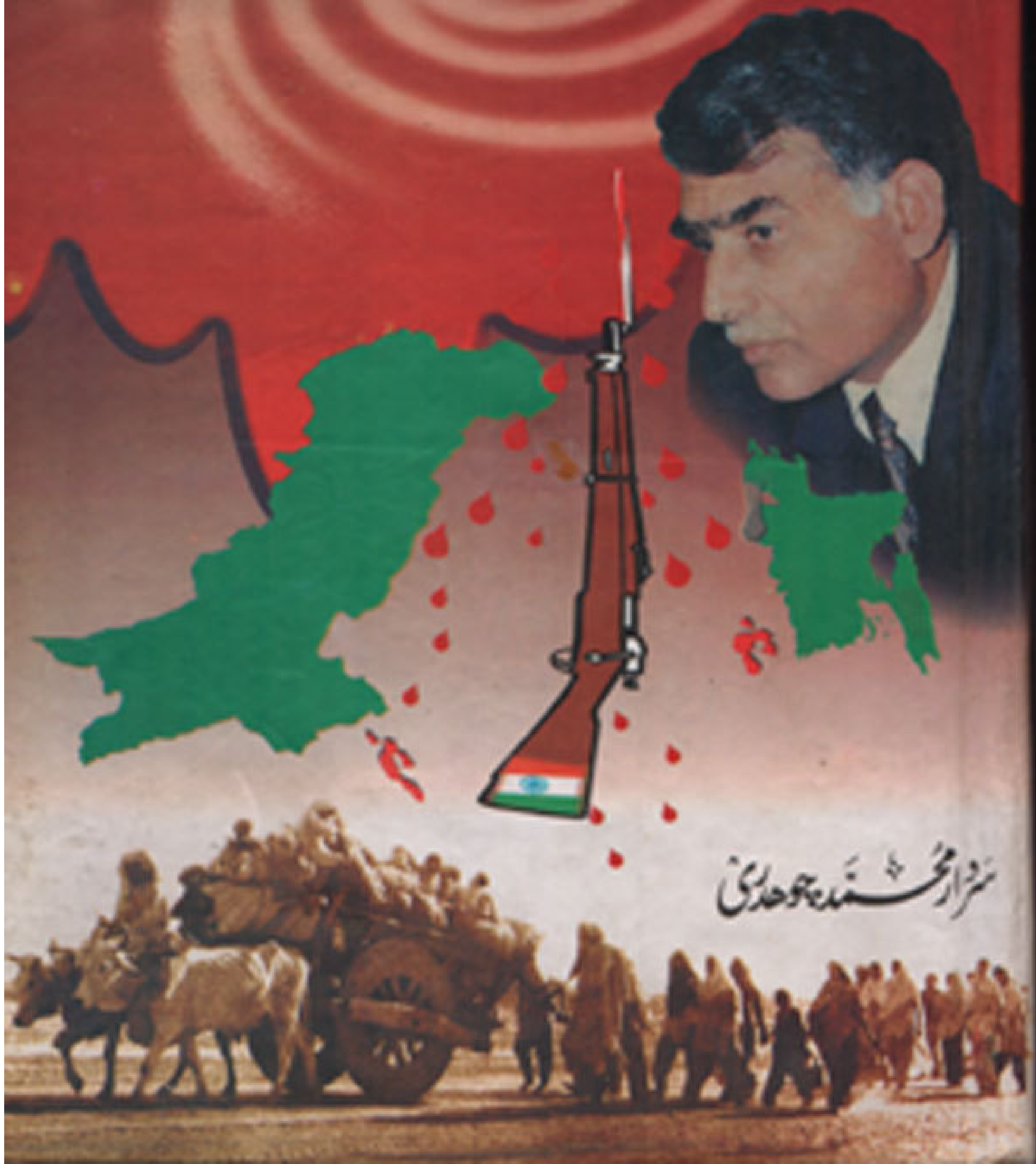
جہانِ حیرت

ایک سابق انسپکٹر جنرل پولیس کی خودنوشت



بسم الله الرحمن الرحيم

جہانِ حیرت

ایک انسپکٹر جنرل پولیس کی خودنوشت سوانحِ حیات

اقتدار کی غلام گردش کے ہوسناک مناظر

عوام کی مظلومیت کے اسباب اور علاج

سردار محمد چوہدری

انتساب

پیارے والدین

اور محبوب شریکِ حیات

بلقیس بیگم

کی حسین یادوں کے نام

اگرچہ وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں
لیکن روحانی طور پر میں انہیں ہمہ وقت اپنے
اِردگرد محسوس کرتا ہوں

ترتیب

☆ سخنے چند

☆ حرفِ اوّل

باب 1: ☆ اللہ ھو

میرا گاؤں

قدرتی مناظر

میلے ٹھیلے

جسٹس بھگوان سنگھ

معصوم شرارت

دھمال ڈالنے والے فقیر

اللہ والے کور شوت

باب 2: ☆ ہجرتِ پاکستان

خاک و خون کا سفر

بُوا بھلّی

سکول میں داخلہ

مثالی استاد - شیخ غلام قادر

مذہبی اور سیاسی اثرات

باب 3: ☆ تلاشِ علم

میرے محسن - شیخ محمد یوسف

گورنمنٹ کالج لاہور

حلقۂ احباب

لا کالج میں داخلہ

باب 4: ☆ اشرافیہ میں شمولیت

روایت شکن افسر

پولیس اکیڈمی کے شب و روز

لاہور کا یادگار دور

وزیرِ خارجہ کے ساتھ شرط

باب5: ☆ پہاڑ اور صحرا

بھٹو تیرا کیا بنے گا؟

جی ایم سیّد سے ملاقات

سیاسی مداخلت کی اصل حقیقت

ڈاکو کا وعدہ

ایک نیک آدمی کا وصال

باب6: ☆ امنڈتے سیاہ بادل

احتجاجی تحریک میں جان پڑ گئی

کیا عوام ملک دشمن ہیں؟

باب7: ☆ شبِ تاریک

جنرل ٹکا خاں کے ساتھ ڈیوٹی

مقدس گائے کو چھیڑنے کے مضمرات

بھارتی طیارے ''گنگا'' کا اغوا

انتخابی نتائج کا تجزیہ

باب8: ☆ تباہی کے راستے پر

جنرل رانی-- طلسم ہوشربا

بلیک بیوٹی کی ناز برداریاں

ہنری کسنجر کی گمشدگی؟

یحییٰ خان کا اصلاحِ احوال سے فرار

باب9: ☆ المناک انجام کی طرف

بھارت کی طرف سے جنگ کا آغاز

نیا آئین نافذ کرنے کے عزائم

منحوس خبر یحییٰ خان کو کیسے پہنچائی گئی؟

حمود الرحمٰن کمیشن

این اے رضوی کا اظہارِ ندامت

باب10: ☆ شیشوں کی مسیحائی

شیخ مجیب کی رہائی

جنرل گل حسن کی برطرفی

الطاف گوہر سے ملاقات

باب11: ☆ جمہوریت کی مجبوریاں

زود رنج سیاستدان

آؤٹ آف ٹرن ترقی کی پیشکش

سہالہ میں ہفتۂ پولیس

ایف ایس ایف کی تشکیل

اٹک سازش کیس

یونس ڈاکو

باب12: ☆جلسوں کی سیاست

بھٹو تقریر نہ کر سکے

لیاقت باغ فائرنگ کیس

باب13: ☆معرکۂ روح وبدن

ہراساں اپوزیشن

طالب علم لیڈروں کے ساتھ حسنِ سلوک

جنگی قیدیوں کی واپسی

باب14: ☆اسلامی سربراہی کانفرنس

یہ چین نہیں ہے

کچھ ایمبولینسیں بھی درکار ہوں گی

بادشاہی مسجد میں افراتفری

سیاستدان اور پولیس

باب15: ☆ٹریفک کا گورکھ دھندہ

پرکشش نعروں کا انتخاب

سوہنی مہینوال اور روڈ سیفٹی

باب16: ☆منشّیات کی دنیا

پاکستان نارکوٹکس کنٹرول بورڈ

بیورو آف پولیس ریسرچ میں تبادلہ

باب17: ☆جہنم کی راہ

نوکر شاہی کا طریقۂ واردات

مسئلے کا حل۔ڈائیلاگ

سیاسی کھیل میں بلاارادہ شرکت

مذاکرات میں غیر ضروری طوالت

باب18: ☆ کیا بھٹو واقعی مجرم تھے؟

دھماکہ خیز انکشاف

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

بھٹو کیس میں عجلت

"رسہ ایک اور گردنیں دو"

ضیا کا اسلامی نظام

باب19: ☆ ایف آئی اے کا استعمال

سیٹھ عابد

مذہب اور اختیارات کا غلط استعمال

فوجی افسروں کے خلاف شکایات

"الذوالفقار" شکنجے میں

باب20: ☆ ضیاء الحق اور انتخابات

فرقہ وارانہ نفرت اور کشیدگی

پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد میں مکالمہ

ایم آر ڈی کی تحریک

درمیانی راستہ

مارشل لا کی چھتری

باب21: ☆نواز شریف سے تعارف

ڈھوک کھبہ کیس

رقصِ مسرّت

گربہ کشتن روزِ اوّل

ایک نجومی کی پیش گوئی

باب22: ☆سپیشل برانچ کی اصلاح

انسدادِ دہشت گردی سیل

سیاستدانوں کا تعاقب

باب23: ☆بین الاقوامی دہشت گردی

چکوال کی راہ پر

فٹ بال کا دھماکہ

باب24: ☆شاہینوں اور فاختاؤں سے واسطہ

یومِ آزادی پر ہنگامہ

احتجاج کو غیر مؤثر کیسے بنایا جا سکتا ہے؟

باب25: ☆نواز شریف کے خلاف گٹھ جوڑ

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف

جنرل ضیا غیر جانبدار بن گئے

باب26: ☆محرّم کے فسادات

شیعہ سُنّی تصادم

جونیجو کے شکوک

باب27: ☆انوکھے بلدیاتی انتخابات

پی پی پی کی شکست یا نظام کی ناکامی

قوانین استعمال کے لیے ہوتے ہیں

مالِ غنیمت کے لیے دوڑ

باب28: ☆جونیجو سائیں الوداع؟

1988ء کے سینٹ الیکشن

اوجڑی کیمپ کا دھماکہ؟

صدارتی نظام کی ترغیب

مسلم لیگ میں پھوٹ

باب29: ☆بہاولپور کا فضائی حادثہ

واقعات

حادثہ کی تحقیقات

باب30: ☆1988ء کے انتخابات

جماعت اسلامی کی اہمیت

آئی جے آئی کی تشکیل

منقسم مینڈیٹ

باب31: ☆بے نظیر کی پنجاب پر چڑھائی

راجیو گاندھی کی ناز برداری

ضمنی الیکشن میں پی پی پی کی شکست

ملازمت پر بحالی

آصف زرداری سے ملاقات

نواز شریف کا تختہ الٹنے کی سازش

پی پی پی کی حکومت کا دھڑن تختہ

باب32: ☆وزیراعظم نواز شریف

مارشل لا لگوانے کی سازش

چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

باب33: ☆کرپشن ختم نہ کرنے کی تراکیب

303افسروں کی چھانٹی

بھٹو دور میں1300افسروں پر کیا گزری؟

ضیا کمیشن کی عنایات

بھٹو اور کرپشن کیس

مخالف فریق کی دادرسی

باب34: ☆پولیس افسران کی گھاتیں

لاڑکانے چلو، ورنہ تھانے چلو

کامیابی کا راز

چوہدری ظہور الٰہی کا اغوا

باب35: ☆آئی جی بننے سے گریز

سازشی کہلانا پسند نہیں

آئی جی کے عہدہ پر تقرر

باب36: ☆اعلیٰ منصب، کٹھن ذمہ داریاں

جنرل کی خواہش

دروازہ کھلا رکھنے کی پالیسی

رضامندی سے تبادلے

استغاثہ-پولیس کی ذمہ داری

پنچایتوں کی بحالی

باب 37: ☆ تخلیقی سوچ کا ارتقا

اشتراکِ عمل

منفرد ایجنڈا

باب 38: ☆ پولیس-دورِ جدید

ہمسایہ ممالک کے تجربات سے استفادہ

اجتماعی خطا

باب 39: ☆ کرائم ریکارڈ کی بحالی

کرائم ریکارڈ- کامیابی کا ایک ذریعہ

کرائم ریکارڈ-چوروں کا سراغ

باب 40: ☆ پولیس کا میگزین-ایک عظیم تجربہ

آغاز

جاہل اور حاسد افسر

باب 41: ☆ پولیس اور عوام میں قربت

معاشرہ کی مدد سے نگرانی کا نظام

جہاد میں میڈیا کی شمولیت

کانسٹیبل کی دعا

باب 42: ☆ مجرم کے لیے فرقہ وارانہ تحفظ

لیّہ میں پہلی کامیابی

جھنگ کا معرکہ

قرآن حکیم جلانے والے مولوی؟

باب43: ☆ منشیات کے خلاف جہاد

قبائلی علاقہ میں ہیروئن نایاب ہوگئی

باب44: ☆ شہدائے امن

اوجلہ کلاں کا معرکہ

ایک عظیم روایت کی پاسداری

عظیم جرأت کی زندہ مثالیں

نماز کے بعد شہادت

خدا کا شکر ہے میں نے اپنا فرض ادا کر دیا

بدمعاشوں سے ٹکر

شہداء کی یاد میں

زندۂ جاوید کے لیے پوری تنخواہ

باب45: ☆ بے نظیر کا ناکام لانگ مارچ

"یہ محض ایک جلوس ہوگا"

باب46: ☆ اہم تبدیلیوں کا سال 1993ء

اب بدلتے ہیں رخ ہواؤں کے

وٹو اور وائیں کے درمیان جھڑپ

باب47: ☆ باہر کی دنیا میں ایک معصوم

ملکی ترقی سے پہلے امن ضروری ہے

بھارتیوں کو خفت

عمرہ کی ادائیگی

باب 48: ☆اسباب کی دنیا

قانون شکن افراد کی عزت افزائی

حب الوطنی کو زنگ کیوں لگ گیا؟

نظامِ عدل میں بگاڑ

منشیات اور کلاشنکوف کلچر

پنچایت کی بجائے بنیادی جمہوریت

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیارات میں کمی

باب 49: ☆امن وامان کے تقاضے

ناکافی عمارتیں

افرادی قوت کی قلت

جرائم کی تفتیش

پراسیکیوشن برانچ

دیگر ایجنسیاں

باب 50: ☆محکمہ پولیس۔ حقائق اور اعداد وشمار

باب 51: ☆بعض متفرق واقعات

لاڑکانہ میں پولیس ہڑتال

بھارت میں پولیس کی بغاوت

پینے کا پانی بھی دستیاب نہیں
امن کے لیے ایک پائی میسر نہیں

باب52: ☆ کچھ اپنے خاندان کے بارے میں
میاں محمد شفیع
بلقیس-ایک مثالی رفیقۂ حیات
نکاح اور رخصتی میں عجلت
پہلے بیٹے کی پیدائش
صائمہ کی ولادت
"پختہ عہد کرو"
صائمہ کی شادی
ہارون کی شادی
مخلص ملازمین
دو المناک اموات

تتمہ مخفّفات

سخنے چند

اس رقص گاہِ حیات میں ہر شخص اپنی زندگیٔ مستعار کے ماہ وسال کو اپنے اپنے احوال وظروف، افتادِ طبع اور زمانے کے سیاسی اور معاشرتی مدّ و جزر کے مطابق گزار دیتا ہے۔ ماہ وسال کی اس گردش میں رخشِ عمر، زمانے کی رَو میں چلتا، دوڑتا، رکتا اور بھاگتا دکھائی دیتا ہے۔ پھر افتادِ عمر کی یہ گردشِ دوراں راستے میں کسی جگہ دم توڑ دیتی ہے اور یہ گردشِ حیات کسی ایک نقطۂ متعین پر جا کر تھم جاتی ہے۔ صوفیا اسے مقامِ فنا اور اطبّا اسے مرگِ طبعی قرار دیتے ہیں۔

گردشِ ایّام اور مرورِ زمانہ کے اس ازلی سفر میں ہر انسان کو گونا گوں اور متنوع تجربات، مشاہدات، حوادث اور وقائع سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو بسا اوقات ناموافق اور گاہے سازگار اور خوشگوار ہوتے ہیں۔ سازِ حیات کے سارے سُر بس ایسے ہی زیر و بم کے ساتھ کبھی نغمۂ طرب اور کبھی نوحۂ غم بن کر ہماری سماعتوں کا امتحان لیتے ہیں۔ اس سفرِ حیات میں کبھی کبھی اور کہیں کہیں ایسے واقعات اور حادثات کا ظہور بھی ہوتا ہے، جو ایک ذاتی تجربے سے آگے نکل کر ایک معاشرتی عمل میں ڈھل جاتے ہیں اور پھر اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر قومی، ملکی اور ملّی جدو جہد کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ایسے مسافر کو بصارت کی جس قدر لطیف حس عطا ہوتی ہے وہ اپنے نتائج وثمرات کے حوالے سے ایک بصیرت میں ڈھل جاتی ہے۔ بصارت اور بصیرت کا یہی امتزاج ایک آپ بیتی یا خودنوشت سوانحِ حیات کا حقیقی لوازمہ ہے۔

شیریں تر از حکایتِ مانیست قصۂ
تاریخِ روزگار سراپا نوشتہ ایم

کسی بھی فرد کے کوائف حیات میں اصل حصّہ اس باطنی واردات، نفسی کیفیات، ذہنی مطالعات اور ارضی مشاہدات کا ہوتا ہے، جس کے باعث وہ محض ان واقعات اور حوادث کا حصّہ ہی نہیں بنتا، صرف ان کے تجزیہ و تحلیل پر اکتفا ہی نہیں کرتا، بلکہ بعض حالات اور جذبات کے باوصف، ان کا رخ موڑنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

اس عالمِ رنگ وبُو میں انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے، جسے حق تعالیٰ نے اپنے حرفِ کُن کی بجائے اپنے

ہاتھوں سے دیس دیس کی مٹی کو گوندھ کر تیار کیا اور اس میں اپنی روح کو پھونکا، جس کے باعث وہ اس ''جہانِ حیرت'' میں ایک انفرادیت کا حامل ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

تاریخ کا دامن کئی رنگوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس قوسِ قزح کا ایک رنگ سوانحی ادب بھی ہے مگر ان سوانح کا سب سے اہم اور دلچسپ پیرایہ آپ بیتی یا خودنوشت سوانح حیات ہے، جسے انگریزی زبان کے ایک ہی لفظ (Autobiography) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اردو زبان میں خودنوشت سوانح یا آپ بیتی کا ارتقائی سفر بہت سی دلچسپیوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ روزنامچے، خطوط، سفرنامے، رپورتاژ اور ملفوظات سبھی شخصی اظہار کے مختلف پیرائے ہیں۔ کائنات کے مختلف اجزائے آفرینش پر نگاہ دوڑایئے، آپ کو نمو کا جذبۂ اظہار ہر کہیں اور ہر چیز میں دکھائی دے گا۔ گویا اظہارِ ذات ہر ذی روح کی جبلّی ضرورت ہے، حتیٰ کہ غیر ذی روح اشیاء میں بھی بسا اوقات اظہارِ ذات کی کیفیت جھلک اٹھتی ہے۔ اگر حضرت انسان نے اپنے اس جبلّی شعور کے تقاضوں کے تحت مختلف علوم و فنون کے حوالے سے اظہارِ ذات کے نقوش پیدا کیے ہیں، تو اس میں اچنبھے کی بات ہی آخر کیا ہے؟

صوفیائے کرام کے ملفوظات، اولوالعزم مجاہدوں کی داستانیں، حریت پسندوں کی روددادِ اسیری، وقائع نگاروں کے تذکرے، مؤرخین کی یادداشتیں، درباریوں کے روزنامچے، نجی مراسلت کے نمونے، سیاحوں کے سفرنامے، خصوصی وقائع کے رپورتاژ، غزل کی داخلی شدّت اور شخصی احوال پر مشتمل آپ بیتیاں۔ یہ سب کچھ خودنوشت سوانح کے مراحلِ تخلیق اور ارتقائی مدارج ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ خودنوشت کا سراغ مشرق کی بجائے مغرب میں ملتا ہے۔ اہلِ مغرب کے ہاں خودنوشت سوانح بھی کثیر الجہات ہیں جس کا ابتدائی اثر اعترافات (Confessions) میں ملتا ہے۔ مسیحی لٹریچر میں یہ رنگ تزکیۂ نفس (Catharsis) کا ذریعہ ہے۔ یہ عمل سچائی کا زہر پینے کے مترادف ہے۔ یوں خودنوشت یا سوانح یا آپ بیتی میں ایک سچا مصنف اپنے لیے خود صلیب اٹھائے پھرتا ہے۔ اسی باعث خودنوشت سوانح، اصنافِ ادب اور تاریخ علوم میں ایک منفرد، علمی اور فنی مقام رکھتی ہے۔ انسانی شخصیت کا سب سے اہم تشکیلی عنصر خودی یا اظہارِ ذات ہے۔ انسان اپنی جبلّت کے ہاتھوں ذاتی رونمائی اور خودستائی کے لیے مجبور ہے۔

کانٹوں کی زبان سوکھ گئی پیاس سے یا رب
اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے

اظہارِ ذات کے منفی ذرائع جہاں انسانی شخصیت کو مسخ کرتے ہیں وہاں ان کا مثبت اظہار شخصیت میں ایک دلآویزی، کشش اور احترام کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ اس اصول کو اگر ہم تاریخی وقائع پر منطبق کریں تو منفی ذرائع سے جہاں سقوطِ بغداد کے المناک مناظر دکھائی دیتے ہیں، وہاں مثبت اظہار سے تاج محل اور مسجد قرطبہ کے پائیدار نقوش بھی ابھرتے ہیں۔ اسی باعث خودنوشت میں ہر قلمکار اپنی ذات کے ارد گرد مختلف رنگوں کا ایک ہالہ بناتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی بدصورتی کو بڑی چابکدستی سے چھپاتا اور اپنے ہنر کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ہر قدم تحسین کا طالب اور ہر لمحہ ستائش کا خوگر ہے۔ وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا نہ کرتے ہوئے بھی ستائش اور صلے کا تمنائی ہوتا ہے۔

تاریخ کا عمل معاشرتی اور ریاستی وقائع کا آئینہ دار ہوتا ہے، تو سوانح میں مختلف رنگوں سے ایک واقعاتی پیکر تراشا جاتا ہے، مگر خودنوشت میں تو اپنے پندار کا صنم کدہ خود تعمیر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس صورتِ حال میں کسی خودنوشت سوانح لکھنے والے کی کامیابی اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ خارج میں ہونے والے واقعات کو اپنے داخلی احساسات سے ہم آہنگ کرے۔ اس تخلیقی عمل کا شاعری میں سب سے بڑا اظہار غزل میں ہوا ہے کہ جہاں ایک شاعر اپنی قلبی واردات کو غمِ دوراں کا حصّہ بناتا ہے۔ یوں آپ بیتی اور جگ بیتی کے فاصلے ختم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ہے آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

خودنوشت سوانح اپنے فن کے لحاظ سے کسی فرد کی وہ روودادِ حیات ہے، جسے وہ خود قلمبند کرتا ہے کیونکہ کوئی دوسرا انسان اس کے ذاتی اور شخصی حالات سے، اس سے بہتر باخبر نہیں ہوسکتا۔ ظاہری وقائع یا خارج میں رونما ہونے والے احوال وحوادث کو تو کوئی بھی اپنے شعور کے مطابق تحریر کرسکتا ہے مگر کسی فرد کی باطنی کیفیات، نفسیاتی ہیجان، قلبی واردات اور ذہنی شعور کو دوسرا فرد بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس لیے آپ بیتی کا فن ہمیں اتنا ہی قدیم نظر آتا ہے جتنا خود حضرت انسان کا وجود۔ کسی آپ بیتی کا مصنف اگر

اپنی نفسیاتی مجبوریوں یا اخلاقی کمزوریوں کے باعث اپنے تجربات و مشاہدات پر خود ہی سنسر شپ عائد کر دے تو اس کا یہ عمل خودنوشت کو نہ صرف کمزور بنا دیتا ہے بلکہ قارئین کے لیے اس میں دلچسپی یا عبرت کا کوئی سامان باقی نہیں رہتا۔ اسی باعث سچائی اور راست بازی کے ساتھ آپ بیتی لکھنا پل صراط سے گزرنے کے مترادف ہے۔ حقیقت نگار مصنف تو اپنی صلیب خود اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہے مگر اس کی سچائی کی روح اور صداقت کا اخلاص قارئین کے ذہنوں میں اس کے لیے یا تو عقیدت کے جذبات پیدا کر دے گا، یا پھر اس کی کوتاہیوں اور لغزشوں کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اختیار کرے گا۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

ایک اچھی خودنوشت محض یادوں کی کھتونی یا یادداشتوں کا روزنامچہ نہیں ہوتی بلکہ وہ زندگی کے نشیب و فراز، اپنے عہد کے حالات و واقعات، افکار و تصوّرات، علوم و فنون اور تہذیبی اور ثقافتی اقدار و روایات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے کسی آپ بیتی میں جگ بیتی کا تناسب کیا ہو، یہ ایک مستقل فنی مسئلہ ہے۔ عالمی ادب کی کامیاب اور مقبول آپ بیتیوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خود نوشت سوانح حیات میں کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ مصنّف واقعاتِ عالم کی ایسی تشریح و توضیح کرے، جس کے تجزیاتی اور تخلیلی عمل سے قاری متفق اور ہم آہنگ ہوتا چلا جائے۔

دیکھنا "تقریر" کی لذت کہ جو اس نے "کہا"
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

خودنوشت یا آپ بیتی کا فن اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ مصنف اپنے شخصی افکار و تصوّرات یا نجی تاثرات کو قاری پر ٹھونسنے کی بجائے ایک ایسا اسلوب اور طرز استدلال اختیار کرے کہ وہ اپنے ذوقِ سلیم کے مطابق اس کی تائید یا تردید کر سکے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ غزل تو جوانی میں کہی جا سکتی ہے مگر ایک اچھی آپ بیتی بالعموم عمر کے صرف آخری حصے میں ہی لکھی جا سکتی ہے کہ جہاں کسی شخص کے تجربات و مشاہدات میں ایک خاص درجے کی وسعت پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔ اس عہد میں انسانی شعور میں پختگی، طبیعت میں اعتدال، تجزیے کی صلاحیت، احوالِ الم سے شناسائی، مشاہدات میں وسعت، اسلوب پر قدرت، تخلیقی اپج، استخراج کی قدرت، تحقیق کی لذت اور دوسروں کی خدمت کا جذبہ فراوانی اختیار کر لیتا ہے۔ خودنوشت میں حقیقت

نگاری، برملا گوئی، صداقت شعاری اور غیر جانبداری کا عنصر جس قدر زیادہ ہوگا، وہ خودنوشت کی کامیابی کی ضمانت فراہم کرے گا۔ مگر اس کے برعکس مبالغہ آرائی، رنگ آمیزی، غلط بیانی، خود پسندی، سہل انگاری، دروغ گوئی، عبارت آرائی اور تکلف و تصنع میں جس قدر اضافہ ہوتا چلا جائے گا، خودنوشت فنی اور علمی لحاظ سے اسی قدر کمزور ہوتی چلی جائے گی۔ آپ بیتی میں خارجی عوامل کو محض ایک دلیل اور جواز کے طور پر اختصار کے ساتھ شامل ہونا چاہیے۔ خودنوشت میں داخلی اور اندرونی زندگی کے تغیرات کو جس قدر جگہ دی جائے گی، وہ خودنوشت دوسروں کے لیے اسی قدر گوارا اور پسندیدہ ہوگی۔ ایک اچھی خودنوشت صرف شخصی وقائع اور تاریخی حالات کا ہی مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ اس کا اسلوب ''گفتہ آید در حدیث دیگراں'' کی مثال ہونا چاہیے۔ طرزِ احساس کی کیفیت، واقعات کے انتخاب، زبان کی قدرت اور اسلوب کی جدت وندرت کے باعث خود نوشت ایک تاریخی دستاویز کے ساتھ ایک ادبی کارنامہ بھی بن جاتی ہے۔

انگریزی ادبیات میں سینٹ آگسٹائن کے اعترافات اپنی نوعیت کی پہلی خودنوشت ہے۔ اعترافات(Confessions) کے ضمن میں سب سے معروف خودنوشت روسو(Rousseau) کی قرار دی جاتی ہے۔ اس کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے:

''میں نے ایک ایسی مہم کا بیڑہ اٹھایا ہے، جس کی کوئی مثال نہیں ملتی، اور شائد کوئی دوسرا فرد اس کی پیروی (کی جرأت) بھی نہ کر سکے گا۔ میں تقدیر زدہ مخلوق کے سامنے ایک انسان کی تصویر اور تمثال پیش کر رہا ہوں۔ اور یہ انسان کون ہے؟ وہ خود میں ہوں۔''

امریکی اور یورپی ادبیات میں گبن، ہرڈر، گوئٹے، ہربرٹ اسپنسر، برٹرینڈ رسل، جان سٹورٹ مل، جی کے چسٹرٹن، بنجمن فرینکلن، لی ہنٹ، جان رسکن، آسکر وائلڈ، رڈیارڈ کپلنگ، ایچ جی ویلز اور تھامس کارلائل وغیرہ کے نام خودنوشت سوانح حیات کے مصنفین میں ممتاز ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں خودنوشت سوانح کے ذخائر پر نگاہ ڈالیں تو اس میں ملوک وسلاطین، علما و صوفیا، ادبا و شعرا، سیاسی اکابرین اور معاشرتی مصلحین اور صحافی اور مؤرخ حضرات دکھائی دیتے ہیں۔ برصغیر میں انگریزی زبان میں سب سے قدیم خودنوشت لطف اللہ نے 1854ء میں لکھی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر، سبھاش چندر بوس، نراد سی، چودھری، موہن داس کرم چند گاندھی، جواہر لال نہرو اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے بھی انگریزی میں اپنی خودنوشت تحریر کی ہیں۔ انگریزی زبان میں دورِ حاضر میں بھی خود

نوشت یا Memories لکھنے کا رواج جاری ہے۔ ایئر کموڈور انعام الحق اور سردار محمد چوہدری (ریٹائرڈ انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب) وغیرہ نے بیسویں صدی کے آخری عشرے میں اس صنفِ ادب میں کامیابی سے طبع آزمائی کی ہے۔ اتفاق سے ان ہر دو حضرات کی آپ بیتیوں کے اردو تراجم بھی معمولی ردّ و بدل کے ساتھ کیے گئے ہیں۔ ایر کموڈور انعام الحق صاحب کی خود نوشت ''ایامِ رفتہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور سردار محمد چوہدری کی آپ بیتی ''جہانِ حیرت'' کے نام سے پیش خدمت ہے، جس کے مقدمے کے طور پر یہ تمہیدی اور تعارفی سطور قلم بند کی جا رہی ہیں۔ عربی، فارسی، انگریزی، روسی اور چند دیگر زبانوں کی آپ بیتیوں کے اردو تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ جنہیں ظہیر الدین بابر، نور الدین جہانگیر، شہنشاہ محمد رضا خان پہلوی، میر تقی میر، واجد علی شاہ اختر، طٰہٰ حسین، موہن داس کرم چند گاندھی، جواہر لال نہرو، روسو اور میکسم گورکی نے لکھا ہے۔ راقم کی تحقیق کے مطابق شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی آپ بیتیاں انہوں نے کرائے کے ادیبوں سے لکھوائی ہیں، جس کے باعث مرورِ ایام اور امتدادِ زمانہ نے ان کاوشوں کو صرف تذکروں کے لیے زندہ رکھا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

شبہ قارہ ہند میں امیر خسرو (م 1325ء) کے نام اور مقام سے کون بے خبر ہے۔ ان کے حالات زندگی، ان کے اپنے قلم سے ''غرۃ الکمال'' اور ''تحفۃ الصغر'' میں ملتے ہیں۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے احوال، اس کی ''فتوحاتِ فیروز شاہی'' میں درج ہیں۔ البتہ مغل شہنشاہوں نے خود نوشت سوانح کے کامیاب نمونے یادگار چھوڑے ہیں۔ ظہیر الدین بابر کی ''تزک بابری''، اس کی بیٹی گلبدن بیگم کا ''ہمایوں نامہ'' اور نور الدین جہانگیر کی ''تزکِ جہانگیری'' بہت معرکے کی تحریریں ہیں۔ اورنگزیب عالمگیر کی ''واقعاتِ عالمگیری'' کو بھی نیم خود نوشت سوانح قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان سب شاہی آپ بیتیوں کے معیاری اردو تراجم دستیاب ہیں۔

خود نوشت سوانح حیات یا آپ بیتی کے واضح نقوش ہمیں اردو زبان کی دوسری اصناف نثر میں بھی دکھائی دیتے ہیں چنانچہ روزناموں میں مولوی مظہر علی سندیلوی نے 1911ء میں 7799 صفحات پر مشتمل اپنا روزنامچہ یادگار چھوڑا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے بھی معروف اور دلچسپ ہیں۔ مکاتیب میں بھی چونکہ شخصی احوال ہی کو بیان کیا جاتا ہے اس لیے ان میں بھی کسی شخصیت کے احوال اور کوائفِ حیات جھلکتے ہیں۔ مرزا غالب کے سوانح نگاروں میں جس کسی نے ان کے مکاتیب کے حوالے سے ان کا حیات نامہ

مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، وہ بہت کامیاب رہے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر کی کاوش ''غالب'' خصوصیت سے لائقِ ذکر ہے۔ اسی طرح شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، علامہ محمد اقبال، سید ابوالاعلیٰ مودودی، فیض احمد فیض، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محمد حمیداللہ اور بیسیوں دوسرے مشاہیر کے مکاتیب کسی نہ کسی درجے میں ان کی خودنوشت سوانح کی تفصیلات فراہم کرتے ہیں۔ سفرناموں کا مطالعہ بھی ان سیاحت نگاروں کے شخصی احوال اور دلچسپیوں کا نقشہ سامنے لاتا ہے اور ایسا لوازمہ خودنوشت سوانح ہی کے ذیل میں شمار کیا جانا چاہیے۔ یوسف خان کمبل پوش، سر سید احمد خان، مولانا جعفر تھانیسری، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، ظفر احسن بیگ، صبیح الدین علوی، محمد حامد علی خان، مرزا نثار علی بیگ، شیخ عبدالقادر، فتح علی قزلباش، خواجہ حسن نظامی، قاضی ولی محمد، قاضی عبدالغفار، ابوظفر ندوی، منشی محبوب عالم، محمود نظامی، بیگم حسرت موہانی، آغا محمد اشرف، سید احتشام حسین، اختر ریاض الدین، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید ابوالحسن علی ندوی، حکیم محمد سعید اور بیسیوں دوسرے سیاحت نگاروں کے سفرناموں میں ان کی شخصی زندگی کے احوال کو خودنوشت سوانح ہی کی ایک صورت قرار دیا جاسکتا ہے۔

اردو ادب میں رپورتاژ بھی ایک ایسی صنفِ نثر ہے جس میں اس خودنوشت سوانح کا لوازمہ اور سامان موجود ہے۔ اس ضمن میں جب ہم سجاد ظہیر کی ''یادیں'' رضیہ سجاد ظہیر کی ''اس کا کارروان''، کرشن چندر کی ''پودے''، عصمت چغتائی کی ''بمبئی سے بھوپال تک''، پرکاش پنڈت کی ''کہت کبیر، سنو بھائی سادھو''، قرۃ العین حیدر کی ''ستمبر کا چاند''، عادل رشید کی ''خزاں کے پھول''، قدرت اللہ شہاب کی ''یا خدا''، زہرہ جمال کی ''5 دسمبر کی رات''، تاجور سامری کی ''اور خدا دیکھتا رہا''، فکر تونسوی کی ''چھٹا دریا'' اور کئی دوسرے رپورتاژ ہمارے سامنے جس نوعیت کا لوازمہ پیش کرتے ہیں۔ ہم انہیں فنی لحاظ سے آپ بیتی کے حامل نقوش نہ بھی قرار دیں تو انہیں خودنوشت کے اثرات سے فیض یاب ضرور گردان سکتے ہیں۔

یوں اگر آپ خودنوشت کے لوازمے کو دیگر اصناف نثر میں تلاش کریں تو مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول ''شریف زادہ''، عصمت چغتائی کے ناول ''ٹیڑھی لکیر''، خواجہ احمد عباس کے ناول ''انقلاب''، قرۃ العین حیدر کے سوانحی ناول ''کارِ جہاں دراز ہے''، جیسے ناولوں میں ان مصنفوں کے حالات کی پرچھائیاں ان کے مختلف کرداروں کے روپ میں صاف صاف ان کے سوانحی کوائف کا پتہ دیتی ہیں۔

صدیق جائسی نے ''دربار دُربار'' میں حیدرآباد کی ثقافتی زندگی، پروفیسر رشید احمد صدیقی نے

''آشفتہ بیانی میری'' میں ان کی طالب علمی کے قصے، انیس قدوائی کی ''آزادی کی چھاؤں میں'' تقسیم ہند کے بارے میں ان کے پرآشوب مشاہدات، علی سردار جعفری کی ''لکھنؤ کی پانچ راتیں''، میں ان کے لکھنؤ میں اقامت کے واقعات، کرنل محمد خان کی ''بجنگ آمد'' میں ان کی فوجی زندگی اور تربیت کی تفصیلات، پروفیسر خورشید احمد کی ''تذکرۂ زنداں''، میں ان کے ایامِ اسیری کی روداد، شعیب اعظمی کی ''صحبت یار آخر شد'' میں اگرچہ ایرانی سفر کی یادداشتیں ہیں مگر ہم انہیں سفرنامے کی نسبت، خودنوشت کے قریب محسوس کرتے ہیں۔ یوں خودنوشت سوانح حیات کا لوازمہ اردو کے روزنامچوں، مکاتیب، سفرناموں، رپورتاژوں اور دیگر تحریروں میں بکھرا دکھائی دیتا ہے۔ صوفیائے کرام کے ملفوظات کے متن ہر چند تحقیقی لحاظ سے لائقِ نقد ہیں مگر ان میں ان عظیم شخصیات کی ذہنی اور قلبی واردات کا صاف پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح مختلف علمی اداروں اور تحقیقی مراکز کی رودادیں، ان اداروں سے منسلک شخصیات کے بارے میں بہت قیمتی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ مگر ایسی سب تحریروں کو خودنوشت کے لوازمے کے قریب سمجھنے کے باوجود ان کے تفصیلی جائزے سے گریز کیا جا رہا ہے۔

اردو ادب میں خودنوشت سوانح یا آپ بیتیوں کی شکل میں بیسیوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اسی قبیل میں اردو کے مہم جو ادیب اور مدیر نقوش، محمد طفیل نے جون 1964ء میں اپنے وقیع رسالے ''نقوش'' کا آپ بیتی نمبر شائع کیا تو اس کی ابتدا میں آپ بیتی کے فن اور اسلوب کے بارے میں چند قیمتی مضامین بھی لکھوائے۔ اور پھر سیکڑوں لوگوں کی آپ بیتیاں بھی فراہم کیں، جن میں کچھ طویل آپ بیتیوں کے خلاصے بھی شامل ہیں۔ ان میں سے بعض آپ بیتیاں برِصغیر سے دور پار ممالک کی شخصیات سے وابستہ ہیں مگر ان کے تراجم فراہم کیے گئے ہیں۔ یوں آپ بیتیوں کی حد تک یہ کام ابھی تک لائقِ تحسین ہے اور ہمیشہ ایک حوالے اور سند کے بطور پیش کیا جاتا رہے گا۔

محترم سردار محمد چوہدری کی خودنوشت سوانح ''جہانِ حیرت'' کے تفصیلی مطالعے سے پیشتر ہم اختصار کے ساتھ اردو میں خودنوشت سوانح نگاروں کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اس ذخیرے میں بعض شہ پارے ایسے ہیں جنہیں دنیا کے کسی بھی خودنوشت سوانحی ادب کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ دنیا بھر میں اس صنف میں لکھی جانے والی جس قدر تحریریں ملتی ہیں ان کے نمایاں رنگوں اور اسالیب کا انعکاس، اردو زبان میں لکھی جانے والی بعض خودنوشت سوانح حیات میں واضح دکھائی دیتا ہے۔

اردو خودنوشت سوانح حیات کے ضمن میں محمد جعفر تھانیسری (م 1905ء) کی ''تواریخ عجیب یا کالا پانی'' کو اس صنف کی اوّلیں کوشش قرار دیا جاتا ہے۔ ظہیر دہلوی کی ''داستانِ غدر'' بھی اس صنف کے ابتدائی نقوش میں قابل توجہ ہے۔ انیسویں صدی کے نصفِ اوّل کے بعد اب تک گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں سیکڑوں چھوٹے بڑے خودنوشت سوانح حیات کے نمونے اردو زبان میں دکھائی دیتے ہیں جن میں خان بہادر منشی محمد عنایت حسین کی ''ایامِ غدر''، سر رضا علی کی ''اعمالنامہ''، حکیم احمد شجاع کی ''خون بہا''، مولانا حسین احمد مدنی کی ''نقشِ حیات''، حسرت موہانی کی ''قیدِ فرنگ''، عبدالماجد دریا آبادی کی ''آپ بیتی''، تقی محمد خان خورجوی کی ''عہدِ رفتہ''، محمد اکرام صدیقی کی ''قید یاغستان''، چودہری افضل حق کی ''میرا افسانہ''، دیوان سنگھ مفتون کی ''نا قابلِ فراموش''، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری''، سیّد ہمایوں مرزا کی ''میری کہانی۔ میری زبانی''، مولانا ابوالکلام آزاد کا ''تذکرہ''، عبدالمجید سالک کی ''سرگزشت''، احسان دانش کی ''جہانِ دانش''، جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات''، ذوالفقار علی بخاری کی ''سرگزشت''، ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی ''میری داستان حیات''، آغا شورش کاشمیری کی ''بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل''، چوہدری ظفر اللہ خان کی ''تحدیث نعمت''، میرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا''، مسیح الدین علوی کی ''سفیر اودھ''، اختر حسین رائے پوری کی ''گردِ راہ''، صادق الخیری کی ''میری زندگی فسانہ''، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی ''رو میں ہے رخشِ عمر''، ڈاکٹر یوسف حسین خان کی ''یادوں کی دنیا''، عشرت رحمانی کی ''عشرت فانی''، نواب سعید احمد چھتاری کی ''یادِ ایام''، عبدالرزاق کانپوری کی ''یادِ ایام''، ائیر کموڈور انعام الحق کی ''آئینۂ ایام''، مرزا فرحت اللہ بیگ کی ''یادِ ایام''، عشرت فانی، شاد عظیم کی ''شاد کی کہانی، شاد کی زبانی''، نابینا مصنف رانا تاب عرفانی کی ''اپلوں کا دھواں''، قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ''، اور جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال کی ''اپنا گریباں چاک'' خصوصیت سے لائق ذکر ہیں۔ اور اب 2003ء کے دوران ''جہانِ حیرت'' کے عنوان سے ایک خودنوشت سوانح حیات منصّۂ شہود پر آ رہی ہے جسے معروف بیوروکریٹ، مصنف، کالم نگار، دانشور اور ادیب سردار محمد چوہدری نے تحریر کیا ہے۔

''جہانِ حیرت'' کے مصنف سے میری شناسائی صرف ان کی تحریروں اور اخباری کالموں کے حوالے سے ہوئی۔ ستمبر 1997ء میں ان کی خودنوشت سوانح کا انگریزی ایڈیشن (The Ultimate

(Crime: Eyewitness to Power Game) کے نام سے شائع ہوا۔ 1999ء میں "متاعِ فقیر" کے 27 ابواب پر مشتمل ان کی سرگزشت ایک دلچسپ، حقیقت افروز، اور عبرت آموز اسلوب میں شائع ہوئی۔ 2001ء میں ان کے 40 تخلیقی مضامین کا ایک مجموعہ "کشت ویراں" کے نام سے شائع ہوا جس کے ہر مضمون کی پیشانی کسی خوبصورت شعر سے مزیّن تھی۔ یہ کتاب واقعاتی صداقتوں کا ایک ادبی پیرایہ لیے ہوئے تھی۔ اسی زمانے میں انہوں نے وزیرِاعظم میاں نواز شریف کی شخصیت پر ایک تجزیاتی اسلوب کی حامل کتاب لکھی جس کا عنوان "نواز شریف۔ ٹیڑھی راہوں کا سیدھا مسافر" رکھا گیا۔ تحریکِ پاکستان کی جدوجہد اور قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کی تاریخ ساز شخصیت سے چوہدری صاحب کو جنوں کی حد تک تعلق خاطر ہے۔ اس جذب وجنوں کا سلسلہ ان کی کتاب "قائدِاعظم محمد علی جناحؒ۔ بیسویں صدی کا سب سے بڑا انسان" میں دیکھا جاسکتا ہے۔

مجھے مذکورہ کتابوں کو عوامی کتب خانوں کی نظامت کے ڈائریکٹر کے بطور دیکھنے اور پڑھنے کے مواقع ملے۔ مختلف صحافتی روزناموں میں ان کے فکر انگیز کالم بھی مسلسل شائع ہو رہے تھے مگر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ایک روز مجھے ایک تقریب میں شرکت کی غرض سے مرحوم غلام حیدر وائیں کی سیاسی خانقاہ تحریکِ پاکستان ورکرز ٹرسٹ اور نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن کے دفاتر میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں ایک طویل قامت بزرگ مگر جواں فکر شخصیت سے ملنے کا موقع میسر آیا۔ یہ رشتۂ شناسائی، ذاتی قربتوں میں ڈھلتا چلا گیا۔ مجھ پر چوہدری صاحب کی شخصیت کے پرت ایک ایک کر کے کھلتے چلے گئے۔ کیسی سندر سوچوں کا انسان، کیسی انقلابی فکر کا پرچارک، کتنا زیرک فرد، کس قدر پختہ شعور اور ادراک کا مالک اور کیسے تجزیہ و تحلیل کا حامل صاحب اسلوب، اعلیٰ پولیس سروس کی غلام گردشوں سے گزرنے کے باوجود، اس طبقے کی تمام تر آلائشوں سے محفوظ۔۔۔ ایک لائق محبت روپ میں میرے سامنے موجود تھا۔ اس قربت کے نتیجے میں مجھے ان کی پاکستان پولیس کی تاریخ سے متعلق ایک فکر انگیز کتاب "پنجاب پولیس۔ سچ کیا ہے؟" پر چند تعارفی سطریں لکھنے کا موقع ملا۔ چوہدری صاحب نے میری اس مختصر تحریر کو پڑھتے ہوئے حوصلہ افزائی فرمائی کہ ایسی تحریر تو کوئی شخص کتاب کے سنجیدہ مطالعے کے بغیر لکھ ہی نہیں سکتا۔ پولیس کے نظام اور طرزِ عمل کو سمجھنے اور بہتر بنانے کے سلسلے میں اس کتاب کو پولیس اور ارباب حکومت کے علاوہ عامۃ الناس میں بھی بہت پذیرائی ملی ہے۔

محترم سردار محمد چوہدری کو بیسویں صدی کے آخری تین عشروں میں اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے باعث ملکِ عزیز پاکستان کے اقتدار کے ایوانوں اور محلّات کی غلام گردشوں میں جانے کے براہِ راست مواقع ملے۔ انہیں اسی دوران اقتدار کے بھوکے درندوں کے ہوسناک کھیل کو بچشم خود دیکھنے کا موقع ملا، جس کے باعث ان کے مشاہدات میں ایک ایسی تصویر کو دیکھنے اور ایک ایسی تحریر کو پڑھنے کے مواقع ملتے ہیں، جس کا ہر ورق ایک عبرت انگیز مرقع اور جس کی ہر سطر ایک خونچکاں آشوب ہے۔ اس المناک صورتِ حال کے باوجود مصنف کے قلم نے واقعات کے تجزیہ و تحلیل کا ایک ایسا اسلوب تراشا ہے کہ جس سے ہمتوں کو پستی کی بجائے حوصلوں کو بلندی ملتی ہے۔ یہ ہمارے قومی المیے کا وہ باب ہے جسے بڑی راستبازی اور صداقت شعاری کے ساتھ رقم کیا گیا ہے۔ وہ خود سچائی کے راستے کے مسافر ہیں اور انہوں نے اہل کاررواں کو بھی ان بحرانوں سے نکلنے کا شعور اور حوصلہ دیا ہے۔ حالات و واقعات کی یہ لہریں جو ایک طوفانی منظر پیش کرتی ہیں، ان کے باعث مصنف نے بجا طور پر اپنی اس خودنوشت کو ''جہانِ حیرت'' کا نام دیا ہے۔

خودنوشت سوانح میں اظہارِ ذات ایک فطری عمل ہے۔ اگر کسی تحریر یا نقش میں یہ وصف پیدا نہ ہوا تو وہ تحریر بہت پھیکی اور وہ تصویر بہت ادھوری رہ جاتی ہے۔ اس خودنوشت کا آغاز مصنف کے ذاتی احوال سے ہوتا ہے۔ ان کی رودادِ حیات کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک محنت کش چھوٹے سے خاندان میں آنکھ کھولی، جہاں رزق حلال کے حصول پر ایک طمانیت اور وسائل کی قلّت پر ایک قناعت کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے اپنے بچپن کی اس تنگ دستی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احوال کو بڑی دیانت داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس تمام خودنوشت میں مصنف نے نہ تو اپنا ماضی فراموش کیا ہے اور نہ ہی اس کے اظہار میں وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہوئے ہیں۔ ایک اچھی خودنوشت اگر راستبازی کے ساتھ زندگی کے اسرار کو منکشف کرنے کا نام ہے، اگر ایسی صنف میں خارجی مشاہدات کے ساتھ داخلی احساسات کے صداقت کو شامل کرنا بھی ایک فطری اور فنی ضرورت ہے تو ''جہانِ حیرت'' اردو زبان میں ایک کامیاب خودنوشت سوانح حیات ہے۔

مصنف کے بچپن کے احوال میں ایک سادگی، جوانی کی کیفیات میں ایک عزم و حوصلہ، ملازمت کے ایام میں ایک جذبہ اور لگن اور زندگی کے اس آخری حصے میں ایک قومی اور ملّی قرض کو چکانے کی دھن

سوار دکھائی دیتی ہے۔ اکھرے بدن کے اس طویل قامت شخص کے کشادہ چہرے پر روشن آنکھیں اپنے اندر بلا کی چمک لیے ہوئے ہیں۔ اس کی پیشانی پر تفکّر کی لہروں کا ایک مدّ و جزر دکھائی دیتا ہے۔ اس کا ذہن اخّاذ اور دماغ خلّاق ہے۔ اس کے دل میں چھپی ہوئی سچائیوں نے اس کے اظہار میں لہجے کی ایک کھنک پیدا کر دی ہے۔ ایک سچا پاکستانی کیسا ہوتا ہے؟ زندگی کے مختلف مراحل میں اسے کس نوعیت کا کردار انجام دینا چاہیے؟ ملازمت کی روایتی زنجیروں کے باوجود حق و صداقت کا اظہار کیسے ممکن ہے۔ یہ سب جاننے کے لیے ''جہانِ حیرت'' کے باون ابواب ایک بہترین مطالعے کا لوازمہ فراہم کرتے ہیں۔ اپنے لوازمے کے تنوّع کے باعث یہ خودنوشت بیک وقت ایک تاریخی، سیاسی، اخلاقی اور یادگاری حیثیت رکھتی ہے، جس کا مطالعہ ہر عمر کے قاری کے لیے ایک پیغامِ عمل اور درسِ حیات ہے۔

''جہانِ حیرت'' میں مصنف نے اپنی زندگی کے چھپن سالوں کی روداد کو کئی حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ کوہ شوالک کے دامن میں بچپن کی بھول بھلیاں، تقسیمِ ہند کے تاریخ ساز مرحلے پر سفر آزادی اور ہجرت کی صعوبتوں کی تفصیل، تعلیمی مراحل، سول سروس کے مقابلے میں کامیابی کے بعد محکمہ پولیس کی ملازمت کے دوران میں اے ایس پی، ایس پی، سپیشل برانچ کے سربراہ اور انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب کی مختلف حیثیتوں میں کارکردگی، پاکستان کے معاشرتی کوائف میں جرائم کے اسباب و محرکات، محکمہ پولیس کی تنظیمِ نو کی ضرورت اور اصلاحات، عالمی شخصیات کے حوالے سے کلماتِ تحسین، سقوطِ مشرقی پاکستان کے ابلیسی کردار، ایوانِ صدر میں مخصوص عورتوں کی حکمرانی، پیپلز پارٹی کا دورِ حکومت، جمہوری پردوں میں آمریت کے نقشے، اسلامی سربراہی کانفرنس، فوجی حکومتوں کی آمریت کا المیہ، جنگِ افغانستان میں روسی ہزیمت کے عالمی اثرات، پاکستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی حقیقت، حصولِ اقتدار کی کشمکش میں مکروہ چہروں کی سیاست، ملکی سیاست میں ایجنسیوں کا کردار، مجرموں اور جرائم کے عبرت انگیز اعداد و شمار، جمہوری حکمرانوں کے غیر جمہوری اقدام، سیاسی قوتوں کی محاذ آرائی اور انتہائے آخر میں اپنے خاندانی کوائف کی ضروری تفصیلات فراہم کی ہیں۔ ان کوائف میں اپنی رفیقۂ حیات کے انتخاب، ازدواجی زندگی کی تفصیلات اور اپنی اہلیہ کی ناگہانی وفات کا نثری مرثیہ، سب لائق مطالعہ ہیں۔ مصنف کے قلم نے ان سب کوائف کو درستی اور سچائی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے ایک ایسے اسلوب اور ایک ایسی لغت میں لکھا ہے کہ جس نے ان

سب حقائق کو ایک الف لیلوی داستان کی طرح دلچسپ بنا دیا ہے۔ حقائق کے شکستہ آئینے کی کرچیوں کو پھر سے جوڑنے کا عمل، تخلیقی سطح پر ایک کرب انگیز مرحلہ ہے مگر چوہدری صاحب کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ موج در موج پھیلے ہوئے ایک قومی اضطراب کے المناک مناظر اور اقتدار کے ہوسناک کھیل میں، انہوں نے کسی جگہ کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ ان کی معاصر خودنوشت سوانح حیات کی کتابوں میں حقائق کی تاویل و تعبیر کچھ اس طرح سے کی گئی ہے کہ سچائی کو بین السطور میں تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے ''جہانِ حیرت'' ایک ایسا شہابِ ثاقب ہے جس نے ملکی تاریخ کے اضطراب انگیز وقائع کے تین عشروں کی ایسی ترجمانی، عکاسی اور نشاندہی کی ہے جسے کوئی منصور صفت مصنّف ہی تحریر کر سکتا تھا۔ مصنّف نے اپنے معاصرین کی طرح وقائع میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کوئی رومان پرور ماحول تخلیق نہیں کیا۔ حقیقت نگاری اور راست گفتاری کے اس عمل نے اس خودنوشت سوانح کو اردو زبان و ادب کے قارئین کے لیے ایک بیش قیمت خزینہ بنا دیا ہے۔ چند تاریخی دستاویزات اور اہم تصاویر نے اس کے حسن و معنی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را

من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

9، اکتوبر 2003ء

پروفیسر عبدالجبار شاکر

ڈائریکٹر ''بیت الحکمت''، لاہور۔

پیش گفتار

یہ کتاب زیادہ تر ان حالات و واقعات کا آئینہ ہے جو اس دوران میرے دیکھنے یا سننے میں آئے، جب ہماری مُلکی تاریخ کے انتہائی اہم واقعات میں سے بہت سے وقوع پذیر ہو رہے تھے۔ اسے جزوی طور پر میری آپ بیتی یا خودنوشت بھی کہا جاسکتا ہے۔

مجھے اس زمانے میں بھی اقتدار کے ایوانوں اور غلام گردشوں میں جانے کے مواقع ملے جب میں اعلیٰ پولیس سروس کے ابتدائی عہدوں پر یعنی بطور A.S.P یا S.P کام کر رہا تھا۔ اس کے بعد اعلیٰ عہدوں خصوصاً سپیشل برانچ (پنجاب پولیس) کے سربراہ اور انسپکٹر جنرل آف پولیس کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے مجھے کئی بار ملک کے مفاد کی خاطر سیاست کا رخ موڑنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ عام لوگوں کا ذہن بدلنا آسان بات نہیں ہوتی چہ جائیکہ ایسے سینئر بیوروکریٹس کو ان کی رائے بدلنے پر آمادہ کیا جائے جو عوام پر حکومت کرنا اپنا موروثی حق سمجھتے ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ہر جگہ طرح طرح کی چالیں چلی جارہی تھیں اور نت نئے حربے استعمال کئے جارہے تھے۔ جبکہ حق بات صرف ایک تھی اور مشکلات نیز بحرانوں سے نکلنے کا واحد راستہ بھی صرف سچائی کا راستہ ہی تھا۔

زندگی پے در پے الجھنوں کا نام ہے۔ پولیس افسر کے لیے خاص طور پر بہت زیادہ' کیونکہ اسے ہمیشہ مشکلات سے گزرنا اور بحرانوں سے کھیلنا پڑتا ہے۔ اگر پولیس والے ڈائریاں نہیں رکھتے اور اپنے افکار وحالات کو قلمبند نہیں کرتے تو اس میں حیرت یا تعجب کی کوئی بات نہیں۔ جو کچھ ان پر گزرتی ہے' وہ اسے من و عن تحریر کرتے چلے جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ اگر کوئی شخص ریٹائرمنٹ کے بعد اس کام کا بیڑا اٹھائے تو حافظہ ساتھ نہیں دیتا۔ اس سلسلے میں اگر کوئی عملی کوشش کی جائے تو وہ بڑی جانکسل اور کٹھن ہوتی ہے۔ کانچ کے ٹکڑوں کو جوڑنا آسان تو نہیں۔

میرے دل میں کئی بار خیال آیا کہ برصغیر پاک و ہند کی تحریکِ آزادی کے پس منظر میں اپنی ابتدائی زندگی کی جدوجہد قلمبند کروں' لیکن سستی اور کاہلی ہر بار آڑے آتی رہی۔ پولیس سروس کے دوران جو واقعات میرے مشاہدے میں آئے انہیں قلمبند کرنے کے بارے میں 1971ء سے پہلے کبھی نہیں سوچا

تھا۔ اس سال کے دوران جو کچھ پیش آیا اس نے مجھے نہ صرف جھنجوڑ کر رکھ دیا بلکہ یوں کہیے کہ بدل ہی ڈالا۔

آغازِ کار

میرے انتہائی قریبی دوست عبدالحمید جن کا نام اے حمید کے طور پر کتاب میں بار ہا آیا ہے' زور دیتے رہتے تھے کہ میں اپنے مشاہدات و تجربات کو قلمبند کر دوں تو اس سے آنے والی نسلوں کو بڑا فائدہ پہنچے گا۔

1971ء میں جب پے در پے تاریخی واقعات رونما ہو رہے تھے' انہوں نے کئی بار تجویز کیا کہ ان حالات کی اندرونی کہانی کو ضبط تحریر میں لانا چاہیئے۔ کیونکہ اقتدار کے اندرونی حلقوں میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے معدودے چند افراد ہی باخبر تھے۔

1971ء کے وسط میں امریکہ کے وزیرِ خارجہ ہنری کسنجر راولپنڈی سے خفیہ سفارتی مشن پر پیکنگ (موجودہ بیجنگ) گئے جس کے نتیجہ میں دو بڑی طاقتوں کے مابین سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ اس تاریخ ساز اور انتہائی خفیہ دورہ کے سیکورٹی انتظامات راقم الحروف کے ذمے تھے۔ اس یادگار اور کامیاب دورے کے بعد اے حمید کا اصرار اور بھی بڑھ گیا کہ مجھے آپ بیتی لکھنے کی ابتدا کر دینی چاہیئے۔ اس کے چند روز بعد مجھے امریکہ کے سفیر مقیم اسلام آباد کی طرف سے اظہارِ تشکر پر مبنی مراسلہ موصول ہوا تو اے حمید نے تجویز پیش کی کہ اس مراسلے کو مجوزہ دلچسپ کتاب کی بنیاد بنا لیا جائے۔

ایک لحاظ سے ان کی بات درست تھی۔ میں نے مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کی چنگاریاں سلگتی دیکھی تھیں۔ اعلان تاشقند کے بعد بھٹو نے ایوب خاں کے خلاف جو احتجاجی تحریک چلائی' وہ بھی میری نظروں سے گزری تھی۔ یحیٰی خاں نے ملک کے ساتھ جو کچھ کیا' میں اس کا بھی عینی شاہد تھا۔ اس طرح میرے پاس کتاب کے لیے خاصا مواد موجود تھا۔ اس کے بعد بھی بہت سے واقعات ظہور پذیر ہوئے' ان سب کی تفصیل میں جانا تو کجا' مختصر ذکر کرنا بھی محال تھا۔

اسے میری خوش قسمتی سمجھئے یا بدقسمتی کہ بہت سے واقعات کا عینی شاہد بننا میری قسمت میں لکھ دیا گیا تھا۔ 1971ء میں بعض طاقتور مسخروں اور مزاحیہ اداکاروں کی فاش غلطیوں اور حماقتوں سے ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ میں نے ان مسخروں کی اداکاری کا بہت قریب سے لیکن انتہائی بے بسی و مجبوری کے ساتھ مشاہدہ کیا۔

ملک کے ٹوٹنے پر پوری قوم کے ساتھ میں بھی بے بس تھا۔ ان لوگوں کے سوا میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ وہ لوگ انتہائی طاقتور تھے اور سنگ و آہن کی فصیلوں میں محفوظ تھے۔ میں نے بھٹو کے عروج و زوال کا مسحور کن ڈراما بھی بہت قریب سے دیکھا۔ ان کا انجام ایک پرانے یونانی المیہ کے طور پر ہوا جو بظاہر ان کی تباہ کن غلطیوں کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد ''حق کی روشنی'' تاریکی کی صورت میں ملک پر چھا گئی۔ اسی دوران افغانستان کی جنگ ہوئی۔ مارشل لا کے تحت عدلیہ کا قتل ہوا۔ ہیروئن کی لعنت عام ہوئی۔ کلاشنکوف کلچر کو فروغ ملا۔ مارشل لا کے کچلنے والے پہیوں اور آہنی ہاتھوں نے قانونی اداروں اور قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کا قیمہ بنا دیا۔ اسلام کا صحیح اور غلط استعمال کیا گیا اور قوم کو بدترین قسم کا ریاستی جبر و تشدد برداشت کرنا پڑا۔

اسی زمانہ میں بین الاقوامی دہشت گردی کی لہر ابھری۔ ہم نے جس بے ڈھنگے طریقے یا کامیابی سے اس کا مقابلہ کیا وہ سب کے دیکھنے میں آیا۔ اس کے بعد بڑی طاقتوں اور کوتاہ اندیش حکمرانوں نے فرقہ وارانہ تشدد کو جس طرح ہمارے خلاف استعمال کیا' وہ منظر بھی دیکھنا پڑا۔ بعد ازاں غیر جماعتی انتخابات کے ذریعے بدعنوانی و کرپشن کے عفریت کو کھلی چھٹی دے دی گئی تا کہ فوجی قیادت ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان رہ سکے۔ اس حکمتِ عملی نے قوم کو نہ صرف مستقل طور پر گروہوں میں تقسیم کر دیا بلکہ وہ جہالت و پسماندگی کے گرداب میں بھی پھنس گئی۔ گویا اس دور میں بہت سے ایسے دلچسپ اور جوڑ توڑ پر مبنی واقعات نظروں سے گزرے جن کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے نواز شریف کے بتدریج سیاسی عروج کا مشاہدہ کیا اور اپنی بساط کے مطابق اس میں کردار بھی ادا کیا۔ جب 1993ء میں انہیں اقتدار سے محروم کر دیا گیا تو اتنا کچھ دیکھا کہ مزید دیکھنے کی ہمت نہ رہی۔ میرے پاس اپنے مشاہدات و تاثرات کی صورت میں اس قدر مواد جمع ہو گیا کہ کئی کتابیں تصنیف کی جا سکتی تھیں۔

کتاب کا آغاز کیسے ہوا؟

اے حمید سالہا سال تک اصرار کرتے رہے اور میں یا تو اپنی سستی و کاہلی کے باعث یا بے پناہ مصروفیات کی بنا پر تحریر و تصنیف کے کام کو مؤخر کرتا رہا تا آنکہ 31 مئی 1993ء کو مجھے انسپکٹر جنرل آف پولیس کے عہدہ سے ہٹا کر او ایس ڈی (افسر بکارِ خاص) بنا دیا گیا۔ یعنی کھڈے لائن لگا دیا گیا۔ او ایس ڈی کی پوزیشن میں آدمی سارا دن اپنے گھر بیٹھا رہتا ہے۔ اُس سے کوئی سرکاری کام نہیں لیا جاتا۔ سارا دن گھر

پر پڑے رہنے سے مجھے تنہائی ڈسنے لگی کیونکہ گھر کی رونق اور میری شریکِ حیات ایک سال پہلے اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ میں نے اپنی کتابوں کی جھاڑ پونچھ کی اور فرصت کے لمحات کو غنیمت جان کران کا دوبارہ سہ بارہ مطالعہ شروع کر دیا۔ پھر اپنے ایک صحافی دوست رفیق غوری کی فرمائش پر اپنی یادداشتیں کیسٹوں پر ریکارڈ کرائیں۔ اس کام میں 30 کیسٹ استعمال ہوئے اور کئی ہفتے لگ گئے۔ وہ بچارا اب تک اس شش و پنج میں ہے کہ 1800 صفحات پر مشتمل اس مسودہ کا کیا کرے جو میں نے اس کی آسانی کے لیے ٹیپ کرایا تھا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ اپنے بیٹے ہارون اور بیٹی صائمہ کی شادی کے انتظامات میں مصروف رہا۔ ان سے فارغ ہوا تو تنہائی نے پھر گھیر لیا۔ کئی راتیں مسلسل جاگ کر گزاریں۔ ایک لمحہ کے لئے بھی آنکھ نہیں لگی۔

15 جنوری 1994ء کی رات اسی طرح بے خوابی کی حالت میں بسر ہوئی۔ اگلی صبح کو پانچ بجے میں نے قلم سنبھالا اور کسی منصوبہ بندی کے بغیر جو جی میں آیا لکھنا شروع کر دیا۔ میں اپنے دماغ سے وہ بوجھ اُتارنا چاہتا تھا جس نے میری نیند حرام کر دی تھی تاکہ خود کو مصروف رکھ کر ڈسنے والی تنہائی سے چھٹکارا حاصل کر سکوں۔ اس ذہنی کشمکش کے دوران میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ ''میں کون ہوں؟'' پھر اس کا جواب تلاش کر کے اسے قلمبند کرنے بیٹھ گیا۔ اس مشق کے دوران جو کچھ نوکِ قلم پر آیا اس نے بہت سے سربستہ رازوں کو آشکارا کرنے والی زیرِ نظر کتاب کی شکل اختیار کر لی۔ یہ بہت سی المناک اور دردانگیز کہانیوں کا مرقع ہے۔ اگر اس کے مطالعہ سے آپ کی آنکھیں نم ہو جائیں تو میں آپ سے معذرت خواہ ہوں تاہم آپ کا کڑھنا اور آنسو بہانا آپ کے اور ہم سب کے کام آ سکتا ہے۔ ہمیں اپنی روح کو شگفتہ اور تروتازہ رکھنے کے لیے بعض اوقات واقعی رونا چاہیے۔

خیالات میں ربط و ہم آہنگی اور تحریر میں پختگی و روانی پیدا ہونے میں کچھ وقت لگا۔ میری بہو شارمین نے ایک آرام دہ میز، کرسیوں کا سیٹ، لکھائی کے دیگر لوازمات نیز مناسب روشنی کا انتظام کر کے میرے لیے ماحول کو انتہائی سازگار و معاون بنا دیا۔ تحریری کام کے دوران حسبِ فرمائش تازہ چائے کی مسلسل فراہمی اس پر مستزاد تھی۔ اس نے اعلیٰ درجہ کا ایک کراس پین بھی مجھے تحفہ کے طور پر پیش کیا۔ جس سے میں نے پورا مسودہ لکھا۔ میں اس کی محبت بھری توجہ پر بے حد ممنون ہوں۔ میں شوکت جاوید کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے پنجاب پولیس کی بابت حقائق اور اعداد و شمار فراہم کیے اور صلاح الدین نیازی کا بھی جنہوں نے سٹیشنری کا بندوبست کیا۔

میں روزانہ پانچ چھ گھنٹے لکھتا تھا۔ جن کے دوران فل سکیپ کے اوسطاً 10 صفحے لکھے جاتے تھے۔ میں نے اپنا روزمرّہ کا معمول جاری رکھا۔ البتہ کبھی کبھار کوئی بن بلایا مہمان آ ٹپکتا یا کسی غیر متوقع مصروفیت سے واسطہ پڑ جاتا تو کارکردگی کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ میں نے پہلے رف کام کیا۔ کیونکہ پیشتر ازیں میں نے کبھی اتنا زیادہ اور باقاعدگی سے نہیں لکھا تھا۔ بہر حال دو ہفتے کی مشق کے بعد میں خاصا سنبھل گیا۔

قلمکار کی کچھ اپنی مشکلات ہوتی ہیں۔ میرے لیے پہلی مشکل تو یہ ہی کہ ایک واقعہ کو کس طرح بیان کیا جائے؟ دوسری یہ کہ اسلوبِ بیان کو عام فہم اور آسان کیسے بنایا جائے؟ حمید صاحب نے جن کے ساتھ شام کی سیر کے دوران روزانہ تبادلہ خیال ہوتا تھا' اس کے دو حل تجویز کیے۔ ایک یہ کہ رات کو سونے سے پہلے اس واقعہ کا ایک خاکہ مرتب کر لیا جائے جسے صبح کو ضبطِ تحریر میں لانا مقصود ہو۔ دوسرے گفتگو کے الفاظ فعل مجہول کی ترکیب میں ڈھالنے کی بجائے من وعن اسی طرح نقل کر دیئے جائیں جیسے بولے گئے ہوں۔ یہ دونوں تجاویز بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ان پر عمل کرنے سے مجھ جیسے مبتدی کے لیے تیزی اور روانی کے ساتھ لکھنا ممکن ہو گیا۔

کام کچھ آگے بڑھا تو میرے دائیں بازو میں درد ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ کسی اسٹینوگرافر کی خدمات حاصل کر کے باقی مسودہ اسے ڈکٹیٹ کرا دیا جائے۔ لیکن اے حمید نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا۔ ناچار مجھے خود ہی لکھنا پڑا۔ میرے خادم محمد شریف کے مساج کرنے سے جو سالہا سال سے بڑی فرض شناسی کے ساتھ میری خدمت کر رہا ہے' بازو کے درد میں افاقہ ہو جاتا اور میں حسبِ معمول اپنا کام شروع کر دیتا۔ یہ سلسلہ کئی مہینے چلتا رہا یہاں تک کہ 13 اپریل 1994ء کو مسودہ مکمل ہونے پر جو 763 صفحات پر مشتمل تھا' میں نے آخری قسط اے حمید کے حوالے کر دی تا کہ وہ نظر ثانی کر لیں۔ مسودہ میں 100 صفحات کا اضافہ بعد کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

ادھر میں لکھتا گیا' ادھر مسودہ ٹائپ ہوتا گیا۔ ابتداء میں جو انتظام کیا گیا وہ رفتار اور معیار دونوں کے لحاظ سے غیر تسلی بخش ثابت ہوا۔ بعد ازاں اے حمید کے اکلوتے صاحبزادے عمر حمید نے جو ایم اے میں داخلہ لینے کے منتظر تھے' یہ ذمہ داری رضا کارانہ طور پر اپنے سر لے لی۔ وہ میرے لیے واقعتاً رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے۔ ان کی رفتار اور معیار دونوں بہت اچھے اور قابل ستائش تھے۔ وہ میرے خراب سوادِ تحریر کو بھی پڑھ لیتے تھے۔ میں ان کی انتھک محنت اور جذبہ ایثار و قربانی کے لیے ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

ٹائپنگ کے بعد ایڈیٹنگ کا مرحلہ آیا تو اس کا بیڑا اے حمید نے اٹھالیا۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ان کا ممنون ہوں۔ انہوں نے ایک ایسے مسودے کو بڑی مہارت اور سلیقے سے از سرِ نو مرتب کیا جو ایک طویل مقالے یا روداد کی شکل میں تھا۔ وہ گزشتہ 23 برسوں سے اس کتاب کے لکھنے کی فرمائش کرتے آ رہے تھے۔ اب انہوں نے اسے ایسی شکل دے دی جس پر میں بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں۔ انہوں نے ایک صابر وشاکر بزرگ کے سے صبر وتحمل کے ساتھ جس باریک بینی سے مسودہ کی ایڈیٹنگ کی وہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ میں کتاب کو اس انداز میں نہ لکھ سکتا تھا نہ ترتیب دے سکتا تھا۔ اندریں حالات میں میں انہیں علامہ اور علم کا کوہ گراں نہ کہوں تو کیا کہوں؟ اگرچہ انہیں یہ خطاب پسند نہیں۔ میں اپنے دوست اور رفیق کار سید اظہر حسن ندیم کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ انہوں نے حتمی مسودہ پر نظر ثانی کی۔ مسٹر وقار احمد بھی میرے اظہارِ تشکر کے مستحق ہیں جنہوں نے آخری مرحلہ پر مسودہ ٹائپ کیا۔

میں ملک کے ممتاز مترجم اور کہنہ مشق صحافی مجاہد لاہوری کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا اور قارئین کے لیے اسے سلیس وعام فہم اُردو کے قالب میں ڈھالا۔

سب کچھ حافظہ کی مدد سے

یہ کتاب میرے بچپن سے لے کر 31 مئی 1993ء تک کے حالات کا احاطہ کرتی ہے جس دن میں نے انسپکٹر جنرل آف پولیس کے منصب کا چارج چھوڑا۔ خدا کے فضل سے مجھے سارے اہم واقعات و تجربات مع ان کی تاریخ، مقام اور ان سے وابستہ افراد واضح طور پر یاد ہیں۔ میں نے کبھی ڈائری نہیں رکھی اور لکھی۔ یہ میرے حافظے کا کمال ہے تاہم آسکر وائلڈ کے بقول ''حافظہ ایک ایسی ڈائری ہے جو ہم سب اپنے ساتھ رکھتے ہیں'' اور وہ قدرتی ڈائری میرے پاس بھی بڑی اچھی حالت میں موجود ہے۔ اگر میں ان تمام واقعات کو قلمبند کرتا اور پوری تفصیل سے لکھتا تو کئی جلدیں بن جاتیں۔ اس لیے مجھے خیال آیا کہ کتنے لوگوں کو وہ ساری جلدیں پڑھنے کی فرصت ہوگی اور کون اتنے طویل صبر وتحمل کا مظاہرہ کرے گا؟ چنانچہ میں نے طے کر لیا کہ ہر واقعہ کو مع تفصیل رقم کرنا ضروری نہیں کیونکہ شیکسپیئر نے اپنے مشہور ڈراما ''ہملٹ'' میں کہا کہ ''اختصار ذہانت کی روح ہے۔''

میں نے اپنے کیریئر کے آغاز ہی سے خود کو کبھی بھی محض روزمرہ کے کام تک محدود نہیں رکھا۔ مجھے

اس سے ہٹ کر سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہوئے اخلاقی کشمکش اور مخمصوں سے بار بار واسطہ پڑا۔ سرکاری ملازم کو جو آج کل بڑی حد تک حکومت کا ملازم ہوتا ہے۔ روزمرہ کے کام میں بھی بہت سی اخلاقی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

میں نے اپنی رہنمائی آپ کرنے اور خود کو راہِ راست پر رکھنے کے لیے بعض اقدار اپنالی تھیں اور بعض نظریات و تصورات کو حرزِ جاں بنالیا تھا۔ ان میں سے بعض بچپن میں میرے والدین اور اساتذہ نے سکھائی تھیں جبکہ باقی زندگی کی جانگسل جدوجہد کے دوران میں نے خود سیکھیں۔ میں نے اپنی صلاحیت کے مطابق ان کی پیروی کی ہے، جس کے نتیجہ میں، میں ملک وقوم کے مفاد میں اپنا کردار ادا کرنے کے قابل ہوا۔

مجھے اپنے کیریئر سے زبردست ذہنی سکون ملا اور میں نے عام طور سے اسی طرح کام کیا جیسے میری خواہش تھی۔ بہرحال جب مخالف قوتیں کامیاب ہوگئیں تو بہت سی ناکامیوں اور مایوسیوں سے بھی سابقہ پڑا۔ زیرِ نظر کتاب میں مذکور بہت سے واقعات زمانہ حال سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے عین ممکن ہے بعض لوگوں کو ان میں اپنے کردار کا تذکرہ ناگوار گزرے۔ میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن ایسا کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں خود کو اپنے آپ کے سامنے اور قارئین کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہوں۔ مجھے سچائی بیان کرنی تھی۔ خواہ وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو۔ نکتہ چیں اپنا کام جاری رکھیں۔ میں نے کسی کے خلاف اسکینڈل بنانے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم بعض اسکینڈل قومی اہمیت کے حامل تھے۔ انہیں اُجاگر کرنا اور ریکارڈ پر لانا تاریخی لحاظ سے مجھ پر فرض تھا۔

بعض لوگوں کو شاید کچھ واقعات کی پوری تفصیل نہ ملے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اختصار کا حق ادا کرنے کے لیے کچھ باتیں نظر انداز کرنی پڑتی ہیں۔ میں نے واقعات بیان کرتے ہوئے کئی اہم شخصیات کا ذکر کیا ہے جو اس وقت موجود تھیں یا انہوں نے واقعات میں کوئی کردار ادا کیا۔ وہ ان واقعات کو مختلف زاویہ نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں سے اکثر بقیدِ حیات ہیں۔ اگر انہیں کسی واقعہ کے بیان میں کوئی سقم یا غلطی نظر آئے تو وہ اس کی تصحیح یا نشاندہی فرمادیں۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں گا۔ قومی اہمیت کے بعض واقعات کو اور بعض صورتوں میں ان کی تفصیلات کو ان کے نازک اور حساس ہونے کی بناء پر سردست نظر انداز کردیا گیا ہے۔ ان شاءاللہ ان کے متعلق پھر کبھی قلم اٹھاؤں گا۔ (آدمی ہمیشہ اگلی دفعہ کی اُمید رکھتا ہے اور کم از کم میں واقعی ایسی توقع رکھتا ہوں)

افسانوں کی تکذیب

میں نے معاملات کو ایک انسان کے طور پر دیکھا ہے اور تحریکِ آزادی کے زیر و بم سے نیز اس کے نتیجہ میں تشکیل پانے والے قومی مزاج سے بھی خاصا باخبر ہوں۔ ہمارے معاشرتی اور اخلاقی آدرشوں کو آمریتوں نے بری طرح پامال کر دیا ہے۔ انہوں نے قانون کا احترام ختم کیا اور اخلاقی اقدار کو مایا دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ میرے تجربات کا لب لباب اور نچوڑ یہ ہے کہ امنِ عامہ، عدل گستری اور اخلاقی اقدار پر عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ دباؤ ڈال کر یا لوگوں کو ڈرا دھمکا کر امن قائم نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اس نکتہ پر بار بار زور دیا ہے۔

پولیس کی اچھی کارکرگی اور جرائم پر کنٹرول اچھی حکومت کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر حکمران خود کو قانون سے بالاتر سمجھنے لگیں، آئین و قانون کی اعلانیہ خلاف ورزی کریں اور انہیں سزا سے تحفظ حاصل ہو تو پولیس نہ امن قائم کر سکتی ہے، نہ جرائم پر قابو پا سکتی ہے۔ اسے عدلیہ اور سیاسی نظام کی طرف سے مکمل حمایت حاصل ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر پولیس محض حکمرانوں کی تابع مہمل اور لونڈی بن کے رہ جاتی ہے۔ میں نے اس خرابی کی بارہا نشاندہی کی ہے اور اپنے تجربہ کی روشنی میں بعض تجاویز پیش کی ہیں۔

میں نے اس کتاب میں امن وامان کے قیام اور اس سے متعلق پیشہ ورانہ مسائل پر کھل کر بحث کی ہے۔ میرے خیال میں امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورت حال اور جرائم میں اضافہ کا اہم سبب یہ ہے کہ پولیس کو بنیادی ضروریات فراہم کرنے سے مجرمانہ غفلت برتی گئی۔ ظاہر ہے رستے ہوئے ناسوروں کا فوری علاج نہیں کیا جا سکتا۔ پولیس کو کم سے کم مطلوبہ معیار تک لانے کے لیے طویل اور سخت جدوجہد کرنی پڑے گی۔ میں انسپکٹر جنرل کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد صورتِ حال کی سنگینی اور وسیع پیمانہ پر خرابی کو پوری طرح سمجھ گیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ پولیس کی اصلاح، تعمیرِ نو اور تنظیم کی درستی پر کم از کم دس سال لگیں گے۔

میں نے اس کتاب میں انتظامیہ اور امن عامہ کے بارے میں بہت سے افسانوں اور دیومالائی کہانیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ ان میں سے ایک تصور جو سب سے زیادہ مقبول اور عام ہے وہ طاقت کی بالادستی سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً عام طور سے باور کیا جاتا ہے کہ امن وامان کی بحالی اور اسے برقرار رکھنے کے لیے مارشل لا بڑا موثر ہوتا ہے جب کہ میرے تجربہ کے مطابق یہ تصور سراسر غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مادی ترقی امن عامہ سے زیادہ اہم ہے۔ چنانچہ کسی بھی حکومت کی طرف سے بجٹ میں ''ترقیاتی منصوبوں''

اور امن عامہ کے لیے جو رقوم مخصوص کی جاتی ہیں ان کے موازنے سے صورتِ حال بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ جب تک معاشرہ کو امن و سکون میسر نہ ہو اور جرائم قابو میں نہ ہوں' قومی زندگی کا کوئی بھی شعبہ ترقی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ کوئی بھی تعمیر کنندہ یا سرمایہ کار شورش زدہ علاقہ میں جانا اور سرمایہ لگانا پسند نہیں کرتا۔ خواہ اسے وزارتِ خزانہ کی طرف سے کیسی ہی پُرکشش ترغیبات کیوں نہ دی جائیں۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ سرحدوں کا دفاع تمام چیزوں پر سبقت رکھتا ہے۔ کوئی بھی عوامی نمائندہ عوام کو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کرتا کہ سرحدوں کے دفاع کے لیے قرضوں کی ادائیگی کے بعد سب سے زیادہ فنڈ مختص کیے جاتے ہیں۔ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ ملک کو سال میں کتنی بار جنگ لڑنی پڑتی ہے؟ اس کے برعکس اسے مجرموں سے نمٹنے کے لیے روزانہ فورس استعمال کرنی پڑتی ہے۔ سوویت یونین کا شمار کئی دہائیوں تک دنیا کی سپر طاقتوں میں ہوتا رہا۔ کیا اس کی بے پناہ فوجی طاقت اندرونی امن قائم کرنے اور ملک کو متحد رکھنے میں کسی کام آئی؟ روس کا شیرازہ بکھرنے کے بعد ماسکو' پٹس برگ اور دوسرے بڑے شہروں میں جرائم کی تشویش ناک صورتِ حال سے اس سوال کا شافی جواب مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے افسانے مشہور ہیں۔ جن پر یقین رکھنا ہمیں انتہائی عزیز ہے۔ ہم قوم کو درپیش مسائل کا حل تلاش کرنے کی جستجو میں عوام کو ان کی اصل حقیقت سے آگاہ کرسکتے ہیں۔ ہمیں کم از کم اس کی ابتدا تو کرنی چاہیے۔

ہمیں ایک مہذب قوم کے طور پر زندہ رہنے کے لیے اپنے اخلاقی اصولوں اور آدرشوں کو دوبارہ اپنانا ہوگا۔ محض مادی ترقی سے مسائل حل نہیں ہوسکتے۔ وہ ہمیں انارکی کی طرف لے جائے گی۔ اسی طرح داخلی امن کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر کے ملک کے رقبہ کا ہر قیمت پر دفاع کرنے کی پالیسی آخرِ کار ہمیں تباہی سے ہمکنار کردے گی۔ جدید دنیا کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

میں اس کتاب کو اپنے پیارے اور محترم والدین نیز اپنی محبوب شریکِ حیات بلقیس کی حسین یادوں کے نام منسوب کرتا ہوں۔ اگرچہ وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ہیں' تاہم روحانی طور پر میں انہیں ہمیشہ اپنے اِرد گرد محسوس کرتا ہوں۔ رفتید ولے نہ از دل ما،

سردار محمد چوہدری

ابتداء ...... دسمبر 1994ء

تکمیل ...... نومبر 1997ء

باب 1

اللہ ھو

میاں محمد بخش مشکل مذہبی اور مابعدالطبیعاتی تصوّرات ایک پانچ سالہ بچے کو بھی سمجھانے کا ڈھنگ اور سلیقہ خوب جانتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں عالمِ دین اور صوفیٔ باصفا تھے۔ انہیں نہ صرف ہمارے گاؤں بلکہ آس پاس کے علاقے میں بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ہر شخص انہیں مرشد (روحانی پیشوا) کے معزّز لقب سے پکارتا تھا۔ میری باقاعدہ تعلیم کے آغاز سے پہلے انہوں نے ہی مجھے الفاظ کی عجیب وغریب دنیا اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے روشناس کروایا اور اُردو حروفِ تہجی لکھنا سکھایا تھا۔ یوں آپ اسے ایک دیہاتی بچّے کی ''رسم بسم اللہ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔

میرا گاؤں

ہمارا گاؤں کوٹھیڑہ جسوالان مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کی تحصیل اونہ میں کوہ شوالک کے دامن میں واقع تھا۔ (تحصیل اونہ کو بعدازاں نئے تشکیل پانے والے صوبہ ہماچل پردیش میں شامل کردیا گیا اور آج کل اسے ضلع کی حیثیت حاصل ہے) گاؤں کی آبادی ڈیڑھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب تقریباً برابر تھا۔ مسلمان تمام تر گوجر تھے' ماسوائے سیّدوں کے چند گھروں کے۔ اہلِ حرفت میں کریموںائی اور فقط ایک ترکھان مسلمان تھا۔ باقی لوہار' چمار اور جولاہے سب کے سب غیر مسلم تھے۔ ہندو آبادی زیادہ تر جسوال راجپوتوں اور چند برہمن خاندانوں پر مشتمل تھی۔ سکّھوں کا صرف ایک گھر تھا۔ گاؤں میں ایک مسجد اور دو مندر تھے۔ گاؤں کے لوگ امن وآشتی سے رہتے اور ایک دوسرے کی خوشی اور غمی میں شریک ہوتے تھے۔ سکھ خاندان کا ایک لڑکا جگند رسنگھ میرا کلاس فیلو اور دوست تھا۔

میرے طویل القامت اور بھاری ڈیل ڈول کے مالک نانا ہیرا بتایا کرتے تھے کہ ہمارا خاندان بلخ اور بخارا سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمارے اجداد وہاں سے نقل مکانی کرکے سوات' کاغان اور کشمیر کے راستے

پنجاب میں داخل ہوئے تھے۔ وہ دریائے کہار اور آس پاس کے علاقہ کی حسن و خوبصورتی کے متعلق پرانے گیت بھی سنایا کرتے تھے۔

میرے والد چوہدری دل محمد اپنے والدین عمر بخش اور ماڑو کی سب سے بڑی اولاد تھے۔ ان کے بعد چچا دھولو، غلام علی اور محمد دین کا نمبر تھا۔ ان کی اکلوتی بہن کریم بی بی جو عمر میں سب سے چھوٹی تھی، ٹوبہ ٹیک سنگھ کے رحمت علی کی زوجیت میں تھی۔

میری والدہ محترمہ کا نام رضیہ بی بی تھا جو ہیرا اور عظمت بی بی کی اولاد تھیں۔ انہیں اپنے اکلوتے اور بہت ہی چھوٹے بھائی فضل محمد سے بے پناہ محبت تھی اور والدین کے اُٹھ جانے کے بعد انہوں نے ہی ماں کی طرح اپنے بھائی کی پرورش اور دیکھ بھال کی تھی۔ ان کی ایک بہن بھی تھی جس کا نام دولت بی بی تھا۔

میری بڑی ہمشیرہ سردار بی بی مجھ سے تین سال بڑی ہیں جبکہ دوسری بہن رمضان بی بی اڑھائی سال چھوٹی ہیں۔ میں ان کا اکلوتا بھائی ہونے کی بنا پر ہمیشہ ان کی توجہ اور شفقت و محبت کا مرکز بنا رہا۔

مجھے اپنی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں کیونکہ ان دنوں تاریخ پیدائش، خصوصاً دیہات میں درج کرانے کا رواج نہیں تھا۔ البتہ ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول ٹوبہ ٹیک سنگھ سے جاری شدہ سرٹیفکیٹ میں میری تاریخ پیدائش 11 مارچ 1937ء درج ہے جو محض اندازہ پر مبنی ہے۔

قدرتی مناظر

ہمارے گاؤں کے آس پاس واقع پہاڑوں کو گھنے اور ہرے بھرے جنگلات نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہمالیہ کے سلسلہ کانگڑہ ہل کی برف پوش چوٹیاں ہمارے گاؤں سے صاف نظر آتی تھیں۔ پہاڑوں سے آنے والی ندیاں اور نالے نہ صرف ہمارے گھر کے پاس سے گذرتے تھے بلکہ سامنے اور دائیں طرف سے چھوتے بھی تھے اور ایک موسیقانہ آہنگ میں بہتے رہتے تھے۔

جنگل میں پائے جانے والے جانوروں میں شیر، بھیڑیا، لومڑی، گیدڑ، بندر، جنگلی پرندے، جنگلی گائے، سور اور تیتر وغیرہ شامل تھے۔ جنگلی جانور کثرت سے پائے جاتے تھے کیونکہ ہندوؤں کی خونریزی سے نفرت کے زیرِ اثر کوئی ان کا شکار نہیں کرتا تھا۔ بہت سے پرندوں خصوصاً موروں کو ہم اپنے ہاتھ سے دانہ کھلایا کرتے تھے۔

زمین زرخیز اور پیداوار خوب ہوتی تھی۔ علاقہ کی آب و ہوا معتدل تھی۔ پہاڑیوں پر اور وادیوں میں مختلف قسم کے پھلدار درخت لگائے گئے تھے۔ ان میں سے آم انتہائی شیریں اور لذیذ ہوتا تھا۔ وہ پھل ہر ایک کو مفت میسر تھے۔ جو پھل کھانے سے بچ جاتے انہیں ضائع کرنا پڑتا تھا کیونکہ انہیں منڈی تک لے جانے کے لیے کوئی ٹرانسپورٹ دستیاب نہیں تھی۔ بارشیں کثرت سے ہوتی تھیں اس لیے ندیاں عام نقل و حرکت میں بھی رکاوٹ بن جاتی تھیں۔ ہمارے گاؤں کے قریب نہ کوئی ریلوے لائن تھی نہ سڑک' قریب ترین ریلوے اسٹیشن ہوشیار پور تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے 35 کلومیٹر کا طویل فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔

ہمارے گاؤں میں پہلا جدید پختہ کنواں (Persian Well) ایک ہندو نے 1944ء میں لگوایا تھا جسے دیکھنے کے لیے دوسرے دیہات کے بچے' عورتیں بلکہ مرد بھی جوق در جوق آیا کرتے تھے۔ گاؤں میں ایک بڑا تالاب نما پرانا کنواں تھا۔ جس کے ایک طرف نیچے جانے کے لیے چوڑی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں تاکہ مویشی نیچے جا کر پانی پی سکیں۔

گھریلو صنعتوں میں گوجر رام جولاہے کی دستی کھڈی اور ایک سنار کی دکان شامل تھی۔ ایک مسلمان نے جس کا نام وزیرا تیلی تھا' تیل نکالنے والا کولہو بھی لگا رکھا تھا۔ میں سکول سے واپسی پر اکثر کولہو کی گدی پر بیٹھ کر لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ ہمارے گاؤں کے قریب سے ایک ندی گزرتی تھی جس کا نام سواں تھا۔ وہ کافی گہری اور تیز رفتار تھی۔ میں ماموں فضل محمد کی مدد سے اس میں اکثر نہایا کرتا تھا۔ برسات کے دنوں میں اس کا پانی کناروں سے اُچھل کر دور دور تک پھیل جاتا تھا۔ میں اس کی پُر جوش اور پُر شور لہروں کا گھنٹوں نظارہ کرکے خوش ہوتا تھا۔ اس سے میرے دل میں زندگی کی تیز رفتاری کا احساس پیدا ہوا (مجھے وہ ندی قطعاً پسند نہیں جو سست رفتار اور دھیمی ہو) میں شورش پسندی اور تیز رفتاری کو جسم میں خون کی گردش کی علامت سمجھنے لگا جس سے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ مجھے مضطرب اور پُر شور سواں بہت اچھی لگتی تھی۔ اس چیز نے آئندہ برسوں میں میرے اسلوبِ زندگی کو ڈھالنے میں بڑا کام دیا۔

سواں کے پار کانگڑہ ہلز کی برف پوش چوٹیاں اپنی پراسرار فراخی کے ساتھ واقع تھیں۔ جنہیں کالی دھار کہتے تھے۔ میری بڑی بہن اور میرا خیال تھا کہ ان کالے بلند پہاڑوں میں جن اور پریاں رہتی ہیں۔

ایک دفعہ مجھے اپنے والد کے ساتھ سواں کے پار ضلع کانگڑہ کے بعض مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے کچھ لوگوں خصوصاً سادھوؤں کو پہاڑوں میں بنائی گئی غاروں میں رہائش پذیر دیکھا۔ میں

پہلی بار ایک غار نما گھر میں داخل ہوا تو مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ باہر سے چھوٹا سا نظر آنے والا گھروندہ اندر سے خاصا وسیع و فراخ اور کئی کمروں پر محیط تھا۔ وہاں گندم اور مکئی پیسنے والی پن چکیاں لگی ہوئی تھیں۔ غار نما مکان بڑے دلکش تھے۔ تاہم مجھے قدرے پریشانی محسوس ہوئی کیونکہ ان میں رہنا قبر میں قیام کے مترادف تھا۔

میلے ٹھیلے

میلے دیہی زندگی کا لازمی جزو تھے۔ جو مختلف تہواروں خصوصاً بیساکھی وغیرہ منانے کے لیے لگتے تھے۔ ان میلوں میں تمام قوموں کے افراد جوش و خروش سے شریک ہوتے تھے۔ لوگ ڈھول کی تھاپ پر گھنٹوں ناچتے تھے۔ اس کو ڈھول کی دھمک کہتے تھے۔ سکھ دو ٹیموں کے مابین فی البدیہہ اشعار (بولیاں) کہنے کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ سکھ نوجوان اپنی داڑھیوں، رنگ برنگے کپڑوں اور زرد پگڑیوں کے ساتھ ناچتے ہوئے بہت بھلے لگتے تھے۔ جوان لڑکے کشتی، کبڈی اور گتکا کے مقابلوں میں جسمانی پھرتی اور جوانمردی کا مظاہرہ کرتے تھے۔

ان میلوں میں میرے لیے سب سے زیادہ دلچسپ چیز بازیگروں کے کرتب ہوتے تھے۔ میں ان کی اونچی چھلانگوں اور حیرت انگیز کرتبوں سے بے حد خوش ہوتا تھا۔ بہت سے لوگ مٹھائیوں اور پکوڑوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ گویے اور موسیقار اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر کے لوگوں کے دل بہلاتے تھے۔ نو عمر لڑکے، جوان اور بوڑھے ڈھول کی تھاپ پر ناچتے۔ وہ لڈی اور دھمال ڈال کر میلے کی رونق کو چار چاند لگا دیتے تھے۔

ہمارے بعض بڑے بوڑھے مذہبی بنیاد پر ایسی سرگرمیوں کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ عورتوں کو گانا بجانا نہیں سننا چاہیے کیونکہ راگی انہیں مسحور کر کے اپنے ساتھ بھگا لے جاتے ہیں۔

جسٹس بھگوان سنگھ

ہمارے بزرگوں کی روایت کے مطابق ہمارے گاؤں میں کبھی قتل یا کوئی دوسرا سنگین فوجداری جرم وقوع پذیر نہیں ہوا تھا۔ چھوٹے موٹے معاملات کو مقامی سطح پر پنچایت کے ذریعے نمٹا دیا جاتا تھا۔ گاؤں کی پنچایت تجربہ کار اور عمر رسیدہ بزرگوں پر مشتمل تھی۔

بھگوان سنگھ جسوال جو بڑی مرعوب کن شخصیت کے مالک تھے' گاؤں کی پنچایت کے سربراہ تھے۔ انہیں علاقہ کی سب سے زیادہ قابلِ احترام شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ میں انہیں اپنے سکول کے سامنے پیپل کے درخت کے نیچے پنچایت کی صدارت کرتے دیکھتا تو میرا دل احترام وارادت مندی کے جذبات سے لبریز ہو جاتا۔ وہ اہلِ دیہہ کے تمام جھگڑوں کا فیصلہ کرتے تھے۔ انصاف کے معاملہ میں ان کے ہندو ہونے کے باوجود مسلمانوں کو بھی ان پر پورا اعتماد تھا۔ وہ مقدمہ کی کارروائی اپنے دلکش سوادِ تحریر کے ساتھ ایک بڑے رجسٹر میں قلمبند کیا کرتے تھے۔ جو سرخ رنگ کے کپڑے میں لپٹا ہوتا تھا۔ ایک بار ان کے قلم میں روشنائی ختم ہوگئی تو انہوں نے مجھ سے دوات مانگ لی۔ اس وقت اتفاق سے میں ان کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے اس بات کو اپنے لیے باعثِ فخر اور انصاف کے معاملہ میں ایک ادنیٰ خدمت سمجھا۔

باہر سے آنے والے قبائلی

ہمارے گاؤں میں ہر سال موسمِ سرما میں ہمالیہ کی اترائی سے گادی قبیلہ کے لوگ آتے اور شاملاتِ دیہہ میں کیمپ لگایا کرتے تھے۔ وہ ہمارے لیے بالکل اجنبی تھے اور مختلف زبان بولتے تھے۔ میرے ہم عمر اکثر لڑکوں کا خیال تھا کہ وہ بالکل جداگانہ مخلوق ہیں کیونکہ اس وقت ہم اپنے گاؤں اور آس پاس کے چند دیہات کو ہی کل کائنات سمجھتے تھے۔

دوسرے قبائلی جو سردیوں کے دوران ہمارے گاؤں کے باہر ڈیرہ ڈالتے تھے۔ وہ افغانستان کے پاوندے تھے۔ وہ خشک میوے اور دوسری اشیاء فروخت کر کے گزر اوقات کرتے تھے۔ ہم انہیں گھومنے والے پہیوں پر چاقو' چھریاں تیز کرتے دیکھ کر محظوظ ہوتے تھے۔ ان کے اونٹ ہمیں سب سے زیادہ متاثر کرتے تھے۔ گادیوں اور پاوندوں کی عورتیں سونے چاندی کے بھاری زیور پہنتی تھیں۔ ان کے رنگ برنگے کپڑوں پر شیشے جڑے ہوتے تھے۔ ان میں سے بعضوں کے پورے بازو ٹھوس چاندی سے ڈھکے ہوتے تھے۔ ہمیں اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ اتنا بوجھ کیسے اٹھا لیتی ہیں۔

گاؤں کے لڑکوں کو قبائلیوں کے لمبے بالوں والے خونخوار کتوں کو جو رسیوں سے بندھے ہوتے تھے' دیکھنا بہت پسند تھا۔ ہم انہیں ''گدی کتے'' کہتے تھے۔ ہمارے بڑے بوڑھے ہمیں ان کتوں کے قریب جانے سے منع کرتے تھے' مبادا وہ حملہ کردیں۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ جن پہاڑوں پر گادی پٹھان رہتے ہیں وہاں شیر عام ہیں جوان کے دائیں بائیں گھومتے پھرتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے کتے ان قبائلیوں اور ان کے

مویشیوں کی شیروں سے حفاظت کرتے ہیں۔ اس قسم کی کہانیوں نے ہمارے خوف میں خاصا اضافہ کر دیا تھا۔

کتا پالنے کی خواہش

ہمارا گاؤں جنگل کے بالکل قریب واقع تھا' اس لیے غروبِ آفتاب کے بعد شیر اکثر حملے کرتے رہتے تھے۔ ایک رات ایک شیر ہمارے باڑہ میں گھس آیا اور ایک بکری کو لے جانے کی کوشش کی۔ معلوم نہیں میرے چچا محمد دین کو کس طرح بروقت پتہ چل گیا' انہوں نے بلم سے شیر پر حملہ کر دیا۔ میں نے شیر کے دھاڑنے کی آواز سنی تو ڈر کے مارے گھگی بندھ گئی۔ میں نے اپنا منہ چادر میں چھپا لیا۔ تھوڑی دیر بعد چچا نے واپس آ کر بڑے فخر سے بتایا کہ انہوں نے شیر کو بھگا دیا ہے۔ میں اس وقت بھی خوف سے کانپ رہا تھا۔ میں ڈر کے مارے ساری رات نہیں سو سکا۔ جبکہ چچا جان چارپائی پر لیٹتے ہی زور زور سے خراٹے لینے لگے۔ میں اٹھ کر ان کے پہلو میں جا لیٹا۔ لیکن وہاں بھی نیند نہیں آئی اور ساری رات آنکھوں میں کاٹنی پڑی۔

اگلی صبح میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ ہمیں ایک گدی کتا پال لینا چاہیے۔ میں نے انہیں رات کو باڑے میں شیر کے گھس آنے اور چچا محمد دین کے اس پر حملہ آور ہونے کی خوفناک کہانی سنائی تو وہ بھی ڈر گئیں۔ تاہم وہ مذہبی بنیاد پر گھر میں کتا رکھنے کے خلاف تھیں۔ جب میں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو وہ مان گئیں۔ چنانچہ میرے ابا جی کو پانچ روپے میں ایک گدی کتا خریدنا پڑا جو اس زمانے میں بہت بڑی رقم تصور کی جاتی تھی۔

طالب علمی کا زمانہ

اسکول میں ہندو لڑکے مجھ سے انتہائی حسد کرتے تھے کیونکہ میں پڑھائی میں ان سب سے بہتر تھا۔ یہ بات ان کے لیے بڑی ناگوار بلکہ ناقابلِ برداشت تھی کہ کوئی مسلمان طالب علم ان پر سبقت حاصل کرلے۔ تاہم اساتذہ نے جن میں ہیڈ ماسٹر لائق سنگھ اور ماسٹر بابو رام قابلِ ذکر ہیں' کبھی تعصب یا طرفداری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ دونوں ہندو تھے۔ وہ مجھ پر بڑے مہربان تھے اور انتہائی شفقت فرماتے بلکہ مجھ پر فخر کرتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر ہمیں حساب پڑھاتے تھے اور بابو رام اُردو۔ 1947ء میں ہمارا پرائمری اسکول سیکنڈری اسکول بن گیا۔

یکم جنوری 1943ء میری زندگی کا ایک یادگار دن تھا جب ہیڈ ماسٹر نے بڑے اعتماد کے ساتھ

منی آرڈرز سمیت ڈاک کی تمام ذمہ داریاں مجھے سونپ دیں۔ ڈاک خانے کی مہر پر ہر روز تاریخ بدلنا بھی میرے فرائض میں شامل تھا۔ اس کام میں عام طور پر تاریخ بدلنی پڑتی تھی، کبھی کبھار مہینہ بھی بدلنا پڑتا تھا۔ اس تاریخی موقع پر میں نے کسی کی مدد کے بغیر سال بھی تبدیل کر دیا جسے بڑا پیچیدہ معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے بقول میں نے وہ کام کر کے بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ انہوں نے میری حد سے زیادہ تعریف کی اور بہت سے لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کیا۔ جس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور خود اعتمادی بڑھی۔

سینئر طلبا کا خوف

جب میں نے پرائمری کے وظیفہ کے امتحان میں اپنی تحصیل اونہ میں پہلی پوزیشن حاصل کی تو بھاری بھرکم قد و قامت کے مالک انسپکٹر آف سکولز بابو رام داس مبارک باد دینے ہمارے گھر تشریف لائے۔ میرے دادا نے تازہ اور پسندیدہ آملہ کی، جو ہمارے علاقے میں کثرت سے ہوتے تھے۔ ایک ٹوکری ان کی نذر کی۔ انہوں نے وہ نذرانہ بڑی مشکل سے اس وقت قبول کیا جب دادا جان نے انہیں بتایا کہ آملہ کا مربہ بہت مزیدار بنتا ہے۔

میری دادی ماڑو نے انسپکٹر کو دیکھ کر رونا شروع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے لاڈلے پوتے کو کہیں دور لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ ان کی سادہ لوحی کا یہ عالم تھا کہ ابا جان سے اس بات پر جھگڑا کرنے لگیں کہ ان کے پوتے کو مزید تعلیم دلانے کا پروگرام کیوں بنایا جا رہا ہے۔ ان کے خیال میں پڑھائی کے بوجھ سے میری صحت خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ جب انہیں تفصیل سے سمجھایا گیا اور ان کے خدشات و تفکرات دور ہو گئے تو انہوں نے خوشی سے بچوں میں بہت ساری شکر بانٹی۔

ابتدائی طالب علمی کے دنوں میں میری دادی کھانا اور پھل لے کر اسکول پہنچ جاتیں اور چھٹی ہونے کا انتظار کرتیں۔ وہ باہر بیٹھی رہتیں اور اسکول بند ہونے پر میرے ساتھ پیدل گھر آتیں۔ راستہ میں دلچسپ اور مسحور کن کہانیاں سناتیں۔ مجھے پریوں کی کہانیاں سب سے زیادہ پسند تھیں۔ میں ہر روز خواہش کرتا تھا کہ جنگل میں پریاں نظر آئیں۔ لیکن میرا وہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔

ہندوؤں کے برعکس ہمارے گاؤں کے زیادہ تر مسلمان ان پڑھ تھے۔ میں نے تعلیم عام کرنے میں اپنا محدود کردار اس طرح ادا کیا کہ اپنے ماموں فضل محمد اور بہنوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا۔ ماموں فضل محمد

بعدازاں اپنے طور پر محنت کر کے صحیح معنوں میں خواندہ بن گئے اور تعلیمِ بالغاں کی پرزور حمایت کرنے لگے۔ پاکستان آنے کے بعد نئے گاؤں میں انہوں نے پڑھائی کے معاملہ میں کئی آدمیوں کی مدد کی۔

جدید ایجادات سے ناواقفیت

ہمارا گاؤں شہروں کی ''جدید'' دنیا سے الگ تھلگ واقع تھا۔ ہمارے علاقہ میں کوئی ریلوے لائن نہیں تھی اس لیے میں نے پہلی ٹرین پاکستان کو ہجرت کرتے وقت دیکھی۔

موٹر سائیکل

میں نے موٹر سائیکل پہلی بار 1943ء یا 1944ء میں اس وقت دیکھی جب ایک فوجی دستہ ہمارے گاؤں میں سے گزرا۔ ہم سب فوجی جوانوں کو سیدھی قطار میں مارچ کرتے ہوئے دیکھ کر بڑے متاثر ہوئے۔ ان کا انچارج بمبوکاٹ (موٹر سائیکل) پر سوار تھا۔ ہم کئی دن تک حیرت اور تعجب سے اس کا تذکرہ کرتے رہے۔

بائیسکل

ہمارے لیے بائیسکل بھی ایک غیر معمولی ایجاد تھی اور ہم اسے ''شیطانی چرخہ'' کہتے تھے۔ ہمارے دیہات میں سائیکل شاذ ہی نظر آتی تھی کیونکہ پہاڑی علاقہ میں اس کا استعمال آسان نہیں تھا۔

ہوائی جہاز

البتہ ہم نے ہوائی جہاز کو بارہا گاؤں کے اوپر سے گزرتے دیکھا۔ اوائل 1947ء میں جب ہر شخص مستقبل کے بارے میں پریشان تھا' ایک دن دیہاتیوں نے ایک چھوٹے طیارہ کو اپنے سروں پر سے گزرتے دیکھا۔ مسلمانوں نے بڑے فخریہ انداز میں کہا کہ اس میں مسلمانوں کے بادشاہ (قائداعظمؒ) سوار ہیں اور وہ مسلمانوں کی حفاظت کے لیے آئے ہیں۔ ہم نے اپنے بڑوں کی بات پر من وعن یقین کر لیا اور خود کو محفوظ سمجھنے لگے۔ میرے کزن سلطان اور میں نے بڑے وثوق سے کہا کہ مسلمانوں کا ہیرو کھڑکی میں سے جھانک کر ہمیں دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ ہم انہیں پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔ ہمارے لیے وہ خیال حقیقت سے زیادہ پُرکشش تھا۔

ہندو بھی اتنی ہی شدومد سے دعویٰ کرنے لگے کہ ہوائی جہاز میں پنڈت جواہر لال نہرو سوار ہیں۔

جو مسلمانوں سمیت سب کی حفاظت کے لیے علاقے کا دورہ کر رہے ہیں۔ جبکہ میرے دوست جوگندر سنگھ نے بڑے پراعتماد لہجہ میں مجھے بتایا کہ جہاز میں بابا گرونانک محو پرواز ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بابا جی کو دنیا سے رخصت ہوئے پانچ سو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔

بجلی

ہم گاہ بگاہ دریائے بیاس پر زیرِ تعمیر بھاکڑا ننگل ڈیم کے دھماکوں کی آوازیں سنا کرتے تھے۔ بھاکڑا ہمارے قریب ہی واقع تھا اور جوگندر نگر بھی اسی علاقہ میں تھا جہاں سے لاہور سمیت مختلف شہروں کو بجلی مہیا کی جاتی تھی۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر لائق سنگھ نے بجلی پیدا کرنے کے عمل کو بڑی وضاحت سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن ہمارے پلے کچھ نہیں پڑا اور یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ پانی سے بجلی کیسے پیدا کی جا سکتی ہے۔ جب ہم نے پانی سے بھرے ہوئے بادلوں میں بار بار خوفناک شعلے دیکھے تو قیاس کرنے لگے کہ جوگندر نگر کے پاس دریا میں بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا اور پانی میں سے بجلی نکلتی ہوگی۔

گراموفون

ہم نے گراموفون 1943ء میں پہلی دفعہ اس وقت دیکھا جب ہیڈ ماسٹر نے طلبا کو دکھانے کے لیے ایک گراموفون منگوایا۔ وہ "ہز ماسٹرز وائس" برانڈ کا تھا۔ اس گراموفون پر ایک کتے کی تصویر بنی ہوئی تھی جس میں کتے کو بڑی توجہ سے گراموفون سنتے دکھایا گیا تھا۔ ہم نے سمجھا کہ چالاک اور عیار قسم کے انگریزوں نے کسی مشین کے ذریعے اس کتے سے گانا گوایا ہے۔ بعض لڑکوں کی رائے اس سے مختلف تھی۔ اس موضوع پر ہمارے درمیان کئی دن تک گرما گرم بحث ہوتی رہی۔ لیکن ہم اپنے اساتذہ سے یہ مطالبہ نہیں کر سکے کہ وہ ہمیں مذکورہ مشین کے چلنے کی بابت وضاحت سے سمجھائیں۔ ہمارے اندر جاننے کی خواہش اور جستجو نہیں تھی۔ اس لیے اس قدر ہمت سے بھی کام نہیں لے سکے۔

ہاتھ سے گھمایا جانے والا گراموفون جس کی سوئی تین منٹ کا ریکارڈ بجنے کے بعد تبدیل کی جاتی تھی، آج کل کے بچوں کے لیے شاید آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھنے والی کوئی چیز ہوگی۔ اس کی جگہ بہت جلد 45 منٹ تک چلنے والے ریکارڈ پلیئر مارکیٹ میں آ گئے، پھر ریل ٹیپ ریکارڈر (Reel Tape Recorder) آئے۔ بعدازاں کیسٹ ماڈل خاصے مقبول ہوئے۔ آج کل ہمارے پاس کم پیکٹ

ڈسک (C.D) پلیئر' ڈی سی سی (Digital Compat Casset) اور منی ڈسک موجود ہیں۔ آدمی یہ سوچ کر انگشتِ بدنداں رہ جاتا ہے کہ ہم ایک ہی نسل میں ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔

میرے ایک کلاس فیلو نے جس کا نام گاندھی تھا' مجھے ترغیب دی کہ اپنے گدی کتے کو گانا سکھاؤں۔ ہم دونوں نے مل کر بہت مغز مارا لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ہم نے سوچا شاید ہماری ناکامی کا سبب یہ ہے کہ ہمارے کتے کا رنگ گرے ہے جبکہ گراموفون پر نظر آنے والا کتا سفید رنگ کا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ سفید فام لوگوں کی طرح صرف سفید جانور دماغ رکھتے ہیں۔ ہم سوچنے لگے کہ شاید اب ہم بہت زیادہ باخبر ہوگئے ہیں۔

ٹیلیگرام (تار)

اس زمانہ میں تار کو بری خبر (اکثر موت) کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ جب بھی کوئی تار آتا عورتیں اس کے مندرجات سے آگاہ ہوئے بغیر رونا پیٹنا شروع کر دیتیں۔ چنانچہ سرپنچ بھگوان سنگھ کے خاندان میں بھی ان کے بیٹے کا تار موصول ہونے پر ایسا ہی ہوا۔ جب وہ تار گاؤں میں انگریزی جاننے والے واحد آدمی ماسٹر سدو رام سے پڑھوایا گیا تو ہر شخص مسکرانے اور خوشی کا اظہار کرنے لگا۔ تار بھیجنے والے نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران اپنی خیر و عافیت کی اطلاع دی تھی۔ جس گھر میں چند منٹ پہلے آہ و بکا کا طوفان برپا تھا اب وہیں اظہارِ تشکر کے طور پر بچوں میں مٹھائیاں بانٹی جا رہی تھیں۔

ٹیلیفون

ٹیلیفون سے مجھے ہجرت کے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ میں واقفیت حاصل ہوئی۔ لیکن میں اس کو استعمال کرنے کے طریقہ سے اس وقت بھی نابلد تھا جب گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم رہا۔ ایک دفعہ ہم نے عظیم دانشور خلیفہ عبدالحکیم کو ایک تقریب میں شرکت کی دعوت دی۔ انہوں نے دعوت قبول کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ مقررہ تاریخ پر فون کر کے انہیں یاد دہانی کروا دوں۔ میں نے ایک دوست کی مدد سے ان کا نمبر تو ملا لیا لیکن بات نہیں کر سکا۔ میں اس قدر پریشان ہوا کہ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ آخر کار میرے دوست نے میری طرف سے بات کی جب کہ میں پسینے میں شرابور چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔

ریڈیو

سرپنچ بھگوان سنگھ کا بیٹا فوج میں ملازم تھا۔ وہ چھٹی پر آیا تو اپنے ساتھ ایک بہت بڑی مشین لایا۔ جس کا نام ریڈیو بتایا گیا۔ اس مشین میں سے لوگوں کے بولنے اور گانے کی آوازیں آتی تھیں۔ ہمارے لیے وہ سب کچھ ایک معجزہ سے کم نہیں تھا۔ جس نے ہمیں سرتاپا حیران و پریشان کر دیا۔

میں نے اس کی بابت اپنے روحانی مرشد میاں محمد بخش سے پوچھا۔ وہ لاہور میں رہ چکے تھے اور ان مشینوں کے متعلق بہت کچھ جانتے تھے۔ اس دانا اور جہاندیدہ شخص نے میری ذہنی الجھنوں کو دور کرنے میں بڑی مدد کی۔ میں اس کے ریکارڈنگ سسٹم کو سمجھ گیا اور یہ بھی کہ ریڈیو سیٹ ریڈیو سٹیشن سے صوتی اشارے کیسے وصول کرتا ہے۔ جب وہ باتیں میں نے دوسرے لڑکوں کو سمجھانے کی کوشش کی تو کسی نے بھی میری بات سے اتفاق نہیں کیا۔ میں نے خود کو پاگل کہلانے اور تضحیک کا نشانہ بننے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی۔

یہ ایک ابتدائی سبق تھا جو مجھے ٹیکنالوجی کو متعارف کرانے کے سلسلہ میں حاصل ہوا۔ نئی ایجادات لوگوں کو حیرت زدہ کر دیتی ہیں۔ وہ ان سے خوف کھاتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں کیسے کام کرتی ہیں۔ اپنی جہالت کے باعث وہ ان کی بابت جاننے اور اچھی طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ بچے بھی اسی قسم کے رویہ کا اظہار کرتے ہیں۔ جب تک گھر' سکول یا کسی دوسری جگہ ضروری سہولتیں فراہم نہ کی جائیں۔ میری نسل کے بہت سے لوگوں کو وی سی آر کے استعمال کا طریقہ نہیں آتا۔ تاہم ان کے پوتے اور پوتیاں اس کی جزئیات تک سے واقفیت رکھتے ہیں۔ خواہ انہوں نے اسکول جانا بھی شروع نہ کیا ہو۔

مجھے جدید آفس ٹیکنالوجی کو متعارف کرانے میں دقت کا عملی تجربہ اس وقت ہوا جب میں سپیشل برانچ کا چیف اور بعد ازاں پنجاب پولیس کا سربراہ بنا۔ ترقی کے لیے ٹیکنالوجی ناگزیر ہے تاہم انسانی ہچکچاہٹوں کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دفتری سامان کو پوری طرح استعمال میں نہیں لایا جاتا اور اسے پڑے پڑے زنگ لگ جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر لوگوں کو اس کے استعمال کا طریقہ نہیں آتا۔

بچپن کا دور

میں چونکہ اپنے خاندان میں واحد لڑکا تھا، اس لیے میرے والدین' چاچے' تائے' بہنیں اور دیگر افراد مجھ سے بیحد لاڈ پیار اور شفقت و محبت کا اظہار کرتے تھے۔ شاید میں بگڑ جاتا۔ لیکن میاں محمد بخش کی کڑی نگرانی اور ہجرت کے وقت مہاجر کیمپ نیز سفر کے دوران پیش آنے والی شدید مشکلات و مصائب کے باعث میں بھٹکنے سے بچ گیا۔ بہر حال مجھے قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں سے جو بہت زیادہ پیار ملا۔ اس نے میرے اندر خاصا اعتماد پیدا کر دیا۔ بچپن میں پیار میسر آنے کی بدولت میرے اندر جذباتی استحکام پیدا ہو گیا جس نے مستقبل کی ذاتی اور اجتماعی جدوجہد میں بڑا کام دیا۔ حسنِ اتفاق سے میرے اردگرد کا ہر شخص خواہ وہ خاندان کا رکن تھا یا خاندان سے باہر کا فرد تھا' بہت محنتی اور سنجیدہ مزاج تھا۔ ان کے زیرِ اثر میں بھی غیر سنجیدہ عادات واطوار اپنانے سے محفوظ رہا۔

زندگی میں اکلوتی شرارت

میں نے زندگی میں صرف ایک شرارت کی' وہ یہ کہ ایک دن اپنے کزن سلطان کے ساتھ مل کر سڑک کے ڈھلوان موڑ پر بڑے بڑے پتھر رکھ کر راستہ بلاک کر دیا۔ اس سڑک پر دن میں ایک بار بس گزرتی تھی۔ خوش قسمتی سے ڈرائیور نے حاضر دماغی سے کام لیا اور بس سنگین حادثہ سے بال بال بچ گئی۔ اس شرارت پر میری اس قدر مرمت ہوئی کہ میری تمام شوخیاں اور شرارتیں ہوا ہو گئیں۔ اس کے بعد میں نے زندگی کے معاملات کو سنجیدگی سے سمجھنا شروع کیا۔

مٹھائی کا شوق

مجھے بیلنے سے نکلتا ہوا گنے کا تازہ رس پینے کا بڑا شوق تھا۔ اگرچہ یہ تقطیر شدہ نہیں ہوتا تھا اور اس میں بعض غیر خالص اشیاء بھی شامل ہوتی تھیں۔ گرم گرم گڑ اس سے بھی زیادہ لذیذ ہوتا تھا جو مجھے بے حد پسند تھا۔

برف کے گولے

میں جلیبیاں بڑے شوق سے کھاتا تھا اور حلوائی کو جلیبیاں بناتے دیکھنا مجھے بے حد مرغوب تھا۔ ان دنوں میرے نزدیک سب سے عجیب چیز دودھ میں برف ڈال کر اس کے گولے بنانے کا ہنر تھا۔ جس

مشین سے ایسے گولے بنائے جاتے تھے اس کے ایک سرے پر شعلہ نکلتا تھا۔ اس لیے میں سمجھتا تھا کہ برف آگ سے تیار کی جاتی ہے جو میرے نزدیک بہت بڑا معجزہ تھا۔ اس وقت مجھے عملِ تبخیر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں گھنٹوں اس عمل کو دلچسپی سے دیکھتا رہتا۔

گیند کا کھیل

ایک بار ابا جان ہوشیار پور سے ربڑ کی گیند لے آئے۔ میں اسے سکول لے جاتا اور چھٹی کے بعد خوب کھیلتا۔ میں اسے ٹھوکر مارتا وہ دیوار سے ٹکرا کر واپس آتی تو کوئی نہ کوئی کیچ کر لیتا۔ ایک دن میں اسے پکڑنے میں ناکام رہا اور وہ گھنی جھاڑیوں میں جا گری۔

کانٹا چبھنے سے اس کی ہوا نکلتی دیکھ کر مجھے اس قدر صدمہ ہوا کہ کئی دن تک کفِ افسوس ملتا رہا۔ وہ میری زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا۔ اس لیے میں نے بقیہ زندگی کے لیے یہ سبق پلّے باندھ لیا کہ اکثر خوشیاں عارضی ہوتی ہیں اور ان میں دوسروں کو شریک کر کے ہی حقیقی مسرت حاصل کی جاسکتی ہے۔

اپنی پسند کا میدان

محکمہ جنگلات کے اہلکار زمین کو آباد کرنے کے لیے پہاڑی نالے/ندیوں پر (جنھیں مقامی زبان میں چوہا کہا جاتا تھا) پشتے باندھتے اور ڈیم بنایا کرتے تھے۔ تیز بارشوں سے بہہ کر آنے والی ریت اور گاد رکاوٹوں کے پیچھے جمع ہو جاتی اور زمین کو زرخیز بنانے میں مدد دیتی تھی۔ میں انجینئرنگ کے اس عمل کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔ پھر میں نے وہی کام خود کرنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے تن تنہا اپنے کھیتوں کے گرد پتھروں کی ایک دیوار بنائی جس کے پاس سے ایک ندی گزرتی تھی۔ اگلے موسمِ برسات میں ہمارا احاطہ تازہ مٹی سے اوپر تک بھر گیا۔ دادا جان میری اس کارکردگی سے بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے مجھے پورے گاؤں میں گھمایا اور لوگوں کے سامنے ایک مہم جو نوجوان کے طور پر پیش کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ وہ کھیت مجھے دے دیا گیا۔ جس میں دادا جان نے صرف میرے لیے کماد لگایا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے جس زمین کو زرخیز بنایا تھا اس کی مالیت 100 روپے ہو گئی ہے۔ میں خود کو بہت مالدار سمجھنے لگا۔

بہت سے لوگوں نے درخت کاٹ کر اور پہاڑیوں کو ہموار کر کے زرعی زمین بنائی۔ ایک دن میرے دادا جان کھدائی کر رہے تھے اور میں انہیں کسی سے کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ اچانک زمین اپنی جگہ سے سرکی اور ایک بڑا تودا ان کے اوپر آ پڑا۔ وہ پلک جھپکتے میں مکمل طور پر زمین تلے دب گئے۔ میں نے لوگوں کو

مدد کے لیے پکارا۔ میرے چاچے دوڑ کر آئے اور انہیں تودے کے نیچے سے نکالا۔ مجھے اس حاضر دماغی اور پھرتی سے کام لینے پر ایک روپیہ انعام ملا۔

غیبی امداد

یہ غالباً 1945ء کی بات ہے۔ میں اپنے ماموں فضل محمد کے ساتھ سواں نالے کے کنارے پر کھڑا موجوں کے زیر و بم سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یک لخت وہ پورا کنارہ جس پر ہم کھڑے تھے۔ اپنی جگہ سے سرک گیا۔ جس سے میرے ماموں نالے میں جا گرے۔ البتہ میں خشک زمین پر صحیح سلامت کھڑا رہا۔ حالانکہ ہم ایک ساتھ کھڑے تھے اور میں نے ان کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اٹھا کر مجھے طوفانی لہروں سے دور ماں کی گود میں ڈال دیا ہو۔ یہ پورا واقعہ عملی طور پر وقوع پذیر ہوا جسے میں نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ دیکھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کسی فرشتہ نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا ہے۔ میرے ماموں کو جو طغیانی میں بہتے ہوئے ایک کلومیٹر تک چلے گئے تھے۔ باہر نکلنے کے لیے زبردست تگ و دو کرنی پڑی۔

عرس پر دھمال ڈالنے والے فقیر

میاں محمد بخش ہر سال فتح پور مرال کے مقام پر جو ہمارے گاؤں سے قریباً 25 کلومیٹر دور تھا' اپنے پیر کا عرس منایا کرتے تھے۔ وہ بڑا اہم موقع ہوتا تھا۔ جس میں شرکت کے لیے لوگ دور دور سے پیدل ،گھوڑوں اور بیل گاڑیوں کے ذریعے آتے تھے۔ دوسرے دیہات کے عقیدت مند بھی اس مذہبی جلوس میں شامل ہو جاتے جو کلمہ کا ورد کرتا ہوا اور اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا پیر صاحب کے مزار پر جاتا تھا۔

فتح پور مرال جانے کے لیے ہم سواں کے دائیں کنارے سفر کرتے تھے۔ جو آگے جا کر دریائے ستلج میں مل جاتا تھا۔ ہم اونہ کے نزدیک نالے کو پار کرتے تھے۔ فتح پور وہاں سے 10 میل کے فاصلے پر تھا۔

عرس میں قوالی کا پروگرام سب سے زیادہ دلچسپ ہوتا تھا۔ جو ہمیں مسحور کر لیتا تھا۔ ایک دفعہ قوالی کے دوران میں نے چند درویشوں کو دائرے کی شکل میں ناچتے اور دھمال ڈالتے دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک بے ہوش ہو گیا اور دوسرا تنبو کی مدد سے اچھل کر پاس کھڑے ہوئے بانس پر چڑھ گیا۔ بعض دوسرے درویشوں نے بڑے زور سے دھمال ڈالی۔ میں انہیں دیکھ کر ڈر گیا اور بھاگ کر عورتوں کے حلقہ میں اپنی ماں

کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ ان نیک لوگوں کو "حال" پڑ جاتا ہے جس کے دوران میں انہیں اللہ کا دیدار ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد درویش نارمل حالت میں آ گئے۔ مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ قوالی بہت اچھی چیز ہے۔ گاؤں پہنچ کر بعض لوگوں نے قوالی کی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بات پیدا نہیں کر سکے۔ میں بھی تالیاں بجانے والوں میں شامل تھا۔ دوسروں کو شہ دینے کے لیے میں اب بھی بہت اچھی تالی بجا سکتا ہوں۔

طاقت کا مظاہرہ

1946ء میں پیر صاحب کے عرس سے واپسی پر میاں محمد بخش سائیکل کے کیریئر پر بیٹھ گئے جسے حکیم محمد رمضان چلا رہے تھے۔ میرے ایک کزن حسن نے جو کہ میرا ہم عمر تھا اور میں نے سائیکل کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تو تھک کر گر پڑا۔ لیکن میں پسینے میں شرابور ہونے کے باوجود دوڑتا رہا۔ یہاں تک کہ 10 کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم اونہ پہنچ گئے۔

میاں صاحب اور حکیم رمضان نے میرے حوصلے اور قوت برداشت کو بے حد سراہا اور دودھ جلیبیوں سے میری تواضع کی۔ میرے گھر والے بھی جو بیل گاڑی پر سوار تھے' جلد ہی پہنچ گئے۔ ان میں سے ہر ایک نے مجھے شاباش دی اور دل کھول کر تعریف کی۔ اس سے میری خود اعتمادی میں خاصا اضافہ ہوا۔

میرے ابو نے سوچا کہ اتنی دوڑ لگانے کے بعد مجھے تھوڑی دیر کے لیے سو جانا چاہیے۔ وہ مجھے ایک ہاسٹل میں لے گئے، جہاں میرا کزن پیر محمد طور رہتا تھا۔ وہ چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ مجھے اس وقت ہاسٹل کا کوئی تصور نہیں تھا۔ میری سوچ یہ تھی کہ بچے اپنے والدین سے دور رہ ہی نہیں سکتے۔ طور نے مجھے بتایا کہ ہاسٹل ان کے لیے گھر کی مانند ہے۔ میں نے دو دن ہاسٹل میں گزارے اور تیسرے دن اپنے گھر چلا آیا۔

میں نے اونہ کے ہاسٹل میں دورانِ قیام پہلی بار ہاتھی دیکھا تو اس کے ڈیل ڈول دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ طور نے قریب جا کر ہاتھی کو ہاتھ بھی لگایا۔ لیکن میں اس کے نزدیک جانے کی جرأت نہیں کر سکا۔ میں اس کی سونڈ اور لمبے لمبے دانتوں سے بطور خاص خوفزدہ تھا۔ میرے اس کزن نے آگے چل کر ایرونائیکل انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کیا۔ آج کل وہ امریکہ میں آباد ہے۔

ولی اللہ کو رشوت

ایک روز میرے ابو، دادا جان اور بعض دوسرے لوگ مالٹے کے باغ میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک نوجوان آیا اور دادا جان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ''باباجی! میں نے منت مانی ہے کہ اگر میری مسروقہ گائے مل گئی تو ولی اللہ کے مزار پر سوا روپے کی نیاز چڑھاؤں گا۔''

میرے دادا نے ازراہِ مذاق کہا:

''اگر چور نے پانچ روپے کی منت مان لی تو وہ بزرگ لازماً بدمعاش کی حمایت کریں گے اور تمہاری گائے کبھی نہیں ملے گی۔'' اس پر وہ نوجوان سٹپٹا کر رہ گیا۔

میں ان دنوں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس لیے دادا جان کے مذاق کو نہیں سمجھ سکا۔ مجھے اس نوجوان پر بڑا ترس آیا۔ میں نے سوچا وہ ولی اللہ انتہائی بدمعاش اور سنگدل ہوگا جس نے چور کی زیادہ رقم قبول کر لی۔ مظلوم نوجوان کو دادرسی کے لیے جسٹس بھگوان کے پاس جانا چاہیے۔

میں میاں محمد بخش کے پاس پہنچا اور انہیں اس بات سے آگاہ کیا کہ کس طرح ایک بزرگ زیادہ رقم کے بدلے ایک چور کی حمایت کر رہا ہے۔ میاں صاحب پہلے تو میری سادگی پر مسکرائے پھر تفصیل سے سمجھایا کہ اللہ کے ولی برے لوگوں کے نذرانے ہرگز قبول نہیں کرتے۔ نہ ہی وہ بدمعاشوں کی طرفداری کرتے ہیں۔ اس وضاحت نے مجھے مطمئن کر دیا اور میری ذہنی خلش دور ہو گئی۔

اسی دن شام کو گائے مل گئی۔ وہ چوری نہیں ہوئی تھی بلکہ جنگل میں گم ہو گئی تھی۔ گائے کا مالک ایک سادہ لوح نوجوان تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ میں روحانی طاقت رکھتا ہوں۔ اس نے مجھے چھوٹے پیر کے طور پر مشہور کر دیا اور ہر جمعرات کو اس گائے کا دودھ مجھے پیش کرنے لگا۔ مجھے اس کی سوچ بہت پسند آئی۔ اس وقت سے مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ اولیاء اللہ اور دوسرے نیک لوگ بدمعاشوں اور بدفطرت انسانوں کی حمایت نہیں کرتے۔ اس یقین نے آئندہ زندگی میں مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ میں اپنے ماتحت پولیس ملازمین پر ہمیشہ زور دیا کرتا تھا کہ وہ مجرموں کے خلاف شریف شہریوں کا تعاون حاصل کریں اور ان سے مدد لیں۔

روحانی استاد

گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخلہ لینے سے پہلے میاں محمد بخش کے درس میں شرکت میری سب سے بڑی مصروفیت ہوتی تھی۔ وہ نظم وضبط کے بڑے پابند تھے۔ نظم وضبط کی خلاف ورزی کرنے پر بعض اوقات مجھے مار بھی پڑتی تھی۔ جو میری والدہ کو بڑی ناگوار گزرتی تھی۔ جب بھی مجھے سزا ملتی وہ پریشان ہو جاتیں۔ وہ کسی درخت یا دیوار کے پیچھے کھڑے ہو کر رو دھو لیتیں کیونکہ وہ مرشد سے بات کرنے کی جرأت نہیں رکھتی تھیں۔ ایک دفعہ انہوں نے میری والدہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تو سخت ناراض ہوئے اور غصہ میں کہنے لگے:

''تمہیں ذرا احساس نہیں کہ بیٹے کے لیے شفقت کا یہ اظہار اس کی آئندہ زندگی میں نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔''

میں نے چھپ کر یہ باتیں سنیں تو والدہ پر بڑا ترس آیا۔ میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ آئندہ اپنی والدہ کو اس طرح بے عزتی کروانے کا موقع نہیں دوں گا۔

میرے مرشد بڑے رحم دل اور صابر وشاکر انسان تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا جو زندگی بھر میرے کام آیا۔ خصوصاً اسلام کی طرف میرے رجحان کا بنیادی سبب میاں صاحب ہی بنے۔ مجھے بہت بعد میں احساس ہوا کہ اس نوعمری میں ان کی صحبت نے میرے مذہبی اور اخلاقی رویوں کو باقاعدہ تعلیم سے بڑھ کر متاثر کیا۔ وہ اکثر بڑی مؤثر کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ وہ بچوں سے سوال' جواب کی صورت میں بھی گفتگو کرتے تھے۔ ہماری ذہنی استعداد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بہت سادہ اور عام فہم زبان بولتے تھے۔

ابتدائی سوال

ایک بار انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ آیا میں اللہ میاں کی بابت کچھ جانتا ہوں؟ اس وقت میری عمر محض پانچ سال تھی۔ اس عمر کے بچے سے اس قسم کا سوال کرنا واقعی عجیب تھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ کہنے لگے:

''کیا تم اللہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟''

''بے شک'' میں نے بے ساختہ جواب دیا۔

''کیا تم نے اپنی ماں دیکھی ہے؟''

''ہاں'' میں نے جواب دیا۔

''کیا وہ تم پر مہربان ہے؟ کیا وہ تمہیں پیاری لگتی ہے؟ کیا وہ تمہیں پینے کے لیے دودھ دیتی ہے؟ کیا وہ تمہیں کھانے اور دل بہلانے کے لیے گڑ دیتی ہے؟''

مُرشد اس قسم کے سوال پوچھتے رہے، میں ہر بار ''ہاں'' میں گردن ہلاتا رہا۔ حتیٰ کہ مجھے اپنی ماں، محبت وشفقت کا کامل مجسّمہ لگنے لگیں۔ جب میری حیرت انتہا کو چھونے لگی تو انہوں نے بڑی سادگی سے فرمایا: ''محبت اور شفقت میں سو مائیں بھی مل کر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔'' اس وقت 100 کا عدد ہی میرے نزدیک سب سے بڑا تھا۔ اس لیے ان کی بات نہیں سمجھ سکا۔ بعد ازاں جب میں نے علامہ شبلی نعمانی کی عظیم تصنیف ''سیرۃ النبیؐ'' کا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ میاں صاحب نے وہ تمثیل خود رسول اکرم ﷺ سے نقل کی تھی۔ انہوں نے اس قسم کی تشریحات میرے ذہن میں غیر محسوس طور پر اور ہمیشہ کے لیے بہت گہری پیوست کر دی تھیں۔

پاکستان کو ہجرت کے بعد میاں صاحب موضع جھبراں ضلع شیخوپورہ میں آباد ہوئے اور جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میں اب بھی روحانی طور پر اپنے گرد ان کی موجودگی اکثر محسوس کرتا ہوں۔



باب 2

ہجرتِ پاکستان

1943ء میں قحط کے مارے کئی بنگالی خاندان نوراک اور پناہ کی تلاش میں ہمارے گاؤں پہنچے اور شاملات دیہہ میں کیمپ لگالیا۔ میری امّی چاول پکاتیں اور ابو یا ماموں غلام علی کے ہمراہ بنگالیوں میں تقسیم کرنے کے لیے لے جاتیں۔ ان لوگوں کو قحط سے پیدا ہونے والی فاقہ زدگی اوران گنت اموات کے باعث اپنے گھر بار سے نکلنا پڑا تھا۔ ان میں سے بعض چہرے آج بھی واضح طور پر میری نگاہوں میں پھرتے ہیں۔ اس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا کہ چند سال بعد ہمیں بھی مہاجر کیمپوں میں ان سے بدتر حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

1947ء کے موسم گرما کے دوران ایک صبح کو ہم پر ناگہاں قیامت ٹوٹ پڑی۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی یہ افواہ تیزی سے پھیل گئی کہ سکھوں نے ہمارے گاؤں پر ہلہ بول دیا ہے۔ خوف نے ہر شخص کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ میرے والد اور چچا گھر پر نہیں تھے۔ وہ گاؤں سے دور کسی جگہ پہرہ دینے گئے ہوئے تھے۔ ہمارا گاؤں پہاڑی علاقے میں واقع تھا اس لیے کسانوں نے ایک دوسرے سے دور مختلف پہاڑیوں پر گھر بنا رکھے تھے۔ آبادی کا وہ سلسلہ پنجاب کے دیگر میدانی علاقوں میں پائے جانے والی ہاؤسنگ اسکیموں سے یکسر مختلف بلکہ ان کے برعکس تھا۔

سکھوں کے حملہ کی خبر نے ہر شخص کو پریشان اور سراسیمہ کردیا۔ میری والدہ نے میری دونوں بہنوں کو اور مجھے ساتھ لیا اور گھر چھوڑ کر قریبی جنگل میں پناہ لے لی۔ کچھ وقت جنگل میں گزارنے کے بعد ہم چھپتے چھپاتے اور پہاڑیوں پر سے گرتے پڑتے موضع جہان کھیلاں پہنچے جہاں ہمارے بعض قریبی رشتہ دار رہتے تھے۔ وہ میرے پیشرو یعنی پنجاب کے سابق آئی جی لیئق احمد خاں کا آبائی گاؤں تھا۔ شام تک میرے والد اور خاندان کے بعض دیگر افراد بھی ہم سے آملے۔

دیکھتے دیکھتے وہاں مہاجرین کی ایک خاصی تعداد جمع ہوگئی۔ چند دن بعد ہم جیسے تیسے کر کے ہوشیار پور پہنچ گئے۔ وہاں کے اسلامیہ ہائی سکول میں آفت زدہ مسلمانوں کے لیے ایک مہاجر کیمپ بنایا گیا تھا۔ جہاں بھوک اور بیماری عروج پر تھی۔ ہر دوسرا شخص اسہال' پیچش' ہیضہ یا ٹائیفائیڈ بخار میں مبتلا تھا۔ کمزور' بڑے بوڑھے اور بچے سب سے زیادہ بیماریوں کا نشانہ بن رہے تھے۔ بعض ایسے افراد کو بھی جو چلنے پھرنے سے معذور تھے' ان کے اہلِ خاندان نے بحالتِ مجبوری مرنے کے لیے کیمپوں میں چھوڑ دیا۔ وہ بڑا خوفناک منظر تھا۔ ہر طرف موت اور مصیبت کا پہرہ تھا۔ وہ جگہ جلد ہی بے گوروکفن لاشوں سے اٹ گئی۔

چاروں طرف انسانی فضلہ اور غلاظت کے ڈھیر لگ گئے۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے ہمیں جنت سے نکال کر جہنم میں دھکیل دیا گیا ہے۔

ایک دن میں صبح سویرے اپنے چچا غلام علی اور چچی کے ساتھ رفع حاجت کے لیے کیمپ سے دور چلا گیا۔ اچانک سکھوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ میں بلوائیوں کو دیکھتے ہی سرپٹ بھاگا اور لوگوں کو مدد کے لیے پکارا لیکن سکھوں نے امداد پہنچنے سے پہلے ہی ان دونوں کو ذبح کر دیا۔ میں نے کھلی آنکھوں کے ساتھ دونوں کو خاک و خون میں تڑپتے اور موت کے منہ میں جاتے دیکھا تو خوف کے مارے بے ہوش ہو گیا اور ایسا بخار چڑھا کہ پاکستان پہنچنے کے بعد بھی یہ کئی مہینے تک چڑھتا رہا۔ بخار نے بگڑ کر ٹائیفائیڈ کی شکل اختیار کر لی جس کی شدت سے بعض اوقات میں بے ہوش ہو جاتا تھا۔ نیم بے ہوشی تو ہر وقت طاری رہتی تھی۔

میری شفیق ماں کے سوا سب میری زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ میں ان کی شفقتوں کو ہزار گنا بڑھا چڑھا کر بیان کروں تب بھی ان کی حقیقت بیان نہیں کر سکتا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)۔ ان کے تذکرے سے میری ڈھارس بندھتی اور میری اُمیدوں کو تقویت ملتی ہے۔ میرے دائیں بائیں رہنے والے بھی اللہ سے رحم و کرم کی دعا کرتے تھے۔ میں ہوش میں ہوتا تو دیکھتا کہ انہیں صرف پاکستان پہنچنے کی خواہش زندہ رکھے ہوئے تھی۔ خوف اور آلام و مصائب کے باوجود کوئی بھی اپنی منزلِ مقصود ترک کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ہمارے گاؤں سے ہندوؤں کا ایک وفد کیمپ میں آیا اور بڑی یقین دہانیاں کرانے کے بعد لوگوں کو اپنے ساتھ واپس لے جانے کی کوشش کی، لیکن کوئی بھی تیار نہیں ہوا۔ ہر شخص نئے وطن میں پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔

البتہ چچا ڈھولو اور چچی دولت بی بی کے خاندان نے ارادہ بدل لیا اور وہ اپنے آبائی وطن لوٹ گئے۔ سنا ہے کہ وہ اور ان کی آل اولاد وہاں اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ تاہم اتنی اچھی نہیں جتنی اچھی کہ پاکستان آ جانے والوں کو میسر آئی۔

موت اور تباہی کے درمیان سفر

ایک دن ہمیں بتایا گیا کہ ایک ٹرین ہمیں پاکستان لے جائے گی۔ لوگ ٹرین کے آنے سے پہلے ہی دیوانہ وار سٹیشن کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ پلک جھپکنے میں کھچا کھچ بھر گئی۔ بہت سے لوگ

چھت پر چڑھ گئے۔ وہ سفر موت کی وادی میں سے گزرنے کے مترادف تھا۔ ریلوے لائن کے دونوں طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ امرتسر پہنچنے کے بعد ٹرین کو آگے جانے سے روک دیا گیا۔ بتایا گیا کہ ڈرائیور سکھوں کے ڈر کے مارے آگے جانے سے انکاری ہے۔ گرمی اور حبس اپنی انتہا پر تھا۔ بہت سے افراد دم گھٹ کر مر گئے۔ ان کی لاشیں گاڑی سے نیچے پھینک دی گئیں۔

دوسرے دن شام کے وقت ٹرین پھر روانہ ہوئی۔ تاہم ایک ویران سے اسٹیشن پر رک گئی۔ رات کی تاریکی میں اچانک فائرنگ شروع ہوگئی۔ ہر کوئی خوف سے کانپنے اور لرزنے لگا۔ میری ماں نے مجھے اور میری بہنوں کو چادر سے ڈھانپ دیا گویا وہ ہمیں گولیوں سے بچالے گی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس پتلے سے کپڑے کے نیچے ہم نے خود کو سچ مچ محفوظ سمجھ لیا۔ والدہ مسلسل دعائیں مانگتی اور کلمہ و درود کا ورد کرتی رہیں۔

کچھ دیر بعد پاک آرمی کی بلوچ رجمنٹ کا ایک سپاہی ہمارے ڈبے میں داخل ہوا اور ہمیں تحفظ کا یقین دلایا۔ میں نے سمجھا کہ اللہ نے اس فوجی کو میری ماں کی دعاؤں کے جواب میں بھیجا ہے۔ وہ ایک رحم دل اور شفیق انسان تھا۔ میری والدہ نے اسے ہزاروں دعائیں دیں۔ اس اکیلے مجاہد کی فائرنگ نے وہ کمال دکھایا کہ سکھ خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے اور ٹرین پھر چل پڑی۔

ہم جونہی سرحد کے پار اٹاری کے آخری اسٹیشن پر پہنچے لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجانا' بلند آواز سے کلمہ پڑھنا اور اللہ اکبر کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ میں اگرچہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا' تاہم اللہ اکبر کے نعرے لگانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جس سے مجھے زبردست طاقت اور تحفظ کا احساس ملا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں موت کی وادی سے گزر کر زندگی کے میدان کی طرف جا رہا ہوں۔

جس وقت ہماری ٹرین سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہوئی سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس وقت میرے ذہن نے پاکستان کو زندگی' اُمید اور پناہ کی علامت سمجھا۔ یہ ہمارے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر تھی۔

بوا بھلی کے بارے میں تشویش

اسلامیہ ہائی سکول کیمپ (ہوشیار پور) چھوڑنے سے پہلے ہم سے ایک ٹرین مس ہوگئی۔ اس کی وجہ ایک بوڑھی رشتہ دار عورت کی بابت میری ماں کی تشویش تھی۔ میری والدہ کو کسی نے بتایا کہ بوا بھلی کو جو کہ

نہ بول سکتی تھی' نہ چل سکتی تھی اور گذشتہ آٹھ سال سے مفلوج زندگی گزار رہی تھی' اس کے آٹھ بیٹے کیمپ میں چھوڑ کر پاکستان چلے گئے ہیں۔ میری والدہ نے اصرار کیا کہ وہ مفلوج بڑھیا کو ساتھ لیے بغیر ٹرین میں سوار نہیں ہوں گی۔ بہت سے لوگوں نے انہیں سمجھایا کہ ٹرین میں سوار ہونے سے رہ گئے تو یہیں مارے جائیں گے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''میں اپنی مفلوج پھوپھی کو یہاں چھوڑ کر جانے پر موت کو ترجیح دوں گی۔ اسے یہاں چھوڑ کر جانا انتہا درجے کی سنگدلی اور شقاوت ہوگی۔''

ناچار لوگوں کو ان کی بات ماننا پڑی۔ میرے ابا گئے اور مذکورہ بڑھیا کو کیمپ کے دوسرے حصہ میں سے ڈھونڈ کر اپنی کمر پر بٹھا کر لے آئے۔ بعد میں جو معجزہ رونما ہوا وہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ بوا بھلی جو بوجہ فالج گذشتہ آٹھ سال سے بولنے سے معذور تھی' ہمارے کیمپ میں پہنچ کر اچانک بولنے لگی۔ اس کے چند دن بعد وہ کیمپ میں ہی اللہ کو پیاری ہوگئی اور اسے اجتماعی قبر میں دفنا دیا گیا۔

اس کے بعد دوسرا معجزہ یہ رونما ہوا کہ ہماری ٹرین سے پہلے جانے والی گاڑی کو جس پر بوا بھلی کے جلد باز اور لاپروا بیٹے سوار تھے اور جو ہم سے مس ہوگئی تھی' دریائے بیاس کے کنارے روک کر سارے مسافروں کو تہہ تیغ کر دیا گیا جبکہ ہماری ٹرین بخیر وعافیت واہگہ پہنچ گئی۔ اگر ہم بھی پہلی گاڑی میں سوار ہوتے تو خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔

جب ہماری ٹرین دریائے بیاس کو پار کرنے لگی تو میرے دادا خوف سے نڈھال ہوگئے۔ انہوں نے دریا کے کنارے لاشوں کا ڈھیر دیکھا۔ دریا کا پانی انسانوں کے خون سے سرخ ہو گیا تھا۔ دادا جان نے یہ سوچ کر کہ قتل ہونے والے ان کے عزیز واقارب تھے' دریا میں چھلانگ لگا کر زندگی ختم کر لینے کی کوشش کی' تاہم انہیں بروقت پکڑ لیا گیا۔ دریا میں تیرتی ہوئی لاشیں ان لوگوں کی تھیں جو بدترین قسم کے سیلاب میں بہہ گئے تھے۔ کیونکہ بے تحاشا بارشوں سے نالوں نے دریاؤں کی شکل اختیار کر لی تھی اور دریا سمندر بن گئے تھے۔ بہت سے مہاجر کیمپ سیلابی ریلے کی لپیٹ میں آ کر نیست ونابود ہوگئے۔

ہر لمحے موت کا حقیقی خطرہ موجود تھا' تاہم میری والدہ بڑی سختی سے اخلاقی اقدار پر قائم رہیں۔ ان کے پھوپھی زاد بھائیوں کے قتلِ عام کو ہمارے خاندان میں اب بھی یاد کیا جاتا ہے۔ جو لوگ اس وقت کیمپ میں تھے وہ اس بات پر آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ انہیں یقینی موت سے اس معذور بڑھیا کی پُرخلوص

دعاؤں نے بچا لیا جسے میری والدہ نے ساتھ لانے کی انتہائی کوشش کی تھی۔

منتشر اجزا کی شیرازہ بندی

پاکستان پہنچنے پر ہمیں لاہور کے قریب والٹن کیمپ میں ٹھہرایا گیا۔ وہاں کے حالات بڑے ناگفتہ بہ تھے۔ تاہم دل کو اطمینان اور تسلی تھی کہ مشن مکمل ہونے کے بعد پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ چند دن بعد ہم ملتان روڈ پر واقع مرا کہ نامی گاؤں میں چلے گئے جہاں ہم نے چند مہینے قیام کیا۔ وہاں سے ٹوبہ ٹیک سنگھ منتقل ہو گئے جہاں میری خالہ کریم بی بی کی قیامِ پاکستان سے بہت پہلے شادی ہو چکی تھی۔ میرے والد کو گزراوقات کے لیے کچھ عرصہ تحصیلدار ٹوبہ ٹیک سنگھ کے دفتر میں چپڑاسی کی نوکری کرنی پڑی۔

ان دنوں زندگی بڑی کٹھن تھی۔ ہمارا خاندان انتہائی خراب حالات سے گزر رہا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کو بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے محنت مشقت کرنا پڑتی تھی۔ میں نے بھی ایسے کاموں میں حصہ لیا اور خاندان کی روزی میں اضافہ کرنے کے لیے والدین کا ہاتھ بٹایا' میں نے کئی کام کیے۔ پہلے قریبی ریلوے سٹیشن پر قلیوں کا کام کیا۔ پھر میں دال روٹی بیچنے کے لیے بس اڈہ پر جانے لگا۔ پھر کچھ عرصہ ردّی کاغذوں سے لفافے بنا کر دکانوں پر بیچے اور یوں روزی کمائی۔ کچھ مہینے اس طرح گزارے کہ میری بڑی بہن چنبیلی کے پھولوں سے ہار بنا دیتی اور میں انہیں بیچ آتا۔ چند مہینے ایک چھوٹے سے ٹی سٹال پر نوکری کی۔ جہاں مجھے چائے کے برتن دھونے پر دس روپے ماہوار اُجرت ملتی تھی۔

عزتِ نفس کو برقرار رکھنا

انتہائی غربت و تنگدستی کے باوجود میرے والدین نے اپنی عزتِ نفس برقرار رکھی۔ خواہ انہیں گھاس اور پتے کھا کر گزارہ کرنا پڑا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میری والدہ خود سبز پتے کھا کر گزراوقات کرتی رہیں تاکہ میں اور میری بہنیں کبھی کبھار میسر آنے والی سوکھی روٹی سے پیٹ کی آگ بجھا سکیں۔ اس کے علاوہ وہ بڑی فراخ دل اور فیاض تھیں۔ گھر میں کچھ نہ ہونے کے باوجود کسی حاجت مند کو مایوس لوٹانا گوارا نہیں کرتی تھیں۔ جو کچھ بھی پاس ہوتا محتاجوں میں بانٹ دیتیں۔ ابا جان کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی۔ لیکن ان کا اللہ پر اس قدر پختہ ایمان تھا کہ ہمیشہ بڑے اطمینان سے کہا کرتی تھیں۔ ''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ ہمیں سب کچھ دے گا۔ وہی سب سے بڑا دینے والا ہے۔''

جن دنوں ہم لاہورر کے قریب مراکہ میں قیام پذیر تھے اور ہمارے شب و روز بڑی تنگ دستی میں کٹ رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ زمین پر گرا ہوا بیر تک اٹھانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ بیر کا درخت کسی اور کی ملکیت ہے۔ اس لیے وہ کسی کا بیر کھانے کی بجائے بھوکا رہنے کو ترجیح دیں گی۔ میری والدہ ہمیشہ سچائی اور اخلاقی اقدار پر زور دیتی تھیں۔ وہ ہمیں ہر وقت نصیحت کیا کرتی تھیں کہ:

''کسی کی چیز مت چراؤ' ہرگز جھوٹ نہ بولو۔''

انہوں نے زندگی بھر اس منشور پر عمل کیا اور ہماری زندگی پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مراکہ میں قیام کے دوران ایک دن میں نے ایک کھیت میں سے کچا پیاز اکھاڑ لیا۔ پیاز کو چوری اکھاڑتے وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے اور ساری دنیا مجھے دیکھ رہی ہے۔ دیانتداری کی قدر و قیمت میرے ذہن میں اس طرح نقش کر دی گئی تھی کہ معمولی سی چوری کے باعث مجھے شدید بخار چڑھ گیا اور میں کئی دن پریشان رہا۔

ایسے خراب لیکن اخلاقی لحاظ سے بلند ماحول میں آنکھ کھولنے کی بنا پر میں زندگی بھر سخت جدوجہد کرنے سے کبھی نہیں ہچکچایا۔ اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ مجھے میری محنت کا بہت اچھا صلہ مل چکا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے جس کی بدولت ایک بندۂ ناچیز بلند مرتبہ عہدوں پر فائز ہوا۔

اسکول میں دوبارہ داخلہ

میرے والدین مجھے اسکول میں داخل کرانے کے خواہشمند تھے۔ چنانچہ میں نے ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول ٹوبہ ٹیک سنگھ کی پانچویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔ میں نے وہاں بہت اچھی کارکردگی دکھائی اور اپنی کلاس کے بہترین طلبا میں شمار ہونے لگا۔

ہمارے سکول کی عمارت انتہائی خستہ تھی۔ اس میں نہ فرنیچر تھا' نہ ٹاٹ اور چٹائیاں۔ کوئی لیبارٹری تھی نہ لیٹرین۔ عمارت بجائے خود ناکافی تھی۔ ہم سردیوں میں کھلے میدان میں فرشِ زمین پر اور شدید گرمیوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر پڑھتے تھے۔

مادی وسائل کی کم یابی اور دیگر مشکلات کے باوجود اساتذہ کا شخصی کردار اور اپنے فرض سے لگن

قابلِ تعریف تھی۔ وہ وقت کے پابند اور انتہائی دیانتدار اور اصول پسند تھے۔ جماعت میں نقل لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ناجائز شخصی فائدہ اٹھانے کی بابت سوچنا بھی گناہ تھا کیونکہ اخلاقی اقدار بڑی مضبوط تھیں اور وہ ملک کے بارے میں مخلصانہ سوچ رکھتے تھے۔ طلبا کے دلوں میں بھی اعلیٰ خیالات موجزن تھے اور وہ اچھے پاکستانی بننے کے لیے سخت محنت کرتے تھے۔

مثالی استاد - شیخ غلام قادر

سکول کا ماحول شر پسند عناصر کو اپنا کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ 1953ء میں قادیانیوں کے خلاف تحریک کے دوران ایک طالب علم نے غالباً باہر کے کسی آدمی کی شہ پر یہ افواہ پھیلانے کی کوشش کی کہ ہمارا ہیڈ ماسٹر قادیانی ہے۔ سکول کے ہر آدمی نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور شرارت کامیاب نہ ہوسکی۔ ہمارے ایک مثالی استاد شیخ غلام قادر تھے جو ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ چھٹی کے بعد بھی ہمیں روک لیتے تھے۔ وہ منتخب طلبا کو اینگلو ورنیکلر فائنل امتحان کی تیاری کراتے تھے تاکہ وظیفہ کے امتحان میں کامیاب ہوکر سکول کا نام روشن کرسکیں۔ اس مقصد کے لیے وہ چھٹیوں کے دوران بھی ہمیں اپنے گھر پر پڑھاتے تھے۔ ٹیوشن فیس لینے کی بجائے وہ ہمیں اپنے گھر سے کھانا بھی کھلاتے تھے۔

ماسٹر غلام قادر بڑے فرض شناس اور مخلص استاد تھے۔ ایک صبح کو ہم پڑھنے کے لیے ان کے گھر پہنچے تو یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ ان کی صاحبزادی فوت ہوگئی ہے۔ ہمارا خیال تھا کم از کم آج پڑھائی نہیں ہوگی اور ماسٹر صاحب چھٹی کریں گے۔ لیکن ہماری سوچ غلط نکلی۔ انہوں نے قبرستان سے واپس آ کر حسبِ معمول ہمیں پڑھانا شروع کردیا اور اپنے اوپر گزرنے والی قیامت کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

ان کا یتیم پوتا غوث اس وقت محض شیر خوار بچہ تھا۔ بعدازاں میں نے اُسے پولیس میں بھرتی ہونے میں مدد دی۔ آج کل وہ ایک مستعد اور دیانتدار پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے طور پر کام کررہا ہے۔ اپنے دادا کی شاندار روایات پر عمل کرنے کی بنا پر اس کی اعلیٰ عہدوں تک ترقی یقینی ہے۔

میں ایک اچھا مقرر تھا اس لیے مختلف تقریبات کے موقع پر میری ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی تھی۔ مجھے تقریر کرنے کا فن ماسٹر غلام قادر نے ہی سکھایا تھا۔ ایک بار انہوں نے 15 صفحات پر مشتمل تقریر لکھی اور ساتویں جماعت کے پانچ طالب علموں کو یاد کرنے کے لیے دی۔ انہوں نے ہمیں کہا کہ "باہر

کھیتوں میں نکل جاؤ۔ وہاں فصلوں اور درختوں کو سامعین تصور کر کے ان سے خطاب کرو۔'' انہوں نے ہمیں یہ نصیحت بھی کی کہ سامعین سے ہرگز خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ لوگوں کا ہجوم کچھ نہیں سوچتا وہ صرف سننے کے لیے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی قطعاً پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ہم سے کوئی غلطی سرزد ہوجائے تو وہ ہرگز نہیں پکڑ سکتے۔ خود کو ان سے برتر اور اس تقریب کا اصل روحِ رواں سمجھنا چاہیے۔

میں نے ان کی باتوں پر حرف بحرف عمل کیا۔ میں کھیتوں میں چلا گیا اور درختوں کو مخاطب کر کے بلند آواز سے تقریر کرنے لگا۔ یوں تھوڑی سی دیر میں پورے پندرہ صفحے یاد کر لیے۔ اگلے دن ماسٹر صاحب نے پہلا صفحہ سنانے کو کہا تو میں نے پوری تقریر ہی سنا دی۔ جس کے دوران صرف ایک غلطی ہوئی۔ ماسٹر صاحب بڑے حیران ہوئے اور مجھے جینیئس (نابغۂ عصر) قرار دیا۔ مجھے اس لفظ کے معنی نہیں آتے تھے۔ نہ ہی ان سے پوچھنے کی ہمت تھی۔ دوسرے روز میرے کلاس فیلو راجہ رفیق نے بتایا کہ ''جینئس'' کے معنے ہیں ''شیطان'' مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس وقت مجھے اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔

یومِ آزادی پر پولیس کی کارروائی

ان دنوں ہر سال 14 اگست کو یومِ آزادی ہر جگہ بڑی دھوم دھام اور جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔ آزادی کی اہمیت کے موضوع پر ایمان افروز تقاریر ہوتی تھیں۔ میں طلبا کے پسندیدہ مقررین میں سے ایک تھا۔ پاکستان پر یقین ہی ہمارا سب سے بڑا سرمایہ تھا۔ ہم اس عزم کا پُرزور الفاظ میں اعلان کیا کرتے تھے کہ وطنِ عزیز کو ایک مضبوط اور خوشحال ملک بنائیں گے۔ یہ اتنی بڑی حقیقت تھی کہ انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں رہتے ہوئے بھی میں اسے واضح طور پر محسوس کیا کرتا تھا۔

لیکن 1958ء میں نفاذِ مارشل لا کے بعد ایمان و ایقان سے بھرپور وہ جذبہ اچانک ہوا میں تحلیل ہوگیا۔ اگلے سال یعنی 14 اگست 1959ء کو میں نے لوگوں کو اداس، افسردہ اور اپنے اصل خیالات کے اظہار سے گریزاں پایا۔

میں نے اپنی تقریر میں مارشل لا کو بدترین اقدام قرار دیا جس نے ہماری آزادی سلب کر لی جو ہم نے بڑی جدوجہد سے حاصل کی تھی۔ لوگوں نے زوردار تالیاں بجائیں اور بعد میں مجھے کندھوں پر اُٹھا کر پورے بازار میں جلوس نکالا۔ شاید یہ چیز مقامی انتظامیہ کو ناگوار گزری۔ چنانچہ جونہی جلوس ختم ہوا پولیس

نے میری خوب ٹھکائی کی۔ شاید وہ مجھے جیل بھیج دیتے لیکن شہر کے ایس ڈی ایم' جناب کے ایم اے صمدانی نے جن کے زیرِ صدارت جلسہ ہوا تھا مداخلت کر کے میری گلوخلاصی کرادی۔ صمدانی صاحب بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے جج بنے۔ اس کے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ میں یومِ آزادی منانے پر پابندی لگادی گئی۔

ان دنوں یومِ آزادی پر والی بال ٹورنامنٹ دوسرا اہم واقعہ ہوا کرتا تھا۔ ملک بھر کی منتخب ٹیمیں تین روزہ ٹورنامنٹ میں حصہ لینے کے لیے ٹوبہ ٹیک سنگھ آیا کرتی تھیں۔ وہ بڑا ہیجان خیز ٹورنامنٹ ہوتا تھا۔ اس دور کے نمایاں افراد میں سے میاں عبدالخالق' چوہدری زمان' چوہدری عبدالحمید اور عبدالکریم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پولیس میں بھرتی ہونے کے بعد پتہ چلا کہ ان میں سے میاں عبدالخالق کے سوا سب پولیس کے آدمی تھے۔ ٹورنامنٹ نے والی بال سے میری دلچسپی میں اضافہ کیا اور میں بہت اچھا کھیلنے لگا۔ کبڈی اور گلی ڈنڈا میرے پسندیدہ کھیل تھے۔

حاسد کلاس فیلو

راجہ محمد رفیق اور بشیر احمد عرشی سکول میں میرے بہترین دوست تھے۔ دونوں امتحان میں نمایاں پوزیشن حاصل کرتے تھے۔ بعد میں رفیق سروے آف پاکستان میں ملازم ہوگئے جبکہ عرشی نے اپنے دانشورانہ لگاؤ کے باعث معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔

1952ء میں وظیفہ کے امتحان کے لیے ماسٹر غلام قادر نے جن چار طلبا کا انتخاب کیا ان میں راشد' ضیاء اور راجہ رفیق کے علاوہ میں بھی شامل تھا۔ راشد اپنے گاؤں سے میرے پاس آ گیا تا کہ ہم مل کر تیاری کر سکیں۔

ایک دن ضیاء کو حساب کے بعض سوالات حل کرنے میں دقت محسوس ہوئی تو اس نے مجھ سے مدد مانگی۔ میں نے پورا دن اس کے ساتھ گزارا اور اسے مشکل سوال حل کرنے کا طریقہ سمجھایا۔ وہ بہت خوش ہوا اور میرا شکریہ ادا کرنے لگا۔

ضیاء کے چلے جانے کے بعد راشد نے مجھ سے پوچھا کہ

"آپ نے اس کی مدد کیوں کی؟"

"کیونکہ وہ ہمارا ہم جماعت اور دوست ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"لیکن وہ ہمارا حریف بھی تو ہے"۔ راشد نے قدرے غصہ سے کہا۔

''تمہاری مدد کی بدولت وہ زیادہ نمبر حاصل کر کے تمہیں شکست دے سکتا ہے۔ مجھے تم نرے کودن لگتے ہو''۔

اس کے ان ریمارکس پر مجھے زبردست افسوس ہوا۔ میں نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا:

''نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے' ہمیں کسی کی ترقی پر حسد نہیں کرنا چاہیے۔''

ان دنوں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بجلی نہیں تھی۔ ہم لالٹین کی روشنی میں تیاری کیا کرتے تھے۔ میں نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ:

''علم اس لالٹین کی مانند ہے۔ اگر آپ اس سے دوسری لالٹین روشن کر لیں تو اس کی روشنی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔''

میں نے راشد کو یہ بھی بتایا کہ میاں محمد بخش نے ہمیں سکھایا تھا کہ'' ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے' اپنے فضل سے نواز دیتا ہے۔'' بہر حال راشد میری وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا۔

جب نتیجہ نکلا تو میں سکول میں اول آیا۔ ہمارے واجب الاحترام ہیڈ ماسٹر جناب حبیب احمد خاں کے بقول میں نے سکول کے قیام سے اس وقت تک 26 سال کی مدت میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے۔

ضیاء فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس کے متعلق آخری بار سننے میں آیا کہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا بریگیڈیئر بن گیا ہے۔ راشد گورنمنٹ کالج لاہور میں لیبارٹری اسسٹنٹ بن گیا اور اب بھی وہیں کام کر رہا ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس کا سب سے بڑا بیٹا میڈیکل ڈاکٹر ہے۔

میری غیر معمولی کامیابی کی خوشی میں ہمارے سکول میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت ملک محمد اسلم تحصیلدار ٹوبہ ٹیک سنگھ نے کی۔ ان کا بیٹا اصغر ملک سکول میں میرا ہم جماعت تھا۔ شہر کے معروف تاجر اور فلاحِ عامہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے شیخ محمد یوسف نے بھی تقریب میں شرکت کی۔ وہ میری تقریر سے بڑے متاثر ہوئے اور بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے حصول میں میری بڑی مدد کی۔

چند دن بعد نئے تحصیلدار شیخ محمد اسلم نے اپنے عہدہ کا چارج سنبھالا تو وہ میرے والدین کو مبارکباد دینے ہمارے گھر آئے۔ انہوں نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انڈیا میں متروکہ اراضی

کے عوض ہمیں کچھ زرعی زمین بھی الاٹ کردی۔ انہوں نے میرے والد سے میرے متعلق یہ کہہ کر ان کا حوصلہ بڑھایا کہ ”پاکستان کو سردار محمد جیسے لائق نوجوانوں کی ضرورت ہے۔“

تحصیلدار صاحب نے مجھے ترغیب دی کہ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے لارنس کالج گھوڑا گلی میں داخلہ لے لوں کیونکہ مجھے مذکورہ کالج میں حصولِ تعلیم کے لئے =/75 روپے ماہوار وظیفہ مل گیا تھا۔ تاہم شیخ محمد یوسف نے مشورہ دیا کہ میں خود کو اس ادارہ کے امیر اور شہری لڑکوں میں ایڈجسٹ نہیں کرسکوں گا۔ ممکن ہے احساسِ کمتری کا شکار ہو جاؤں۔ اس لیے اپنے معیار کے کسی دوسرے کالج میں داخلہ لے لوں میں نے ان کے مشورہ پر جو سو فیصد درست اور برمحل تھا' عمل کیا اور لارنس کالج میں داخلہ لینے کا ارادہ ترک کر دیا۔

مذہبی اور سیاسی اثرات

میں نے قرآن حکیم اپنی والدہ اور میاں محمد بخش سے پڑھا۔ بعد ازاں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں شاہ جی اور سکول میں عربی کے ٹیچر عبدالصمد سے مزید تعلیم حاصل کی۔ ان دونوں استادوں نے مجھے دیوبندی افکار سے روشناس کرایا جبکہ ہمارا خاندان بریلوی مکتبِ فکر کا پیروکار تھا۔ ان متضاد اثرات کے باعث میں نے اعتدال کی راہ اختیار کرلی۔

حاجی محمد اکرم سیکرٹری ٹوبہ ٹیک سنگھ میونسپل کمیٹی بڑے دیندار آدمی تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ تبلیغی جماعت کے اجتماعات میں لے جاتے تھے۔ جہاں میں بڑی مؤثر تقریر کیا کرتا تھا۔ وہ میری تقریروں سے اتنے متاثر ہوئے کہ مجھے فلپس بائیسکل لے دی تاکہ میں زیادہ دیہات میں جاسکوں اور سامعین کی بڑی تعداد کو خطاب کرسکوں۔

چونکہ میرا زیادہ تر وقت مذہبی لوگوں کی صحبت میں گزرتا تھا' اس لیے میں نے 1953ء میں مرزائیوں کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پولیس آتی تو ہم بھاگ جاتے البتہ علماء گرفتاریاں پیش کرتے۔ ایک بار ہم پوری طرح پولیس کے نرغہ میں آگئے تھے لیکن میں کسی نہ کسی طرح کھسک جانے میں کامیاب ہوگیا۔

میں کالج کے زمانہ میں جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ میں شرکت کرنے سے گریزاں رہا۔ البتہ گورنمنٹ کالج میں جمعیت کی شاخ قائم کرنے میں اسلامیہ کالج کے پروفیسر عثمان غنی کی

مدد کی۔ ہم جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملنے کئی بار اچھرہ گئے۔ میں مولانا کے تبحر علمی اور دلنشیں تقریروں سے بہت متاثر ہوا۔ ان کے صاحبزادے عمر فاروق گورنمنٹ کالج میں میرے ہم جماعت تھے۔

دینی طبقہ سے گہری رسم وراہ رکھنے کے ساتھ ساتھ میری انتہا پسند سیاسی گروہوں سے بھی آشنائی تھی۔ میجر (ریٹائرڈ) خوشی محمد اور سید محمد (ہمارے ہیڈ ماسٹر حبیب خاں کے صاحبزادے) نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک کمیونسٹ سیل قائم کیا تو میں ان کے سیل میں شامل ہو گیا' تاہم ان کے خیالات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا کیونکہ وہ اللہ کو محض واہمہ قرار دیتے تھے۔ میں نے ان کے دو تین اجلاسوں میں شرکت کے بعد ان سے علیحدگی اختیار کر لی۔

دینی عقائد کی طرح سیاسی معاملات میں بھی میں نے درمیانی راہ یعنی اعتدال پسندی کو اختیار کیا۔ مسلم لیگ مجھے جذباتی اور عقلی لحاظ سے سب سے زیادہ اپیل کرتی ہے۔ کیونکہ اس نے حصولِ پاکستان کے لیے جو جدوجہد کی تھی اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ میں مسلم لیگ کے مقامی صدر ڈاکٹر نجم الدین سے بھی کسی قدر متاثر ہوا۔ انہوں نے مجھے علامہ اقبالؒ کی کتاب ''بانگِ درا'' پڑھنے کو دی۔ مہاجر کیمپ میں ہم بہت سی متعدی بیماریوں کا شکار ہو گئے تو ڈاکٹر صاحب نے ہمارے خاندان کا مفت علاج کیا۔ اپنے مریضوں کو طبی مشورے دیتے وقت وہ جماعتِ اسلامی اور کانگریس دونوں پر اس لیے تنقید کرتے تھے کہ انہوں نے قیامِ پاکستان کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

باب 3

تحصیلِ علم

1955ء میں میں نے ایک نئی اور وسیع دنیا میں قدم رکھا۔ سکول سے کالج میں آنا واقعی بہت بڑی تبدیلی تھی اور ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسے دور افتادہ مقام سے لاہور جیسے بڑے شہر میں آمد اس سے بھی عظیم تر بات تھی۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لینے سے گویا زندگی کی کایا ہی پلٹ گئی۔

میں نے میٹرک کا امتحان 850 میں سے 688 نمبروں کے ساتھ پاس کیا اور اپنے سکول میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اگرچہ مجھے وظیفہ بھی ملا۔ تاہم وہ رقم کالج کے اخراجات کے لئے کافی نہیں تھی اور میرے والد کمی پوری کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ گو ہمیں کچھ زرعی اراضی الاٹ ہو گئی تھی مگر اس سے خاندان کا گزارہ ہی بمشکل ہوتا تھا۔

میرے محسن - شیخ محمد یوسف

اس مرحلہ پر ایک نیک دل انسان میری زندگی میں داخل ہوا جس نے میری آرزوؤں اور خاندان کے خوابوں کی تکمیل وتعبیر کی راہ ہموار کی اور ہمیں بے حد مدد دی۔

شیخ محمد یوسف ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک ہمدرد اور انسان دوست شخص تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں پیسے نہ ہونے کی وجہ سے کالج میں داخلہ نہیں لے سکتا تو انہوں نے میرے تمام اخراجات کی ذمہ داری قبول کر لی۔ ان کی صرف ایک شرط تھی کہ بڑا ہو کر مجھے بھی کسی غریب اور ہونہار طالب علم کی اسی طرح کفالت اور مدد کرنا ہوگی۔ میں نے آگے چل کر اپنے محدود وسائل میں رہتے ہوئے ان کی شرط پوری کی۔ تاہم اس کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں۔

گورنمنٹ کالج میں داخلہ

گورنمنٹ کالج لاہور جیسے ادارہ میں جس کا شمار جنوبی ایشیا کے بہترین تعلیمی اداروں میں ہوتا تھا' داخلہ مل جانا خوش قسمتی کی بات تھی۔ اس کالج نے اپنے ماٹو ''تحصیلِ علم کی حوصلہ افزائی'' کے مطابق حصولِ علم کے معاملہ میں مجھ جیسے غریب و نادار طلبا کی واقعی بڑی مدد کی۔

گورنمنٹ کالج نہ صرف پورے ملک بلکہ بیرونی ممالک کے اربابِ علم وفضل اور دانشوروں کے لیے بھی زبردست کشش رکھتا تھا۔ یہاں طلبا کو اپنے دور کی عظیم اور اہم شخصیات سے ملنے اور انہیں سننے کے مواقع میسر آتے تھے۔ ہمیں بڑے ممتاز اور فاضل اساتذہ کی رہنمائی میں علمی منازل طے کرنے کا موقع ملا۔ ان میں پروفیسر سراج الدین' کے ایم حسین' ایس جی رضا' ایم راشد اور ڈاکٹر نذیر احمد جیسی نابغۂ روزگار شخصیات شامل تھیں۔ انہوں نے ہمارے شعور کو جلا بخشی' ہماری شخصیتوں میں نکھار پیدا کیا اور اکتسابِ فیض کے سفر میں ہماری مدد اور رہنمائی کی۔

کالج کے صحت مند ماحول کے اسباب میں سے ایک اہم سبب داخلے کا طریق کار تھا۔ ان دنوں تمام طلبا کا تحریری امتحان اور انٹرویو لیا جاتا تھا جس میں کارکردگی کے حامل بہترین طلبا منتخب کئے جاتے تھے۔ میٹرک میں حاصل کردہ نمبروں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس سال پورے پنجاب میں اول آنے والے طالب علم کو اس بنا پر داخلہ نہیں مل سکا کہ وہ کالج کے لیے موزوں نہیں تھا۔ جبکہ میرا مالی لحاظ سے غریب و نادار ہونا رکاوٹ کا موجب نہیں بنا۔

ہماری کلاس داخلے کے اس طریقہ سے منتخب ہونے والی آخری کلاس ثابت ہوئی۔ اگلے سال سے حکومت مغربی پاکستان نے جس کے سربراہ ڈاکٹر خان صاحب تھے' وہ طریق کار یکسر بدل دیا۔ انہیں اپنے اس اقدام کے تباہ کن نتائج کا اندازہ نہیں تھا۔ نئی پالیسی کے تحت طلبا کو تمام کالجوں میں محض میٹرک میں حاصل کردہ نمبروں کی بنیاد پر داخل کیا جانے لگا۔ پرنسپلوں اور سینئر ترین اساتذہ کو داخلے کے عمل سے الگ کر کے وہ کام ہیڈ کلرکوں کو سونپ دیا گیا۔ جو داخلہ فارموں کو حاصل کردہ نمبروں کی ترتیب سے فائل میں مرتب کر لیتے ہیں اور داخلہ کے مستحق طلبا کی فہرست بنا کر نوٹس بورڈ پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ بہت سی صورتوں میں نالائق طلبا سفارش اور بعض رشوت کے ذریعے داخلہ حاصل کرنے کے چور دروازے تلاش کر لیتے ہیں۔ اس مضحکہ خیز سسٹم کو آگے چل کر ''میرٹ سسٹم'' کا نام دیا گیا اور حکومتیں جہاں انہیں سفارش کی بجائے اس طریقہ پر عمل کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس پر فخر کا اظہار کرتی ہیں۔ بعدازاں زیادہ سے

زیادہ نمبر حاصل کرنے کی دیوانہ وار دوڑ میں والدین، طلبا اور اساتذہ نے تمام اخلاقی اقدار کو پسِ پشت ڈال دیا اور قوم کے اخلاقی ڈھانچہ کی تباہی میں حصہ دار بنے۔

کالج کے پرنسپل خواجہ منظور حسین نے داخلہ کے لیے انٹرویو کے دوران میرے کیس پر خصوصی توجہ فرمائی۔ چونکہ میں اُردو میڈیم سکول کا طالب علم تھا' اس لیے انہوں نے 15 پروفیسرز کے پینل کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ میرا انٹرویو اُردو میں لیا جائے۔ میں نے سارے مشکل سوالوں کے صحیح جواب دے دیئے تو وہ اس قدر خوش ہوئے کہ میری کامیابی کا اسی وقت اعلان کر دیا۔ کالج کے بارعب ہیڈ کلرک محمد دین نے مجھے بعد میں بتایا کہ میں اس لحاظ سے بڑا خوش قسمت تھا کہ مجھے انٹرویو کے دوران ہی نتیجہ سے آگاہ کر دیا گیا' ورنہ عام طور پر ایسا نہیں کیا جاتا۔

سائنس کی بجائے آرٹس کے مضامین

میں ہائی سکول میں سائنس کا طالب علم رہ چکا تھا۔ اس لیے میں نے کالج کے پری میڈیکل گروپ میں داخلہ لے لیا۔ تاہم چند دن بعد ہی مجھے اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ لیبارٹری میں بعض گیسوں کی تیاری کے دوران مجھے ان کی بدبو سخت ناگوار گزری بلکہ ناقابلِ برداشت محسوس ہوئی۔ میرے لیے آئندہ زندگی میں ایسے بدبودار ماحول کو اپنانا محال تھا۔ دوسرے مجھے سائنسی مضامین سے دلچسپی بھی نہیں تھی۔

میں نے آرٹس کے مضامین اختیار کرنے کے لیے درخواست لکھی اور پرنسپل صاحب کی خدمت میں پیش ہو گیا۔ میری درخواست پڑھ کر انہوں نے حیرت کا اظہار کیا کیونکہ میڈیکل شعبہ میں داخلہ ملنا خاصا مشکل کام تھا۔ اس کے باوجود میں پری میڈیکل گروپ چھوڑنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنے کو کہا۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ انہوں نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری درخواست منظور کر لی اور کہا کہ ''اگر بعد میں ضرورت محسوس ہو تو تمہیں دوبارہ پری میڈیکل میں داخل مل سکتا ہے۔ مجھ سے ملنے میں قطعاً ہچکچاہٹ محسوس نہ کرنا''۔ ان کے خیال میں میرا فیصلہ غلط تھا' اس لیے انہوں نے دروازہ کھلا رکھا تاکہ بعد میں غلطی کا احساس ہونے پر میں پھر سائنس گروپ میں جا سکوں۔

جب خواجہ صاحب نے مجھے یہ بتایا کہ انہیں میرا کیس اور انٹرویو پوری طرح یاد ہے تو میں ہکا بکا

رہ گیا۔ جہاں سینکڑوں طلبا انٹرویو دینے کے عمل سے گزرتے ہوں وہاں کسی ایک طالب علم کے کیس کو یاد رکھنا واقعی حیرت انگیز بات تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کی پڑھائی اور ان کی فلاح و بہبود میں کس قدر دلچسپی لیتے تھے۔

مضامین کی تبدیلی کے بعد میں آرٹس کی کلاسز میں بیٹھنے لگا۔ پہلے ہی دن پروفیسر ایس جی رضا نے انگریزی کی کلاس میں ایک نیا چہرہ دیکھا تو مجھ سے کہنے لگے: ''تم کون ہو اور اتنی تاخیر سے داخلہ لینے کا سبب کیا ہے؟'' جب میں نے مضامین تبدیل کرنے کے بارے میں بتایا تو انہیں میرے فیصلہ پر زبردست حیرت ہوئی۔ انہوں نے پوری کلاس کو مخاطب کر کے کہا: ''اس نوجوان کو دیکھیں اس نے اپنے ہاتھوں سے خود اپنی قبر کھودی ہے۔'' پوری کلاس قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ میں نے بڑی بے باکی سے کہا: ''سر! میں نے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔''

''تمہیں ایک دن اپنے فیصلہ پر پچھتانا پڑے گا''۔ انہوں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ وہ اپنی رائے پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ بی اے کا امتحان بھی پاس کرلیا۔

پروفیسر سراج دین نے ہمیں ''میکبتھ (شیکسپیئر کا مشہور ڈرامہ) پڑھایا۔ پڑھاتے وقت ان کی ادائیگی اور تاثرات اس قدر موئثر ہوتے کہ ہم شیکسپیئر کے اظہار کے باریک ترین فرق اور اسلوب کو بھی سمجھ جاتے تھے۔

دوستوں کا حلقہ

کالج کی فضا بڑی خوشگوار اور معلومات افزا تھی۔ میں نے شخصیت کو جلا بخشنے والے تمام مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بحث مباحثہ، جس میں گاہ بگاہ میں خود بھی حصہ لیتا تھا۔ میرے لیے سب سے زیادہ دلچسپ اور فرحت بخش سرگرمی تھی۔ میں ڈراماٹک سوسائٹی، مجلسِ اقبالؒ انگریزی ادبی سوسائٹی، اسلامی تعلیمات کی انجمن، میوزک سوسائٹی، سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی اور فلاسوفیکل سوسائٹی کی سرگرمیوں میں بھی گہری دلچسپی لیتا تھا۔

میرے بہت سے ہم عصر بعد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ ان میں سے عبدالخالق اعوان، محمد عارف (بعدہٗ ڈاکٹر) اقبال معین، غلام مرتضیٰ ملک (بعدہٗ ڈاکٹر) پرویز مسعود، چوہدری منظور احمد، سردار ظفر،

شیر محمد لونڈ خور، محمد اشرف (کینیڈی)، طور، احمد کاظم اور محمد عبدالحمید کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

چونکہ میں لیٹ داخل ہوا تھا اس لیے عربی کے مضمون کے معاملے میں پریشان رہنے لگا جو کہ میرے اختیاری مضامین میں سے ایک تھا۔ بہر حال مسجد میں اور بعدازاں سکول میں جو عربی پڑھی تھی، وہ مددگار ثابت ہوئی اور میں نے پہلے ہی ٹیسٹ میں دوسری پوزیشن حاصل کر لی حالانکہ میں نے عربی کی کلاس میں محض پندرہ دن پڑھا تھا۔ اس کے بعد عربی کے استاد آغا عبدالستار مجھ پر مہربان ہو گئے۔ بعد میں میں نے اپنے دوست اے حمید کے تعاون سے، جس نے ذاتی مطالعہ کی مدد سے عربی میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ عربی کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اس نے مجھے عربی سے انگریزی کی مشہور لغت ''قاموس العصری'' مہیا کر دی۔ جو مصر کے مشہور فرہنگ نویس الیاس انطون الیاس کی مرتبہ ہے۔

خالق اعوان جو عربی میں بھی ہمارے ساتھی تھے، آغا صاحب کے عربی بولنے کے انداز کی ہو بہو نقل اتارا کرتے تھے، جسے سن کر پوری کلاس بے حد محظوظ ہوتی تھی۔ وہ دوسرے اساتذہ کی نقل اتارنے میں بھی ماہر تھے۔ خصوصاً انگریزی کے اساتذہ پروفیسر رضا اور پروفیسر اعوان کے انداز بیان کی نقل اتار کر سب کو ہنسا دیتے تھے۔

عارف اور اقبال معین زبردست مناظر تھے اور بعض اوقات ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہوتے تھے۔ وہ دونوں تقریر لکھتے وقت اہم نکات پر مشورہ کے لیے حمید کی طرف رجوع کرتے تھے۔ پارلیمانی طرز کے مباحث کے لیے قانونی اقوال (Propositions) کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا جاتا تھا تاکہ ان کی حمایت اور مخالفت کی وسیع گنجائش موجود ہو۔ حمید کی متوازن سوچ دونوں کو ٹھوس دلائل فراہم کرتی تھی۔ بعض اوقات دونوں انعامات جیتنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

حمید بہت زیادہ صاحبِ علم تھا۔ وہ خدا کی زمین پر موجود ہر چیز کے بارے میں معلومات رکھتا تھا۔ اس نے 1956ء میں پنجاب بورڈ آف سکینڈری ایجوکیشن کے زیرِ اہتمام ہونے والے معلوماتِ عامہ کے مقابلہ میں پہلا انعام حاصل کیا۔ اس لیے ہم اسے ''علامہ'' کہا کرتے تھے۔ اس کے زبردست احتجاج کے باوجود یہ لقب مشہور ہو گیا۔ وہ اس لقب کو آج بھی ناپسند کرتا ہے کیونکہ وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ بہر حال اس کے بعض کلاس فیلو اب بھی پرانا نام استعمال کرنے سے باز نہیں آتے۔

چونکہ اُسے زیرِ نظر کتاب ایڈٹ کرنی تھی اس لیے مجھے مسودہ میں ''علامہ'' کا لقب استعمال

کرنے کی اجازت نہیں دی۔ میں چاہتا تو بحیثیت مصنف اپنے صوابدیدی اختیارات استعمال کر سکتا تھا۔ لیکن ہمارا اس بات پر سمجھوتہ ہو گیا کہ اس کے بعد کتاب کے آخر تک اس کا حوالہ ''اے حمید'' کے طور پر دیا جائے گا اور میں اس سے ''علامہ حمید' مراد لوں گا۔ اس کے خیال میں اس کا نام عبدالحمید ہی ہو گا۔ قارئین اپنی پسند کا جو نام چاہیں مراد لے سکتے ہیں۔

شیر محمد خاں نے جو بعد ازاں میرے کیریئر کے انتہائی اہم موڑ پر نمودار ہوئے (جس کا ذکر آئندہ باب میں آ رہا ہے) مردان میں وکالت شروع کر دی۔ پھر وہ لیٹرل انٹری (Lateral Entry) کے ذریعے فارن سروس میں چلے گئے۔ انہوں نے سفارتی کیریئر میں دن رات محنت کر کے خوب نام کمایا۔ زمبابوے اور موزمبیق میں ان کے آزاد ہونے پر پاکستانی سفارت خانے قائم کیے۔ ان کے والد خان غلام محمد خاں لونڈ خور مسلم لیگ کے مشہور لیڈر رہے تھے اور قائداعظمؒ کے رفیقِ کار رہ چکے تھے۔

کالج یونینوں کے انتخاب سے طلبا میں جمہوری روح پیدا کی جاتی تھی اور آئندہ کے لیے تربیت دی جاتی تھی۔ ان دنوں مطبوعہ پوسٹرز' ہینڈ بلز یا کتابچوں کی بے ہودگی کا رواج نہیں تھا۔ سٹوڈنٹس یونین یا ینگ سپیکرز یونین کا اُمیدوار ہاتھ سے لکھے ہوئے صرف چھ پوسٹر آویزاں کر سکتا تھا وہ بھی کالج کی حدود کے اندر۔ گویا ان دنوں محض حقیقی قابلیت کو مدنظر رکھا جاتا تھا۔ سب سے زیادہ قابلِ طلبا منتخب ہوتے تھے کیونکہ صرف وہی اکثریت کی طرف سے اعتماد حاصل کر سکتے تھے۔ سیاسی جماعتوں کی ذیلی تنظیموں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس بدعت کو بعد میں فروغ ملا۔

ملکی یا سیاسی مسائل پر احتجاج کرنے کے لیے طلبا کے جلوس نہیں نکلتے تھے۔ میرے زمانہ طالب علمی کے دوران میں صرف دو جلوس نکالے گئے۔ پہلا اکتوبر 1956ء میں مصر پر اسرائیل' برطانیہ اور فرانس کے مشترکہ حملہ کے خلاف' دوسرا چند مہینے بعد مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں۔

لاکالج میں داخلہ

میں نے 1959ء میں انگریزی میں آنرز کے ساتھ بی اے پاس کر لیا۔ میرے لازمی مضامین تاریخ' فلسفہ اور عربی تھے۔ اس کے بعد قانون کی ڈگری (ایل ایل بی) حاصل کرنے کے لیے اسی سال پنجاب یونیورسٹی لاکالج میں داخلہ لے لیا۔ گورنمنٹ کالج کو چھوڑتے ہوئے بہت افسوس ہوا۔ لاکالج میں پڑھائی کے دوران میں فری لیگل ایڈ سوسائٹی کا سیکرٹری بھی رہا۔

لا کالج میں چند دوستوں کو ساتھ ملا کر "فرینڈز آف سرکل" کے نام سے ایک سوسائٹی بنائی تاکہ معاشرتی اور سیاسی مسائل پر بحث کی جائے' ان کا تجزیہ کیا جائے اور ان پر لکھا جائے۔ اس کے نمایاں ارکان میں ناصر حسین شمسی' خورشید خاں' اے حمید' تحسین اور انیس کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ہر ہفتہ کو بعد دوپہر میرے کمرہ میں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا تھا۔ ارکان میں سے کوئی ایک تحقیقی مقالہ پیش کرتا' پھر اس پر زوردار بحث ہوتی تھی۔ اس طرح ہم نے بہت کچھ سیکھا۔

ہم اخلاقی مسائل کو بھی زیرِ بحث لاتے تھے۔ چونکہ اخلاقی اقدار کا پرچار کرنے سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے' اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ جو لوگ سچائی اور نیکی کے راستے پر چلتے ہیں ان کی دل کھول کر تعریف کی جائے۔ چونکہ یہ بات انسان کی سرشت میں داخل ہے کہ اس کے کام کو سراہا جائے اور اس کی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔ اس لیے ہم ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے تاکہ وہ صحیح راستے پر گامزن رہیں۔ ہم اس اندازِ فکر کو اپنے طریقہ کے مطابق اس وقت سے اپنائے ہوئے ہیں۔ میں اپنے ماتحتوں سے نمٹتے وقت ہمیشہ اسی پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ اکثر افراد کو اس کے برعکس عمل کرتے دیکھا گیا۔ ایوب خانی مارشل لا کے ابتدائی ایام کا ذکر ہے۔ میں ایک کمبل خریدنے کے لیے انارکلی میں ایک دکان پر گیا۔ دکان کے مالک نے جو ایک عمر رسیدہ معزز آدمی تھا' کمبل کی قیمت صرف پانچ روپے بتائی جو بظاہر بہت کم تھی۔ کیونکہ ان دنوں عام قیمت پندرہ سے بیس روپے تک تھی۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے کوئی فوجی افسر اس کی دکان پر آیا تھا جس نے اس (دکاندار) کو حد سے زیادہ نفع کمانے پر برا بھلا کہا۔ اس لیے مجبوراً اس کے ہاتھ پانچ روپے میں کمبل بیچنا پڑا۔ اس نے یہ بھی حکم دیا کہ دوسرے گاہکوں سے بھی یہی قیمت وصول کی جائے۔ اس لیے وہ دکاندار اس کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ میں نے لاگت سے بھی کم قیمت پر کمبل خریدنا پسند نہیں کیا اور خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ جب میں نے یہ بات گورنمنٹ کالج کے نیو ہاسٹل میں اپنے ساتھیوں کو بتائی تو صرف خالق اعوان نے میرے فیصلہ کی تائید کی۔ دوسروں نے مجھے بدھو' گاؤدی اور کودن قرار دیا۔ خصوصاً ایک دوست نے بہت ہی مذاق اڑایا بعدازاں وہ پولیس میں اعلیٰ افسر بنا۔

ہر اجلاس کی کارروائی سوسائٹی کے سیکرٹری ناصر شمسی ایک رجسٹر میں لکھ لیتے تھے۔ وہ جب بھی اپنے وطن (لاہور) آتے ہیں' ان اجلاسوں کا بڑے اشتیاق سے تذکرہ کرتے ہیں۔ بلکہ اس رجسٹر کو دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کرتے ہیں جو شاید اب کسی کے پاس بھی نہ ہو۔ (میں آگے چل کر بیان کروں گا کہ انہیں

امریکہ میں کیوں آباد ہونا پڑا)۔ میرے بعض دیگر دوست بھی ملک سے باہر ہیں، مثال کے طور پر تحسین سپین میں ہیں اور خورشید نے امریکہ میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔

بحث مباحثہ کے دوران ہم عام طور پر انگریزی بولتے تھے تا کہ ہمیں اس زبان پر عبور حاصل ہو جائے۔ لیکن اے حمید ہمیشہ اُردو بولتے اور اُردو میں لکھتے تھے۔ وہ ہمیں بھی قومی زبان اپنانے کی تلقین کرتے تھے۔ حالانکہ وہ ہم سب سے بہتر انگریزی جانتے ہیں۔ انہوں نے اُردو کو قومی اتحاد واشتراک کے اہم ذریعہ کے طور پر فروغ دینے میں زبردست کردار ادا کیا ہے۔

میں ان کی سوچ کے پس پردہ حکمت کو بہت دیر بعد سمجھ سکا۔ کوئی غیر ملکی زبان اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دے گی کہ ہماری قوم کی صلاحیت سے پورے طورر پر استفادہ کیا جا سکے۔ خواہ ہم میں سے کوئی شخص اس زبان میں کتنی ہی مہارت اور فراوانی کیوں نہ حاصل کر لے۔ اے حمید کے زیرِ اثر میں نے بھی پولیس میں اُردو کے استعمال کو فروغ دیا تو اس کے بہت اچھے نتائج نکلے۔ سرکاری سطح پر کارکردگی کئی گنا بڑھ گئی کیونکہ پولیس والوں کو اپنی زبان میں دفتری کام کرنا بہت آسان محسوس ہوا۔

میں نے لا کالج سے 1961ء میں گریجوایشن کرنے کے بعد ضلع کچہری میں پریکٹس شروع کردی۔ شیخ اظہار الحق اور میں مل کر پریکٹس کرتے اور معقول روزی کما لیتے تھے۔ وکالت کا زیادہ تجربہ نہ رکھنے کے باوجود ہمیں خاصے مقدمات مل جاتے تھے۔ تاہم میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ (اس کی وجہ آئندہ باب میں بیان کی گئی ہے)۔

تاریکی کے سائے

7-اکتوبر1958ء کی رات ہماری تاریخ کی سیاہ ترین رات تھی۔ اگلی صبح آنکھ کھلی تو یہ خبر پڑھ کر زبردست دھچکا لگا کہ صدر اسکندر مرزا نے آئین منسوخ کر کے جنرل ایوب خاں کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا ہے۔ ہم اس اقدام کے مضمرات کو فوری طور پر نہیں سمجھ سکے۔ تاہم ہر شخص خوفزدہ تھا اور کسی قسم کے تبصرہ سے گریزاں تھا۔ ہم نے مارشل لا کے نفاذ پر آپس میں تبادلہ خیال کیا۔

خالق اعوان، ایف آئی ملک اور میں ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے، جنہوں نے اس اقدام کو ملک وقوم کے لیے علانیہ ضرر رساں قرار دیا۔

شعبۂ تاریخ کے پروفیسر فیاض نے کہا کہ جبت کی چاشنی ختم ہو گئی ہے۔ ہمارے پلے کچھ نہیں پڑا۔ پھر انہوں نے وضاحت کی کہ ہم اپنی اس آزادی سے محروم ہو گئے ہیں جو قائداعظمؒ کے زیرِ قیادت انتھک جدوجہد سے حاصل کی تھی۔ ہم نے اپنے نصب العین کی جو بھاری قیمت ادا کی تھی وہ رائیگاں گئی۔ اب ہمارا معاشرہ ایک سنگین بحران میں پھنس جائے گا۔ جس کے نتیجہ میں معاشرتی تباہی اور اخلاقی انحطاط رونما ہوگا۔ آزادانہ علمی بحث مباحثہ کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ علاقائی' لسانی' فرقہ وارانہ' گروہی اور دیگر شناختوں کو اہمیت حاصل ہو جائے گی۔ پروفیسر کی نظر بڑی دور تک دیکھ سکتی تھی' تاہم ان کی گفتگو ہم میں سے اکثر کے لیے مشکل تھی' اس لیے ہم ان کے مافی الضمیر کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے۔

ایوب خاں یہ دعویٰ لے کر آئے تھے کہ وہ عوام کا معیارِ زندگی بلند کریں گے۔ تاہم مادی ترقی کا نعرہ لوگوں کی حالتِ زار سے ان کی توجہ ہٹانے کی ایک چال ثابت ہوا۔ بلاشبہ اقتصادی ترقی ضروری ہے' تاہم اسے اخلاقی اور ماڈی دونوں طرح کی ترقی کے جامع پلان کا ایک حصہ ہونا چاہیے اس میں عوام کی رضامندی شامل ہونی چاہیے اور انہیں اس میں شراکت کا بھرپور موقع ملنا چاہیے۔ ایوب خاں نے قوم کو بلند اخلاقی سطح سے گھسیٹ کر محض ماڈی بقا کے چکر میں پھنسا دیا اور عظیم افکار کی جگہ چوہا دوڑ (Rat Race) نے لے لی۔ جسے ''اقتصادی ترقی'' ''معاشی ارتقاء اور'' جدت پسندی'' جیسے ناموں سے پکارا گیا۔ ایک بار میں نے ڈاکٹر نذیر احمد سے اس موضوع پر تبادلہ خیال کیا۔ انہوں نے دل میں گھر کر جانے والی فراست کے ساتھ علامہ اقبالؒ کا ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ محض سنگ وخشت سے نیا عالمی نظام وجود میں نہیں لایا جاسکتا۔

متحد رہو اور خدمت کرو

سماجی اور اخلاقی نظام کے لیے اس غلط اقدام کے نتائج بڑے ہولناک اور اس سے بھی بدتر نکلے جن کی نشاندہی پروفیسر فیاض نے بہت پہلے کر دی تھی۔ معاشرتی بگاڑ جلد ہی نظر آنے لگا۔ قانون کی حکمرانی پر کاری ضرب لگائی گئی اور بدمعاشی وغنڈہ گردی کے کلچر کو فروغ ملا۔ سینئر وکلا کہا کرتے تھے کہ یہ رجحان عام مجرموں کو معزز بنا دے گا۔

وکالت کے دوران اونچی سطحوں پر کرپشن کی کہانیاں اکثر سننے میں آتیں تھیں۔ حکمرانوں کی دیکھا

دیکھی معاشرہ کے بعض طبقات میں قانون اور اخلاقی قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کا رجحان عام ہو گیا۔ ہندوستان میں چھوڑی ہوئی جائیداد کے جھوٹے اور جعلی کلیم بھر کے اس کے عوض پاکستان میں غیر مسلموں کی متروکہ جائیداد ہتھیانا راتوں رات امیر بننے کا آسان ترین نسخہ ثابت ہوا۔ مارشل لا حکومت کی الاٹمنٹس کو مستقل کرنے کی بلا سوچے سمجھے عجلت پر مبنی پالیسی نے صورتِ حال کو مزید خراب کر دیا۔ سرکاری اہلکاروں اور وکیلوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔

تعلیمی اداروں کی فضا بھی خراب ہونا شروع ہو گئی۔ امتحانات میں نقل اور اساتذہ کی طرف سے ٹیوشن کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ ڈاکٹر محمد اجمل نے جو ایک مشہور ماہرِ نفسیات و ماہرِ تعلیم ہیں اور کالج میں میرے استاد تھے' اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''یہ سب کچھ معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔''

''اخلاقی معیار کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ ''جذبات' اقدار اور تصورات طبعی اور نظر آنی والی چیزیں نہیں اور چھوٹے دماغ ان کا ادراک نہیں کر سکتے۔'' انہوں نے برجستہ جواب دیا۔

وکلا کے خلاف ایک مذموم مہم شروع کر دی گئی۔ ان میں سے بہت سے تحریکِ آزادی کے ہر اول دستہ میں شامل رہ چکے تھے۔ سرکاری میڈیا کے ذریعے وکیلوں کو ''بے اصولے اور بدقماش'' قرار دیا جانے لگا۔

قلمکار' فنکار' صحافی اور تخلیقی کام کرنے والے دیگر افراد سب کو متاثر کرنے لگے۔ نجی اور سرکاری معاملات میں مصلحت کوشی اور خود غرضی وقت کا کلچر بن گئی۔ لکھنے والوں کو گرانٹس اور انعامات کے ذریعے قابو کرنے کے لیے ''رائٹرز گلڈ'' تشکیل دیا گیا۔ اس دور کے بعض نمایاں اخبارات (پاکستان ٹائمز' امروز' مشرق اور مارننگ نیوز) کو قومی تحویل میں لینے کی غرض سے نیشنل پریس ٹرسٹ بنایا گیا تا کہ ان سے پروپیگنڈہ کا کام لیا جا سکے اور آزاد پریس پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ باقی ماندہ مخالفانہ آوازوں کو دبانے کے لیے پریس و پبلیکیشنز آرڈیننس 1963ء کی سخت دفعات کافی تھیں۔

جمہوری اداروں کو تباہ کرنے کے لیے ایوب خاں نے عوام کی شراکت پر مبنی نیا نظام (بنیادی جمہوریت) متعارف کرایا۔ جس کے تحت دیہات کی سطح پر یونین کونسلوں کا اور شہروں میں وارڈز کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس کے بعد کونسلرز نے اپنے سے بلند سطح کے عوامی نمائندوں یعنی صوبائی اور قومی اسمبلی کے ممبران کا چناؤ کیا اور پانچ سال میں ایک بار صدر کے انتخاب میں حصہ لیا۔ وہ نظام اس طرح وضع کیا گیا تھا کہ برسر اقتدار افراد اس میں آسانی سے دھاندلی کر سکتے تھے۔ ایسے دولت مند افراد بھی جو مطلوبہ رشوت دینے کی استطاعت رکھتے تھے' قومی امور میں بااثر مقام حاصل کر سکتے تھے۔

ملک اسلم حیات جوان دنوں لاہور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر تھے ''بی ڈی'' (B.D) سے بنیادی ڈویژنز مراد لیتے تھے کیونکہ بنیادی جمہوریت کا نظام انگریزوں کی اس پالیسی سے ملتا جلتا تھا جس نے ہمارے معاشرہ میں تفرقہ ڈالا اور لوگوں کو تقسیم کیا۔ بظاہر وہ نظام جمہوریت کو بنیادی سطح پر متعارف کرانے کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ لیکن وہ بہت سے تنازعات اور ناچاقیوں کا سبب بن گیا۔ وہ اس بارے میں فکر مند تھے کہ یہ نظام ہمارے دیہی معاشرہ میں عداوت' محاذ آرائی' خاندانی تنازعات اور معمولی باتوں پر کبھی ختم نہ ہونے والی مقدمہ بازی کو جنم دے گا۔ دیہی زندگی کے باہمی اتفاق اور امن و آشتی کو انتخابی اتحاد' جوڑ توڑ اور گروہ بندی تباہ کر دے گی کیونکہ انتخابی حلقے بہت چھوٹے رکھے گئے تھے۔ اس کا بہتر متبادل یہ ہوسکتا تھا کہ پنچایتی نظام کو بحال کر دیا جاتا جو سراسر اتفاق رائے پر مبنی ہوتا تھا اور معاشرہ میں اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینے کا موجب بن سکتا تھا۔

اگر ہمارے حکمرانوں کا مقصد محض اپنے اقتدار کو طول دینا تھا تب بھی میرے خیال میں ان کے لیے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی بجائے بہترین ماٹو یہ ہوسکتا تھا کہ: ''لوگوں کو متحد رکھو اور ان کی خدمت کرو۔''

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

باب 4

اشرافیہ میں شمولیت

میں وکالت کرتا رہا تاہم کامیابی کے امکانات کچھ زیادہ روشن نہیں تھے جبکہ گھریلو ذمہ داریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ گھر والوں نے میرے مستقبل کے لیے بہت زیادہ قربانیاں دی تھیں اور اب ان کی ساری اُمیدوں کا مرکز میری ذات تھی۔ میرا ان کی توقعات پر پورا اترنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس کی بہتر صورت یہی نظر آئی کہ سرکاری ملازمت اختیار کر لی جائے۔ اس لیے میں نے سی ایس ایس کے لیے مقابلے کا امتحان دینے کا ارادہ کر لیا۔

میرا رفیقِ کار اظہار میرے فیصلہ سے خوش نہیں تھا۔ اے حمید کو پتہ چلا تو اس نے بھی افسوس کا اظہار کیا بلکہ حیران ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرنے والی بات ہو گی۔ اس کی سوچ کے مطابق میرے اندر کسی آزادانہ پیشہ میں کامیاب ہونے کی عظیم صلاحیت موجود تھی اور میں سیاست میں حصہ لے کر قومی مفادات کے تابع بہت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ لیکن نہ تو میں اپنے خاندان کی مجبوریوں کو نظر انداز کر سکتا تھا' نہ ہی سیاست میں حصہ لینے کی بابت سوچ سکتا تھا۔

اے حمید نے مجھے اپنے ارادہ سے باز رکھنے کی انتہائی کوشش کی' لیکن اس کے مضبوط ترین دلائل بھی میرا فیصلہ نہ بدل سکے۔ آخر کار مایوس ہو کر کہنے لگا۔ ''سی ایس ایس بننے کے بعد بھی تمہاری حیثیت

ایک معزز کلرک سے زیادہ نہیں ہوگی۔"

"بہر حال عزت تو حاصل ہوگی۔" میں نے جواب دیا۔

آخری موقع سے استفادہ

میں نے دو بار سی ایس ایس کا امتحان دیا' لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ دریں اثناء میری عمر مذکورہ امتحان کے لیے مقررہ حد سے زیادہ ہوگئی اس لیے میں نے وکالت کو ذریعۂ معاش کے طور پر سنجیدگی سے اپنانے کا ارادہ کرلیا۔ اسے میری خوش قسمتی کہیئے یا حسنِ اتفاق کہ 1962ء میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے طلبا کی عمر کا حساب لگانے کے لیے آخری تاریخ (Cut off Date) ہر سال یکم جنوری کی بجائے یکم اکتوبر تک شمار کرنے کا اعلان کردیا۔ اس تبدیلی سے مجھے مقابلے کے امتحان میں شرکت کا ایک اور موقع مل گیا۔ لیکن میں نے وکالت پر زیادہ توجہ مرکوز رکھی اور سی ایس ایس کی تیاری اچھی طرح نہیں کرسکا کیونکہ سابقہ دو ناکامیوں کے پیشِ نظر پاس ہونے کی کچھ زیادہ اُمید نہیں تھی۔ دوسرے اے حمید کے اصرار نے بھی میرا ارادہ ڈانواں ڈول کردیا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میری ناکامیوں نے مجھے "معزز کلرک" بننے سے بچالیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ وکالت میں مجھے فکر وعمل کی زیادہ آزادی میسر ہوگی جبکہ سرکاری ملازمت میری صلاحیتوں اور تخلیقی سرگرمیوں کا گلا گھونٹ دے گی۔ میں نے سمجھا کہ ایک دوست کی حیثیت سے وہ میری' محمد عارف اور اقبال معین کی صلاحیتوں کو غیر ضروری اہمیت دے رہے ہیں اور سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے معاملہ میں ہماری حوصلہ شکنی کررہے ہیں۔ سی ایس ایس افسر بننا ہمارا دیرینہ خواب تھا۔ لیکن وہ اپنی رائے کے اظہار سے باز نہیں آتے تھے۔

بہر حال سی ایس ایس کے لیے درخواست جمع کرانے کی آخری تاریخ سے چند دن پہلے میں نے آخری کوشش کرنے کا تہیہ کرلیا۔ اب یہ الجھن پیدا ہوگئی کہ میرے پاس امتحان کی فیس جمع کرانے کے لئے 50 روپے نہیں تھے۔ آخری تاریخ سے پہلی شام کو میں فیس کے لیے اپنے دوست شیر محمد خاں سے 50 روپے ادھار لینے کے ارادے سے اس کے گھر رائل پارک کی طرف روانہ ہوا تو میری جیب میں صرف 5 روپے تھے۔ راستہ میں یہ سوچ دامن گیر رہی کہ والدہ کے بقول ادھار لینا عزتِ نفس کے منافی اور بے عزتی کی بات ہے۔ میں اصول اور مجبوری کے مابین کشمکش کی حالت میں چلتا رہا۔

میکلوڈ روڈ پر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے برلوم ہیڈ ہاٹل کے نزدیک ایک دوست سے مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ وہ بھی میری طرح بے روزگار مفلس اور کنگال تھا۔ حسنِ اتفاق سے اسے اس دن کوئی روزگار مل گیا تھا اور وہ بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ''ایک اخبار کی طرف سے ملازمت کی پیشکش آئی ہے اور اُسے فوری طور پر لائل پور جانا ہے۔ اس لیے وہ کرایہ کے لیے دو روپے ادھار لینے کی غرض سے میری طرف آ رہا تھا۔ اسے روزگار مل جانے پر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور وقتی طور پر اپنی پریشانی بھول گیا۔ میں نے اپنی ساری پونجی (جو 5 روپوں پر مشتمل تھی) اس کے حوالے کر دی۔ اس نے تین روپے واپس کرنے چاہے لیکن میں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ ''تمہیں دیگر اخراجات کے لیے ضرورت ہوگی، یہ بھی رکھ لو۔''

یوں ہاتھ اور جیب پوری طرح خالی کر کے میں شیر محمد خاں کے گھر پہنچا۔ وہ اپنے فلیٹ کے باہر ایک چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس نے میرا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا اور کہنے لگا۔ ''خدا کا شکر ہے، آپ وقت پر آ گئے۔ نثار گدھا آیا تھا وہ میرے پاس 300 روپے بطور امانت رکھ گیا ہے۔ مجھ سے خرچ ہو جائیں گے، اس لیئے تم اپنے پاس رکھ لو۔ مجھے اُمید ہے کہ تمہارے پاس محفوظ رہیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے وہ رقم میرے حوالے کر دی۔

نثار میرا کالج کا کلاس فیلو تھا اور مردان سے تعلق رکھتا تھا۔ ہم اسے پیار سے نثار گدھا کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بچارا اس واقعہ کے چند ماہ بعد ٹریفک کے ایک حادثہ میں جاں بحق ہو گیا۔

روایتی عقلمندی کے برعکس روش

نثار کی رقم استعمال کرنے کے صرف ایک ہفتہ بعد مجھے پٹواری عبدالغنی کا کیس لڑنے کی پیشکش ہوئی۔ اس پر الزام تھا کہ اس کا پٹوار کا سرٹیفکیٹ جعلی ہے۔ اس کا مقدمہ سپیشل جج لاہور کی عدالت میں زیرِ سماعت تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کیس کی سماعت فیصل آباد (جو کہ اس کا رہائشی ضلع تھا) میں کی جائے۔ لیکن وہاں کوئی سپیشل کورٹ نہیں تھی۔ دفعہ 30 کے مجسٹریٹ کی ایک عام عدالت تھی۔

کوئی بھی وکیل غنی کا کیس لینے کو تیار نہیں تھا کیونکہ عدالت کے دائرہ اختیار کو چیلنج کرنا خطرناک بات تھی۔ مجھے پیشکش ہوئی تو میں نے بلا پس و پیش وہ کیس لے لیا۔ حالانکہ میرے کئی سینئرز کی رائے یہ تھی کہ انتقال مقدمہ کے لیے صرف جج کی دیانتداری کو چیلنج کرنے سے بات بن سکتی ہے۔ جبکہ کسی دوسرے جج

کی طرف سے اس بات کو قبول کر لیے کا قطعاً امکان نہیں ہوتا۔ اس لیے کامیابی کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ میں پیشی کی تاریخ سے پہلے رات بھر کام کرتا رہا۔ صبح کے ٹھیک تین بجے میرے ذہن میں اچانک ایک نکتہ آ گیا جسے بحث کی بنیاد بنایا جا سکتا تھا۔

اس مقدمہ نے میری قانونی فہم و فراست کے لیے ٹیسٹ کیس کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بہت سے وکلاء جن میں سید مشتاق شاہ' بیرسٹر شفیع اور شیخ اظہار الحق شامل تھے' میری کارکردگی دیکھنے کے لیے عدالت پہنچ گئے۔

کیس کی بابت دلائل دیتے ہوئے میں نے کہا ''ملزم پر الزام لگایا گیا ہے کہ اس نے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لیے جعلی سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس وقت جرم کا ارتکاب کیا گیا' اس وقت وہ سرکاری ملازم نہیں تھا۔ یہ سپیشل کورٹ خالصتاً سرکاری ملازمین کے مقدمات سننے کے لیے ہے۔ اس لیے عدالت ہذا کو اس کیس کی سماعت کا کوئی اختیار نہیں۔ پس اسے فیصل آباد کی عام عدالت میں منتقل کر دینا چاہیے۔''

سرکاری وکیل نے کہا کہ غنی نے مذکورہ جعلی سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر جو تنخواہ وصول کی وہ دھوکہ دہی کے زمرہ میں آتی ہے۔ تاہم مجھے مزید بحث کرنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ جج نے خود ہی کہہ دیا کہ سپیشل کورٹ کی طرف سے مقدمہ کی سماعت اس بنا پر غیر مؤثر ٹھہرتی ہے کہ جعل سازی اور دھوکہ دہی کے الزامات کو غلط طریقے سے اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ وہ سپیشل کورٹ کے دائرہ اختیار میں نہیں آتے۔ ان کی سماعت کوئی عام عدالت ہی کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ کیس فیصل آباد کی عام عدالت کو بھیج دیا گیا۔ مجھے اس مقدمہ کی 300 روپے فیس ملی جو میں نے نثار کو دے کر اس کا حساب بے باق کر دیا۔

پولیس اکیڈمی کے شب و روز

میں نے 1962ء میں سی ایس ایس کا امتحان دیا اور مجھے پولیس سروس کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ 18 نومبر 1963ء کو میں اے ایس پی کی تربیت کے لیے پولیس ٹریننگ اکیڈمی سارداا (ضلع راج شاہی' مشرقی پاکستان) پہنچ گیا۔ ہم کل 9 اُمیدوار تھے۔ مغربی پاکستان سے میرے علاوہ پانچ نوجوان چوہدری منظور احمد' خاور زمان' وجاہت لطیف' محسن منظور اور عباس خاں تھے۔ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے تین اُمیدواروں کے نام محمد علی' محبوب الحق اور بدیع الزمان تھے۔

اکیڈمی کی زندگی انتہائی کٹھن تھی۔ ہمیں صبح کو بہت جلد اٹھ کر آدھ گھنٹہ کی پی ٹی کرنی پڑتی تھی۔ اس کے بعد واپس آ کر پریڈ کی وردی بدلتے اور گراؤنڈ پہنچ جاتے جہاں اڑھائی گھنٹے رائفل کے ساتھ یا اس کے بغیر بڑی سخت پریڈ کروائی جاتی۔ ناشتے اور غسل وغیرہ کے لیے 40 منٹ کے وقفہ کے بعد ہمیں تعلیمی کلاسوں میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔

لنچ اور آرام کے لیے دو گھنٹے کا وقفہ گزارنے کے بعد کسی ایکسر سائز یا کھیل مثلاً گھڑ سواری' پولو' باسکٹ بال یا ہاکی میں حصہ لیتے۔ شام کو کھانے کے لیے رسمی لباس پہننا لازمی تھا۔

ڈنر میں بعض معزز مہمان بھی شامل ہوتے اور اس میں آداب و رسوم کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ پرنسپل اور ان کی بیگم ہر ہفتہ کی شام کو اکیڈمی کے مہمان ہوتے۔ انہیں ''میس نائٹس'' کہا جاتا تھا۔ جس میں شرکت کے لیے پوری یونیفارم کے ساتھ ولنگٹن بوٹ اور سپر پہننا ضروری تھا۔ روزمرہ کی مصروفیات انتہائی مشقت طلب اور تھکا دینے والی تھیں۔ جسم کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگتا تھا۔ آرام اور سکون کے بارے میں سوچنا بھی گناہ تھا۔ بہرحال تین چار مہینے کے بعد جب جسم اس مشقت کا عادی ہو گیا تو ہم وہاں کی زندگی اور فضا سے لطف اندوز ہونے لگے۔

ہماری اکیڈمی دریائے پدما کے کنارے اٹھارہویں صدی کی بنی ہوئی ڈچ طرز کی پُرشکوہ عمارت میں واقع تھی۔ زیرِ تربیت افسروں کے میس کی عمارت بھی بڑی وسیع اور جاذبِ نظر تھی۔ مجھے رہنے کے لیے بہت بڑا کمرہ اور خدمت کے لیے اردلی مل گیا جو میری وردی کی دھلائی صفائی اور اسے تیار رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ میں ایک بالکل نئی دنیا میں پہنچ گیا تھا جہاں سامراجی روایت کے تحت یہ احساس پیدا کیا جاتا تھا کہ بیوروکریٹس کا طبقہ منتخب روزگار اور عام لوگوں سے برتر ہوتا ہے۔ شروع میں اس احساس نے مجھے پریشان کر دیا' تاہم سچی بات یہ ہے کہ آہستہ آہستہ میں بھی اس خیال سے لطف اندوز ہونے لگا۔ میری انا کو تسکین پہنچانے کے لیے وہ ایک اچھا تصور تھا۔

ڈی آئی جی' کے امین حسین ہمارے پرنسپل تھے۔ وہ ڈسپلن کے معاملے میں بڑے سخت تھے اور ہمیں ہر وقت مصروف رکھتے تھے۔ البتہ چھٹی کے دن قریبی شہر راج شاہی اور دوسرے مقامات پر جانے کی اجازت مل جاتی تھی۔ ہم گاہ بگاہ مطالعاتی دورہ پر ڈھاکہ' جیسور اور دیگر بڑے شہروں میں جاتے رہتے تھے۔ مسز حسین بڑی دلکش اور خوبصورت خاتون تھیں۔ وہ اکیڈمی کی معاشرتی سرگرمیوں کی روحِ رواں تھیں اور

اپنی دو بہنوں کے ہمراہ گھڑ دوڑ میں حصہ لیتی اور پولو کھیلتی تھیں۔ وہ ٹینس کی بھی بہت اچھی کھلاڑی تھیں۔ اگر ہم ان سے ہار جاتے تو انتہائی مسرت کا اظہار کرتیں۔ ہم میں سے بہت سے انہیں ہرانا اور ان کی غرور و تمکنت سے بھری انا کو ٹھیس پہنچانا گوارا نہیں کرتے تھے۔

طوفان کی بنیاد کیسے پڑی؟

مشرقی پاکستانیوں کے ساتھ ہمارا رابطہ کبھی کبھار اور محدود نوعیت کا ہوتا تھا' وہ بھی اس صورت میں جب ہمیں اکیڈمی سے باہر جانے کا موقع ملتا۔ تاہم حکمران طبقہ سے ان کی بیزاری کا مختلف طریقوں سے پتہ چلتا رہتا تھا۔ بظاہر ان کے اور مغربی پاکستانیوں (وہ ان سب کو پنجابی کہتے تھے) کے درمیان طویل فاصلہ اور بعد تھا۔ حتیٰ کہ ہمارے ساتھ زیرِ تربیت ملازمین بھی اجنبیت محسوس کرتے تھے۔

اس صورتِ حال کی بہت سی وجوہ تھیں۔ ان میں سب سے بڑی وجہ ایوب خاں کا اقتدار پر غاصبانہ قبضہ اور بنیادی جمہوریت کے نظام کا رائج کرنا تھا۔ لوگوں نے خود کو اقتدار میں شرکت سے محروم سمجھنا شروع کر دیا۔ جس سے پنجابیوں کے خلاف بنگالیوں کے نسلی تعصب کو فروغ ملا۔ ایوب خاں تو پنجابی نہیں تھے البتہ وہاں تعینات بہت سے بیوروکریٹ پنجابی تھے۔ جس سے لسانی اور نسلی تعصبات پیدا ہوئے۔ لیکن حکمران طبقے اس واضح حقیقت سے یکسر آنکھیں چرا رہے تھے۔ وہ اسے ماننے کو تیار نہیں تھے۔ کچھ بنگالی فوجی حکمرانوں کی حمایت کر رہے تھے اور انہیں ان کے محدود دائرہ سے باہر جھانکنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

ہم نکتہ چیں اور شاکی بنگالیوں کو بتاتے تھے کہ مغربی پاکستان کے بھی زیادہ تر عوام ایوب خاں اور ان کے نظام سے خوش نہیں ہیں۔ مگر وہ ہماری بات پر یقین نہیں کرتے تھے۔ ہمیں بنگال کی دولت کا استحصال کرنے والے سمجھا جاتا تھا اور ہم پر بنگالی عورتوں کی بے حرمتی کرنے کا الزام لگایا جاتا تھا۔ ہمارے لیے ذاتی طور پر یہ چیز بڑی تکلیف دہ تھی۔ اس لیے ہم اپنی صفائی میں دلائل پیش کرتے کرتے طیش میں آجاتے تھے۔ اس طرح ایک مخالف حلقہ وجود میں آجاتا اور پہلے سے موجود اجنبیت مزید بڑھ جاتی۔ 1964ء میں اعلانیہ کہا جانے لگا کہ پنجابی فوج نے بنگالیوں کو غلام بنا لیا ہے اور انہیں آزادی حاصل کرنے کے لیے زبردست جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اگر ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' والا اصول فوج کے

لیے درست ہے تو بنگالی نوجوانوں کے لیے بھی بغاوت کرنا جائز ہوگا۔ جب ایسی باتیں عام لوگوں تک پہنچ رہی تھی تو انٹیلی جنس ایجنسیوں کے نوٹس میں بھی یقیناً آتی ہوں گی۔

ہماری ٹریننگ 1964ء کے آخر میں مکمل ہوئی۔ ان دنوں مشرقی پاکستان میں بڑا جوش وخروش پایا جاتا تھا کیونکہ جنوری 65ء میں صدارتی انتخابات ہونے والے تھے۔ پرانے سیاسی رہنما کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز (C.O.P) نام سے ایک اتحاد کے پرچم تلے جمع ہو گئے اور انہوں نے بابائے قوم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کو ایوب خاں کے مقابلہ یں اپنا اُمیدوار بنالیا۔ اگرچہ اس اتحاد میں جماعتِ اسلامی (جس کے سربراہ مولانا مودودی تھے) اور نیشنل عوامی پارٹی (جس کی قیادت ولی خاں کے ہاتھ میں تھی) جیسی متضاد افکار کی حامل جماعتیں شامل تھیں تاہم مادرِ ملت کی قیادت نے ان سب کو شیر وشکر کر کے ایک مضبوط گروپ کی شکل دے دی۔

انتخابی مہم کے دوران ایوب خاں اور سرکاری مشینری کی بنیادیں ہل گئیں۔ ناچار وہ ظلم وتشدد کے ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔ ایوب خاں اور زیڈ اے بھٹو نے (جو ان دنوں کنونشن مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل تھے) مایوسی اور پریشانی کا شکار ہو کر مادرِ ملت اور دیگر قابل احترام قائدین کے خلاف ناشائستہ زبان استعمال کرنی شروع کردی۔ جس سے خود ان کے مقصد کو نقصان پہنچا۔ بنیادی جمہوریت کے ارکان کو جو صدارتی انتخاب میں ووٹرز تھے' رشوتیں دی گئیں یا ہراساں کر کے ایوب خاں کے حق میں ووٹ ڈالنے پر مجبور کیا گیا۔ ہم نے دیکھا کہ پولیس اور انتظامیہ کی سختی نے بنگالیوں کی اس نفرت میں مزید شدت پیدا کردی جو ان کے دلوں میں پہلے سے موجود تھی۔ عام آدمی کے نزدیک وہ الیکشن غلامی و آزادی اور نیکی و بدی کے مابین مقابلہ کے مترادف تھا۔

ایوب خاں نے انتخابی مہم کے دوران ہماری اکیڈمی کا دورہ کیا۔ پرنسپل کی رہائش گاہ پر صدر کو لنچ دیا گیا' جس میں ہم بھی شریک ہوئے۔ میں نے لنچ کے دوران محسوس کیا کہ بہت سے بنگالیوں سمیت ہر شخص ایوب خاں کو یقین دلا رہا تھا کہ سارے بنگالی ان کے ساتھ ہیں۔ محض چند گمراہ آدمی ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ حقائق کی پرواہ کیے بغیر کوئی شخص بھی انہیں ناراض کرنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ میں صدر کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کردوں تاہم میری ہمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اے حمید کا کہنا درست تھا کہ میں ایک معزز کلرک بننے کے راستہ پر گامزن ہو گیا تھا۔ اور اس وقت تو

عزت کا احساس بھی میرا ساتھ چھوڑ گیا جب وائس پرنسپل نے جو بڑے متعصب بنگالی تھے اور ایوب خاں کی بابت ہر وقت نکتہ چینی کرتے رہتے تھے اس بات پر میری سخت سرزنش کی کہ میں نے ایوب خاں سے ملنے اور انہیں حالات کے اصل رخ سے باخبر کرنے کا ارادہ کیوں کیا۔ ''کیا تم احمق ہو؟'' انہوں نے برہمی کے عالم میں سوال کیا۔ مجھ پر اس قدر خوف طاری ہو گیا کہ میری زبان گنگ ہو کے رہ گئی اور میں نے معافی مانگ کر پیچھا چھڑایا۔

انتظامی تربیت

سار دا سے پاس آؤٹ ہونے کے بعد جنوری 65ء میں مجھے انتظامی تربیت کے لیے ایبٹ آباد (ضلع ہزارہ کا صدر مقام) بھیج دیا گیا۔ ہزارہ آج کل ایک ڈویژن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس پہاڑی علاقے کو صنوبر اور چیڑ کے درختوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ نتھیا گلی' ٹھنڈیانی' بفہ' بٹل' شنکیاری' کوہستان اور دیگر مقامات کے مسحور کن مناظر بہتی ندیاں گھنے جنگلات اور سرسبز وشاداب کھیت آدمی کو مبہوت کر دیتے ہیں۔ وہ علاقہ دیکھ کر مجھے اپنا پچھلا وطن یاد آنے لگا اور میں بچپن کی خوشگوار یادوں میں کھو گیا۔

ان دنوں حاجی حبیب الرحمٰن (جو ایک انتہائی نفیس آدمی ہیں) ہزارہ کے ایس پی تھے۔ انہوں نے بڑے بھائی کی طرح میرا خیال رکھا۔ ان کی بیگم بھی بہت اچھی تھیں۔ اس وقت ان کے چھوٹے چھوٹے تین بچے تھے۔ میرے ساتھ گھر کے فرد کی طرح سلوک کیا جاتا تھا۔ دفتری اوقات کے بعد میرا زیادہ وقت ان کے گھر پر گزرتا تھا۔ حاجی صاحب فلم کا ہفتہ وار شو دیکھنے پی ایم اے کاکول جاتے تو گھر والوں کے ہمراہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔

وہ بڑے قابل افسر تھے۔ انہوں نے مجھے پولیس کے کام کرنے کا طریقہ تفصیل سے سمجھایا۔ خصوصاً دفتری نظم ونسق' پولیس سٹیشن کی کارکردگی کے طریقے اور انسپکشن کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچائیں۔

طریق کار کو سمجھنا

انسپکٹر ذوق کو جو ملازمت کا 40 سالہ تجربہ رکھتا تھا اور ریٹائرمنٹ کے قریب تھا' مجھے تفتیش کا

طریق کار سکھانے پر مامور کیا گیا۔ وہ ایک اچھا شاعر تھا اور بعض اوقات اپنے روزنامچہ میں بھی شعر لکھ دیتا تھا۔ میری طرح وہ بھی ہوشیار پور کا مہاجر تھا۔ اس چیز نے ہمارے درمیان گہرا تعلق پیدا کر دیا۔

ایک دن اسے اور مجھے ایک قتل کیس کی تفتیش کے لیے بھیجا گیا جو ایک قریبی گاؤں باگنوٹر (آج کل وہاں تھانہ بن گیا ہے) میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ میں نے ابتدائی رپورٹ پڑھی جس میں تین افراد کو نامزد کیا گیا تھا۔ اس میں دو ہتھیاروں کا ذکر تھا' لیکن مہلک ضرب صرف ایک بتائی گئی تھی۔ اس طرح میرے ذہن میں ملزمان کی تعداد کی بابت شروع میں ہی شکوک وشبہات پیدا ہو گئے۔

ہم گاؤں میں پہنچے تو وہاں بہت سے لوگ پہلے سے جمع تھے۔ ایک گھنٹہ کی پوچھ گچھ کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ وقوعہ کا ملزم صرف ایک تھا دیگر افراد کو محض دشمنی کی بنا پر ملوث کیا گیا ہے۔ ذوق بھی میری رائے کا قائل ہو گیا اور اس نے ہجوم کے سامنے اپنے رائے کا اظہار کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ریسٹ ہاؤس لوٹ آئے اور ذوق نے کاغذی کارروائی شروع کر دی۔

جب اس نے فائل میں اپنی یہ رائے قلمبند کی کہ ''تینوں ملزمان قصوروار پائے گئے'' تو مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے بڑی نرمی سے مجھے پولیس کی یہ پرانی روایت سمجھائی کہ ایف آئی آر میں جو کچھ لکھا ہوا اس کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ اس طرح مقدمہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ یعنی کیس بن جاتا ہے ورنہ فریق صفائی استغاثہ کی کہانی میں پائے جانے والے تضادات سے فائدہ اٹھا کر ملزم کو بری کرا لیتا ہے۔ ''لیکن یہ کام سراسر غیر اخلاقی اور خلافِ قانون ہے۔'' میں نے احتجاج کیا۔ ''ایک حقیقی ملزم کے ساتھ دو بے گناہوں کو مجرم ٹھہرانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اسے نہ قانون تسلیم کرتا ہے نہ اخلاقیات اور نہ ہی انصاف''۔ میں نے زور دے کر کہا۔ تاہم ذوق نے اپنے طویل تجربہ اور کڑی ضابطہ پسندی کے پیش نظر میرے پرجوش خیالات اور وقتی جوش وخروش کو نظر انداز کر کے اپنی بات پر اصرار کیا۔ معاملہ ایس پی کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے میرے موقف کو درست قرار دیا۔ بیچارے انسپکٹر کو مجبوراً اکیلے ملزم کا چالان کرنا پڑا۔ تاہم اس نے صاف کہہ دیا کہ سماعت کے دوران وہ مصیبت میں پھنس جائے گا اور اس پر کیس کو خراب کرنے کا الزام لگایا جائے گا۔

واقعی وہی ہوا جس کی اس نے پیش گوئی کی تھی۔ پراسیکیوشن انسپکٹر نے اعتراضات کیئے تو حاجی

حبیب الرحمٰن کے جانشین ایس پی نے بیچارے ذوق کو چارج شیٹ کر دیا کہ وہ کیس خراب کرنے کا ذمہ دار ہے۔ پولیس حکام اور عدالت جائے وقوعہ سے طویل فاصلے پر تھے' اس لئے وہ اصل صورتِ حال کو سمجھنے میں ناکام رہے۔

وہ میری اولین تفتیش تھی جس سے میں نے کئی سبق حاصل کئے۔ میں نے محسوس کیا کہ حقیقی انصاف اور قانونی انصاف میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مخالف فریق اور عوام پولیس' عدالتوں بلکہ خود نظامِ عدل کے متعلق زبردست برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں صداقت اور انصاف کے راستے پر چلوں گا خواہ اس کے لیے مجھے کتنی ہی جدوجہد کیوں نہ کرنی پڑے۔ میں اپنے ماتحت تفتیش کنندگان کو بھی غیر ضروری طور پر ہراساں کرنے سے گریز کروں گا تاکہ وہ سینہ تان کر سچائی کے راستے پر چل سکیں۔ انسپکٹر ذوق کی دیانت داری مسلمہ تھی۔ وہ کوئی ذاتی محرکات بھی نہیں رکھتا تھا۔ یہ نظام کا جبر تھا جس نے اسے مشین کے ایک پرزہ کی حیثیت سے کام کرنے پر مجبور کر دیا۔

زیر بحث نظام کی اس سے بڑھ کر بوالعجبی کیا ہوگی کہ ایک ٹریفک انسپکٹر جو پورے ضلع میں ٹریفک کو کنٹرول کرنے اور ڈرائیونگ لائسنس جاری کرنے کا ذمہ دار تھا۔ خود گاڑی چلانا نہیں جانتا تھا۔ ضروری اہلیت کے بغیر محض عہدے پر فائز ہونا سنگین انتظامی خرابیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ کسی شخص کو ٹریفک انسپکٹر بنا دینے سے وہ راتوں رات ماہر نہیں بن جاتا۔ میں نے سنا کہ اس کی دولت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ وہ حکمران خاندان کے انتہائی قریب تھا۔ شاید ایسی نفع بخش پوسٹ پر اس کی تعیناتی کا سبب یہی تھا۔

ایوب خاں کا تعلق ہزارہ سے تھا اور لوگ ان کی تعریف کرتے تھے۔ البتہ ان کے بیٹوں کی بابت بعض ناگفتنی کہانیاں سننے میں آئیں اور ان کی کرپشن کے خوب چرچے ہوئے۔ بہرحال ہزارہ کے لوگ انہیں سچ نہیں مانتے تھے۔ میں بھی وہاں کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور بنگالیوں کے اعتراضات نیز نکتہ چینی مشکوک نظر آنے لگی۔ وہاں پروفیسر فیاض اور ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ کی باتیں کھوکھلی محسوس ہونے لگیں۔ طاقت کے نشہ نے مجھ پر اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے معقول تنخواہ مل رہی تھی اور جہاں کہیں جاتا لوگ سیلوٹ کرتے اور عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ میں خود کو دوسروں سے بہتر اور ممتاز

سمجھنے لگا۔ مارشل لا کے نفاذ سے مجھے وقتی طور پر جو تکلیف پہنچی اور مایوسی ہوئی تھی، وہ آہستہ آہستہ زائل ہونے لگی۔ میں اقتدار کے ذائقہ سے روشناس ہو رہا تھا۔ حالانکہ اس وقت میں محض زیرِ تربیت اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا اور مجھے کسی قسم کے اختیارات حاصل نہیں تھے۔ (کیا یہ معزز کلرک بننے کی علامات تھیں؟) اگر اقتدار کا نشہ ایک اے ایس پی کے دماغ میں اتنا فتور مچا سکتا ہے تو ملک کا صدر لوگوں کے احساسات سے بے خبر اور غافل ہونے کا واقعی جواز رکھتا ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کی کہ وہ مجھے عہدے اور اقتدار کی فسوں کاریوں سے محفوظ رکھے۔ میں نے خود کو بار بار یہ احساس دلانے کا تہیہ کر لیا کہ میں اس چکر میں ہرگز نہیں پڑوں گا۔ خدا کے فضل سے یہ احساس آئندہ زندگی میں میرے بہت کام آیا۔

یادگار دورہ

مئی 1965ء میں لاہور گیا اور وہاں ملک اسلم حیات سمیت بہت سے دوستوں سے ملاقات کی۔ ہزارہ ایک پُرامن اور پرسکون جگہ تھی جب کہ لاہور میں بڑا جوش و خروش دیکھنے میں آیا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح نے الیکشن ہار جانے کے باوجود ایوب خاں کو سیاسی طور پر شکست دے دی ہے۔ اس لیے وہ لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے کوئی ڈرامہ کرنے والے ہیں۔ تصورات اور عملی حقائق میں کتنا فرق ہوتا ہے اس کا اندازہ بعد میں ہوا۔

اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ کشمیر میں ایک غلط آپریشن کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ جو ستمبر میں ملک کو جنگ میں دھکیلنے کا سبب بن جائے گا۔ ملک اسلم حیات اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو اس کا پیشگی ادراک ہو گیا تھا۔ وہ خود غرض و خود پرست حکمرانوں کے ذہنوں کو پڑھنے اور سمجھنے کی بصیرت رکھتے تھے۔ بعد میں میں نے ان سے دریافت کیا کہ وہ ایسی چیزوں کا ادراک کیسے کر لیتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ

”میرے دل میں پاکستان کی بابت جو تشویش پائی جاتی ہے وہ ایسی باتوں سے آگاہ کر دیتی ہے۔“

لاہور کا وہ سفر میری زندگی میں سنگِ میل ثابت ہوا۔ بلقیس کے ساتھ میری شادی اسی دورہ کے دوران ہوئی۔ حاجی حبیب الرحمٰن اور دوسرے ساتھی یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ میں لاہور میں محض چند روز قیام کے دوران شادی کر کے اور دلہن کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔ حالانکہ اس بارے میں پہلے سے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی۔ حاجی حبیب الرحمٰن اور ان کی بیگم نے ہماری خوب تواضع کی۔ صبح، دوپہر اور

شام کو کھانے کھلائے۔ دوسروں نے بھی ان کی پیروی کرنے کی کوشش کی۔

وہ ہمارے لیے حقیقی خوشیوں کا زمانہ تھا۔ ہم ہنی مون کے لیے ایبٹ آباد سے کچھ فاصلے پر واقع کتھورڈ پہاڑی (نتھیا گلی) گئے۔ وہ ایک انتہائی خوبصورت جگہ ہے اور ان دنوں تو ہمیں جنت کا کوئی ٹکڑا دکھائی دیتی تھی۔ نتھیا گلی ایک صحت افزا مقام اور بڑی خوش منظر جگہ ہے ہم وہاں پیدل یا گھوڑے پر خوب سیر کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی گاڑی میں مری اور قرب وجوار کے دیگر مقامات پر بھی چلے جاتے تھے۔

وزیرِ خارجہ کے ساتھ شرط

ستمبر 1965ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان پہلی جنگ ہوئی۔ مجھے شہری دفاع کا کام سونپا گیا۔ میں نے ضلع بھر میں آگ بجھانے والے سامان' آلات' پناہ گاہوں اور بلیک آؤٹ کے انتظامات کا معائنہ اور جانچ پڑتال کی۔ بلقیس نے میری بڑی مدد کی اور ہر وقت میرے ساتھ رہی۔

22 ستمبر کو ہم نتھیا گلی گئے۔ وہاں پر مقیم نمایاں افراد میں منظور قادر (سابق وزیرِ خارجہ) اور ان کی بیگم بھی تھے۔ منظور قادر اور میرے مابین جنگ کے نتیجہ کی بابت طویل بحث ہوئی۔ میرا قیاس یہ تھا کہ ایوب خاں کل 11 بجے دن قوم سے خطاب میں جنگ بندی کا اعلان کرنے والے ہیں۔ جبکہ سابق وزیرِ خارجہ کا خیال تھا کہ لڑائی جاری رہے گی۔ میں نے کہا ''قوم کو ہمیشہ یہی بتایا گیا کہ ہم صرف مختصر اور زوردار مقابلہ میں کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ چیز بھارت کو مذاکرات پر مجبور کردے گی۔ اس لیے ہمیں اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انڈیا نے ہم پر جنگ ٹھونسی ہے۔ اس لیے ہمیں جس قدر ممکن ہو اس سے مثبت انداز میں نکلنا چاہیے''۔ منظور قادر کی رائے یہ تھی کہ ہمیں جنگ کے طول پکڑنے سے فائدہ پہنچے گا۔ اس طرح ہم کشمیر میں اپنے قدم جماسکیں گے۔

ہم 23 ستمبر کی صبح کو بھی جب صدر کے خطاب کو 11 بجے کی بجائے 3 بجے دوپہر تک مؤخر کردیا گیا' اپنے اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ آخرِ کار ہمارے درمیان 100 روپے کی شرط لگ گئی۔ میری اہلیہ بہت پریشان ہوئیں۔ انہیں خدشہ تھا کہ میں ایک باخبر وزیرِ خارجہ سے شرط ہار جاؤں گا۔

آخرِ کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ صدر کی تقریر شروع ہوئی اور وہ جلد ہی جنگ بندی کے اعلان پر پہنچ گئے۔ جناب منظور قادر نے بلاچون وچرا اپنی شکست تسلیم کرلی اور 100 روپے نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ سابق وزیرِ خارجہ جیسی شخصیت سے شرط جیتنے پر بلقیس کو اور مجھے جو خوشی ہوئی' اسے الفاظ

میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

ان دنوں یہ افواہ بھی سننے میں آئی کہ دراصل وزیرِ خارجہ بھٹو نے ایک سازش کے تحت ایوب خاں اور مسلح افواج کو جنگ میں دھکیل دیا تھا۔ بھٹو پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔ ان کے حامیوں نے جوابی الزامات لگائے۔ اس رسہ کشی کے باوجود بھٹو اقوامِ متحدہ میں اپنی جوشیلی تقریروں کی بدولت قومی ہیرو بن گئے۔ لوگوں نے ایوب خاں کو مطعون کرنا اور بھٹو کو سراہنا شروع کر دیا۔ بہتر علم رکھنے والے لوگوں کا خیال ہے کہ حقائق عام تصورات سے یکسر مختلف تھے اور حقیقت بیان بازی کے قطعی برعکس تھی۔



باب 5

پہاڑ اور صحرا

میری پہلی باقاعدہ پوسٹنگ ستمبر 65ء میں جنگ بندی کے فوراً بعد گھوٹکی (ضلع سکھر) کے مقام پر ہوئی جہاں میں نے سب ڈویژنل پولیس آفیسر کی حیثیت سے چارج سنبھالا۔ ابھی وہاں میرے پاؤں جمنے نہیں پائے تھے کہ دو ہفتے بعد سہون (ضلع دادو) کے اے ایس پی کی حیثیت سے کوٹری بھیج دیا گیا۔ میں ملازمت کے ابتدائی ایام میں بار بار کے تبادلوں سے بہت پریشان ہوا۔ میں اس پریشانی اور کوفت کو کبھی فراموش نہیں کر سکا چنانچہ میں نے پوری ملازمت کے دوران اپنے ماتحت افسروں کا تبادلہ کرنے سے پہلے ان کی جائز شکایتوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔

ضلع دادو کی سرحد مغرب کی طرف بلوچستان کے پہاڑی علاقہ کیرتھر سے ملتی ہے اور اس کے مشرق میں دریائے سندھ ہے۔ پہاڑی اور نہروں سے سیراب ہونے والا میدانی علاقہ قریباً برابر

برابر ہے۔ دریا کی جانب کا علاقہ (جو کچے کا علاقہ کہلاتا ہے) کی جھاڑیاں اور جنگلات ڈاکوؤں کی پناہ گاہیں ہیں جب کہ پہاڑی علاقہ بلوچستان سے آنے والے بدمعاشوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ وہ جگہ انتہائی غیر آباد تھی لیکن نوجوان ہونے کی بنا پر میں نے کچھ خاص پرواہ نہیں کی اور علاقے میں مسلسل چکر لگاتا رہا۔ دراصل میرے باس کو جبری رخصت پر بھیج دیا گیا تھا۔ اس لیے مجھے پورے ایک سال تک قائم مقام ایس پی کے طور پر کام کرنا پڑا۔ آصف فصیح الدین وردگ جو آج کل ایک معروف سیاستدان ہیں، تب دادو کے ڈپٹی کمشنر ہوتے تھے۔ وہ بڑے دلیر ہیں اور ہاتھ میں سٹین گن لے کر خود ڈاکوؤں کا پیچھا کیا کرتے تھے۔ ہم نے بدمعاشوں کے ساتھ بہت سے مقابلے کیے اور ان کی اندھا دھند فائرنگ سے بال بال بچتے رہے۔ ہم نے جان پر کھیل کر ڈاکوؤں کے پانچ مشہور گروہوں کا خاتمہ کر دیا جبکہ بہت سے دوسروں نے ہتھیار پھینک کر گرفتاری دے دی۔

نسوانی سوچ

دادو میں بلقیس کو تنہائی بہت زیادہ ستاتی تھی، اس لیے میں دوروں پر جاتا تو وہ بھی میرے ساتھ ہو لیتی۔ ایک شام سہون کو جاتے ہوئے ہم اچانک ڈاکوؤں کے نرغہ میں آگئے اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ اسے ایسی صورتحال سے پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ اس لیے چیخیں مارنے لگی۔ میں بھی پریشان ہو گیا کیونکہ ان دنوں وہ امید سے تھی۔ قریباً دس منٹ بعد فائرنگ بند ہوئی اور ڈاکو اپنے ایک ساتھی کو زخمی حالت میں چھوڑ کر بھاگ نکلے تو ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ میں نے انتہائی حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بیوی سے زخمی ڈاکو دیکھنے کی فرمائش کی۔ میں ایسے واقعات کا عادی ہو گیا تھا۔ تاہم یہ نہیں سوچا کہ عورت بڑے نازک احساسات رکھتی ہے۔ میری بات سن کر اسے زبردست دھچکا لگا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور اچانک بے ہوش ہو گئی۔ پولیس مقابلہ بجائے خود ایک خوفناک منظر تھا۔ پھر ایک ڈاکو کو زخمی حالت میں دیکھنا تو بڑے دل گردے کی بات ہوتی ہے۔ میں خود بھی نروس ہو گیا کہ کہیں ڈر کے مارے اس کا سانس بند نہ ہو جائے۔ خدا کے فضل سے وہ دوسرے دن سنبھل گئی۔

اس سے پہلے بھی ایک موقع پر میں اس کے خیالات کو سمجھنے میں ناکام رہا۔ ہوا یوں کہ ضلع دادو کے دورہ پر روانگی کے وقت اس نے میرے ساتھ جانے پر اصرار کیا۔ میں اس کی تکلیف کے پیشِ نظر اسے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ ناچار اس بے چاری کو یہ کہنا پڑا کہ اسے اکیلے رہتے ہوئے ڈر لگتا ہے، کیونکہ اس ویران و سنسان مقام پر میرے چلے جانے کے بعد اجنبی محافظوں کے علاوہ اس کے پاس کوئی

نہیں ہوتا۔ اس کے بعد میں اسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ میں یہ سوچتے ہوئے کہ بلقیس کو مزید خطرات سے نہ گزارا جائے اوائل نومبر 65ء میں اسے اپنے ساتھ لاہور لے گیا تا کہ وہ اپنی والدہ کے پاس رہ سکے۔ 24 نومبر کو یا اس کے لگ بھگ سہون کے دورہ کے دوران ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میرا معمول تھا کہ سہون شریف پہنچ کر سیدھا حضرت شہباز قلندرؒ کے مزار پر حاضری دیتا۔ اس کے بعد ریسٹ ہاؤس یا کہیں اور جاتا۔ اس روز بھی میں نے ایسا ہی کیا۔ ریسٹ ہاؤس میں نیند کے دوران میں نے صبح کے قریب خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو جڑواں بیٹے عطاء فرمائے ہیں جن کی شکلیں مجھ سے ہو بہو ملتی تھیں۔ پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھ پر خوشگوار حیرت کا عالم تھا۔ میں نے اٹھ کر نماز پڑھی اور خواب کی کیفیت اپنی بیوی کے نام خط میں لکھ کر لاہور بھیج دی۔ اللہ تعالیٰ نے تھوڑے عرصے بعد واقعتاً ہمیں دو بیٹوں سے نوازا جن کی شکلیں مجھ سے ملتی ہیں جیسا کہ مجھے خواب میں نظر آئی تھیں۔ میری اہلیہ نے وہ خط سنبھال کر رکھ لیا جسے وہ اکثر مجھے دکھایا کرتی تھی۔

بھٹو کا کیا بنے گا؟

جنوری 1966ء میں ایوب خاں اور بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری کے مابین معاہدہ تاشقند طے پایا۔ عوام نے اس معاہدہ کو یکسر مسترد کر دیا۔ انہوں نے پاکستان میڈیا کے ان دعووں کو سچ سمجھ لیا تھا کہ ستمبر 65ء کی جنگ میں پاکستان کو برتری حاصل تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ایوب خاں کشمیر کو بھارت کے شکنجہ سے آزاد کرانے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ بھٹو نے عوام کے موڈ کو بالکل ٹھیک سمجھا، چنانچہ اعلان تاشقند کے بارے میں انہوں نے ایسا ردعمل ظاہر کیا گویا کہ وہ اس سے خوش نہیں ہیں، جبکہ باخبر حلقوں کے مطابق وہ سمجھوتہ کی حمایت کرنے والے افراد میں سرفہرست تھے۔

اعلان تاشقند کے بعد بھٹو سہون شریف کے سجادہ نشین پیر گل محمد شاہ کی دعوت پر وہاں آئے۔ اس موقع پر وردگ اور مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ وہاں خوب شراب نوشی ہوئی گانا بجانا ہوا اور رنگ رلیاں منائی گئیں۔ ایک رقاصہ بھٹو کی فرمائش پر ان الفاظ کو بار بار گاتی تھی۔ "تاشقند ہو گیا" بھٹو تیرا کیا ہو گا؟

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بھٹو عوام کے جذبات کے ساتھ اظہار یکجہتی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وردگ اور میں نے اس بات کو بطور خاص نوٹ کیا کیونکہ اعلان تاشقند کے خلاف احتجاجی تحریک پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ لاہور اور راولپنڈی میں فائرنگ، آنسو گیس کا استعمال اور لاٹھی چارج کے واقعات روز کا

معمول بن گئے تھے۔ لاہور میں پولیس کی فائرنگ سے دو طالب علم مارے جا چکے تھے۔ سندھ میں انتظامیہ پوری طرح الرٹ تھی۔ کیونکہ بھٹو کا تعلق اسی صوبہ سے تھا۔ بھٹو بڑے بڑے جلوس نکال رہے تھے اور طلبا میں ان کی مقبولیت دن بدن بڑھ رہی تھی۔ ہمارے علاقہ میں طلبا کے دو بڑے ادارے واقع تھے ایک لیاقت میڈیکل کالج اور دوسرا سندھ یونیورسٹی (جامشورو)۔ ان دنوں سندھ یونیورسٹی کی طرف سے بھٹو کو ایل ایل ایم کی اعزازی ڈگری دینے کا اعلان ہو چکا تھا لیکن مغربی پاکستان کے گورنر نواب ملک امیر محمد خاں کی طرف سے بحیثیت چانسلر اس کی منظوری آنے میں دیر ہوگئی۔ طلبا کے بڑے ہجوم میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وردگ اور میں ایک تنگ سے کونے میں کھڑے تھے۔ طلبا نے ہم پر ہوٹنگ کی اور ہمیں تضحیک کا نشانہ بنایا۔ بھٹو اپنے ریلوے سیلون میں بیٹھے ہوئے اس توہین آمیز تاخیر پر سخت پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ کیونکہ وہ اس وقت ملک کے وزیر خارجہ تھے۔ آخر کار کئی گھنٹے کی تاخیر سے منظوری آ گئی تو ہمیں طلبا کے نرغہ سے رہائی ملی۔

جی ایم سیّد سے ملاقات

ممتاز سندھی سیاستدان جی ایم سید کا تعلق "سن" (ضلع دادو) سے تھا۔ وہ اپنے علاقہ کے بہت بڑے جاگیردار اور پیر بھی تھے۔ دریائے سندھ کے دائیں کنارے ان کے پرشکوہ اور عالیشان محلات تھے۔ ان کی نقل و حرکت ان کے گاؤں تک محدود کر دی گئی تھی اور ان سے احکام کی پابندی کرانا میری ذمہ داری تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس عمر رسیدہ آدمی کے ساتھ جو اکثر حکومت کے خلاف ہوتا تھا' حکمت و دانائی کے ساتھ معاملہ کیا جا سکتا ہے۔ ان دنوں (1965-66ء) وہ بھٹو کے حامی تھے۔

جب میں پہلی بار ان سے ملا تو وہ سخت اضطراب کی کیفیت میں تھے۔ میں ان کے ساتھ انتہائی عزت و احترام سے پیش آیا کیونکہ وہ آزادی سے پہلے اپنے دور کے سرکردہ مسلم راہنماؤں میں سے ایک تھے۔ ان دنوں بہت کم لوگ مسلمانانِ ہندوستان کی نمائندہ جماعت میں شامل ہونے کی جسارت کرتے تھے۔ وہ میرے خیالات سے بہت خوش ہوئے اور اطمینان کا اظہار کیا۔ اس کے بعد میں ان سے کئی دفعہ ملا وہ بتدریج مختلف مسائل پر گفتگو کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا "میں نے مسٹر جناح سے 1946ء کے الیکشن میں ٹکٹوں کی تقسیم پر اختلاف کیا تھا۔ میرے سیاسی مخالفین نے اس اختلاف سے فائدہ اٹھایا اور مسٹر جناح کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ ان لوگوں نے ذاتی مفادات کے تحت میرے خلاف بے سروپا پروپیگنڈہ

کر کے رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ مسٹر جناح نے علیحدہ ہوتے وقت میں نے جس تلخی کا اظہار کیا' مجھے اس پر آج بھی افسوس ہے۔ وہ بہت دردناک المیہ تھا جو میری زود رنجی، برہمی اور دوسروں کی طرف سے لگائی بجھائی کے باعث رونما ہوا۔

جی ایم سیّد اپنے بھتیجوں کے سخت مخالف اور ان سے خوفزدہ تھے۔ وہ مجرمانہ ذہنیت کے مالک تھے اور مبینہ طور پر قتل کی کئی وارداتوں میں ان کا ہاتھ تھا۔ سید کو یہ خوف لاحق تھا کہ گورنر مغربی پاکستان نواب آف کالا باغ ان نادانوں کو ان کے خلاف استعمال نہ کر لے کیونکہ وہ سیاسی حریفوں کے معاملہ میں بہت ہی ظالم اور سنگدل تھا۔

ایک دن جی ایم سید نے پیر صبغت اللہ (پیر پگارا کے والد) کے ساتھ جنہیں انگریزوں نے پھانسی دیدی تھی، اپنی واحد ملاقات سے متعلق دلچسپ واقعہ سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں پیر صاحب کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے سات بہت بڑے خالی اور تاریک کمروں سے گزرنا پڑا۔ ہر دروازہ پر خشمگیں نظروں سے گھورنے والے محافظ کھڑے تھے۔ پیر صاحب تک پہنچتے پہنچتے جی ایم سید پر زبردست خوف طاری ہو گیا اور وہ تھر تھر کانپنے لگے، حالانکہ وہ نوجوان تھے اور عام حالات میں کسی چیز سے نہیں ڈرتے تھے۔ علاوہ بریں پیر صاحب ان کے رشتہ دار بھی تھے۔ اس کے بعد جی ایم سید نے ان سے کبھی ملاقات کا نہیں سوچا۔

سیاسی مداخلت کی اصل حقیقت

عبدالحمید جتوئی اور ملک سکندر ضلع دادو کی دو نمایاں سیاسی شخصیات تھیں۔ وہ دونوں صدر اور گورنر کے بہت قریب تھے۔ تاہم انتظامی معاملات میں قطعاً مداخلت نہیں کرتے تھے۔ بایں ہمہ اس علاقے کے بہت سے افراد اور پولیس والوں نے مجھے یہ تاثر دیا کہ ان کی خواہش اور مرضی کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مارتا۔ چونکہ میں قومی وصوبائی اسمبلیوں کے اراکین اور دیگر ممتاز سیاستدانوں کے بارے میں ایسی باتیں اکثر سنتا رہتا تھا، اس لیے میں نے معاملہ کو گہرائی سے پرکھنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے اپنے ماتحتوں اور دوسرے لوگوں سے بڑے پیمانہ پر تبادلہ خیال کیا تو پتہ چلا کہ اصل صورتحال اس کے قطعی عکس تھی۔

میں نے دیکھا کہ بدعنوان اور مکار اہلکار سینئر افسروں پر غیر معمولی مسائل کا بوجھ ڈالنے کے لیے پیچیدگیاں پیدا کرتے اور کام نہ کرنے کے لیے تاخیری حربے استعمال کرتے ہیں۔ جب مشکلات پیدا ہوتی

ہیں اور لوگ شکایتیں کرتے ہیں تو اپنی جان بچانے کے لیے آسانی سے اسمبلیوں کے ممبران اور حکمران جماعت کے ارکان پر مداخلت کا الزام لگا دیتے ہیں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ سینئر افسران اس معاملے میں سیاستدانوں سے بات نہیں کریں گے۔ یہ حربہ بآسانی کامیاب ہو جاتا ہے کیونکہ سیاسی مخالفین ایسے الزامات کو خوب اچھالتے ہیں اور ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔اس کے بعد سول اور فوج کے سینئر بیورو کریٹس ذرائع ابلاغ کے نمائندے اور دیگر مفادات رکھنے والے افراد ان الزامات کو پورے سیاسی نظام کے سر منڈھ دیتے ہیں۔

سفارش کا دروازہ کھولنے کا ایک معروف طریقہ تعیناتیاں اور تبادلے ہیں۔سینئر انتظامی افسران معاملات کو انسانی مسائل کے طور پر نہیں نمٹاتے۔ وہ ڈسپلن' اطاعت اور وفاداری جیسی اصطلاحات کے پردہ میں چھپی رسمی حماقتوں کا ارتکاب کر کے اپنے غریب ماتحتوں اور ان کے اہل خاندان کے ساتھ ناانصافی کرتے اور ان کے لیے طرح طرح کی تکالیف کا موجب بنتے ہیں۔ متاثرین ان پریشانیوں سے بچنے کے لیے خارجی سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ جس میں سیاستدانوں کی سفارش بھی شامل ہوتی ہے۔ اگر سینئر افسران اس پہلو کو احتیاط اور توجہ سے پیش نظر رکھیں تو دیگر معاملات میں بھی مبینہ طور پر مداخلت کا بآسانی خاتمہ ہو سکتا ہے۔

دادو میں تقرری کے دوران عوامی نمائندوں کی طرف سے میرے کام میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی گئی۔ جب میں دوسروں سے اس کا ذکر کرتا تو کوئی بھی میری بات پر یقین نہیں کرتا تھا۔

تبادلوں کے مسائل کا حل

میں تعیناتی اور تبادلوں کے مسائل کو اپنے طریقہ سے نمٹاتا تھا۔ میں قریباً ایک سال تک ضلع دادو میں قائم مقام ایس پی رہا۔ اس حیثیت میں مجھے تھانوں، ٹریفک برانچ، پراسیکیوشن برانچ، سی آئی اے اور خود اپنے دفتر وغیرہ کے لیے سینکڑوں تعیناتیاں اور تبادلے کرنے پڑے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تمام تبادلے متعلقہ عہدوں کی ضروریات، اہلکاروں کے ذاتی ریکارڈ اور ان کی صلاحیت و اہلیت نیز جرائم کے بارے میں ان کی معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے پورے سٹاف کے مشورہ سے کیا کروں گا۔ جس میں ان کی سہولت اور رہائش نیز بچوں کی تعلیم کے حوالہ سے ان کی ضرورتوں کو مدنظر رکھا جائے گا کیونکہ وہ بھی انسان ہیں اور ان کی بھی بہت سی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔

میں نے اس طریق کار کی بابت اپنے ڈی ایس پی صاحبان، بعض انسپکٹروں اور سب انسپکٹروں

سے مشورہ کیا۔ ان کے لیے یہ تصور یکسر اجنبی تھا۔ انہوں نے میرے ان مثالی خیالات کو ملازمت کے کم تجربہ کا نتیجہ قرار دیا۔ ڈی ایس پی صاحبان بطور خاص پریشان ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ڈسپلن تباہ ہو جائے گا۔ ان کے مطابق ان معاملات میں ماتحتوں سے مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا کام تو صرف احکام پر عمل کرنا ہوتا ہے دیگر معاملات سے ان کا کیا تعلق؟

بہر حال میں نے اپنے منصوبہ پر عملدآمد کرانے اور اس کی افادیت ثابت کرنے کا تہیہ کر لیا۔ میری ہدایت پر ضلع کے ہر پولیس ملازم سے کہا گیا کہ وہ تبادلہ کے لیے دفتر کو اپنی تین ترجیحات سے تحریری طور پر مطلع کرے۔ ہمیں محض دو ہفتوں میں مکمل اعداد و شمار موصول ہو گئے۔ میں نے تین دن میں اپنے سٹاف کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد ایک اتوار کو (جو ان دنوں چھٹی کا دن ہوتا تھا) پورے ضلع کی گرینڈ پریڈ طلب کر لی۔

پریڈ کے بعد سپاہی سے لیکر ایس پی تک ہم سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور باہمی مشورہ سے تعیناتیوں اور تبادلوں کا فیصلہ کرنے لگے۔ ملازمین نے ایک دوسرے کے مسائل کا احساس کرتے ہوئے ایڈجسٹمنٹ پر آمادگی ظاہر کی۔ ہم نے شام تک ہر آدمی کے اطمینان کے مطابق کام مکمل کر لیا۔ ڈی ایس پی صاحبان، انسپکٹرز اور سب انسپکٹرز نے اس طریق کار کو بے حد سراہا۔

میں نے اپنے مختصر خطاب میں جوانوں کو بتایا کہ ہر آدمی کا تبادلہ اس کی منشا کے مطابق کر دیا گیا ہے۔ اب جرائم کو کنٹرول کرنا اور علاقہ میں امن و امان بحال رکھنا ان کی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے ہمارے دیہی معاشرہ کی روایت کے مطابق انتہائی درجہ کی یقین دہانی کرائی کہ اگر وہ پوری کوشش نہ کرے تو اپنے باپ سے پیدا نہیں۔ یہاں تک کہ جن لوگوں کو سخت فرائض سونپے گئے مثلاً گارڈ کے طور پر کھڑے ہو کر ڈیوٹی دینے اور دفتری کام کرنے والے بھی ناراض نہیں ہوئے کیونکہ انہیں وہ ذمہ داریاں ان کی صلاحیت و اہلیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تفویض کی گئی تھیں۔ کسی نے ردوبدل کے لیے کوئی سفارش نہیں کرائی۔ اگر کسی ماتحت کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ کسی بھی وقت مجھ سے مل سکتا تھا۔

میرے تصورات جنہیں حقیقت پسندانہ اور مثالی قرار دیا گیا تھا اپنے نتائج کے اعتبار سے انتہائی شاندار ثابت ہوئے۔ اس طریقہ پر عملدآمد کے نتیجے میں پولیس کی کارکردگی خاصی بہتر ہو گئی۔ جرائم پر قابو پا لیا گیا' ڈاکوؤں کے کئی مشہور گروہوں نے یا تو سرنڈر کر دیا یا وہ ملیامیٹ کر دیئے گئے۔ یہاں تک کہ وڈیرے جو عموماً مجرموں کو پناہ دیتے تھے، ان کا تعاقب کرنے میں تعاون کرنے لگے۔ عوام اور پولیس کے مابین

خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔ سندھ یونیورسٹی اور لیاقت میڈیکل کالج کے طلبا نے جو سردردی کا باعث بنے ہوئے تھے، پولیس سے دوستانہ مراسم استوار کر لیے۔

قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین جو سفارشوں کے لیڈ نام تھے' نئی صورتحال سے بڑے خوش ہوئے کیونکہ اب کوئی ان کو سفارش کرانے کے لیے تنگ نہیں کرتا تھا۔ وہ میرے متعلق اکثر تحسین آمیز خیالات کا اظہار کرتے پائے گئے۔ ادھر عوام میں بھی یہ تاثر زائل ہو گیا کہ با اثر طبقوں کی منشاء کے بغیر کوئی چیز حرکت نہیں کر سکتی۔ میں نے اس لائحہ عمل پر پوری ملازمت کے دوران عمل کیا اور اس کے شاندار نتائج نکلے۔

ڈاکو کا وعدہ

بعض اوقات کسی انسان پر اعتماد کرنے کا بہت اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے خواہ وہ بدمعاش ہی کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں مشہور ڈاکو ایوب کھوڑو کا واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ ایک دن میں اپنی پک اپ میں تھانہ بولا خاں کا دورہ کر رہا تھا۔ میرا پرانا ریڈر عبدالحکیم بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو پیدل جا رہا تھا۔ میرے ریڈر نے بتایا کہ یہ مشہور ڈاکو ایوب کھوڑو ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید ریڈر کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایک ڈاکو بھلا غیر مسلح کیسے ہو سکتا ہے اور دن کے وقت یوں پیدل کس طرح چل پھر سکتا ہے؟ اس نے ہمیں دیکھ کر اچانک دوڑ لگا دی۔ ہم نے تعاقب کر کے اسے جا لیا۔ وہ واقعی ایوب کھوڑو تھا۔

"تم اس حالت میں کیوں پھر رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

" کل میری بہن کی شادی ہے۔ میں نے سوچا کہ اپنے گاؤں جانے کا محفوظ ترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے۔" ایوب نے جواب دیا۔

میں اس کی عقل سلیم سے خاصا متاثر ہوا اور مجھے اس پر ترس بھی آیا۔ اس کے گاؤں والوں سے چھان بین کرنے پر اس کی بات درست نکلی۔ اگلے دن واقعی اس کی ہمشیرہ کی شادی ہونے والی تھی۔ میں نے اپنے سٹاف کے زبردست اختلاف کے باوجود اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ میرے سٹاف والے اتنے خطرناک اور بدنام زمانہ ڈاکو کو پکڑنے پر کسی بڑے انعام کی توقع کر رہے تھے۔

ایوب پولیس کی تحویل میں بھی اپنے گھر جانے کو تیار تھا۔ لیکن میرا نقطہ نظر مختلف تھا۔ میں نے کہا۔ " تمہاری بہن کو پورے گاؤں کے سامنے بے عزتی محسوس نہ ہو اس لیے تم آزادانہ حیثیت سے اپنے

گھر جاؤ۔" ڈاکو جو بدترین سزا خاموشی سے برداشت کر سکتا تھا، میرے چند شفقت بھرے الفاظ سن کر خوشی سے پاگل ہوگیا اور چیخیں مار کر رونے لگا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ تین دن بعد واپس آ کر سرنڈر کر دے گا۔ واقعی تیسرے دن اس نے گرفتاری دے دی۔ اس کی عزت نفس اور انسانیت کی بابت میرا یقین مزید پختہ ہوگیا۔ بعد میں وہ نہ صرف اپنے گینگ کی بلکہ تین دوسرے گروہوں کی گرفتاری مین بھی مددگار ثابت ہوا۔

26 فروری 1966ء کو اللہ تعالیٰ نے مجھے پہلا بیٹا عطا فرمایا۔ ایک مہینے بعد میں بلقیس اور بچے کو دادو لے آیا۔ پھر نومبر میں 6 ہفتے کی فوجی تربیت کے لیے کوئٹہ روانہ ہوگیا اور بلقیس لاہور چلی گئی۔

کوئٹہ کا قیام خاصا پرلطف ثابت ہوا، البتہ وہاں کی سردی ناقابل برداشت تھی۔ جنرل اختر حسین ملک اکثر گیریژن کلب آتے رہتے تھے۔ وہ اپنی گفتگو سے سامعین کو مسحور کر لیتے تھے۔ وہ اس نکتہ پر ہمیشہ سنجیدگی سے بحث کیا کرتے تھے کہ اگر 1965ء کی جنگ میں انہیں چھمب جوڑیاں سیکٹر کی کمان سے تبدیل نہ کیا جاتا تو وہ یقیناً کشمیر فتح کر لیتے۔ ایبٹ آباد میں ایک باخبر اعلیٰ افسر نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اس آپریشن کو خراب کر دیا تھا۔ اس لیے ان کا تبادلہ کرنا پڑا۔ تاہم ان کی مدلل اور شیریں گفتگو ہمیشہ یاد رہے گی۔

کوئٹہ کلب میں جن جرنیلوں اور کرنیلوں سے میری روزانہ ملاقات ہوتی تھی، وہ باہر کی حقیقی صورت حال سے یکسر بے خبر تھے وہ فوج کی طرف سے کیے جانے والے پروپیگنڈہ پر یقین رکھتے اور خود کو قومی ہیرو سمجھتے تھے۔ اس سے بڑھ کر حقیقت کا انکار اور کیا ہوسکتا تھا۔ اگر کوئی شخص تدبیر اور سلیقہ سے حقائق پیش کرتا تو وہ فوراً چپ ہو جاتے۔ اس قسم کی باتیں دادو میں بھی سننے میں آئیں۔ بہرحال دیہات میں رہنے والے لوگ صحیح طور سے جانتے ہیں کہ دشمن نے سندھ میں کتنے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا۔

ایک نیک آدمی کا وصال

فوجی تربیت مکمل ہونے پر میں 16 دسمبر 1966ء کو کوئٹہ سے دادو کے لیے روانہ ہوا۔ جیکب آباد کے سٹیشن پر ریلوے والوں نے مجھے ایک تار دیا جس میں میرے سسر میاں محمد شفیع کے لندن میں فوت ہو جانے کی المناک اطلاع دی گئی تھی اور مجھے فوری طور پر لاہور پہنچنے کو کہا گیا تھا۔ تار میرے سامنے پڑا تھا لیکن مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ یقیناً کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔ 56 برس کا ہونے

کے باوجود بظاہر ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ شاید مولوی عبدالعزیز فوت ہو گئے ہوں جو ان دنوں ہسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ میں انتہائی دل گرفتگی اور غم و اندوہ کی حالت میں کراچی روانہ ہو گیا تا کہ وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز لاہور جا سکوں۔ کراچی پہنچ کر میں نے روزنامہ نوائے وقت خریدا تو اس کے صفحہ اول پر تصویر کے ساتھ میاں صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر چھپی ہوئی تھی۔ اس تصدیق نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

میں انتہائی تلخ تجربہ سے گزر رہا تھا یہ سوچ سوچ کر میری روح ہلکان ہو رہی تھی کہ اس آدمی کی موت پسماندگان کے لیے کس قدر رنج و غم اور مسائل کا سبب بنے گی۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری رہے یہاں تک کہ میں لاہور پہنچ کر غم زدہ خاندان میں شامل ہو گیا۔ ابھی وہ صدمہ تازہ تھا کہ دوسرے دن مولوی عبدالعزیز صاحب کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ انہیں لاہور کے سب سے بڑے قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک کیا گیا۔

میاں شفیع کی میت لندن سے ایک دن بعد پہنچی۔ میں نے لاہور ایئرپورٹ پر میلوں لمبے ماتمی جلوس کو دیکھا جس میں شامل سب لوگ نوحہ کناں تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر ہر دلعزیز تھے۔ اس وقت ان کے والدین بقیدِ حیات تھے۔ وہ منظر بڑا ہی المناک تھا جب میاں صاحب کے والد مولوی چراغ دین ایڈووکیٹ نے اپنے عظیم بیٹے کے چہرہ کو بوسہ دیا۔ میں میاں صاحب کی غمزدہ والدہ سے اظہارِ تعزیت کرنے گیا تو میری زبان گنگ ہو گئی۔ شدتِ غم کے باعث ایک لفظ بھی نہیں بول سکا۔ غم کے مارے والدین تھوڑے ہی دنوں میں یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

میرے سسرالی رشتہ دار انتہائی غمزدہ اور شکستہ دل تھے۔ اس لیے میاں صاحب کے کفن دفن کے انتظامات مجھے کرنے پڑے۔ کلب روڈ پر G.O.R.I میں میاں صاحب کی رہائش گاہ سے میانی صاحب قبرستان تک سوگواروں کا اژدہام تھا۔ سوگ اور تعزیت کا سلسلہ کئی دن جاری رہا۔ میری ساس نے صدمہ سے نڈھال ہونے کے باوجود بچوں کی خاطر ہمت سے کام لیا اور دوسروں کی ڈھارس بندھائی۔

خاندان کے سربراہ کے اچانک اٹھ جانے کے بعد میری سسرال کو مشکل صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ بلقیس سب سے بڑی تھی جب کہ اس کے بھائی سکول اور کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ میرے کندھوں پر بہت بھاری ذمہ داریاں آن پڑیں۔ ان دنوں ایس ڈی قریشی مغربی پاکستان کے آئی جی تھے۔ میں نے ان سے ملاقات کی اور انہیں اپنے مسائل سے آگاہ کرنے کے بعد لاہور میں تبادلہ کی درخواست کی۔ وہ مجھے

دادو سے ہلانا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ان کے بقول میں نے طلباء کے بلوؤں کے اور دیگر مسائل کو ایسی ہنر مندی اور چابکدستی سے حل کیا تھا کہ انہیں میرا مناسب متبادل نظر نہیں آ رہا تھا۔ آئی جی کی طرف سے ایک افسر کے لیے اس طرح کا خراج تحسین بڑے فخر کی بات ہوتی ہے۔ خصوصاً ایسے آدمی کے لیے جو ملازمت کے بہت ابتدائی درجے میں ہو۔ تاہم اس سے میرا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ آئی جی صاحب کے انکار کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے اپنی درخواست پر زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔

ملک خدا بخش بُچہ میرے سسر کے رفیق کار رہ چکے تھے اور ان دنوں صوبائی وزیر تھے۔ وہ اظہار تعزیت کے لیے آئے تو مجھے لاہور میں تبادلہ کرا لینے کی تجویز پیش کی۔ میں نے انہیں اپنی ناکام کوشش کے بارے میں بتایا تو انہوں نے ازخود گورنر موسیٰ خاں کے نام ڈی او لیٹر لکھا جس پر میرے فوری تبادلہ کے احکام جاری کر دیئے گئے۔ یوں جنوری 67ء میں میرا تبادلہ لاہور ہو گیا اور میں نے سٹرائیکنگ فورس (قربان لائن) کے اے ایس پی کا چارج سنبھالا۔ آئی جی نے اس معاملے میں سیاسی مداخلت کا برا منایا لیکن اگر انہوں نے وہی پالیسی اپنائی ہوتی جو دادو میں میں نے اختیار کی تھی تو کوئی شکایت پیدا نہ ہوتی۔ مجھے معلوم نہیں، آیا آئی جی کو اپنے طرز عمل کی وجہ سے ناپسندیدہ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا یا نہیں اور وہ میرا مناسب بدل ڈھونڈ سکے یا نہیں۔ تاہم وہ میری طرف سے اظہار تشکر حاصل کرنے میں یقیناً ناکام رہے۔



باب 6

امنڈتے سیاہ بادل

لاہور میں پولیس سٹرائیکنگ فورس کی کمان میرے لیے ایک ولولہ انگیز تجربہ تھا۔ سٹرائیکنگ فورس ایک امدادی فورس ہوتی ہے جسے صرف خطرناک اور شدید ہنگاموں کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں گھڑ سوار پولیس کا دستہ بھی شامل ہوتا ہے۔

جرائم کو کنٹرول کرنا اب میری ذمہ داری میں شامل نہیں رہا تھا۔ اس طرح میں بعض ایسی سرگرمیوں پر توجہ دینے کے قابل ہو گیا جو نظم وضبط یا تنظیم سے متعلق سرگرمیاں کہلاتی ہیں۔ میں نے ایک گھوڑا کلب (Pony Club) قائم کیا، پولو ٹیم تشکیل دی اور اپنے پسندیدہ کھیل والی بال سمیت مختلف کھیلوں کا اہتمام کیا۔ آئی جی نے مجھے صوبے کا چیف سپورٹس آفیسر مقرر کر دیا۔ اس حیثیت سے میں نے ٹینس کورٹ تعمیر کرائی اور گورنر ہاؤس کے نزدیک پولیس کلب میں وسیع سکوائش کورٹ بنوائی۔ ڈسٹرکٹ پولیس لائنز (لاہور) میں باسکٹ بال کورٹ تعمیر کی گئی۔ ہاکی کے قومی ہیرو منیر ڈار کی مدد سے، جو پہلے سے پولیس میں موجود تھے، مختلف کھیلوں کے لیے نمایاں قومی کھلاڑیوں کا انتخاب کیا گیا۔ انسپکٹر جنرل میاں بشیر احمد نے جو بذات خود کھیلوں کے بڑے شوقین اور کھلاڑیوں کے قدردان تھے، کھلاڑیوں کو پولیس میں اچھے اچھے عہدے دیئے۔ اس طرح پولیس ٹیموں نے کھیلوں کے قومی اور بین الاقوامی مقابلوں میں جیتنا اور اچھی پوزیشن حاصل کرنا شروع کر دیا۔

کچھ دنوں بعد حاجی حبیب الرحمٰن کو ایس ایس پی لاہور بنا دیا گیا۔ صاحبزادہ رؤف علی خان لاہور کے ڈی آئی جی تھے۔ ان دونوں کا شمار پولیس کے انتہائی قابل اور باصلاحیت افسران میں ہوتا تھا۔ مجھے ان دونوں کے سٹاف آفیسر کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا اور میں نے وہ ذمہ داری ان کے اطمینان کے مطابق نبھائی۔ حالانکہ ان کے مابین بہت سے معاملات میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔

ایک اہم مسئلہ جس سے مجھے فورس میں واسطہ پڑا، وہ عملہ میں توقع سے کہیں زیادہ غیر حاضر رہنے کا رجحان تھا۔ میں نے اس سلسلے میں سخت سزائیں دینے کا عام دستور اپنانے کی بجائے غیر حاضر باشی کی وجوہات معلوم کرنے کے لیے فورس کے ہر ملازم کا انٹرویو لیا۔ میں نے ملازمین سے کہہ دیا کہ اپنے مسائل بے تکلفی کے ساتھ صاف صاف بیان کریں۔ پتہ چلا کہ سابق کمانڈر کسی نہ کسی ہنگامی سبب کے پیش نظر چھٹی

دینے سے اکثر انکار کر دیتے تھے۔ حتیٰ کہ بیچارے سپاہیوں کو اپنے انتہائی ضروری مسائل سے نمٹنے کے لیے بھی چھٹی نہیں ملتی تھی۔ اس لیے وہ غیر حاضری کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ یہ طریقہ یقیناً مناسب نہیں تھا۔

میں نے فورس کی گرانڈ پریڈ کا اہتمام کرایا اور نظم وضبط نیز پابندی وقت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ ملازمین کو یقین دلایا کہ حقیقی ضرورت کی صورت میں انہیں چھٹی دینے سے انکار نہیں کیا جائے گا اور ان سے توقع کی جائے گی کہ وہ اپنا کام دیانتداری اور محنت سے کریں۔ اس کے بعد میں نے ملازمین پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی جو طے کرتی تھی کہ آیا چھٹی کی ضرورت حقیقی ہے یا فرضی۔ اگر کمیٹی سفارش کر دیتی تو میں فوراً منظوری دے دیتا تھا۔ سال کے دوران ہر ملازم کو چھٹی دی گئی اور حاضری سو فیصد ہو گئی۔ کسی کو بہانے بنانے کی ضرورت نہیں رہی۔ میری فورس تھوڑے ہی عرصہ میں پہلے سے زیادہ مستعد، اہل اور ذمہ دار بن گئی۔

پاک آرمی کے سابق کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ نے ملک امیر محمد خاں کی جگہ مغربی پاکستان کے گورنر کا منصب سنبھالا۔ بہت سی شکایات موصول ہونے پر انہوں نے غنڈوں اور بدمعاشوں کے خلاف خصوصی مہم چلانے کا حکم دیا۔ لاہور پولیس نے ڈی آئی جی اور ایس ایس پی کے زیر قیادت خطرناک مجرموں کی پناہ گاہوں اور ٹھکانوں پر چھاپے مارے۔ جس کے دوران بہت سے غنڈے پولیس مقابلوں میں مارے گئے۔ باقی ماندہ گرفتاریاں دے کر جیلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اہل لاہور پولیس کی تعریفیں کرنے لگے۔ مجھے انسداد غنڈہ گردی مہم کی روزمرہ نگرانی کرنے اور ڈی آئی جی نیز ایس ایس پی کو بریف کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ وہ تجربہ میرے لیے پیشہ ورانہ طور پر بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ اس طرح مجھے ایک تشدد پسند اور منظم گروہ کا مطالعہ کرنے اور انہیں سمجھنے کا موقع مل گیا۔

میاں بشیر احمد جو ایس ڈی قریشی کے بعد آئی جی پولیس بنے، ایک ملنسار، مضبوط ارادے کے مالک، بے تکلف اور انتہائی سخت کمانڈر تھے۔ وہ کھیلوں کے شوقین اور سکواش کے بہترین کھلاڑی تھے۔ وہ اپنے سر کے بال روزانہ منڈواتے تھے اور پولیس میں یل برائنر (ہالی وڈ کا مشہور اداکار جس نے یہ اسٹائل 1956ء میں ایک فلم "King and I" میں اختیار کیا تھا) کے نام سے مشہور تھے۔ بظاہر وہ بڑے سخت تھے لیکن حقیقتاً انتہائی رحم دل اور شفیق انسان تھے۔ ان کی پیشہ ورانہ مہارت اور دیانتداری کا پولیس کے عام حلقوں میں بے حد احترام کیا جاتا تھا۔

میں صاحبزادہ رؤف علی کی پیشہ ورانہ اہلیت و قابلیت سے بھی بہت متاثر ہوا۔ وہ معاملات کی چھان بین بڑی باریک بینی سے کرتے تھے اور مقدمات کی پیچیدہ جزئیات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ وہ اپنے ماتحتوں کو کنٹرول کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اور انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔ انہیں گمراہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ حاجی حبیب الرحمٰن بھی پولیس کے کام کو پوری طرح سمجھتے تھے۔ انہیں ہنگاموں پر فراست و حکمت کے ساتھ قابو پانے میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ وہ تھانوں کا معائنہ کرنے کے ڈھنگ سے پوری طرح آگاہ تھے اور ماتحت انہیں جل دینے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ میں خوش قسمت تھا کہ مجھے پولیس کے مذکورہ بالا تین انتہائی ممتاز افسران کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

پرانے ساتھیوں سے ملاقات

مجھے جب کبھی فرصت میسر آتی میں گورنمنٹ کالج چلا جاتا۔ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں شرکت کرتا اور پرانے دوستوں سے ملنے کے لیے ڈسٹرکٹ و ہائی کورٹ بار پہنچ جاتا۔ چوہدری غلام باری سلیمی، میرے سابق سینئر شیخ اظہار الحق، وکالت میں میرے سینئر رفیقِ کار ملک اسلم حیات اور دوسرے لوگ مجھے بتایا کرتے تھے کہ ایوب خاں اپنی مقبولیت کھو چکے ہیں۔ حبیب جالب کے ساتھ جو کہ ہمیشہ کا باغی شاعر تھا، جب بھی ملاقات ہوتی وہ ایوب خاں کے بارے میں بڑی سخت زبان استعمال کرتا تھا۔ دوسری طرف میں جن سرکاری حلقوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا وہ اس امنڈتے ہوئے طوفان سے قطعاً بے خبر تھے۔

طلبا میں حکومت کے خلاف نفرت اور شدید غصہ پایا جاتا تھا۔ ایک دن میں وردی پہن کر اپنے استاد سعید شیخ سے ملنے گورنمنٹ کالج چلا گیا۔ میں نے طلبا کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت دیکھی۔ میں نے بڑی خوش دلی اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا، لیکن جواب میں کوئی مسکراہٹ نہیں ملی۔ میں نے اس کا ذکر شیخ صاحب سے کیا۔ انہوں نے معنی خیز تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ مجھے اس وقت بڑا دکھ ہوا جب میرے استاد نے بھی اپنے اصل جذبات کے اظہار میں مجھ پر بداعتمادی ظاہر کی۔ ان کے نزدیک میں ایک پولیس آفیسر تھا جو حکمران طبقے کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ ایک سرکاری ملازم پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھے۔ گویا مملکت میں ''سب اچھا'' نہیں تھا۔ میں اپنے استاد پروفیسر فیاض کے قیمتی مشورے حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ بہت دور (انگلستان) جا چکے تھے۔

اپوزیشن پارٹیاں انتہائی فعال تھیں۔ آئے دن ملک کے دونوں حصوں میں ان کے جلسے ہوتے رہتے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے جو ایک جوشیلے رہنما تھے' صوبائی خودمختاری کے لیے اپنا 6 نکاتی پروگرام پیش کر دیا تھا اور ان کے خلاف اگرتلہ سازش کیس کی سماعت جاری تھی۔ حزبِ اختلاف والے رائے عامہ کو بڑے جوش وخروش سے بیدار کر رہے تھے۔ دل کا دورہ پڑنے کے بعد معاملات پر ایوب خاں کی گرفت کمزور ہوگئی تھی۔ تاہم قومی پریس' سرکاری بیٹریوں میں جکڑ بند ہونے کے باعث ''عشرہٴ اصلاحات وترقی'' منا رہا تھا۔ اخبارات کے کالموں میں ہر طرف خوشی کی لہر دوڑتی اور دودھ و شہد کی نہریں بہتی دکھائی جارہی تھیں۔

لوگوں کے دل سے حکومت کا خوف ختم ہوگیا اور طلبا نے سڑکوں پر احتجاج شروع کر دیا۔ راولپنڈی کے شیخ رشید احمد اور لاہور کے جہانگیر بدر (آج کل یہ دونوں بالترتیب مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے رہنما ہیں) احتجاج کرنے والے طلبا میں نمایاں اور سرفہرست تھے۔ ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ جلوسوں کی قیادت کرتے ہوئے باآواز بلند کہا کرتے تھے کہ عوام کو غاصب کے خلاف علمِ بغاوت علم بلند کرنے کا قانونی حق ہے۔ پولیس پوری طرح مستعد و چوکس تھی جیسا کہ اس طرح کی صورتحال میں ہوا کرتی ہے۔

راولپنڈی کے پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کے سامنے رونما ہونے والا ایک ناخوشگوار حادثہ پورے ملک میں غم وغصہ کی لہر دوڑانے کا سبب بن گیا۔ وہاں مری روڈ پر طلبا کا جلوس اپنے بعض ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کر رہا تھا جنہیں پشاور کے تفریحی دورہ سے واپس آتے ہوئے کسٹم اہلکاروں نے کپڑے کی سمگلنگ کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا۔ ہنگامہ آرائی اور نعرہ بازی کے دوران پولیس نے فائرنگ شروع کردی جس سے ایک طالب علم مارا گیا۔ مظاہروں میں اس قسم کے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان دنوں کی نفرت اور غیظ وغضب سے بھری ہوئی فضا میں لوگوں نے اس معاملہ کو حکومت کی منتقمانہ کارروائی قرار دے دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے لیے راولپنڈی میں ایک بڑے جلوس کی قیادت کی۔ یوں لوگوں کو حکومت کے خلاف اپنے جذبات کے اظہار کا اچھا موقع مل گیا۔

بھٹو نے 9 نومبر 1968ء کو راولپنڈی سے لاہور تک بذریعہ تیزگام سفر کیا۔ ہمیں رپورٹ ملی کہ راستے میں ہر سٹیشن پر لوگوں کے پُرجوش اور مشتعل ہجوم کی طرف سے بھٹو کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا گیا۔ ٹرین 5 گھنٹے کی تاخیر سے لاہور پہنچی۔ ہم نے ریلوے سٹیشن اور شہر کی بڑی سڑکوں پر امن وامان قائم رکھنے کے لیے حسبِ معمول ضروری انتظامات کر رکھے تھے۔ میری ڈیوٹی ریلوے سٹیشن پر تھی۔ لوگوں کے ہجوم میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ پلیٹ فارموں' پلوں' چھتوں اور سڑکوں کے ساتھ

واقع میدانوں میں تاحدِ نظر سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے۔ جب ریل گاڑی پہنچی تو ہجوم جوش میں پاگل اور کنٹرول سے باہر ہو گیا۔

بھٹو اور ان کے ساتھی اپنے ڈبہ سے باہر نہیں آ سکے۔ اس موقع پر ممتاز بھٹو نے ایس پی ریلوے ملک نذیر احمد سے درخواست کی کہ بھٹو کو تحفظ فراہم کیا جائے' ورنہ وہ دم گھٹ کر مر جائیں گے۔ ہم بڑی مشکل سے ان کی کار پلیٹ فارم پر لائے۔ بھٹو کو ڈبہ سے نکالا۔ ان کے گہرے دوست مصطفیٰ کھر نے کار چلانے کی کوشش کی لیکن راستہ نہیں ملا۔ لوگوں نے کار اپنے کندھوں پر اٹھا لی اور اسے باہر لے آئے۔ کار جونہی زمین پر رکھی گئی' کھر نے سپیڈ تیز کر دی۔

میں بطور تماشائی اس منظر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا' اچانک ایک اینٹ میرے بائیں کندھے پر آ کر لگی۔ میں درد سے بلبلا اٹھا۔ پاس کھڑے ہوئے پولیس والوں نے بے اختیار ہجوم پر لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ تاہم میں نے انہیں منع کر کے صورتِ حال پر قابو پا لیا۔ ورنہ بپھرا ہوا ہجوم ہماری تکا بوٹی کر دیتا۔ بعدازاں پولیس کنٹرول روم میں حکامِ بالا نے اپنی رپورٹوں میں ہجوم کی تعداد بہت ہی کم ظاہر کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ حاکمانِ وقت کی نیندیں حرام نہ ہوں۔

بھٹو کی ریلوے سٹیشن سے روانگی کے بعد وفاقی حکومت اور گورنر موسیٰ خاں اس افسر کا سراغ لگانے میں مصروف ہو گئے جس نے کار کو پلیٹ فارم تک لے جانے کی اجازت دی تھی۔ قرعہ فال ملک نذیر اور میرے درمیان گھومتا رہا۔ خوش قسمتی سے یکے بعد دیگرے کئی دیگر اہم واقعات رونما ہوئے' اس لیے کسی کو ہماری گردن دبوچنے کا ہوش نہیں رہا۔

چند دن بعد بھٹو اور ان کے بعض ساتھیوں کو دفاع پاکستان رولز کے تحت لاہور سنٹرل جیل میں بند کر دیا گیا۔ جیل حکام نے بھٹو کو ان کی حیثیت کے مطابق جملہ سہولتوں والی کلاس دے دی۔ اس کے باوجود وہ نظر بندی پر سخت برہم تھے۔ ڈپٹی کمشنر بندیال اکثر جیل کے معائنہ پر جاتے رہتے تھے۔ ایک بار مجھے بھی ان کے ساتھ جانے کا موقع ملا۔ ڈی سی نے بھٹو سے دریافت کیا' آیا وہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ''میں اسی قدر آرام سے ہوں جس قدر کوئی شخص جیل میں ہو سکتا ہے۔'' بھٹو نے برجستہ جواب دیا۔

جب ہم رخصت ہونے لگے تو بھٹو نے بندیال کو واپس بلایا اور ان سے کہا۔ ''مسٹر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ میں نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے' جیل سے باہر کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔''

''ٹھیک ہے''۔ ڈی سی نے جواب دیا

جیل سے باہر اس طرح کی افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ بھٹو کے ساتھ بدسلوکی کی جا رہی ہے اور وہ اس تاثر کو زائل نہیں کرنا چاہتے تھے۔

بھٹو کی گرفتاری کے بعد ائر مارشل اصغر خاں میدانِ سیاست میں اترے۔ انہوں نے لاہور کے انٹر کانٹینینٹل ہوٹل میں اولین پریس کانفرنس سے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ صدر کی طرف سے انسپکٹر جنرل پولیس کو ہدایت کی گئی تھی کہ اصغر خاں کی پریس کانفرنس کی رپورٹ لینے کے لیے میری ڈیوٹی لگائی جائے۔ خوش قسمتی سے کسی نے بھی مجھے نہیں پہچانا۔ میری رپورٹ سے فوری طور پر ایوب خاں کو مطلع کیا گیا۔ جب مجھے ان کی طرف سے دی گئی شاباش کی بابت بتایا گیا تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ اب میں واقعی بڑائی اور عظمت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اے حمید ٹھیک ہی کہتے تھے۔ مجھے اس کا خیال ذرا دیر سے آیا۔

احتجاجی تحریک میں جان پڑ گئی

احتجاج کے لیے فضا سازگار ہوتی جا رہی تھی۔ لوگوں کے ہجوم آئے دن سڑکوں اور گلیوں میں احتجاج کے لیے نکلنے لگے۔ مظاہروں کے لیے مال روڈ پسندیدہ جگہ تھی اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔

میں اپنی سٹرائیکنگ فورس کے ساتھ ہر روز جلوس سے نمٹنے کے لیے ریگل چوک پہنچ جاتا۔ ڈی ایس پی رانا مشتاق میرے مستقل ساتھی ہوتے تھے۔ ایس ایس پی نے ہمیں ہدایت کر رکھی تھی کہ حتیٰ الامکان ضبط و تحمل سے کام لیں اور کسی حال میں بھی ضرورت سے زیادہ ردِ عمل کا اظہار نہ کریں۔ یہ پالیسی بڑی سود مند ثابت ہوئی اور مظاہرین ہمارے دوست بن گئے کیونکہ ان میں سے اکثر بار بار جلوس میں شریک ہوتے تھے۔ اس طرح ہمارے درمیان بقائے باہمی کا خاموش سمجھوتہ طے پا گیا۔

لیکن اپوزیشن لیڈروں کو فکر تھی کہ لاہور میں آگ کیوں نہیں لگ رہی۔ انہوں نے سوچا کہ جب تک لاہور کو مشتعل کر کے نقطۂ جوش تک نہیں لایا جائے گا' بات نہیں بنے گی۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ چند نوجوان اچانک نمودار ہوتے اور پولیس پر پتھراؤ شروع کر دیتے۔ ہماری ضبط و تحمل کی پالیسی کے باوجود بعض پولیس والے جواب میں آنسو گیس پھینک کر اور لاٹھی چارج کر کے اپنا غصہ ٹھنڈا کر تے۔ پولیس نے بعض شر پسندوں کو پہچان لیا اور رات کو چھاپہ مار کر گرفتار کر لیا۔ اخبارات نے اس معاملہ کو پولیس کے وحشیانہ

ظلم وتشدد سے تعبیر کیا اور خوب ہوا دی۔ اس پیپر نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور تشدد میں اضافہ ہو گیا۔ اب ہجوم جوش میں اندھا ہو جاتا اور پاگلوں کی طرح ہم پر ٹوٹ پڑتا۔

گرفتار شدہ شر پسندوں سے پوچھ گچھ کی گئی تو پتہ چلا کہ ان میں سے اکثر کے سپیشل پولیس اور دیگر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ساتھ رابطے تھے۔ سپیشل برانچ کے سربراہ آغا محمد علی تھے جو آرمی چیف آغا یحییٰ خاں کے بھائی تھے۔ قرائن سے پتہ چلتا تھا کہ اندرون خانہ کوئی مذموم سازش تیار ہو رہی ہے۔

صورتِ حال سے غیر دانشمندانہ انداز میں نمٹنے کے واقعات بھی نوٹس میں آئے۔ ایک دن آئی جی میاں بشیر احمد نے وائرلیس پر دریافت کیا۔ آیا مال روڈ صاف ہے؟ وہ گورنر ہاؤس جانا چاہتے تھے۔ انہیں بتایا گیا کہ وائی ایم سی اے ہال کے نزدیک طلبا کا ایک جلوس گزر رہا ہے۔ انہوں نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے سختی سے حکم دیا کہ اگلے پانچ منٹوں میں مال روڈ کو بالکل صاف کر دیا جائے۔ اس وقت ڈی ایس پی رانا مشتاق اور ایک مجسٹریٹ طلبا کے ساتھ مذاکرات کر رہے تھے اور طلبا منتشر ہونے پر آمادہ ہو گئے تھے بلکہ ان میں سے بعض نے وہاں سے جانا شروع کر دیا تھا۔ انسپکٹر جنرل کا حکم سنتے ہی ڈی ایس پی چوہدری اللہ داد اور ڈی ایس پی سردار ذوالفقار کے زیر کمان پولیس والوں نے طلبا پر چاروں طرف سے ہلہ بول دیا۔ لڑکوں نے سمجھا کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے' اس لیے وہ مشتعل ہو گئے۔ آئی جی صاحب مطمئن تھے کہ سختی سے کام لے کر صورتِ حال پر قابو پا لیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے احتجاج کرنے والوں کے ساتھ نرمی برتنے پر ڈی آئی جی اور ایس ایس پی کا خوب مذاق اڑایا۔ بہرحال معاملہ وہاں ختم نہیں ہوا۔

انسپکٹر جنرل تو گورنر ہاؤس چلے گئے جبکہ زخموں سے چور بہت سے لڑکے یونیورسٹی کیمپس پہنچے اور انہوں نے واقعہ کی دلخراش تفصیلات بتا کر اپنے ساتھیوں کو خوب بھڑکایا۔ آناً فاناً ہزاروں لڑکے جمع ہو گئے اور احتجاج کرنے لگے۔ پولیس نے کیمپس کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے کر آنسو گیس کا استعمال اور اندھادھند لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ طلبا نے زبردست مزاحمت کی' انہوں نے مورچہ بند ہو کر مقابلہ کیا اور پولیس کو تین بار پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ ڈی آئی جی' ایس ایس پی اور ڈی سی آپریشن کی کمان کر رہے تھے۔ آئی جی گورنر کے احکام کے تحت وائرلیس سیٹ پر طلبا کے ساتھ سختی سے نمٹنے کی مسلسل ہدایات دے رہے تھے' لیکن پولیس بے بس ہو گئی تھی۔ واحد متبادل چارہ یہ رہ گیا تھا کہ فائر کھول دیا جائے جس سے بھاری جانی و مالی نقصان کا اندیشہ تھا۔ اس لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فائرنگ کی اجازت نہیں دی۔ تین گھنٹے تک زبردست مقابلہ ہوتا رہا' تاہم کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

گورنر موسیٰ خاں جو ماضی میں آرمی چیف رہ چکے تھے' اس چیز کو برداشت نہیں کر سکے۔ انہوں نے آئی جی کو خود موقع پر جانے اور پولیس اور ڈپٹی کمشنر کو ان کی بزدلی پر جھنجھوڑنے کا حکم دیا۔ یونیورسٹی کو فتح کرنے کی دھن میں آئی جی صاحب طلبا کا پیچھا کرتے ہوئے کیمپس میں گھس گئے جہاں لڑکوں نے قابو کر کے انہیں یرغمال بنا لیا۔ طلبا کے دباؤ میں آ کر انہیں نہ صرف پولیس کو ہٹانا پڑا بلکہ جی پی او چوک تک جلوس کی قیادت بھی کرنی پڑی۔ پولیس کی زبردست سبکی ہوئی۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ اس وقت رونما ہوا جب مولانا عبیداللہ انور کو' جو ایک قابلِ احترام عالمِ دین تھے' گورنر کے ذاتی احکام کے تحت ٹھڈے مارے گئے اور ان کی توہین کی گئی۔ وہ ایک مظاہرہ کے دوران گرفتاری پیش کرنے والے تھے۔ اس سانحہ پر پورا شہر سراپا احتجاج بن گیا۔ فوجی ایڈمنسٹریٹر کو ان کی فوری رہائی کا حکم دینا پڑا۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے مجھے مولانا کے ساتھ بھیجا گیا کہ وہ بخیر و عافیت اپنے گھر پہنچ جائیں۔

میں نے ایسے واقعات سے آئندہ کے لیے کئی سبق حاصل کیے۔ سرسری اور سطحی معلومات کی بنا پر اضطراری نوعیت کے احکام جاری کرنا اور آئین و قانون کے ضابطوں کو نظر انداز کرنا بہت سی حکومتوں کے زوال کا سبب بن چکا ہے۔ صرف موقع پر موجود افسران اصل صورتِ حال کو سمجھتے ہیں۔ انہیں ایک عام پالیسی دے دینی چاہیے۔ اس کے بعد انہیں موقع کی مناسبت سے از خود فیصلہ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔

کیا عوام ملک دشمن ہیں؟

ملک بھر میں خصوصاً مشرقی پاکستان میں صورتِ حال قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ حزبِ اختلاف کے اتحاد ''ڈیک'' (ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی) نے عوام کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ہر طرف گھیراؤ' جلاؤ کے نعرے سننے میں آ رہے تھے۔ ایوب خاں نے آخری چارہ کار کے طور پر اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ صدارتی انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے۔ اس سے معاملات مزید خراب ہو گئے۔ کوئی بھی تدبیر صورتِ حال کو خراب ہونے سے نہیں روک سکی۔ جلوسوں کی تعداد اور ان کی جسامت بڑھتی گئی اور انتظامیہ عملاً مفلوج ہو کے رہ گئی۔ آخر میں ''ڈیک'' نے ملک گیر ہڑتال کی کال دے دی۔

ایک دن لاہور میں حزبِ اختلاف نے چوک رنگ محل سے اسمبلی ہال تک جلوس نکالنے کا اعلان کر دیا۔ لوگوں کے جمع ہونے سے پہلے ہی ہر طرف آتش زنی اور لوٹ مار کی وارداتیں شروع ہو گئیں۔ حکومت کے حامیوں کی املاک کو بطور خاص نشانہ بنایا گیا' میکلورڈ روڈ پر رتن سینما اور مال پر امپیریل شو کمپنی

سمیت بہت سی دکانیں اور پٹرول پمپ لوٹنے کے بعد نذرِ آتش کردیئے گئے۔ خفیہ ہاتھ نے اپنا مذموم کھیل شروع کردیا تھا۔

تحریک شروع ہونے کے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اس دن پہلی بار انتظامیہ کی مدد کے لیے فوج بلانی پڑی۔ فوجی دستہ بعد دوپہر 2:30 بجے ریگل چوک پہنچا۔ اس وقت آئی جی بھی وہاں موجود تھے۔ گورنر کی طرف سے حکم دیا گیا کہ جلوس منتشر کردیا جائے اور وہ کسی قیمت پر اسمبلی چیمبر تک نہ پہنچنے پائے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جلوس کو جی پی او چوک کے قریب روک لیا اور لیڈروں سے مذاکرات شروع کردیئے۔ وہ بہت بڑا جلوس تھا جس کی قیادت سابق وزیراعظم چوہدری محمد علی، ممتاز دولتانہ، میاں طفیل محمد، خواجہ صفدر اور نوابزادہ نصراللہ خاں جیسے سینئر لیڈر کررہے تھے۔ ان قائدین سے جلوس کو منتشر کرنے کو کہا گیا تاکہ فوج سے تصادم نہ ہو، لیکن انہوں نے ڈی ایم کی بات ماننے سے صاف انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگ ان کے کہنے کے باوجود منتشر نہیں ہوں گے جب تک مقررہ جگہ (اسمبلی ہال) تک نہ پہنچ جائیں۔ دوسری طرف آئی جی اور فوجی دستہ کے کمانڈر کو براہ راست گورنر کی طرف سے حکم دیا گیا تھا کہ جلوس کو بہرصورت منتشر کرنا ہے۔ آخرکار ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو قائل کرلیا گیا کہ فائرنگ کے بغیر اتنے بڑے جلوس کو منتشر نہیں کیا جاسکتا اور فائرنگ کی صورت میں بہت زیادہ نقصان کا خدشہ ہے۔ انہوں نے پولیس اور فوج کا چیئرنگ کراس تک پیچھے ہٹنا منظور کرلیا۔ آئی جی کو اس فیصلہ سے سخت اختلاف تھا۔ تاہم انہیں ڈی ایم کی بات ماننی پڑی اور جلوس اسمبلی ہال پہنچ کر کسی توڑ پھوڑ کے بغیر منتشر ہوگیا۔

اِدھر تو معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا گیا، لیکن اُدھر سول لائنز پولیس سٹیشن میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ وہاں چیف سیکرٹری (بی اے قریشی) آئی جی (میاں بشیر احمد) اور فوجی دستہ کے کمانڈر (بریگیڈیئر قادر) نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو گھیر لیا اور اپوزیشن کے مطالبہ پر فوج کو پیچھے ہٹانے کے معاملہ پر انہیں لعنت ملامت کرنے لگے۔ ڈی ایم نے انہیں صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلانے کی بے حد کوشش کی، تاہم کوئی بھی ان کی بات سننے اور عقل کے ناخن لینے کو تیار نہیں تھا۔ آخرِ کار ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے غصہ میں میز پر ہاتھ مار کر کہا:

"جنٹلمین! میں نے فوج سے اس لیے پیچھے ہٹنے کو کہا تھا کہ اس کا مقابلہ کسی دشمن سے نہیں بلکہ اپنے ہی عوام سے تھا اور میں اپنے لوگوں کو بلاوجہ ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔" فوج کے وقار کے علمبرداروں پر اس بات کا قطعاً اثر نہیں ہوا۔ وہ ڈی ایم کے خلاف غیظ وغضب میں بھرے ہوئے گورنر ہاؤس چلے گئے تاکہ گورنر سے ان کی شکایت کرسکیں۔ آئی جی بھی ان کے پیچھے روانہ ہوگئے۔ چیف سیکرٹری

نے جوان سے مختلف نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ [illegible] کی پالیسی کو سراہا اور آرمی کی عزت کا ناجائز دم بھرنے والوں کا ساتھ نہیں دیا۔

بریگیڈیئر قادر جنہوں نے بندیال کے احکام پر کڑی نکتہ چینی کی تھی' 1974ء میں بھارت سے جنگی قیدی کی حیثیت سے واپس آئے تو بطور ایس ایس پی لاہور میں نے انہیں خوش آمدید کہا اور واہگہ بارڈر پار کرتے وقت انہیں افسردہ سرنگوں دیکھ کر افسوس کا اظہار کیا۔ اگر انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے مشرقی پاکستان میں اپنے عوام کے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک نہ کیا ہوتا تو انہیں اپنے ازلی دشمن (بھارت) کے آگے ہتھیار ڈالنے کی ذلت ہرگز برداشت نہ کرنا پڑتی۔

ایوب خاں نے معاملات کو کنٹرول سے باہر نکلتا دیکھ کر اوائل 1969ء میں ''ڈیک'' کو مذاکرات کی دعوت دی۔ شیخ مجیب کو' جن پر اگرتلہ سازش کیس چل رہا تھا' دوسرے لیڈروں کے اصرار پر رہا کر دیا گیا۔ ڈیفنس آف پاکستان رولز کو غیر موثر بنانے کے لیے ایمرجنسی اٹھالی گئی' حالانکہ ان دنوں اس کی اشد ضرورت تھی' نیز بھٹو سمیت سارے لیڈروں کی نظربندی کے احکام واپس لے لیے گئے۔

اپوزیشن لیڈروں نے ایوب خاں کے جذبہ خیر سگالی کا مثبت جواب دیا اور گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے' البتہ بھٹو اور مولانا بھاشانی نے مذاکرات کا بائیکاٹ کر دیا۔ کانفرنس میں طے پایا کہ ملک میں صدارتی کی بجائے پارلیمانی طرزِ حکومت بحال کیا جائے گا اور آئندہ انتخابات بنیادی جمہوریت کی بجائے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہونگے۔ دونوں صوبوں کے گورنر بدل دیئے گئے اور یوسف ہارون کو مغربی پاکستان کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ سیاسی رہنما کارکن اور عام لوگ ماسوائے بھٹو اور بھاشانی کے سمجھوتہ سے خوش تھے۔ وہ اُمید کرنے لگے کہ جلد ہی پُرامن انتقالِ اقتدار کا مرحلہ طے کر لیا جائے گا جیسا کہ کانفرنس میں طے پایا تھا۔ ملک میں امن قائم ہو گیا اور سرکاری حمایت میں نکلنے والے اکا دکا جلوسوں کے سوا ہر طرف سے سکون اور چین کی خبریں آنے لگیں۔ پولیس نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ وہ کئی مہینے کی احتجاجی تحریکوں سے تنگ آ چکی تھی اور تھکاوٹ سے چکنا چور تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

باب 7

تاریک شب

بہر حال تقدیر کا پہیہ مخالف سمت میں گردش کرنے لگا۔ یحییٰ خاں نے ایوب خاں کو مذکورہ سمجھوتہ سے منحرف ہونے اور ملک کی سلامتی و یک جہتی کی خاطر آرمی چیف کو ضروری اقدامات کرنے کی دعوت دینے پر مجبور کر دیا۔ ایوب خاں انتہائی بے بسی کے عالم میں ایوانِ اقتدار سے رخصت ہو گئے۔ یحییٰ خاں نے 25 مارچ 1969ء کو عنانِ اقتدار ہاتھ میں لیتے ہی 1962ء کا دستور منسوخ کر دیا۔ ملک بھر میں مارشل لا لگا دیا اور منصبِ صدارت کا حلف اٹھائے بغیر ہی صدر مملکت و چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن بیٹھا۔ 1958ء میں پروفیسر فیاض نے کہا تھا کہ ''محبت کی چاشنی ختم ہو گئی ہے۔'' اس دفعہ نفرت کی اذیت بھی جاتی رہی۔ لوگوں کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے ساتھ دوہرا دھوکہ کیا گیا ہے۔ ممتاز ماہرِ نفسیات پروفیسر اجمل ان سارے واقعات کی ایک خاص انداز میں توضیح کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان لاکھوں لوگوں کی جدوجہد اور قربانیوں کے نتیجہ میں حاصل ہوا۔ یہ ان کی مادرِ وطن ہے جس کی بدولت انہیں روٹی، عزتِ نفس اور آزادی ملی۔ ایوب خاں نے وحشیانہ قوت سے ماں کو بے آبرو کر کے بچوں کو اچھا کھلایا پلایا۔ لیکن بچوں نے ماں کی بے عزتی کا خوب بدلہ لیا۔ اب ایک بدمعاش نے اسے اغوا کر لیا ہے۔ اس دفعہ مکافاتِ عمل اس سے بھی زیادہ سفاکانہ اور وحشیانہ انداز میں رونما ہو گا۔

میں نے وہ رات انتہائی کرب اور ابتلا کی حالت میں روتے ہوئے اور اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا کرتے ہوئے گزاری کہ یاالٰہی ہمیں ہماری حماقتوں کی سزا نہ دے۔ ایک ناجائز اور غیر قانونی حکومت کی جگہ دوسری حکومت نے لے لی اور قوم کو معاشرتی تباہی کے عمیق غار میں دھکیل دیا۔

احتجاجی تحریک کے مہینوں میں پولیس کو زیادہ تر گلیوں اور سڑکوں پر رہنا پڑا تھا۔ اس لیے ان کی پیشہ وارانہ کارکردگی بری طرح متاثر ہوئی۔ جرائم کی بیخ کنی پر توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ بہت سے مجرموں نے صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاسی سرگرمیوں میں پناہ لے لی۔ اس طرح جرائم کی شرح میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا۔ تفتیش میں غیر معمولی تاخیر ہونے لگی۔ مقدمات کی سماعت میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ کیونکہ مجسٹریٹ اور مستغیث جلسے جلوسوں کے سلسلے میں غیر پیشہ وارانہ ڈیوٹی پر ہوتے تھے۔ جرائم کے ریکارڈ پر بھی ضروری توجہ نہیں دی جا سکی۔

میرے ایڈووکیٹ دوست شیخ اظہار نے میری اس بات پر معنی خیز قہقہہ لگایا کہ پولیس کو ایک غیر نمائندہ حکومت کو سہارا دینے کی بناء پر بہت زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑا۔

"1958ء کے بعد پولیس کی پیشہ وارانہ مہارت کا سوال ہی باقی نہیں رہا' اس لیے پولیس ایسے بدمعاش کو گرفتار کرنے سے کترانے لگی جو نہ صرف بنیادی قانون کی خلاف ورزی کا اعلانیہ اعتراف کرتا بلکہ اس پر فخر بھی کرتا ہے۔"

انہوں نے جواب دیا پھر کہنے لگے "اب ایک اور بدمعاش سامنے آ گیا ہے۔ کیا تم اسے پکڑ سکتے ہو؟ نظم و ضبط قائم کرنے' قانون نافذ کرنے اور جرائم پر قابو پانے کی بات بھول جاؤ۔ چور اچکے حکمران بن گئے ہیں' ان کے احکام بجالاؤ اور ان کے قانون نافذ کرو۔"

جب مجھے کھڈے لائن لگا دیا گیا

ایوب خان کے خلاف تحریک کے بحرانی دور میں مجھے ترقی ملی اور لاہور کا ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ پولیس بنا دیا گیا۔ 18 نومبر 1968ء کو آئی جی میاں بشیر احمد نے ایس پی رینک کے ستارے میرے کندھوں پر لگائے۔ انہوں نے ایس ایس پی اور دیگر افسران کے سامنے میری کارکردگی کو سراہا اور مسرت کا اظہار کیا۔ مجھے انتہائی خوشی ہوئی۔ اس طرح میں حکمران طبقہ میں ایک درجہ اوپر ہوگیا۔ ساتھ ہی ایک بے حس مشینری کا کل پرزہ بننے سے جو "معزز کلرک" سے بدتر تھا' دکھ بھی ہوا جیسا کہ میرے دوست اے حمید

نے پیشگوئی کی تھی۔

1969ء میں نفاذ مارشل لا کے بعد لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمٰن کو مغربی پاکستان کا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور گورنر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اپنا صدر دفتر پنجاب اسمبلی میں قائم کیا۔ یاد رہے کہ صوبائی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اپنا ہیڈ کوارٹر ہمیشہ اسمبلیوں میں قائم کرتے ہیں کیونکہ اسمبلیاں اور مارشل لا ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ مغربی پاکستان کو زون ''اے'' کا نام دیا گیا جبکہ مشرقی پاکستان کو آبادی میں بڑا ہونے کے باوجود زون ''بی'' کہا گیا۔

مارشل لا ہیڈ کوارٹرز کو' بھاری سٹاف کے ساتھ دو سیکشنوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک کا سربراہ بریگیڈیئر ''فوجی امور'' اور دوسرے کا بریگیڈیئر ''سول امور'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

شیخ انعام الحق' سی ایس پی سول انتظامیہ کی طرف سے افسر رابطہ تھے۔ میں واحد افسر تھا جسے ہیڈ کوارٹرز کے دونوں شعبوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا۔ میں لیفٹیننٹ کرنل مصطفیٰ کے ساتھ جو انٹیلی جنس کے انچارج تھے' کام کرنے کے علاوہ پولیس سے متعلق بہت سے معاملات پر توجہ دیتا اور جنرل کو بریف کرتا تھا۔

ہیڈ کوارٹرز کے روحِ رواں لیفٹیننٹ کرنل عبدالقیوم تھے جو بڑی مسحور کن اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سول امور کے انچارج تھے۔ ان کے پاس ایک رجسٹر سفارشات تھا جس میں وہ ہر ایسا کام لکھ لیتے تھے جس کی بابت سول انتظامیہ کو ہدایت کرنی ہوتی کہ فوجی افسروں کے فلاں فلاں کام انجام دیئے جائیں۔ فوجی افسران اپنے ذاتی مفادات کے لیے انہیں بطور رابطہ کار (Conduit) استعمال کرتے تھے تاکہ وہ فوجی اثر ورسوخ بروئے کار لا کر ان کے کام کرا دیں۔

عرفِ عام میں انہیں ''پٹواری'' کہا جاتا تھا کیونکہ فوجی افسران کے نام زرعی زمین الاٹ کرانے کا فریضہ بھی وہی انجام دیتے تھے۔ میں نے ان کے طریقِ کار کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا۔ ان کے ماتحت چند تجربہ کار سی ایس پی افسر تھے جنہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ صوبہ بھر میں سرکاری اور متروکہ اراضی کا سراغ لگائیں۔ جنرل' بریگیڈیئر اور دیگر سینئر فوجی افسر سارا دن ان کے گرد چکر لگاتے رہتے اور وہ مغل بادشاہ کی طرح عطیات بانٹنے میں مصروف رہتے۔ بعض اوقات تو یوں لگتا تھا کہ مارشل لا صرف اسی مقصد کے لیے لگایا گیا تھا۔ مجھ سے اکثر کہا جاتا کہ متعلقہ ضلعوں کے ایس پی صاحبان کو حکم دیا جائے کہ الاٹ شدہ زمینوں سے موجودہ قابضین کو بے دخل کر کے نئے الاٹیوں کو قبضہ دلانے میں مدد کریں۔ ایس پی حضرات الجھن میں پھنس جاتے تھے کیونکہ بہت سے مزارعین کئی پشتوں سے ان زمینوں کو کاشت کر رہے تھے اور

انہیں قبضہ کے حقوق وراثت میں ملے تھے۔

اس سلسلے میں قصور کے ایڈیشنل ایس پی نے ایک بہت ہی دلخراش کہانی سنائی۔ اس نے اپنے چند آدمی بعض مزارعین کو بے دخل کرنے کے لیے بھیجے جو انیسویں صدی یعنی سکھوں کے دور سے ان زمینوں کو کاشت کررہے تھے۔ ان کی عورتیں احتجاج اور فریاد کرنے لگیں۔ انہوں نے ایس پی سے کہا کہ انہیں سرحد پار انڈیا کے علاقہ میں دھکیل دیا جائے۔ کیونکہ سکھوں نے ان کے بزرگوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ان فوجی افسروں کے سلوک سے کہیں بہتر تھا۔ جن کی خواہش پر ظالم پولیس ہمیں ہمارے کھیتوں سے بے دخل کررہی ہے۔ ایس پی نے بڑے درد بھرے لہجہ میں کہا کہ میں اس معاملہ سے متعلقہ حکام کو مطلع کروں، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

جب میں نے وہ کربناک داستان کرنل قیوم کو سنائی تو انہوں نے بڑے پُر جوش لہجہ میں کہا:

''ایسے غیر محب وطن عناصر کو جیلوں میں ڈال دینا چاہیے''

''فوجی افسران کو یا مزارعین کو؟'' میں نے پوچھا

ان کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ جھنجھلا کر بولے:

''وہ تم ہو جسے جیل میں ہونا چاہیے' چلو اب یہاں سے دفع ہو جاؤ''

یہ صرف ایک کیس نہیں تھا۔ مجھے پے در پے رپورٹیں موصول ہو رہی تھیں کہ زمین ہتھیانے اور مزارعین کو بے دخل کرنے کا کام پورے صوبہ میں زوروں پر ہے۔ قبضہ گروپ پوری طرح سرگرمِ عمل تھا۔ کسی کو مارشل لا حکام کے غیظ وغضب سے بچانے کا یہ حربہ بڑا کامیاب تھا۔

ایک دن پولیس کے ایک حفاظتی دستہ پر جو پچاس ملزموں کو عام بس کے ذریعے ایبٹ آباد سے ہری پور لے جا رہا تھا' ملزمان کے حامیوں نے حملہ کر دیا۔ پولیس دستہ کا انچارج ہیڈ کانسٹیبل اور دو سپاہی مارے گئے جبکہ سارے قیدی فرار ہو گئے۔

اس واقعہ کو مارشل لا انتظامیہ کے منہ پر زوردار طمانچہ قرار دیا گیا۔

جنرل عتیق الرحمٰن پولیس کے زبردست نکتہ چیں تھے۔ میں نے انہیں تمام حقائق سے آگاہ کیا، تاہم وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ میں نے انہیں وسائل کے فقدان خصوصاً پولیس کی بوسیدہ گاڑیوں اور سٹاف کی کمی کے بارے میں بتایا مگر وہ اپنی بات پر قائم رہے کہ پولیس والوں کو کڑی سزا ملنی چاہیے۔

''اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ پولیس تو اپنے تین جوانوں کی پہلے ہی قربانی دے چکی ہے۔'' میں نے عرض کیا۔

''یہ بڑی گھٹیا اور ذلیل مخلوق ہے کسی کی گردن میں لازمی پھندا پڑنا چاہیے۔'' وہ بڑبڑائے۔

''وہ گورنر صاحب ہیں، جن کی گردن میں پھندا پڑنا چاہیے کیونکہ وہ جیل کی گاڑیوں کے لیے مطلوبہ فنڈز فراہم نہیں کرتے۔'' میں جذبات کی رو میں بہہ کر نجانے کیا کچھ کہہ گیا، تاہم کچھ دیر بعد مجھے اپنی حماقت پر خاصی ندامت ہوئی۔

جنرل صاحب خاموش ہوگئے اور مجھے کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ میں انتہائی پریشانی کے عالم میں ان کے کمرے سے نکل آیا۔ اپنے دفتر میں آ کر مسلسل سگریٹ نوشی کرنے لگا۔ جب مجھے معاملہ کی سنگینی کا پوری طرح احساس ہوا تو جیل کی کوٹھڑی کا نقشہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ کئی گھنٹوں کے شدید اور طویل انتظار کے بعد جنرل صاحب نے مجھے پھر بلایا۔ اب ان کا رویہ اس سے یکسر مختلف تھا جو میں سوچ رہا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک مختصر نوٹ لکھوایا جس میں مجھے پولیس کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے تجاویز پیش کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ میں جلد ہی نارمل حالت میں آ گیا۔

میں نے اپنی تجاویز فوری طور پر پیش کر دیں اور انہوں نے بلا تاخیر صدر کو بھجوا دیں۔ جس کے نتیجہ میں میجر جنرل اوایم مٹھا کی سربراہی میں ایک پولیس کمیشن بنایا گیا جو مٹھا کمیشن کے نام سے مشہور ہوا۔

میں نے موقع ملتے ہی جنرل عتیق سے اپنی گستاخی کی معافی مانگی۔ وہ معاف کر دینے والے انسان تھے۔ بعد ازاں انہوں نے مجھے اپنے انتہائی قریبی دوستوں کے ساتھ اپنی رہائش گاہ پر ایک ڈنر میں مدعو کر کے میرے سارے خدشات دور کر دیئے۔

جنرل ٹکا خاں کے ساتھ ڈیوٹی

چند مہینے بعد جنرل عتیق کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے اور ایئر مارشل نور خاں کو مغربی پاکستان کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ جنرل ٹکا خان ایک کھرے انسان اور عملی سپاہی تھے۔

میرا اہم فرض یہ تھا کہ سیاسی انٹیلی جنس رپورٹس کا خلاصہ جنرل صاحب کو پیش کیا کروں۔ اس سمری کا مطالعہ کوئی خوشگوار کام نہیں تھا تاہم میں اپنا کام دیانتداری سے کرتا اور جنرل کو پوری طرح باخبر رکھتا تھا۔

آہستہ آہستہ پورا مغربی پاکستان مارشل لا کے خلاف ہوگیا۔ طلبا اور محنت کشوں میں بے چینی پھیل

گئی۔ بارکونسلوں اور سیاسی جماعتوں کے محدود اجلاسوں کا سلسلہ جاری تھا۔ انٹیلی جنس رپورٹوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ پابندی کے باوجود ہر طرف نچلی سطح کی سیاسی سرگرمیاں جاری ہیں۔

چونکہ ایوب خاں کی شخصیت اور فوج کا خوف ان کے طویل دورِ حکومت میں سیاسی منظر پر چھایا رہا' اس لیے بعض لوگ لسانی' علاقائی اور نسلی سوچ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ سندھو دیش' عظیم تر بلوچستان' پختونستان اور بنگلہ دیش کے لیے تحریکوں نے جڑ پکڑی۔ مارشل لا کے خلاف جذبات کو پاکستان کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اغوا شدہ ماں کو اس کے بیٹے سالم حالت میں نہیں بلکہ ٹکڑوں کی صورت میں پیش کیے گئے۔ سیاسی محرومی نے لوگوں کو مایوس و پریشان کر دیا اور پنجاب کو قربانی کا پسندیدہ بکرا بنا لیا گیا۔ ون یونٹ سکیم پر یہ کہہ کر نکتہ چینی کی جاتی تھی کہ یہ ایک ذہین پنجابی کی تیار کردہ سٹریٹجی کا نتیجہ ہے جو اقتدار پر اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے اختیار کی گئی تھی۔ یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے مسائل کے لیے بھی لوگوں کو سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے لاہور آنا پڑتا ہے جو صوبہ کے ایک کونے میں واقع ہے۔ مسلم لیگ' جماعت اسلامی' نو تشکیل شدہ پیپلز پارٹی اور بعض دوسری جماعتیں قومی سوچ رکھتی تھیں جبکہ دیگر اکثر علاقائیت کی طرف مائل تھیں۔

علاقائیت پسند دانشوروں' شاعروں اور پروفیسروں کی بڑی تعداد کو مارشل لا کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ تاہم انٹیلی جنس رپورٹوں کے مطابق اس اقدام سے تلخی میں اضافہ ہوا۔ بھارتی ریڈیو کے علاقائی پروگراموں کے ذریعے علاقائیت کا خوب پرچار کیا جا رہا تھا۔ مارشل لا حکام کے پاس جسدِ سیاست کو لگنے والے زخموں کا کوئی علاج نہیں تھا۔ وہ صرف نظر بندیوں اور گرفتاریوں کو اس کا حل سمجھتے تھے۔

فوجی حکمران عمیق تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ علاقائیت پسندوں کے غبارے میں سے ہوا نکالنے کے لیے ون یونٹ کا خاتمہ کر کے چاروں صوبے بحال کر دیئے جائیں۔ دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کے لیے لیگل فریم ورک آرڈر جاری کیا گیا تا کہ وہ نیا آئین مرتب کر سکے۔ خیال یہ تھا کہ انتخابات کے نتیجہ میں منقسم مینڈیٹ والی اسمبلی وجود میں آئے گی اور فوج بدستور اقتدار پر قابض رہے گی۔ اس سلسلے میں فوج کی آشیر باد سے ایک جامع منصوبہ تیار کیا گیا جس کا کوڈ نام "شاطر" (Brilliant) تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل عبدالقیوم کو ون یونٹ کی بابت تحلیل کا حکم تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ مطلوبہ اعلان کے بعد صوبوں کے مابین اثاثوں اور عملہ کی تقسیم اور بعض دوسرے متعلقہ امور بھی ان کی ذمہ داری میں شامل تھے۔ انہوں نے پنجاب' سندھ اور سرحد (جس میں دیر اور سوات کی ریاستیں شامل تھیں) کے پرانے صوبے بحال کرنے نیز بلوچستان کو مکمل صوبائی درجہ دینے کی سفارش کی۔ پرانے صوبوں کی بحالی سکیم

پر جولائی 1970ء سے عملدر آمد ہونا تھا۔ تاہم ون یونٹ کو یکم جولائی سے ختم کر دیا گیا۔ تاکہ 1956ء کے آئین کو بحال کرنے کا مطالبہ سر نہ اٹھا سکے کیونکہ وہ آئین مشرقی و مغربی کے درمیان مساوات (parity) کے اصولوں پر مبنی تھا۔ یوں سیاستدانوں کو سبق سکھانے کے لیے دستور سازی کے گورکھ دھندا میں پھنسا دیا گیا۔ کرنل عبدالقیوم اور دیگر فوجی افسر اپنے اس کارنامے کا بڑے فخر کے ساتھ ذکر کیا کرتے تھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ سیاستدان نیا آئین تیار نہیں کر سکیں گے۔ اس طرح انہیں اقتدار سے محروم رکھا جا سکے گا۔ لیگل فریم ورک آرڈر بھی اسی مقصد سے تیار اور نافذ کیا گیا تھا۔

سیاستدان الجھن میں پھنس گئے

یکم جنوری 1970ء سے سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی گئی۔ انتخابات سے پورے ایک سال پیشتر انتخابی مہم کی اجازت دینے کا اصل منشا یہ تھا کہ اس طرح سیاستدانوں کے مابین اختلافات میں شدت پیدا ہو جائے گی اور ممکن ہے لوگ ان سے بیزار ہو کر جمہوریت سے باغی ہو جائیں۔ مارشل لا ہیڈ کوارٹرز میں اس قسم کی باتیں اکثر سننے میں آتی تھیں کہ ''سیاستدانوں کو ایک لمبا رسہ دے دو تا کہ وہ ایک دوسرے کو بل دے کر اپنے آپ پھانسی پر لٹک جائیں۔''

ابتداء میں چار دیواری کے اندر جلسے کرنے کی اجازت دی گئی تھی بعد ازاں کھلے میدانوں میں سیاسی سرگرمیوں کی اجازت مل گئی۔ مغربی پاکستان میں نئی نئی بننے والی پاکستان پیپلز پارٹی کے جلسے اور جلوس سب سے بڑے اور عوام کے لیے موجب کشش بنے ہوئے تھے۔ جماعتِ اسلامی بڑی منظم تھی اس نے ''نظامِ اسلام پارٹی'' اور دوسری جماعتوں کے اشتراک و تعاون سے ''شوکتِ اسلام'' کے نام پر بڑے بڑے جلوس نکالے۔ ممتاز دولتانہ کے زیرِ قیادت کونسل مسلم لیگ کو جاگیرداروں اور میدانِ سیاست کی اہم شخصیات کی حمایت حاصل تھی جبکہ قیوم خان کی سربراہی میں کام کرنے والی قیوم لیگ کو مارشل لا حکام کی پشت پناہی میسر تھی اور وہ بھی اچھی جا رہی تھی۔ مفتی محمود کی جمیعت العلمائے اسلام اور ولی خان کی نیپ بلوچستان و سرحد میں مقبول تھیں۔ پیپلز پارٹی اور نیپ کو فوج پسند نہیں کرتی تھی۔ مشرقی پاکستان میں فوج کے پسندیدہ سیاستدان نور الامین تھے۔

لیکن ملکی سیاست اس ڈگر پر نہیں چلی جیسا کہ منصوبہ سازوں کو اُمید تھی۔ کسی روک ٹوک کے بغیر چلنے والا سیاسی عمل علاقائیت پسندوں کی بجائے وفاق پر یقین رکھنے والوں کی مدد کر رہا تھا۔ حکمران اس بات

سے سخت مضطرب اور پریشان تھے کہ عوامی لیگ کی طرح پیپلز پارٹی نے سب پر سبقت حاصل کرلی اور مشرقی پاکستان کی طرح مغربی پاکستان میں کوئی تشدد دیکھنے میں نہیں آرہا تھا کیونکہ ان کی منصوبہ بندی یہ تھی کہ آخرِ کار تشدد کی لہر سب کچھ بہا کرلے جائے گی اور الیکشن کا ڈرامہ فلاپ ہوجائیگا۔

جونہی سیاسی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا' میری مصروفیت بڑھ گئی کیونکہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو سیاسی پیشرفت سے باخبر رکھنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ صوبے میں تشدد نہ ہونے کے برابر تھا۔ جس سے فوجی حکام کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ انتخابی تقاریر میں زیادہ تر مارشل لا کو نشانۂ تنقید بنایا جاتا تھا۔ مجھے فوجی افسروں کی آگاہی کے لیے لمبی لمبی تقریروں کا خلاصہ تیار کرنا اور انگریزی میں ترجمہ کرنا پڑتا تھا کیونکہ وہ قومی زبان سمجھنے سے عاری تھے۔

فوجی حکمران سیاستدانوں کے بہت سے بیانوں پر برہمی کا اظہار کرتے تھے' تاہم جس نعرہ نے انہیں سب سے زیادہ پریشان کیا' وہ یہ تھا۔ ''کرنل جرنل کی سرکار نہیں چلے گی۔''

ان کے غیظ وغضب کا سارا نزلہ مجھ پر گرتا۔ وہ پولیس کو سارے فساد کی جڑ سمجھتے تھے جو شر پسندوں کو موقع پر گرفتار نہیں کرتی تھی۔ چونکہ یہ نعرہ ہر روز لگایا جاتا تھا اس لیے میری گوشمالی بھی روزمرہ کا معمول بن گئی جو مجھے بڑی شاق گزرتی تھی۔ ناچار میں نے بریگیڈیئر بی ایم مصطفیٰ اور بریگیڈیئر قادر کے مُنہ پر صاف صاف کہہ دیا کہ قانونی لحاظ سے یہ نعرہ قابلِ اعتراض نہیں۔ یہ محض اس اعلان کی توثیق کرتا ہے کہ جو سی ایم ایل اے اور صدر نے قوم سے اولین خطاب میں کیا تھا۔ یعنی ''مارشل لا قطعی عارضی ہے اور ملک جلد ہی جمہوری عمل کی طرف لوٹ جائے گا''۔ جس سے منطقی طور پر یہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ کرنل اور جرنل زیادہ عرصہ ملک پر حکومت نہیں کریں گے۔

بریگیڈیئر میری بات کی تہہ تک پہنچ گئے اور جھنجھلا کر بولے: ''تمہیں تو جیل میں ہونا چاہیے۔''
میں یقیناً جیل میں ہوتا لیکن جنرل ٹکا خان کی عنایت ونوازش کے طفیل بچ گیا۔ مجھے جلد ہی احساس ہوگیا کہ میں غلط جگہ بحث کرکے بلاوجہ اپنے نقصان کی راہ ہموار کرتا ہوں۔ مارشل لا حکام کسی نہ کسی بہانے بہت سے لوگوں کو گرفتار کرکے جیلوں میں ڈالنا چاہتے تھے تاکہ سیاسی سرگرمیوں میں احتجاج اور تشدد کا عنصر شامل ہو جائے اور انہیں من مانی کرنے کا موقع مل جائے۔ ان کی خواہش کے احترام میں بہت سے لوگوں کو حوالۂ زنداں کردیا گیا۔ تاہم نتائج حسبِ منشا نہیں نکلے۔ جماعتِ اسلامی اور پیپلز پارٹی کے درمیان حکمرانوں کی

خواہش کے مطابق شدید محاذ آرائی نہیں ہوئی۔ مگر عقیل نے پیپلز پارٹی کے ترجمان روزنامہ ''مساوات'' اور مولانا کوثر نیازی کے شہاب پر پابندی لگانے کے لیے کہیں نہ کہیں سے قابلِ اعتراض مواد ڈھونڈ نکالا۔ تاہم بھٹو نے احتجاج کی دھمکی دی تو صرف تین دن بعد ''مساوات'' پر سے پابندی اٹھالی گئی۔ اس پر مارشل لا ہیڈکوارٹرز نے بڑی سبکی محسوس کی۔

جب ایئر مارشل نور خان نے محنت کشوں کے حالاتِ کار بہتر بنانے کے لیے بعض اقدامات کیے تو انہیں انتہائی خطرناک آدمی سمجھا جانے لگا۔ مجھے حکم دیا گیا کہ گورنر کے خلاف مواد جمع کروں تاکہ مارشل لا کے تحت مقدمہ بنایا جا سکے۔ میں یہ حکم سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ میں کوشش کے باوجود ان کے خلاف کوئی مواد اکٹھا نہیں کر سکا۔ بہرحال ایئر مارشل کو جلد ہی فارغ کر کے ان کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمٰن کو گورنر بنا دیا گیا۔

مقدس گائے کو چھیڑنے کے مضمرات

میجر جنرل اے اے کے نیازی لاہور کے ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے۔ ہمیں ان کے خلاف ثبوت اور حلفیہ بیانوں کے ساتھ کرپشن اور عورتوں کے ساتھ معاشقوں کی بہت سی رپورٹیں موصول ہو رہی تھیں لیکن کوئی بھی ڈر کے مارے اس سلسلے میں بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا' مبادا ''مارشل لا بدنام ہو جائے۔'' دوسرے فوجی افسران کے خلاف بھی جو مارشل لا سے متعلق امور نمٹانے پر مامور تھے' اسی طرح کی شکایات کا طومار موجود تھا۔ لیکن ان سب کو فائل کر دیا گیا۔

ایک بار جنرل ٹکا خان نے مجھے نیازی کے خلاف انتہائی کراہت آمیز شکایت کی تفتیش کرنے کا حکم دیا لیکن میں اپنی جان کے خوف سے باز رہا۔ میں جانتا تھا کہ ایسا کرنے کی صورت میں مجھے من گھڑت الزامات کے تحت جیل بھیج دیا جائے گا اور ٹکا خان کو اس کی خبر تک نہیں ہونے پائے گی۔ ان دنوں فرضی الزامات کی بنیاد پر کسی کو ملک دشمن قرار دے کر اس کے خلاف سمری ملٹری کورٹس میں فوجداری مقدمہ چلا کر سزا سنا دینا معمول کی حکمتِ عملی بن گئی تھی' خواہ اس کارروائی سے کسی متنازعہ مکان کا قبضہ لینا مقصود ہوتا یا کسی فوجی افسر کی زمین سے مزارع کو بے دخل کرنا مطلوب ہوتا۔ مارشل لا ہیڈکوارٹرز میں بدعنوانیوں کی بہت سی شکایات موصول ہوتی تھیں اور لوگوں میں بھی گردش کرنے لگی تھیں۔ کیونکہ ایسی کارروائی کا نشانہ بننے والے خاموش نہیں رہتے تھے' اگرچہ ان کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی ممکن نہیں تھی۔ یہاں تک کہ میرے ساتھ انٹیلی جنس میں کام کرنے والے فوجی افسر بھی بااختیار سینئر افسروں کے خلاف رپورٹ تیار

کرنے سے ڈرتے تھے۔ جنرل ٹکا خان جو خود صاحبِ کردار آدمی تھے' اس قسم کی شکایات سن کر پریشان ہو گئے' لیکن نظام کی اصلاح کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔

ایک دن مال روڈ پار کرتے ہوئے اچانک سابق استاد ڈاکٹر نذیر احمد سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے صورتحال کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا:

''ایسا لگتا ہے جیسے ہماری روح وسوسوں اور جھوٹی باتوں کو فروغ دینے سے زخمی ہو گئی ہے۔ اخلاقی بنیاد زنگ آلود ہو جائے تو ملک کی سلامتی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ تعفن اور اخلاقی بگاڑ نے سارے جسدِ سیاست کو مفلوج کر دیا ہے۔ ملک کی حفاظت کرنے والے ہی اسے تباہ کرنے پر تل گئے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ ان کے ساتھ میں بھی رونے لگا۔ اس رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی۔

ون یونٹ کا خاتمہ بیوروکریسی کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ پرانے صوبے بحال ہونے سے بہت سے لوگوں کو ترقیاں ملیں۔ کیونکہ بہت سی نئی اسامیاں پیدا کر لی گئی تھیں۔ علاوہ ازیں ''303'' کرپٹ افسران کی ریٹائرمنٹ یا برطرفی سے بھی بہت سی پوسٹیں خالی ہو گئی تھیں چنانچہ پولیس کے اعلیٰ عہدوں میں بھی بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ صاحبزادہ رؤف علی انسپکٹر جنرل بن کر آزاد کشمیر چلے گئے۔ میاں بشیر ریٹائر ہو گئے اور ان کی جگہ انور آفریدی پنجاب کے آئی جی بنے۔ قاضی محمد اعظم سپیشل برانچ کے ڈی آئی جی بنا دیئے گئے جبکہ آغا محمد علی نے اپنے بھائی آغا یحییٰ خان (صدر) کے چیف سیکورٹی آفیسر کا منصب سنبھال لیا۔

بھارتی طیارے کا اغوا

بھارت کے ''گنگا'' نامی طیارے کو اندرون ملک پرواز کے دوران اغوا کر کے لاہور پہنچا دیا گیا۔ میں اور میجر عقیل فوراً ایئرپورٹ پہنچے۔ اغوا شدہ فوکر طیارہ وی آئی پی لاؤنج کے نزدیک کھڑا تھا۔ لاہور کے ایس ایس پی سردار وکیل خاں بھی اپنے سٹاف کے ساتھ موقع پر موجود تھے۔ چیف سیکرٹری افضل آغا' آئی جی سپیشل برانچ کے ڈی آئی جی' آرمی کے سٹیشن کمانڈر اور دوسرے فوجی افسر نیز ایئرفورس کے افسران بھی آئے ہوئے تھے۔ پتہ چلا دو کشمیری نوجوان اشرف اور ہاشم طیارہ اغوا کر کے لائے ہیں۔ ان

کے ساتھ رابطہ کیا گیا تو انہوں نے خود کو مجاہدِ آزادی ظاہر کیا۔ ان دنوں کشمیر میں آزادی کی کوئی تحریک نہیں چل رہی تھی۔ اس لیے مجھے ان کی اصلیت کے بارے میں کچھ شک پڑ گیا۔ ہائی جیکرز افضل آغا کے ساتھ بات چیت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کا تعلق بھی سرینگر سے تھا۔ طویل مذاکرات کے بعد انہوں نے تمام مسافروں اور ارکان عملہ کو رہا کر دیا۔ طیارے میں صرف ہائی جیکر رہ گئے۔

اگلے دن ایئر پورٹ پر بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا۔ عوام ہائی جیکرز کو مجاہدینِ آزادی اور ہیرو قرار دے کر ان کے حق میں نعرے لگانے لگے جنہیں دیکھ کر ہائی جیکرز خوشی سے پھولے نہیں رہے تھے۔ میں نے انہیں قریب سے دیکھا۔ جس وقت اشرف وی آئی پی لاؤنج میں چیف سیکرٹری کے ساتھ مذاکرات میں مصروف تھا، کاک پیٹ میں اکیلا ہائی جیکر رہ گیا جس کے ہاتھ میں گرنیڈ تھا۔ میں اس کے قریب تر ہو گیا۔ اسے باتوں میں لگا کر بہلانے پھسلانے کی کوشش کی۔ وہ صرف کشمیری زبان بولتا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آئی، میں نے اس کے ساتھ اُردو میں بات کرنا چاہی تو کہنے لگا کہ وہ اُردو نہیں سمجھتا۔ اس سے میرا شک اور بڑھ گیا۔ کیونکہ اکثر کشمیری اچھی خاصی اُردو بولتے ہیں خصوصاً پڑھے لکھے افراد۔ بہرحال میں نے اس کے ساتھ بات چیت جاری رکھی۔ اس کا ساتھی کچھ سینڈوچ لے کر واپس آیا۔ وہ خود بھی سینڈوچ کھا رہا تھا۔ میں نے انہیں چائے کی پیشکش کی تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ چائے نہیں پیتے۔ میرے خیال میں وہ خود کو ضرورت سے زیادہ چالاک اور محتاط ظاہر کر رہے تھے۔

میں نے گہرائی میں جا کر صورتِ حال کا جائزہ لیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ انہیں بآسانی گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ جب ان میں سے کوئی ایک مذاکرات کے لیے گیا ہوا ہو تو دوسرے کو اچانک جھپٹ کر قابو کر لیا جائے اور اس کے ہاتھ سے اسلحہ چھین لیا جائے۔ مذاکرات میں مصروف ہائی جیکر کو وی آئی پی لاؤنج میں گرفتار کرنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ اس طرح سارا ڈرامہ اپنے انجام کو پہنچ جاتا۔ میں نے اپنے منصوبہ کے بارے میں وکیل خان سے بات کی تو وہ فوراً میری بات سے متفق ہو گئے۔ انہوں نے آئی جی اور چیف سیکرٹری سے مشورہ کیا تاہم وہ ایوانِ صدر سے کلیئرنس لیے بغیر کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہیں تھے۔ یحییٰ خان اپنی رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ وہ اس سنگین قومی بحران پر توجہ دینے کے لیے دن بھر دستیاب نہیں ہو سکا۔

میں نے وکیل خان پر زور دیا کہ وہ اپنے طور پر کارروائی کر کے ہائی جیکروں کو گرفتار کر لیں۔ کیونکہ یہ ایک آپریشنل معاملہ ہے۔ حکامِ بالا کو پیش آمدہ حالات سے بعد میں مطلع کر دیں اور ملک کو سنگین

صورتحال کا شکار ہونے سے بچالیں۔ لیکن ان میں اوپر کے حکم کے بغیر کوئی قدم اٹھانے کا حوصلہ نہیں تھا۔ بہرحال اس وقت تک مجھے پختہ یقین ہوگیا کہ ہائی جیکنگ مشکوک آپریشن ہے اور ہائی جیکرز کے ناپاک مقاصد پورے ہونے سے پہلے کچھ نہ کچھ کارروائی ضرور ہونی چاہیے۔ میں اپنے طور پر اقدام کرنے کو تیار تھا' لیکن اس وقت میرے زیرِ کمان کوئی فورس نہیں تھی۔

میں ایئرپورٹ پر ہی تھا جب بھٹو ڈھاکہ سے لاہور پہنچے اور ڈاکٹر مبشر حسن نے ان کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر مبشر نے تجویز پیش کی کہ بھٹو کو ہائی جیکروں سے ملاقات کرنی چاہیئے۔

''میں ان سے کیوں ملاقات کروں؟'' بھٹو نے پوچھا۔

''وہ کشمیری مجاہدین ہیں اور اہالیانِ لاہور کے ہیرو بن گئے ہیں۔'' ڈاکٹر مبشر نے جواب دیا۔

''مجھے معلوم نہیں' وہ کون ہیں؟ ممکن ہے یہ کوئی چال ہو۔''

بھٹو کے یہ الفاظ میں نے بذاتِ خود سنے۔ ان کا وجدان درست تھا۔ لیکن انہیں غلط مشورہ دیا جارہا تھا۔ بہرحال ڈاکٹر مبشر کے اصرار پر وہ ہائی جیکرز سے ملے اور رسمی مصافحہ کر کے وہاں سے فوراً رخصت ہوگئے۔ ایئرپورٹ پر اخباری نمائندے موجود تھے۔ انہوں نے اس ملاقات کی تصویریں بنائیں۔ بعدازاں اس واقعہ کو رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کیا گیا اور اس بات پر بھٹو کی خوب بھد اڑائی گئی کہ انہوں نے دشمن کے ایجنٹوں کی آؤ بھگت کی تھی۔ اعلیٰ حکام ہائی جیکرز کو گرفتار کرنے کے سلسلے میں بروقت فیصلہ نہیں کر سکے۔ یہاں تک کہ ہائی جیکروں نے طیارہ کو آگ لگادی اور خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردیا۔ بھارت نے اس واقعہ کی آڑ لے کر اپنے علاقہ سے گزرنے والی بین الصوبائی پروازوں پر پابندی عائد کردی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین براہ راست رابطہ ختم ہوجانے سے ملک کو بے پناہ نقصان برداشت کرنا پڑا۔ بعد کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ ہائی جیکرز واقعی بھارت کے ایجنٹ تھے۔ اختیارات کے مرکز میں ارتکاز نے مقامی سطح پر فیصلہ کی قوت سلب کرلی اور بے یقینی کی فضا پیدا کردی تھی جس میں کوئی بھی خطرہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہوا۔ اس کا نتیجہ ایک بحران کی صورت میں نکلا۔ چیف سیکرٹری سے اوپر کے متعلقہ حکام ڈر کے مارے روبوٹ بن گئے تھے اور ان میں بروقت صحیح فیصلہ کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

انتخابی نتائج کا تجزیہ

جوں جوں الیکشن کی تاریخ (دسمبر 70ء) قریب آتی گئی انتخابی مہم میں شدت پیدا ہوتی

گئی۔ مارشل لاہیڈکوارٹرز میں الیکشن کے ممکنہ نتائج کے متعلق اندازے موصول ہونے لگے۔ اگرچہ ہم صرف پنجاب کے معاملات کی نگرانی کر رہے تھے۔ تاہم جلد ہی دوسرے صوبوں سے بھی رپورٹیں موصول ہونے لگیں۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی انتہائی مقبول جماعت لگ رہی تھی' جبکہ انٹیلی جنس ایجنسیاں قیوم لیگ اور مسلم لیگ (کونسل) کو جیتنے والے گھوڑے قرار دے رہی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو برتری حاصل تھی اور دوسری جماعتوں کے بارے میں بھی خیال کیا جارہا تھا کہ وہ زیادہ پیچھے نہیں ہیں۔ قطعی خوش کن نتیجہ یہ تھا کہ ملے جلے نتائج کی صورت میں فوج ہمیشہ ثالث کا کردار ادا کرتی رہے گی۔ ہر کام حکمرانوں کے حسب منشا انجام پائے گا اور ان کے تیار کردہ بڑے منصوبہ کے موافق ہوگا۔

شومئی قسمت الیکشن سے پہلے مشرقی پاکستان کو بادوباراں کے تباہ کن سیلاب نے آلیا جس میں دس لاکھ کے قریب انسان لقمۂ اجل بننے کا اندیشہ ظاہر کیا گیا۔ بے پناہ مالی نقصان اس کے علاوہ تھا۔ عوامی لیگ نے جانی و مالی نقصان کے اعداد وشمار قصداً مبالغہ آمیزی کے ساتھ پیش کیے تاکہ مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کو ہوادی جاسکے۔ اس کے بعد اس سے بھی بدتر سائیکلونوں سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد محض ہزاروں میں بتائی گئی۔ یحییٰ خاں نے جو چین کے دورے پر گیا ہوا تھا' واپسی پر چند گھنٹوں کے لیے ڈھاکہ میں رکنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ وہ خاصی تاخیر سے مشرقی پاکستان گیا تو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چلنے کا ڈرامہ رچایا۔ بنگالیوں نے اسے سنجیدگی سے لینے کی بجائے ایک مذاق سمجھا۔ بیوروکریسی کا ذہن عوام کے موڈ کو قطعاً نہیں سمجھ سکا۔ ایک اجلاس میں میں نے اس امر کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی کہ سرکاری اندازے حقیقت پر مبنی نہیں لگتے اور پیپلز پارٹی سرکاری اندازوں سے زیادہ سیٹیں جیت لے گی۔ تاہم کسی نے میری بات سننا بھی گوارا نہیں کی۔ وہ پیپلز پارٹی کو بچہ پارٹی سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کوئی بھی سنجیدہ آدمی بھٹو جیسے اشتعال پسند مقرر اور بک بک کرنے والے لیڈر کو ووٹ نہیں دے گا۔

انتخابی نتائج نے دنیا بھر کو یقین دلانے والے سیاسی پنڈتوں کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے دو کے سوا ساری نشستیں جیت لیں جبکہ مغربی پاکستان میں پی پی سب سے بڑی پارٹی کے طور پر ابھری جسے پنجاب اور سندھ جیسے اہم صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل تھی۔ بلوچستان اور سرحد میں نیپ اور جے یو آئی نے مل کر میدان مار لیا۔ بھٹو' ولی خاں اور مفتی محمود کے مابین پہلے سے ذہنی ہم آہنگی موجود تھی۔ قیوم لیگ اور کونسل لیگ محض چند سیٹیں حاصل کر سکیں۔ عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان سے نشستیں جیت لیں۔ تاہم مغربی پاکستان میں اسے ایک سیٹ بھی نہیں ملی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو حکومت

بنانے کا جمہوری حق حاصل تھا لیکن ہائی کمانڈ نے ان کے خلاف ایک سازشی منصوبہ تیار کر رکھا تھا جسے مناسب وقت پر بروئے کار لانا تھا۔

جنرل ٹکا خان کے زیرِ صدارت ایک طویل اجلاس ہوا جس میں انتخابی نتائج پر غور و خوض کیا گیا۔ شرکائے اجلاس ایک دوسرے سے بڑھ کر یہ ثابت کرنے میں مصروف تھے کہ انتخابی نتائج عظیم سیاسی پختگی کے مظہر ہیں کیونکہ ان کے نتیجہ میں دو جماعتی نظام رائج ہو سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے پانے کے لیے انگلستان کو پورے پانچ سو سال محنت کرنا پڑی تھی۔ ٹکا خان میرے خیالات جاننے کے خواہاں تھے لیکن میں بحث میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو میں نے عام نقطۂ نظر کی تائید کی بشرطیکہ حکمران اکثریتی جماعت کو اقتدار منتقل کرنے میں مخلص ہوں اور پی پی اپوزیشن بنچوں پر بیٹھنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ورنہ ملک دو حصوں میں بٹ جائے گا۔ انہوں نے غیظ و غضب کے عالم میں میری طرف دیکھا اور بولے: ''تم ایک بے وقوف شخص ہو؟'' گورنر ہاؤس میں پوسٹنگ کے دوران یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے میرے متعلق ایسے الفاظ استعمال کیے۔ شاید جنرلوں کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ انہوں نے مستقبل کے لیے جو مکروہ منصوبہ بندی کر رکھی تھی، اس کا راز فاش ہو گیا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے ان کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو یا میرا پاؤں کسی بارودی سرنگ پر پڑ گیا ہو۔ مجھ پر اسی لمحے سارا کھیل واضح ہو گیا۔ کیونکہ میں خاصے عرصہ سے ان کی انٹیلی جنس کا ایک جزو بنا ہوا تھا۔

اجلاس اچانک ختم کر دیا گیا۔ میرے رفیقِ کار انعام الحق میری ناعاقبت اندیشی پر بے حد پریشان ہوئے اور انہوں نے آئندہ محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ مجھے اگلے ہی دن وہاں سے رخصتی کا پروانہ مل گیا اور سپیشل برانچ کے ایس پی کی حیثیت سے راولپنڈی بھیج دیا گیا جبکہ میں یہ توقع کر رہا تھا کہ مارشل لا ہیڈ کوارٹرز میں اتنی سختیاں برداشت کرنے کے بعد مجھے کسی ضلع میں تعینات کیا جائے گا۔ میں جنرل ٹکا خان سے رخصتی ملاقات کرنے گیا تو انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ معمولی اخلاق کا مظاہرہ بھی نہ کر سکے جس نے ان کے ساتھ دیانتدارانہ اختلاف رائے کیا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

باب 8

تباہی کے راستے پر

لاہور میں چارج چھوڑتے وقت میں اس بات پر خوش ہو رہا تھا کہ مارشل لا ہیڈ کوارٹرز کے وحشت ناک ماحول سے جان چھوٹ گئی۔ اس وقت میں یہ احساس نہیں کر سکا کہ سپیشل برانچ (راولپنڈی) کا ایس پی بننے کے بعد میں جوڑ توڑ' جہالت اور ہٹ دھرمی کے عظیم تر مرکز میں داخل ہو جاؤں گا۔

میں نے 1971ء کے منحوس اور بھیانک سال کے پہلے مہینہ میں نئے منصب کا چارج سنبھالا۔ میری ذمہ داریوں میں صدر کی ذات اور ایوانِ صدر کی سیکورٹی شامل تھی۔ صدر کے ذاتی محافظ (Gunmen) میرے سٹاف میں سے تھے۔ میں راولپنڈی ڈویژن کی سپیشل برانچ کے لیے سیاسی اور سلامتی سے متعلق خفیہ معلومات حاصل کرنے کا ذمہ دار بھی تھا۔ اسلام آباد بھی میرے دائرہ اختیار میں شامل تھا۔

اس وقت ایوانِ صدر ہر قسم کے لوگوں کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ صدر پرلے درجہ کا شرابی اور عورتوں کا رسیا تھا۔ اس کی سیکورٹی کا انچارج کرنل ہم جنس پرست تھا' البتہ صدر کے ملٹری سیکرٹری میجر جنرل اسحاق نہ صرف پکے نمازی بلکہ تہجد گذار تھے۔

اس کے علاوہ وہاں دلال اور طوائفیں تھیں اور بعض کو انتہائی اہم مرتبہ حاصل تھا۔ ان میں اقلیم اختر رانی' مسز کے این حسین اور لیلیٰ مظفر سرفہرست تھیں۔ علاوہ ازیں وہاں بہت سی بدنام لیکن حسین و پرکشش عورتوں کا ہجوم تھا جو سارا دن تمباکو نوشی' شراب نوشی اور ناچنے کودنے میں مصروف رہتی تھیں۔ پولیس کے سپاہی ایوانِ صدر کو کنجر خانہ' جی ایچ کیو کو ڈنگر خانہ اور اپنی پولیس لائنوں کو لنگر خانہ کہتے تھے۔

جنرل رانی۔ طلسم ہوشربا

اقلیم اختر کو جسے جنرل یحییٰ خان کی قریب ترین دوست ہونے کے باعث عام طور پر جنرل رانی کے

نام سے پکارا جاتا تھا' بھٹو کے برسر اقتدار آنے کے بعد گجرات میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک ٹیم نے جو ڈی ایس پی رائے شاہ محمد اور انسپکٹر ملک محمد وارث پر مشتمل تھی' میری نگرانی میں 23 دن تک اس سے پوچھ گچھ کی تھی۔

وہ پولیس انسپکٹر رضا کی بیوی تھی اور گجرات سے تعلق رکھتی تھی۔ یحییٰ خان اور جنرل رانی کے مابین تعلقات اس وقت قائم ہوئے جب یحییٰ خان نے سیالکوٹ کے جنرل آفیسر کمانڈنگ کی حیثیت سے سی ایم ایچ کا دورہ کیا جہاں وہ زیرِ علاج تھی۔ ان کی دوستی میں جلد ہی بے تکلفی اور اعتماد بڑھ گیا۔ یحییٰ خان ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران اس وقت بھی ہیلی کاپٹر پر اس کے گھر جاتا رہا جب وہ گجرات کے نزدیک چھمب' جوڑیاں سیکٹر کا انچارج تھا۔

ایک دن یحییٰ خان دادِ عیش دینے کی غرض سے اس کے پاس گیا تو وہ ایک دوسرے ڈی ایس پی مخدوم کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی۔ شراب کے نشہ میں دھت مخدوم یحییٰ خان کو دیکھ کر اس قدر مشتعل ہوا کہ اس نے اپنے سرکاری پستول سے ''جنرل رانی'' کے خفیہ اعضا پر گولیاں ماریں۔ فائرنگ کی آواز سن کر یحییٰ خان ڈر گیا اور اپنے ہیلی کاپٹر پر واپس بھاگ گیا۔ رانی نے مخدوم کے آئندہ غیظ و غضب سے بچنے کے لیے اپنی نوخیز لڑکی اس کے عقد میں دے دی۔ مخدوم بعد ازاں عادی نشئی بن گیا اور انتہائی عبرت انگیز انجام سے دوچار ہوا۔

جنرل رانی کے پاس یحییٰ خان اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں معلومات کا طومار تھا۔ اس کے بقول یحییٰ خان نے نومبر 1968ء میں اس وقت سے اقتدار پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی جب ایوب خاں کے خلاف احتجاجی تحریک میں شدت پیدا ہوئی۔ وہ فوج کے تقریباً ہر اہم آدمی کو جانتی تھی اور جرنیلوں کی رنگ رلیوں' سمگلنگ' زراندوزی اور دیگر کرتوتوں پر مبنی بہت سی کہانیوں سے واقف تھی۔

میجر جنرل خداداد کے ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر لاہور بننے کے بعد جنرل رانی اور مذکورہ جنرل نے مارشل لا کے نفاذ اور یحییٰ خان سے قربت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دولت جمع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ رفیق سہگل کو جو ان دنوں سہگل گروپ آف انڈسٹریز کے سربراہ تھے' ایک سودے کی پیشکش کی گئی۔ اگلے دن سہگل نے فلیٹیز ہوٹل میں رانی سے ملاقات کی اور اسے 10 لاکھ روپے کے علاوہ نئی ٹیوٹا کار پیش کی۔ سہگل کے روانہ ہوتے ہی جنرل خداداد رانی کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کار رانی کو دے دی اور رقم خود لے کر چمپت ہو گیا۔

رانی نے جرنیلوں' سیاستدانوں اور افسروں کے ساتھ میل ملاپ کے نتیجہ میں بے پناہ دولت اکٹھی کرلی تھی۔ جنرل یحییٰ خان کے برسراقتدار آنے کے بعد گجرات کے ایک مشہور سیاستدان نے اسے چھ ہزار روپے ماہورا لاؤنس دینا شروع کر دیا۔ میرے افسر بالا شیخ محمد اکرم' ڈی آئی جی سپیشل برانچ (پنجاب) کے بھی اس کے ساتھ بڑے گہرے مراسم تھے۔ جب انہوں نے میری رپورٹ میں اپنا نام اور سرگرمیوں کی تفصیل پڑھی تو بہت غضب ناک ہوئے۔

رانی نے بتایا کہ وہ ناگہانی طور پر رفیق سہگل کے عشق میں گرفتار ہوگئی تھی کیونکہ وہ انتہائی خوب صورت تھے۔ تاہم سہگل نے اس کی پیش قدمیوں کا مثبت جواب نہیں دیا۔ انہیں اس کی دلچسپ سزا بھگتنی پڑی۔ ایک دن پشاور کے گورنر ہاؤس میں ایک پارٹی کے دوران رانی نے یحییٰ خان سے شکایت کی کہ:

''آغا جی رفیق سہگل میرے نال محبت نئی کردا۔''

یحییٰ خان نے گورنر ہاؤس کے نگران کو طلب کر کے اس سے پوچھا کہ ''جب ملکہ الزبتھ اپنے دورے کے دوران یہاں آئی تھیں تو کون سے کمرے میں سوئی تھیں؟''

نگران نے کمرہ کی نشاندہی کی۔ اس پر جنرل یحییٰ خان نے جو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی تھا' رفیق سہگل کو حکم دیا کہ:

''آج رات تم مارشل لا احکام کے تحت اسی کمرے میں اس کے ساتھ سوؤ گے۔''

رفیق اس حکم کی تعمیل سے انکار کی جرأت نہیں کر سکے۔

اس کے بعد یحییٰ خان رانی سے مخاطب ہوا۔

''موٹی تم اس کے پیچھے جاؤ - خدا حافظ''

رانی رفیق کے پیچھے روانہ ہوگئی اور دونوں کے داخل ہو جانے کے بعد کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔

رانی نے پوچھ گچھ کرنے والوں کو بتایا کہ ایک بار کراچی میں قیام کے دوران شاہِ ایران کو روانہ ہونے میں خاصی تاخیر ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یحییٰ خان گورنر ہاؤس میں اپنی خوابگاہ سے باہر نہیں آ رہا تھا۔ پروٹوکول کے حوالے سے بڑا سنگین مسئلہ پیدا ہوگیا لیکن کوئی بھی صدر کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ آخر کار ملٹری سیکرٹری جنرل اسحاق نے رانی سے درخواست کی کہ

وہ اندر جائے اور صدر کو باہر لائے۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو ملک کی ایک مشہور ترین گلوکارہ کو صدر کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے پایا۔ خود رانی کو اس منظر سے بڑی کراہت محسوس ہوئی۔ اس نے کپڑے پہننے میں صدر کی مدد کی اور بدقت تمام اسے باہر لائی۔

رانی نے یہ انکشاف بھی کیا کہ جنرل یحییٰ خان کے شیخ مجیب کے ساتھ اس وقت سے تعلقات تھے جب اس نے زمام اقتدار بھی نہیں سنبھالی تھی۔ ایک رات کو وہ یحییٰ خان کے پہلو میں تھی جب شیخ مجیب اچانک کمرے میں آ گئے۔ وہ گھبرا کر اور کسی قدر خوفزدہ ہو کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مجیب جو گول میز کانفرنس کے سلسلے میں اسلام آباد آئے ہوئے تھے۔ ایک گھنٹہ تک جنرل کے ساتھ رہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد رانی نے یحییٰ خان سے کہا:

”آغا جی! آپ کو اس آدمی سے نہیں ملنا چاہیے تھا۔ اس کے ساتھ ملاقات خطرناک ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ صدر کو پتہ چل گیا تو وہ ناراض ہوں گے۔“

”تم فکر نہ کرو، موٹی“ یحییٰ نے جواب دیا۔

”ایوب خان ختم ہو چکا ہے۔ اب تم حکومت کرو گی۔ لیکن کسی سے ذکر نہ کرنا۔ یہ ایک خفیہ معاملہ ہے“

رانی نے مزید بتایا کہ 1960ء میں راولپنڈی کلب کی ایک محفل میں اس کی ملاقات بھٹو سے ہوئی، جہاں اس کا کزن تجمل حسین بھی موجود تھا۔ بعد میں وہ پارٹی فلشمین ہوٹل منتقل ہو گئی جہاں بھٹو اور تجمل حسین میں اس بات پر لڑائی ہوئی کہ رانی نے بھٹو کو لفٹ کیوں کرائی۔ رانی نے کہا کہ بھٹو نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا لیکن تجمل نے سارا کھیل خراب کر دیا۔ رانی کے بقول بھٹو بعد میں اس کی بھابی (Sister-in-law) کو ترجیح دینے لگے اور رانی کو رقابت کی آگ میں جلنے کے لیے چھوڑ دیا۔

اقلیم اختر کی بابت میری رپورٹ حمود الرحمٰن کمیشن کے سامنے بھی پیش کی گئی جب کمیشن نے یحییٰ خان سے رانی کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا:

”میں اس خاندان کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میرے والد آغا سعادت علی کی بطور ایس پی گجرات میں پوسٹنگ ہوئی۔ یہ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔ رانی میری بہن کی طرح ہے۔“

خبیث اور کمینہ انسان

میں ان لوگوں میں شامل تھا جو جنرل یحییٰ خان کو خدا حافظ کہنے کے لیے اس وقت ایئر پورٹ پر موجود تھے جب وہ الیکشن کے بعد براستہ کراچی مشرقی پاکستان کے پہلے دورے پر گیا۔ یحییٰ خان ڈھاکہ کو روانگی سے قبل کراچی کے نزدیک مرغابی کا شکار کھیلنے کے لیے سردار یوسف چانڈیو کے ہاں ٹھہرا تھا۔ یوسف چانڈیو مسلم لیگ (قیوم گروپ) کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ میرے سٹاف میں شامل ڈی ایس پی مرزا انور بیگ بحیثیت گن مین صدر کے ساتھ تھا۔ اس نے خفیہ طریقے سے صدر اور چانڈیو کے مابین ہونے والے حسب ذیل گفتگو سن لی:

''سائیں، اب کیا ہوگا؟ الیکشن کے نتیجہ میں ایک طرف سور اور خبیث (مجیب) آگے آ گیا ہے، دوسری طرف ایک ذلیل اور کمینے انسان (بھٹو) نے اکثریت حاصل کر لی ہے۔

یحییٰ: بچو، فکر نہ کرو، بس تماشے دیکھتے جاؤ۔ میں ایسا دانہ پھینکوں گا کہ یا تو سور شکاری کتے کو ختم کر دے گا یا شکاری کتا سور کو مار ڈالے گا۔ شیر نے ان دونوں کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔''

خود کو ''شیر'' قرار دے کر یحییٰ خان نے دونوں بڑی پارٹیوں کے لیڈروں کے بارے میں اپنے عزائم کا واضح اظہار کر دیا تھا۔ تاہم اس نے مکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجیب کے ساتھ مذاکرات کے بعد اعلان کر دیا کہ وہ ملک کے وزیر اعظم ہوں گے۔

ڈھاکہ سے واپسی پر وہ بھٹو کے ساتھ تیتر کا شکار کھیلنے لاڑکانہ پہنچا اور بھٹو کو بتایا کہ ''مجیب تمہیں اور مجھے اقتدار میں شریک کرنے کو تیار نہیں۔ ہم دونوں اقتدار سے باہر رہیں گے۔ اس نے اپنے چھ نکاتی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کر لیا ہے جس کا مطلب ہے پاکستان ختم۔'' بھٹو شیخ مجیب کے ساتھ براہِ راست مذاکرات کرنے کے خواہاں تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے سے پہلے یا سیشن کے دوران مسائل کا حل تلاش کر لیں گے۔ لیکن اس سے یحییٰ خان کا کھیل خراب ہونے کا خدشہ تھا۔ اس لیے اس نے بھٹو کو گمراہ کرنے کی غرض سے کہا کہ:

''مجیب بڑا ہٹ دھرم اور ضدی ہے۔ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ اس کے ساتھ میری معرفت معاملہ کرو۔ اس طرح کامیابی کے زیادہ امکانات ہیں۔'' بھٹو نے جواب دیا ''مجھے کچھ مہلت دو اور قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے میں جلدی نہ کرو۔'' قدرے تذبذب کے بعد بھٹو ''پاکستان کو بچانے کی'' کوششوں میں شریک ہو گئے۔

یوں بھٹو کو مجیب کے خلاف بھڑکا کر ان کے دلوں میں نفرت اور انتشار کے بیج بوئے گئے۔ جب مجیب نے بھٹو کو نظر انداز کر کے مغربی پاکستان کے دوسرے لیڈروں سے رابطہ قائم کیا تو بھٹو کو بڑا ناگوار گزرا۔ سیاسی مذاکرات کے بارے میں ایوانِ صدر سے پریس کو گمراہ کن خبریں پہنچائی گئیں تا کہ دونوں بڑے لیڈروں کے درمیان کوئی مفاہمت نہ ہونے پائے۔

ڈھاکہ جانے والوں کی ٹانگیں توڑ دیں گے

ایک دن میں نے ایوانِ صدر میں بہت زیادہ پریشان کن صورتحال دیکھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی انتہائی تباہ کن واقعہ رونما ہو گیا ہے۔ اس دن بعض ثالثوں کے بارے میں یہ رپورٹ ملی تھی کہ انہوں نے ''دونوں بڑے بدمعاشوں کے درمیان جو پاکستان کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے' بعض اختلافات ختم کرا دیے ہیں۔'' اس بارے میں جنرل اسحاق سے بات چیت ہوئی تو میں نے کہا:

''میرے خیال میں یہ کوئی بُری بات نہیں۔'' جنرل اسحاق کو میری رائے پسند نہیں آئی۔ ناچار میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

اگلے دن اعلان کر دیا گیا کہ قومی اسمبلی کا افتتاحی اجلاس 3 مارچ 1971ء کو ڈھاکہ میں ہو گا۔ وہ اعلان عوامی لیگ کی طرف سے احتجاج کے جواب میں نہیں بلکہ مجیب اور بھٹو کے مابین کسی ممکنہ مفاہمت کو ناکام بنانے کی نیت سے کیا گیا تھا۔ بھٹو اور مجیب دونوں یحیٰی کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے تھے۔

بھٹو نے حکومت کے اس فیصلہ پر شدید غم و غصہ کا اظہار کیا۔ 28 فروری 1971ء کو مینارِ پاکستان (لاہور) میں ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے دھمکی دی کہ: ''اگر قومی اسمبلی کا کوئی رکن اجلاس میں شرکت کی غرض سے ڈھاکہ جائے گا تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ ایسے شخص کو ڈھاکہ جانے کا یک طرفہ ٹکٹ خریدنا چاہیے کیونکہ اسے مغربی پاکستان آنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔'' دراصل بھٹو کچھ عرصہ کے لیے اسمبلی کے اجلاس کا التوا چاہتے تھے۔ انہوں نے عوامی لیگ کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ: ''اگر وہ مشرقی پاکستان میں ایک طاقت ہیں تو مغربی پاکستان میں ہم بھی ایک طاقت ہیں۔'' لاہور کے اُردو روزنامہ آزاد نے اسی چیز کو ذرا وضاحت کے ساتھ ''اُدھر تم' اِدھر ہم'' کی شہ سرخی لگا کر شائع کر دیا۔ حالانکہ مصدقہ رپورٹ کے مطابق بھٹو نے اپنی تقریر میں مذکورہ بالا الفاظ قطعاً

استعمال نہیں کیے تھے۔ کئی سال بعد انگلینڈ میں آباد ایک لکھنے نے مذکورہ بالا تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''تمہارے لیڈروں نے اپنی ٹانگیں تو بچالیں تاہم ملک کو دو ٹکڑے ہونے سے نہیں بچا سکے۔''

میرے ایک مشرقی پاکستانی دوست کی جو اسلام آباد میں مقیم تھے' رائے تھی کہ اس مرحلہ پر سیشن کا التوا بڑا تباہ کن ثابت ہوگا۔ لیکن صدر نے قطعاً پرواہ نہیں کی اور اجلاس شروع ہونے سے محض دو دن پہلے ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں اس کا فوری اور شدید ردِ عمل ہوا۔ مغربی پاکستانیوں خصوصاً پنجابیوں پر جہاں کہیں بھی ہتھے چڑھے قاتلانہ حملے کیے گئے۔ کئی جگہ پنجابی افسروں کو خود ان کے نوکروں نے ذبح کر دیا۔ میرے اپنے ہم زلف امتیاز مسرور جو راج شاہی ڈویژن میں اسسٹنٹ کمشنر تھے' موت سے بال بال بچے۔ مغربی پاکستان کے بعض فوجی افسر خود اپنے محافظوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ تاجر پیشہ لوگوں اور بہاریوں کو جو وہاں صدیوں سے آباد تھے' خاص طور سے ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ صوبہ کا کنٹرول ان لوگوں نے سنبھال لیا ہے جنہیں کچھ عرصہ پہلے عوام نے منتخب کیا تھا۔ ہر چیز ساکت و جامد ہو کے رہ گئی' ٹرانسپورٹ' بجلی حتیٰ کہ پانی کی فراہمی بھی بند کر دی گئی۔ سول انتظامیہ بری طرح ناکام ہو گئی' شہر کا نظم ونسق عوامی لیگ کے لیڈروں نے سنبھال لیا تھا۔

ہر شخص ملک کے مستقبل کے بارے میں پریشان ومضطرب تھا ماسوائے یحییٰ خان اور اس کے حواری جرنیلوں کے۔ میں نے مشرقی پاکستان کے حالات پر انہیں اکثر بغلیں بجاتے دیکھا۔ کیونکہ ایسی صورتِ حال انہیں مداخلت کا جواز مہیا کرتی تھی۔ انہی دنوں ایوانِ صدر میں ایک جنرل کو یہ کہتے سنا گیا کہ: ''بنگالی تمام حدود پھلانگ گئے تھے۔ اب وہ مکمل طور پر گھیرے میں آ گئے ہیں۔'' اس نے یحییٰ خان کے ''شاطرانہ اقدامات'' کو سراہا اور ضرورت کے وقت کام آنے والے انسان کی حیثیت سے ملک کی خدمت کرنے پر اس کی خوب تعریف کی۔

مجیب نے 7 مارچ کو پلٹن میدان (ڈھاکہ) میں جلسۂ عام منعقد کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے حوالہ سے ایسی افواہیں گشت کرنے لگیں کہ مجیب اس جلسہ میں یک طرفہ طور پر آزادی کا اعلان کر دیں گے اور انڈیا بنگلہ دیش کی آزادی کو تسلیم کرنے والا پہلا ملک ہوگا۔ بی بی سی نے کئی خبر ناموں میں اس بات کو دہرایا کہ مجیب ''ایک اہم اعلان'' کریں گے' اور مذکورہ جلسۂ عام سے تھوڑی دیر پہلے یہ خبر بھی نشر کر دی کہ ''آزادی کی افواہیں'' سننے میں آ رہی ہیں۔

یحییٰ خان اس کے چند دن بعد ڈھاکہ گیا۔ بہت سے لوگ امید کر رہے تھے کہ وہ ذلیل بنگالیوں کو خوب مزہ چکھا کر آئے گا۔ ڈی ایس پی مرزا انور بیگ (صدر کے گن مین) نے روانگی کے وقت میرے کان میں کہا: ''میں ایک انتہائی شریر و خبیث انسان کے ساتھ جا رہا ہوں۔ تم میری بخیریت واپسی کی دعا کرنا۔'' وہ یحییٰ خان کے ناپاک اور عاقبت نا اندیشانہ اقدامات سے پوری طرح آگاہ تھا جبکہ باہر کے اکثر افراد بے خبر تھے۔

یحییٰ خان نے خود کو مجیب کے ساتھ نام نہاد مذاکرات میں مصروف رکھا۔ اس نے بات چیت کا تکلف پورا کرنے کے لیے دوسرے سیاستدانوں کو بھی ڈھاکہ بلا لیا۔ دوسری طرف 25 مارچ 1971ء کو رات کے بارہ بجے فوجی دستوں کو فضائی راستہ سے ڈھاکہ بھیجنا شروع کر دیا اور جنرل ٹکا خان کو مشرقی بازو کا گورنر و مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ جب مذاکرات ناکام ہو گئے تو وہ ٹکا خاں کو آرمی ایکشن کا حکم دے کر 25 مارچ 1971ء کی نصف شب کو چپکے سے مغربی پاکستان آ گیا۔ ناگزیر واقعات منصوبہ کے عین مطابق رونما ہوئے۔ یحییٰ خان کو اقتدار کے دو سال پورے ہونے پر اس کے ذاتی نجومی نے خوشخبری سنائی تھی کہ 25 مارچ کی تاریخ اس کے لیے بڑی مبارک ہو گی۔

یحییٰ خان کی واپسی کے بعد مشرقی پاکستان پر سٹیم رولر پھر گیا۔ ایسٹ پاکستان رجمنٹ، ایسٹ پاکستان رائفلز، ایسٹ پاکستان پولیس اور عوامی لیگ کے رضا کاروں (جنہیں بعد میں مکتی باہنی کا نام دے دیا گیا) نے مشترکہ طور پر فوج کے خلاف بغاوت بلکہ اعلانِ جنگ کر دیا۔ مکمل خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ کئی ملین افراد (حکومت پاکستان کے مطابق تین چار ملین، بھارت کے نزدیک 10 ملین افراد زیادہ تر ہندو) سرحد پار کر کے بھارت میں پناہ گزین ہو گئے۔ دونوں طرف سے زیادتیوں اور ظلم و تشدد کی داستانیں سننے میں آئیں۔ حالات انتہائی کربناک اور ہولناک تھے۔

بلیک بیوٹی کی ناز برداریاں

ملک بڑے برے حالات کی گرفت میں تھا، لیکن یحییٰ خان کو اس کی قطعاً پرواہ نہیں تھی۔ اس نے اپنی عیاشیاں بدستور جاری رکھیں، وہ ہر رات کو اپنی پسندیدہ عورتوں میں سے کسی ایک کو ساتھ لے کر راولپنڈی اور اسلام آباد کی سڑکوں پر ڈرائیونگ کے لیے نکل جاتا۔ ان سڑکوں پر سیکورٹی کے افراد پہلے سے

متعین کر دیئے جاتے تھے۔ بعض اوقات وہ اپنی کار میں جس کی چھت نہیں تھی، سیدھا کھڑا ہو جاتا اور محافظ دستے کے سامنے اپنی داشتہ کے ساتھ چھیڑ خانیاں کرنے لگتا۔ مسلح محافظوں کو ایک مسلم ریاست کے سربراہ کی ایسی حرکتوں پر زبردست غصہ آتا تھا جو جنون و دیوانگی کے دورہ میں اسے نقصان پہنچا سکتی تھیں۔

جب میں نے سیکورٹی کے مسئلہ کا ذکر اپنے باس یعنی ڈی آئی جی قاضی محمد اعظم سے کیا تو وہ صدر کے خلاف باتیں کرنے پر ناراض ہوئے۔ ''صدر کو سنگین قسم کے بہت سارے مسائل کا سامنا کرنے کے بعد آرام اور تفریح کی ضرورت ہوتی ہے۔'' انہوں نے اپنی رائے ظاہر کی۔

''جناب والا یہ سیکورٹی کے لیے زبردست خطرہ ہے۔'' میں نے اپنی رائے پر اصرار کیا۔

ڈی آئی جی نے خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن جواب میں کچھ نہیں کہا۔

یحییٰ خان کے پاس عیش و عشرت کے لیے بہت سی داشتائیں اور کئی ٹھکانے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوتا اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض تھا۔ ایک شام کو وہ مسز کے این حسین کے گھر گیا جو عرفِ عام میں ''بلیک بیوٹی'' کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے شوہر مشرقی پاکستان پولیس اکیڈمی میں ہمارے پرنسپل رہ چکے تھے اور ان دنوں سپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ کے آئی جی تھے۔ طویل بوریت سے بچنے کے لئے میں نے اپنے بیچ کے ساتھی محسن منظور سے کہا کہ صدر کی سیکورٹی ڈیوٹی میں وہ بھی میرے ساتھ شامل ہو جائیں اور کے این حسین کی رہائش گاہ پر پہنچ جائیں۔ صدر نے تین دن اور تین راتیں وہاں گزاریں اور اس دوران کوئی بھی ان سے ملاقات نہیں کر سکا۔ چوتھے روز وہ مسز حسین کو سٹیٹ گیسٹ ہاؤس لے گیا جہاں اسے اندرونی آرائش کرنے والی کے طور پر مستقل ملازم رکھ لیا گیا۔ اس کے شوہر کو سوئٹزرلینڈ میں سفیر بنا دیا گیا۔

یحییٰ خان کے مستعفی ہونے پر مسز حسین سٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے اسلام آباد منتقل ہو گئی اور اپنے بہنوئی کمال حسین کے ساتھ رہنے لگی جو وزارتِ خارجہ میں ایک افسر تھا۔ اسے زیرِ نگرانی رکھنا اشد ضروری تھا۔

معمول کی نگرانی کے علاوہ میں نے محسن منظور کو، جو ان دنوں پلاننگ کمیشن میں تھے، یہ ہدایت بھی کی کہ مسز حسین سے رابطہ رکھے۔ میں اُسے فرار ہو جانے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ وہ جنگی کمیشن کے لیے ایک اہم گواہ تھی۔ کے این حسین جو اس وقت بھی سوئٹزرلینڈ میں سفیر تھے، دل کا دورہ پڑنے سے اچانک فوت ہو گئے۔ بھٹو کو اسے وہاں جانے کی اجازت دینا پڑی، ورنہ بین الاقوامی سطح پر شور مچ جاتا کہ

ایک بنگالی بیوہ کو اپنے شوہر کی آخری رسوم میں شرکت کا موقع نہیں دیا گیا۔ میں اسے ایئرپورٹ تک چھوڑنے گیا۔ راستہ میں، میں اس سے یہ سوال پوچھے بغیر نہیں رہ سکا کہ فلاں موقعہ پر یحییٰ خان مسلسل تین دن اور تین رات تمہارے پاس کیوں ٹھہرا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ وہ صدر کو بنگالی میوزک سکھا رہی تھی۔

بی بی سی مشرقی پاکستان کے بارے میں حقائق پر مبنی رپورٹیں نشر کرنے لگا جو یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کو پسند نہیں تھیں اس لیے بی بی سی کی مذمت کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ بن گیا۔ یحییٰ خان کی قربت حاصل کرنے کے لیے، بہت سی عورتیں بی بی سی کے خلاف گانے گاتیں اور نظمیں پڑھتی تھیں۔ ایک موقع پر ایک حسین عورت نے اپنی سُریلی آواز میں اسی طرح کا نغمہ سنایا تو اسے ''محبوبہء پاکستان'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ یحییٰ خان نے اس کی حب الوطنی سے خوش ہو کر اسے گود میں بٹھا لیا اور خوب پیار کیا۔ وہ سب کے سامنے خاصی دیر تک اس کی گود میں بیٹھی رہی۔

مشرقی پاکستانیوں کی حالتِ زار

اسلام آباد میں مقیم مشرقی پاکستانی جن میں سے بہت سے ہمارے رفقائے کار رہ چکے تھے، بڑی کربناک صورتِ حال سے دوچار تھے۔ وہ اپنے ڈراؤنے مستقبل کے بارے میں پریشان اور اپنے آبائی گھروں کی بابت تشویش میں مبتلا تھے۔ ان میں سے بعض کو یہ خوف لاحق تھا کہ ان پر تشدد کیا جائے گا، انہیں جیل میں ڈالا جائے گا یا قتل کر دیا جائے گا۔ بعض نے افغانستان کے راستے فرار ہونے کی کوشش بھی کی۔ وہ اپنے گھر، پلاٹ اور دیگر املاک انتہائی سستے داموں بیچ رہے تھے۔ وہ بڑے آزردہ اور دل شکستہ تھے۔ ان کی سردمہری پر مبنی خاموشی ان کے دلوں میں پائی جانے والی بے چینی و نا اُمیدی اور نفرت و حقارت کی چغلی کھاتی رہی تھی۔

پیپلز پارٹی کے متعلق رپورٹ ملی کہ جو کچھ مشرقی پاکستان میں ظہور پذیر ہو رہا ہے وہ اس سے خوش نہیں ہے۔ پارٹی کی حقائق معلوم کرنے والی کمیٹی نے ان زیادتیوں اور مظالم کو بے نقاب کیا جن کا ارتکاب فوج نے کیا تھا۔ اقتدار کی غلام گردشوں میں اس کارروائی کو پسند نہیں کیا گیا۔ چیف مارشل لا ہیڈکوارٹرز میں یہ بات عام طور پر کہی جانے لگی کہ مشرقی پاکستان کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد پیپلز پارٹی کو اچھی طرح سبق سکھایا جائے گا۔ اس وقت تک کے لیے اعلیٰ ترین سطح کے پالیسی سازوں نے بھٹو کو رام

کرنے کا منصوبہ بنایا اور یہ ذمہ داری یحییٰ نے خود اپنے سر لے لی۔

ان دنوں بھٹو انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل راولپنڈی میں اقامت پذیر اور حکومت کے زیرِ نگرانی تھے۔ میرے سٹاف کا ہیڈ کانسٹیبل اللہ دتہ ان کی نگرانی پر مامور تھا۔ ایک دن میں نے بھٹو سے ملاقات کی اور انہیں ایوانِ صدر میں ہونے والی عام گفتگو کے متعلق بتایا۔ وہ فوری طور پر یحییٰ خان سے ملے اور ٹھیک ایک مہینے بعد ان کی تصنیف ''گریٹ ٹریجڈی'' منظرِ عام پر آ گئی۔ جس میں بنگالیوں کے ساتھ روا رکھے گئے غیر انسانی سلوک کو بڑے شرح وبسط سے اُجاگر کیا گیا تھا۔ جوابی اقدام کے طور پر بھٹو نے سینئر فوجی حکام کے ساتھ روابط قائم کرنے شروع کر دیئے۔ ان میں سے اکثر کو وہ بخوبی جانتے تھے۔ وہ یحییٰ خان سے متعدد بار ملے اور چین کی اہمیت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں اپنی افادیت بھی جتائی۔ فوج کے اعلیٰ حلقوں اور چینی قیادت کے ساتھ اپنے ذاتی اثر و رسوخ کو اُجاگر کرنا بھٹو کا ایک کارڈ تھا جس کا مقصد یحییٰ خان کو اپنے اور پی پی پی کے خلاف سخت کارروائی سے باز رکھنا تھا۔

ہنری کسنجر کی ''گمشدگی''

جولائی 1971ء کی ایک صبح کو صدر کے ملٹری سیکرٹری نے مجھے بلایا اور بتایا کہ: ''امریکی صدر کے مشیر برائے قومی سلامتی ہنری کسنجر پاکستان آ رہے ہیں۔ سیکرٹ سروس کے افراد نے راولپنڈی کے ڈی آئی جی مرزا عباس اور ایس ایس پی ملک محمد نواز سے ملاقات کی' تاہم وہ سیکورٹی کے انتظامات سے مطمئن نہیں ہیں۔ وہ ایک انتہائی اہم خفیہ مشن پر ہیں اور صدر پریشان ہیں' کیا آپ ان لوگوں کو مطمئن کر سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

اس وقت سی آئی اے کے ایریا چیف ولف اور امریکہ کی سیکرٹ سروس کے دو ایجنٹ ایوانِ صدر میں موجود تھے۔ میں نے ان کے سوالوں کے ترکی بہ ترکی جواب دیئے۔ ''کیا آپ ان مقامات کے بارے میں جاننا چاہیں گے جہاں ہنری کسنجر کو اپنے مشن پر جانا ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''صرف ان مقامات کی بابت جہاں سیکورٹی کے انتظامات کرنے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

انہوں نے یقیناً سکھ کا سانس لیا ہوگا کہ انہیں ایک اہم راز فاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

دوسرے نکات پر بھی انہیں چند منٹوں میں مطمئن کر دیا گیا۔ جب صدر کو اس کی خبر ملی تو انہوں نے مجھے اندر بلایا اور شاباش دی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یحییٰ خان کی ناپسندیدہ سرگرمیوں سے بیزار ہونے کے باوجود اس خراجِ تحسین پر مجھے زبردست خوشی ہوئی۔

میں نے سیکرٹ سروس کے ایجنٹوں کے ساتھ قریباً ایک مہینہ کام کیا۔ ہنری کسنجر کو نتھیا گلی کے گورنر ہاؤس میں ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں سیکرٹ سروس والوں کو بذریعہ ہیلی کاپٹر اور سڑک کے راستے کئی بار نتھیا گلی لے گیا۔ ایک دفعہ سفر کے دوران ہم نے اونٹ دیکھا۔ امریکی خوشی کے مارے ناچنے اور زور زور سے ''کیمل، کیمل'' پکارنے لگے۔

''کیا آپ نے کبھی اونٹ نہیں دیکھا؟'' میں نے پوچھا۔

''یقیناً دیکھا ہے، مگر چڑیا گھر میں۔'' ایک اونٹ کو یوں کھلے میدان میں دیکھنے کا یہ پہلا موقع ہے۔ '' انہوں نے جواب دیا۔ آگے چل کر مری کے نزدیک ایک ریچھ کو ناچتے دیکھ وہ خوشی سے پاگل ہو گئے۔

آم ان کے لیے نئی دریافت تھی جو انہیں بے حد مرغوب تھا۔ مجھے ان کے لیے آم کا خاصا ذخیرہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔

ہنری کسنجر کو شام کے وقت راولپنڈی ایئرپورٹ پر خوش آمدید کہا گیا۔ رات کو انہوں نے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے ایک ڈنر میں شرکت کی۔ تمام مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد انہیں بڑی رازداری سے ایئر فورس والی سائیڈ سے ایئر پورٹ پر لے جایا گیا۔ جہاں پی آئی اے کا ایک طیارہ پہلے سے ان کا منتظر تھا۔ اس میں سوار ہو کر وہ اپنے تاریخی مشن پر پیکنگ روانہ ہو گئے۔ اس وقت مجھے ان کی منزل کا علم نہیں تھا۔ نہ ہی میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی کیونکہ مجھے ان کو کسی اور جگہ لے جانے کا حکم ملا تھا۔

اگلی صبح ہم امریکی سفیر جوزف فارلینڈ کو تقریباتی کارواں کی صورت میں ڈرائیونگ کر کے نتھیا گلی لے گئے۔ سب سے اہم کار میں فارلینڈ سوار تھے۔ ادھر اسلام آباد میں ہمارے سیکرٹری خارجہ اور وزارتِ خارجہ کے دیگر سینئر حکام نے جعلی مصروفیت کا ڈھونگ رچا کر پوری دنیا کو باور کرا دیا کہ کسنجر کی طبیعت ناساز ہے اور وہ نتھیا گلی میں آرام کر رہے ہیں۔ تاہم اس نادیدہ بحران سے نمٹنے کی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی جس سے ہم جلد ہی دوچار ہونے والے تھے۔

سیکرٹ سروس کے ایجنٹوں میں سے ایک واقعی بیمار ہو گیا۔ اس کے علاج کے لیے ایبٹ آباد

سے ڈاکٹر بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے ہنری کسنجر کے بارے میں سنا تھا کہ نتھیا گلی میں ہیں۔ وہ انہیں دیکھنے کے اشتیاق میں کشاں کشاں چلا آیا۔ جب کسی نے بہت ہی بھونڈے طریقے سے اسے رخصت کیا تو اسے یقین ہوگیا کہ کسنجر نتھیا گلی میں موجود نہیں۔ اس نے اپنے شک وشبہ کا اظہار ہزارہ کے ایس پی آغا رضا علی سے کردیا۔ جو وہاں پروٹوکول اور سیکورٹی ڈیوٹی پر مامور تھے۔ انہوں نے کسنجر کے لاپتہ ہونے کی بابت سن کر ایک ہنگامہ کھڑا کردیا۔ وہ دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے اور اس بات پر انتہائی برہمی وخفگی کا اظہار کیا کہ انہیں کسنجر کی ''گمشدگی'' جیسے اہم معاملہ سے بے خبر کیوں رکھا گیا۔ جب کہ ضلع کے ایس پی ہونے کے ناطے وہ ان کی سیکورٹی کے ذمہ دار ہیں۔

اب پریشانی وسراسیمگی نے مجھے آگھیرا۔ ایک انتہائی اہم راز کے افشا ہوجانے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ جس کے سنگین بین الاقوامی نتائج نکل سکتے تھے۔ رضا کو پختہ یقین دلانے اور خاموش رکھنے کے لیے مجھے انہیں لکھ کر دینا پڑا کہ کسنجر کی حفاظت وتحفظ کی ذمہ داری خود صدر نے مجھے سونپی ہے' جس کا ایس پی ہزارہ سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ کم از کم ان کے ڈی آئی جی کو تو اعتماد میں لیا جائے لیکن میں نے ان کی یہ بات بھی نہیں مانی۔ میں خود انہیں واپس ایبٹ آباد تک چھوڑنے گیا تاکہ وہ بالکل خاموش رہیں۔ اس کے بعد رضا نے ڈاکٹر سے رابطہ کرلیا اور اسے خاموش رکھا۔

اس وقت مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ کسنجر کہاں گئے تھے' نہ ہی میں نے سراغ لگانے کی کوشش کی کیونکہ ایسا کرنا پیشہ ورانہ اخلاق کے منافی تھا۔ ایسے معاملات میں بہترین سیکورٹی یہ ہوتی ہے کہ رازداری سے کام لیا جائے اور ''جاننے کی ضرورت'' کے اصول کی لازماً پابندی کی جائے۔ مجھے جاننے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے اس کی قطعاً کوشش نہیں کی۔ بہرحال ہمارا قیاس یہ تھا کہ کسنجر شیخ مجیب سے ملاقات کرنے گئے ہیں جو سیاسی بحران کا حل تلاش کرنے کے سلسلہ میں مغربی پاکستان آئے ہوئے تھے۔

بعدازاں جب میں نے خالد حسن کو جو بھٹو کے بہت قریب تھے' یہ بات بتائی کہ میں کسنجر کی ''گمشدگی'' کے راز سے آگاہ تھا تو انہوں نے کہا کہ اگر وہ راز کسی بڑی اخباری ایجنسی کے ہاتھ بیچا جاتا تو اس کا بھاری معاوضہ مل سکتا تھا۔ کئی دن بعد میں اخبارات میں یہ رپورٹ شائع ہوئی کہ ایک پاکستانی صحافی کو کسنجر کی روانگی کے فوراً بعد ان کی گمشدگی کا راز معلوم ہوگیا تھا۔ اس نے وہ خبر فوری طور پر روزنامہ ٹیلیگراف (لندن) تک پہنچائی۔ لیکن لندن میں ڈیوٹی پر متعین ایڈیٹر نے جو اس بات سے آگاہ تھا کہ اسلام آباد سے

خبر بھیجنے والا قابلِ اعتماد نہیں' یہ بات ماننے سے انکار کردیا کہ اس کی خبر نے عالمی میڈیا کو چونکا دیا تھا۔ چنانچہ اس کی رپورٹ ردی کی ٹوکری میں پھینک دی گئی۔

ہنری کسنجر تین دن کے بعد اسی طیارہ سے واپس آ گئے۔ انہوں نے سیکورٹی والوں اور دوسرے لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور صدر سے ملنے کے بعد واشنگٹن پرواز کر گئے۔ چینی لیڈروں کے ساتھ کسنجر کی کامیاب خفیہ ملاقات کے بارے میں پیکنگ اور واشنگٹن سے بیک وقت اعلان نشر ہوا تو صدر نکسن کے دورۂ پیکنگ کی تاریخ کا اعلان بھی کردیا گیا اور بتایا گیا کہ 1949ء میں کمیونسٹوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد یہ کسی امریکی صدر کا چین کا اولین دورہ تھا۔ یہ کہ ان دو بڑی طاقتوں کو قریب لانے میں پاکستان نے پل کا کام دیا ہے۔ امریکہ کی طرف سے حکومت پاکستان کی کوششوں کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ یہ حقیقت صدر نکسن اور کسنجر کی طرف سے یحییٰ خان کے نام ہاتھ سے لکھے گئے خفیہ خطوط سے بھی ظاہر ہے۔ (جن کی نقول کتاب میں شامل ہیں) البتہ ہم جیسے ادنیٰ افراد نے نتھیا گلی میں جو کردار ادا کیا' اس کا قطعاً ذکر نہیں کیا گیا حتیٰ کہ کسنجر کی یادداشتوں میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ شاید یہ معاملہ خود ان کے لیے بھی ایک راز ہی رہا۔ بہرحال امریکی سفیر (مقیم اسلام آباد) فارلینڈ نے اپنے خط کے ذریعے (جس کی نقل شاملِ کتاب ہے) احتیاط اور ہوشیاری سے کیے گئے ان بہترین انتظامات کو خلوصِ دل سے سراہا جو میں نے ڈاکٹر ہنری کسنجر کے ذاتی تحفظ کے سلسلہ میں کیے تھے۔

یحییٰ خان نے عقل کی بات ماننے سے انکار کردیا

امریکہ اور چین کے ساتھ پاکستان کے تعاون کے جو ڈرامائی نتائج برآمد ہوئے' اس نے بھارت اور روس کو مزید قریب کردیا۔ ان کے مابین اسی مہینے دوستی وتعاون کا ایک 20 سالہ معاہدہ طے پایا۔ روس سے فوجی ساز وسامان کی بھاری کھیپ نئی دہلی پہنچنی شروع ہوگئی۔ مشرقی پاکستان پر حملے کی تیاریاں تیز تر کردی گئیں۔

یحییٰ خان کو ایک انتہائی خفیہ رپورٹ موصول ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ اندرا گاندھی جنگ یا سیاسی سمجھوتہ دونوں صورتوں میں خوش ہوگی۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ سیاسی مفاہمت سے عوامی لیگ کی حکومت یعنی بھارت نواز حکومت کا قیام مراد ہے۔ اور جنگ کی صورت میں بھارت کی فتح یقینی ہے۔ تاہم یحییٰ خان اس زعم میں مبتلا تھا کہ وہ کوئی شاطرانہ چال چلے گا اور بازی پلٹ جائے گی۔ اس نے ایک دن نیم

مدہوشی کے عالم میں ایک بہت ہی سینئر افسر کے سامنے بڑ ہانک دی کہ "میری فوج بھارت کے مقابلہ میں کہیں بہتر جنگی مشین ہے۔"

امریکہ' چین' پاکستان اتحاد نے یحییٰ خان کو ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی سے سرشار کر دیا۔ اس موقع پر ہر بڑی طاقت نے اسے معقول انداز فکر اپنانے کا مشورہ دیا۔ امریکہ نے بڑے نرم لفاظ میں مشرقی بازو کے مسئلہ کا سیاسی حل تلاش کرنے کو کہا۔ چین نے بھی بار بار ایسی ضرورت پر زور دیا۔ لیکن دو بڑی طاقتوں کو قریب تر لانے کے بعد یحییٰ خان اس خوش فہمی کا شکار ہو گیا کہ اس نے ان دونوں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ بھارت کے ساتھ لڑائی کی صورت میں وہ دونوں لازماً پاکستان کی مدد کریں گے۔ ڈپلومیسی کی باریک دھنیں ایسے شخص کو سنائی نہیں دیتیں جو سارجنٹ کی بلند آہنگ سیٹی سننے کا عادی ہو۔

روس کے صدر پڈگورنی نے بھی یحییٰ خان کو سخت الفاظ پر مشتمل ایک مراسلہ لکھا جس میں مسئلہ کا سیاسی حل تلاش کرنے پر زور دیا گیا تھا' لیکن یحییٰ خان کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ انہی دنوں ایرانی بادشاہت کی اڑھائی ہزار سالہ سالگرہ منانے کے لیے مشہد کے قریب پرسی پولس (Persepolis) کے کھنڈرات میں جو تقریب منعقد ہوئی' اس کے دوران روسی صدر سے گفتگو کرتے ہوئے یحییٰ خان نے بڑے توہین آمیز لہجہ میں سوال کیا:

"مسٹر پریذیڈنٹ تمہیں میرے نام وہ تہدید آمیز خط لکھنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

پڈگورنی نے نہ صرف ان کلمات کو نظر انداز کر دیا بلکہ اگلے دن بھارت کے ساتھ قریبی تعلقات ہونے کے باوجود اندرا گاندھی اور یحییٰ خان کے مابین بات چیت کرانے کا اہتمام بھی کیا لیکن یحییٰ خان مذاکرات سے بچنے کے لیے ایک دن پہلے وطن لوٹ آیا۔

مجیب' حکومت کی قید میں ہونے کے باعث مشرقی پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات کو کنٹرول نہیں کر سکتے تھے' کیونکہ معاملات ان کی پارٹی کے انتہا پسندوں کے ہاتھ میں چلے گئے تھے جنہیں بھارت کی زبردست حمایت حاصل تھی۔ بھارت نے اپنی سرزمین پر بنگالی پناہ گزینوں کی آڑ لے کر پاکستان کے اندرونی مسئلہ کو پوری دنیا میں اچھالا اور پاک فوج کو بدنام کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔

بھٹو ڈھاکہ سے واپسی پر فوجی آپریشن کے بارے میں اس رائے کا اظہار کرنے کے بعد کہ:

"خدا کا شکر ہے' پاکستان کو بچا لیا گیا۔"

اپنے ہی الفاظ کے اسیر بن کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے ''گریٹ ٹریجڈی'' نامی کتاب لکھ کر خود کو بحران سے بری الذمہ ٹھہرانے کی کوشش کی اور فوج کی ظالمانہ کارروائیوں کی کھل کر مذمت کی تاہم وہ سب کچھ بعد از وقت تھا۔

اناڑی ڈرائیور سنگین حادثات کا موجب بنتے ہیں

صورتحال پر قابو پانے کی ناکام کوشش میں نئی ٹیم سامنے لائی گئی۔ ٹکا خان کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کو (جو خود کو ٹائیگر نیازی کہلانا پسند کرتے تھے) مشرقی پاکستان کا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا اور ڈاکٹر ایم اے مالک کو گورنر۔ ایک طرف ڈاکٹر مالک کو جو خود بنگالی تھے' عوامی لیگ کی قیادت کے ساتھ مذاکرات شروع کرنے کا اختیار دیا گیا۔ دوسری طرف جنرل نیازی کو مارشل لا کا سختی سے استعمال کرنے کی ہدایت کر دی گئی۔

نئے گورنر نے عام معافی کا اعلان کر دیا تاہم کسی بھی جانب سے مثبت جواب نہیں ملا۔ عام طور سے یہ بات کہی گئی کہ بھارت نے بنگالیوں کو عفو عام کے اعلان سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی جبکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ کوئی بھی بے چارے ڈاکٹر مالک کے اعلان پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس امر کی ضمانت نہیں دے سکتے تھے کہ ان کے قول و قرار کا احترام کیا جائے گا کیونکہ اصل طاقت تو جرنیلوں کے پاس تھی۔ مذکورہ اعلان سے یحییٰ خان دنیا پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ ہر ممکن کارروائی کر رہا ہے لیکن دوسری طرف سے مثبت جواب نہیں مل رہا۔ یہ چال اس قدر شفاف نہیں تھی کہ اس پر آسانی سے یقین کیا جا سکتا۔

قومی اسمبلی میں عوامی لیگ کی عددی قوت کم کرنے کے لیے اس کے متعدد ارکان کو مختلف الزامات کے تحت نااہل قرار دے کر ضمنی الیکشن میں اپنی پسند کے آدمی منتخب کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ مجیب اور عوامی لیگ ایسا کیوں ہونے دیں گے اور عوامی لیگ کے باقی ماندہ ارکان اسمبلی سیشن میں کیسے شریک ہوں گے؟ دوسری پارٹیوں کا ردِعمل کیا ہوگا؟ اگر انہوں نے ضمنی الیکشن میں حصہ لیا تو کیا عوام اس انتخاب کو قبول کر لیں گے؟ جب ایسے سوالات ایک میٹنگ میں اٹھائے گئے تو انہیں غیر متعلقہ قرار دے کر نظرانداز کر دیا گیا۔ اصل مقصد امریکہ' روس' چین اور دوسرے ممالک کو یہ باور کرانا تھا کہ کچھ نہ کچھ کیا جا رہا ہے۔ ضمنی الیکشن کا ڈراما واقعی رچایا گیا۔ لیکن نئے ارکان کو جو زیادہ تر بلا مقابلہ منتخب ہوئے تھے' اپنی

جانیں بچانے کے لیے مغربی پاکستان بھاگ گئے کیونکہ ان کے تمام بہاری ووٹرز ہی ان کے خون کے پیاسے بن گئے تھے۔

جنرل ٹکا خاں نے ڈھاکہ سے آنے کے بعد کچھ عرصہ مشرقی پاکستان ہاؤس اسلام آباد میں قیام کیا۔ میں ان سے ملنے گیا تو بے حد خوش ہوئے۔ ہم قریباً 6 گھنٹے ساتھ رہے۔ انہوں نے اس وقت کی صورتِ حال کا تفصیل سے ذکر کیا جب انہوں نے چارج سنبھالا تھا۔ انہیں اس طریقِ کار پر بڑا فخر تھا جس طریقے سے آرمی ایکشن کو مکمل طور پر پوشیدہ رکھا گیا۔ جونہی صدر نے ایکشن شروع کرنے کی اجازت دی' یک دم جہنم پھٹ پڑا۔ مانک میاں کے قوم پرست بنگالی اخبار ''اتفاق'' کے دفاتر اور ڈھاکہ یونیورسٹی دو خصوصی ہدف تھے۔ ڈھاکہ پر 24 گھنٹے میں قابو پالیا گیا۔ مجیب کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان بھیج دیا گیا۔ محض ایک مہینے کی مختصر سی مدت میں پورے صوبہ پر فوج کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ ٹکا خان نے اپنی کامیابیوں کی داستان اس طرح بیان کی جیسے انہوں نے کسی دشمن کے خلاف فتح پر فتح حاصل کی ہو۔ وہ اس بات پر بڑے خوش تھے کہ ''ٹائم'' میگزین نے انہیں ''انتہائی غصیل''(Red-hot) قرار دیا تھا۔ سوئے اتفاق سے ''ٹائم'' کے اس شمارہ پر ان کی اپنی حکومت نے پابندی لگادی کیونکہ اس میں بعض ناخوشگوار واقعات بھی درج تھے۔ ''کیا مشرقی پاکستان کا مسئلہ اس طریقہ سے حل ہوگیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''اب یہ میری ذمہ داری نہیں رہی' کیونکہ میرا تبادلہ ہوگیا ہے۔'' انہوں نے میرے سوال سے پہلوتہی کرتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ بنیادی طور پر ایک سیاسی مسئلہ ہے جسے سیاسی انداز میں حل کرنا چاہیے۔'' میں نے انہیں اصل نکتہ کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ انہوں نے میری رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ پرانی لاف زنی کی طرف سے پلٹتے ہوئے اپنی انگلی میرے سینہ کے قریب لا کر بولے۔ ''سردار! میں نے تمہارے لیے مشرقی پاکستان کو دوبارہ فتح کر کے دکھا دیا۔ تم نے لاہور میں کہا تھا کہ وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔'' ان کے ساتھ الجھنا اور بحث کرنا فضول تھا۔ اس لیے میں نے ان سے اجازت لی اور اس بات پر کفِ افسوس ملتا ہوا لوٹ آیا کہ میرے وطن کی قسمت کس قدر چھوٹے اور سنگ دل لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔

جب نومبر 1971ء میں شیزان ریسٹورنٹ راولپنڈی میں ہماری دوبارہ ملاقات ہوئی تو میرے

سابق استاد پروفیسر اجمل نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا کہ معاملہ کو جان بوجھ کر ایسے مقام تک پہنچا دیا گیا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں رہی اور اب اس کا اپنے منطقی انجام تک پہنچنا ناگزیر ہو گیا ہے۔

''انجام کیا ہوگا؟'' میں نے بے چینی سے سوال کیا۔

ان کا جواب بالکل صاف اور دوٹوک تھا۔'' دونوں حصوں کی علیحدگی اور تقسیم۔''

اس کے بعد انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:

''وہ وقت گزر گیا جب آپ دوستوں کی طرح جدا ہو سکتے تھے۔اب آپ کو دشمنوں کی طرح لڑ جھگڑ کر علیحدہ ہونا پڑے گا۔آپ کے مشرق میں ایک اور افغانستان بن جائے گا جو روس اور بھارت کا طفیلی ہوگا۔1947ء کی تاریخ کا اس فرق کے ساتھ اعادہ ہوگا کہ جناحؒ اور نہرو کو اپنے اپنے عوام کا اعتماد حاصل تھا۔وہ ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھ سکتے تھے اور سخت ناگوار فیصلے کر سکتے تھے۔اس وقت معاملہ یحییٰ خان اور اندرا گاندھی کے درمیان ہے ان میں سے یحییٰ خان لیڈر نہیں ہے۔وہ ہمیشہ لوگوں سے خوفزدہ رہتا ہے۔ بظاہر بڑا مضبوط لگتا ہے' لیکن اندر سے بڑا ڈرپوک ہے۔اندرا گاندی بھی بڑی کم ظرف اور منتقم مزاج ہے۔ ان کے مابین کسی بات پر اتفاق نہیں ہو سکے گا اور شدنی ہو کر رہے گی۔''

جس وقت ہم یہ باتیں کر رہے تھے' ایک فرانسیسی سکالر پروفیسر اجمل سے ملنے آیا۔اس نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ''پاکستان کسی صورت تباہی سے نہیں بچ سکتا کیونکہ یحییٰ خان حقائق سے یکسر بے خبر ہے۔جو اندرا گاندھی کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ نہ تو اچھی عورت ہے نہ سیاستدان۔حالانکہ وہ ایک اچھی عورت بھی ہے اور سیاستدان بھی۔اس نے دو بیٹوں کو جنم دیا اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی منتخب شدہ وزیرِ اعظم ہے۔بے خبر ڈرائیور ہمیشہ سنگین حادثات کا موجب بنتے ہیں۔''

حادثہ وقوع پذیر ہونے والا تھا۔اس رات میں نے بے حد دُکھ محسوس کیا اور ایک پل کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپکی۔ میں نے اپنے دوست اے حمید کو لاہور سے بلا لیا کہ پریشانی و بے چینی کے ان لمحات میں میرے پاس رہو۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

باب9

المناک انجام کی طرف

1971ء کی آخری سہ ماہی کے دوران بھٹو اعلیٰ سطح کا ایک وفد لے کر چین گئے۔ وہ بڑی تام جھام کے ساتھ لوٹے اور انہوں نے قوم کو یہ تاثر دیا کہ چین ایک مخلص دوست کی حیثیت سے ہماری مدد کو آئے گا۔ عام طور پر باور کرلیا گیا کہ بھارت کے ساتھ جنگ کی صورت میں چین ہماری حمایت میں لڑے گا۔ ایوان صدر کے باخبر ذرائع کے مطابق حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ تاہم قوم کا مورال بلند رکھنے کے لیے اسے ایک اچھا محرک سمجھا گیا مگر یہ بہت بڑا دھوکہ تھا۔ اس کا مقصد کیا تھا؟ حقیقت میں حکمران طبقے اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے تھے۔ انہوں نے اس غلط راستہ سے جس پر وہ گامزن تھے، واپسی کے تمام دروازے بند کردیئے۔

قوم میں جنگی جنون کو ہوا دی جانے لگی۔ سازش کی تھیوریاں پیش کرنے والے دور کی کوڑیاں لا رہے تھے اور ملک کو درپیش سنگین صورت حال کی ذمہ داری لندن، کابل، ماسکو، سی آئی اے اور بھارت پر ڈالی جارہی تھی۔ ادھر طاقت کا سرچشمہ سمجھے جانے والوں پر خوف اور بے چینی کا عالم طاری تھا۔ ان کے اعصاب جواب دینے لگے تھے اور وہ اس عالمِ وحشت میں چلاّ چلاّ کر بھارت کے ہاتھ میں کھیلنے والے بنگالی غداروں کو نیست و نابود کرنے کا حکم دے رہے تھے۔ سیاسی مذاکرات کی حمایت میں واحد مدبّرانہ آواز ایئر مارشل اصغر خان نے بلند کی، تاہم کسی نے ان کی بات پر توجہ نہیں دی۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے لاہور ہائی کورٹ بار سے خطاب کے دوران امن و آشتی کی بات کرنا چاہی تو وکلا نے ہڑبونگ مچا کر انہیں خاموش ہونے پر مجبور کردیا۔

ماہ ستمبر کے دوران، وہی مہینہ جس میں بھارت کے ساتھ چھ سال پیشتر پہلی جنگ لڑی گئی تھی،

لاہور میں " کرش انڈیا" کے نعروں پر مشتمل سٹکرز ہر طرف نمودار ہونے لگے۔ لوگوں کو جوش دلانے کے لیے قومی زبان کی بجائے انگریزی زبان استعمال کرنے کا خیال کسی بیوروکریٹ کے ذہن میں ہی آ سکتا تھا۔ حکومت کے زیر کنٹرول ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے علاوہ پورا پریس جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے اور جنگی جنون تیز کرنے میں مصروف ہو گیا۔ عام شہریوں خصوصاً پنجابیوں میں غیرت ، بہادری اور بھارت دشمنی پر مبنی جذبات کو ہوا دی جا رہی تھی۔

بھارت کی طرف سے جنگ کا آغاز

بھارتی فوج نے مکتی باہنی کے نمائشی پرچم تلے 22 نومبر 1971ء کو مشرقی پاکستان پر چاروں طرف سے حملہ بول دیا۔ یحییٰ خان اس روز دوپہر کے بعد سیالکوٹ بارڈر سے واپس آیا تھا۔ ڈی آئی جی مرزا عباس نے توقع ظاہر کی کہ جنگ کا اعلان فوری طور پر ہونے والا ہے کیونکہ صدر سیالکوٹ سے واپس آنے کے بعد سیدھا جی ایچ کیو جائیں گے ان دنوں چین کے نائب وزیراعظم کی قیادت میں ایک فوجی مشن اسلام آباد آیا ہوا تھا اور ان کی روانگی سے پیشتر اعلان جنگ خارج از امکان تھا۔ "چینی ہماری مدد کے لیے آئے ہوئے ہیں۔" عباس مرزا نے کہا" بے شک، مگر وہ عملی طور پر جنگ میں حصہ نہیں لیں گے"۔ میں نے برجستہ جواب دیا۔ عام طور سے سمجھا جا رہا تھا کہ چینی اب بھی چاہتے ہیں کہ پاکستانی حکام مذاکرات کے ذریعے مسئلہ حل کر لیں۔ وہ خود کو بنگالی عوام کے دشمن کے طور پر پیش کرنے کے حق میں نہیں تھے اور یہ بات پاکستان کے اعلیٰ حکام پر پوری طرح واضح کر دی گئی تھی۔

اگلے دن ہم دونوں صدر کے ہمراہ جی ایچ کیو گئے۔ ہائی کمان نے اپنے دفاعی حصار کو مضبوط بنانے کا فیصلہ کیا۔ جس میں مشرقی پاکستان کے چپے چپے کا دفاع کرنا شامل تھا۔ طے پایا کہ مکتی باہنی کو کہیں قدم جمانے کا موقع نہ دیا جائے تاکہ نہ تو وہ پاکستان کی سرزمین پر بنگلہ دیش کا پرچم لہرا سکیں نہ ہی انڈیا اور دوسرے ممالک کو نئی ریاست کو تسلیم کرنے کا موقع مل سکے۔ پرانا نظریہ جس پر اکثر زور دیا جاتا تھا کہ مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے مغربی پاکستان سے دباؤ بڑھایا جائے گا، قطعاً زیر بحث نہیں آیا۔

واحد سیاسی قدم کے طور پر نورالامین کو وزیراعظم اور بھٹو کو ڈپٹی پرائم منسٹر نیز وزیر خارجہ مقرر کر دیا گیا۔ نورالامین بلاشبہ بنگالی تھے تاہم وہ ان دو ممبران قومی اسمبلی میں سے ایک تھے جن کا تعلق عوامی لیگ

سے نہیں تھا۔ نیا اقدام دنیا کو یہ تاثر دینے کی ایک ناکام کوشش تھی کہ پاکستان میں ایک بنگالی وزیر اعظم حکمران ہے۔

انجام کی ابتدا

3 دسمبر 1971ء کو جب میرے دوست علی افضل جدون اور میں نے لیاقت باغ کے اوپر جہاں بھٹو ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے، پاک فضائیہ کے طیاروں کو اڑتے دیکھا تو ہم سمجھ گئے کہ بھر پور جنگ چھڑ گئی ہے۔ تاہم وہ قدم بھارت کی طرف سے مشرقی پاکستان پر حملہ کے بعد 12 دن کی ناقابل توجیہہ اور غیر معمولی تاخیر سے اٹھایا گیا تھا۔

دو دن بعد ہی یہ کیفیت ہوگئی کہ بھارتی فوج مغربی پاکستان میں شکر گڑھ (ضلع سیالکوٹ) آزاد کشمیر سندھ اور دیگر محاذوں پر تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ بہر حال ان کے حملوں کا اصل نشانہ مشرقی پاکستان تھا۔ جہاں ایئر فورس کے ہوائی اڈے تباہ کر دیئے گئے تھے۔ راج شاہی، کھلنا، جیسور اور دیگر سرحدی شہروں کے بارے میں خبریں ملیں کہ بھارتی فوج نے فتح کر لیے ہیں اور وہ پاکستانی فوج کو جو دفاعی پوزیشن میں تھی، بائی پاس کر کے اندر تک داخل ہوگئی ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان کر دیا گیا، جسے بھارت اور بھوٹان نے فوری طور پر تسلیم کر لیا۔

راولپنڈی میں یہ افواہ بھی سننے میں آئی کہ رُوس نے بھارت کو مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنے کے لیے 15 دسمبر کی ڈیڈ لائن دی ہے، بصورت دیگر امریکہ اور چین اقوام متحدہ میں معاملات کو مشکل بنا دیں گے۔ یہ رپورٹ درست تھی، لیکن جب میں نے سب سے بااختیار حاکم کو اس سے آگاہ کیا تو اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ مجھے بتایا گیا کہ "پاک آرمی ہر جگہ بہتر پوزیشن میں ہے"۔

''پھر ہر سیکٹر میں بھارتی آگے کیوں بڑھ رہے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''انہیں ایک جال میں پھنسایا جا رہا ہے۔ مناسب وقت آنے پر سب کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔'' ادھر سے جواب ملا۔

بریگیڈیئر عطا محمد، جو میرے پرانے دوست تھے، 7 دسمبر کو اچانک میرے دفتر میں آئے اور بڑے رازدارانہ انداز میں کہنے لگے۔

''مشرقی پنجاب پر جلد ہی قبضہ ہونے والا ہے۔''

''کیسے؟'' میں نے بے یقینی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہماری فوج نہایت ہوشیاری سے کچھ چالیں چل رہی ہے۔ آئندہ ایک دو روز میں ان کا سلسلہ مکمل ہونے کے بعد بھارتی پنجاب ہمارے قبضہ میں ہوگا۔'' انہوں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

آپ مذاق کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے کہا۔ "میرے نزدیک صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔" وہ میری بات سن کر طیش میں آگئے۔

میں نے بڑی مشکل سے انہیں ٹھنڈا کیا تو انہوں نے یہ انکشاف کر کے میرے ہاتھوں کے سارے طوطے اڑا دیئے کہ انہیں مشرقی پنجاب کا فوجی گورنر نامزد کیا جا رہا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ میں امر تسر کا ایس پی بننا قبول کرلوں تا کہ سکھوں کے ساتھ چابکدستی سے نمٹا جا سکے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ ان کی پیشکش کا کیا جواب دیا جائے۔ میں نے گریز کی راہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ میرے ڈی آئی جی سے بات کرلیں۔ انہوں نے میرے سامنے سیکرٹ فون پر میرے باس سے بات کی۔ اس کے بعد مجھے تیار رہنے کا مشورہ دیا تا کہ دو گھنٹے کے نوٹس پر امر تسر پہنچ سکوں۔ فوجی جنتا نے حقیقت پسندی کے تمام دروازے بند کر لیے تھے۔ اور اپنی خیالی دنیا میں جی رہی تھی۔ مجھے اپنی حالت اس کردار کی سی محسوس ہوئی جو طلسمات کے حیرت کدے میں کھو گیا ہو۔

اگلے دن پریس نے غیر ملکی ذرائع کے حوالہ سے خبر دی کہ گورنر مشرقی پاکستان کے مشیر میجر جنرل راؤ فرمان علی نے ڈھاکہ میں اقوام متحدہ کے نمائندہ کے ساتھ رابطہ قائم کیا ہے۔ اس خبر پر عوام کی طرف سے جو حکومت کے جھوٹے پروپیگنڈہ پر یقین کئے بیٹھے تھے۔ زبردست ردعمل کا اظہار کیا گیا' حکومت نے فوری طور پر اس خبر کی تردید کر دی۔

بھٹو سلامتی کونسل میں اپنے ملک کی نمائندگی کرنے کے لیے نیو یارک پہنچے ہوئے تھے۔ ایک طرف بھارتی جارحیت کے خلاف دھواں دھار تقریروں کے ساتھ ساتھ جنگ بندی کے لیے قراردادوں کو حتمی شکل دینے کا سلسلہ جاری تھا۔ دوسری طرف بھارتی فوجیں تیزی سے ڈھاکہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

ان فیصلہ کن ایام میں اے حمید میرے پاس مقیم رہے۔ وہ فضائی حملوں کے درمیان عارضی وقفہ میں بذریعہ سڑک لاہور سے راولپنڈی پہنچے تھے۔ یہ عارضی وقفہ اس لیے کیا گیا تھا کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اسلام آباد پہنچ سکیں۔ اے حمید نے پیشہ وارانہ دلچسپی سے ہٹ کر کئی ممتاز غیر ملکی نامہ نگاروں کے ساتھ جوان

دنوں ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں مقیم تھے۔ دوستانہ تعلقات قائم کر لیے تھے۔ ان میں پولیٹزر (Pulitzer) انعام جیتنے والے نیو یارک ٹائمز کے مالکولم براؤن، ٹائم میگزین کے لوئس کرار اور ٹائمز لندن کے ڈیوڈ ہاؤسگو شامل تھے۔ وہ بی بی سی اور وائس آف امریکہ کی نشریات بھی بڑی پابندی سے سنتے تھے۔ ان کے خیال میں جنگ کی صورتِ حال بڑی مایوس کن تھی۔ جبکہ ریڈیو پاکستان اسے خوشنما رنگوں میں پیش کرر ہا تھا۔

ایک روز وائس آف امریکہ سے خبریں سننے کے بعد اے حمید نے مجھے بتایا کہ امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ بحرالکاہل سے خلیج بنگال کی طرف روانہ ہوگیا ہے۔ مجھے بعد میں ایوان صدر کے ذرائع سے پتہ چلا کہ امریکی بیڑے کی نقل و حرکت کا مقصد مشرقی پاکستان کو بچانا ہرگز نہیں تھا بلکہ اس کے ذریعے امریکہ بھارت کو مغربی پاکستان پر قبضے سے باز رکھنے کے لیے دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اب امریکہ اور چین، پاکستان کی حمایت میں مداخلت کریں گے۔ لیکن مجھے چین کے موقف کی بابت اپنی معلومات کی روشنی میں کچھ شک تھا۔ چینی صرف اس صورت میں مداخلت کرتے جب ملک میں کوئی نمائندہ حکومت ہوتی اور قوم کو کسی جائز اخلاقی مقصد کے لیے جنگ پر ابھارا گیا ہوتا۔ اے حمید کو یقین تھا کہ خداوند کریم پاکستان کے دونوں حصوں اور دنیا بھر میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کو مایوس نہیں کرے گا۔ میں نے ان سے پوچھا۔

''ان پلید حکمرانوں کے شیطانی کرتوتوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟'' وہ پھر بھی میرے ساتھ اتفاق کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ وہ حقائق کے برعکس آس لگائے بیٹھے تھے۔

14 دسمبر کو میں صدر کے ملٹری سیکرٹری میجر جنرل اسحاق سے ملنے گیا تو وہ بڑے پریشان نظر آئے۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور زور زور سے رونے لگے۔ میں سمجھا شاید ان کے خاندان میں کوئی المیہ رونما ہوگیا ہے۔ میں انتہائی حیرت و پریشانی کے عالم میں تھا جب انہوں نے یہ بتا کر میرے حواس مزید شل کر دیئے کہ "متحدہ پاکستان ختم ہوگیا ہے"۔ پھر انہوں نے مجھے ایسٹرن کمانڈ کے نام بھیجے گئے تار کے مندرجات پڑھ کر سنائے جس کے تحت انہیں حالات کے مطابق تمام ضروری اقدامات کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب فقط سرنڈر تھا۔ کیونکہ ڈھاکہ کو ان بھارتی دستوں نے پہلے ہی گھیرے میں لے لیا تھا۔ جنہیں ہیلی کاپٹرز کے ذریعے اتارا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں آرمی فارمیشنز کے مابین کسی بھی جگہ رابطہ قائم نہیں رہا تھا۔ کمانڈ مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی تھی۔ مجھے اس بات پر زبردست حیرت تھی کہ سینئر جرنیل اور ان کا باس اپنے عاقبت نااندیشانہ اقدامات اور لاف زنی پرمبنی بیانات کے نتائج کا بروقت احساس

کیوں نہ کر سکے۔

"یہ تار کیوں بھیجا گیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بصورت دیگر بچارا نیازی کتے کی موت مارا جائے گا"۔ انہوں نے جواب دیا۔ یہ سن کر میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا اور بولا۔

"اب اسے اور اس کی فوجوں کو دفاع کرتے ہوئے مرنے دیں۔ انہیں اسی بات کی تنخواہ دی جاتی ہے۔ اپنے شہریوں کو ہلاک کرنے کی نہیں۔ وہ سرنڈر کیوں کر رہے ہیں۔ ان کا فرض تو اس کے برعکس تقاضا کرتا ہے؟ انہوں نے اپنے اصل فرائض کو عرصہ دراز سے فراموش کر رکھا تھا"۔

میرے لیے وہاں مزید ٹھہرنا محال ہو گیا۔ چنانچہ میں کمرے سے نکل کر اپنی کار کی طرف آ گیا۔ میرے ڈرائیور نے پوچھا۔

"صاحب، صاحب، آپ کو کیا ہوا؟' میں دکھ اور کرب کے مارے رونے لگا اور جب تک اس نے توجہ نہیں دلائی، مجھے اپنی حالت کا احساس نہیں ہوا۔

پھر میں سیدھا اپنے گھر پہنچا اور اے حمید کو تازہ ترین صورت حال سے آ گا کیا۔ وہ اپنے دوست مالکولم براؤن (نمائندہ نیو یارک ٹائمز) کو اس بارے میں بتا کر اس پر "بہت بڑا احسان" کرنے کے چکر میں پڑ گئے۔ بلاشبہ وہ بہت بڑی خبر بن سکتی تھی۔ تاہم اس وقت ایک سرکاری راز کی حیثیت رکھتی تھی اور ہم اس کے افشا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے براؤن کو بلایا اور بڑے ہی محتاط الفاظ میں بتایا کہ "جنگ کے سلسلہ میں کوئی بہت ہی اہم واقعہ رونما ہوا ہے۔ میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا۔ لیکن آپ اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش ضرور کریں"۔ ان کا خیال تھا کہ امریکی سفارت خانہ اس معاملہ سے یقیناً آگاہ ہو گا اور براؤن کو سرنڈر کے فیصلہ کی بابت معلومات حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ بعد میں ان کی ملاقات ہوئی تو براؤن نے بتایا کہ وہ معاملہ کے انجام تک پہنچ جانے کے بعد بھی اصل کہانی حاصل نہیں کر سکا۔ جب سب سے زیادہ باخبر امریکی صحافیوں کا یہ حال تھا تو باقیوں کے متعلق آپ خود قیاس کر لیجئے۔

صدارتی حکم کی صورت میں نیا آئین نافذ کرنے کا ارادہ

اے حمید اور میں 14 یا 15 دسمبر کو بعد دوپہر انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل گئے۔ وہاں ہم نے ملک نور حیات نون کو نئے آئین کا ابتدائی مسودہ پڑھتے دیکھا جسے یحییٰ خان جلد ہی نافذ کرنے والا تھا۔ میں نے اس کی ایک نقل چند منٹ کے لیے مستعار لی اور اس پر سرسری نظر ڈالی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس مسودہ میں اس وقت بھی مشرقی پاکستان کا ایک صوبہ کے طور پر ذکر موجود تھا۔ میں سوچنے لگا جب قوم کو ایسے بے کار اور مضحکہ خیز اقدامات کا پتہ چلے گا تو یقیناً ایک تباہ کن طوفان برپا ہوگا۔

میں بھاگم بھاگ ایوان صدر پہنچا اور نئے آئین پر لوگوں کے ردعمل کی بابت خدشات بیان کرنے کے بعد تجویز کیا کہ اس کی کاپیاں جو پریس کو جاری کی گئی تھیں، فوری طور پر واپس منگوالی جائیں۔ اس تجویز کی کچھ مخالفت ہوئی تاہم آغا محمد علی (صدر کے بھائی) بہت جلد معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئے اور تقسیم کردہ کاپیاں واپس منگوالیں۔

مجھے یوں محسوس ہوا کہ یحییٰ خان کو اس بات کا یقین تھا کہ ایک اسلامی اور غیر متنازعہ نئے آئین کا نفاذ جو چیف جسٹس آف پاکستان اے آر کارنیلئس جیسی نابغۂ روزگار شخصیت نے مرتب کیا تھا، ملک کو بچانے کی آخری تدبیر ثابت ہوگی۔ اس کے خیال میں سیاستدان ملک کو دستور اور دستور ساز اسمبلی کے نام پر پہلے ہی بہت زیادہ نقصان پہنچا چکے تھے۔

مجھے ایک ایک کر کے وہ سارے اقدامات یاد آنے لگے جو یحییٰ خان کی حکومت نے گزشتہ اڑھائی سال کے دوران کیے تھے۔ مثال کے طور پر لیگل فریم ورک آرڈر، دستور ساز اسمبلی کے انتخابات، ون یونٹ کا خاتمہ، نئے دستوری ڈھانچہ کی تیاری اور لیڈروں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے کی حکمت عملی۔ واقعی وہ ایک لمبا رسہ تھا جس سے لٹک کر سیاستدان خود کو پھانسیاں لگا سکتے تھے۔

فوجی حکومت اس بات پر پختہ یقین رکھتی تھی کہ قوم نے سیاستدانوں کو قطعی طور پر مسترد کر دیا ہے اور فوج کو کسی شور شرابہ کے بغیر ایک بار پھر قبول کر لیا جائے گا۔

چنانچہ سرنڈر کرنے کا الزام سیاستدانوں کے سر تھوپنے کے لیے ایک خاص حکمتِ عملی تیار کی گئی۔ 15 دسمبر کی شام کو یحییٰ خان نے ایوان صدر کی میڈیا ٹیم کو ذاتی طور پر ان خطوط پر بریف کیا اور وزیر اطلاعات وقومی امور میجر جنرل نواب زادہ شیر علی نے جماعت اسلامی کی مدد سے مجیب اور بھٹو کو اس المیہ کے حقیقی ولن کے طور پر پیش کرنے والی پراپیگنڈہ مہم کا آغاز کر دیا۔

میں نے اے حمید کو ایوان صدر کی خود فریبی پر مبنی پالیسی کے بارے میں بتایا تو انہیں سکھوں کا

مشہور نعرہ یاد آ گیا کہ "راج کرے گا خالصہ باقی رہے نہ کوئے" میں نے ایوان صدر کے ارباب اختیار پر زور دیا کہ قوم کو ذہنی صدمہ برداشت کرنے کے لیے تیار کیا جائے تا کہ امن و امان کی سنگین صورت حال پیدا نہ ہونے پائے۔ اس صورت میں صدر کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا جب 15 دسمبر کو بھی یہ دعویٰ کیا گیا کہ عوام صدر سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور وہ بھٹو کے نیو یارک سے واپس آنے پر اس کی تکا بوٹی کر دیں گے۔

آخر کار شدنی ہو کے رہی

''ٹائیگر'' نیازی نے 16 دسمبر 1971ء کو ڈھاکہ کے اسی پلٹن میدان میں ہتھیار ڈال دیئے جہاں 9 مہینے قبل مجیب نے یکطرفہ اعلانِ آزادی کرنے سے گریز کیا تھا۔ بنگلہ دیش نے ایک حقیقت کا روپ دھار لیا، جس کے ذمہ دار مجیب سے بڑھ کر یحییٰ خان اور نیازی تھے۔ سرنڈر کے بعد بھی یحییٰ خان قوم کو یہی طفل تسلیاں دیتا رہا کہ ''مشرقی محاذ پر عارضی پسپائی اور ناکامی'' کے باوجود جنگ جاری رہے گی۔ اسی شام بھارت نے 24 گھنٹے کے لیے یکطرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا جو پاکستان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے 1962ء میں چین نے انڈیا کے ساتھ کیا تھا۔ اس رات اے حمید اور میں جی بھر کے روئے۔ انہوں نے یہ بات خاص طور نوٹ کی کہ قریب کی مسجد میں فجر کی اذان دیتے وقت وفورِ جذبات سے موذن کی آواز بھی تھرتھرا رہی تھی۔

یحییٰ خان جنگ بندی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ حالانکہ امریکی سفیر نے اسے واضح اور دوٹوک الفاظ میں بتا دیا تھا کہ انکار کی صورت میں ان کا ملک مغربی پاکستان کے تحفظ کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اپنی بات اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لیے امریکی سفیر نے جنگ بندی کی تجویز مسترد ہونے کی صورت میں امریکی شہریوں کے انخلا کی درخواست بھی کی۔ یحییٰ خان نے جو امریکہ کو ہی اپنا ملجا و ماویٰ سمجھتا تھا ادھر سے مایوس کن جواب ملنے پر 17 دسمبر کو جنگ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ یوں قوم کی ذلت و رسوائی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔

لوگ غم و غصہ سے پاگل ہو رہے تھے۔ بڑے بڑے احتجاجی جلوس نکلنے لگے۔ وہ جوشِ انتقام میں زبردست نعرہ بازی کر رہے تھے۔ شراب کی دکانوں کو بطور خاص نشانہ بنایا گیا۔ راولپنڈی اور اسلام آباد

میں اکثر دکانیں نذرِ آتش کردی گئیں۔ غم و غصہ کی لہر قابو میں نہیں آرہی تھی۔ لوگوں کے غیظ و غضب کا رُخ یحییٰ خان کی منصوبہ بندی کے برعکس سیاستدانوں کی بجائے خود اس کی اور فوج کی طرف تھا۔ ہر شخص اس کے سر کا مطالبہ کررہا تھا۔ پشاور میں اس کے نو تعمیر شدہ مکان کو آگ لگا کر تباہ کردیا گیا۔ فوجی افسر باوردی حالت میں باہر نکلنے سے گریز کرنے لگے۔ چھاؤنی کا علاقہ بھی سراپا احتجاج بن گیا اور خود فوج میں اس رائے کا اظہار کیا جانے لگا کہ یحییٰ خان کو اقتدار سے الگ کردینا چاہیے۔

یہ افواہ بھی سننے میں آئی کہ بھٹو کا طیارہ پشاور میں اترے گا تو انہیں باہر نکلتے وقت گولی ماردی جائے گی۔ بہرحال اس سلسلے میں کوئی مصدقہ خبر نہیں ملی کیونکہ بھٹو کا طیارہ سیدھا اسلام آباد آیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ آیا اس معاملہ میں فوجی کمانڈو ملوث تھے یا نہیں۔ جیسا کہ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن نے' جسے بعدازاں بھٹو نے آرمی چیف مقرر کیا تھا۔ اپنی یادداشتوں میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

منحوس خبر یحییٰ خان کو کیسے پہنچائی گئی؟

18 دسمبر کو یحییٰ خان نے ایوب ہال میں فوجی افسروں سے خطاب کرنے کا پروگرام بنایا۔ سیکورٹی کے ڈی ایس پی چوہدری سلطان غنی کو اپنے ذرائع سے پتہ چلا کہ اس تقریب میں صدر کے ساتھ بدتمیزی بلکہ اس پر حملہ ہونے کا قوی امکان ہے کیونکہ فوج میں اس کے خلاف زبردست اشتعال پایا جاتا ہے۔ میں نے اپنے باس ڈی آئی جی قاضی اعظم سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ ساری تفصیلات سے آغا محمد علی کو آگاہ کردو۔ وہ خود ایک بری خبر سنا کر آغا کا موڈ خراب کرنے کو تیار نہیں تھے۔ میں نے بھی ہچکچاہٹ سے کام لیا۔

چنانچہ میں مرزا عباس' ڈی آئی جی راولپنڈی کے پاس پہنچا جو یحییٰ خان کے رشتہ دار تھے اور انہیں صدر کی بابت موصول شدہ پریشان کن رپورٹ سے مطلع کیا۔ وہ طیش میں آکر اتنی تیزی کے ساتھ کرسی سے اٹھے کہ میں ڈر گیا' مبادا وہ مجھ پر حملہ کردیں۔ وہ کہنے لگے کہ ''یحییٰ خان فوج کے کمانڈر انچیف ہیں۔ فوجی افسر اپنے چیف کے خلاف کیسے ہوسکتے ہیں؟''

جب وہ ذرا ٹھنڈے ہوئے تو میں نے تجویز کیا کہ وہ خود اپنے ذرائع سے اس خبر کی تصدیق کرلیں۔ انہوں نے اس تجویز پر عمل کیا تو میری رپورٹ درست نکلی۔ پھر ہم دونوں آغا محمد علی کے پاس

پہنچے۔شروع میں انہوں نے بھی ہماری بات پر یقین نہیں کیا۔ انہیں شک گزرا کہ شاید وہ صدر کو خوفزدہ کرنے کا منصوبہ ہو۔ چیک کرنے پر رپورٹ کی دوبارہ تصدیق ہوگئی۔

آخرِ کار رات گئے طے پایا کہ صدر کی بجائے چیف آف آرمی سٹاف جنرل عبدالحمید کو فوجی افسروں سے خطاب کرنا چاہیئے۔ اگلی صبح جونہی وہ ہال میں داخل ہوئے نوجوان افسران پر پل پڑے۔ ان کی بری طرح توہین وتذلیل کی گئی اور آوازے کسے گئے۔ ناچار انہیں تقریر ادھوری چھوڑ کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس طرح یحییٰ خان اور جرنیلوں کے ٹولے کو یہ احساس ہوگیا کہ معاملات ان کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ جب کوئی چارہ نظر نہیں آیا تو اقتدار بھٹو کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ صدر کے ملٹری سیکرٹری جنرل اسحاق نے بھٹو کو فوراً وطن پہنچنے اور اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی جو اس وقت روم میں تھے۔

میں اس وقت ایوانِ صدر میں ہی تھا جب پنجاب کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمٰن نے فون پر یحییٰ خان کو ترغیب دی کہ وہ بھٹو کے لیے اقتدار کی راہ ہموار نہ کریں۔ ''اگر آپ صورتِ حال کو کنٹرول نہیں کرسکتے تو اقتدار میرے حوالے کردیں۔'' انہوں نے یحییٰ خان پر زور دیا۔

''اب ایسا نہیں ہوسکتا' وہ وقت گزر گیا۔ اب تو بھٹو کو اطلاع بھی دے دی گئی ہے۔'' یحییٰ نے افسردگی سے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ عرصہ کے لیے جرنیلوں کے اقتدار کا سورج غروب ہوگیا۔

حمود الرحمٰن کمیشن

مشرقی پاکستان کے سقوط میں بھٹو یحییٰ گٹھ جوڑ کے الزامات زبان زدِ عام تھے۔ جن کے نتیجہ میں یحییٰ خان کی جان کو شدید خطرہ لاحق ہوگیا۔ میں نے ایک رپورٹ پیش کی جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ صدر کے لیے سیکورٹی انتظامات سخت ترین کردیئے جائیں۔ کیونکہ اگر کسی انتہا پسند اور جنونی شخص نے اسے قتل کر دیا تو بھٹو پر الزام آئے گا کہ انہوں نے یحییٰ خان کو اپنے راستہ سے ہٹانے اور اپنے کرتوتوں کو چھپانے کی غرض سے مروادیا ہے۔ بھٹو نے فوراً یحییٰ خان کو حفاظتی تحویل میں لینے کا حکم جاری کردیا۔ اسے منگلا کینٹ لے جایا گیا تو وہاں جنگی قیدیوں کی بیگمات اس پر پل پڑیں۔ اس کے بعد اسے کھاریاں کے نزدیک ایک الگ تھلگ ریسٹ ہاؤس میں' جسے بنی بنگلہ کہا جاتا ہے' نظر بند کردیا گیا۔ رینجرز اور سپیشل برانچ کو اس کے تحفظ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ٹیکنیکل لحاظ سے وہ میری تحویل میں تھا اور میں ہی اس کی سلامتی کا ذمہ دار تھا۔

بھٹو نے سانحہ مشرقی پاکستان کے اسباب کا کھوج لگانے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا جس کے سربراہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس حمود الرحمٰن تھے۔ اسے حمود الرحمٰن کمیشن یا جنگی کمیشن کا نام دیا گیا۔ کمیشن نے ایوب ہال (راولپنڈی) میں اپنا کام شروع کیا جسے 1962ء میں مارشل لا ختم ہونے کے بعد قومی اسمبلی چیمبرز کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ یحییٰ خان کا بیان قلمبند کرنے کا وقت آیا تو کمیشن نے سیکورٹی کے نقطۂ نظر سے اپنا دفتر عارضی طور پر پولیس کالج سہالہ میں قائم کر لیا۔ کمیشن کی کارروائی بند کمرے میں ہوتی تھی یعنی عام لوگوں کو سماعت کی اجازت نہیں تھی۔ میں کمیشن کی سیکورٹی کا انچارج تھا۔ زیرِ حراست اہم گواہوں مثلاً یحییٰ خان، جنرل حمید، جنرل عمر اور این اے رضوی (سابق ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو) کو کمیشن کے سامنے میں نے ہی پیش کیا تھا۔ میں نے جو کچھ سنا وہ تاریخ کے بارے میں ان کی اپنی روایت تھی، اس میں سے کچھ سچ، کچھ آدھا سچ اور بعض باتیں سراسر جھوٹ پر مبنی تھیں۔ جنرل حمید کو لاہور میں نظر بند کیا گیا تھا۔ اس کی حفاظت پر ایس پی نثار احمد چیمہ مامور تھے۔ نثار اسے میرے حوالے کر کے اپنے دوستوں سے ملنے اسلام آباد چلے گئے۔ جنرل حمید نے اپنے بیٹے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جو فوج میں کیپٹن تھا اور ان کا اے ڈی سی رہ چکا تھا۔ میں نے باپ بیٹے کی ملاقات کی اجازت دے دی۔ اس موقع پر دونوں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

''کیا آپ لاہور میں اس سے نہیں مل سکے؟'' میں نے سوال کیا

''نہیں۔ حکومت نے اجازت نہیں دی تھی۔ بھٹو بہت سنگدل ہے۔'' جنرل نے درد بھرے لہجہ میں جواب دیا۔

''مجھے ایسی کوئی ہدایت نہیں ملی، حالانکہ میری نگرانی میں سب سے زیادہ قیدی ہیں۔'' میں نے انہیں بتایا۔

وہ شیو کرانا چاہتے تھے۔ میں نے ایک نائی بلا لیا۔ میں نے قدرے تعجب سے پوچھا۔ ''کیا انہوں نے لاہور میں شیو کرانے کی اجازت بھی نہیں دی تھی؟''

''نہیں۔ شاید انہوں نے سوچا ہو کہ میں استرے سے خودکشی کر لوں گا۔ بھلا مجھے ایسا کرنے کیا ضرورت ہے؟'' اس نے جواب میں کہا۔

جنرل حمید کے نگران ضرورت سے زیادہ محتاط اور سخت تھے۔ جس سے کشیدگی و تلخی میں یقیناً اضافہ ہوا۔ سیکورٹی انتظامات کو کوئی تقویت نہیں ملی۔ اگرچہ اس حد تک بہت کم لوگ جاتے ہیں، جس حد

تک میں الطاف گوہر کے معاملے میں چلا گیا تھا۔ (اس کی تفصیل اگلے باب میں آئے گی) تاہم بعض اخلاقی تقاضے اعلیٰ حکام کی اجازت کے بغیر بھی پورے کیے جا سکتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ قیدی عام ملزم نہ ہوں۔ عام ملزمان کی صورت میں بھی پولیس کو اپنا رویہ درست اور مناسب رکھنا چاہیے کیونکہ سزا دینے کی مجاز فقط عدالتیں ہیں۔

جنرل عبدالحمید' سابق آرمی چیف نے کمیشن کے روبرو بیان دیتے ہوئے اپنے فوجی رفقائے کار کی عمومی سوچ اور رویوں کا ذکر کیا۔ تاہم بنگالیوں اور دیگر عناصر کی غداری کے متعلق دعویٰ سے کہا کہ انہوں نے ہندوؤں سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور یہ کہ فوجیوں کی شراب نوشی اور بدکاریوں کی بابت کہانیاں پاکستان دشمن عناصر کے جھوٹے پروپیگنڈہ پر مبنی ہیں۔ جن کا مقصد فوج کی اعلیٰ کمان کے خلاف نفرت پھیلانا تھا۔ انہوں نے کہا کہ کرپشن اور ظلم وتشدد کے الزامات سراسر جھوٹے ہیں۔ وہ محض سیاسی شکست تھی' سارا قصور بنگالیوں اور سیاستدانوں کا تھا جبکہ فوج سراسر بے گناہ تھی۔

انہوں نے کمیشن کے سوالوں کے جو جواب دیئے وہ بھی انہی خطوط پر تھے' نمونہ کے طور پر چند سوالوں کے جواب نقل کئے جاتے ہیں:

''16 دسمبر کو پوری دنیا کے سامنے کیے گئے سرنڈر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' وہ خاموش رہے۔

''لوگ اتنی بھاری تعداد میں جنگی قیدی کیوں بنے؟'' اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

''کیا فوج کا ڈسپلن ختم ہو گیا تھا؟''

نہیں۔ ہرگز نہیں۔ وہ موجود تھا اور اب بھی بہترین حالت میں ہے۔ پاک آرمی اس وقت بھی دنیا کی سب سے منظم وبہتر لڑاکا فوج ہے۔'' انہوں نے اپنی رائے پر اصرار کیا۔

''کیا ایسٹ بنگال رجمنٹ نے بغاوت کر دی تھی اور ساتھ چھوڑ دیا تھا؟ کیا ایسٹ پاکستان رائفلز نے بھی ایسا ہی کیا تھا؟'' انہوں نے حسب ذیل مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

''بعض برے عناصر ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔''

جنرل یحییٰ خان اور دوسرے تمام گواہوں نے ایسی ہی روش اختیار کی۔ ان کی سوچ میں یکسانیت تھی۔ ''ڈسپلن'' کا بار بار تذکرہ اپنے سیاہ کرتوتوں کی پردہ پوشی اور ''سب سے بہتر ادارے'' کے نام پر دھبہ لگنے کے احتمال سے کیا گیا۔ ملک اور اس کی بہادر مسلح افواج کے لیے زبانی جمع خرچ تو بہت تھا۔ لیکن

جو ہمالیائی غلطیاں سرزد ہوئیں، ان کی تہہ تک پہنچے اور ان کا اعتراف کرنے کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔ بہرحال بعض دوسرے گواہوں نے اس کے بالکل برعکس بیان دیے۔ ایئر مارشل نور خاں نے اپنے بیان میں کہا کہ نچلی سطح پر جرأت و بہادری کا اعلیٰ معیار برقرار تھا۔ تاہم مارشل لا نے جرنیلوں کے اخلاق کو تباہ کر دیا۔ وہ خود پسند، متکبر، لالچی اور کرپٹ ہو گئے تھے۔

یحییٰ خان کی دیدہ دلیری

یحییٰ خان کو کمیشن کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے لانے اور لے جانے کے لیے مجھے دو کاریں اور ایک ہیلی کاپٹر دیا گیا تھا۔ ہم اسے صبح سویرے بنی بنگلہ (کھاریاں) سے بذریعہ ہیلی کاپٹر پنڈی لاتے اور شام کو واپس لے جاتے تھے۔ آخری دن اس نے ہیلی کاپٹر میں سفر کرنے سے انکار کر دیا اور بذریعہ سڑک جانے پر اصرار کیا۔ مجھے نہ تو ایسا کرنے کا اختیار تھا نہ ہی میں اس کے لیے تیار تھا کیونکہ ایسا کرنے میں سیکورٹی کا زبردست خطرہ تھا۔

وہ سہالہ ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور ہلنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے ہیلی کاپٹر میں جبراً سوار کرانے سے گریز کیا اور سمجھانے لگا کہ قابلِ اعتماد ٹرانسپورٹ، سیکورٹی اور حفاظتی دستہ وغیرہ فوری طور پر دستیاب نہیں۔ مگر اس نے ایک نہ سنی اور ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ شور سن کر چیف جسٹس اور کمیشن کے دیگر ارکان باہر آ گئے۔ چیف جسٹس نے یحییٰ خان کے ساتھ طویل بحث کے بعد مجھے حکم دیا کہ اسے سڑک کے راستے کھاریاں لے جاؤ۔ یحییٰ خان راستے میں کہنے لگا۔

"مجھے راولپنڈی لے چلو"

میں نے پوچھا "کیوں؟"

"میں اپنے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں"۔ اس نے جواب دیا

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

"کیوں؟" اس نے بڑے تند لہجے میں سوال کیا۔ یحییٰ خان کا ردِ عمل ایسے شخص کا تھا جس نے زندگی میں کبھی حرفِ انکار نہ سنا ہو۔

"اس لیے کہ لوگوں نے آپ کو دیکھ لیا تو وہ آپ کی تکا بوٹی کر دیں گے۔"

"لوگ میرے خلاف کیوں ہوں گے؟"

"مشرقی پاکستان میں شکست اور سقوطِ ڈھاکہ کے باعث وہ بہت برہم ہیں۔" میں نے وضاحت سے بتایا۔

"اس افسوسناک واقعہ کے ذمہ دار سیاستدان تھے' میں نہیں۔" اب اس کے لہجہ میں احتجاج کا عنصر نمایاں تھا۔

"عوام ایسی باریکیوں کو نہیں سمجھتے' وہ عام طور سے بے خبر ہوتے ہیں۔" میں نے دوبارہ نرمی سے جواب دیا۔

"کیا میں زیرِ حراست ہوں؟" وہ جارحانہ انداز میں بولا۔

"نہیں آپ میری حفاظتی تحویل میں ہیں۔"

"مجھے تمہاری حفاظت کی ضرورت نہیں۔ میں راولپنڈی جانا چاہتا ہوں۔" وہ اپنی بات پر ڈٹ گیا۔

"سر میں آپ کو لوگوں کے غیظ و غضب سے بچانا چاہتا ہوں۔" میں نے قدرے سختی سے کہا۔

"کیا میں اچھوت ہوں۔" یحییٰ خان نے بڑے طیش کے عالم میں کہا۔

اس کے بعد اس نے پنجابی میں واہی تباہی بکنا شروع کر دیا اور بولا "کیا میں نے کسی کی گدھی کو چھیڑا ہے۔"

یہ خرافات سن کر مجھے بے حد غصہ آیا' تاہم ضبط سے کام لیا اور خاموشی اختیار کر لی۔ کیونکہ میرے سامنے ایک ایسا شخص تھا جو پاکستان کا صدر اور پاک فوج کا کمانڈر انچیف رہ چکا تھا۔ وہ ملک کی تباہی کا سب سے زیادہ ذمہ دار تھا لیکن اسے اس چیز کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ واضح فوجی شکست کے باوجود وہ سیاستدانوں کو موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا۔ مجھے اس کی حکومت کے وہ منصوبے یاد آ گئے جن میں سیاستدانوں کو لمبا رسہ فراہم کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا تاکہ وہ نئے آئین کی تیاری کی جان جوکھم مشق میں الجھ کو خود کو ہلاک کر لیں۔ اس کام کو یکسر ناممکن بنانے کے لیے اس نے "ایک شخص' ایک ووٹ" کا حربہ استعمال کیا اور ون یونٹ کو توڑ دیا۔ مجھے یوسف چانڈیو کے ساتھ اس کی وہ گفتگو بھی یاد آ گئی جس میں اس نے بھٹو کو مجیب کے خلاف صف آرا کرنے کا عندیہ دیا تھا۔ یحییٰ خان مجھے سچ مچ شیطان لگنے لگا۔

میں انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا جب ہمارے سامنے سے گزرنے والی ٹرین کے شور نے مجھے چونکا دیا اور پتہ چلا کہ وہ سہالہ کے ریلوے پھاٹک پر رک گئی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس ویران جگہ

میں بھی اسے پہچان لیا' اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ہماری کار کو پتھر مارے جا رہے تھے۔ خوش قسمتی سے وہ پھاٹک جلد ہی کھل گیا اور ہم نے بھگوڑوں کی طرح رفتار تیز کر دی۔ یحییٰ خان کا رنگ فق ہو گیا اور بری طرح کانپنے لگا جیسے اس کا دم نکل رہا ہو۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں خاصی دیر تک محظوظ ہوتا رہا۔ اس موقع پر میں نے اس سے کہا۔

''آؤ راولپنڈی چلیں۔''

''نہیں''۔ اس نے فی الفور جواب دیا۔ ''ہمیں بنّی بنگلہ جانا چاہیے۔ تم ایک سرکاری ملازم ہو اور میں تمہارے لیے مشکلات پیدا نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ مجھ پر احسان جتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس چیز نے میرے دل میں مزید نفرت پیدا کر دی۔ ''میں نہ صرف تمہیں راولپنڈی لے جاؤں گا بلکہ اپنی گاڑی راجہ بازار کے بیچ میں سے گزاروں گا۔'' میں نے اصرار کیا۔ میں نے اپنی بات پوری طرح ذہن نشین کرانے کی کوشش کی۔ اب وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ نام نہاد ''نڈر سپاہی'' کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ جو پوری دنیا بلکہ بڑی طاقتوں کے خلاف بھی انتہائی غلیظ زبان استعمال کرتا تھا۔ صرف چند پتھروں سے سابقہ پڑنے پر بے حد خوفزدہ ہو گیا۔ آخر میں میری منتیں کرنے لگا۔ ''مجھے بنی بنگلہ لے چلو۔'' ظاہر ہے میں اسے کسی صورت راولپنڈی نہیں لے جا سکتا تھا۔

بنی ریسٹ ہاؤس پہنچنے پر اس نے خواہش ظاہر کی کہ اسے ایبٹ آباد منتقل کر دیا جائے۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ایسا کرنا میرے اختیار میں نہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔

''براہ کرم کسی سے کہیں۔ میں اس جگہ کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ یہاں گیدڑوں کی بھرمار ہے جو رات کو بہت زیادہ شور مچاتے ہیں۔'' اس نے ملتجیانہ لہجہ میں کہا۔

''سر آپ کو بہت اچھے ساتھی میسر ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ وہ میرے ریمارکس پر چیں بچیں تو ہوا لیکن کہا کچھ نہیں۔ جب میں راولپنڈی واپس پہنچا انتہائی غصے اور پریشانی کی حالت میں تھا۔'' میں اس کا مکروہ چہرہ دوبارہ نہیں دیکھوں گا۔'' میں نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا۔ اس کے بعد میں کسی ماتحت کو اس کی حفاظت کے لیے بھیج دیتا تھا۔ آخر کار اس کی خواہش انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر تک پہنچا دی گئی۔ کیونکہ میں صرف یہی کر سکتا تھا اور یہ بات میرے فرائض میں شامل تھی۔

این اے رضوی کا اظہارِ ندامت

این اے رضوی بھی' جو ایک سینئر پولیس افسر اور یحییٰ خانی دور میں ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورہ رہ چکے تھے' زیرِ حراست تھے۔ انہیں کمیشن کے سامنے پیشی کے لیے لاہور سے لایا گیا۔ وہ ایک ممتاز دانشور اور خوش فکر شاعر تھے۔ میں نے ان کے قیام کے لیے فلشمین ہوٹل (راولپنڈی) میں انتظام کرایا تھا۔

کمیشن میں پیش ہونے کے بعد وہ بڑی دیر تک زار وقطار روتے رہے۔ میں نے انہیں حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

''سر آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟'' میں نے سوال کیا

وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کو بڑی آرزوؤں اور توقعات کے ساتھ منصہٗ شہود پر اُبھرتے دیکھا تھا۔ ان کی نسل نے عظیم قربانیاں دیں اور قائداعظمؒ کی ولولہ انگیز قیادت میں انتھک جدوجہد کی۔ پاکستان مادی فوائد کے لیے نہیں بلکہ اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے' سچائی' مساوات' اخوت اور کردار کی پاکیزگی اور پرانی اقدار بحال کرنے کی خاطر حاصل کیا گیا تھا۔ کوئی بھی قوم اپنے مثالی تصورات سے گہرے لگاؤ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

''اس کمیشن کا قیام بے مقصد ہے۔'' انہوں نے رائے ظاہر کی۔

''کیوں؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

''اس لیے کہ دسمبر کی جنگ تو محض ایک تکلف تھا۔ وہ بحیثیت قوم ہماری موت کی خواہش کا آخری عمل تھا۔ ہم اپنے اعلیٰ اصولوں کو بہت پہلے ترک کر چکے تھے۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح ناشکر گزار قوم ہیں۔ قائداعظمؒ نے پاکستان حاصل کر کے ہمیں ذلت ورسوائی کے گڑھے سے نکالا اور آزادی سے ہمکنار کیا۔ ہمیں اپنی شناخت اور خودداری سے نوازا گیا۔ ہم نے اپنی جانیں قربان کیں۔ گھر بار چھوڑے غلامی پر آزادی اور امارت پر غربت کو ترجیح دی لیکن ہم میں سے کچھ افراد نے قوم کی آزادی رہن رکھ دی۔ اس کے ضمیر کو امریکہ اور دوسری طاقتوں سے ملنے والی امداد اور دیگر مادی آسائشوں کے عوض گروی رکھ دیا۔ مخصوص مفادات کے غلام قوم کے لیے نہیں لڑ سکتے۔ ہمیں ایسے لوگوں کے باعث ذلت ورسوائی سے دوچار ہونا پڑا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے امریکہ میں متعین سفیر محمد علی بوگرہ کو درآمد کر کے اور وزیراعظم بنا کر خلافِ قانون اقدامات کی بنیاد رکھی۔ اس نے ایوب خاں اور اسکندر مرزا کو ترقی دی۔ جنہوں نے 1958ء میں مارشل لا لگا کر ہمارے قانونی جواز اور آزادی کو تباہ کر دیا۔ پاکستان کے عوام ان کی ظالمانہ قوت کے غلام بن گئے۔ پاکستان عوام نے بنایا تھا فوج نے نہیں۔ اب وہ مایوس ہو گئے ہیں۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول کو

درست تسلیم کرلیا گیا ہے۔"

"ان بھاری رقوم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو آپ نے صنعت کاروں سے وصول کر کے انتخابی مہم کے لیے نورالامین اور قیوم خاں کو فراہم کی تھیں؟" میں نے دبی زبان سے سوال کیا۔ یاد رہے کہ ان کے خلاف اس سلسلے میں نیوٹاؤن پولیس سٹیشن (راولپنڈی) میں پہلے ہی ایک مقدمہ درج ہو چکا تھا۔

"شاید سرمایہ وصول کرنا اس قدر قابلِ اعتراض نہیں تھا' جتنا کہ اس سرمایہ کو ایسی سرگرمیوں میں خرچ کرنا جن کا مقصد عوام کے مینڈیٹ کی توہین تھا۔ حکومت کو لوگوں کی خواہش کی ہرگز توہین نہیں کرنی چاہیے۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلتا ہے۔"

"مجھے افسوس ہے۔" انہوں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "میں خود بھی اس بات کا ادراک نہیں کرسکا کہ ہم راہِ راست سے بھٹک کر ڈاکوؤں کے اس گروہ میں شامل ہو گئے جس نے سرزمینِ وطن اور قانون کو پامال کر دیا۔ مجھے انٹیلی جنس بیورو کا ڈائریکٹر رہنے پر افسوس ہے۔ میں پاکستان کی تباہی میں ایک فریق بن گیا تھا۔ اس لیے رو رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ زاروقطار رونے لگے۔

"کیا ہم کچھ کرسکتے ہیں؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"بے شک۔" انہوں نے برجستہ جواب دیا۔

"لوگوں کو آزادی سے سوچنے کا اور اپنے معاملات کی خود دیکھ بھال کرنے کا موقع دیں۔ وہ آپ سے' مجھ سے اور جرنیلوں سے بہتر دماغ رکھتے ہیں۔ انہیں غلطیاں کرنے اور ان سے سبق سیکھنے دیں۔ کسی کو ان پر کوتوال نہیں بننا چاہیے۔ ہمیں اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے اور صراطِ مستقیم پر چلنا چاہیے۔ آئین اور قانون کی بالادستی کا راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے جو ہمیں ایک آزاد قوم کے قانونی جواز' عزت و آبرو' جرأت اور خودداری کی طرف لے جائے گا۔ دشمن ہمیشہ فائدہ اٹھانے کے لیے تاک میں رہتا ہے' جیسا کہ انڈیا نے کیا۔ ہم تاریخ سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن کوئی شخص اس سے سبق سیکھنے کو تیار نہیں۔"

میں نے جو کچھ کیا اس کی بابت سوچ کر کانپ اُٹھتا ہوں۔" مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے"! انہوں نے آخر میں اپنے جینے پر تاسف کا اظہار کیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ لاہور میں انتقال کر گئے۔

ستر کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں متعدد اہم افراد میری تحویل میں رہے۔ جرنیلوں اور سینئر بیوروکریٹس میں سے بہت سے جنہوں نے عرصہ دراز تک ملک پر حکومت کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کے

جذبہ کو ذاتی مفادات کے لیے مسل اور کچل ڈالا تھا۔ جو لوگ انقلاب لانے کے لیے کام کر رہے تھے' اب خاک چاٹتے پائے گئے۔ وہ بری طرح خوفزدہ تھے اور اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر منت سماجت کرنے لگتے۔ ظاہر ہے اُن میں روحانی قوت نہیں تھی۔ وہ بڑے کم ظرف' کمینے اور احمق تھے جن کے پیش نظر واحد مقصد یہ تھا کہ دنیاوی زندگی کی خوشیاں اور لذتیں حاصل کی جائیں۔ ان تمام لوگوں میں واحد اور قابلِ احترام استثنا الطاف گوہر کا نام ہے۔ جو اپنی روش پر قائم رہے۔ وہ بڑے حوصلہ مند اور صاف گو تھے۔ اپنی رائے کے اظہار میں کبھی نرمی یا مصلحت سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ انتہائی ذہین و فطین بیوروکریٹ تھے۔ ان کا اخلاقی کردار بھی مضبوط تھا۔ میں ان کرداروں کے متعلق جو پاکستان کی روح کے قاتل بنے' علیحدہ سے لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔



باب 10

اے حمید اور میں 20 دسمبر 1971ء کو اسلام آباد ایئر پورٹ پر تھے جب بھٹو کے طیارہ نے لینڈ کیا۔ ایک غمزدہ ہجوم جس میں زیادہ تر ان کی پارٹی کے کارکن تھے انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے اکٹھا ہو گیا تھا۔ طیارہ دن کے ٹھیک گیارہ بجے زمین پر اترا۔ ''بھٹو پاکستان بچاؤ'' کے نعروں میں اداس وافسردہ بھٹو طیارہ سے اترے' ان کے قریبی ساتھی غلام مصطفیٰ کھر ان کی کار چلا کر انہیں ایوانِ صدر لے گئے۔ ڈی ایس پی چوہدری معین اور میں نے سرکاری محافظ کے فرائض انجام دیئے۔ بھٹو نے یحییٰ خاں سے صدارت کا چارج لیا اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا بھی، جو عوام کے لیے حیرت کا باعث ہوا۔

مصطفیٰ کھر نے بھٹو کے ذاتی تحفظ کے بارے میں پریشانی ظاہر کی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ان کی پوری طرح حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس کے باوجود بھٹو اپنے تکیہ کے نیچے بھرا ہوا پستول رکھتے تھے۔ یہ ناقابلِ فہم اقدام تھا۔ انہیں ابھی تک انتظامیہ پر پورا بھروسہ نہیں تھا اور وہ ہمیں یحییٰ خان کے آدمی سمجھتے تھے۔ ماضی قریب میں ہونے والی سازشوں اور جوابی منصوبہ بندیوں کے تناظر میں ایک دوسرے پر سے اعتماد کا اُٹھ جانا قدرتی بات تھی۔

صدارت کا منصب سنبھالنے کے بعد بھٹو پنجاب ہاؤس (راولپنڈی) گئے۔ اس موقع پر بھی معین اور میں ان کے ساتھ تھے۔ سب سے پہلے جس شخص نے ان کے ساتھ ملاقات کی وہ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن تھے جن کی بطور آرمی چیف تقرری کا اسی دن اعلان کر دیا گیا۔

شام کو بھٹو نے قوم سے خطاب کیا۔ ان کی تقریر فی البدیہہ تھی جو تاثیر' سوز وگداز اور دردمندی نیز اُمید وحوصلہ مندی سے معمور تھی۔ جس میں کہا گیا تھا کہ انہیں ایسے موقع پر اقتدار سنبھالنا پڑا جب ملک دو ٹکڑے ہو چکا ہے۔ انہیں بکھرے ہوئے اجزاء کو پھر سے جمع کر کے تعمیرِ نو کا فریضہ انجام دینا ہے۔ انہوں نے ملک کو درپیش مسائل پر روشنی ڈالی اور ان سے نمٹنے کے لیے اپنے منصوبوں کا ذکر کیا۔ میں ان کے ساتھ ٹیلی ویژن سٹیشن بھی گیا۔ میں ان کے خطاب سے خاصا متاثر ہوا۔ بعدازاں میں نے اے حمید سے کہا کہ مجھے بھٹو قدرت کی طرف سے فرستادہ قائد لگتے ہیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنے اور کام کرنے لگے۔ انہوں نے لوگوں کے اعتماد کو سہارا دیا۔ ایک دن وہ راجہ بازار (راولپنڈی) جا نکلے تو لوگوں کا جمِ غفیر اکٹھا ہو گیا۔

انہوں نے افسردہ زخم خوردہ قوم کو حوصلہ دینے کے لیے پشاور، لاہور، کوئٹہ اور کراچی کا بھی دورہ کیا۔

بھٹو نے اہم تقرریوں کے اعلان میں کسی تاخیر سے کام نہیں لیا۔ صوبائی گورنروں کی جگہ ان کے پارٹی کارکنوں نے سنبھالی۔ مصطفیٰ کھر پنجاب کے گورنر بن گئے۔ ممتاز بھٹو کو سندھ کا وزیرِ اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ میاں محمود علی قصوری جیسے ممتاز قانون دان کو عبوری دستور تیار کرنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ میاں انور علی کو جو ایک ریٹائرڈ پولیس افسر تھے' واپس بلا کر انٹیلی جنس بیورو کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ وہ ایوب دور میں بھی اس منصب پر کام کر چکے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میجر جنرل اسحاق جو یحییٰ خان کے انتہائی قریب رہ چکے تھے' بھٹو کے ملٹری سیکرٹری کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ شیخ اکرام نے قاضی اعظم کی جگہ ڈی آئی جی سپیشل برانچ (پنجاب) کی ذمے داریاں سنبھال لیں۔ صاحبزادہ رؤف علی راولپنڈی کے ڈی آئی جی بن گئے۔ مصطفیٰ کھر نے مجھے تبدیل کرنا چاہا تاہم صاحبزادہ صاحب نے میرے تبادلہ کے احکام منسوخ کرا دیئے۔ یوں میں بدستور ایس پی سپیشل برانچ (راولپنڈی) کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کرتا رہا۔

بھٹو نے انتظامیہ کے مختلف پہلوؤں پر بیک وقت توجہ دی۔ بہت سے کمیشن بنائے گئے اور کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ انہیں حتمی رپورٹیں پیش کرنے اور پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مختصر وقت دیا گیا۔ بھٹو نے ان کمیٹیوں کو رہنما خطوط خود مہیا کیے۔ زراعت' محنت' صحت' تعلیم اور دوسرے شعبوں میں برق رفتاری سے اصلاحات کا اعلان کیا۔ لوگوں کو مایوسی و نا اُمیدی کے بھنور سے نکالنے کے لیے کھیل کود اور عوامی میلوں کا اہتمام کرایا۔ بڑی بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ غیر ملکی زرِ مبادلہ کے اصول و قواعد سخت کر دیئے گئے اور برآمدات کو فروغ دینے کے لیے روپے کی قیمت میں 50 فیصد کے قریب کمی کر دی گئی۔ عجلت میں کی گئی ان تبدیلیوں اور اصلاحات پر شدید نکتہ چینی ہونے لگی۔ جماعتِ اسلامی اور تحریکِ استقلال کی تنقید میں غیر معمولی شدت تھی۔

شیخ مجیب کی رہائی

ایئر مارشل اصغر خاں ان معدودے چند سیاستدانوں میں سے ایک تھے جنہوں نے بنگلہ دیش کو فوری طور پر تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ بھٹو اس معاملہ کو لیور کے طور پر استعمال کرنے کی غرض سے مؤخر کرنے کے حق میں تھے تاکہ بھارت کے ساتھ سنگین مسائل مثلاً مغربی پاکستان کے مقبوضہ علاقوں سے بھارتی فوج کا

انخلا‘ جنگی قیدیوں کی رہائی وغیرہ طے کیے جا سکیں۔ البتہ انہوں نے شیخ مجیب کو فوراً رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

شیخ مجیب کو میانوالی جیل سے راولپنڈی لایا گیا۔ وہ سیدھے ڈھاکہ جانا چاہتے تھے۔ بھٹو کا خیال تھا کہ ایسا اقدام بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس کے بعد مجیب نے دہلی جانے کی خواہش ظاہر کی‘ لیکن وہ بھارتی جارحیت کے آگے سر جھکانے اور مشرقی پاکستان پر اس کے تسلط کو جائز قرار دینے کے مترادف ہوتا۔ بھٹو سفارتی نزاکتوں کو سمجھنے میں واقعی بڑے ذہین اور تیز طرّار تھے۔ بعد ازاں شہنشاہ ایران نے پیشکش کی کہ شیخ مجیب کو تہران بھیج دیا جائے لیکن یہ بات مجیب کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی۔ آخرِ کار ایک خوش تدبیر اور نوکھا راستہ نکالا گیا۔ وہ یہ کہ مجیب کو لندن بھیج دیا جائے۔ اس کے بعد وہ اپنی مرضی سے کہیں بھی جا سکتے تھے۔ انہوں نے وہاں سے براستہ دہلی ڈھاکہ جانے کا فیصلہ کیا۔ رات کی تاریکی میں مجیب کو لندن روانہ کیا گیا تو بھٹو بذاتِ خود ہوائی اڈہ پر موجود تھے۔

’’مجیب کو اس طرح جانے کی اجازت کیوں دے دی گئی؟‘‘ ایک اجلاس کے دوران کسی جنرل نے پوچھا۔

’’کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ بھارت مسلم بنگال کے معاملات میں زیادہ ملوث ہو اور اسے وہاں اپنے پاؤں جمانے کا موقع مل جائے۔‘‘ بھٹو نے برجستہ جواب دیا۔ انہوں نے مزید کہا۔ ’’مجیب ہی وہ واحد شخص ہے جو اپنی قوم کو بھارتی فوج کے بغیر متحد رکھ سکتا ہے۔ مسلم بنگال میں اقتدار کی کشمکش اس نوزائیدہ ریاست کو تباہ کر سکتی ہے۔ اس لیے میں نے مجیب کو جانے کی اجازت دے دی۔ موجودہ بحران ایک عارضی مرحلہ ہے جو مارشل لا کی زیادتیوں اور جرنیلوں کی کوتاہ نظری کے باعث رونما ہوا۔ بنگال کی مسلم شناخت کا پھر سے ظہور ہوگا اور وہ ایک عظیم حقیقت و سچائی کے طور پر ہمیشہ باقی رہے گی۔ جب اس کو اہمیت حاصل ہو گی تو بنگالی فطری طور پر پاکستان کے ساتھ انس و محبت اور بھارت کے خلاف عداوت و دشمنی کا اظہار کریں گے۔ مجھے پاکستان کے ساتھ ساتھ مسلم بنگال کو بھی بچانا ہے۔‘‘

بھٹو نے اسی میٹنگ میں مولانا کوثر نیازی‘ وزیر مذہبی امور کو ہدایت کی کہ آئندہ سال زیادہ سے زیادہ افراد کو حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے بھیجا جائے تاکہ اس موقع پر دونوں برادر ملکوں کے حاجی مذہبی فضا میں ایک دوسرے کے قریب آ سکیں۔ جب دونوں ملک جذباتی طور پر قریب آئیں گے تو بھارت یا کوئی دوسری طاقت کچھ نہیں کر سکے گی۔

مجیب کولندن جانے کی اجازت دے دی گئی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا سفارتی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ اس نازک مرحلہ پر بھٹو نے بڑی چابکدستی اور بے باکی سے فیصلے کیے اور انہیں عملی جامہ پہنایا۔ وہ واقعی تاریخ کا گہرا شعور رکھتے تھے۔

1972ء میں سندھ میں ہونے والے لسانی فسادات کے دوران ایک سابق پولیس افسر سعید احمد خان جسے بھٹو ذاتی طور پر جانتے تھے منظرِ عام پر آیا۔ وہ ان افسروں میں شامل تھا جنہیں یحییٰ خان نے کرپشن کے الزام میں برطرف کر دیا تھا۔ اس نے پرانے اور نئے سندھیوں کے موضوع پر بڑی اچھی تجاویز پیش کیں اور دونوں گروہوں کو قریب لانے کے لیے قابلِ قدر کام کیا۔ اسے صدر کے چیف سیکورٹی افسر کے طور پر ملازم رکھ لیا گیا۔ مجھے کچھ عرصہ اپنے فرائض کے علاوہ میاں انور علی ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو اور سعید احمد خان دونوں کے ساتھ کام کرنا پڑا۔

بھٹو کی سیکورٹی کا مسئلہ

بھٹو ابتداء میں اپنی ذاتی سیکورٹی کے بارے میں خاصے فکر مند تھے لیکن بعد ازاں اپنے عام جلسوں میں لوگوں کے ہجوم دیکھ کر مطمئن ہو گئے۔ جب ان کی طرف سے سیکورٹی کے عمومی اقدامات سے بھی منع کیا گیا تو میاں انور علی نے تشویش کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس نازک مرحلے پر کسی دشمن ایجنٹ کی طرف سے بھٹو کو نقصان پہنچا تو ملک یکدم افراتفری کی لپیٹ میں آ جائے گا اور کوئی بھی صورتِ حال کو کنٹرول نہیں کر سکے گا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں کچھ کروں۔

اس مرحلہ پر مجھے وہ اقدامات یاد آ گئے جو جنوری 1948ء میں گاندھی کے قتل ہونے کے بعد قائداعظمؒ کی سیکورٹی کے لیے ان کی اجازت سے کیے گئے تھے اور میں ہیکٹر بولیتھو کی کتاب "JINNAH" میں ان کی تفصیل پڑھ چکا تھا۔ میں نے اے حمید سے مذکورہ کتاب مستعار لی۔ اس کے متعلقہ حصہ کے حاشیہ پر نشان لگائے اور وہ کتاب بھٹو کے اے ڈی سی کو دے دی۔ اس نے بعد میں بتایا کہ بھٹو نے مسکراہٹ کے ساتھ منتخب حصوں کا مطالعہ کیا اور بولے۔ ''ایس پی اسپیشل برانچ سے کہہ دو کہ میں ان کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کروں گا۔ انہیں سیکورٹی پر خواہ مخواہ زور نہیں دینا چاہیے اور حفاظتی اقدامات کی زیادہ نمائش نہیں ہونی چاہیے۔''

جب میں نے میاں انور علی کو بتایا کہ سیکورٹی کا مسئلہ کیسے حل کیا گیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد بھٹو نے سیکورٹی کے معاملہ میں کبھی الجھن پیدا نہیں کی۔ البتہ پولیس اپنے طور پر ضرورت سے

 زیادہ پھرتیوں کا مظاہرہ کرتی رہی۔

بھٹو نے مذکورہ کتاب پڑھنے کے بعد واپس نہیں کی اور کتابوں کے شیدائی اے حمید نے اس کی گمشدگی پر مجھے آج تک معاف نہیں کیا کیونکہ اس کی متبادل کاپی کہیں سے نہیں مل سکی۔

بھٹو عنانِ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد مغربی ایشیا (مشرقِ وسطیٰ) اور افریقہ کے 12 ممالک کے دورہ پر روانہ ہو گئے تاکہ اسلامی دنیا کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کر سکیں۔ انہوں نے چین اور روس کا دورہ بھی کیا۔ بھٹو نے بھارت پر یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ پاکستان اس نازک مرحلے پر تنہا نہیں۔ ایک اجلاس کے دوران انہوں نے کہا کہ آج کل کے حالات میں جب تک پاکستان دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا' جنگ نہیں بلکہ ڈپلومیسی ہی دیرپا آپشن ہے۔

بھٹو نے روسیوں کو پاکستان کے خلاف ایک بڑے آپریشن سے باز رکھا۔ ان دنوں انٹیلی جنس بیورو نے کرنسی کے ایک بڑے بحران کی نشان دہی کی تھی۔ تفصیلات کے مطابق افغانستان میں روسیوں کی مدد سے پاکستان کی جعلی کرنسی بھاری تعداد میں چھاپ کر پاکستان میں پھیلائی جا رہی تھی تاکہ یہاں مالی و اقتصادی بگاڑ پیدا کیا جا سکے۔ بھٹو نے اپنے قریبی دوست رفیع رضا کو ماسکو بھیجا۔ رفیع اس سازش کا ثبوت اپنے ساتھ لے کر گئے۔ بھٹو نے رفیع کو ہدایت کی کہ وہ روسیوں سے دوٹوک الفاظ میں دریافت کریں۔ ''آیا وہ پاکستان کی بقا کے حق میں ہیں یا نہیں؟'' ظاہر ہے ان کا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ پاکستان کو پھلتا پھولتا دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ ''اس وقت تم درخواست کرنا کہ'' افغانستان کو اس قسم کی مہم جوئیوں سے باز رہنے کی ہدایت کریں۔ معاملہ کو یہیں ختم کر دیں اور جب تک وہ کسی ثبوت کا تقاضا نہ کریں ان سے کوئی مزید مطالبہ نہ کیا جائے۔ بھٹو نے کہا کہ اگر ہمارے انٹیلی جنس بیورو سے کوئی حماقت سرزد نہ ہوئی تو روسی ثبوت مانگنے کی غلطی نہیں کریں گے۔ کچھ عرصہ بعد ملک میں جعلی کرنسی کی آمد کا سلسلہ واقعی بند ہو گیا۔

فسطائیت کا منظر

بھٹو خارجی اور سفارتی مسائل کے حل میں واقعی بہت تیز و طباع تھے۔ بد قسمتی سے انہوں نے ملک کے انتظامی معاملات زیادہ تر اپنے رفقائے کار پر چھوڑ دیئے۔ ان کا یہ طرزِ عمل آخرِ کار ان کے لیے تباہی کا باعث بنا۔ بھٹو اپنے گورنروں اور وزرائے اعلیٰ سے کہا کرتے تھے کہ وہ ملک میں کوئی ہنگامہ' گڑبڑ یا

فساد نہیں دیکھنا چاہتے جس کے باعث ان کی توجہ ان سفارتی کوششوں سے ہٹ جائے جو وہ پاکستان کو بحران سے نکالنے کے لیے کر رہے تھے۔

یہ ان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ گورنر' وزرائے اعلیٰ اور بیوروکریٹس میں مطلوبہ فہم و فراست کا فقدان تھا' اس لیے وہ امن و امان قائم رکھنے کے لیے ڈنڈے کے استعمال کو ہی آسان ترین ترکیب سمجھتے تھے۔ گویا تباہی کا راستہ نیک نیتی سے ہموار کیا جا رہا تھا۔ اگر ڈنڈا ہی تمام مسائل کا حل ہوتا تو مارشل لا حکام ممکن حد تک مضبوط ترین ڈنڈا استعمال کر سکتے تھے' لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ مارشل لا کس بری طرح ناکام ہوا اور امن و امان کی تباہی کے ملبہ میں دفن ہو گیا۔ عوام سیاستدانوں کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ وہ ان سے ڈنڈے کی نہیں بلکہ افہام و تفہیم' انصاف اور دیانتداری کی توقع رکھتے ہیں۔

جن دنوں بھٹو باقی دنیا سے معاملات سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے' ان کے اپنے عوام وزیرِ داخلہ قیوم خان' گورنر پنجاب مصطفیٰ کھر اور وزیر اعلیٰ سندھ ممتاز علی بھٹو کے ہاتھوں ڈنڈے کی سختیوں کا مزہ چکھ رہے تھے۔ طالب علموں' محنت کشوں' خواتین' جماعتِ اسلامی اور دیگر سیاسی پارٹیوں کے جلوسوں کی پولیس اور پی پی کے کارکنوں کی طرف سے خوب مرمت اور ٹھکائی کی جا رہی تھی۔ مخالفانہ آواز کو بڑی سختی سے دبانے اور کچلنے کی کوششیں بروئے کار لائی جا رہی تھیں۔ بھٹو کو چھوٹی موٹی سردردیوں سے بچانے کے لیے بہت ہی سنگین قسم کے مسائل پیدا کیے جا رہے تھے۔ ہر طرف فسطائیت کا منظر ظہور پذیر ہو رہا تھا۔

اوائل 1972ء میں قانون ساز اسمبلی کا اجلاس بلایا گیا۔ ان دنوں یہ افواہ سننے میں آئی کہ زیادہ تر ارکان کو سرمایہ داروں اور صنعتکاروں نے خرید لیا ہے تاکہ بھٹو کے قومی تحویل میں لینے کے منصوبوں کو سبوتاژ کیا جا سکے۔ میرے باس ڈی آئی جی شیخ اکرام اور انٹیلی جنس بیورو کے چیف میاں انور علی بے حد پریشان تھے جبکہ بھٹو بھی وسوسے کا شکار ہو گئے۔ راولپنڈی کے ڈی آئی جی صاحبزادہ رؤف علی نے مجھے راولپنڈی کلب میں بلایا۔ اس موقع پر نواب صادق حسین قریشی بھی جو ملتان کے ایک بڑے زمیندار تھے اور بعد میں پنجاب کے گورنر اور چیف منسٹر رہے' وہاں موجود تھے۔ ہم نے مذکورہ بالا افواہ کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔ اصل صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے اعلیٰ سطح کا اجلاس بلایا گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں گزشتہ تین دنوں سے چیک کر رہا ہوں مجھے پی پی میں باغیوں اور بھٹو سے اختلاف کرنے والوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

''انہوں نے تو یحییٰ خانی مارشل لاء میں بھی بھٹو کا ساتھ دیا تھا۔ بھلا اب ان سے کیوں بے وفائی کریں گے؟''

''ہم صرف تمہاری یقین دہانی پر قدم آگے بڑھا رہے ہیں۔''

''میں پوری ذمہ داری لیتا ہوں۔'' میں نے انہیں یقین دلایا۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ پارٹی کی قیادت اپنی صفوں کا جائزہ لے کر خود حقائق معلوم کیوں نہیں کر سکی یا اس قوت کا سراغ کیوں نہیں لگا سکی جو بھٹو کے اعصاب کو متاثر کرنے کے درپے تھی۔ میں یہ سوچ کر پریشان ہونے لگا کہ اگر میری معلومات غلط نکلیں تو کیا بنے گا؟ یہ ان کی اور میری خوش قسمتی تھی کہ میری اطلاع درست نکلی اور کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہوا۔ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بخیر و خوبی گزر گیا جس میں بھٹو متفقہ طور پر اس کے چیئرمین منتخب ہوئے۔

فوجی ریزروسٹس (Reservists) کی ہڑتال

اوائل 1972ء میں اوجڑی کیمپ (راولپنڈی) میں مقیم فوجی ریزروسٹوں نے واجبات کی عدم ادائیگی اور فوج میں بدنظمی و کرپشن کے خلاف ہڑتال کر دی۔ انہوں نے ایک بڑا جلوس نکالا اور غیر ملکی سفارت خانوں کے سامنے احتجاج کرنے کے لیے اسلام آباد پہنچ گئے۔ وہ اس بات پر غم و غصہ کا اظہار کر رہے تھے کہ سینئر فوجی افسروں نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے مشرقی پاکستان سے برما جاتے ہوئے اپنے زخمی ساتھیوں کو نکالنے کی بجائے سونے کی اینٹوں، طوائفوں حتیٰ کی پان جیسی حقیر شے سمگل کرنے کو ترجیح دی۔ وہ اعلیٰ فوجی کمانڈروں پر بدترین الزام لگا رہے تھے۔

راولپنڈی کے کمشنر ایف کے بندیال اور ڈپٹی کمشنر حاجی محمد اکرم نے زبردست کوششوں سے انہیں واپس آنے پر آمادہ کیا۔ ہم نے انہیں پاکستان کی عزت اور وقار کے واسطے دیئے۔ حاجی اکرم نے کہا کہ:

''اگر تمہارے الزامات عالمی پریس کے ہاتھ لگ گئے تو ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔'' دھمیال کیمپ (راولپنڈی) میں بھی اسی طرح کا واقعہ پیش آیا۔ شکایات تقریباً ایک جیسی تھیں اور حاجی اکرم کی منت سماجت بھی ویسی ہی تھی۔

جنرل گل حسن کی برطرفی

بھٹو نے اچانک آرمی چیف جنرل گل حسن اور فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل رحیم خان کو برطرف کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اوائل 1972ء میں پولیس کی ہڑتال کے دوران پشاور میں پولیس لائنز پر بمباری کرنے کے حکم پر عمل نہیں کیا تھا۔ (تفصیلات باب نمبر 50 میں دیکھئے) بھٹو نے نیوی کے چیف' ڈی آئی جی صاحبزادہ رؤف علی اور مجھے ایوانِ صدر طلب کیا۔ اپنی پارٹی کے ارکان میں سے کھر اور جتوئی کو بھی بلا رکھا تھا۔ جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خاں کو طلب کر کے ان کی برطرفی کا فیصلہ سنایا تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔ صدر نے ڈی آئی جی' نیوی چیف' مجھے اور اپنے ذاتی عملہ کو ایک علیحدہ کمرے میں بلا کر خطاب کیا اور ایوانِ صدر پر بمباری کا خدشہ ظاہر کیا۔ ہم نے تجویز کیا کہ آپ کہیں اور چلے جائیں۔ ہم یہیں ٹھہرتے ہیں۔

صاحبزادہ نے ڈی ایس پی چوہدری افتخار احمد اور معین الدین کی زیرِ قیادت پولیس کا ایک دستہ تیار کیا تا کہ وہ برطرف شدہ دونوں افسران کو اپنی نگرانی میں لاہور لے جائے۔ لیکن کھر فوج اور پولیس کے مابین تصادم کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے ان دونوں کو اپنی کار میں لاہور لے گئے۔ پی پی کے کارکنوں کا ایک گروپ تحفظ کے لیے ان کے ساتھ تھا۔

اسی شام چھ بجے میں نے جنرل ٹکا خان کو ایوانِ صدر میں خوش آمدید کہا۔ وہ مجھے دیکھ کر بڑے حیران ہوئے اور پوچھا: ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

میں نے جواب دیا: ''میں آپ کو نئے آرمی چیف کے طور پر خوش آمدید کہنے آیا ہوں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ ''دنیا واقعی گول ہے۔''

اس وقت ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ بحران ختم ہوگیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ ٹکا خان فوج میں خاصے مقبول ہیں۔ کمانڈر انچیف کے عہدہ کا نیا نام چیف آف آرمی سٹاف رکھے جانے کے بعد سب سے پہلے وہی اس منصب پر فائز ہوئے۔

صاحبزادہ رؤف علی جو بڑے قابل اور متحرک افسر تھے' کچھ عرصہ بعد پنجاب کے آئی جی بن گئے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''حصولِ آزادی کے بعد میں پنجاب کا اولین پنجابی آئی جی ہوں۔'' (پنجاب کے غلبہ واجارہ داری کے بارے میں اسی قدر کہنا کافی ہوگا)۔

الطاف گوہر کے ساتھ ملاقات

الطاف گوہر کو جو ایوب خان کے سیکرٹری اطلاعات رہ چکے تھے' بھٹو کے حکم پر نظر بند کر دیا گیا تھا۔ اوائل 1972ء میں انہیں راولپنڈی لایا گیا اور میرے زیرِ تحویل پولیس کالج سہالہ میں رکھا گیا۔ میں پہلی بار ان سے ملنے گیا تو اپنے ساتھ کچھ پھل لے گیا۔ انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔ ہم اس سے پہلے کبھی نہیں ملے تھے۔ تاہم پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ اس شام ہم نے طویل گفتگو کی۔ اس کے بعد میں انہیں کباب اور تکے کھلانے صدر بازار (راولپنڈی) لے گیا۔ وہ اس خوشگوار تبدیلی پر بے حد خوش تھے کیونکہ کراچی میں انہیں بھٹو کے ذاتی حکم پر قیدِ تنہائی میں رکھا گیا تھا۔ جبکہ مجھے کسی نے ایسی ہدایات نہیں دی تھیں۔

میں نے الطاف گوہر کو نظر بندی کی ان وجوہ سے مطلع کیا جو حکومتِ سندھ کی طرف سے موصول ہوئی تھیں۔ ان پر لگائے جانے والے الزامات میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے کراچی انٹرکانٹی نینٹل کی لابی میں ایک پاکستان دشمن شخص سے ساتھ ملاقات کی تھی۔

''وہ شخص کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ورلڈ بینک کا صدر رابرٹ میکنامارا تھا۔ یحییٰ خان نے کسی بات پر برہم ہو کر اسے پاکستان کا دشمن قرار دے دیا۔ میں اسے ملازمت کے دنوں سے جانتا تھا اور اس کے دورۂ کراچی کے دوران اس سے ملنے چلا گیا۔'' انہوں نے وضاحت کی۔

گویا سپیشل برانچ کے کسی ہیڈ کانسٹیبل کی رپورٹ' جو اس وقت ڈیوٹی پر ہوگا' الطاف گوہر کو پابندِ سلاسل رکھنے کے لیے استعمال کی جا رہی تھی۔

میں نے نظر بندی کی اصل وجہ جاننا چاہی تو انہوں نے بتایا کہ ''میں انگریزی روزنامہ ڈان (کراچی) کا ایڈیٹر انچیف تھا۔ میری گرفتاری سرکاری پالیسی کے خلاف ایک اداریہ لکھنے پر عمل میں آئی۔ میں نے اس اداریہ میں بنگالیوں کے لیے نرم گوشہ ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ دوستوں کی حیثیت سے جدا ہونا بہتر ہوتا خواہ مشرقی و مغربی پاکستان کی ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن ہی کیوں نہ بنالی جاتی۔''

''یہ تو وہی تجویز ہے جو سہروردی نے پیش کی اور قائداعظمؒ نے اس سے اتفاقِ رائے ظاہر کیا تھا۔'' میں نے فوراً گرہ لگائی۔ ''بنگال کی تقسیم پر اصرار تو آل انڈیا کانگریس نے کیا تھا۔ میں ہڈسن کی کتاب

''گریٹ ڈیوائڈ'' کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ مذکورہ کتاب میں لکھا ہے کہ قائداعظمؒ نے سہروردی کی تجویز کو پسند کرتے ہوئے کہا تھا۔'' مجھے یقین ہے کہ متحدہ بنگال پاکستان کا دوست ہوگا۔'' الطاف یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ میں وہ کتاب پڑھ چکا تھا۔ جوانہی دنوں شائع ہوئی تھی۔

میں نے الطاف گوہر کو پولیس کالج سہالہ سے سیٹلائٹ ٹاؤن (راولپنڈی) میں اپنے گھر کے قریب ایک ریسٹ ہاؤس میں منتقل کرلیا۔ میں انہیں گھر کا پکا ہوا کھانا کھلانے کے لیے اپنے ساتھ لے آتا تھا جہاں وہ فون پر کراچی میں اپنی بیگم سے بات بھی کر لیتے تھے۔ میں نے انہیں ان کے بھائی تجمل حسین سے ملاقات کی اجازت بھی دے دی جو ایک سینئر سرکاری افسر تھے اور برطرف شدہ 303 کی فہرست میں شامل تھے۔

میں الطاف کو بعض اوقات تفریح کے لیے اپنی کار میں لے جاتا تھا۔ کئی بار میں انہیں اپنے دوست محسن منظور کے گھر لے گیا۔ وہاں ہم نے دیر تک گپ شپ لگائی۔

ایک دن میں نے ان سے کہا: ''آپ اپنی صلاحیتوں کو بھٹو کے ساتھ ٹکراؤ میں کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ ملک بڑی نازک صورتحال سے دوچار ہے یہ باہم دست وگریبان ہونے کا وقت نہیں۔ سب کو متحد ہوکر ملک کو مضبوط و مستحکم بنانا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو دشمن سے دوبارہ لڑنا چاہیے۔''

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' انہوں نے بظاہر میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا ایسا ممکن نہیں کہ آپ کسی ملک میں سفیر بن جائیں اور پاکستان کو اس کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں مدد دیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا آپ کو کسی طرف سے اس بارے میں ہدایات ملی ہیں؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''حقیقت میں مجھے کسی طرف سے ایسی ہدایات نہیں دی گئیں میں آپ کی ذہانت اور صلاحیت سے متاثر ہوکر محض اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کر رہا ہوں۔''

''یہ بات ہے تو براہ کرم ایسی تجاویز پیش نہ کیا کریں۔ مبادا میں بہک جاؤں اور مزاحمت کرنے کا ارادہ ترک کردوں، بھٹو اور میں گہرے دوست تھے۔ لیکن جب ایوب خان سے ان کی لڑائی ہوئی تو مجھ سمیت بہت سے لوگوں کے خلاف ہوگئے۔ شاید وہ توقع کر رہے تھے کہ میں بھی مستعفی ہوکر ان کا ساتھ دوں

گا۔لیکن ہمارے ملک میں سرکاری ملازم کبھی ایسا قدم نہیں اٹھاتے۔

ان کی یہ وضاحت سن کر ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

میں نے اپنے طور پر بھٹو کے اے ڈی کانگ سے کہا کہ الطاف گوہر کی صدر کے ساتھ ملاقات کا اہتمام کرا دیں۔ ''وہ ماضی میں ایک دوسرے کے دوست رہے ہیں ممکن ہے مل جل کر اپنے اختلافات ختم کرلیں۔'' میں نے تجویز پیش کی۔اے ڈی سی نے بھٹو سے بات کی تو وہ بھی ملاقات پر آمادہ ہو گئے۔اس دن وہ مشرقِ وسطیٰ کے طویل دورہ پر جا رہے تھے' اس لیے مجھ سے کہا گیا کہ الطاف کو راولپنڈی میں رکھوں تا کہ صدر واپسی پر انہیں ملاقات کا وقت دے سکیں۔ پھر نجانے کیا ہوا وزارتِ داخلہ نے اچانک انہیں کراچی بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے انہیں تحریری طور پر مطلع کیا کہ مجھے الطاف کو پنڈی میں رکھنے کا حکم ملا ہے۔لیکن کسی نے ایک نہ سنی۔ایسا لگتا ہے بیوروکریسی کے بعض کل پرزوں کو ان کی ملاقات پسند نہیں تھی۔

میں نے الطاف کو ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہا۔روانگی کے موقع پر وہ افسردہ دلگیر نظر آئے۔کہنے لگے۔''مصیبت کے دنوں میں تمہارے حسنِ سلوک نے مجھے خراب کر دیا ہے وہاں پہنچتے ہی قیدِ تنہائی میں ڈال دیا جاؤں گا۔کاش انہوں نے مجھے آپ کے پاس نہ بھیجا ہوتا۔میں جیل کی زندگی کا عادی ہو گیا تھا۔ لیکن اس عارضی آرام دہ قیام کے بعد وہاں کا ماحول اور بھی زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوگا۔''

''میں نے جو کچھ کیا اپنے طور پر کیا اور خطرہ مول لے کر کیا۔ مجھے کسی شخص کی طرف سے ہدایات نہیں دی گئی تھیں۔مجھے آپ کے جانے پر دکھ ہو رہا ہے کیونکہ آپ کی صحبت میں میرا بہت اچھا وقت گزرا۔'' میں نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی کچھ عرصہ بعد میں اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ الطاف گوہر نے نظر ثانی بورڈ میں اپنی نظر بندی کے خلاف دلائل دیتے ہوئے منظور محسن اور میرے خلاف بیان دیا ہے۔انہوں نے الزام لگایا کہ ہم بھٹو کے اشارے پر شاطرانہ اور دل لبھانے والے حربوں سے انہیں بھٹکانے اور بہکانے کی کوششیں کرتے رہے۔انہوں نے میری طرف سے کباب اور تکوں سے ضیافت کرنے' انہیں اپنے اور محسن منظور کے گھر لے جانے اور لانے وغیرہ کی تفصیلات بیان کیں۔ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو کو یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا۔انہوں نے مجھ سے جواب طلبی کی۔ میں نے صاف صاف بتا دیا کہ وہ سارے کام محض جذبۂ ہمدردی اور خوش اخلاقی کے تحت کیے گئے تھے۔میری وضاحت کے باوجود ان کی خفگی دور نہیں ہوئی۔اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ وہ سرکار کی طرف سے مقدمہ ہار جائیں گے۔

میں محسن منظور کے لیے بطور خاص پریشان تھا کیونکہ وہ محض میری وجہ سے مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ ہم بصد مشکل اپنی نوکریاں بچانے میں تو کامیاب ہو گئے' لیکن بے پناہ مشکلات سے گزرنا پڑا۔ عدالت نے الطاف کو رہا کر دیا۔

ایک دن مری میں محسن منظور اور میں نے مال روڈ پر چہل قدمی کرتے ہوئے الطاف گوہر اور ان کے بھائی تجمل حسین کو مری چرچ کے پاس بیٹھا ہوا دیکھا۔ محسن منظور غصے میں آگ بگولا ہو کر ان کی طرف بڑھے۔ انہوں نے الطاف گوہر سے اس بات پر سخت احتجاج کیا کہ عدالت میں بیان دیتے وقت انہوں نے ہمارے متعلق غلط بیانی کیوں کی تھی۔ محسن نے الطاف کو بروٹس کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ''محسن ہمیں وہ سب کچھ فراموش کر دینا چاہئے''۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ''اس وقت وہ مصیبت سے دوچار تھے۔ ان کی مشکل گھڑی ٹل گئی ہے اور ہمیں بھی مصیبت سے نجات مل گئی ہے۔'' لیکن محسن بدستور آتش زیرپا تھے۔ ''الطاف صاحب' آپ نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا اسے دیکھتے ہوئے آئندہ کوئی بھی آپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔'' انہوں نے چلا کر کہا۔ الطاف گوہر نے انتہائی ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''میں ایسا بیان نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن میرے وکیل منظور قادر نے مشورہ دیا کہ ایسا کرنے سے میرا کیس مضبوط ہو جائے گا۔''

میں نے محسن سے کہا کہ ''استغاثہ اور صفائی دونوں نے جھوٹے دلائل کا سہارا لیا۔ ہمیں اپنے ذاتی طرزِ عمل سے غرض ہے۔ ہمیں یہ قصہ بھلا دینا چاہیے۔ اور اپنے اس عزم پر قائم رہنا چاہیے کہ آئندہ بھی ایسی نیکیاں کرتے رہیں گے۔ خواہ دوسرے ہمارے ساتھ کسی طرح پیش آئیں۔ اعمال کا صلہ نیت کے مطابق ملتا ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ ہماری نیت کیا تھی۔'' آخرِ کار گلے شکوے کے بعد ہم نے دوستوں کے طور پر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ الطاف گوہر کے ساتھ میری دوستی ان کی وفات تک قائم رہی۔

بھٹو کی حلف برداری کے موقع پر سیکورٹی کا مسئلہ

بھٹو کو سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بننے اور مارشل لا کو غیر ضروری طور پر طول دینے پر ہر طرف سے زبردست تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ میاں انور علی نے بھٹو کو مشورہ دیا کہ نکتہ چینی سے بچنے کے لیے مارشل لا اٹھا لیا جائے۔ بھٹو نے جواب میں کہا: ''میں مارشل لا اٹھا لوں گا۔ تاہم میں اس کا قبل از وقت چرچا نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو میرا اقتدار دھڑام سے زمین بوس ہو جائے گا۔ جیسا کہ ایوب خان کے ساتھ اس وقت ہوا جب انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ صدارتی

 الیکشن میں حصہ نہیں لیں گے۔"

دستور ساز اسمبلی نے 1972ء کے شروع میں عبوری دستور کی منظوری دے دی۔ 21 اپریل کو ریس کورس گراؤنڈ (راولپنڈی) میں ایک بڑے جلسۂ عام کا اہتمام کیا گیا جس میں بھٹو نے صدر کے عہدہ کا حلف اٹھانا تھا۔ سٹیج کا انتظام گراؤنڈ کے وسط میں کیا گیا۔ جہاں ہجوم کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے درخت یا جھاڑیاں نہیں تھیں۔ اس لیے ڈپٹی کمشنر حاجی اکرم کا خیال تھا کہ ہجوم کو اس کی جگہ پر کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ انہوں نے تجویز کیا کہ اسٹیج تماشائیوں سے بھرے ہوئے حلقہ میں ہونا چاہیئے۔ لیکن چھ وفاقی سیکرٹریوں پر مشتمل کمیٹی نے اس زعم میں کہ عقلمندی کی سطح تنخواہوں کی سکیل کے تناسب سے بلند یا پست ہوتی ہے۔ نچلی سطح کے ڈی سی کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ ایس ایس پی ملک محمد نواز کو بھی سیکرٹریوں کی رائے سے اتفاق کرنے میں ہی عافیت نظر آئی۔

پنجاب کے گورنر مصطفیٰ کھر نے قبل از دوپہر جگہ کا معائنہ کیا اور انتظامات دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ حاجی اکرم نے سیکورٹی کے انتظامات درہم برہم ہو جانے کا خدشہ ظاہر کیا اور میں نے بھی ان کی تائید کی۔ لیکن کسی نے ہماری بات نہیں سُنی۔

جوش و جذبہ سے بھرپور عوام کے ہجوم جوق در جوق گراؤنڈ میں داخل ہونے لگے۔ ہجوم کے بڑھتے ہوئے دباؤ نے جلد ہی سارے انتظامات درہم برہم کر دئے۔ میں نے معمول کے طریق کار کے برعکس سٹاف کے تمام ارکان ایک جگہ جمع کر لیے اور بھٹو کے گرد قطار در قطار کھڑا کر کے راستہ بنانے کی کوشش کی تا کہ وہ سٹیج تک پہنچ سکیں۔ افرادی قوت کم پڑ گئی تو میں نے پی پی کے کارکنوں کو ساتھ ملا لیا۔ ان کی مدد اور تعاون سے ہم بمشکل اپنا فرض ادا کر سکے۔

بھٹو سے فوری طور پر حلف اٹھوایا گیا۔ صدر بہت ہی مختصر تقریر کر سکے کیونکہ بے قابو ہجوم کے باعث سٹیج بری طرح ہل رہا تھا۔ صدر غصے اور عجلت میں روانہ ہو گئے۔ وفاقی سیکرٹریوں کی کمیٹی نے جنہوں نے ڈپٹی کمشنر کی تجویز مسترد کر دی تھی' ناکافی اور ناقص انتظامات کی ساری ذمہ داری ضلعی انتظامیہ پر ڈال دی۔ انتظامیہ کے متعلق پی پی کی ہائی کمانڈ کا نقطۂ نظر پہلے ہی خراب تھا۔ ان کے بقول پیشتر ازیں بھٹو کے جلسہ ہائے عام کے انتظامات بہت بہتر ہوا کرتے تھے۔ ہم نے وضاحت کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی بھی ہماری بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ ملک محمد نواز (ایس ایس پی) کو بلاوجہ سب سے زیادہ مورد الزام ٹھہرایا اور

قربانی کا بکرا بنانے کے لیے تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ میں نے لوگوں کو بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔

میں نے ''گریٹ ڈیوائڈ'' نامی کتاب اٹھائی اور اس حصہ کو انڈر لائن کر دیا جس میں یوم آزادی 1947ء کے موقع پر دہلی کی تقریب کا منظر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس موقع پر تمام انتظامات درہم برہم ہو گئے تھے۔ اور یہ کہ ہجوم کے باعث جواہر لال نہرو اور ماؤنٹ بیٹن نہ صرف اپنی گاڑیوں سے گر گئے بلکہ اپنے پیروں پر بھی کھڑے نہیں رہ سکے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کی بیٹی پامیلا کچھ دیر کے لیے گم ہو گئی تھی اور حکومت کو بے حد پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میں نے کتاب کے حاشیہ پر لکھ دیا کہ ''21 اپریل 1972ء پاکستان کے لیے قریباً ایسا ہی دن تھا جو بھٹو جیسے عظیم لیڈر کی ولولہ انگیز قیادت میں جمہوریت کی خوشبو لایا تھا۔ اگر خوشیاں مناتے ہوئے ہجوم کے جوش و خروش سے انتظامات درہم برہم نہ ہوتے تو وہ ان کی عظمت اور شہرت و ناموری کے شایانِ شان خراجِ تحسین نہ ہوتا۔'' اے ڈی سی نے ایک بار پھر مجھ پر مہربانی کی اور وہ کتاب بھٹو کو پیش کر دی۔ اسے پڑھ کر بھٹو کا غصہ اور اس واقعہ کی بابت ہونے والی تحقیقات سب کچھ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

شملہ جانے کی تیاریاں

میں نے 1972ء کے شروع میں میاں انور علی، ڈی آئی جی کے ساتھ ایک اعلیٰ سطح کے اجلاس میں شرکت کی جس میں بھٹو نے ڈائریکٹر آئی بی سے متعدد سوال پوچھے۔ مثلاً کیا مقبوضہ علاقوں کی واپسی جنگی قیدیوں کی رہائی سے زیادہ اہم ہے؟ جب اندرا گاندھی یہ کہتی ہیں کہ وہ اپنی قوم کو ایک اور خوشخبری سنائیں گی تو اس سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے؟ آجکل اتنے زیادہ جلوس کیوں نکل رہے ہیں؟ روس بلوچستان میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا ہے؟ آیا کوئی بڑا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور یہ کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ اس سے پیشتر کہ میاں انور علی جواب دینے کے لیے اپنا منہ کھولتے، جلد باز اور تیز طرار بھٹو اگلا سوال داغ دیتے۔ بہر حال میاں صاحب نے کسی نہ کسی طرح تمام مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اس رائے کا اظہار کیا کہ ان مسائل کو جلدی میں نہیں چھیڑنا چاہیے بلکہ ان سے ہوشیاری، ہوش مندی اور تحمل کے ساتھ نمٹنا چاہیے۔

میاں صاحب کا خیال تھا کہ جنگی قیدیوں کا مسئلہ سب سے زیادہ پریشان کن ہے جو اتنی بڑی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے کہ وہ حکومت کے عدم استحکام کا سبب بن سکتی ہے۔ اس مسئلہ سے فوج میں بھی بے

چینی پھیلنے کا امکان ہے کیونکہ شیخ مجیب افسروں پر جنگی مقدمات چلانے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ہم سب نے ان کے نقطۂ نظر کی تائید کی۔

بھٹو نے پوچھا: ''آیا جنگی قیدیوں کے مسئلہ سے زیادہ خاندان متاثر ہو رہے ہیں یا بھارت کے زیرِ قبضہ علاقہ سے؟'' ہم سب کی رائے تھی کہ جنگی قیدیوں کا معاملہ زیادہ لوگوں کی پریشانی کا موجب بن رہا ہے' ہمیں محسوس ہوا کہ بھٹو وہ واحد شخص تھے جو اس اجلاس میں ہوم ورک کر کے آئے تھے۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ دشمن کے زیرِ قبضہ علاقہ متاثر ہونے والے لوگوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے جو جنگی قیدیوں کے مسئلہ سے متاثر ہو رہے ہیں۔ الگ الگ سیکٹر کی مکمل تفصیلات پیش کیں۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ بلاشبہ جنگی قیدیوں کی رہائی کا معاملہ ایک سنگین مسئلہ ہے' تاہم مقبوضہ علاقوں کا انخلا اس سے بھی اہم ہے۔ دشمن کا ہمارے علاقہ پر قبضہ معروف معنوں میں فتح ہے۔ اگرچہ جنگی قیدی بھی دشمن کے غلبہ کی علامت ہیں۔ ان جنگی قیدیوں کا تنازعہ بہت سے اخلاقی وجذباتی پہلو رکھتا ہے۔ جن سے ہم بھارت کے خلاف بین الاقوامی سطح پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر ہمارے عوام تھوڑے سے صبر وتحمل اور معاملہ فہمی کا مظاہرہ کریں تو ہم اس مسئلہ کو بھارت کے لیے انتہائی پریشانی کا موجب بنا سکتے ہیں۔ ان کے استدلال کا انداز واقعی مدبرانہ اور قائل کرنے والا تھا۔ انہوں نے ہم سب کو ہدایت کی کہ ان کے تجزیہ کے بارے میں ہرگز کہیں بات نہ کریں' یہاں تک کہ اپنے گھر والوں سے بھی اس کا ذکر نہ کریں۔

بھٹو وقتی طور پر مسئلہ کشمیر کو بھی سرد خانے میں ڈالنے اور جنگ بندی لائن (بعدازاں اس کا نام لائن آف کنٹرول رکھ دیا گیا) کو بین الاقوامی سرحد سے الگ تھلگ رکھنے کے حق میں تھے۔ کشمیر کو ایک جداگانہ مسئلہ قرار دے کر بھارت پر مقبوضہ علاقے خالی کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا مقصود تھا۔ نیز وہ اپنی حکمتِ عملی کے ذریعے ان دوسرے مسائل کا حل بھی ڈھونڈنا چاہتے تھے جو جنگ کے باعث پیدا ہوئے۔

انہوں نے ہمیں ذرائع اور تدابیر کی مدد سے اس قسم کی فضا تیار کرنے کو کہا جس میں پوری دنیا خصوصاً بھارت کو باور کرایا جا سکے کہ اگر جنگی قیدیوں کو جلد رہا نہ کیا گیا تو پاکستان اس قدر غیر مستحکم ہو جائے گا کہ اپنے پیروں پر بھی کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ میاں انور علی کو اس مہم کا انچارج اور افسر رابطہ مقرر کیا گیا۔ میاں انور علی نے طالب علموں' جنگی قیدیوں کی بیگمات' محنت کشوں' علمائے دین' وکیلوں اور سیاسی کارکنوں کی طرف سے زوردار احتجاجی مہم انتہائی ہوشیاری سے اور بڑے موثر انداز میں مکمل رازداری کے ساتھ چلائی۔

کسی نے بھی مقبوضہ علاقوں کے مسئلہ کا نام تک نہیں لیا۔ بھٹو نے ملک کے مختلف طبقات کے نمائندوں اور سیاسی لیڈروں کے ساتھ مری میں ملاقاتیں کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا اس کا مقصد بھی شملہ جانے سے پہلے یہ تاثر پیدا کرنا تھا کہ جنگی قیدیوں کو فوری رہائی نہ ملنے کی صورت میں بھٹو حکومت کا جلد ہی دھڑن تختہ ہو جائے گا۔ جب اندرا گاندھی نے مقبوضہ علاقے خالی کرنے کی پیشکش کی تو بھٹو نے ایسا تاثر دیا گویا وہ اسے بادل نخواستہ اور آخری چارہ کار کے طور پر قبول کر رہے ہیں۔ بھارت نے مقبوضہ علاقے تو اپنی مرضی سے خالی کر دیے تاہم اسے جنگی قیدی بھی غیر معمولی عالمی دباؤ کے تحت جلد ہی چھوڑنے پڑے۔ اس عمل کے دوران اندرا گاندھی کو تاوانِ جنگ، جنگی جرائم کے تحت مقدمات چلانے اور دیگر مطالبات کا ہوش ہی نہیں رہا جن کا وہ پہلے اکثر ذکر کرتی رہتی تھی۔ آخر میں بھٹو اندرا کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوشیار اور تیز طرار ثابت ہوئے۔

''پیس بے بی'' کی پیدائش

جون 1972ء کے دوران میں غیر معمولی طور پر مصروف رہا کیونکہ بھٹو نے مری میں وفود کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ 22 جون کو مجھے خبر ملی کہ میری اہلیہ نے صبح کی اذان کے وقت ایک بچی کو جنم دیا ہے۔ میں بچی کی پیدائش پر بہت زیادہ خوش ہوا کیونکہ میں نے بیٹی کے لیے دعا مانگی تھی جبکہ بلقیس بیٹے کی خواہاں تھیں۔ میں نے اپنے باس شیخ اکرام کو جو اس وقت مری میں موجود تھے یہ خوشخبری سنائی اور راولپنڈی جانے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے اجازت دے دی کہ ''ہمیں اُمید کرنی چاہیے کہ نومولود برصغیر میں قیامِ امن کی نوید لے کر آئی ہے اور ہمارے لیے ''پیس بے بی'' ثابت ہوگی۔''
جب میں گھر پہنچا تو بلقیس ایک نہایت پیاری بچی کے ساتھ ہسپتال سے گھر آ چکی تھی۔

''آپ نے ہسپتال سے گھر منتقل ہونے میں بڑی جلد بازی سے کام لیا'' میں نے بلقیس سے کہا۔

''میں آپ کے آنے سے پہلے آپ کے لیے چائے بنانا چاہتی تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے گرم گرم چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑ کر بلقیس کا شکریہ ادا کیا اور نومولود کا نام صائمہ سردار رکھا۔ اس کے چند ہی روز بعد شملہ میں امن کے معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔



باب11

جمہوریت کی مجبوریاں

مجھے اگست1972ء میں ایس ایس پی (راولپنڈی) بنا دیا گیا۔ ایس پی کے رینک میں ترقی کے بعد ڈسٹرکٹ پولیس کے سربراہ کے طور پر وہ میری اوّلین تقرری تھی اور جمہوری نظام کے دباؤ تلے کام کرنے کا پہلا تجربہ۔ آدمی اس تجربہ سے گزرنے کے بعد ہی سمجھ سکتا ہے کہ اصل میں اس کے معنی کیا ہیں۔

مجھے سب سے پہلے جن اہم مسائل سے سابقہ پڑا ان میں سے ایک یہ تھا کہ شہر میں روزانہ نکلنے والے جلوسوں سے خاصی کم پولیس فورس کے ساتھ کیسے نمٹا جائے۔ بحیثیت ایس پی سپیشل برانچ یہ بات میرے علم میں تھی کہ کسی نہ کسی مسئلہ پر احتجاج کے لیے روزانہ اوسطاً پانچ چھ مختلف قسم کے جلوس نکلتے تھے۔ محنت کش، وکلاء، خواتین، اقلیتیں اور مختلف خیال کے سیاسی عناصر معمولی سا بہانہ ہاتھ آتے ہی سڑکوں پر نکل

آتے تھے۔ شاید وہ اس کمی کو پورا کرنا چاہتے تھے جو مارشل لا کے باعث احتجاج نہ کرنے سے واقع ہوئی تھی اور اپنی ساری شکایات کا ایک ہی سانس میں اظہار کرنے کے خواہاں تھے۔ تمام جلوس مری روڈ پر جمع ہو جاتے جو راولپنڈی اور اسلام آباد کے مابین رابطے کا سب سے اہم ذریعہ تھی کیونکہ ہوائی اڈہ کو جانے والی لنک روڈ ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔

میں اکثر لیڈروں کو جانتا تھا۔ میں نے ان کے ساتھ انفرادی طور پر بات چیت کی اور ان سے کہا کہ سڑکوں پر نکلنے کی بجائے اپنے کام پر توجہ دیں۔ بہر حال انہیں جلوس نکالنے کی آزادی ہے بشرطیکہ وہ تشدد کی سرگرمیوں میں ملوث نہ ہوں۔ مجھے پولیس فورس کا تحفظ مطلوب تھا اور یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ سڑکوں پر کوئی گڑ بڑ ہو۔ میرے پاس پولیس کی نفری بہت ہی کم تھی کیونکہ ان میں سے جو 20 فیصد ملازمین مشرقی پاکستان بھیجے گئے وہ ان دنوں جنگی قیدی بنے ہوئے تھے۔

مذاکرات کے ذریعے میرا اکثر لیڈروں کے ساتھ سمجھوتہ ہو گیا کہ وہ توڑ پھوڑ نہیں کریں گے اور یہ کہ پولیس کم از کم مداخلت کرے گی۔ اس طرح میں بہت تھوڑی مدت میں جلوسوں کی تعداد و نیز ان کی قوت کم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں پولیس کے دستوں کو جلوس سے بہت دور رکھتا۔ لاٹھی چارج، آنسو گیس اور فائرنگ سے حتیٰ الامکان گریز کیا جاتا تھا تا کہ ڈرامائی عوامل میں اضافہ نہ ہو۔ اگر ایسے اقدامات نہ کیے جائیں تو جلوس میں شامل لوگ خواہ مخواہ مشتعل نہیں ہوتے۔ نہ کوئی تماشا ہوتا ہے نہ ہنگامہ اور لوگوں کی جلوس میں شامل ہونے کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔

حاجی محمد اکرم ان دنوں راولپنڈی کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہ بڑے دانا اور تعاون کرنے والے افسر تھے۔ وہ معاملہ فہم مجسٹریٹوں کو جلوس سے متعلق ڈیوٹی پر مامور کرتے تھے تا کہ احتجاج کرنے والوں سے بات چیت کر کے ان کے مسائل کو ممکنہ حد تک حل کیا جا سکے۔

ایک مہینے کے بعد سڑکوں اور گلیوں میں صرف طلبا سرگرم رہ گئے۔ شیخ رشید احمد جو آج کل مسلم لیگ کے ممتاز راہنما ہیں۔ ان دنوں سب سے اہم سٹوڈنٹ لیڈر تھے۔ حاجی اکرم اور میں نے ان کے ساتھ بہت سی ملاقاتیں کیں۔ ہم نے انہیں معاملہ فہم اور معقول آدمی پایا۔ وہ خود بھی تشدد اور توڑ پھوڑ کے خلاف تھے۔ ان کے ساتھ ہماری اس بات پر مفاہمت ہو گئی کہ پولیس مداخلت نہیں کرے گی اور طلبا کو خود ان کی قیادت کنٹرول کرے گی۔

زود رنج سیاست دان

ایک دن مری روڈ پر طلبا کا جلوس گزر رہا تھا۔ اچانک وزیر داخلہ قیوم خان کی کار ادھر سے گزری۔ کچھ لڑکوں نے کار پر مکے مارے اور پرچم اتار لیا۔ شیخ رشید کو پتہ چلا تو وہ فوراً موقع پر پہنچے۔ جھنڈا پھر سے کار پر لگا دیا اور معذرت کی لیکن قیوم خان کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ انہوں نے ٹیلی فون پر مجھے حکم دیا کہ ان تمام طلبا کو گرفتار کر کے ان کی خوب مرمت کی جائے۔ انہوں نے یہ شکایت بھی کی کہ پولیس فرض شناس اور مستعد نہیں۔ میں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔ ناچار میں نے ان کا حکم نظر انداز کر دیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اس پر عمل کرنے سے معاملہ خراب ہو جائے گا۔ تاہم ایسا کرنے سے میں خود مصیبت میں پھنس گیا۔

لحیم شحیم خان صاحب سیاست دان ہوتے ہوئے ایک طالب علم کی چھوٹی سی شرارت کو معاف نہیں کر سکے اور انہوں نے اسے ذاتی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ میری حکم عدولی نے جلتی پر تیل چھڑکا۔ انہوں نے بھٹو سے میری شکایت کر دی۔ چنانچہ مجھے صدر کے سامنے پیش ہو کر معاملہ کی وضاحت کرنی پڑی۔ اپنی وضاحت کے دوران میں نے عرض کیا ''سر ایک کانسٹیبل کو آپ کی عوام میں مقبولیت سے کھیلنے کا اختیار نہیں دیا جا سکتا۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا'' انہوں نے آہستگی سے کہا۔

اب میں ایک اور الجھن میں پھنس گیا۔ میں سوچنے لگا صف اول کے یہ دونوں راہنما اس بات کو کیوں نہیں سمجھ رہے جس سے اپنے کیریئر کے دوران انہیں بارہا سابقہ پڑ چکا ہے؟ میں نے دوبارہ وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ پولیس کی غیر ضروری موجودگی ہمیشہ اشتعال کا موجب بنتی ہے جس سے بعض اوقات معاملہ بگڑ جاتا بلکہ فائرنگ تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بات بڑھ جاتی ہے جس کا نتیجہ حکومت کی عدم مقبولیت کی صورت میں نکلتا ہے۔ وہ اس پر بھی میری بات نہ سمجھے تو میں پریشان ہو گیا۔ کیا میں کسی ایسے پیچیدہ فلسفیانہ نظریہ کی بات کر رہا تھا جو اس دنیا سے تعلق نہیں رکھتا؟ ناچار میں نے ان کی اپنی مثال پیش کی جب 1968ء میں وہ حزب اختلاف میں شامل تھے۔ اس سال پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ راولپنڈی میں ایک المیہ رونما ہوا جس میں پولیس فائرنگ سے ایک طالب علم ہلاک ہو گیا تھا۔ وہ سانحہ ایوب خاں کے خلاف احتجاجی تحریک کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ بھٹو نے بحیثیت اپوزیشن لیڈر اس سے خوب

فائدہ اٹھایا۔ آخرِ کار میں اپنا نقطۂ نظر سمجھانے میں کامیاب ہوگیا اور [illegible] نے کہا "میں تمہارا موقف سمجھ گیا' تاہم آئندہ محتاط رہنا"۔ "ٹھیک ہے' سر" میں نے زور سے کہا اور اجازت لے کر باہر نکل آیا۔

میں نقل و حرکت کی آزادی کے جمہوری حق کا احترام کرنے اور مسائل کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کی پالیسی پر ہمیشہ کاربند رہا۔ میں معمولی باتوں پر طلبا کو گرفتار نہیں کرتا تھا اور وہ بھی میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاتے تھے۔

انتظامیہ کو اپنے کنٹرول میں کرنے کے لیے جیالوں کی بے تابی

یہ بات بڑی حیرت انگیز تھی کہ مجھے اپوزیشن کے برعکس حکمران جماعت (پیپلز پارٹی) کے کارکنوں کے ہاتھوں جنہیں اب "جیالے" کہا جاتا ہے (کیونکہ ان کے جذبات اکثر ان کے دماغ پر حاوی ہوتے ہیں) زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی کے کنٹرول میں نہیں۔ وہ اپنے مخالفین کے خلاف طاقت استعمال کر کے غیر ضروری کشیدگی اور تلخی پیدا کر رہے تھے۔ وہ میری اس پالیسی سے خوش نہیں تھے کہ میرے دفتر کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رہیں اور میں اپوزیشن سمیت ہر گروپ یا پارٹی کے ساتھ مساوات' انصاف اور غیر جانبداری پر مبنی خوشگوار تعلقات قائم رکھوں۔ مثال کے طور پر جماعتِ اسلامی کے مولانا فتح محمد اور مسلم لیگ کے علی اصغر شاہ میرے دفتر میں اکثر آتے رہتے تھے۔ پی پی پی کے مقامی لیڈر جو پوری حکومتی مشینری پر اجارہ داری قائم کرنے کے خواہشمند تھے۔ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے میرے خلاف شکایات بھی کیں لیکن میری پالیسی میں نہ تو مصطفیٰ کھر نے مداخلت کی نہ ہی بھٹو نے۔

مقامی اپوزیشن کو حاجی اکرم اور مجھ پر، ہماری اوپن ڈور انتظامی پالیسی اور غیر جانبداری کی وجہ، سے مکمل اعتماد تھا۔ جس کا امتحان 1973ء میں یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ کی احتجاجی تحریک کے دوران میں ہو چکا تھا۔ مصطفیٰ کھر نے تحریک شروع ہونے سے تین دن پیشتر مجھے فون کیا اور سخت اقدامات کرنے کی ہدایت کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایسے اقدامات کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ کم از کم راولپنڈی میں ایسی کوئی تحریک شروع نہیں ہوگی۔ ان کے لیے میری بات پر یقین کرنا مشکل ہوگیا۔ راولپنڈی میں ملک محمد قاسم تحریک کے انچارج تھے۔ وہ لاہور سے پنڈی پہنچے اور یہ دیکھ کر بے حد مایوس ہوئے کہ کوئی بھی ان کی آواز پر

لبیک کہنے کو تیار نہیں تھا۔ شیخ رشید نے بھی ایک انچ سرکنے سے انکار کردیا۔ ملک قاسم کو انتہائی افسردہ اور دل گرفتہ ہوکر واپس جانا پڑا۔ اس کے بعد پورے ملک میں تحریک چلتی رہی لیکن راولپنڈی میں لوگ سڑکوں پر نہیں نکلے۔ ہر شخص راولپنڈی کی انتظامیہ سے خوش تھا۔ اگر میں نے وزیرِ داخلہ کے جابرانہ احکام پر عمل کیا ہوتا تو صورتِ حال یکسر مختلف ہوتی۔ موقع پر موجود ہونے کی بنا پر میں صورتِ حال کا بہتر ادراک رکھتا تھا۔ میں نے اس کے مطابق عمل کیا۔ مجھے وہ معاملہ اچھی طرح یاد تھا کہ گورنر موسیٰ خاں اور آئی جی میاں بشیر احمد نے ایوب خاں کے خلاف احتجاج کے دوران صورتِ حال کو کیسے خراب کیا تھا۔

مصطفیٰ کھر کے نزدیک میرے مؤثر ایس ایس پی ہونے کا سبب یہ تھا کہ میں پُرتشدد اور سنگدلانہ ہتھکنڈے استعمال کرتا تھا۔ انہیں میرے مساویانہ اور منصفانہ سلوک کے خفیہ ہتھیار کا اس وقت پتہ چلا جب وہ اقتدار میں نہیں رہے تھے۔ انہیں لاہور کے دو طالب علم رہنماؤں محبوب بٹ اور ناظم شاہ کی زبانی یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ میں نے ان دونوں کو ڈنڈے کے زور پر نہیں بلکہ نرمی اور شریفانہ سلوک کے ذریعے اپنا ہم خیال بنایا تھا۔

''لیکن سردار تو بڑا کامیاب ایڈمنسٹریٹر تھا اور اس دور میں کوئی بھی چیز کنٹرول سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ طاقت استعمال کیے بغیر وہ سب کچھ کیسے ممکن ہوگیا؟''

کھر نے تعجب سے پوچھا۔

''وہ انصاف کے معاملہ میں اپنے کھرے پن اور دیانتداری کے باعث مؤثر تھا۔ وہ ہر شخص کے ساتھ خواہ سیاسی کارکن ہوتا، طالب علم ہوتا یا لیبر لیڈر رہتا۔ مروت سے پیش آتا اور اس پر مہربانی کرتا تھا۔''

محبوب بٹ نے جواب دیا۔

''مجھے واقعی حیرت ہو رہی ہے'' کھر نے اعتراف کیا۔ وہ ہمیشہ نواب آف کالاباغ ملک امیر محمد خان کو مثالی نمونہ سمجھتے تھے جو ایوب خاں کے دور میں مغربی پاکستان کا بڑا سخت، گرم مزاج اور ظالم گورنر رہ چکا تھا۔ جبکہ میں اس کے دورِ حکومت میں بھی اس سے برعکس تدابیر پر عمل کرتا رہا تھا۔

صوبوں میں شورش

بھٹو بین الاقوامی مسائل میں الجھا ہوا ہونے کے باعث ملک میں امن و آشتی اور اتحاد و یکجہتی

دیکھنے کے خواہاں تھے۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ انہوں نے ولی خاں، مفتی محمود، غوث بخش بزنجو اور عطاء اللہ مینگل کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا اور انہیں بلوچستان اور سرحد میں نیپ و جے یو آئی کی مخلوط حکومتیں بنانے کا موقع فراہم کیا۔ لیکن ان حکومتوں نے بھٹو کے لیے مسائل کھڑے کر دیئے۔ حکومتِ بلوچستان نے مقامی لوگوں کے علاقائی مطالبات پورے کرنے کے لیے پنجاب سے تعلق رکھنے والے ملازمین کی چھانٹی شروع کردی اور پنجاب میں جو بھٹو کا گڑھ تھا پی پی کے خلاف منافرت کے جذبات کو ہوا دینے لگی۔ حکومتِ پنجاب کو برطرف شدہ ملازمین کو روزگار دینا پڑا۔ بزنجو صوبوں پر مبنی چار قومیتوں کا پرچار کرنے لگے۔ ولی خان پختونستان کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ گو ایک سندھی صدر مملکت بن گیا تھا' اس کے باوجود سندھ میں پنجاب کے خلاف شدید جذبات موجزن تھے۔ وہاں پنجاب سے تعلق رکھنے والے کسانوں کو ہراساں اور بے دخل کیا جا رہا تھا۔ اُدھر اندرا گاندھی بنگلہ دیش کی تخلیق کے بعد تین مہینے کے اندر اپنی قوم کو ایک اور خوشخبری سنانے کا اعلان کر رہی تھی اور روس یونائیٹڈ سٹیٹس آف انڈیا قائم کرنے کا پروپیگنڈا کر رہا تھا۔

علیحدگی پسندی کے ان رجحانات نے بھٹو کو پریشان کر دیا تاہم وہ یہ سوچ کر معاملہ کو نظر انداز کرتے رہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ زخم مندمل ہو جائیں گے اور تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے کر لیے جائیں گے۔ انہوں نے نت نئے ابھرنے والے مسائل کو حل کرنے کی غرض سے ہدایات جاری کیں' بعض اوقات وہ غصہ میں آ جاتے اور سختی اختیار کرنے کی راہ اپنا لیتے۔ انہیں اکثر شرانگیز اقدامات کے پسِ پردہ غیر ملکی ہاتھ کا شک گزرتا تھا۔

بلوچستان اور سرحد کی حکومتوں نے انگریزی کی بجائے اُردو کو دفتری زبان قرار دے کر ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا۔ بھٹو نے اس اعلان کو رکوانے کی کوشش کی۔ کیونکہ انہیں سندھ میں گڑبڑ کے آثار نظر آ رہے تھے۔ لیکن دونوں حکومتوں نے ان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ انہیں اس اقدام کے پسِ پشت غیر ملکی ہاتھ نظر آیا۔ چنانچہ انہوں نے ڈائریکٹر انٹیلی جنس میاں انور علی سے کہا کہ ان کے خیال میں روس ان کو شہ دے رہا ہے تاکہ سندھ میں بھی حالات خراب ہو جائیں۔ سندھ میں واقعی سرکاری زبان کے مسئلہ پر جلد ہی لاوا پھوٹ پڑا۔ سندھیوں اور مہاجرین کے مابین خونریز فسادات ہوئے جن میں بہت سی جانیں ضائع ہوئیں۔

اس سلسلہ میں ایوانِ صدر میں ایک اجلاس ہوا۔ جس میں دوسروں کے علاوہ کئی جرنیلوں نے بھی شرکت کی۔ اجلاس شروع ہونے سے پہلے میں نے بعض جرنیلوں کو یہ کہتے سنا کہ قومی مسائل کا واحد علاج

مارشل لا کا نفاذ ہے۔ ان کے خیال میں سیاست نے ملک کا کباڑہ کر دیا تھا۔ وہ خلوصِ دل سے اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ بچاؤ کا بہترین طریقہ مارشل لا ہے جبکہ محض چند مہینے قبل ڈھاکہ کا سقوط مارشل لا ہی کا نتیجہ تھا۔ یحییٰ خان نے سقوطِ ڈھاکہ کا الزام فوج کی بجائے سیاست دانوں کے سر تھوپنے کے لیے جو پروپیگنڈہ لائن دی تھی اس پر بدستور عمل ہو رہا تھا۔

سعید احمد خاں نے تجویز پیش کی کہ بلوچستان میں بزنجو مینگل اتحاد توڑنے کے لیے سردار اکبر خاں بگٹی کو اور سرحد میں ولی خان و مفتی محمود اتحاد کے خلاف عبدالقیوم خان کو استعمال کیا جائے۔ چنانچہ بھٹو نے بگٹی اور قیوم خان کو بہلا پھسلا کر اپنی صفوں میں شامل کر لیا۔

کچھ دن بعد بلوچستان کی حکومت کو اسلام آباد میں واقع عراق کے سفارت خانہ سے اسلحہ کی بھاری مقدار برآمد ہونے پر برطرف کر دیا گیا۔ اسلام آباد پولیس کے انسپکٹر رضا خان نے ایک مجسٹریٹ کے زیرِ نگرانی چھاپہ مارٹیم کی قیادت کی تھی۔ بھٹو کو یقین تھا کہ وہ ہتھیار بلوچستان بھیجنے کے لیے جمع کیے گئے تھے تاکہ وہاں مینگل اور دوسرے سرداروں کی حمایت میں لڑنے والے باغیوں کی مدد کی جا سکے۔ ان کے خیال میں وہ سارا کھیل عراق کو آگے رکھ کر روس نے کھیلا تھا۔ انہوں نے نیپ پر روس کے ہاتھوں میں کھیلنے کا الزام لگایا۔ صوبہ سرحد کی حکومت نے اپنی فوری برطرفی کا خطرہ بھانپ کر "بطور احتجاج" مستعفی ہونے میں عافیت سمجھی۔

اپنی حکومتیں گنوانے کے بعد نیپ اور جے یو آئی نے احتجاج شروع کر دیا جس نے جلد ہی تحریکِ مزاحمت کی شکل اختیار کر لی۔ وہاں فوجی ایکشن کیا گیا۔ لیکن اس سے کشیدگی اور بڑھ گئی۔ جو عمل مشرقی پاکستان میں کامیاب اور مؤثر ثابت نہیں ہوا تھا' بلوچستان میں کیسے نتیجہ خیز ثابت ہوتا؟ بھٹو فوج استعمال کر کے ایسی صورتِ حال میں پھنس گئے جس سے نکلنا محال ہو گیا' یہاں تک کہ ایک کے بعد دوسرا مارشل لا لگ گیا جس طرح دن کے بعد رات آ جاتی ہے۔ فوج کو سول انتظامیہ کی مدد کے لیے جہاں کہیں بھی بلایا جائے' وجہ خواہ کچھ بھی ہو' اسے حکومت پر قبضہ کرنے کی شہ مل جاتی ہے۔ بھٹو نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا اور اس غلطی کو دہرانے کی زبردست قیمت ادا کرنی پڑی۔ جس میں ان کی حکومت بھی گئی اور جان بھی۔

تبادلوں اور ڈسپلن کے امور میں اجتماعی مشورہ

میں نے اپنی فورس کا اعتماد بڑھانے کے لیے جوانوں اور افسروں کے ساتھ اجتماعی مشورہ کر کے

تبادلے اور پوسٹنگ کرنے کی وہی پالیسی جاری رکھی جس پر میں دادو اور قربان لائنز (لاہور) میں عمل کر چکا تھا۔ صحیح کام کے لیے صحیح آدمی ہونا چاہیے جو اپنے سینے میں دل اور اس کے اندر روح رکھتا ہو۔ ہمارا بنیادی مقصد یہی تھا۔ تاہم ایسا کرتے وقت افسروں اور ان کے اہلِ خاندان کی سہولت اور آسانی کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا تھا۔ یہاں میں نے اس قدر اضافہ کیا کہ ڈسپلن اور سزا کے معاملات میں بھی اجتماعی مشورہ سے کام لینے لگا۔

میں نے پہلے مقاصد متعین کیے' پھر انہیں حاصل کرنے کے طریقِ کار پر زور دیا۔ میں نے اپنے ماتحتوں کو بتایا کہ طریقِ کار خود قانون خصوصاً ضابطہ جاتی قانون میں متعین کر دیا گیا ہے۔ شرکائے اجلاس میں مجھے معنی خیز نظروں سے گھورنے لگے۔ میں ان کی مشکل کو سمجھ گیا۔ قانون کو عرصۂ دراز سے بڑی بے نیازی کے ساتھ نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ ان کے نزدیک قانون سے افسرِ اعلیٰ کا حکم اور اس کی خفگی کا ڈر مراد تھا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ انہیں تمام احکام کی تعمیل کرنی چاہیے خواہ وہ درست ہوں یا غلط' قانونی ہوں یا غیر قانونی اور اس طرح اپنی کھال بچانی چاہیے۔ انہیں روزگار کی ضمانت' ترقیاں اور من مانی کرنے کا مکمل اختیار اسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس قانون ان اختیارات پر جو پابندیاں عائد کرتا ہے وہ انہیں ناپسند تھیں۔ قانون کے بارے میں میری رائے انہیں بڑی عجیب اور بے محل محسوس ہوئی۔

ڈی ایس پی چوہدری معین کا خیال تھا کہ میری پالیسی کامیاب نہیں ہوگی اور پولیس فورس مثبت جواب نہیں دے گی کیونکہ وہ صرف احکام وصول کرنے اور ان پر عمل کرنے کی عادی تھی۔

''بہر حال آپ کو میری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا'' میں نے کہا لیکن احکام جاری کرتے وقت مجھے بھی قانون کی لازماً پابندی کرنی ہوگی۔ اپنی خواہشات کی نہیں۔ میں من مانے احکام جاری نہیں کرونگا۔ اسی طرح میرے ماتحت ہر سطح کے بااختیار افسروں کو بھی اس قانونی طریقِ کار کی لازماً پیروی کرنی چاہیے۔''

اس پر معین چوہدری بولے: ''ایوب خان کے بعد ہر حاکم نے شخصی حکومت کی پیروی کی' ملک کے قانون پر عمل نہیں کیا۔ گورنر' چیف سیکرٹری' آئی جی' ڈی آئی جی اور دوسرے تمام ایڈمنسٹریٹرز عرصہ دراز سے من مانے طریقے پر چل رہے ہیں اور کامیاب ہیں۔ اس سے ان کی قابلیت اور کارکردگی بڑھتی ہے۔ اگر آپ نے قانونی طریقہ کار اور جزئیات کی باتیں کر کے پنڈورا بکس کھول دیا' تو پورا نظام دھڑام سے

زمین بوس ہو جائے گا اور آپ بحیثیت ایس ایس پی ناکام ہو جائیں گے۔"

"ایک ملازم کے طور پر میری ذاتی ناکامی' چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ لاقانونیت کے ذریعے قابلیت کا اظہار چنداں موجب افتخار نہیں۔ ہم قانون نافذ کرنے والے ہیں اس لیے ہمیں خود بھی قانون کی پابندی کرنی چاہیے۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر مصطفیٰ کھر آپ کو ایسا حکم دیں جو بظاہر خلافِ قانون ہو یا لاقانونیت پر مبنی ہو' تو آپ کیا کریں گے؟" معین نے سوال کیا۔

"ہم اِس پر اُس وقت غور کریں گے جب ایسا موقع آئے گا" میرا جواب تھا۔

اگلے چند مہینوں کے دوران میں، میں نے اپنے سٹاف کے ساتھ بہت سی میٹینگیں کیں۔ میں انہیں اپنے رہنما خطوط سے آگاہ کرتا اور بتاتا کہ ہمیں مختلف امور حتیٰ کہ سزا کے معاملے میں بھی اجتماعی مشاورت کے تصور کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ قریباً چار مہینے کی مدت میں بتدریج اس بات کو سمجھ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے میرے تصورات کی پیروی شروع کر دی۔ حقیقت میں انہیں سچائی اور قانون کی پیروی کر کے خوشی محسوس ہونے لگی۔ وہ اس پر فخر کرنے لگے اور خود اپنی نظروں میں ان کا وقار بڑھ گیا۔ لوگوں کی طرف سے بہتر تعاون ملنے لگا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ باطنی غور و فکر کے ذریعے اپنی اصلاح آپ کی تدابیر بروئے کار لائی جانے لگیں۔ کمانڈ سے ڈرنے کی بجائے اس کا احترام کیا جانے لگا۔ ماتحت دل لگا کر کام کرنے لگے اور محض چند مواقع ایسے آئے جب مجھے سزا دینی پڑی۔ لکھائی کا غیر ضروری کام فائلوں کے ڈھیر' سفارش کی ضرورت اور وقت و توانائی کا لامحدود ضیاع خاصا کم ہو گیا۔ ماتحتوں کو ڈرانے اور خوفزدہ کرنے والے شوکاز نوٹسوں اور چارج شیٹوں کے چکر میں الجھانا بند کر دیا گیا اور کارکردگی میری توقع سے بھی زیادہ بہتر ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ مصطفیٰ کھر کو اپنے دوست محبوب بٹ سے کہنا پڑا:

"سردار کے دائرہ اختیار میں کوئی بھی چیز اس کے نوٹس میں آئے بغیر حرکت نہیں کرتی تھی' وہ یقیناً ایک خوفناک شخص (Terror) رہا ہو گا۔"

انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں مختلف قسم کا آدمی تھا اور میرا طریق کار پولیس کی کارکردگی کو افسروں اور جوانوں کی اجتماعی مشاورت کے ذریعے موثر بنانے پر مبنی تھا۔

آؤٹ آف ٹرن ترقی کی پیشکش

ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر نے راولپنڈی میں چاول کے ایک بہت بڑے ذخیرہ کا سراغ لگایا جو افغانستان کو سمگل کرنے کی غرض سے جمع کیا گیا تھا۔ اس وقت پاکستان خوراک کی کمی کے سنگین مسئلہ سے دو چار تھا۔ میں نے ڈی سی حاجی اکرم کو مطلع کیا۔ ڈی ایس پی اللہ بخش نے دو مجسٹریٹوں کے زیرِ نگرانی کامیاب چھاپہ مارا۔ ذخیرہ کا سراغ لگا کر اسے مقفل کر دیا گیا اور ملزمان کے خلاف قانونی کارروائی کی گئی۔ بھٹو نے اخبارات میں وہ خبر پڑھی تو بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ انہوں نے کمشنر ملک فتح خان بندیال کو فون کیا۔ بندیال نے سارا کریڈیٹ حاجی اکرم اور میرے کھاتہ میں ڈال دیا۔ بھٹو نے حکم صادر کیا کہ اس شاندار کارکردگی پر حاجی اکرم اور مجھے آؤٹ آف ٹرن ترقی اور معقول انعام دیا جائے۔ حاجی صاحب اور میں نے متفقہ گزارش کی کہ حقیقی کریڈٹ ماتحت عملہ کو جاتا ہے' اس لیے انہی کو ترقی اور انعام ملنا چاہیے۔ ہمارے لیے تعریفی اسناد (Letters of Appreciation) ہی کافی ہوں گی۔ بھٹو کی طرف سے ہم دونوں کو تحسین و آفرین پر مشتمل مراسلے دیئے گئے جن پر ان کے دستخط ثبت تھے۔ (اس کی نقل کتاب میں شامل ہے) اس کے علاوہ جونیئر سٹاف کو ترقیاں دی گئیں۔ ہم دونوں کی رائے یہ تھی کہ ماتحتوں کی طرف سے کیے گئے کام کا سہرا اپنے سر باندھنا ایک معیوب اور غیر اخلاقی حرکت ہے۔ میں نے ایسے افسر دیکھے ہیں جنہوں نے دوسروں کی قربانیوں کی قیمت پر اپنا کیریئر بنایا ہے۔ حالانکہ ان کاموں میں ان کا ذاتی کوئی کردار نہیں تھا۔ اس طرح وہ ان خوبیوں کی کمی پوری کرتے ہیں جو ان میں نہیں پائی جاتیں' البتہ وہ بڑی عمدہ' خوش کن اور قائل کرنے والی درخواستیں پیش کرنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔

اسلام آباد میں مقیم بنگلہ دیشیوں کا حال

اسلام آباد میں مشرقی پاکستانیوں کی خاصی تعداد مقیم تھی۔ ان میں سے زیادہ تر سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بنگلہ دیش جانا چاہتے تھے۔ ہمارے بہت سے سیاست دانوں اور بیوروکریٹس نے تجویز پیش کی کہ جنگی قیدیوں کی واپسی کو یقینی بنانے کے لیے انہیں یرغمال بنا لیا جائے۔ پریس بھی ان کے خلاف ہو گیا اور مخالفانہ فضا کو ہوا دینے لگا۔ البتہ بین الاقوامی ریڈ کراس ان پھنسے ہوئے بنگلہ دیشیوں سے ہمدردانہ انداز میں نمٹ رہا تھا جو جنگی قیدیوں کے معاملہ سے یکسر مختلف تھا۔

بھٹو مخمصہ کی حالت میں تھے۔ انہیں شیخ مجیب کے بہت سے مطالبات نے جن میں اثاثوں کی تقسیم، تاوانِ جنگ اور جنگی مقدمات جیسے معاملات شامل تھے، پریشان کر رکھا تھا۔ انہوں نے اس مسئلہ پر غور وخوض کے لیے اعلیٰ سطح کا اجلاس بلایا۔ اس میٹنگ میں بھی ہر ایک نے یہی تجویز کیا کہ غیر لڑاکا بنگالیوں کو سودا بازی کے لیے بطور یرغمال رکھ لیا جائے۔ ورنہ لوگوں کی طرف سے شدید ردِعمل کا اظہار کیا جائے گا۔

بھٹو نے سب کی باتیں سننے کے بعد آخر میں کہا کہ "پاکستان کو اس الجھن سے نکلنے کے لیے پوری بین الاقوامی برادری کی مدد درکار ہے۔ تکنیکی لحاظ سے یہ لوگ پاکستان کے شہری ہیں۔ اگر ہم ان کی اتنی بڑی تعداد کو اس طرح روکیں گے تو بین الاقوامی سطح پر بدترین نکتہ چینی کا نشانہ بنیں گے۔ ہمیں ایک مسلح غنڈے کی بجائے اخلاقی پوزیشن اختیار کرنی چاہیے۔ بھارت نے ہمارا مقبوضہ علاقہ خالی کر دیا ہے ہم اپنے جنگی قیدیوں کو صرف بین الاقوامی دباؤ سے حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ بالکل حقیقت پسندی سے کام لے رہے تھے اور ان کے دلائل دل میں اتر جانے والے تھے۔ قطعی فیصلہ کرتے وقت انہوں نے سب کی باتیں نظر انداز کر دیں۔

ایک دن ہمیں حکم ملا کہ بنگالیوں کو رات کے وقت ریڈ کراس کے حوالے کر دیں۔ ہم نے یہ ڈیوٹی مذہبی فریضہ کے طور انجام دی۔ انہیں خدا حافظ کہتے وقت ہم میں سے بعض جذباتی ہو گئے لیکن میں نے کئی رفقائے کار اور دوستوں سمیت کسی ایک بنگالی کو جذباتی ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ سب اُداس، افسردہ اور خاموش تاہم خشمگیں چہروں کے ساتھ رخصت ہوئے۔ ان کی آنکھوں سے انتہائی نفرت اور غصہ ٹپک رہا تھا۔

سہالہ میں ہفتۂ پولیس

بھٹو نے اندرونی استحکام کے لیے پولیس کو مضبوط بنانے میں بڑی دلچسپی لی۔ مارچ 1973ء میں بعض منصوبوں کو قطعی شکل دینے کے لیے پولیس کالج سہالہ میں ہفتہ پولیس کا اہتمام کیا گیا۔ انسپکٹر جنرل صاحبزادہ رؤف علی نے مجھے ضروری انتظامات کرنے کی ہدایت کی۔ میں نے اصغر خاں، ایس پی لاہور کینٹ سے انتظامات میں مدد مانگی۔ انہوں نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ پی آئی اے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز

اپنے دوستوں کا تعاون حاصل کر کے انہوں نے شہانہ کالج کو خوبصورتی اور شان وشوکت کا اعلیٰ مرقع بنا دیا۔ بھٹو ان انتظامات کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے اور انہوں نے پولیس فاؤنڈیشن کے قیام کے لیے 50 ملین روپے کی خطیر گرانٹ کا اعلان کر دیا۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے بھٹو نے انتہائی اہم بین الاقوامی مسائل پر پالیسی بیان دیا۔ میرے ایک دوست اور رفیق کار وجاہت لطیف میرے برابر میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ بھٹو نے اس بیان کے لیے پولیس کے ادارہ کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ ٹھیک اسی مرحلہ پر بھٹو نے جن کی تقریر اس وقت جاری تھی' یہ کہہ کر سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ

''معزز حضرات' آپ اس بات پر یقیناً حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں ان مسائل کو آپ کے سامنے کیوں زیر بحث لا رہا ہوں۔ پولیس ملک کے اندرونی استحکام کے لیے سب سے اہم ادارہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ماضی میں پولیس کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے' جس کا نتیجہ پورے معاشرہ کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ کسی معاشرہ کی طاقت کا انحصار اس کے اندرونی استحکام پر ہوتا ہے۔ آپ مجھے امن و استحکام فراہم کریں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کوئی دباؤ قبول کیے بغیر پاکستان کو درپیش بین الاقوامی مشکلات سے نکال لوں گا۔''

ہم نے ان کی سوچ کی گہرائی اور موقع کے مطابق فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو سراہا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہر شخص نے اندرونی استحکام کے تصور کی اپنی پسند اور تجربہ کے مطابق تعبیر وتشریح کی۔ پولیس افسران کی ایک نسل استبدادی ماحول میں پروان چڑھی تھی وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ قیام امن کے لیے جبر و تشدد ہی واحد مجرب نسخہ ہے۔ انتظامیہ کے لیے قانون کی بالادستی اور انصاف و مساوات کے تصورات اجنبی بن گئے تھے۔ حاکمِ وقت کے حکم کو ہی قول فیصل سمجھا جاتا تھا۔

تمام حکمران' خواہ ان کی نیت نیک ہی کیوں نہ ہو' موقع سے دور ہونے' کسی معاملہ کے پس منظر کی بابت معلومات کے نہ رکھنے یا مقامی صورتِ حال کو سمجھنے میں غلطی کی بنا پر غلط احکام جاری کر سکتے ہیں جبکہ موقع پر موجود افسر حقائق اور قانون کی روشنی میں فیصلہ کرنے کی بہتر پوزیشن میں ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ دلیر و بے باک' صاحبِ علم ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے انصاف کا گہرا احساس وشعور عطا کیا ہو۔ زیادہ تر افسر شریف شہریوں کی مکمل شراکت کے ساتھ قانون نافذ کرنے کی بجائے طرزِ کہن کی پیروی کرنے میں ہی

عافیت سمجھتے ہیں۔ استبدادی اقدامات فوری اور نظر آنے والے نتائج تو پیدا کر سکتے ہیں لیکن اپنے پیچھے تلخی و کشیدگی کی طویل لہر چھوڑ جاتے ہیں۔

اس معاملے میں میرا ذہن بالکل صاف تھا کہ حقیقی استحکام قانون کی حکمرانی سے آتا ہے۔ تاہم بہت سے لوگ مجھ جیسوں کو خبطی سمجھتے تھے۔ میاں اسلم حیات نے جو بہت سینئر اور نیک نام پولیس افسر تھے' صوبہ سندھ کے آئی جی کی حیثیت سے قانون کی حکمرانی پر عمل کیا' جبکہ ایف ایس ایف کے سربراہ مسعود محمود جیسے لوگوں نے ایسے استبدادی ہتھکنڈے استعمال کیے جن کی قانون میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ برسراقتدار حکمرانوں' سیاست دانوں اور افسروں سمیت ہر شخص نے اپنی پسند کا استحکام لانے کے لیے اپنی ذہنی استعداد کے مطابق عمل کیا۔

ایف ایس ایف کی تشکیل

سعید احمد خان کی تجویز پر بھٹو نے امریکہ کے فیڈرل گارڈز اور بھارت کی سنٹرل ریزرو پولیس کی طرز پر فیڈرل سیکورٹی فورس (FSF) قائم کی تاکہ فوج کو بار بار طلب نہ کرنا پڑے اور اسے مارشل لا نافذ کرنے کی شہ نہ ملے۔ ایف ایس ایف کو ایک بدنام زمانہ اور برطرف شدہ پولیس افسر حق نواز ٹوانہ نے منظم کیا۔ اس کے بعد اسی طرح کے ایک دوسرے بدنام پولیس افسر مسعود محمود کو اس کی سربراہی سونپ دی گئی۔

ایف ایس ایف جب استعمال کے لیے تیار ہوگئی تو رفتہ رفتہ پولیس کو بائی پاس کر کے بھٹو کے لیے مسائل پیدا کرنے لگی۔ اس میں شک نہیں کہ پولیس مارشل لا کے نفاذ کی وجہ سے ہمیشہ قانون کی پیروی نہیں کرتی تھی تاہم اسے اب بھی قانون کی بالادستی کا کچھ نہ کچھ پاس تھا۔ اس کے برعکس ایف ایس ایف شروع سے ہی کسی قانون کو خاطر میں نہیں لاتی تھی اور قانون سے بالا ہو کر کام کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے بھٹو کی نجی فوج کا روپ اختیار کر لیا۔ ہم اکثر سنتے تھے کہ بھٹو کے مخالفین پر نامعلوم افراد نے تشدد کیا' ان پر فائرنگ کی اور ناحق ستایا۔ پہلے ایسے معاملات کے لیے زیادہ تر پولیس کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا تھا' لیکن اب بعض حلقے ایف ایس ایف کی طرف بھی انگلیاں اُٹھانے لگے۔

ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل حق نواز ٹوانہ نے خواہش ظاہر کی کہ راولپنڈی میں پٹرولنگ کی طرح کرائم ڈیوٹی بھی ایف ایس ایف کو سونپ دی جائے۔ میں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ میں ایف ایس ایف کے بغیر اپنا کام چلا سکتا تھا' لیکن وہ کم از کم دارالحکومت کی حد تک اپنی فورس کے لیے پولیس

کا کردار حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ اس فورس کا واحد قانونی رول یہ تھا کہ سول انتظامیہ کی مدد کرے نیز مقامی انتظامیہ کے ماتحت رہتے ہوئے فسادات اور ہنگاموں کو کنٹرول کرے۔

حق نواز کو میری مخالفت ناگوار گزری اور انہوں نے بھٹو سے میری شکایت کردی۔ مجھے صدر کو وضاحت سے بتانا پڑا کہ ضابطۂ فوجداری کے تحت پولیس کا کردار خاص حد تک محدود ہے۔ ایف ایس ایف قانونی پابندیوں کے بغیر شہریوں کے لیے خوف اور دہشت کی علامت بن سکتی ہے جو آخرِ کار خود صدر کی عدم مقبولیت پر منتج ہوگی۔ اگر ایف ایس ایف اپنے لیے کوئی کارآمد کردار تلاش نہیں کرسکتی تو بہتر ہوگا اسے صوبائی پولیس میں ضم کردیا جائے۔ بھٹو نے میری رائے سے وقتی طور پر اتفاق کرلیا جس سے ایف ایس ایف کے چیف بے حد خفا ہوئے۔ ایف ایس ایف بعض بدقماش و بدعنوان افسروں کے لیے مخصوص مفادات کے حصول کا ذریعہ بن گئی جو قانونی رول نہ ملنے پر غنڈہ گردی کے ذریعے اپنی اہمیت بڑھانے کی فکر میں تھے۔

اٹک سازش کیس

یہ 1973ء کا ذکر ہے۔ ایک دن انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر رات گئے میرے گھر آئے اور بتایا کہ انہیں ایک سازش کا پتہ چلا ہے جس میں فوج اور فضائیہ کے بعض اعلیٰ افسر ملوث ہیں۔ اس سازش کا مقصد راولپنڈی ریس کورس میں یومِ پاکستان کی پریڈ کے موقع پر صدر اور سینئر فوجی افسران کو قتل کرنا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایف آئی آر کا مسودہ بھی لائے تھے جو میں نے چھاؤنی پولیس سٹیشن کے ایس ایچ او شبیر احمد کو دے دیا تاکہ اس کی بنیاد پر مقدمہ درج کیا جاسکے۔

کیس کی تفتیش اور مقدمہ چلانے کا کام فوجی حکام نے خود سنبھال لیا۔ پولیس کو سازش میں ملوث صرف سویلین افراد کو گرفتار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ان میں سے بعض کا تعلق ضلع ہزارہ سے تھا۔ وہاں گرفتاریاں کرتے وقت ایس ایس پی وجاہت لطیف نے محسوس کیا کہ ایئر مارشل اصغر خاں کی تحریکِ استقلال کو بطورِ خاص نشانہ بنایا جارہا تھا۔ جس کا مجھے افسوس تو ہوا۔ تاہم سچ کو جھوٹ سے الگ کرنا میری ذمہ داری نہیں تھی۔

ضیاالحق کو جو اس وقت میجر جنرل تھے' اس ملٹری کورٹ کا سربراہ مقرر کیا گیا جس نے ملزمان کا کورٹ مارشل کرکے کڑی سزائیں دیں۔ بھٹو اس فیصلے سے بہت خوش ہوئے اور 1975ء میں ضیاء الحق کو

چیف آف آرمی سٹاف بناتے وقت اس کارکردگی کو بھی پیشِ نظر رکھا۔

امریکی سفیر کو فلسطینیوں کی دھمکی

اوائل 1973ء میں میاں انور علی ' ڈائریکٹر آئی بی نے اپنے دفتر میں ایک اجلاس بلایا جس میں مجھے اور سپیشل برانچ کے ایس پی افتخار کو بھی شریک ہونے کا حکم ملا۔ اس میٹنگ میں علی اصغر سیکرٹری داخلہ ' جنرل غلام جیلانی ڈی جی آئی ایس آئی نیز امریکی سی آئی اے کے نمائندہ نے بھی شرکت کی۔

افتخار اور میں پہنچے تو اجلاس کو شروع ہوئے خاصی دیر ہوگئی تھی۔ ڈائریکٹر آئی بی کو اس امر کی اطلاعات موصول ہوئی تھیں کہ فلسطینی تنظیم "بلیک ستمبر" نے امریکی سفیر متعین اسلام آباد کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اجلاس میں سفیر کو دی گئی دھمکی سے نمٹنے کے اقدامات پر غور و خوض کیا گیا۔

میں جونہی کمرے میں داخل ہوا ' میاں انور علی نے یہ قیاس کرتے ہوئے کہ مجھے پہلے سے معلومات حاصل ہوں گی (حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی) میری رائے دریافت کی۔ اس کے بعد یوگوسلاویہ میں ہمارے سفارت خانہ کی طرف سے موصول شدہ ایک ٹیلی پرنٹر پیغام میرے حوالے کیا جس میں سازش کی تفصیلات درج تھیں۔ میں نے اس پیغام کو احتیاط اور تنقیدی نقطۂ نظر سے دو تین بار پڑھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ اغوا کنندگان پاکستان روانہ ہونے سے پہلے اسی دن چار بجے بعد دوپہر انقرہ کے ایک کیفے ٹیریا میں ملاقات کرنے والے ہیں۔ میں نے پاکستان اور ترکی کے معیاری وقت میں فرق کا حساب لگایا تو پتہ چلا کہ اس وقت سازشیوں کے کیفے میں پہنچنے کے مقررہ وقت میں پانچ گھنٹے باقی تھے۔ میں نے میاں صاحب کو مشورہ دیا کہ فوری طور پر انقرہ میں ان کی نگرانی شروع کر دی جائے کیونکہ پاکستان میں جوابی اقدامات کرنے کے لیے ابھی خاصا وقت ہے۔

میں نے جونہی یہ تجویز پیش کی کہ کارروائی کا آغاز انقرہ سے کرنا چاہیے ' سی آئی اے کا نمائندہ ولف جس کے ساتھ میں ہنری کسنجر کے دورہ چین کے موقع پر کام کر چکا تھا ' اچانک اپنی کرسی سے اٹھا اور کہنے لگا۔ "سردار کی رائے زیادہ بہتر ہے۔ مجھے سب سے پہلے انقرہ سے رابطہ کرنے دو۔ خدا جانے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں سوجھی۔"

"براہ کرم ایک منٹ کے لیے رک جائیں۔" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ پیغام جھوٹی اطلاع پر مبنی لگتا ہے۔ جس کا مقصد ہماری توجہ دوسری طرف مبذول کرانا

ہوسکتا ہے کیونکہ اس کی ابتدا پی ایل او کے آدمی نے کی ہے۔ ممکن ہے کارروائی کسی اور ملک میں کرنی ہو۔"

ولف بولا۔ "شکریہ' ہمارے پاس افغانستان کے متعلق خبر موجود ہے۔" وہ یہ کہہ کر تیزی کے ساتھ اجلاس سے نکل گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے کہا کہ تخریب کاروں کے داخل ہونے کا پہلا مقام کراچی ایئرپورٹ ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ ان دنوں اسلام آباد میں بین الاقوامی ہوائی اڈہ نہیں تھا۔ سرحد پر واقع دوسری چیک پوسٹوں کو بھی الرٹ کر دینا چاہیے۔ چونکہ سازشی پاکستان کے شہری نہیں ہیں اس لیے انہیں بآسانی شناخت کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک راولپنڈی اور اسلام آباد کا تعلق ہے۔ افتخار اور میں مناسب انتظام کرلیں گے۔ بشرطیکہ ہمیں اس بارے میں تازہ ترین رپورٹ مہیا کردی جائے۔ میں نے امریکی سفیر نیز چند ملکوں کے اہم سفارت کاروں کی حفاظت کے لیے جو اسی طرح کے خطرہ سے دوچار ہوسکتے تھے' ضروری اقدامات کردیئے۔

ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو نے چوہدری فضل حق کو جو ایک سینئر پولیس افسر تھے' اس آپریشن کا انچارج بنایا۔ چوہدری افتخار اور میں نے سیکورٹی کے جامع انتظامات کیے جبکہ چوہدری فضل حق نے میٹنگیں منعقد کرنے اور روزمرہ احکام وتعیناتیوں کی ایک موٹی سی فائل تیار کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اس میں سیکورٹی کی ان خامیوں کی فہرست بھی شامل تھی جو چوہدری افتخار اور میری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھیں۔ جنہیں وہ اس صورت میں ہمارے خلاف استعمال کرسکتے تھے جب کوئی غلط کام ہوجاتا اور انہیں اپنی کھال بچانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اسلام آباد میں تو ہر طرح خیریت رہی' البتہ تھائی لینڈ میں متعین امریکی سفیر کو بنکاک سے اغوا کرلیا گیا۔

تھوڑے ہی دنوں بعد چوہدری فضل حق کو سندھ کا آئی جی بنادیا گیا۔ میں انہیں مبارکباد دینے گیا تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ اس موقع پر میں ان سے یہ دریافت کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ اغوا کی دھمکی سے متعلق فائل کے بارے میں اس قدر محتاط کیوں تھے۔ چوہدری صاحب نے بتایا کہ انہوں نے طویل تجربہ سے ایسی احتیاطی تدابیر سیکھی ہیں۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ایسے معاملات میں ہمیشہ اپنا دفاع پیش نظر رکھنا چاہیے۔

ان کا مشورہ اس حد تک درست تھا کہ سینئر ایڈمنسٹریٹر اپنے ماتحتوں کو ہمیشہ دفاعی پوزیشن میں رکھتے ہیں تاکہ وہ بلاچون وچرا اطاعت کرتے رہیں۔ خواہ یہ چیز ان کے پہل کرنے کے عزم اور جذبہ عمل کو

تباہ کردے۔ لیکن میں نے ان کے "سنہری" مشورہ پر کبھی عمل نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ سچائی' خلوص' دیانتداری' قوتِ تحریک اور انصاف و کھرے پن کا گہرا احساس ہوتا ہے جو کسی تنظیم کی کارکردگی کو بہتر بناتا ہے۔ اس سے ہمیشہ کامیابی اور نیک نامی حاصل ہوتی ہے خواہ حکام بالا کو وقتی طور پر ناگوار کیوں نہ گزرے۔ بھٹو اور مصطفیٰ کھر ہمارے کام میں کم سے کم مداخلت کرتے تھے۔ لیکن فضل حق جیسے چالاک افسر اپنے ذاتی خوف اور ڈر کے مارے دفاع کے تانے بانے بنتے رہتے تھے۔

سفارت خانوں کے لیے سیکورٹی

"بلیک ستمبر" کی دھمکی نے پولیس فورس پر ذمہ داریوں کا ناقابلِ برداشت بوجھ ڈال دیا۔ ہر غیر ملکی مشن پولیس گارڈز مہیا کرنے کا تقاضا کرنے لگا۔ فارن آفس کے چیف پروٹوکول آفیسر ہر وقت میرے پیچھے پڑے رہتے کہ پولیس مہیا کرو۔ میں نے مسئلہ کا اچھی طرح ادراک کرنے کے بعد حکومت پنجاب کو بہت پہلے نفری کی تعداد میں اضافہ' عمارت' ٹرانسپورٹ' مواصلات' ساز و سامان' ہتھیار اور گولہ بارود کے بارے میں ایک اسکیم بھیجی تھی جسے محکمہ مالیات نے فنڈز کی نایابی کا بہانہ بنا کر مسترد کر دیا تھا۔ انہوں نے معاملہ کی سنگینی اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی پولیس کی ضروریات پر صحیح طریقے سے غور نہیں کیا تھا۔ اس وقت ضلع راولپنڈی کی پولیس کا قریباً 1/5 حصہ جنگی قیدیوں کے طور پر بھارت میں تھا۔ اس لیے میں سفارت خانوں کی حفاظت کے لیے ایک بھی سپاہی فراہم نہیں کر سکتا تھا۔

فارن آفس ایک سنگین سفارتی بحران سے دوچار تھا۔ علی ارشد اکثر کہتے تھے۔ "آپ جس قدر چاہیں سرمایہ لے لیں۔ لیکن ہمیں پولیس گارڈ فراہم کریں۔" انہوں نے کمشنر بندیال سے بھی درخواست کی۔ انہوں نے فنانس سیکرٹری اور بعد ازاں چیف سیکرٹری سے بات کی لیکن نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات رہا۔ جب علی ارشد نے مجھ سے بار بار درخواست کی اور سرمایہ فراہم کرنے کی پیشکش کی تو میں تنگ آ گیا اور انہیں جواب دیا کہ:

"براہ کرم سفارت خانوں کے دروازوں پر دولت کے ڈھیر لگا دیں اور ان سے کہیں کہ اپنی سیکورٹی کا انتظام خود کر لیں۔ پولیس گارڈ مہیا کرنا اس قدر آسان نہیں ہے۔ گارڈ مقررہ طریق کار کے تحت ایک خاص مدت میں بھرتی کیے جا سکتے ہیں اور حکومت سے اس سارے پیکج کی منظوری لینا ہوتی ہے۔" آخر

کاروہ معاملہ صدر کے پاس پہنچا۔ انہوں نے اس غرض کے لیے ایک میٹنگ بلانے کا ارادہ ظاہر کیا اور ایم ایچ صوفی کیبنٹ سیکرٹری کو ابتدائی اجلاس منعقد کرنے کی ہدایت کی۔ میں پوری طرح تیار ہو کر گیا۔

ان دنوں اے حمید میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ انڈیا میں پولیس کی بغاوت پر تحقیق کر رہے تھے جس کی بنیاد بھارتی اخبارات میں شائع شدہ مواد پر تھی (مزید تفصیل باب نمبر 50 میں دیکھیئے) صوفی صاحب کی میٹنگ میں جانے سے پہلے انہوں نے مجھے انڈیا کے مشہور اخبار ''سٹیٹس مین'' کا ایک شمارہ دیا جس میں نئی دہلی میں واقع سفارت خانوں کی سیکورٹی سے متعلق مسائل پر ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ سفارت خانوں کی گارڈ ڈیوٹی پر 3500 پولیس والے تعینات تھے جبکہ پورے شہر کو محض اس لیے غنڈوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا کہ نہرو جیسا صاحب فراست آدمی بھی دارالحکومت کے سیکورٹی مسائل کا قبل از وقت ادراک نہیں کر سکا۔

میں نے وہ مقالہ صوفی صاحب کو دے دیا۔ انہوں نے اس کا مطالعہ کیا اور بات سمجھ گئے۔ اگر نئی دہلی میں جو کہ کئی عشروں سے دارالحکومت چلا آ رہا ہے' سیکورٹی کا مسئلہ موجود ہے۔ تو اسلام آباد کی صورتِ حال جو نیا نیا دارالحکومت بنا ہے' اس سے کہیں بدتر ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

اس کے بعد انہوں نے بھٹو سے بات کی اور مذکورہ بالا مضمون بھی دکھایا۔

بھٹو نے گورنر پنجاب مصطفیٰ کھر کو اس موضوع پر میٹنگ کرنے کی ہدایت کی۔ کھر چیف سیکرٹری اور آئی جی کو ساتھ لے کر راولپنڈی آئے اور تفصیلی بریفنگ کے بعد میری طرف سے پیش کردہ سارے منصوبوں کی وہیں اور اسی وقت منظوری دے دی اور اسی دن نوٹیفکیشن جاری کر دیا گیا جس کی رو سے اسلام آباد میں جداگانہ پولیس ڈسٹرکٹ کا قیام عمل میں آیا جسے مطلوبہ نفری اور وسائل مہیا کر دیئے گئے۔ یہ وہی پلان تھا جسے بعض تبدیلیوں کے ساتھ اسلام آباد کے موجودہ پولیس سیٹ اپ کے لیے لائحہ عمل قرار دیا گیا اور ایک نئے آئی جی کو اس کی سربراہی سونپ دی گئی۔

میں نے کم سے کم وقت میں سیکورٹی کے مسئلہ سے نمٹنے کے لیے صرف ریٹائرڈ فوجی بھرتی کیے جنہیں محض 15 دن کی تربیت دی گئی۔ اپنی اسکیم کی منظوری کے بعد میں فقط تین ہفتوں کے اندر بہت ہی مستعد اور تربیت یافتہ گارڈ مہیا کرنے کے قابل ہو گیا۔ صاحبزادہ رؤف علی (آئی جی) گارڈز کا معائنہ

کر کے بے حد خوش ہوئے۔ اچھی انتظامیہ کو درپیش مسائل حل کرنے کے لیے ضروری غور و فکر اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکمرانوں کو محض خواہشات نہیں پالنی چاہئیں اور اگر ان کی خواہشات پوری نہ ہوں تو ماتحتوں کی سرزنش نہیں کرنی چاہیے۔

راولپنڈی میں جرائم کی صورت حال

ڈسٹرکٹ پولیس کی نفری بہت تھوڑی تھی اور اسے بھی اکثر اوقات امن وامان سے متعلق فرائض انجام دینے پڑتے تھے۔ امن وامان کے مسئلہ سے اپنے انداز میں نمٹنے کے بعد میں نے مجرموں کے قلع قمع کے لیے ایک بھرپور حملہ کی غرض سے پولیس فورس کی قوت کو مجتمع کیا۔ پھر میں نے پولیس کی جنرل پریڈ سے خطاب کیا اور انہیں اپنی پالیسی کے رہنما خطوط سے روشناس کرایا۔ جس کا مرکزی نکتہ انتظامیہ اور عوام کے ساتھ اوپن ڈور قریبی رابطہ تھا۔ پولیس کو لوگوں کے تعاون اور مشورہ سے ان کی جان' مال اور آبرو کی حفاظت کو یقینی بنانا چاہیے۔ قیام امن وامان کا مسئلہ کبھی خلا میں حل نہیں ہوا۔ جمہوری نظام میں لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر چلنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ میں نے پولیس والوں سے کہا۔ ''آپ لوگ مارشل لا کے تحت سیاسی عناصر کے خلاف لڑتے رہے ہیں' لیکن اب آپ کو صرف بدمعاشوں کے خلاف جہاد کرنا ہوگا۔''

میں نے پولیس افسران کے بہت سے اجلاس بلائے اور انہیں رہنما خطوط دیئے۔ ضلعی انتظامیہ نے حاجی اکرم کی سربراہی میں ہمارے ساتھ مکمل تعاون کیا۔ میں نے جرائم کے خلاف جدوجہد میں عوام کا تعاون حاصل کرنے کے لیے دیہات میں ایریا کمیٹیاں اور شہر میں محلہ کمیٹیاں تشکیل دیں۔ اس مقصد کے لیے وکیلوں' علمائے دین' محنت کشوں' طالب علموں اور مخصوص مفادات والے دیگر گروپوں کی کمیٹیاں بھی قائم کی گئیں۔

پولیس کو ہر جگہ عوام کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاروباری مراکز جیب کتروں' بٹوے چھیننے والوں اور دھوکے بازوں کے لیے موجب کشش ہوتے ہیں۔ ایک گاؤں یا محلہ میں کسی وقت بھی باہمی عداوت کا کوئی واقعہ رونما ہوسکتا ہے۔ ویران سڑک پر مسلح ڈاکو اپنی اجارہ داری قائم کر لیتے ہیں۔ بینکوں' مالیاتی اداروں اور بڑی کارپوریشنوں کو فزیکل سیکورٹی درکار ہوتی ہے۔ ہماری طرف سے پہل کرنے پر لوگوں نے ہر جگہ پولیس سے تعاون شروع کر دیا تاکہ جرائم کی روک تھام اور ان پر کنٹرول کیا

جا سکے۔ یہاں تک کہ مخصوص مفادات رکھنے والے گروپ بھی رضا کارانہ طور پر ہمارے ساتھ کام کرنے لگے کیونکہ اس سے ان کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے معمول کے مشغلہ کو، یعنی کسی نہ کسی مسئلے پر احتجاج کرنا، بھول گئے۔

اس طرح میں نے امن وامان کی صورتِ حال کو بہتر بنایا۔ امن عامہ قانون کا احترام کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ اگر کوئی معاشرہ قانون پر عمل کرتا ہے یا اس سے قانون کی پابندی کرائی جاتی ہے تو اس میں امن قائم ہو جاتا ہے۔ وہ محض جبر کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے قانون اور امن (Law and Order) کہا جاتا ہے۔ میں نے انتظامیہ، پولیس اور شریف شہریوں پر زور دیا کہ بدمعاشوں کے خلاف مل کر جہاد کریں، جس کے نتائج بڑے حوصلہ افزا نکلے۔

میں اپنے ماتحتوں سے دیگر موضوعات پر بھی بات چیت کرتا رہتا تھا۔ میں نے ان سے یہ بات منوالی کہ تفتیش کے دوران شہادت میں غیر ضروری باتوں کو شامل کرنا، بے گناہ افراد کے نام ہتھیار یا منشیات کی برآمدگی ڈالنا اور اعداد و شمار کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا جرائم پر قابو پانے یا لوگوں اور عدالتوں سے احترام کرانے کی تدابیر نہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ "آیئے ہم سچ کو اپنائیں اور سچائی کا سامنا کریں۔"

اس قسم کی تحریک وترغیب کے نتیجہ میں پولیس والوں نے خود کو بہتر ثابت کرنا اور بدقماش عناصر کے خلاف جوش وخروش سے لڑنا شروع کر دیا۔ پنڈورا (راولپنڈی) کا ایک بدنام غنڈہ مرتضٰی قتل کی 17 اور ڈاکہ زنی کی ان گنت وارداتوں کے بعد اس علاقہ کے لیے خوف و دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ ایک پولیس مقابلہ میں اس نے دو کانسٹیبلوں پر فائرنگ کر کے زخمی کر دیا لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری یہاں تک کہ وہ مارا گیا۔ لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ ان بہادر سپاہیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک بڑا جلوس نکالا گیا۔ اگلے دن ایک بڑھیا میرے دفتر میں آئی اور آنکھوں میں تشکر کے آنسوؤں کے ساتھ گلدستہ پیش کیا۔ اس کا اکلوتا بیٹا جو نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ تین سال پیشتر دن دہاڑے مرتضٰی کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے وہ سانحہ دیکھا تھا لیکن کوئی بھی مرتضٰی کے خلاف گواہ بننے کی جرأت نہیں کر سکا۔ وہ اس بات پر خوش تھی کہ اس کے بیٹے کے قاتل سے انتقام لے لیا گیا ہے اس کی باتوں سے مجھے خاصا سکون واطمینان حاصل ہوا۔

تین بدنام ڈاکو بھی جو کئی قتل کر چکے تھے کوکا کولا فیکٹری کے نزدیک ایک اور پولیس مقابلہ میں

مارے گئے اور ان کے دو ساتھی شدید زخمی ہو گئے۔ ان زخمیوں سے پوچھ گچھ کی گئی تو 234 ڈکیتیوں اور قتل کی سات وارداتوں کا سراغ ملا جن کا ارتکاب ان کے گروپ نے کیا تھا۔ وہ بعض اوقات ڈاکے کے دوران زنا بالجبر کے مرتکب بھی ہوئے۔ وہ سات قتل محض جہالت و نادانی کا نتیجہ تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے پولیس مقابلے ہوئے۔ پولیس پوری طرح متحرک تھی اور بدمعاشوں پر اس طرح جھپٹتی تھی جیسے عقاب چڑیا پر۔ انتظامیہ اور لوگوں نے ان تمام کارروائیوں میں ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور ہماری مدد کی۔

اگر میں قیوم خان (وزیرِ داخلہ) جیسے لوگوں کی خواہشات کے مطابق سختی کرتا تو خود کو عوام کے خلاف لڑائی میں الجھا لیتا اور بدمعاشوں کا تعاقب کرنے کے لیے کوئی وقت بچتا نہ توانائی باقی رہتی۔

حکومت قوانین اور قواعد و ضوابط کے ذریعے کام چلاتی ہے۔ ملک کا قانون برتری کا حامل ہوتا ہے حکامِ بالا کی خواہشات نہیں۔ کسی وزیر، وزیر اعلیٰ یا وزیر اعظم کی طرف سے عملی احکام جاری کرنے کا رواج مارشل لا کا ورثہ ہے۔ موقع پر موجود افسروں کو اس قدر حوصلہ رکھنے کی اجازت ہونی چاہیے کہ فوری اور ضروری فیصلے کر سکیں۔ اچھی حکومت میں اس قدر ظرف اور فراخ دلی بھی ہونی چاہیے کہ کبھی کبھار ان کے غلط فیصلوں کو نظر انداز کر سکے۔ تربیت سے ایسی غلطیوں کی تعداد یقیناً گھٹ جاتی ہے۔

اگر پولیس کو سیاست کی دلدل میں دھنسا دیا جائے تو صورتِ حال بد سے بدتر ہو جاتی ہے۔ حکمرانوں کا غیر دانشمندانہ رویہ افسروں کو خوفزدہ کر دیتا ہے اور وہ خطرات قبول نہیں کرتے۔ آخرِ کار وہ آزادانہ فیصلے کرنے کی صلاحت سے محروم ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ سینئر حکام کے اشارۂ ابرو کے منتظر رہتے ہیں۔ سینئرز کے حکم پر سخت کاروائی کسی ملازم کا تبادلہ رکوا سکتی ہے یا روزگار بچا سکتی ہے، لیکن وہ لوگوں میں تلخی کا اس قدر زہر گھول دیتی ہے کہ چیف ایگزیکٹو کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ میں نے حکومتوں کو اس وجہ سے ختم ہوتے دیکھا ہے کہ انہوں نے اپنے احکام کی تعمیل کو غیر ضروری طور پر یقینی بنانے کی کوشش کی۔

یونس ڈاکو کی کہانی

جنرل ٹکا خان مجھے اکثر ملامت کرتے تھے کہ ان کے علاقہ میں یونس ڈاکو کھلے بندوں گھومتا پھرتا اور پولیس کی نالائقی کے باعث بچ نکلتا ہے۔

''ہم اسے جلد ہی قابو کر لیں گے''۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا

ایک بار ائر پورٹ پر انہوں نے کہا ''اگر آپ اسے نہیں پکڑ سکتے تو میں فوج کو حکم دوں؟'' جنرل ٹکا خان کی طرف سے دباؤ ڈالنے کا انداز مجھے ناگوار گزرا اس لیے مجھے کہنا پڑا کہ:

''سر! یونس کو آپ ہی نے بحیثیت مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اس کی غیر حاضری میں پانچ سال قید کی سزا دی تھی۔ غیر حاضری میں اس لیے کہ فوجی حکومت اسے گرفتار نہیں کر سکی تھی۔ آپ کے آدمی پہلے ہی ناکام ہو چکے ہیں۔ اس لیے مجھے یہ کام کرنے کا موقع دیں،' یہ کہہ کر میں نے چیلنج قبول کر لیا۔ اگرچہ مجھے جنرل صاحب کے ساتھ گستاخی سے پیش آنے پر افسوس بھی ہوا۔

یونس فوج میں ملازم رہ چکا تھا۔ وہ ایک دلیر اور اچھی طرح تربیت یافتہ شخص تھا۔ اس نے کہوٹہ (راولپنڈی) کے پہاڑی علاقہ میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ وہ اپنے کئی دشمنوں کو قتل کر چکا تھا اور ڈکیتیوں کا ارتکاب آئے دن کا معمول بن گیا تھا۔ وہ اپنے علاقہ میں ٹھیکیداروں سے بھتہ لیے بغیر کوئی تعمیراتی کام نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس نے ایک خوفناک گروہ بنا لیا تھا۔ میری ہدایت پر پولیس نے ایک ڈی ایس پی کے ماتحت علاقہ کی ناکہ بندی کی تو اس نے کہوٹہ پولیس سٹیشن پر حملہ کر دیا۔ بعدازاں راولپنڈی شہر سے ایس ایچ او کے بیٹے کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔ تاہم ایک باوردی سپاہی کے اتفاقیہ آ جانے سے بھاگ گیا۔ کوئی بھی شخص اس کے اتا پتہ کی بابت معلومات فراہم کرنے کے لیے آگے نہیں آ رہا تھا۔ ہمارے آپریشن کے دوران اس نے شاہراہ پر ایک رات میں سات ڈاکے مارے۔ یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ جس میں ہمیں کوئی کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

آخرِ کار اس کے علاقہ کا ایک سپاہی نصیر اس کی گرفتاری میں مدد دینے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ ایک خوبصورت، صحت مند، دلیر اور ایف اے تک تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ اسے سرکاری ریکارڈ میں بھگوڑا ظاہر کیا جائے۔ اس طرح اسے یونس کے گروہ میں شامل ہونے کا معقول بہانہ مل جائے گا۔ پھر وہ اس کا اتا پتہ اور نقل و حرکت معلوم کر کے ہمیں مطلع کر دے گا۔ میں نے اس کی تجویز منظور کر لی۔

نصیر نے یونس کے گینگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ وہ مجھے گاہ بگاہ اس کی نقل و حرکت سے مطلع کرتا رہتا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے دیر ہو جاتی تھی۔ 5 جنوری 1973ء کو رات گیارہ بجے نصیر نے میرے گھر آ کر مجھے بتایا کہ یونس ڈھوک چراغ دین کے ایک مکان میں رہتا ہے اور اس وقت وہاں موجود ہے۔ میں نے راولپنڈی چھاؤنی کے ڈی ایس پی چوہدری معین الدین کو بلایا اور اسے یونس کے ٹھکانہ پر چھاپہ مار کر گرفتار کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ اس نے آدھی رات کو علاقہ کا سروے کرنے کے بعد مجھے رپورٹ دی۔ ہم نے 12 جوانوں کا انتخاب کیا جو سادہ کپڑوں میں سٹین گنوں سے لیس تھے۔ استعمال کے لیے آنسو گیس اور دوسرا ساز و سامان بھی لے لیا گیا جبکہ بیرونی حلقہ کے لیے دو باوردی ریزرو ضروری ہتھیار اور سامان سے

لیس کر کے ساتھ روانہ کر دیئے گئے۔ اندرونی حلقہ کی کمان معین کے ہاتھ میں تھی اور بیرونی کا کمانڈر انسپکٹر بندے علی شاہ تھا۔ میں نے اس آپریشن کی موقع پر خودنگرانی کی۔ طلوعِ صبح سے پہلے سادہ کپڑوں میں ملبوس دستہ نے علاقے کا گھیراؤ کرلیا اور باوردی دستہ قریب ہی اینٹوں کے بھٹہ میں چھپ گیا۔ ہم نے بہانہ بنایا کہ سادہ کپڑوں والے بیوپاری ہیں جو مقامی لوگوں سے بھینسیں خریدنے آئے ہیں۔

جب جوانوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں تو معین نے نصیر کو آگے بھیجا تاکہ دیکھ کر سکے آیا یونس اپنے مکان میں موجود ہے یا نہیں؟ یونس اور اس کا ساتھی ضیا وہاں موجود تھے۔ انہوں نے ہمارے جوانوں کی غیر معمولی نقل وحرکت دیکھ لی تھی اور نصیر کے بقول انہیں شک ہوگیا تھا۔ اِدھر نصیر کوئی بہانہ بنا کر باہر نکلا اُدھر معین دو سپاہیوں کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہوگیا۔ انہوں نے یونس سے سرنڈر کرنے کو کہا تو جواب میں گرنیڈ پھینکا گیا۔ اس کے بعد کئی اور گرنیڈ پھینکے گئے۔ معین اور سپاہی بڑی مشکل سے باہر نکلے۔ اس کے بعد دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہوگئی۔

یونس اور ضیا اچانک مکان کی چھت پر چڑھ گئے جس کے گرد ایک میٹر اونچی حفاظتی دیوار تھی۔ وہاں پوزیشنیں لے کر انہوں نے فائر کھول دیا اور چاروں طرف گرنیڈ پھینکنے لگے۔ پولیس کے جوان بھی مکان کے اردگرد اور اس کے آس پاس کی اونچی عمارتوں پر پوزیشنیں لے کر جوابی فائرنگ کر رہے تھے۔ نصیر نے مجھ سے چینی رائفل لے لی اور قریبی مسجد کے مینار سے لڑائی میں حصہ لینے لگا۔ تین گھنٹے تک زبردست مقابلہ ہوا۔ چاروں طرف گولیاں چلتی نظر آئیں۔ پولیس اور بدمعاشوں کے مابین سچ مچ کی لڑائی دیکھنے کے لیے لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ مجھے اس بات کا انتظام کرنا پڑا کہ لوگوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ اے ایس آئی علی اکبر اور ہیڈ کانسٹیبل محمد امیر گرنیڈ کے ٹکڑے لگنے سے شدید زخمی ہوگئے تھے۔ انہیں ڈسٹرکٹ ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈپٹی کمشنر حاجی اکرم ان کا خیال رکھنے کے لیے ذاتی طور پر ہسپتال میں موجود تھے۔ زخمیوں کو خون دینے کے لیے بہت سے افراد وہاں پہنچ گئے۔

آخر کار وہ مقابلہ اس وقت شاندار کامیابی سے ہمکنار ہوا جب دونوں ڈاکو مارے گئے۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر، نعرے لگا کر اور کلمہ ہائے تحسین کا اظہار کر کے ہمیں داد دی۔ تلاشی لینے پر یونس کی بیٹی مکان میں چھپی ہوئی پائی گئی۔ میں نے اسے فوری طور پر گاؤں بھجوا دیا۔ حفاظت کے لیے زنانہ پولیس ساتھ کر دی۔

میں نے نصیر کو فوراً اے ایس آئی پروموٹ کر دیا۔ اس کے علاوہ دونوں زخمیوں کو بھی ترقیاں دی گئیں۔ علی اکبر کی ایک ٹانگ کاٹنی پڑی۔ جنرل ٹکا خان ہماری کارروائی سے بے حد خوش ہوئے اور علی اکبر

کے لیے مصنوعی ٹانگ کا انتظام کرادیا جو بطور خاص جرمنی سے درآمد کی گئی تھی۔ وہ اس قدر عمدہ تھی کہ علی اکبر آج کل بھی اسی طرح چلتا پھرتا ہے جیسے اس کی ٹانگ اصلی ہو۔ وہ ابھی تک ملازمت میں ہے اور ترقی کر کے ڈی ایس پی بن گیا ہے۔ چوہدری معین' ملک علی اکبر' محمد امیر اور راجہ نصیر احمد کو بہادری کے تمغے دیئے گئے۔ میں جنرل ٹکا خان کی نظروں میں سرخرو ہوگیا۔

نصیر بہت اچھا افسر ثابت ہوا اور ترقی کے مراحل طے کرتا ہوا انسپکٹر کے عہدہ تک پہنچا۔ 1993ء میں وہ ضلع چکوال میں تعینات تھا جہاں اس نے بدمعاشوں کے ساتھ ایک زبردست مقابلہ میں شہادت پائی۔ مجھے اس کی شہادت کا بے حد دکھ ہوا۔ میں اس دلیر نوجوان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے کہوٹہ گیا اور اس کے خاندان سے اظہارِ تعزیت کیا۔ اس کے پسماندگان میں بوڑھی ماں' بیوہ اور چار نوعمر بیٹے شامل تھے۔ پنجاب پولیس ایک قیمتی افسر سے محروم ہوگئی۔

اے حمید جو یونس کے ساتھ مذکورہ مقابلہ کے چند دن بعد لاہور سے آئے تھے وہ کہانی سن کر بے حد متاثر ہوئے۔ جب انہوں نے میری توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ اس مقابلہ کو فلمایا جانا چاہیئے تو مجھے بڑا افسوس ہوا کہ ٹیلی ویژن والوں کو کیوں نہیں بلایا۔ میں اطلاع کر دیتا تو وہاں سے فوراً ایک ٹیم آجاتی اور ایک شاندار زندہ ڈراما ریکارڈ کر لیتی۔ دراصل میں ان دنوں اس قدر مصروف تھا کہ اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ نہ ہی موقع پر موجود کسی شخص نے اس طرف توجہ دلائی۔

اے حمید نے اس واقعہ پر ایک کتاب لکھنے کے لیے گہرائی میں جانے اور زیادہ سے زیادہ مواد اکٹھا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ تمام متعلقہ مقامات پر گئے اور ایسے ہر شخص کا انٹرویو لیا جو اس واقعہ کی بابت کچھ جانتا تھا۔ ان میں یونس کے گھر والے بھی شامل تھے۔ قریباً 40 گھنٹے کے انٹرویو ریکارڈ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کہانی میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جن سے ایک دلچسپ غیر افسانوی ناول لکھا جاسکتا ہے۔ نیز اس کی بنیاد پر ایک مقبول عام کمرشل فیچر فلم بنائی جاسکتی ہے۔

اے حمید برسوں تک اس کام کے لیے وقت نہیں نکال سکے آخر میں انہوں نے زیادہ مشقت اور وقت کے ضیاع سے بچنے کے لیے مذکورہ کتاب کمپیوٹر پر لکھنے اور ایڈٹ کرنے کا پروگرام بنایا۔ لگتا ہے کہ اب ان کے منصوبے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔



باب13

معرکۂ روح و بدن

میں ستمبر 1973ء کے پہلے ہفتہ میں ایک نجی کام سے بذریعہ سڑک راولپنڈی سے روانہ ہوا۔ لاہور پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ شہر محاصرے کی حالت میں لگتا تھا کیونکہ میں نے ہر چوک میں پولیس کے بڑے بڑے دستے دیکھے۔ میرے اپنی سسرال پہنچنے سے پہلے آئی جی پنجاب کی طرف سے وہاں ٹیلی فون پر کئی کالیں اور یہ ارجنٹ پیغام موصول ہو چکا تھا کہ میں پہنچتے ہی ان سے ملوں۔ میں لیک کران کی رہائش گاہ پر پہنچا تو انہیں اپنا منتظر پایا۔

''کیا آپ نے سڑک کے چوراہوں پر متعین پولیس دیکھی؟''

انہوں نے سوال کیا

''یس سر'' میں نے جواب دیا

''آپ کو کیسا لگا؟''

''مجھے یہ سب کچھ قطعاً اچھا نہیں لگا۔ یہ لوگوں کو اشتعال دلانے والی بات اور افرادی قوت کا ضیاع لگتا ہے۔ اگر ایمر جنسی کے بغیر سڑک کے ہر چوراہے میں پولیس کے سپاہی کھڑے کرنے پڑیں تو اسے نگرانی کا بڑا ناقص انتظام سمجھا جاتا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا ہے۔'' میں نے تفصیل سے بتایا۔

انہیں میرا تبصرہ ناگوار گزرا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ سب کچھ ان کے ذاتی احکام کے تحت کیا گیا تھا۔ میرے علم میں یہ بھی نہیں تھا کہ وہ مجھے لاہور کا ایس ایس پی بنانے کی سوچ رہے تھے۔ جرائم کی صورتِ حال کنٹرول سے باہر ہو چکی تھی اور شہر میں اکثر دن کے وقت ڈاکے کی دلیرانہ وارداتیں ہوتی تھیں۔ پولیس کی بھاری نفری متعین کرنے اور اس کی نمایاں موجودگی کا قدم پولیس کی کارکردگی پر عوام کا اعتماد بحال کرنے کے لیے اٹھایا گیا تھا۔ آئی جی کے نقطۂ نظر سے اختلاف کے باوجود مجھے چند دن بعد

لاہور کا ایس ایس پی بنا دیا گیا۔

راولپنڈی سے میرے تبادلہ پر جماعتِ اسلامی، صحافیوں، بار ایسوسی ایشن، چیمبر آف کامرس و انڈسٹری، نیز طلبا اور لیبر یونین کی طرف سے میرے اعزاز میں الوداعی ضیافتیں دی گئیں۔ ان کے علاوہ بہت سے دعوت نامے موصول ہوئے اور مجھے وقت کی کمی کے باعث معذرت کرنی پڑی۔ اپوزیشن کی طرف سے دی گئی دعوتوں میں میری شرکت نے ڈی ایس پی وارث کو پریشان کر دیا۔ انہیں یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں یہ چیز کھریا بھٹو کی خفگی کا سبب نہ بن جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، میں محض حکمران جماعت کے لیے نہیں بلکہ ہر شخص کے لیے ایس ایس پی ہوں۔ مصطفیٰ کھریا بھٹو نے اس کی قطعاً پرواہ نہیں حالانکہ وہ تنظیمیں مجھے ایک بڑے جلوس کی شکل میں ضلع راولپنڈی کی سرحد تک خدا حافظ کہنے آئیں۔ یہ وارث جیسے سرکاری ملازمین کے اعصاب پر سوار غیر ضروری خوف ہوتا ہے جو انہیں راہ راست پر چلنے سے روکتا ہے۔

ہراساں اپوزیشن

میری طرف سے ایس ایس پی لاہور کا چارج سنبھالنے کے بعد جلد ہی نوابزادہ نصر اللہ خاں اور مولانا مفتی محمود کے نمائندوں نے مجھ سے الگ الگ ملاقات کر کے ان کا یہ پیغام پہنچایا کہ ان کے کارکنوں کو پی پی پی کے غنڈوں کی زیادتیوں سے بچایا جائے کیونکہ شہر کے تھانوں کو وہی لوگ چلا رہے تھے۔ وہ مجھ سے کسی رعایت کے خواہاں نہیں تھے، محض پولیس کی غیر جانبداری اور منصفانہ سلوک کی یقین دہانی چاہتے تھے جیسا کہ میں نے راولپنڈی میں کیا تھا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ قانون شکنی کرنے والوں کے خلاف کارروائی میرا فرض ہے۔ اس سلسلے میں کسی کی سیاسی وابستگی کا قطعاً لحاظ نہیں کیا جائے گا۔

انہوں نے اسے معمول کی یقین دہانی سمجھا، جبکہ میں نے حقیقتاً بدمعاشوں کے خلاف سخت کارروائی کا تہیہ کر لیا تھا۔ میں اس سے پہلے لاہور میں اسسٹنٹ ایس پی اور ایڈیشنل ایس پی کے طور پر کام کر چکا تھا اور شہر میں جرائم اور بدمعاشوں کے متعلق خاصی معلومات رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر مشہور بدمعاشوں کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ بعض اوقات میرے افسر میرے پاس آتے، ملزمان میں سے بعض کے سیاسی تعلقات کی بابت چپکے سے بتا جاتے۔ لیکن ان کے لیے میری

ہدایات یہی تھیں کہ کارروائی صرف حقائق اور میرٹ کی بنیاد پر کی جائے۔

میں اکثر اجلاس بلاتا اور افسروں پر زور دیتا کہ خطرناک بدمعاشوں کا قومی فرض سمجھ کر خاتمہ کر دیں۔ فورس کو بدقماش افراد اور غنڈوں کے خلاف بے باکی سے لڑنے کی ترغیب دی گئی' بہت سے مقابلے ہوئے جن میں پولیس کے متعدد بہادر افسر اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ تاہم محض دو مہینے کی قلیل مدت میں بدمعاشوں کا ناطقہ بند کر دیا گیا۔ گورنر کھر نے مجھے کسی کو معاف کرنے کے لیے نہیں کہا۔

لاہور میں چارج لینے کے قریباً تین مہینے بعد میں نے مولانا مودودی سے ملاقات کی اور ان سے پوچھا' آیا انہیں پی پی پی کے زیرِ سرپرستی بدمعاش عناصر سے کوئی شکایت ہے؟

''اب کوئی شکایت نہیں رہی۔'' انہوں نے جواب دیا

''آپ نے ایسا حسن انتظام کس طرح کیا؟ میں جانتا ہوں کہ آپ نے راولپنڈی میں بھی غنڈوں پر قابو پا لیا تھا۔'' انہوں نے مزید سوال کیا۔

''میں محض قانون پر عمل کرتا ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔

''کیا کسی نے کبھی آپ کے کام میں مداخلت نہیں کی؟''

''نہ کسی نے میرے کام میں مداخلت کی' نہ میں نے کسی سے ہدایات مانگیں۔ میں صرف قانون کی پیروی کرتا ہوں۔''

میری اس وضاحت پر ان کی حیرت دیدنی تھی۔

''ٹھیک ہے' میں آپ کی بات پر یقین کرتا ہوں۔ کیونکہ اب پولیس سٹیشنوں سے غنڈوں کا راج ختم ہو گیا ہے۔ اگرچہ ہر شخص کہتا ہے کہ کھر ان کی سرپرستی کرتے ہیں۔''

مولانا نے میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنی راولپنڈی والی پالیسی جاری رکھی اور جرائم سے نمٹنے کے لیے مختلف سطحوں پر معاشرہ کے اشتراک سے کام کرنے لگا۔ میں نے لوگوں کے مختلف گروپوں کے اجلاس بلائے اور جرائم کے خلاف جہاد میں تعاون حاصل کرنے کے لیے تھانیداروں' ڈی ایس پی اور ایس پی حضرات کی حوصلہ افزائی کی۔ معاشرہ کے مختلف طبقات کی طرف سے مثبت جواب ملا۔ میں نے پولیس اور عوام کو مشترکہ مقصد کے

لیے ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ اس نقطہ نظر پر عمل کی مزید تفصیلات اگلے باب میں ملیں گی۔ جہاں اسلامی سربراہی کانفرنس کے سلسلہ میں کیے گئے انتظامات کا ذکر ہے۔

پولیس کے متعلق عوام کی سوچ میں تبدیلی

لاہور پی پی پی کی حکومت کے زبردست خلاف ہوگیا تھا کیونکہ یو ڈی ایف (یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ) کی احتجاجی تحریک کے دوران پولیس نے ان سے بہت زیادتیاں کی تھیں اور وہ ظلم و تشدّد کی علامت بن گئی تھی۔ لوگوں کے چہروں سے شدید نفرت جھلکتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شہری غم و غصہ میں بھرے بیٹھے ہیں۔ میرے دوست اظہار الحق کا خیال تھا کہ پہلے بہت سے بدترین واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ گزشتہ سال مسلم لیگ کے مخلص رہنما خواجہ محمد رفیق کا دن دہاڑے بہیمانہ قتل' اس کے علاوہ جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد اور مسلم لیگی لیڈر ملک قاسم کے ساتھ جو شرم ناک اور توہین آمیز سلوک کیا گیا' اس کی بابت طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔

میرا فرضِ منصبی تھا کہ فوجداری انصاف فراہم کرنے والی مشین پر شہریوں کا اعتماد پھر سے بحال کروں۔ ان دنوں پرویز مسعود ڈپٹی کمشنر تھے جو گورنمنٹ کالج میں میرے کلاس فیلو رہ چکے تھے اور بعد میں ترقی کر کے پنجاب کے چیف سیکرٹری بنے۔ میں نے ان کے ساتھ صورتِ حال پر تبادلہ خیال کیا اور ایک انتظامی ٹیم کے طور پر کام کرنے کو کہا تاکہ ہم لوگوں کے دل و دماغ تک پہنچ سکیں اور ان کے دلوں میں بسی ہوئی تلخی کم کر سکیں۔ "بدمعاشوں کے خلاف جہاد میں ہمیں استبدادی اقدامات کرنے کی بجائے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔'' میں نے اولین میٹنگ میں ان سے کہا۔ انہوں نے مجھ سے مکمل اتفاق کیا اور میری درخواست پر پولیس نیز مجسٹریٹوں کا ایک اجلاس طلب کر لیا۔

میں نے اس اجلاس سے خطاب کیا اور لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے یا کمیونٹی کی مدد سے پاسبانی کرنے کے سلسلہ میں اپنے خیالات کی وضاحت کی۔ مجسٹریٹوں نے میرے خیالات کی تائید کی اور اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ ہم نے بدمعاشوں کے ساتھ سختی سے نمٹنے اور سیاسی کارکنوں' طلبا' لیبر اور دوسرے گروپوں کے ساتھ جو اپنے مطالبات کے حق میں مظاہرہ کے لیے سڑکوں پر آتے تھے نرمی سے پیش

آنے کا ارادہ کرلیا۔ طے پایا کہ ان کے ساتھ بات چیت کے ذریعے معاملات طے کیے جائیں گے۔ ڈنڈا کے استعمال سے گریز کیا جائے گا۔ عادی مجرموں کی ضمانتیں نہیں لی جائیں گی اور عدالتی تفتیش میں ہر ممکنہ عجلت سے کام لیا جائے گا۔ ہم نے سمنوں' وارنٹوں اور دیگر عدالتی احکام کی فوری تعمیل کو یقینی بنانے کا تہیہ کر لیا۔ فوجداری انصاف میں ایک دوسرے سے منسلک مشینری کو متضاد مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی بجائے جیسا کہ پولیس اور مجسٹریٹوں کے مابین مسلسل سرد جنگ کا عام رواج ہے' اسے بہتر بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

پرویز مسعود اور میں نے پولیس اور مجسٹریٹوں کے درمیان ہم آہنگی اور ربط پیدا کرنے کے بعد ڈسٹرکٹ و سیشن جج سے رابطہ کیا تا کہ فوجداری انصاف کی فراہمی کی رفتار تیز کی جاسکے اور کارکردگی بہتر بنائی جاسکے۔ ہم نے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سردار محمد اقبال کے ساتھ بھی ملاقات کی جو لا کالج میں میرے استاد رہ چکے تھے۔ وہ ہائی کورٹ کے ایک جج جسٹس محمد افضل ظلّہ (بعدہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس) کے گھر مشکوک واردات کی بنا پر پریشان تھے۔ میں ان کے ساتھ جسٹس ظلّہ کی رہائش گاہ پر گیا۔ انہوں نے ہمیں گولیوں کے خول دکھائے نیز ایک پنسل بھی جو بعض شرپسند مکان کے ساتھ لگی ہوئی باڑ میں چھوڑ گئے تھے۔ بظاہر وہ جج کو خوفزدہ کرنے کی کوشش لگتی تھی کیونکہ انہوں نے بعض سیاسی نظر بندوں کو رہا کردیا تھا۔ میں نے ان کی رہائش گاہ پر گارد لگادی اور معاملہ تفتیش کے لیے سی آئی اے کے حوالے کردیا۔ اس معاملہ میں کسی نے میرے کام میں مداخلت نہیں کی۔ چیف جسٹس بے حد خوش ہوئے اور جرائم کے خلاف جدوجہد میں ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اس طرح ہر سطح پر خطرناک مجرموں کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کردیا گیا۔

لیبر لیڈروں کے ساتھ معاملہ

محنت کشوں کی طرف سے پہلا احتجاجی مظاہرہ جس سے مجھے سابقہ پڑا' میرے بطور ایس ایس پی چارج لینے کے چند ہی دن بعد کیا گیا۔ کوٹ لکھپت کے فیکٹری ایریا میں محنت کشوں نے صنعت کاروں اور حکومت کے خلاف جلوس نکالا اور سڑک بلاک کردی۔ میں ڈی سی کے ہمراہ موقع پر پہنچا۔ دریں اثنا وزیر محنت مختار اعوان بھی آ گئے۔ انہوں نے مقامی لیبر لیڈروں عبدالرحمٰن اور طارق لطیف کے ساتھ بات چیت

کی۔ لیبر لیڈروں نے وزیرِ محنت کی بات نہیں مانی اور انہیں ایک بیٹھک میں یرغمال بنالیا۔

وزیر کو چھڑانے کے لیے بظاہر طاقت کے استعمال کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ میں پھر بھی متامل تھا۔ میں نے ڈی سی سے کہا کہ مجھے پُرامن حل کے لیے آخری کوشش کرنے کا موقع دیں۔ میں نے مزدوروں سے خطاب کرنا شروع کیا تو وہ چند منٹ بعد ہی میری بات سننے پر آمادہ ہوگئے۔ میں نے ان کے جائز مطالبات تسلیم کرنے کا اعلان کردیا اور وہ بتدریج منتشر ہونے لگے۔ کارکنوں میں آدھے سے زیادہ منتشر ہو چکے تھے۔ جب لیڈروں کو اندازہ ہوگیا کہ ان کی پشت خالی ہوگئی ہے تو ہماری بات مان لی ۔انہوں نے اس وعدہ پر وزیرِ محنت کو بلا تاخیر رہا کردیا کہ مزید مذاکرات اگلے دن ہوں گے۔

میں نے اگلے دن لیبر لیڈروں کو لنچ پر مدعو کیا۔ ان کے مسائل پر اگلے دو دن تک بات چیت ہوتی رہی۔ صاف گوئی سے کام لیا جائے تو بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ وہ مزدوروں کے ساتھ پولیس کے توہین آمیز رویہ سے نالاں تھے۔ مجھے یہ جان کر انتہائی دکھ ہوا کہ کچھ عرصہ پہلے سی آئی اے کے ڈی ایس پی چوہدری محمد صادق نے ایک لیبر لیڈر پر زبردست تشدد کیا اور اس کے منہ میں پیشاب کرنے جیسی ذلیل حرکت کا مرتکب ہوا۔ میں نے اس ایس پی سے بات کی تو اس نے اپنی احمقانہ حرکت پر بڑے فخر کا اظہار کیا اور بولا ''ان شیطانوں کو کنٹرول میں رکھنے کا بس یہی طریقہ ہے۔'' اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ انسانوں کے ساتھ دوسرے بہتر طریقوں سے بھی مؤثر انداز میں نمٹا جاسکتا ہے۔ شاید تعلیم کی کمی بھی اس کا سبب ہو۔ وہ ڈی ایس پی محض میٹرک پاس تھا۔

میں نے اس کے بعد بھی ان لیڈروں کو لنچ یا ڈنر پر مدعو کرنے اور ان کے مسائل پر گھنٹوں بحث کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ معاملہ کا روشن رخ دکھانے کے لیے چوہدری صادق کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ محنت کشوں کے مسائل جلد ہی ختم ہوگئے۔

دریں اثنا میں نے بہت سے مزدور لیڈروں کے ساتھ دوستانہ مراسم استوار کرلیے۔ انہوں نے ذہنی طور پر مطمئن ہونے کے بعد دوسرے محاذ پر پیش قدمی میں بھی ہماری مدد کی۔ جرائم اور بدمعاشوں کے خلاف جدوجہد میں ہمارا ساتھ دیا اور مفید معلومات فراہم کرنے کے لیے دن رات کام کیا۔

فیکٹری انتظامیہ نے بعض عادی مجرموں کو ملازم رکھ لیا تاکہ محنت کشوں کے غیظ وغضب سے بچنے کے لیے ان کو ڈھال بنایا جاسکے۔

ایک بار میں نے طارق لطیف سے پوچھا

''کیا تم اس قدر خطرناک ہو کہ فیکٹری کی انتظامیہ کو تمہارے مظالم سے بچنے کے لیے بدمعاش ملازم رکھنے پڑتے ہیں؟''

''ہاں یہ درست ہے۔ لیکن آپ کے شریفانہ و شائستہ سلوک نے ہمیں ''نکما'' کر دیا ہے۔ اس سے پہلے ہم اس قدر تند و تلخ تھے کہ مالکان اور پولیس کو تباہ کرنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ صنعت کار پھلیں پھولیں اور ہمیں زیادہ بونس دیں۔ پولیس ہمیں پکڑنے کی بجائے بدمعاشوں کا تعاقب کرے۔'' اس نے جواب دیا۔

چند دن بعد چوہدری صادق نے میرے سامنے تسلیم کیا کہ ''یہ شیطان واقعی اب انسانوں کی طرح پیش آنے لگے ہیں۔ میں غلطی پر تھا۔ انہوں نے مجرموں کے گیارہ بدنام گروہوں کا سراغ لگانے میں ہمارے مدد کی ہے۔ ایک گینگ کا سرغنہ ایک لیبر لیڈر تھا' طارق لطیف نے اس کا کھوج لگانے میں بھی ہمارا ساتھ دیا' حالانکہ وہ ان کے ہی گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔''

''اب آپ سمجھ گئے کہ کسی انسان کی شرافت پر بھروسہ کرنے کا کیا مطلب ہے۔'' میں نے اسے احساس دلایا۔ میں اپنے تجربے کی کامیابی پر خوش تھا اور اس بات پر بھی کہ چوہدری صادق جیسے پرانے پولیس افسر بھی اس قدر جلد بعض اچھے سبق سیکھ گئے۔

ٹرانسپورٹ کے شعبہ میں چوہدری انور ظہور' سیف صابر' ملک صدیق' چوہدری منظور اور طاؤس خاں اہم مزدور رہنما تھے۔ چوہدری ظہور اپنے عمدہ و شائستہ کردار کے باعث میرے اس قدر قریب ہو گئے تھے کہ وہ اب بھی میرے لیے بھائی کی طرح ہیں۔ وہ اس وقت سے آل پاکستان ٹرانسپورٹ ایمپلائز ایسوسی ایشن کے صدر چلے آ رہے ہیں۔ موصوف اسلامیہ کالج کے گریجوایٹ ہیں۔ انہیں اقبال کی شاعری سے عشق ہے۔ وہ بڑے روشن خیال اور کریم النفس و ہمدرد انسان ہیں۔ یوسف صابر رکشا ٹیکسی یونین کے صدر تھے۔ چوہدری منظور گڈز کیریئر ایسوسی ایشن کی نمائندگی کرتے تھے جبکہ طاؤس خان تانگہ یونین کے سربراہ تھے۔ انہوں نے رضا کاروں کی ایک کور بنائی جو اپنے اپنے علاقہ میں سڑکوں پر ڈسپلن قائم رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ ٹریفک پولیس کے اشتراک سے اپنے ساتھیوں کو روڈ سیفٹی اور ٹریفک کا شعور جیسے اہم موضوعات پر لیکچر دیتے تھے۔ انہوں نے خود اپنے مفاد میں ڈسپلن برقرار رکھنے اور ٹریفک کے بہاؤ کو امن و

سکون کے ساتھ رواں دواں رکھنے کا پختہ عزم کر لیا کیونکہ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ سڑکوں پر ہونے والے حادثات میں دوسروں کی نسبت ٹرانسپورٹ ورکرز زیادہ نشانہ بنتے ہیں۔

طالب علم لیڈروں کے ساتھ حسنِ سلوک

طلبا ہمارے معاشرہ کا سب سے زیادہ حساس طبقہ ہیں۔ سب سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ صورت حال پیدا کرنے کے ذمہ دار طلبا ہی ہوتے ہیں، وہ کسی بھی حکومت کو جھکنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے طلبا کے ساتھ ہمیشہ خوشگوار مراسم رکھے۔ یوڈی ایف کی تحریک کے دوران لاہور میں طلبا کے ساتھ بدسلوکی کی گئی تھی۔ میں نے ان طلبا کو رہائی دلائی جو اس وقت بھی جیل میں تھے اور جب بھی انہیں کوئی مسئلہ پیش آتا تو مجھ سے براہ راست ملاقات کا وقت دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔

میں نے راولپنڈی میں طلبا کے ساتھ جو اچھا سلوک کیا اُسے بھی پیشِ نگاہ رکھا گیا' کیونکہ طلبا کا احترام کرنے اور معاملات کو میرٹ پر سلجھانے کی بابت میری شہرت پہلے ہی لاہور پہنچ چکی تھی۔

تمام اداروں سے اور مختلف موقف رکھنے والے طلبا اکثر میرے دفتر میں آتے تھے۔ یہاں تک کہ مخالف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے طلبا کو بھی میرے دفتر میں آکر بات چیت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ جماعت اسلامی کے فرید پراچہ اور راجہ منور، پیپلز پارٹی کے ناظم شاہ اور محبوب بٹ اور تحریک استقلال کے حفیظ خاں بیک وقت میرے دفتر میں موجود ہوتے اور باہمی دلچسپی کے معاملات پر مکمل ہم آہنگی کے ساتھ تبادلہ خیال کرتے۔ میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں ان سب کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرتا ہوں۔ تاکہ وہ اپنے مسائل کے حل کی خاطر پورے اعتماد کے ساتھ میرے پاس آسکیں اور احتجاج سے گریز کریں۔

وہ میرے بعض دیگر افسروں کے بھی دوست بن گئے اور اس دور کی بعض دوستیاں تاحال قائم ہیں۔ ڈی ایس پی چوہدری سلطان محمود اور مشتاق بخاری طلبا میں بے حد مقبول تھے۔ مشتاق بخاری خوش فکر شاعر تھے اور ہمیں اپنے خوبصورت اشعار سے محظوظ کیا کرتے تھے۔ مذکورہ بالا دونوں افسر بحیثیت ڈی ایس پی ریٹائر ہوئے۔

چوہدری عبدالغفور، ایس پی سٹی جو ایک سن رسیدہ آدمی تھے، طلبا پر باپ کی طرح شفقت کرتے تھے۔ وہ ان کے لیے لذیذ کھانے منگواتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ لاہور کے کس علاقے میں کون سا بہترین

کھانا ملتا ہے۔

طلباء میں افراتفری اور گڑ بڑ جلد ہی ختم ہو گئی اور نت نئے مسائل پیدا ہونا بند ہو گئے۔ دوسری طرف پرانی نسل کے افسر مجھ سے شکوہ کرتے تھے کہ میں نے طلبا کی ناز برداری کر کے انہیں بگاڑ دیا ہے۔ ان کے خیال میں امن قائم رکھنے کا بہترین طریقہ منگول حکمران ہلاکو خاں کی طرح طاقت کے ذریعے کچلنے میں مضمر تھا۔ اس طبقے کا ایک افسر لاہور میں واقعتاً ہلاکو خاں کے نام سے بڑا مشہور ہوا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ طلبا ہمارا مستقبل ہیں اور انہیں پھلنے پھولنے کے مواقع ملنے چاہئیں۔

ہمیں صرف ایک موقع پر ایک درجن یا اس سے زائد طلبا کو زیر حراست رکھنا پڑا۔ وہ اس وقت کی بات ہے جب اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ طلبا کی طرف سے علامتی احتجاج اور ان کی نظر بندی دونوں قوم کے مفاد میں تھے۔ اگر الجھے ہوئے مسائل بشمول جنگی قیدیوں کی رہائی کو سلجھانے کے لیے ایک نئی ریاست کو تسلیم کرنا ناگزیر تھا تو اس طریق کار کے خلاف، جس طریقہ سے بھارتی جارحیت اور حکمرانوں کی حماقت نے اس حقیقت کو جنم دیا، نفرت و ناپسندیدگی کا اظہار بھی لازمی تھا۔ گرفتار شدہ طلبا کو پولیس کے خلاف کسی قسم کی تلخی پیدا ہونے سے پہلے یعنی تین روز بعد رہا کر دیا گیا۔ دراصل ہم نے باہمی افہام و تفہیم کی ایسی فضا پیدا کر لی تھی کہ انہوں نے احتجاج کے بارے میں مجھے پیشگی مطلع کر دیا اور اپنی مرضی سے گرفتاریاں دیں۔

باقی ماندہ واحد تنازعہ طلبا اور ٹرانسپورٹ والوں کے مابین تھا۔ ٹرانسپورٹرز خصوصاً بسوں اور ویگنوں کے ڈرائیور مفت سفر کرنے والے طلبا سے سخت نالاں تھے۔ بھٹو نے نااندیشی سے کام لیتے ہوئے ان کے لیے مفت سفر کی رعایت کا اعلان کر دیا تھا۔ فریقین کے مابین بہت سے خونریز جھگڑے ہوئے، جو اکثر امن و امان کا مسئلہ کھڑا کر دیتے تھے۔

میں نے سٹوڈنٹس یونین اور ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشن کے نمائندوں کے درمیان اپنے دفتر میں کئی بار ملاقات کرائی۔ شروع شروع میں ایسے اجلاس تُو تکار کی نذر ہو جاتے تھے۔ لیکن بعد میں مصالحت آمیزی اور حقیقت پسندی کے مظہر بن گئے۔ بعض لڑکوں نے ڈرائیورز کو اپنی انگریزی سے مرعوب کرنا چاہا، لیکن ادھر سے بہتر انگریزی میں جواب ملا تو خاموشی اختیار کر لی۔ پتہ چلا کہ بہت سے ویگن ڈرائیور ماضی میں کالجوں کے طالب علم رہ چکے تھے۔ میں نے ان لوگوں کے ساتھ بھی تعلقات استوار کیے اور طلبا کو سمجھایا

کہ مستقبل میں ان میں سے بھی بعض اس پیشہ کو اپنا سکتے ہیں اس لیے ان کے ساتھ بنا کر رکھیں۔ طلبا اپنی خیالی بلندیوں سے نیچے اتر آئے اور ٹرانسپورٹرز کے ساتھ دوستی کا دم بھرنے لگے۔ طلبا اور پولیس دونوں نے محنت کی عظمت تسلیم کر لی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس مسئلہ کی شدت کم ہو گئی۔

جنگی قیدیوں کی واپسی

اسلامی سربراہ کانفرنس کے دوران بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینے سے جنگی قیدیوں کی واپسی کی راہ ہموار ہو گئی۔ اس وقت انڈیا دباؤ بڑھانے اور بلیک میل کرنے کی خاطر انہیں عرصۂ دراز تک قید میں رکھنے سے بین الاقوامی سطح پر یکہ وتنہا رہ گیا تھا۔ وہ بھارت کے لیے بھاری مالی بوجھ بن گئے تھے۔ اب انڈیا کو اپنی بات کا بھرم رکھنے کے لیے کسی بہانہ کی ضرورت تھی جو بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی صورت میں فراہم کر دیا گیا۔

ہم نے واپس آنے والے جنگی قیدیوں کا استقبال کرنے کے لیے واہگہ سرحد پر انتظامات کیے۔ اگرچہ وہ ایک ناخوشگوار اور تکلیف دہ کام تھا، تاہم اس بات کی خوشی بھی تھی کہ وہ اپنے گھروں کو اور اپنے خاندان میں واپس آ رہے تھے۔ ان قیدیوں میں بریگیڈیئر قادر بھی شامل تھے۔ انہوں نے 14 فروری 1969ء کو اس وقت بڑا شور مچایا تھا جب ایف کے بندیال نے بحیثیت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی کے جلوس کو ان کے مشورہ کے برعکس اسمبلی چیمبر تک جانے کی اجازت دے دی تھی۔ بریگیڈیئر صاحب نے بڑے سخت الفاظ میں شکوہ کیا تھا کہ فوج کو مال روڈ سے پسپائی کا حکم دے کر اس کی "توہین" کی گئی ہے۔ بندیال کا موقف تھا کہ یہ دشمن کے سامنے پسپائی نہیں بلکہ اپنے ہی شہریوں کے نقطۂ نظر کو برداشت کرنے کی ایک دانشمندانہ تدبیر ہے۔

بریگیڈیئر قادر کو خوش آمدید کہتے وقت مجھے حقیقی دشمن کے سامنے سرنڈر کرنے اور جنگی قیدی بننے کی ذلت برداشت کرنے والی بات یاد آ گئی۔ وہ وقار کہاں گیا جسے ٹھیس پہنچانے کا بندیال کو دوش دیا گیا تھا؟

میں انہیں وہ واقعہ یاد دلانا اور ان سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ فوج نے مشرقی پاکستان میں اپنے عوام کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ درست تھا؟ نیز یہ کہ آیا جدید مسلم تاریخ میں سب سے بڑی فوجی شکست کھانے کی بجائے ان کے ساتھ مفاہمت کر لینا بہتر نہ ہوتا؟ لیکن میں نے چپ رہنا مناسب سمجھا کیونکہ مجھ

میں ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

انہی دنوں چیف آف آرمی سٹاف جنرل ٹکا خاں سے ملنے کا اتفاق ہوا تو میں نے مشرقی پاکستان کے حوالہ سے وہ گفتگو یاد دلائی جو ہمارے درمیان اس وقت ہوئی تھی جب وہ لاہور کے مارشل لا ایڈ منسٹریٹر تھے۔ ان کا اس وقت بھی یہی خیال تھا کہ انہوں نے بحران پر قابو پا لیا تھا۔ لیکن جنرل نیازی نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ انہیں یہ تک یاد نہیں تھا کہ انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں ڈائریکٹ فائرنگ کا حکم دے کر صورتِ حال خراب کر دی تھی۔

پولیس کے جنگی قیدیوں کی بحالی

واپس آنے والے جنگی قیدیوں میں پولیس والوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے آئی جی نے سینئر پولیس افسران کی ایک کمیٹی قائم کر دی۔ بحیثیت ایس ایس پی میں بھی موقع پر موجود ہوتا تھا۔ میں نے ضلع لاہور سے تعلق رکھنے والے پولیس کے اکثر قیدیوں کے ساتھ تفصیلی بات چیت کی۔ وہ میری توقع سے بڑھ کر قید کرانے والوں کے خلاف تھے۔ نظر بندی کے دوران بھارتیوں نے ان کے ساتھ بدسلوکی کی اور تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس لیے ان کے دلوں میں بلا کی تلخی اور نفرت تھی۔ ان میں سے بہتوں کے بیوی بچے گم ہو گئے۔ انہوں نے انٹرنیشنل ریڈ کراس کے خلاف اس امر کی شکایتیں کیں کہ وہ ان کے خطوط اور پارسلوں کی تقسیم میں غیر معمولی تاخیر کر دیتے تھے۔ بعض دوسری شکایات بھی تھیں۔ جنیوا کنونشن کے تحت پولیس والوں کو لڑاکا نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے فوجی جوانوں اور افسروں کی نسبت انہیں بہت زیادہ محرومیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پولیس والوں کو صرف =/10 روپے ماہوار ملتے تھے جبکہ فوجیوں کو ان سے کئی گنا زیادہ جیب خرچ دیا جاتا تھا اور انہیں بہت سی دیگر سہولتیں بھی حاصل تھیں۔ قید میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی بڑی اہمیت اختیار کر جاتی ہیں۔ نظر بندی کی ٹینشن کے باعث آپس میں بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ ان میں سے بہت سے مذہب کی طرف مائل ہو گئے اور نماز کی پابندی کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی تلاوت میں مشغول رہنے لگے۔ ان پولیس والوں کو از سرِ نو آباد کاری کے لیے اظہارِ ہمدردی، آرام اور ذہنی سکون کی ضرورت تھی۔ مایوسی و ناکامی دور کرنے کے لیے ان کی مدد کرنا ضروری تھا۔

لاہور ڈسٹرکٹ پولیس کے انسپکٹر چوہدری عبدالحمید کو ایک دلخراش تجربہ سے گزرنا پڑا۔ سرنڈر

کے وقت وہ ڈھاکہ پولیس لائنز میں ریزرو انسپکٹر تھے۔ وہ والی بال کے بہت اچھے کھلاڑی تھے' اس لیے میں انہیں بہت پسند کرتا تھا۔ جب بھارتی فوج تیزی سے پیش قدمی کرتی ہوئی شہر میں داخل ہوگئی تو مکتی باہنی نے ڈھاکہ پولیس لائنز کا محاصرہ کرلیا، جہاں مغربی پاکستان کے پولیس والے اکٹھے ہوگئے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد پولیس لائن پر دھاوا بول کر اسے تخت وتاراج کردیا گیا اور ہر چیز لوٹ لی گئی۔ کھانے پینے کی کوئی چیز باقی نہیں بچی۔ پولیس والے خوف کے مارے ایک کونے میں دبک گئے۔ اس معاندانہ اور خوفناک فضا میں ان میں سے کسی کو بھی تین چار دن تک کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ ان میں سے بعض کا دماغ ماؤف ہوگیا اور بعض بے ہوش ہوگئے۔ ان کی جانیں بچانے کی خاطر کچھ نہ کچھ کرنا لازمی ہوگیا تھا۔

انسپکٹر حمید نے بعض پنجابی سپاہیوں اور افسروں کو جو وہاں طویل عرصہ سے ملازمت کررہے تھے اور روانی سے بنگالی بول سکتے تھے' جمع کیا اور صبح سویرے چھاؤنی روانہ ہوگئے تاکہ وہاں سے کچھ راشن حاصل کرسکیں۔ اگر کوئی انہیں پہچان لیتا کہ پنجابی ہیں تو سب کے سب مارے جاتے۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ چھاؤنی کا علاقہ بھارتی فوج کے قبضہ میں تھا۔ تاہم زیادہ تر انتظامی اور مواصلاتی کام پاکستانی افسر انجام دے رہے تھے۔ وہ سپلائی ونگ میں گئے اور پولیس والوں کی حالتِ زار بیان کرکے راشن مانگا۔ لیکن کسی نے بھی ان کی بات نہیں سنی۔ پھر وہ سپلائی کے سب سے بڑے افسر کے پاس پہنچے۔ اس نے بھی یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ پولیس والے ہماری فہرست میں شامل نہیں۔ اس لیے انہیں کچھ نہیں مل سکتا۔ حمید نے دیکھا کہ ہر چیز بھارتیوں کے حوالے کرنے کے لیے بڑی احتیاط سے تیاریاں کی جارہی اور فہرستیں بن رہی تھیں۔ بنگالی اشیاء کو صاف اور بڑی محنت سے ترتیب دے رہے تھے تاکہ بھارتیوں کو ان کے بارے میں برا تاثر نہ ملے۔ لیکن انہیں اپنے ملک کے بھوکے بلکہ قریب المرگ پولیس والوں پر قطعاً ترس نہیں آیا۔

حمید اور اس کے ساتھیوں نے ہر طرف سے مایوس ہوکر شور مچانا اور واہی تباہی بکنا شروع کردیا۔ بنگالی پولیس والوں کا ناشائستہ رویہ دیکھ کر ان پر پل پڑے۔ اتفاق سے ایک سکھ میجر باجوہ کے زیرِ کمان بھارتی فوج کا ایک دستہ ادھر سے گزرا۔ انہوں نے سمجھا شاید مکتی باہنی والوں نے پاکستانی فوجیوں پر حملہ کردیا ہے۔ اس لیے مداخلت کرکے پولیس والوں کو مار پیٹ سے بچایا۔ جب پولیس والوں نے اپنی حالتِ زار کے بارے میں میجر باجوہ کو بتایا تو اس کے حکم پر سپلائی والوں نے حمید وغیرہ کو آٹا' دال' چاول اور دوسرا خشک راشن فوراً دے دیا۔ سکھ میجر نے حمید کو اپنی جیپ میں بٹھا کر اور اس کے ساتھیوں کو ٹرک میں سوار کرکے

پولیس لائنز پہنچایا چونکہ اس وقت شام ہو چکی تھی اس لیے ان کے اگلے دن سے راشن کا معقول اور مستقل انتظام کرنے کا وعدہ کر لیا۔

اپنی لائنوں میں پہنچنے پر انہیں ایک اور مسئلہ سے واسطہ پڑ گیا۔ وہاں نہ تو برتن تھے نہ ہی کھانے پکانے کے لیے ایندھن، ایسی تمام چیزیں مکتی باہنی والے اٹھا کر لے گئے تھے۔ انہوں نے کمروں کی کھڑکیاں توڑ کر آگ جلائی۔ کانسٹیبلری کے پرانے اور ناکارہ بکس دال پکانے کے لیے استعمال کیے۔ اس طرح انہوں نے پیٹ کی آگ بجھائی اور جوانوں کو موت کے منہ میں جانے سے بچایا۔

حمید نے جب یہ المناک واقعہ سنایا تو وہ انتہائی غم و غصہ کی حالت میں تھا۔ اسے اور اس کے ساتھیوں کو اس ذہنی کیفیت سے نکالنا بہت ضروری تھا۔ انہیں مختلف تدابیر بروئے کار لا کر جن میں پسند کی پوسٹنگ بھی شامل تھی، مطمئن کرنا لازمی ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے ایڈیشنل ایس پی ایل آر نبلیٹ سے کہا کہ ان کے اطمینان کے مطابق ان کی پوسٹنگ کا انتظام کرے، اور اگر چھٹی مانگیں تو فراخدلی سے کام لے۔

جب مجھے پتہ چلا کہ نبلیٹ پورا ہفتہ گزرنے کے باوجود کسی چیز کا فیصلہ نہیں کر پایا تو میں نے پوچھا۔

''اس قدر تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟''

''وہ مکمل طور پر ختم ہو چکے ہیں، ان میں کوئی ڈسپلن نہیں۔ ان میں سے ہر ایک کسی دیہی تھانہ میں جانا چاہتا ہے۔ احکام جاریہ کے مطابق دیہی تھانہ میں جانے کی باری 12 سال بعد آتی ہے۔'' اس نے وضاحت سے بتایا۔

''تاہم آپ کو ہر معاملہ میں ممکن حد تک ان کی خواہش کو ملحوظ رکھنا ہو گا۔'' میں نے زور دے کر ہدایت کی۔

''سر وہ قطعاً کسی کام کے نہیں رہے۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''وہ لمبی چھٹی پر جانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر اس کے مستحق نہیں کیونکہ قواعد کے مطابق ان کے کھاتہ میں کوئی چھٹی نہیں بنتی۔'' نبلیٹ نے جان چھڑانے کے لیے بہانہ بنایا۔

اس پر میرے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ مجھے اس کے غیر ہمدردانہ اور بیوروکریسی والے رویہ سے انتہائی کوفت ہوئی۔ تنگ آ کر میں نے اس سے پوچھا: ''مسٹر نبلیٹ یہ کون سے قانون میں لکھا ہے کہ سرکاری ملازمت کے دوران وہ بھارتی جیلوں میں سڑیں گے؟ یہ ایک خاص صورتِ حال ہے۔ انہوں نے

بڑے عرصہ تک سخت تکلیفیں جھیلی ہیں۔ ہمیں ہر طرح سے انہیں بحال کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ان کا ہم پر حق بنتا ہے۔ ان کا قوم پر حق بنتا ہے۔ ہمیں ان کے ساتھ شفقت و مہربانی سے پیش آنا چاہیے تا کہ وہ اپنے اوپر گزرنے والی قیامت کو آہستہ آہستہ بھلا دیں۔''

''ایسی صورت میں پہلے قواعد میں تبدیلی کرنا پڑے گی یا ان میں لچک پیدا کرنی ہوگی۔'' وہ اب بھی مقررہ قواعد وضوابط سے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

''ایسا کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں بعد میں اجازت لے لوں گا۔ سر دست جو کچھ کرنا ضروری ہے' ہمیں کر گزرنا چاہیے تا کہ وہ لوگ مزید مایوسی سے بچ سکیں۔''

میری طرف سے فوری اقدامات پر بے حد زور دینے کے باوجود وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ وہ اس بات سے خوفزدہ تھا کہ قواعد وضوابط کے خلاف قدم اٹھانے پر بعد میں اس کے خلاف کارروائی نہ شروع ہو جائے۔ اس طرح وہ مصیبت میں پھنس جائے گا۔ سرکاری ملازمت میں ضرورت سے زیادہ ضابطہ پسندی انسان کی قوتِ تحریک اور پہل کرنے کی صلاحیت کو کچل ڈالتی ہے۔ وہ انسان کو طرح طرح کے خوف و ہراس اور وسوسوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ آدمی تھوڑے ہی عرصہ میں ہمدردانہ جذبات سے محروم ہو کر محض ایک روبوٹ بن جاتا ہے۔

میں نے سوچا کہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں وہ نبلیٹ کے بس سے باہر ہے۔ اس لیے میں نے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ میں نے ضلع کے تمام جنگی قیدیوں کو جن کی تعداد 700-800 کے درمیان تھی۔ پولیس لائنز کے گراؤنڈ میں اکٹھا کر لیا۔ ان کے علاوہ اپنے سٹاف بشمول نبلیٹ' میجر ظہیر' زیرِ تربیت ایس پی اور زیرِ تربیت بعض اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹس آف پولیس کو بھی بلا لیا۔ میں نے جنگی قیدیوں سے خطاب کیا۔ ملک کے لیے ان کی خدمات کو سراہا' اپنے مقدس پیشہ سے لگن اور فرض شناسی کی تعریف کی۔ میں نے انہیں اپنی پسند کے مقام پر پوسٹنگ کرانے کی پیشکش کی جو ان کی ضروریات اور حالات کے مطابق ہو۔ ان سے کہا گیا کہ وہ اپنی پسند سے موقع پر موجود سٹاف کو آگاہ کر دیں۔ میں نے انہیں لمبی رخصت پر جانے کی اجازت بھی دے دی خواہ ان کی چھٹی بنتی تھی یا نہیں۔ میں نے اعلان کر دیا کہ جب تک ان کی خواہش کے مطابق سارے حکم جاری اور ان پر عملدرآمد نہیں ہو جاتا' یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔ اس

پوری مشق میں محض چھ گھنٹے لگے۔ تمام افسروں اور جوانوں نے اپنے احکام دستی لے لیے اور نئی پوسٹنگ کے مقامات کی طرف یا چھٹی پر اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ اکثریت نے رخصت پر جانے کو ترجیح دی۔

''یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟'' میں نے میجر ظہیر سے پوچھا جو خود جنگی قیدی رہ چکے تھے اور آج کل ڈی آئی جی ہیں۔

''چونکہ وہ اپنے بال بچوں سے لمبے عرصہ تک دور رہے ہیں اس لیے اپنی طویل غیر حاضری کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔'' انہوں نے دل کو لگنے والا جواب دیا۔

''آیئے ایک نظر چارٹس پر ڈالیں تا کہ پتہ چل سکے کہ اس ایکسرسائز سے تھانوں اور مختلف برانچوں مثلاً ٹریفک' پراسیکیوشن اور سی آئی اے وغیرہ میں کوئی عدم توازن تو پیدا نہیں ہوگا۔''

''سر' ان سب کا ستیاناس ہو گیا ہوگا۔'' نبلیٹ نے رائے ظاہر کی جو محض مفروضہ پر مبنی تھا۔ جب ہم نے مختلف چارٹس کا جائزہ لیا اور ان کا منظور شدہ نفری سے موازنہ کیا تو کمی' بیشی برائے نام پائی گئی کسی بھی جگہ دو یا تین سے زیادہ نہیں۔ ہم سب بے حد حیران ہوئے کیونکہ وہ ساری کارروائی انتہائی متوازن ثابت ہوئی حالانکہ میرا زور محض انسانی ہمدردی پر تھا۔ لوگوں پر کمانڈ کرنے میں سب سے بڑی دانائی ہمدردی' مہربانی انسان دوستی اور باپ کی سی سختی میں مضمر ہوتی ہے' بشرطیکہ اس کی ضرورت محسوس ہو۔

بھارتی جیلوں سے واپسی پر جوانوں کو دل جوئی و تشفی کی ضرورت تھی۔ کلرکوں والی درشتی کی نہیں (اس معاملے میں میں نے اعلیٰ درجے کا کلرک بننے سے گریز کیا) پولیس کے جنگی قیدی بہت سے اضلاع میں ایک مسئلہ بن گئے اور انہوں نے ریلوے پولیس لائن سمیت جو کہ لاہور ڈسٹرکٹ پولیس لائن سے بہت تھوڑے فاصلے پر واقع ہے' کئی جگہوں پر ہڑتال کر دی۔ اس کے بعد آئی جی کو پورے صوبہ میں ہدایات جاری کرنی پڑیں کہ پولیس کے جنگی قیدیوں کے ساتھ اس طریقے سے نمٹا جائے جو لاہور کے ایس ایس پی (راقم الحروف) نے اختیار کیا تھا۔

کھر حکومت کا ارکان صوبائی اسمبلی سے معاملہ

پنجاب اسمبلی کے ارکان رانا پھول محمد' ملک محمد علی اور عاشق ڈوگر وزیر اعلیٰ کے بہت قریب تھے۔ ان کا تعلق ضلع لاہور کی تحصیل قصور سے تھا۔ وہ بعض تھانیداروں کا اپنی مرضی کے مطابق تبادلہ کرانے کی

غرض سے میرے پاس آئے ان کا مطالبہ اخلاقی لحاظ سے موزوں نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ وہ مجھ سے سخت ناراض ہوگئے اور میرا تبادلہ کرانے کی مہم شروع کردی۔ کھر نے ان سے وعدہ کرلیا کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کے فوراً بعد مجھے تبدیل کردیا جائے گا۔ کھر کے قریبی حلقہ میں موجود میرے دوستوں نے مجھے اس بارے میں مطلع کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے اس عہدہ پر برقرار رہنے سے زیادہ دل چسپی نہیں۔ اگر میرا تبادلہ کردیا گیا تو سکھ کا سانس لوں گا۔ میں نے اپنی پوسٹنگ کو ہمیشہ ایک ذمہ داری سمجھا' اختیارات کا سرچشمہ نہیں، جسے ذاتی مفاد کے لیے غلط استعمال کیا جائے۔ اس لیے جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ کھڈے لائن والی نوکری میرے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

کھر نے اسلامک سمٹ (سربراہی کانفرنس) کے دوران پی پی پی کے بعض اراکین صوبائی اسمبلی کو بڑے سنگدلانہ طریقے سے ہراساں کیا جو بھٹو کو بھی ناگوار گزرا۔ وہ جماعتِ اسلامی یا تحریکِ استقلال نہیں تھی بلکہ بھٹو کی اپنی پارٹی تھی جس کے چیئرمین وہ خود تھے۔ چونکہ کھر نے وہ کارروائی کرنے سے پہلے بھٹو کو اعتماد میں نہیں لیا تھا' اس لیے انہوں نے سمجھا کہ ان کا نائب انہیں چیلنج کرنے لگا ہے۔

سعید احمد خاں بھی اپنی عادت کے مطابق اس مہم میں شریک ہوگیا۔ جیسا کہ اس نے بتایا' وہ کھر کے خلاف چوہدری ظہور الٰہی کے ادھورے اغوا کے بعد اقدام کرنا چاہتا تھا (اغوا کی تفصیلات باب نمبر 33 میں ملاحظہ کیجئے) وہ بھٹو کے کانوں میں کھر کے خلاف بتدریج زہر گھولتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی سمٹ کے فوراً بعد کھر کی جگہ محمد حنیف رامے کو پنجاب کا وزیرِ اعلیٰ مقرر کردیا گیا۔

ضلع قصور کے ایک ایم پی اے یعقوب مان بھی جو کھر کے غیظ و غضب کا نشانہ بن چکے تھے۔ رانا پھول اور ان کے دوسرے ساتھیوں سے جو میرے خلاف کھر کے کان بھرتے رہتے تھے' وہی کچھ کرنا چاہتے تھے۔ حنیف رامے نے یعقوب مان کی شکایت پر ان تینوں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی ٹھان لی۔ اگرچہ وہ ٹولہ مسلسل میری مخالفت کررہا تھا تاہم جب تک ان کے خلاف کسی جرم میں ملوث ہونے کا ثبوت نہ مل جاتا پیشہ ورانہ اخلاق مجھے ان کے خلاف کسی قسم کا بغض و عداوت پالنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ میں ان کے معاملہ میں بالکل غیر جانبدار رہا۔ جو حنیف رامے کو پسند نہیں تھا۔ میں یعقوب مان کے خلاف کبھی پارٹی نہیں بنا تھا۔ کیونکہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا' مجھے اس کا علم نہیں تھا۔

آخر کار تین کا وہ ٹولہ میرے پاس آیا۔ انہیں انتقامی کارروائی کا زبردست خوف تھا' میں نے انہیں یقین دلایا کہ جب تک میں ایس ایس پی ہوں حقائق اور قانون کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ انہی دنوں

بعض طلبا نے کھر کی حمایت میں جلوس نکالا میں نے ان کے ساتھ اسی طرح شریفانہ اور انسانی سلوک کیا جیسے ماضی میں اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے طلبا کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ میری نرمی کو کھر کی حمایت سے تعبیر کیا گیا اور رامے نیز ان کے مشیروں نے مجھ پر کھر کا آدمی ہونے کا لیبل لگا دیا۔

میرے خلاف ہر طرف جوڑ توڑ جاری تھا۔ میرے اپنے ڈی آئی جی اور سپیشل برانچ کے ڈی آئی جی وکیل خان جو مجھ سے اس بات پر برہم تھے کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کے دوران میں نے ان کی دم پر پاؤں رکھ دیا تھا' اس مہم میں بڑے فعال بلکہ پیش پیش تھے۔ سپیشل برانچ والے رکشا اور ٹیکسی ڈرائیوروں سے اس امر کا بیان لینے کی کوشش کر رہے تھے کہ اسلامی کانفرنس کے دوران ڈسپلن کو فروغ دینے سے متعلق نعرے پولیس کے دباؤ کے تحت گاڑیوں پر پینٹ کرائے گئے تھے تاکہ ان بیانات کو میرے خلاف استعمال کیا جا سکے۔

سعید احمد خان بھی میرے خلاف مہم میں شریک ہو گیا۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ کھر کے بعض دوستوں کو اٹھا لیا جائے۔ میرے نزدیک وہ کام غلط تھا۔ اس لیے میں نے ان سے اتفاق نہیں کیا تاہم انہیں پروگرام کے مطابق اٹھا لیا گیا البتہ قانون کے تحت ان کی گرفتاری کا اندراج کیا گیا۔ میری طرف سے انہیں پولیس ریکارڈ میں باقاعدہ گرفتار دکھانے پر سعید احمد خاں آگ بگولا ہو گیا اور ٹیلی فون کر کے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ میرے تبادلہ کے فوراً بعد کھر کے دوستوں کو دوبارہ اٹھا لیا گیا۔ لیکن اس دفعہ گرفتاری نہیں ڈالی گئی اور انہیں آزاد کشمیر کے دلائی کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ چونکہ وہ واقعہ میری پوسٹنگ کے بعد رونما ہوا تھا' اس لیے میں اس کی تفصیلات بیان کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ بلاشبہ اس واقعہ نے بھٹو کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔

سعید احمد خان اور دوسرے لوگوں نے حنیف رامے کو باور کرا دیا کہ میں کھر کا آدمی ہوں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ مجھے بطور ایس ایس پی لاہور برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اصل کھیل سے واقف نہیں تھے جو سعید احمد خان' اخلاق و شرافت کی تمام حدود کو پار کرتے ہوئے کھیل رہا تھا۔ وہ بھٹو سمیت ہم سب کو لاقانونیت اور معصیت کی دلدل میں دھنسانے کی سازش کر رہا تھا۔

حنیف رامے نے حقائق جاننے کی کوشش کیے بغیر مجھے معطل کرنا چاہا تاہم حاجی حبیب الرحمٰن نے جو ڈی آئی جی بن گئے تھے اور ان دنوں انٹیلی جنس بیورو میں جائنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے' انہیں میرے خلاف اتنی سخت کارروائی کرنے سے باز رکھا۔

کچھ عرصہ بعد رامے کو پتہ چل گیا کہ سازشی عناصر واقعی انہیں میرے خلاف غلط رپورٹیں پہنچا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے 7 کلب روڈ (وزیرِ اعلیٰ کی سرکاری رہائش گاہ) پر بلایا اور مجھ سے کہا کہ بطور ایس ایس پی کام کرتا رہوں۔ میرا خیال تھا کہ سازشی ٹولہ اپنی مہم جاری رکھے گا اور میرے لیے وزیرِ اعلیٰ کے ساتھ اعتماد کا رشتہ قائم رکھنا محال ہو جائے گا۔ دراصل میں پہلے ہی تنگ آیا ہوا تھا کیونکہ قانون کو نظر انداز کرنا مجھے پسند نہیں تھا جو سعید احمد خان، وکیل خان اور مسعود محمود جیسے لوگوں کا معمول بن گیا تھا۔ آدمی سرکاری مشینری کی مزاحمت ایک حد تک ہی کر سکتا ہے۔ اس قدر سخت اور طویل جدوجہد کرنے کے بعد میں اپنے لیے نسبتاً کم بھاگ دوڑ والا کام چاہتا تھا۔

چنانچہ حنیف رامے کو رحم دل اور شفیق سمجھتے ہوئے میں نے درخواست کی کہ مجھے موجودہ پوسٹ سے ہٹا کر اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل ٹریفک لگا دیا جائے۔ اتفاق سے وہ پوسٹ خالی تھی۔ انہوں نے میری گزارش منظور کر لی اور اگلے ہی دن اے آئی جی ٹریفک بنا دیا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا۔ آئی جی صاحبزادہ رؤف علی خان نے میری ٹرانسفر سے اتفاق نہیں کیا۔ انہیں قائل کرنے کے لیے مجھے خاصی محنت کرنی پڑی۔ 29 اپریل 1974ء کو آئی جی کے سٹاف آفیسر اویس مظہر کو میری جگہ لاہور کا ایس ایس پی مقرر کر دیا گیا۔

جب میں نے اے حمید کو اپنے تبادلہ کے لیے وزیرِ اعلیٰ سے درخواست کرنے کے بارے میں بتایا تو وہ میرے فیصلہ سے خوش نہیں ہوئے۔

''تمہارے تبادلہ کے بعد صاحبزادہ بھی اپنے عہدہ پر قائم نہیں رہیں گے۔'' انہوں نے مستقبل میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اس کے بعد بہت سے غلط کام ہوں گے اور وہ انجام کی ابتداء ہوگی۔'' اے حمید نے خبردار کیا۔

''لیکن اس پورے نظام میں میں ایک حقیر سا فرد ہوں۔'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''بطور ایس ایس پی تمہاری پوزیشن مشین کے انتہائی اہم پرزہ کی ہے۔'' انہوں نے اپنے نقطۂ نظر پر اصرار کیا۔

''تم ایک تھکے ہارے شخص کا ردِ عمل ظاہر کر رہے ہو۔ یو ڈی ایف کی تحریک کے بعد تم نے حکومت کے مخالف لاہور شہر کو اس کا حامی بنانے کے لیے سخت محنت کی تھی۔ تم نے اسلامی کانفرنس کے لیے پورے شہر کی ماہیئت قلب بدل دی اور لاہوریوں کو بہترین شہری بنا دیا۔ تم نے برائی کے خلاف اپنی صفوں

میں اوراس کے باہر دونوں جگہ بہت سے معرکے سر کیے ہیں۔ یہ کامیابیاں معمولی نہیں۔ تم اب بھی معاشرہ کی بھلائی کے لیے اہم کردار ادا کر سکتے ہو' لیکن تم تھکے ہوئے محسوس ہوتے ہو۔"

ان کی بات درست نکلی۔ صاحبزادہ رؤف علی کو اگست 1974ء میں برطرف کر دیا گیا اور بہت سے غلط واقعات ظہور پذیر ہوئے جو حتمی انجام کا آغاز بنے۔ ان کا یہ کہنا بھی صحیح تھا کہ میں تھکے ہوئے شخص کی طرح لگ رہا تھا۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے جو زوالوجی میں پی ایچ ڈی تھے' اس چیز کی دوسرے طریقہ سے وضاحت کی۔ ایک دن میں نے انہیں انسپکٹر حمید کی وہ کہانی سنائی جس کا تعلق سقوطِ ڈھاکہ کے دوران فوج کی پولیس کے خلاف نفرت نیز جنگی قیدیوں کے ساتھ نبلیٹ جیسے لوگوں کے سلوک سے تھا تو انہوں نے میری باتوں پر خفگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ بڑے سکون کے ساتھ فرمایا:

"یہ جسم کے اکڑ جانے کی علامت ہے۔"

"سر اس سے کیا مراد ہے؟" میں نے پوچھا

"بچپن میں تمہارے بدن میں لچک ہوتی ہے جو نشو نما کے عمل میں بھی برقرار رہتی ہے۔ لیکن جوں جوں عمر گزرتی ہے۔ تمہارا بدن بے لچک اور سخت ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں وہ مکمل طور پر اکڑ جاتا ہے۔ یہی چیز تمام اجسام اور تنظیموں میں پائی جاتی ہے۔ تمہاری فوج اور پولیس اکڑنے کی طرف مائل ہے۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔"



باب14

اسلامی سربراہی کانفرنس

جن دنوں میں عوام اور پولیس کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے عمل کو' جس میں جرائم کے خلاف جدوجہد بھی شامل تھی' کھیل کود کے مقابلوں کے ساتھ بتدریج آگے بڑھا رہا تھا' حسنِ اتفاق سے انہی دنوں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ 1974ء کے شروع میں لاہور میں ایک عظیم الشان کانفرنس ہوگی جس میں تمام اسلامی ممالک کے سربراہانِ ریاست وحکومت شرکت کریں گے۔

مجھے سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ اس موقع کو عوام اور پولیس کے درمیان یگانگت کا رشتہ قائم کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ یہ کانفرنس لوگوں کے لیے بہت بڑا تاریخی واقعہ ہوگی کیونکہ انہیں پورے عالمِ اسلام کے قائدین کو اپنے درمیان دیکھنے کا موقع ملے گا جن میں وہ طلسماتی شخصیات بھی شامل ہونگی جن کے متعلق انہوں نے بہت کچھ سن اور پڑھ رکھا ہے۔

میں جانتا تھا کہ کانفرنس کے دوران پولیس کی بنیادی ذمہ داری غیر ملکی شخصیتوں کے راستوں پر ہجوم کو کنٹرول کرنے اور اہم مقامات پر ڈسپلن برقرار رکھنے کے اہم مسئلے سے متعلق ہوگی۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے دو طریقے تھے۔ ایک یہ کہ ہم عوام کی قطاریں بنوا دیتے اور انہیں طاقت کے ذریعے کنٹرول کرتے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ایسے اقدامات کیے جاتے جن کی مدد سے ان کی رضاکارانہ اور پُرجوش شراکت کو یقینی بنایا جاسکے۔ ان انتظامات میں معاشرہ کے نمائندوں کی شمولیت بہت مفید و مددگار ثابت ہوسکتی تھی لیکن اس سے بعض خدشات وخطرات بھی لاحق تھے۔ اس لیے میں نے سوچا اگر ڈسپلن کی اہمیت اور مقصد کے شعور کو لوگوں کے دلوں پر نقش کیا جاسکے تو بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

چنانچہ میں نے دوسرے طریقے کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے عوام اور پولیس کے مابین خلیج پاٹنے میں بھی مدد

ملنے کی توقع تھی۔

میں نے انتظامات میں لوگوں کی شرکت کا تصور سینئر پولیس افسروں کے ایک اجلاس میں پیش کیا تو کوئی بھی اس قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوا۔ کیونکہ انہوں نے اسلامی سربراہی کانفرنس جیسا مہتمم بالشان واقعہ کبھی نہیں دیکھا تھا' نہ ہی وہ ایسے انتظامات میں لوگوں کو شامل کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ میں نے ان پر واضح کیا کہ جب تک عوام ڈسپلن قائم رکھنے میں خود بھرپور حصہ نہیں لیں گے' سڑکوں پر ڈسپلن قائم نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کہ کانفرنس میں شرکت کے لیے چالیس کے قریب رہنما آئیں گے جن میں شاہ فیصل' یاسر عرفات اور کرنل قذافی جیسی انتہائی ہردلعزیز شخصیات بھی شامل ہوں گی۔ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگوں کا بے ہنگم جوش وخروش ہمارے سارے انتظامات کو درہم برہم کردے گا۔ ایسی صورت میں طاقت کا استعمال اور لاٹھی چارج وغیرہ اقدامات بدنما منظر پیش کریں گے۔ نیز اس سے سیکیورٹی کے مسائل بھی پیدا ہوں گے۔

میرے دلائل اثر انداز ہوتے محسوس ہوئے' تاہم پولیس افسران کو ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ اصل میں کرنا کیا ہے۔ میرے منصوبے کا دارومدار چونکہ ان افسروں کی کارکردگی پر تھا اس لیے میں ان کی خوش دلی کے ساتھ شراکت کا خواہاں تھا۔ میں نے اسلامی روایت کے مطابق صف بندی کے بنیادی تصور کی وضاحت کی اور بتایا کہ لوگ سڑکوں کے ساتھ سیدھی قطاروں میں کھڑے ہوکر (جیسے نماز میں کھڑے ہوتے ہیں) نظم وضبط قائم رکھیں اور تخریب پسند عناصر کو ان میں گھسنے کی اجازت نہ دی جائے اور یہ کہ قائدین کو خوش آمدید کہتے وقت انہیں اپنے دائیں بائیں ہجوم پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ پولیس افسر کچھ زیادہ قائل نہیں ہوئے کہ لوگ ایسا کرسکیں گے۔ معمول کے مطابق لوگوں پر میرے اعتماد نے اس تصور کو لے کر آگے بڑھنے میں میری مدد کی۔ میں نے اپنے منصوبہ کی بابت اے حمید سے تبادلہ خیال کیا۔ انہیں میرا تصور بے حد پسند آیا اور انہوں نے بنیادی تصور کو نمایاں کرنے والے نعروں' اشعار' پوسٹرز' پمفلٹ اور اشتہاروں سمیت تحریک دینے والا ہر قسم کا لٹریچر تخلیق کرنے میں بھرپور تعاون کا وعدہ کیا۔ انہوں نے تجویز کیا کہ لاہوریوں کو جوش دلانے اور ان کی حب الوطنی اور جذبۂ افتخار کو بیدار کرنے کے لیے مؤثر نفسیاتی طریقے استعمال کیے جائیں۔ انہیں یہ بتا کر خود انضباطی کی ضرورت سے آگاہ کیا جائے کہ ٹیلی ویژن کے کیمروں کے ذریعے پوری دنیا کی نظریں ان پر لگی ہوں گی۔ ان خطوط پر بنیادی مواد کی تیاری واقعی بہت بڑی مدد تھی۔ لاہور ضلع

کے پولیس والے ہر سطح پر ڈسپلن کے پیغامبر بن گئے اور انہوں نے اس کام کو مذہبی فریضے کے طور پر انجام دیا۔

ڈی ایس پی مشتاق بخاری نے عظیم شاعرانہ طبیعت کے ساتھ بڑے جوش و سرگرمی سے اے حمید کا ہاتھ بٹایا۔ انہوں نے ایسے بہت سے پولیس مین دریافت کر کے اپنی ٹیم میں شامل کر لیے جو اچھی شاعری کر سکتے اور نثر لکھ سکتے تھے۔ اُردو اور پنجابی میں جوش و ولولہ ابھارنے والی نظمیں اور گیت لکھے گئے اور ان کی دُھنیں تیار کی گئیں۔

یہ تصور اپنے سٹاف کو ذہن نشین کرانے کے بعد میں نے اس معاملہ پر ڈی سی پرویز مسعود اور آئی جی صاحبزادہ رؤف علی سے بات کی۔ ان دونوں افسروں نے شروع میں بعض تحفظات کا اظہار کیا۔ تاہم آخر میں میری بات سے اتفاق کر لیا البتہ صدیق سلمان ڈی آئی جی اور سردار وکیل خان' ڈی آئی جی سپیشل برانچ نے میرے منصوبے کو "فضول" قرار دیا اور کہا کہ تحریکی مواد پر وقت اور پیسہ ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ان کی باتوں سے مجھے وقتی طور پر مایوسی ہوئی تاہم میں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے منصوبے پر کام جاری رکھا۔

آہستہ آہستہ لاہور کے پولیس افسر اور مجسٹریٹ اس تصور کی افادیت کے قائل ہو گئے اور اسے ہر سطح پر پوری مستعدی سے پروان چڑھانے لگے۔ پرویز مسعود اور میں نے لاہور کو مختلف علاقائی اور سماجی حلقوں میں تقسیم کر دیا۔ میری رائے یہ تھی کہ معاشرہ کے لیڈروں کو انتظامات میں ہر سطح پر شریک کیا جائے۔ چنانچہ معاشرہ کے مختلف طبقوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے شہر کے قریباً ہر محلّہ اور وارڈ میں شہریوں کی کمیٹیاں بنا دیں۔ لاہور کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر اے یو سلیم نے صف بندی' خود انضباطی اور نگرانی کے تصور کو عام کرنے میں معزز شہریوں کو شامل کر کے ہماری بے پناہ مدد کی۔

وہ تصور نچلی سطحوں تک پہنچا اور دور دور تک پھیل گیا۔ تاجروں نے اے حمید اور مشتاق کے تیار کردہ مواد کی تقسیم اور اس کے فروغ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ رکشا ڈرائیوروں نے یوسف صابر کی سربراہی میں اور ویگن ڈرائیوروں نے چوہدری انور ظہور کے زیرِ قیادت دلکش نعرے اور علامہ اقبالؒ کے دلکش اشعار گاڑیوں پر پینٹ کرا لیے۔ اس کا شہر کے تمام حصوں میں بہت اچھا اثر ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ پبلسٹی کی انتہائی موٴثر مہم ثابت ہوئی اور اس نے اقبالؒ کے پیغام کو گھر گھر پہنچا دیا۔

طلبا اور محنت کش لیڈروں نے سیاسی وابستگیوں سے قطع نظر رضا کاروں کے دستے تیار کیے

جنہیں نہ صرف نئے تصور کا پرچار کرنے بلکہ مقررہ اوقات سڑکوں پر پولیس کے ساتھ ڈیوٹی دینے کی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی۔ میں یہ جان کر بے حد خوش ہوا کہ فرید پراچہ' راجہ منور' حمید اللہ خان اور دوسرے طلبا جو بصورت دیگر حکمران پارٹی کے سخت خلاف تھے' سڑکوں پر بطور سپیشل پولیس آفیسر رضا کارانہ ڈیوٹی دینے پر آمادہ ہو گئے۔ طارق لطیف' عبدالرحمٰن اور دیگر مزدور رہنما جو حکومت کے بدترین مخالف تھے' قیامِ امن و امان کے لیے پی پی پی کے کارکنوں کے ساتھ کام کرنے لگے۔ اساتذہ' کھلاڑی اور سکاؤٹس بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ میں پرویز مسعود کو سنٹرل ماڈل ہائی سکول میں لیکچرار' اساتذہ، طلبا اور سکاؤٹس کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرنے کے لیے لے گیا۔ اسکول کا ہال قومی معاملات میں پُرجوش عوامی شراکت کا ایک ولولہ انگیز منظر پیش کر رہا تھا۔ اجلاس کے شرکا نے گلیوں میں امن و امان قائم رکھنے کا عہد کیا۔ انہوں نے رضا کارانہ امن قائم رکھنے والے افراد بھرتی کیے اور اپنا مواد بھی خود تیار کیا۔ مساجد کے آئمہ اور دیگر علمائے کرام نے اس موضوع پر ایک کنونشن منعقد کیا اور طے کیا کہ وہ نہ صرف تمام مساجد میں صف بندی اور نظم و ضبط برقرار رکھیں گے بلکہ سڑکوں پر بھی کام کریں گے۔

طاؤس خان کے زیرِ قیادت تانگہ ایسوسی ایشن نے پیشکش کی کہ وہ سربراہی کانفرنس سے پہلے اور اس کے دوران چند دن اپنے تانگے اور ریڑھے سڑکوں پر نہیں لائیں گے تاکہ سڑکیں صاف ستھری رہیں۔ رکشوں' ٹیکسیوں' منی بسوں اور دوسری ٹرانسپورٹ کے ڈرائیوروں کی طرف سے بھی ایسی ہی پیشکش موصول ہوئی۔ میں ان کے جذبے سے بڑا متاثر ہوا۔ میں نے ان کے تعاون سے گاڑیوں کو مقررہ ٹائم ٹیبل کا پابند کرنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا تاکہ ان میں سے بعض گاڑیوں کو مقررہ اوقات پر سڑکوں سے دور رکھا جا سکے۔ اس طرح عوام پریشانی سے بچ جائیں گے اور متعلقہ سڑکوں پر غیر ضروری رش بھی نہیں ہوگا۔ اسلامی سربراہ کانفرنس نے ہماری اس کوشش کی کامیابی کا ایک خوبصورت موقع فراہم کیا جو ہم عوام اور پولیس کو قریب لانے کے سلسلہ میں کر رہے تھے اور ان دونوں کو ایک دوسرے کے حریف کی بجائے دوست بنا دیا۔ پیشتر ازیں کسی قومی نصب العین نے انہیں ایک دوسرے کے اس قدر قریب نہیں کیا تھا۔

تطہیر پر زور

جن دنوں پرویز مسعود اور میں اپنے پلان پر کام کر رہے تھے' وہ لوگ بھی جو ہمیشہ اختیار اور طاقت کے استعمال کے لیے بے چین رہتے ہیں' فارغ نہیں بیٹھے رہے۔ سپیشل برانچ کے ڈی آئی جی وکیل

خان نے طالب علموں، محنت کشوں اور سیاسی کارکنوں میں سے گڑبڑ کرنے والے متوقع افراد کی ایک طویل فہرست مرتب کر کے تجویز پیش کی کہ انہیں پکڑ کر کانفرنس کے دوران نظر بند کر دیا جائے۔ وہ سب میرے ساتھ مل کر قیامِ امن کے لیے مخلصانہ کوششیں کرنے والے افراد تھے۔ ان کی گرفتاری کا مطلب ان کے ساتھ دھوکا دہی کی واردات ہوتا۔ چنانچہ میں نے اُس تجویز کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ میں بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں۔ تاہم ایک بڑا مقصد حاصل کرنے لیے مجھے مجبوراً وہ خطرہ مول لینا پڑا۔ میرے لیے ان لوگوں کو محض سپیشل برانچ کے ظاہر کردہ خدشہ کی بنیاد پر حراست میں لینا ممکن نہیں تھا جو شب و روز میرے ساتھ کام کر رہے تھے۔ میں نے اخلاقی اور انتظامی وجوہات کے پیشِ نظر اس تجویز میں پارٹی بننے سے انکار کر دیا۔ میں نے موصولہ رپورٹ کی صداقت کو بھی چیلنج کر دیا۔

پھر وہ معاملہ صوبائی کابینہ کے اجلاس میں زیرِ غور آیا جس کی صدارت وزیر اعلیٰ مصطفیٰ کھر نے کی۔ اجلاس میں معاملہ پر تفصیل سے غور و خوض کیا گیا۔ محفوظ تر راستے پر چلنا ہمیشہ آسان ہوتا ہے اس لیے مجھے گرفتاریوں کے خلاف زوردار دلائل دینے پڑے۔ سیاستدانوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کے حریف ایک قومی معاملہ میں انتظامیہ کے ساتھ اس طرح تعاون کر سکتے ہیں۔ میاں افضل وٹو واحد وزیر تھے جنہوں نے میرے نقطۂ نظر کی حمایت کی۔

آخرِ کار میں کابینہ سے یہ منظوری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ سپیشل برانچ کی فہرست میں درج افراد کو حراست میں نہ لیا جائے۔ اس سلسلے میں مجھے ذاتی طور پر ہر چیز کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ یہ کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو مجھے پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جائے گا۔ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ وہ ذمہ داری قبول کر لی اور کہہ دیا کہ جب تک میں ایس ایس پی ہوں ہر کام کے لیے، آخری ذمہ داری بہر صورت میری ہوگی خواہ کابینہ کا فیصلہ میرے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ دراصل میں نے اس امکان کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے ہی یہ سوچ لیا تھا کہ اگر انہوں نے طلبا اور دوسرے کارکنوں کی گرفتاری پر زور دیا تو میں تبادلہ کی درخواست دے دوں گا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ لوگ سیاسی اختلافات کے باوجود گڑبڑ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

وکیل خان بڑے برہم تھے، انہوں نے میرے نقطۂ نظر کو ''احمقانہ جسارت'' قرار دیا۔ چوہدری مختار گوندل کے بقول جو بطور ایس پی وکیل خان کے ساتھ کام کر رہے تھے، ڈی آئی جی نے ان سے کہا۔ ''حکومت کے مخالفین لازماً گڑبڑ کریں گے۔ ہم ان کی یقین دہانیوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ایس ایس پی

سادگی اور بھولے پن کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور وہ ہم سب کو کسی بڑی مصیبت میں پھنسائیں گے۔''

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے میری لاج رکھ لی۔ کانفرنس کے انتظامات میں عملی شراکت نے عوام میں مغائرت کا احساس پیدا نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ اس طرزِ عمل کے نتیجے میں خدا تعالیٰ نے ہمیں نہایت عزت و وقار کے ساتھ سُرخرو کیا۔ لوگوں کی شراکت سے خیر سگالی کی جو فضا پیدا ہوئی اس میں شیخ مجیب الرحمٰن کی آمد پر بھی جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد سب سے زیادہ قابلِ نفرت لیڈر رہے تھے ہجوم نے دل کھول کر تالیاں بجائیں۔ جاوید ہاشمی' فرید پراچہ اور ایک درجن کے قریب دیگر طلبا لیڈروں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے خلاف علامتی پُرامن احتجاج کیا اور کسی ہلّہ گلّہ کے بغیر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ انہیں تین دن بعد رہا کر دیا گیا۔

وزیرِ اعلیٰ طلبا کی رہائی پر بڑے برافروختہ ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں اچھی طرح سبق سکھانے کے لیے کافی دیر تک پابندِ سلاسل رکھا جائے تاکہ وہ دوبارہ احتجاج کرنے کی جرأت نہ کریں۔ یہ ایک ناسمجھ حکمران کا مخصوص اندازِ فکر تھا۔ جب مجھ سے جواب طلبی کی گئی تو میں نے انہیں بتایا کہ ''کانفرنس ختم ہونے کے بعد انہیں زیادہ دیر تک زیرِ حراست رکھنے سے طلبا کی نظر بندی مزید احتجاج کا بہانہ بن سکتی تھی۔ میں اس امکان کو ختم اور ممکنہ احتجاج کا سدِ باب کرنا چاہتا تھا' اس لیے یہ قدم اُٹھایا۔''

میری وضاحت سے چیف منسٹر تو مطمئن ہو گئے لیکن سپیشل برانچ کے ڈی آئی جی نہیں' کیونکہ سخت اقدامات کے ذریعے طلبا کو زیر کرنے کی ان کی خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے طلبا کے معاملہ میں میری نرمی کو بنیاد بنا کر اس قسم کی افواہیں پھیلانی شروع کر دیں کہ میری ہمدردیاں جماعتِ اسلامی کے ساتھ ہیں۔

''یہ چین نہیں ہے''

کانفرنس سے متعلق سیکورٹی کے انتظامات کا معاملہ خاصا مشکل کام تھا۔ ملک کی تاریخ میں ایک ساتھ اتنے سربراہان مملکت و حکومت اس سے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ شاہ فیصل' یاسر عرفات اور کرنل قذافی جیسے قائدین کو دنیا کے انتہائی فعال' تربیت یافتہ اور خطرناک گروپوں کی طرف سے جان کا خطرہ تھا۔ سیکورٹی کے مطلوبہ انتظامات کے حوالے سے پاکستان کی صلاحیت پر بھی شک و شبہ کا اظہار کیا جا رہا تھا۔

دراصل بعض سربراہ سیکورٹی کے فقدان کی بنا پر کانفرنس میں شریک ہونے سے ہچکچا رہے تھے۔ شہنشاہ ایران کے شریک نہ ہونے کی اصل وجہ یہی تھی۔ بھٹو کو اس معاملے میں بڑی تشویش تھی کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ رہنما کانفرنس میں شرکت کریں۔

ہم نے انتظامات کی ذمہ داری کو ایک قومی فرض سمجھ کر قبول کیا اور تہیہ کر لیا کہ بہترین افسروں اور جوانوں کو اس کام پر لگائیں گے۔ صاحبزادہ رؤف کی دانشمندانہ اور ولولہ انگیز قیادت و رہنمائی نے کئی مشکل مراحل آسان بنا دیئے۔ بحیثیت آئی جی پنجاب مجموعی طور پر تمام آپریشنز کے انچارج وہی تھے۔ انہوں نے ذمہ داریاں تفویض کرتے وقت بڑی سلیقہ مندی سے کام لیا۔ چونکہ یہ کام محض لاہور ڈسٹرکٹ پولیس کے بس سے باہر تھا' اس لیے صوبہ بھر سے اضافی فورس منگوائی گئی۔ صوبہ سرحد اور آزاد کشمیر سے بھی دستے طلب کیے گئے۔ پنجاب کانسٹیبلری کے کمانڈنٹ آغا رضا علی کو باہر سے آنے والے دستوں کے قیام و طعام اور ڈیوٹیاں تقسیم کرنے کا کام سونپا گیا۔

میں نے سیکورٹی آرڈر تیار کیے جن میں مختلف تقریبات کے لیے مقررہ جگہوں' مہمانوں کے لیے قیام گاہوں' راستوں اور ایئرپورٹ پر متعین ہر افسر اور جوان کے فرائض وضاحت سے درج کیے گئے تھے۔ کانفرنس کے ورکنگ سیشن پنجاب اسمبلی چیمبرز میں منعقد ہوئے' ڈنر اور لنچ کا اہتمام شاہی قلعہ اور گورنر ہاؤس میں کیا گیا۔ شہریوں کی طرف سے استقبالیہ شالامار باغ میں دیا گیا اور مہمانوں نے نمازِ جمعہ بادشاہی مسجد میں ادا کی۔

ریاض احمد سپرا' اے آئی جی ٹریفک' سربراہانِ مملکت اور دیگر اہم شخصیات کی نقل و حرکت' ان کے محافظوں اور ٹریفک کے دیگر معاملات کے انچارج تھے۔ انہوں نے فوج کے تعاون سے سخت محنت کی تاکہ وی آئی پی شخصیات کی نقل و حرکت میں ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی نہ ہو۔ ہر چیز نے گھڑی کی طرح تیز رفتاری سے حرکت کی۔ جس پر ہر شخص کی طرف سے تحسین اور اطمینان کا اظہار کیا گیا۔

جن راستوں سے مہمانانِ گرامی نے گزرنا تھا' ان پر عوام کے بہت بڑے بڑے اور پُرجوش ہجوم کھڑے تھے' اس لیے سیکورٹی کا اصل مسئلہ انہی سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ہجوم تعداد میں بہت زیادہ ہونے کے باوجود نظم و ضبط کے پابند تھے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے چند مثالیں کافی ہوں گی کہ ہماری چار مہینے کی انتھک

اور مخلصانہ جدوجہد نے لوگوں کے طرزِ عمل کو بہت بہتر بنا دیا تھا۔ جس پر بھٹو سمیت کوئی بھی شخص یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

جب ایک اجلاس میں ہم نے سیلف ڈسپلن کے ساتھ لوگوں کے لگاؤ کا ذکر کیا تو بھٹو نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ''یہ چین نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''میرے خیال میں یہ منصوبہ کامیاب رہے گا۔'' میں نے عرض کیا۔

''نہیں میں اس پر یقین نہیں کر سکتا۔ ہم کیسے مان لیں کہ یہ کامیاب رہے گا۔'' انہوں نے اصرار کیا۔

''سر آپ بڑے ہر دلعزیز راہنما ہیں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اعلان کیے بغیر کسی پرہجوم مقام پر جائیں اور لوگوں کا ردِ عمل دیکھیں۔'' انہوں نے میری تجویز قبول کر لی۔

وہ شام کو مصطفیٰ کھر کے ہمراہ داتا دربار گئے۔ منزلِ مقصود بتائے بغیر جب گورنر ہاؤس سے روانہ ہوئے تو ڈپٹی کمشنر اور میں وائرلیس پر پیغام ملتے ہی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ وہ دربار پہنچے تو وہاں ایک بھی پولیس والا نہیں تھا' کیونکہ کسی کو پیشگی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ بھٹو فاتحہ خوانی کر کے باہر نکلے تو دربار کے باہر تنگ گلیوں میں خاصا ہجوم جمع ہو چکا تھا۔ وہ سب قطار میں کھڑے بڑے جوش و خروش سے تالیاں بجا رہے تھے۔ وہاں ایک بھی سپاہی دیکھنے میں نہیں آیا جو انہیں کنٹرول کرتا۔ انہوں نے اس وقت بھی قطار نہیں توڑی جب بھٹو ہاتھ ملانے کے لیے ان کی طرف بڑھے۔ پھر وہ قلعہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت تک علاقے کے لوگوں کو بھٹو کی داتا دربار میں آمد کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ سب نہایت سلیقے سے راستہ کے دورویہ لائنوں میں کھڑے ہو گئے۔ وہاں بھی پولیس نہیں تھی۔ جب بھٹو قلعہ میں پہنچے تو ''لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو'' جاری تھا۔ جہانگیر اور نور جہاں کے رومانوی ڈائیلاگ سن کر بھٹو زیرِ لب مسکرائے۔ انہیں خوشگوار موڈ میں دیکھ کر میں نے لوگوں کے ڈسپلن کی بابت ان کی رائے دریافت کی۔ بھٹو نے دل کھول کر لوگوں کی تعریف کی۔ میں نے ان سے لاہوریوں کے ڈسپلن کے بارے میں ایک بیان جاری کرنے کو کہا تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو۔ انہوں نے کھر کو مطلوبہ بیان جاری کرنے کی ہدایت کی۔ لیکن جب میں نے اصرار کیا کہ ایسا بیان خود وزیرِ اعظم کی طرف سے آنا چاہیے تو انہوں نے میری بات مان لی اور فوراً بیان جاری کر دیا۔

کانفرنس کے انعقاد سے ایک دن پہلے یعنی 21 فروری 1974ء کو لوگ آرائشی انتظامات اور روشنیاں دیکھنے کے لیے بھاری تعداد میں مال روڈ پر نکل آئے۔ پنجاب اسمبلی کے قریب بہت بڑا ہجوم جمع

ہوگیا۔ وہاں پولیس کے ساتھ ڈیوٹی پر موجود بعض فوجی افسر ہجوم کو دیکھ کر طیش میں آ گئے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار نکال لیے اور دھمکی دی کہ اگر وہ فوری طور پر منتشر نہ ہوئے تو ان کے خلاف انتہائی طاقت استعمال کی جائے گی۔ مجھے قریبی پولیس کنٹرول سے معاملہ کی خبر ملی تو میں فوراً موقعہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایس پی کینٹ چوہدری محمد امین مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے میٹھی میٹھی باتیں کر کے فوجی افسروں کا غصہ بڑی حد تک ٹھنڈا کر دیا تھا۔

فوجی دستہ کا انچارج بریگیڈیئر اس بات پر سخت برہم تھا کہ ہجوم مقررہ لائن سے آگے کیوں آ گیا؟ میں نے اسے ایک طرف لیجا کر سمجھانے کی کوشش کی کہ بعض اوقات ایسے واقعات ہو جاتے ہیں اور ان سے تحمل و بردباری کے ساتھ نمٹنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ میری بات سے مطمئن نہیں ہوا۔

''تم نے ان لوگوں کو خراب کر دیا ہے۔ ایک مہینہ میں سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔ میں ان میں سے دو تین کے دروازے کھٹکھٹاؤں گا تو ایک بھی باہر نہیں نکلے گا۔ تم پولیس والوں نے اپنی ساری سختی بھلا دی ہے۔'' اس نے غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے نرمی سے سمجھایا کہ

''ان لوگوں کا مقصد گڑ بڑ کرنا نہیں۔ یہ محض تفریح کے موڈ میں باہر نکلے ہیں۔''

لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہا اور کہنے لگا۔

''میں کسی کو اس لکیر سے آگے جانے کی اجازت نہیں دونگا۔ آپ اس بات کو یقینی بنائیں کہ آئندہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے۔''

''میں اس بات کو یقینی بناؤنگا سر۔'' اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے میں نے ہامی بھری۔ اس کے ساتھ مزید بحث کرنا فضول تھا۔ میں نے اللہ کے حضور دعا کی کہ دوبارہ اس کی نوبت نہ آئے۔ اس وقت تک چوہدری امین نے لوگوں کو سمجھا بجھا کر منتشر کر دیا تھا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا اور اپنی جگہ لوٹ آیا۔

کچھ ایمبولینسیں بھی درکار ہوں گی

پروگرام کے مطابق تمام مسلمان سربراہوں نے جمعہ کی نماز بادشاہی مسجد میں ادا کرنا تھی' اس کے لیے بادشاہی مسجد کے اندر اور اردگرد سیکورٹی کے سخت انتظامات کرنا ضروری تھا۔ مسلمانوں کی تاریخ مساجد میں قتل کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بادشاہی مسجد بڑی وسیع ہے جس میں قریباً 70 ہزار نمازی بیک

وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ہجوم کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے اس کے وسیع صحن میں کوئی رکاوٹ موجود نہیں۔ میری نگاہوں میں 21 اپریل 1972ء کو ریس کورس راولپنڈی میں رونما ہونے والا وہ خوفناک منظر گھومنے لگا جب ایک جلسہ عام میں بھٹو کی سیکورٹی کے انتظامات درہم برہم ہو گئے تھے۔ اس لیے میں نے تجویز پیش کی کہ صحن میں پائپ کے بنے ہوئے ڈیوائڈرز نصب کر دیئے جائیں تا کہ ہجوم مختلف حصوں میں بٹ جائے' نیز صحن کے وسط میں معزز مہمانوں کے گزرنے کے لیے قالین بچھا دیا جائے۔ لیکن ڈی سی اور آئی جی کے سوا کسی نے میری تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔

یہ معاملہ ایک میٹنگ میں پیش کیا گیا جس کی صدارت خود وزیرِ اعظم نے کی۔ آئی جی نے میری تجویز کی پُر زور حمایت کی' خلافِ توقع وکیل خان بھی اس کے حق میں نظر آئے۔ جنرل ٹکا خان چیف آف آرمی سٹاف نے تجویز پیش کی کہ مسجد کے صحن میں فوجی جوانوں کو انسانی دیواروں کی شکل میں کھڑا کر دیا جائے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے دس ہزار جوان فراہم کرنے کی پیش کی۔ بھٹو اس تجویز سے بہت متاثر ہوئے۔ میں جانتا تھا کہ جنرل صاحب محض سادگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ورنہ لوگوں کے دباؤ کے آگے کوئی دیوار نہیں ٹھہرتی۔ میں نے اپنا ہاتھ کھڑا کیا' کھر نے مجھے روکنا چاہا تاہم بھٹو نے مداخلت کر کے بولنے کا اشارہ کیا۔

میں اس وقت تک خاصا کبیدہ خاطر ہو چکا تھا لیکن میں نے خود کو سنبھالا اور آہستہ آہستہ چند جملے کہے جن میں متوقع جوش و خروش کا ذکر کرنے کے بعد دوٹوک الفاظ میں کہا کہ ہجوم کے اس قدر زبردست دباؤ کے سامنے کسی انسانی دیوار کے ٹھہرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح معزز مہمانوں کے کچلے جانے کا خدشہ ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں چند ایمبولینس گاڑیاں بھی تیار رکھنی چاہئیں تا کہ اپنے زخمی وی آئی پی مہمانوں کو ہسپتال پہنچا سکیں۔ میرے منہ سے یہ الفاظ غیر شعوری طور پر نکل گئے۔ اجلاس میں گہری خاموشی چھا گئی۔ میں سہم گیا اور مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ بھٹو نے کہا ''ایس ایس پی کی بات درست لگتی ہے۔ مصطفیٰ تم خود مسجد میں جاؤ اور موقع پر فیصلہ کرو۔'' یہ سن کر میری جان میں جان آئی۔

اجلاس کے بعد چیف سیکرٹری افضل آغا نے کہا ''سردار تم نے اس سارے معاملہ کو عجیب ڈرامہ بنا دیا ہے۔ تمہاری تجویز پر بہت بھاری رقم خرچ کرنی پڑے گی۔''

''اگر ایسی بات ہے تو سربراہ کانفرنس منعقد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''اس کانفرنس پر بہت خرچ ہو رہا ہے۔ ہمیں اشرفیاں لٹانے اور کوئلوں پر مہر لگانے کی ضرورت

نہیں۔‘‘

افضل آغا نے فوراً پلٹا کھایا اور بولے ’’آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ صحن میں رکاوٹوں کا ہونا لازمی ہے۔‘‘ پھر کچھ سوچ کر بولے: ’’مجھے اُمید ہے کہ نمازی مسجد کے تقدس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شور نہیں مچائیں گے۔

مصطفیٰ کھر ہمیشہ فیصلہ کن موڈ میں ہوتے تھے۔ وہ لاہور کے کور کمانڈر جنرل عبدالحمید اور سول انتظامیہ کو ساتھ لے کر مسجد پہنچے۔ انہوں نے موقع کا جائزہ لیا اور وہیں کھڑے کھڑے میری تجویز کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ کور کمانڈر نے تجویز پیش کی کہ صحن کے درمیان میں سے معزز مہمانوں کے گزرنے کے لیے جو راستہ بنایا جائے اسے صحن کی عام سطح سے بلند ہونا چاہیے تاکہ حاضرین اپنے محبوب رہنماؤں کو اچھی طرح دیکھ سکیں۔ ان کی یہ تجویز بھی قبول کر لی گئی۔ اس پورے منصوبہ پر صرف سات لاکھ روپے لاگت آئی تاہم تقریب پُرسکون، محفوظ اور باوقار بن گئی۔ اس سلسلے میں کسی نے بھی میرا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اپنے تجربہ کی بنا پر مجھے اس کی توقع بھی نہیں تھی۔

مسجد میں افراتفری

سیکورٹی کی بابت اعلیٰ سطح کے ایک اجلاس میں طے پایا کہ نمازِ جمعہ کے لیے لوگوں کو صرف شاہی محلّہ کی طرف سے داخل ہونے کی اجازت دی جائے اور بڑا دروازہ وی آئی پی مہمانوں کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اس حد تک تو بات درست تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کر لیا گیا کہ شاہی محلّہ کی جانب واقع سات میں سے فقط دو دروازے استعمال کیے جائیں گے تاکہ داخل ہونے والے ہر نمازی کو الیکٹرک آلات سے اور جسمانی طور پر چیک کیا جا سکے۔ میں نے گزارش کی کہ اس طرح بہت زیادہ وقت لگے گا۔ اس لیے دوسرے پانچوں دروازے بھی کھول دینے چاہئیں۔ مگر کسی نے میری بات نہیں سنی۔ سپیشل برانچ کے ڈی آئی جی وکیل خان ہٹ دھرمی پر اتر آئے اور بولے۔

’’ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔‘‘

’’اگر ہم ساتوں دروازے استعمال کریں تو اس میں خطرہ کی کوئی بات نہیں۔‘‘ میں نے زور دے کر کہا۔

’’اس طرح آپ دو کی بجائے ایک ساتھ سات آدمیوں کو کلیئر کر سکیں گے اور یہ بات ذہن میں

رکھیں کہ آپ کو قریباً 70 ہزار افراد کلیئر کرنے ہوں گے۔" میری بات بالکل واضح اور دل کو لگنے والی تھی' لیکن سنی ان سنی کردی گئی۔ میں نے ایک بار پھر واضح کیا کہ اگر اس طریقے سے داخلہ ہوا تو جمعہ کی نماز اتوار کے دن بھی مشکل سے ادا کی جا سکے گی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس کے باوجود وہ معاملہ کو نہیں سمجھ سکے۔ میں نے ایک اور پہلو سے بات سمجھانا چاہی کہ معزز مہمانوں کے راستے بالکل کھلے ہوئے اور غیر محفوظ ہیں اور کوئی شخص انہیں مکمل طور پر محفوظ نہیں بنا سکتا۔ ایک سوچا سمجھا خطرہ بہر طور مول لینا پڑے گا۔" "پھر آپ ایسا فیصلہ کیوں کر رہے ہیں' جس سے عوام کو بے حد پریشانی ہوگی؟" میں نے اپنی بات دہرائی۔

"آپ کو اس کا احساس نہیں کہ ان دروازوں کے باہر ہجوم کے اکٹھے ہونے سے کیا کچھ وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ خدا کے لیے دیوار کے پار بھی دیکھیں۔"

مجھے یوں محسوس ہوا کہ دانا لوگوں نے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ میرے مؤقف کو مسترد کر دیا گیا۔ ڈی آئی جی لاہور مسجد میں انتظامات کے انچارج بنا دیئے گئے تاکہ وہ اپنے فیصلہ پر سختی سے عمل کرا سکیں۔ اپنے اس اعلان کے باوجود کہ ممنوعہ علاقہ میں کوئی خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا' وہ کئی خطرے مول لے رہے تھے۔ مثال کے طور پر یہ بڑی خطرناک بات تھی کہ اس علاقہ کے باہر کی جانب یک دم بہت زیادہ رش ہو جائے۔ اس صورت میں یہ امکان موجود تھا کہ وہ ہجوم قریبی راستہ کے ساتھ ساتھ معزز مہمانوں کے لیے مخصوص بڑے راستے کی طرف پھیل جائے اور اسے کنٹرول کرنا محال ہو جائے۔ میرے نزدیک وہ فیصلہ صورتِ حال کو پیش نظر رکھے بغیر کی گئی منصوبہ بندی کا شاہکار تھا۔

جمعہ کے دن عوام کا بہت بڑا ہجوم علی الصبح شاہی مسجد کے مشرق کی جانب واقع دروازوں کے باہر جمع ہو گیا۔ چوہدری عبدالغفور ایس پی سٹی نے 500 سپاہیوں اور اسی قدر رضا کاروں کے ساتھ ہجوم کو دو مقررہ دروازوں کی طرف دھکیلنے کی انتہائی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ وہاں پہلے ہی ہزارہا نمازی مسجد میں داخل ہونے کے لیے دھکم پیل کر رہے تھے۔ اس دھکم پیل اور بے پناہ رش سے ناقابلِ برداشت گھٹن پیدا ہو گئی۔ جس میں دو افراد دم گھٹنے سے مر گئے اور سولہ بے ہوش ہو گئے۔ چوہدری عبدالغفور نے بڑی سراسیمگی کے عالم میں یہ خبر 9 بجے وائرلیس پر نشر کر دی۔

پرویز مسعود اور میں مزید نقصان سے بچاؤ کی خاطر فوراً موقع پر پہنچے۔ ہم نے دیکھا کہ مسجد کا صحن خالی تھا جس میں صرف دو تین ہزار نمازی ہوں گے جبکہ بھاری ہجوم اندر داخل ہونے کے لیے دھکم پیل کر رہا

تھا۔ ہم نے ڈی آئی جی انچارج کو مسجد کے شمال کی طرف کھڑا دیکھا جنہیں یہ خبر نہیں تھی کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ ہم نے انہیں صورت حال کے بارے میں بریف کیا اور ان سے دوسرے دروازے بھی کھلوا دینے کی درخواست کی مگر وہ اعلیٰ سطح پر کیے گئے فیصلہ کی خلاف ورزی کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ باہر لوگ مر رہے ہیں اور اگر فوری اقدامات نہ کیے گئے تو بہت خراب اور تکلیف دہ صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ اس بات پر مطمئن تھے کہ مسجد کے اندر سکون ہے' وہ باہر کی صورتِ حال سے یکسر بے نیاز تھے۔

غیر ذمہ داری کی اس سے زیادہ بری مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ پرویز مسعود نے میرے مشورے پر بحیثیت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جرأت مندانہ فیصلہ کیا اور بقیہ پانچوں گیٹ بھی کھولنے کا حکم دے دیا تاہم ڈیوٹی پر موجود سپیشل برانچ کے عملہ نے تذبذب سے کام لیا' کیونکہ ان میں اپنے افسرانِ بالا کے احکام کی خلاف ورزی کا حوصلہ نہیں تھا۔ انسانی جانوں کے تحفظ اور انتظامات کو برقرار رکھنے کے لیے ہم ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ ناچار میں نے اپنے زیرِ کمان پولیس کو تمام دروازے کھولنے کا حکم دے دیا۔ ہجوم اس طرح داخل ہوا جیسے بند گودام میں سے غلہ باہر نکلتا ہے۔

اب چیکنگ ممکن نہیں رہی تھی' اس لیے ہم نے گڑگڑا کر اللہ سے دعا مانگی کی ہماری مدد فرمائے۔ اس کے بعد ہم نے نمازیوں کو صحن مسجد میں بنے ہوئے مختلف انکلوژرز میں بٹھانا شروع کر دیا۔ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود ہم 12:30 سے پہلے انہیں نماز کے لیے صفوں کی حالت میں نہیں بٹھا سکے۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ حساب لگانے میں میں نے بھی غلطی کی تھی کیونکہ اگر تمام دروازے نہ کھولے جاتے تو جمعہ کی نماز اتوار کے روز بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

اس ہنگامی مسئلہ پر قابو پانے کے بعد ہم اپنے سینئرز کے ردِعمل کی بابت پریشان ہونے لگے۔ اگر کوئی کام غلط ہو جاتا خواہ اس کا ہمارے اقدام سے دور کا بھی واسطہ نہ ہوتا' تو فوراً ہمیں ذمہ دار ٹھہرا دیا جاتا۔ سرکاری ملازمت میں اپنے طور پر اقدام کرنے کی ہمت نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے جبکہ بلا چون وچرا اطاعت اور چاپلوسی پر انعام ملتا ہے چاہے کوئی غلط کام کیوں نہ ہو جائے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وائرلیس پر ایس پی سٹی کا ایمرجنسی پیغام ملتے ہی آئی جی مسجد میں پہنچ گئے اور انہوں نے ہمیں کام کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں جونہی فارغ ہوا' وہ میری طرف آئے اور مجھے گرم جوشی سے شاباش دی۔

''تم نے ہمیں ایک بڑی تباہی سے بچا لیا۔'' انہوں نے جذباتی انداز میں کہا۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی اور یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اپنی محنت کا صلہ پالیا ہو۔ آئی جی نے پرویز مسعود کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

معزز مہمانوں کی رہائش گاہوں پر سیکورٹی کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا' کیونکہ ان کے لیے جو مکانات حاصل کیے گئے وہ گلبرگ' شاہ جمال' شادمان اور بعض دوسرے علاقوں میں واقع تھے۔ ان مہمانوں کی مختلف جگہوں پر بار بار آمدورفت کا اس طرح انتظام کیا گیا کہ سیکورٹی کا مسئلہ پیدا نہ ہو اور سڑکوں پر ٹریفک کا بہاؤ عمدہ طریقہ سے جاری رہے۔ ہر وی آئی پی مہمان کی قیام گاہ پر سیکورٹی کے انتظامات کا انچارج ایس پی رینک کے افسر کو بنایا گیا۔

شالامار باغ میں شہریوں کی طرف سے جو استقبالیہ دیا گیا وہ رنگ برنگی سرگرمیوں کا مرقع تھا۔ اس میں شرکت کرنے والا ہر شخص وقار' متانت اور نظم و ضبط کی تصویر تھا۔ ہر دل میں اسلامی اتحاد کا جذبہ موجزن تھا جس کا اظہار شیخ مجیب الرحمٰن کا خیر مقدم کرنے کے معاملہ میں بھی پوری طرح کیا گیا۔ مجیب کو دنیائے اسلام کے بعض اہم قائدین کی کوشش سے آخری مرحلہ پر کانفرنس میں لایا گیا تھا۔ ان کا استقبال اس قدر زوردار تالیوں کے ساتھ کیا گیا کہ ان کا سارا غصہ کافور ہو گیا اور انہوں نے وہ بہت سی شرطیں ختم کر دیں جو پاکستان کے لیے توہین آمیز اور نقصان دہ ہو سکتی تھیں۔ مثال کے طور پر جنگی جرائم کے مقدمات اور اثاثوں کی تقسیم وغیرہ۔ اس طرح خیر سگالی کی جو فضا پیدا ہوئی' اس سے جنگی قیدیوں کی غیر مشروط رہائی کا راستہ بھی ہموار ہو گیا۔

مقررہ راستوں پر خوش آمدید کہنے والے ہجوم 15 سے 35 لائنوں پر مشتمل تھے۔ اس کے باوجود مکمل نظم و ضبط قائم رہا۔ معاشرہ کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے رضا کار مقررہ راستوں کے ساتھ لائنیں قائم رکھنے کے لیے کام کر رہے تھے۔ ٹیکسیوں' رکشاؤں' تانگوں اور دیگر گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے متفقہ انتظامات پر بڑی خوشی سے عمل کیا اور پرائی گاڑیاں رضا کارانہ طور پر سڑکوں سے سینکڑوں گز دور کھڑی کر دیں۔ یہ عظیم الشان یک جہتی کا ایک شاندار مظاہرہ تھا۔ مجھے اپنے عوام پر جو اعتماد تھا اگرچہ وہ بڑی حد تک رومانوی انداز کا تھا لیکن اللہ نے میری لاج رکھ لی۔

سیاستدان اور پولیس مین

جن دنوں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس ہو رہی تھی لاہور سے باہر کسی اور جگہ سستی سیاست کا ایک ناپسندیدہ ڈرامہ سٹیج کیا جا رہا تھا۔ فیصل آباد کے ایس پی جہانزیب برکی اور قصور کے ایڈیشنل ایس پی ایم آر ضیا کانفرنس کے دوران اپنی اہم اور حساس ڈیوٹیوں سے غیر حاضر پائے گئے۔ حالانکہ وہ بڑے ذمہ دار اور فرض شناس افسر تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ مصطفیٰ کھر نے انہیں ملک خالد' یعقوب مان اور پی پی کے بعض لیڈروں کو درست کرنے کی خصوصی ذمہ داری سونپی تھی جو اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ میں حیران تھا کہ ذاتی انتقام لینے کے لیے کیسے موقع کا انتخاب کیا گیا ہے۔

اس کے برعکس ایک دوسرے واقعہ سے قربانی وایثار کے اس گہرے جذبے کا پتہ چلتا ہے جس کا مظاہرہ پولیس افسروں کی طرف سے کیا گیا۔ کانفرنس میں ڈیوٹی پر تعینات ایک ڈی ایس پی جو لاہور سے باہر کا رہنے والا تھا' بڑی ندامت وشرمندگی سے میرے پاس آیا اور ایک ضروری کام سے گھر جانے کے لیے چھٹی مانگی۔ وہ بہت زیادہ ہچکچاہٹ کا شکار بلکہ شرمندہ ہو رہا تھا۔

''وہ اہم کام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا بھائی مر گیا ہے۔ مجھے یہ افسوس ناک خبر ابھی ابھی موصول ہوئی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا وہ آپ کا حقیقی بھائی تھا؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''ہاں۔ جناب وہ میرا حقیقی بھائی تھا۔'' اس نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہ خبر سن کر بڑا دکھ ہوا ہے۔ میری طرف سے دلی تعزیت قبول کریں اور فوری طور پر روانہ ہو جائیں۔ ہم متبادل انتظام کر لیں گے۔'' میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

جب وہ رخصت ہوا تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بندھی ہوئی تھی۔ میں اس کی لگن اور احساسِ فرض سے بہت متاثر ہوا۔ بدقسمتی سے میں اس افسر کا نام بھول گیا کیونکہ اس کے بعد ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔



باب15

ٹریفک کا گورکھ دھندا

میں مئی 1974ء میں بحیثیت اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل ٹریفک (پنجاب) چارج لینے سے پہلے ٹریفک کے بہت سے مسائل سے آگاہ ہو چکا تھا لیکن مجھے یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی کہ ٹریفک پولیس انہیں کنٹرول کرنے والے اقدامات پر توجہ دینے کی بجائے ان کی ظاہری حالت پر زور دیتی تھی۔ دفتر کی تمام تر سرگرمی ان دو امور کے گرد گھومتی تھی۔

(الف) ہر تین مہینے بعد ایک ڈرائیور اور دو سپاہیوں کا جو موبائل موٹر پٹرول انسپکٹر کے ماتحت کام کرتے تھے، تبادلہ کر دیا جاتا تھا۔ خود موبائل پٹرول انسپکٹر کے تبادلہ کی نوبت کبھی نہیں آتی تھی۔

(ب) گاڑیوں کے مطلوبہ تعداد میں چالان کر کے پراسیکیوشن برانچ کے یک طرفہ طور پر مقرر کردہ اہداف پورے کیے جاتے تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بیکار مشق سے کون سا کارآمد مقصد حاصل کرنا مطلوب تھا۔ ممکن ہے سینئر افسروں اور حکومت کو یہ باور کرانا مقصود ہو کہ بہت زیادہ کام ہو رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے متعدد رپورٹیں اور چارٹس تیار کیے جاتے تھے۔ دوسری طرف غفلت کا یہ عالم تھا کہ گاڑیوں، سڑکوں اور ٹرانسپورٹ شعبہ کے بارے میں بنیادی اور ضروری اعداد و شمار بھی میسر نہیں تھے۔ میں جب بھی سٹاف سے ان معاملات کے بارے میں پوچھتا ادھر سے نفی میں جواب ملتا۔ وہ صرف اپنے اختیارات کے استعمال سے واقف تھے یا یہ جانتے تھے کہ پراسیکیوشن کے خوف سے ٹریفک کو منظم حالت میں کیسے رکھا جا سکتا ہے۔

میں نے نچلے عملہ کے غیر ضروری تبادلوں کا سلسلہ فوری طور پر بند کروا دیا۔ جس سے آفس سپرنٹنڈنٹ بہت خوفزدہ ہوا کیونکہ اس طرح اسے اپنی جبر و دباؤ والی اتھارٹی ہاتھوں سے کھسکتی محسوس ہوئی۔ اس کے بعد میں نے یک طرفہ اہداف ترک کر دیئے اور ہدایت کر دی کہ صرف جائز اور درست چالان کیے

جائیں اور دستاویزات کی چیکنگ سڑکوں کی بجائے بس اور ٹرک اڈوں پر کی جائے۔ میں نے حکم جاری کر دیا کہ سڑکوں پر تعینات پولیس کو فقط ٹریفک ضوابط کی خلاف ورزیوں پر نظر رکھنی چاہئے اور ان سے نمٹنا چاہئے۔

بڑی سڑکوں پر ٹریفک کا اصل مسئلہ گاڑیوں کی بلا روک ٹوک رفتار تھی اور حالت یہ تھی کہ پولیس کو رفتار چیک کرنے والے آلات بھی میسر نہیں تھے۔ یحیٰی خاں دور میں جو ٹرانسپورٹ پالیسی متعارف کرائی گئی اس میں تیز رفتاری پر اندھا دھند جرمانے تو کیے جاتے تھے، لیکن سڑک پر تحفظ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے سلسلہ میں کچھ نہیں کیا گیا۔ پیشتر ازیں روٹس ٹرانسپورٹروں کے بڑے گروپوں کو دیئے جاتے تھے تاکہ ٹرانسپورٹ انتظامیہ روڈ سیفٹی کو کاروباری تقاضا کے طور پر یقینی بنا سکے۔ نئی پالیسی یہ تھی کہ جو ٹرانسپورٹر بھی درخواست دے اسے روٹ پرمٹ جاری کر دیا جائے۔ بعض صورتوں میں ایک گاڑی کئی افراد کی ملکیت ہوتی تھی۔ واحد اور مشترک مالکان دونوں اس بات کے لیے کوشاں رہتے تھے کہ جس قدر دولت کمائی جا سکے کمالی جائے۔ جس کے پیش نظر سڑکوں پر سواریاں اٹھانے کے لیے جان لیوا مقابلے ہوتے تھے۔ ٹرانسپورٹروں نے ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں کو دن بھر کی کمائی میں سے کمیشن دینے کی پیشکش کر کے صورت حال کو مزید بدتر بنا دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس نے بھی کمیشن سسٹم کو اپنا لیا۔ کمیشن سسٹم تیز رفتاری کا باعث اور نتیجتہً حادثات کا سبب بنا۔

اس طرح ٹرانسپورٹ پالیسی بذات خود روڈ سیفٹی کو خطرے میں ڈالنے کی ایک وجہ بن گئی، بہر حال میں حکومت کو اصلاحات بروئے کار لانے کے لیے تجاویز بھیجتا رہا۔

ٹریفک کے مسائل بڑے پیچیدہ ہیں، جن کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لینا چاہئے۔ ٹریفک انتظامیہ کے اہم مسائل کو "تین ایز" (Three Es) کے حوالہ سے پکارا جاتا ہے یعنی:

1۔ گاڑیوں اور سڑکوں کی انجینئرنگ (Engineering of Vehicles and Roads)

2۔ قوانین کا نفاذ (Enforcement of laws)

3۔ سڑک استعمال کرنے والوں کی تعلیم (Education of road users)

سڑکوں اور گاڑیوں کی انجینئرنگ میرے محکمہ کے کنٹرول سے باہر تھی جبکہ قوانین کا نفاذ بلیک میلنگ، کرپشن اور دھوکہ دہی کا ذریعہ بن گیا تھا۔ گویا میرے لیے صرف ٹریفک ایجوکیشن کا میدان تھا جس

میں کوئی مفید کام کیا جا سکتا تھا۔

میں نے دفتری عملہ کو ٹریفک کے جملہ اہم پہلوؤں کی بابت اعداد و شمار جمع کرنے اور فہرست بنانے کا حکم دیا۔ جس میں مختلف قسم کی گاڑیوں، مختلف شہروں کے مابین سڑک کے راستے فاصلوں، سڑک استعمال کرنے والوں بشمول مسافروں، ٹرانسپورٹ ملازمین مثلاً ڈرائیوروں، مکینکوں اور کنڈکٹروں، ٹریننگ اسکولوں، ٹیسٹ لینے کے لیے گراؤنڈ، ٹریفک کے انضباط، ٹریفک قوانین کی خلاف ورزیوں کی قسموں سے متعلق حقائق اور اعداد و شمار شامل تھے۔

ٹریفک کی تعلیم کے لیے اے حمید، میرے دوست انور ظہور، صدر آل پاکستان ٹرانسپورٹ ایمپلائز ایسوسی ایشن اور منیر احمد ڈار (ہاکی کے ممتاز ہیرو) نے اپنی تخلیقی سوچ کے ذریعے میری بڑی مدد کی۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے تیز رفتاری پر توجہ دی جائے۔ اس سلسلے میں طے پایا کہ روڈ سیفٹی کے متعلق دلکش نعرے لکھوائے جائیں جو انگریزی کی بجائے اردو میں ہوں کیونکہ زیادہ تر ڈرائیور انگریزی نہیں جانتے۔ بنیادی ہدایات کے بارے میں فیصلہ کر لینے کے بعد میں نے ہائی وے ٹریفک سٹاف کے ساتھ کئی اجلاس کیے تا کہ انہیں بھی مہم میں شامل کیا جا سکے۔ انہوں نے ابتداء میں قدرے کم جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تاہم بعد میں نئے نئے تصورات پیش کرنے لگے۔ انہوں نے مؤثر اور دلچسپ نعرے تیار کرنے میں بھی حصہ لیا۔ جہلم کے ٹریفک انسپکٹر نے سب سے زیادہ مقبول ہونے والا مقولہ یعنی "تیز چلو گے، جلد مرو گے" تجویز کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے اسے مریضانہ سوچ کی بنا پر پسند نہیں کیا لیکن اے حمید کے اصرار پر منظور کرنا پڑا۔ ایک اور ٹریفک انسپکٹر نے "گاڑی سواری۔ امانت تمہاری" کا مقولہ تجویز کیا۔ ایک اور نعرہ میں براہ راست تیز رفتاری کی مذمت کی گئی تھی جو اس طرح تھا۔ "تیز رفتاری جان پر بھاری" اٹک کے ٹریفک انسپکٹر نے یہ فقرہ وضع کیا کہ "ہر موڑ سے موت جھانکتی ہے"۔ ایک اور نعرہ "بچ موڑتوں" تجویز کیا گیا جو پہلے ہی خاصا مقبول تھا کیونکہ وہ ایک پنجابی فلم کے گانے میں استعمال ہو چکا تھا۔

سلامتی کے بارے میں پہلے جو نعرے مستعمل تھے، وہ زیادہ تر انگریزی میں تھے جنہیں اونچا طبقہ تو سمجھ سکتا تھا لیکن ان سے ڈرائیوروں کی تعلیم کا کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ جبکہ ہمارا اصل مقصد ڈرائیوروں کو تعلیم دینا تھا۔ اس لیے اے حمید، چوہدری انور ظہور اور ٹریفک سٹاف نے ڈرائیوروں کے کلچر، نفسیات اور تعلیمی معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اردو میں اقوال تیار کیے۔ تیس کے قریب معیاری اقوال تیار کرنے میں

قریباً ایک مہینہ لگ گیا۔ ان کی پانچ ہزار نقول تیار کرا کے ڈرائیوروں میں تقسیم کی گئیں۔ اب بھی جب ٹریفک پولیس کا کوئی نیا چیف اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہے تو اس فہرست کو جھاڑ پونچھ کر نکالا جاتا ہے اور ان میں سے بعض اقوال سرکاری گاڑیوں پر نظر آنے لگتے ہیں۔

نعروں اور اقوال کا انتخاب ہمارا پہلا قدم تھا۔ دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ ایسے پیغام کو مطلوبہ حضرات تک کیسے پہنچایا جائے۔ یہ کام چوہدری انور ظہور اور دوسروں کی مدد سے آل پاکستان ٹرانسپورٹ ایمپلائز ایسوسی ایشن اور موٹر ٹرانسپورٹ فیڈریشن (ٹرانسپورٹ مالکان کی نمائندہ تنظیم) کو سونپ دیا گیا۔ ہم نے تفصیلی منصوبہ تیار کیا۔ میں نے کنڈکٹروں اور ڈرائیوروں کے نمائندوں سے مذاکرات کیے اور یہ بات ان کے ذہن میں بٹھائی کہ ان کا سارا وقت سڑک پر گزرتا ہے، اس لیے دوسروں کی نسبت حادثات میں ان کے ہلاک یا زخمی ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔ انہیں اپنی جان اور سلامتی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ اگر ان کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے تو وہ کمیشن چھوڑنے کو تیار ہیں۔ اس کے بعد میں نے ٹرانسپورٹ مالکان سے بات کی اور انہیں سمجھایا کہ ہر حادثہ ان کے لیے بھاری مالی نقصان کا موجب بنتا ہے، خواہ انشورنس کی رقم وصول بھی ہو جائے۔ جب تک گاڑی کی مرمت نہ ہو جائے وہ آف روڈ رہتی ہے۔ وہ بھی ہمارے اس نقطۂ نظر کے قائل ہو گئے اور اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ اس طرح سڑک استعمال کرنے والوں کے تمام طبقات کی ابتدائی ٹیمیں بنا دی گئیں تاکہ روڈ سیفٹی مہم وسیع پیمانہ پر چلائی جا سکے۔

ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں کی تنظیموں نے ضلعی ہیڈ کوارٹرز میں بس اڈوں پر روڈ سیفٹی کے موضوع پر ہفتہ وار اجلاس منعقد کرنے اور گزشتہ ہفتے کے دوران تشہیری اقدامات کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ٹریفک انسپکٹروں کو ہفتہ وار اجلاسوں کا کوارڈی نیٹرز اور ان کی کارروائی قلمبند کرنے کے لیے ریکارڈ کیپرز مقرر کر دیا گیا۔ مختلف کمیٹیوں نے گاڑیوں پر، اڈوں کے اندر اور باہر، سڑکوں کے ساتھ واقع دیواروں وغیرہ پر اقوال پینٹ کرانے کا اہتمام کیا۔ بڑے شہروں مثلاً لاہور، راولپنڈی اور ملتان وغیرہ میں کپڑے کے بینرز لگائے گئے۔

موٹر ٹرانسپورٹ فیڈریشن نے سید علی اصغر شاہ صدر اور حاجی محمد حیات سیکرٹری جنرل کے زیر قیادت روڈ سیفٹی مہم میں فراخ دلی سے سرمایہ لگایا اور اسے کامیاب بنایا۔ میاں معراج دین اور نصیر بٹ بھی

بڑے مددگار ثابت ہوئے۔ فیڈریشن نے میری درخواست پر طلبا کے درمیان روڈ سیفٹی کے موضوع پر مضمون نویسی کا مقابلہ کرایا جس میں طلبا کو معقول انعامات دیئے گئے۔ اس مقابلہ کی سرپرستی کرنے والوں میں اے حمید کا ہفت روزہ "پاک نامہ" بھی شامل تھا جس نے انعامات کے لیے فنڈز فراہم کرنے کی پیشکش کی۔ تقسیم انعامات کی تقریب جناح ہال (لاہور) میں ہوئی جس میں راؤ عبدالرشید، آئی جی (پنجاب) مہمان خصوصی تھے۔ میں نے تقریر کرنے کے علاوہ روڈ سیفٹی کے موضوع پر مشتاق بخاری کی لکھی ہوئی نظم بھی سنائی۔

موٹر فیڈریشن نے مختلف شاہراہوں پر اپنی گشتی ٹیمیں منظم کیں۔ ان ٹیموں کی طرف سے چیکنگ میں ٹرانسپورٹ ایمپلائز کے نمائندے اور ٹریفک پولیس والے بھی شریک ہو گئے تا کہ مل کر چیکنگ کر سکیں۔ اڈہ میٹنگوں اور مشترکہ چیکنگ نے خود احتسابی اور اپنی اصلاح آپ کی شکل اختیار کر لی، ایسے اجتماعات میں ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں نے ولولہ انگیز تقریریں کیں اور ان میں سے بہت سے خاصے پڑھے لکھے اور اپنے مضمون میں ماہر نکلے اور اس سے ان میں اپنی اہمیت کا احساس بھی اجاگر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ٹریفک سٹاف کو بھی ترغیب دی گئی کہ وہ اپنے اختیارات سے غلط فائدہ اٹھانے کی بجائے روڈ سیفٹی کی مہم پر توجہ دے۔ اب وہ کھلم کھلا رشوت ستانی سے گریز کرنے لگے تھے کیونکہ انہیں خبر تھی کہ میں ڈرائیور برادری کی شکایات پر فوری توجہ دیتا تھا۔ وہ با آسانی اور فوری طور پر مجھ سے مل سکتے تھے میں نے کڑی نگرانی کے لیے آئی جی کی اجازت سے ٹریفک انسپکٹروں کو رینج کے ڈی آئی جی کے ماتحت کر دیا کیونکہ لاہور سے میرا ریموٹ کنٹرول مؤثر نہیں تھا۔

میری تمام تر بھاگ دوڑ کے باوجود لاہور سے دور دراز مقامات پر براہ راست کنٹرول مؤثر نہیں ہو سکا۔ میں نے ہر ماہ کے بہترین ڈرائیور کے لیے انعامی سلسلہ کا اجراء بھی کیا۔ صوبائی سطح پر اول آنے والے کو 500 روپے اور ضلعی سطح پر پہلی پوزیشن حاصل کرنے والے کو 200 روپے انعام ملتا تھا۔ یاد دہانی کے لیے ہر ڈرائیور کی سیٹ کے پاس ایک سٹکر آویزاں کیا گیا جس پر لکھا تھا۔ "خطرناک ڈرائیونگ بھیانک انجام"۔

سوہنی کا تذکرہ اور روڈ سیفٹی

میں نے آئی جی کی اجازت سے وزیر اعلیٰ پنجاب حنیف رامے سے ملاقات کی تا کہ حکومت کے

وسائل اور اثر رسوخ سے روڈ سیفٹی مہم کو وسعت دی جاسکے۔ انہوں نے ہماری مہم پر مسرت کا اظہار کیا اور تمام محکموں کو ہدایات جاری کر دیں کہ اس مہم کو ہر ممکن طریقہ سے کامیاب بنایا جائے اور فروغ دیا جائے۔ انہوں نے مزید کہا کہ بعض اقوال منفی سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے بقول وزیر اعظم بھٹو نے ملتان میں ایک بینر "تیز چلو گے، جلد مرو گے" لکھا ہوا پڑھا تو انہیں ناگوار گزرا۔ انہوں نے مزاحیہ انداز میں پوچھا" کیا یہ میرے لیے ہے؟" (جیسا کہ بعد کے واقعات سے ثابت ہوا مذکورہ قول واقعی ان کے لیے بھی تھا۔) انہوں نے ہدایت کی کہ اس قول کی تشہیر سے اجتناب برتا جائے، لیکن اس وقت تک وہ انتہائی مقبول بن چکا تھا اور ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے وزیر اعظم کی حسب ہدایت تمام محکموں خصوصاً محکمہ تعلیم، ہائی ویز، لوکل گورنمنٹ، ڈویژنل کمشنروں اور رینج کے ڈپٹی انسپکٹر جنرلوں سے رابطہ کیا۔ انہیں روڈ سیفٹی کی بابت اقوال کی نقول بھیجیں تاکہ ان کی مزید نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جا سکے اور مجسٹریٹ نیز پولیس افسروں کے ذریعے مباحثوں، مذاکروں، سیمینارز نیز اسکولوں اور کالجوں میں لیکچروں کی صورت میں تشہیر کی جا سکے۔ محکمہ شاہرات، میونسپل کارپوریشنوں اور میونسپل کمیٹیوں سے درخواست کی گئی کہ شاہراہوں اور شہر کی اہم سڑکوں پر بڑے بڑے بورڈز کے ذریعے ان اقوال کی تشہیر کی جائے۔ افضل وٹو، وزیر ٹرانسپورٹ خلوص دل کے ساتھ ہماری مہم میں شامل ہو گئے اور اپنے پورے محکمہ کو اس کام پر لگا دیا۔

محکمہ ڈاک بھی بڑا معاون ثابت ہوا۔ انہوں نے ٹریفک سے متعلق اقوال کو اپنے منسوخ شدہ ٹکٹوں پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ واقعتاً ایک نتیجہ خیز سوچ تھی۔ کیونکہ لفافوں، پوسٹ کارڈوں، پارسلوں اور ڈاک سے بھیجی جانے والی دیگر اشیاء پر چسپاں ٹکٹ ہمارے پیغام کو ہر دفتر اور گھر تک لے گئے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ دکانداروں نے بھی ان اقوال کو فروغ دینے میں بہت زیادہ دلچسپی لی۔ تجزیہ کرنے پر پتہ چلا کہ انہیں اس بات سے بڑی دلچسپی تھی کہ ان کی دکانوں کے سامنے سے تجاوزات کو ہٹا لیا جائے۔

میری خواہش تھی کہ اس مہم کو عوامی خدمت کے منصوبے کے طور پر چلایا جائے۔ میں نے اس

سلسلے میں اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو خطوط لکھے مگر ان کا جواب مایوس کن تھا۔ انہوں نے بھاری رقوم کا مطالبہ کیا جبکہ ہمارے پاس اشتہارات کے لیے فنڈز نہ ہونے کے برابر تھے۔

چونکہ روڈ سیفٹی ہر شخص کا مسئلہ تھا اس لیے میں ہر اس شخص کے پاس گیا جو اس کے فروغ میں مدد دے سکتا تھا۔ ان میں کئی مشہور شاعر بھی شامل تھے۔ وہ ایسے خشک اور روکھے پھیکے موضوع پر کچھ لکھنے یا شعر موزوں کرنے کو تیار نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ممتاز شاعر احسان دانش کا خیال تھا کہ ایسے موضوع پر طبع آزمائی کرنا قریباً ناممکن ہے۔ میں نے ان کی اپنی زبان میں بات کی اور ان کی توجہ پنجابی میں سوہنی مہینوال کی عوامی داستان کی طرف مبذول کرائی۔ مشہور روایت کے مطابق سوہنی اپنے محبوب سے ملنے کے لیے مٹی کے گھڑے پر تیر کر دریائے چناب کے پار جایا کرتی تھی۔ وہ اس وقت ڈوب گئی جب اس کی حاسد نند نے اس کے پکے گھڑے کو کچے گھڑے سے بدل دیا۔ سوہنی کی المناک موت پر بہت سے شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ وہ گھڑا کیا تھا؟ وہ دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانے کا ذریعۂ سفر تھا جبکہ کچا گھڑا ایک غیر محفوظ گاڑی کی طرح تھا۔ آج کل ہزاروں، لاکھوں گاڑیاں دیوانہ وار ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتی اور راستے میں بہت سی "سوہنیوں" کا خون کرتی ہیں۔ بہت سے عاشق حادثات میں مارے جاتے ہیں۔ ان کے پسماندگان عمر بھر روتے رہتے ہیں۔ حادثات کے نتیجہ میں انسانیت کو خون، زخموں، موت، غم اور مصیبت سے واسطہ پڑتا ہے۔ اگر ہماری سڑکیں محفوظ ہوں تو ہمارے چاروں طرف خوشیاں رقص کرتی نظر آئیں۔ ماؤں کو روزانہ اسکول جانے والے بچوں اور بچیوں کی فکر میں ہلکان نہ ہونا پڑے۔ سڑکوں پر سلامتی ہر انسان کا مسئلہ ہے۔ اس لیے شعرائے کرام جو بہت ہی حساس ہوتے ہیں، اتنے اہم انسانی مسئلہ کے بارے میں کیوں نہیں لکھ سکتے؟

میں نے ان کے ساتھ اس انداز میں خاصی دیر تک گفتگو کی۔ آخر کار وہ قائل ہو گئے۔ انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ پہلے ان خطوط پر کیوں نہیں سوچا گیا۔ احسان دانش نے تسلیم کیا کہ اس مضمون میں درد و کرب، سوز و گداز اور خوشیاں موجود ہیں جو اچھی شاعری کے اجزائے ترکیبی سمجھے جاتے ہیں۔ جب انہوں نے اس موضوع پر لکھا تو ان کی نگارشات واقعی اثر انگیز ثابت ہوئیں۔ میں نے کئی

دوسرے شاعروں کے ساتھ اسی استدلال کو بنیاد بنا کر گفتگو کی۔ انہوں نے بھی روڈ سیفٹی پر اردو اور پنجابی میں مؤثر و دلنشیں نظمیں لکھیں۔ خود پولیس میں سے کئی شاعروں نے اس موضوع پر نظمیں موزوں کیں جن کی وسیع پیمانہ پر تشہیر کی گئی۔

روڈ سیفٹی مہم کے بڑے شاندار نتائج نکلے۔ حادثات کی تعداد بڑی حد تک گھٹ گئی۔ ایک ہفتہ ایسا بھی گزرا جس کے دوران لاہور سے راولپنڈی تک جی ٹی روڈ پر کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ نہ ہی کسی گاڑی کا چالان کیا گیا۔ ہم نے اس کامیابی پر شاندار جشن منایا اور اسے اجتماعی کوششوں کا حاصل قرار دیا، جس میں ڈرائیوروں کے ٹریفک کی بابت ادراک و شعور کا بڑا دخل تھا۔ موٹر ٹرانسپورٹ فیڈریشن کے صدر سید علی اصغر شاہ نے منتخب ڈرائیوروں کے اعزاز میں شاندار ڈنر کا اہتمام کیا۔ میں اس میں شرکت کے لیے ایک ویگن لے کر گیا جس میں استاد دامن، احسان دانش، مشتاق بخاری اور دیگر بہت سے مشہور شاعر سوار تھے۔ ہم نے راستے میں ویگن کے اندر ایک "چلتا پھرتا مشاعرہ" بھی کر ڈالا۔

ٹیکسیوں کی پڑتال

طاقت کا بلاسوچے سمجھے استعمال اصل مسئلہ کو حل کرنے کی بجائے بہت سے نئے مسائل کھڑے کر دیتا ہے، تاہم خصوصی ذہنیت کے مالک بیوروکریٹس اور پولیس والے پیچیدہ مسائل کے بارے میں غیر جانبدارانہ انداز فکر اختیار نہیں کرتے۔ اکتوبر 1974ء میں وزیر ٹرانسپورٹ میاں افضل وٹو نے ایک میٹنگ بلائی جس میں آئی جی، ایس ایس پی، منصور حسن خاں چیئرمین پراونشل ٹرانسپورٹ اتھارٹی اور راقم الحروف نے بطور اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل (ٹریفک) شرکت کی۔ اس اجلاس میں ایسے ٹیکسی اور رکشا ڈرائیوروں کے بارے میں غور و خوض کیا گیا جو میٹر استعمال نہیں کرتے اور مسافروں سے منہ مانگا کرایہ وصول کرتے ہیں۔ وزیر اعظم بھٹو نے اس موضوع پر روزنامہ "نوائے وقت" میں ایک اداریہ پڑھا تھا اور اس پر اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم انہیں لوگوں کی کھال اتارنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ ان کے خلاف کارروائی ہونی چاہئے"۔ میٹنگ کا نوٹس ملنے پر میں نے کچھ مطالعہ کیا۔ میں نے گاڑیوں کی قیمت، پٹرول، دیکھ بھال پر اٹھنے والے مصارف اور کرایہ کی شرح کو جو کئی سال پہلے مقرر کی گئی تھی، بنیاد بنا کر ٹیکسی اور رکشہ مالکان کی بچت کے بارے میں اعداد و شمار جمع کیے۔ گاڑیوں اور پٹرول کی قیمت میں 1973ء کی

جنگ رمضان کے بعد ہوش ربا اضافہ ہوگیا تھا لیکن ٹرانسپورٹ کے کرائے نہیں بڑھائے گئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رکشا اور ٹیکسی کو کرایہ کی پرانی شرح پر چلانا نفع بخش کاروبار نہیں رہا تھا۔

اجلاس شروع ہوا تو ہر ایک نے رکشا اور ٹیکسی ڈرائیوروں کے خلاف انتہائی سخت کارروائی کا مطالبہ کیا۔ جس میں موقع پر ہی بھاری جرمانہ وصول کرنے کی تجویز بھی شامل تھی۔ میں نے کہا کہ ان لوگوں کے ساتھ انصاف ہونا چاہئے ورنہ وہ رکشہ اور ٹیکسی چلانا بند کردیں گے۔ ٹیکسیوں کو پرائیویٹ کاروں میں تبدیل کرکے فروخت کردیا جائے گا۔ چونکہ رکشاؤں سے کوئی دوسرا کام نہیں لیا جاسکتا، لہٰذا ان کے ڈرائیور مکمل ہڑتال کردیں گے۔ ہمیں کوئی معقول اور قرین انصاف نقطۂ نظر اپنانا چاہئے۔ رکشا اور ٹیکسی والے فی سبیل اللہ یہ کام نہیں کرتے۔ وہ کاروباری لوگ ہیں اور یہ بہت چھوٹا کاروبار ہے۔ انہیں ان کی محنت اور سرمایہ کاری کا معقول معاوضہ ملنا چاہئے۔ وزیر ٹرانسپورٹ اور انسپکٹر جنرل نے میرے نقطہ نظر سے اتفاق کیا تاہم وکیل خاں، ڈی آئی جی اور اصغر خاں، ایس ایس پی لاہور نے ڈٹ کر مخالفت کی۔ وہ ان کے خلاف انتہائی سخت قدم اٹھانے کے حق میں تھے اور یہاں تک کہتے تھے کہ ان کی " کھال ادھیڑ دی جائے" یا انہیں "جیلوں میں ڈال دیا جائے"۔ انہوں نے میرے تجزیہ کا بھی مذاق اڑایا اور مجھے ایک کمزور افسر قرار دیا۔ جب پنجاب ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے چیئرمین نے کہا کہ ٹرانسپورٹروں کی طرف سے کرایہ میں اضافہ کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جارہا تو ہمیں " آ بیل مجھے مار" کے مصداق کرایوں میں اضافہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے اس ضمن میں ان کی طرف سے کیے گئے مطالبے کا حوالہ دیا اور متعلقہ ریکارڈ بھی پیش کیا۔ تنگ آ کر انہوں نے کہا۔

"وزیراعظم کی مذکورہ بالا آبزرویشن کے بعد کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا"۔ یہ خالصتاً بیوروکریٹس والا اندازِ فکر تھا۔

"سرکاریں اخباری اداریوں پر نہیں چلتیں۔ ضروری نہیں کہ وہ اداریہ رکشہ ٹیکسی والوں نے پڑھا بھی ہو۔ اداریہ کوئی سرکاری نوٹیفکیشن نہیں ہوتا"۔ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

اجلاس میں شریک دانشمند حضرات نے سخت کارروائی والی تجویز سے اتفاق کیا جس کا نتیجہ ہمارے اندازہ کے عین مطابق یہ نکلا کہ ٹیکسیاں اور رکشے سڑک سے غائب ہوگئے۔ ایک ہفتہ کی مکمل ہڑتال کے بعد راؤ عبدالرشید آئی جی نے مجھے بلایا۔ انہوں نے میٹنگ میں پیش کیے گئے میرے نقطۂ نظر کو سراہا اور

آخر میں کہنے لگے کہ ہڑتال ختم کرانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ میں نے عرض کیا کہ "اپنے طاقتور ڈی آئی جی اور ایس ایس پی کو ہدایت کریں کہ وہ اس معاملہ سے الگ ہو جائیں۔ انہوں نے ایک بدترین مسئلہ کھڑا کر دیا ہے اور متعلقہ لوگوں کے ساتھ میرے خوشگوار مراسم بھی خطرہ میں پڑ گئے ہیں۔ اس کے بعد میں اپنی سی کوشش کروں گا۔" میں نے یوسف صابر اور چوہدری انور ظہور سے بات کی پھر انہیں راؤ رشید کے پاس لے گیا۔

رکشے دوبارہ سڑکوں پر آ گئے، لیکن میٹر کے بغیر کرایہ کی وصولی کے معاملہ کو نظر انداز کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ وزیر ٹرانسپورٹ نے کچھ عرصہ بعد کرائے بڑھا دیئے تاہم وہ اقدام کافی نہیں تھا۔ ٹیکسیاں اگلے 17 سال تک سڑکوں پر نہیں آئیں۔ یہاں تک کہ 1991ء وزیر اعظم نواز شریف کو پیلی ٹیکسیوں کی اسکیم چلانی پڑی۔ رکشے بھی ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے لیکن ان کا کوئی دوسرا مصرف نہیں تھا اس لیے مالکان کو مجبوراً اپنے روزگار کے لیے انہیں سڑکوں پر لانا پڑا۔ مسافروں کو شور کرنے والے لڑکھڑاتے ہوئے اور تکلیف دہ رکشوں پر سفر کرنا پڑتا ہے۔ ان تمام برسوں میں لوگوں کو انتہائی تکلیف برداشت کرنی پڑی خصوصاً ہنگامی حالات میں انہیں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ سچ ہی تو کہتے ہیں کہ بیوقوفوں کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔



باب16

منشّیات کی دنیا

جن دنوں میں روڈ سیفٹی مہم میں مصروف تھا' میرے قریبی دوست اور کالج کے کلاس فیلو عبدالخالق

اعوان (تب ڈپٹی سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ ڈویژن) نے مطلع کیا کہ میری ڈی آئی جی کے رینک میں ترقی کی منظوری دے دی گئی ہے۔ بلاشبہ مجھے اس خبر سے خوشی ہوئی تاہم میں نے ان سے درخواست کی کہ فی الحال فائل کو التوا میں رہنے دیں تاکہ میں روڈ سیفٹی پروگرام کے مختلف مراحل مکمل کرسکوں۔ میرے اس خلاف توقع جواب پر انہیں حیرت ہوئی کیونکہ اکثر افسر محض اچھی پوسٹنگ کی خبر سن کر ہی خوشی سے اچھلنے لگتے ہیں' ترقی کی تو بات ہی اور ہے۔ وہ تشویش کا اظہار کرنے لگے کہ کہیں میں وہ چانس ضائع نہ کر بیٹھوں کیونکہ اس عہدہ کے لیے پانچ دوسرے افسران کے نام بھی منظور کیے گئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ''ہمیں سارے معاملات خداوند کریم پر چھوڑ دینے چاہئیں۔'' ساتھ ہی ان سے گذارش کی کہ سردست فائل کو دبائے رکھیں۔ ان کی بات درست نکلی اور میرے راستہ میں واقعی ایک دیوار کھڑی کردی گئی۔

اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد انہوں نے اطلاع دی کہ میری خدمات ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود نے طلب کی ہیں۔ میں ایف ایس ایف میں نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ ان دنوں وہ خاصی بدنام ہورہی تھی۔ میں فوراً پشاور پہنچا اور سعید احمد خان سے ملا۔ انہوں نے میری بات سننا بھی گوارا نہیں کیا اور مجھے بتایا کہ ''تمہارا نام خود بھٹو صاحب نے منظور کردیا ہے۔'' مجھے اس کی آنکھوں میں کچھ شرارت محسوس ہوئی جیسے وہ غلط بیانی کررہا ہو۔ اس لیے میں چوہدری فضل الٰہی' صدرِ پاکستان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ مداخلت کرکے میرا تبادلہ رکوائیں۔ صدر نے وقار احمد سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ سے بات کی اور مجھے پاکستان نارکوٹکس کنٹرول بورڈ میں بھیجنے کو کہا، جہاں خالی جگہ موجود تھی۔ وقار احمد نے ان کی بات اس شرط کے ساتھ مان لی کی نارکوٹکس کنٹرول بورڈ کے چیئرمین کی طرف سے میری خدمات طلب کی جائیں۔

اسے میری خوش قسمتی سمجھئے کہ ان دنوں نارکوٹکس بورڈ کے چیئرمین صاحبزادہ رؤف علی تھے جو ماضی میں میرے افسر رہ چکے تھے۔ میں فوراً ان کے پاس پہنچا اور ان سے اپنی خدمات طلب کرنے کی بابت مراسلہ حاصل کرلیا۔ اس کے بعد میں خالق اعوان سے ملا، انہوں نے اسی دن میری پوسٹنگ کا نوٹیفکیشن جاری کردیا۔ میں نے جنوری 1975ء میں نارکوٹکس بورڈ (اسلام آباد) میں بحیثیت جوائنٹ ڈائریکٹر ذمہ داریاں سنبھالیں۔ مخالفین کی شیطانی اسکیمیں دھری رہ گئیں۔ کچھ عرصہ بعد صاحبزادہ صاحب نے مجھے پنجاب میں نارکوٹکس بورڈ کا دفتر قائم کرنے کے لیے لاہور بھیج دیا۔

پاکستان نارکوٹکس کنڑول بورڈ

پاکستان نارکوٹکس کنڑول بورڈ کا قیام محض ایک سال پیشتر عمل میں آیا تھا اور اس کی نیچے سے اوپر تک ساری تنظیم کا کام ہونا باقی تھا۔ چیئرمین نے علاقائی دفتر قائم کرنے، فیلڈ سٹاف بھرتی کر کے اسے تربیت دینے اور مؤثر آپریشنز کے لیے انٹیلی جنس نیٹ ورک منظم کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپ دی۔ انہوں نے مجھے بطور رابطہ آفیسر امریکی ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی کے ساتھ بھی منسلک کر دیا جو پاکستان نارکوٹکس کنڑول بورڈ کے آپریشنز اور ان کی کامیابی کے امکانات کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

صاحبزادہ رؤف علی نے جو بہت لائق اور باخبر افسر تھے، کئی اجلاسوں میں منشیات کے مسئلہ پر اس کے تمام پہلوؤں سمیت بحث کی۔ انہوں نے ہمیں برطانیہ اور چین کے مابین انیسویں صدی میں افیون کے حوالہ سے لڑی جانے والی لڑائیوں کے تاریخی پس منظر سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ برطانوی ہند کو افیون کی تجارت پر اجارہ داری حاصل تھی اس نے اس کاروبار کو چین میں فروغ دینے کی کوشش کی تو چین کی حکومت کو اپنے عوام کے مفاد میں مزاحمت کرنی پڑی جس پر دونوں طاقتوں کے مابین لڑائیاں ہوئیں۔

جدید منشیات بہت عمدہ حالت میں تیار کی جاتی ہیں اور ان کی اثر پذیری میں کئی گنا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ افیون، بھنگ اور کوکین تین قدرتی منشیات ہیں جو بالترتیب پوپی، کینابس اور کوکا کے پودوں سے حاصل کی جاتی ہیں۔ افیون اور کوکین کو ادویات میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جبکہ کینابس کے ریشے سے مضبوط کینوس اور رسے تیار کیے جاتے ہیں جو جہاز رانی میں کام آتے ہیں۔ افیون اور بھنگ ہمارے علاقہ میں پیدا ہوتی ہیں جبکہ کوکین جنوبی امریکہ میں کاشت کی جاتی ہے۔ قدرتی پودوں سے حاصل ہونے والے یہ تینوں نشے صدیوں سے انسانی استعمال میں ہیں لیکن اس مسئلہ نے خطرناک صورت اس وقت اختیار کی جب اس نباتاتی پیداوار کو مارفین، پاوڈر اور تیل کی شکل میں ڈھالا گیا کیونکہ مارفین، پاوڈر اور ان کے تیل ایک صحت مند جوان آدمی کو بہت تھوڑے وقت میں ہلاک کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

مصنوعی طور پر تیار کردہ منشیات اس سے بھی زیادہ سنگین مسئلہ بن چکی ہیں اور ٹرانسپورٹ کے ذریعے ہمارے ہاں آتی ہیں۔ ہمارے عوام کو عام طور پر اس مسئلہ کے نقصان دہ مضمرات کا علم نہیں۔ ان میں سے بعض بڑی بے نیازی سے کہہ دیتے ہیں کہ قدرتی منشیات کی مغرب کو ترسیل جاری رہنی چاہیے تا کہ اسے

اس کے سابقہ سامراجی مظالم کی سزا مل سکے۔ اس کا ایک برا اثر برآمدات پر بھی پڑا ہے کیونکہ منشیات کے شبہ میں کسٹم والوں کو سامان کی تلاشی دینے کی کوفت سے بچنے کے لیے مغرب کے درآمد کنندگان نے ہماری اشیاء کی خرید میں کمی کر دی ہے۔ علاوہ ازیں یہ یک طرفہ تجارت نہیں ہے۔ ایک پاکستانی سمگلر منشیات کی سمگلنگ سے جو پیسہ کماتا ہے وہ جائز مالیاتی طریقہ سے ملک میں نہیں لایا جاتا بلکہ منشیات کی شکل میں آتا ہے تاکہ اس سے مزید دولت کمائی جا سکے۔ اس طرح یہ برائی مزید کئی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ سمگلروں نے اپنے اڈے قائم کر رکھے ہیں جو متوازی ریاستوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے اپنے فوجی دستے اور مواصلاتی نظام ہیں۔ سیاست اور حکومت میں ان کا اثر و رسوخ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔

صاحبزادہ صاحب نے حسب معمول اس لعنت پر اپنی پوری توانائی سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس جہاد میں، میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ اوّلین ترجیح یہ طے پائی کہ عوام میں منشیات کے ضرر رساں نتائج کے متعلق جانکاری پیدا کی جائے۔ ذرائع ابلاغ کے علاوہ والدین خصوصاً ماؤں اور معاشرہ میں نمایاں حیثیت کے حامل افراد مثلاً علمائے کرام، اساتذہ، ڈاکٹروں اور دانشوروں کو نشہ کے سنگین مضمرات کی بابت بریف کیا جائے۔ اس کے بعد ان پر زور دیا جائے کہ بہترین سماجی ماحول پیدا کرنے میں ہماری مدد کریں۔ تاکہ بے خبر نوجوان اس لعنت کے چنگل میں نہ پھنسیں۔

ہماری دوسری ترجیح منشیات کی بآسانی دستیابی کو ناممکن بنانے کے لیے سخت ترین اقدامات کرنا تھی۔ کسی شے کی عام دستیابی اس کے استعمال پر ابھارنے والی سب سے بڑی ترغیب ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک انتہائی باخبر شخص بھی بے چینی اور پریشانی کے لحات میں یا بگڑے ہوئے دوستوں کی صحبت میں نشہ استعمال کرنے لگتا ہے۔ کئی ڈاکٹر محض اس لیے مارفین کے عادی بن جاتے ہیں کہ ان کے ہسپتالوں میں مارفین طبی استعمال کے لیے آسانی سے دستیاب ہوتی ہے۔ وہ اسے انتہائی مایوسی و پریشانی کے موقع پر استعمال کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ عادی ہو جاتے ہیں۔

چیئرمین نے وزارت داخلہ کی معرفت وفاقی انفورسمنٹ ایجنسیوں مثلاً کسٹم، ایف آئی اے، کوسٹ گارڈز، ایئرپورٹ سیکورٹی فورس، ریلوے پولیس اور صوبائی ہوم ڈیپارٹمنٹس کے ذریعے صوبائی ایجنسیوں مثلاً پولیس، ایکسائز، محکمہ محصولات اور عدالتوں سے رابطہ قائم کیا۔ جب انہیں مسئلہ کے خطرناک پہلوؤں سے آگاہ کیا گیا تو منشیات کے خلاف تمام تنظیموں کی انسدادی سرگرمیوں میں تیزی آگئی۔

امریکیوں کی غلط سوچ

امریکیوں کی زبردست خواہش تھی کہ پاکستان نارکوٹکس کنٹرول بورڈ منشیات کی روک تھام کے لیے اپنی ایلیٹ فورس قائم کرے۔ لیکن اس کے مؤثر ہونے کے بارے میں میری رائے مختلف تھی۔ میرا پختہ یقین تھا کہ ساری کوششوں کو ملک بھر کے انتظامی سسٹم سے مربوط کرنا ضروری ہے۔ پہلے سے موجود نظام کو نظر انداز کر کے اگر کوئی کام کیا گیا تو محکمانہ رقابت اور انتشار کے باعث سارا معاملہ خراب ہو جائے گا۔ امریکی اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھے کہ پاکستان میں جنرل ایڈمنسٹریشن کی شکل میں ایک مؤثر نظام موجود ہے کیونکہ ان کے اپنے ملک میں اس طرح کا کوئی نظام نہیں تھا۔ میں نے انہیں سمجھانے کی انتہائی کوشش کی کہ تھانہ کے ایس ایچ او اور ضلع کے ڈپٹی کمشنر کی پشت پر پورا نظام ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر قوت، اثر و رسوخ اور وسائل میسر ہوتے ہیں وہ کوئی ایلیٹ یا ٹاسک فورس حاصل نہیں کر سکتی۔ عام انتظامیہ خصوصاً پولیس کو بہت دور تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور اس کی اثر انگیزی اس قدر دوررس ہوتی ہے کہ فوج بھی اس کا متبادل نہیں بن سکتی۔

میں نے انہیں بتایا کہ مسائل کے پیدا ہونے اور ان میں پیش آنے والی پیچیدگیوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ پولیس اور ضلعی انتظامیہ کو مطلوبہ وسائل فراہم نہیں کیے گئے۔ اگر ہم نے منشیات کے حوالہ سے کوئی آزادانہ منصوبہ بندی کی تو اس کا نتیجہ عام انتظامیہ میں احساس مغائرت پیدا کرنے کے سوا کچھ اور نہیں ہو گا۔ انتظامی افسر یہ سوچنے لگیں گے کہ ایلیٹ فورس کے قیام کے بعد منشیات کے خلاف کاروائی ان کی ذمہ داری نہیں رہی۔ اور انتظامیہ کے لاتعلق ہو جانے کے بعد مجوزہ ایلیٹ فورس اپنا مقصد کسی طور پر بھی حاصل نہیں کر سکے گی۔ اس طرح صورتحال بہتر ہونے کی بجائے مزید خراب ہو جائیگی۔ میری دیانت دارانہ رائے تھی کہ پولیس کے ایک گروپ کو ایلیٹ فورس سے موسوم کرنے کا یہ نادر منصوبہ جسے متعلقہ محکموں کا تعاون اور مطلوبہ وسائل میسر ہونگے، الٹا نقصان دہ ثابت ہوگا۔ میں اپنے خیالات پر استقلال اور سختی سے ڈٹا رہا اور امریکیوں کے ساتھ اجلاسوں میں انہیں اپنے موقف سے آگاہ کرتا اور سمجھاتا رہا۔ میں اپنے دائرہ اختیار میں اس بات کے لیے لڑتا رہا کہ پاکستان نارکوٹکس کنٹرول بورڈ کو محض رابطہ کا کردار دیا جائے۔ جو ایک ماہر ادارے کے طور پر کارآمد معلومات اور اپنی پیشہ ورانہ رائے سے دوسری انسدادی ایجنسیوں کی مدد کرے۔ مذکورہ مقصد کے پیش نظر میری درخواست پر نارکوٹکس بورڈ نے سمگلروں کے بڑے بڑے گروہوں

کا ریکارڈ تیار کیا جو اندرون و بیرون ملک سے حاصل کردہ معلومات پر مبنی تھا اور اس کی تفصیلات دوسری ایجنسیوں کو فراہم کی گئیں۔ اسی طرح ان کی پناہ گاہوں، مقررہ راستوں نیز رسل و رسائل کے طریقوں کی بھی فہرست بنائی گئی۔ خام مال سے منشیات تیار کرنے والی لیبارٹریوں کا سراغ لگایا گیا تاکہ متعلقہ انسدادی ایجنسیاں ان پر چھاپے مار سکیں بہتر نتائج منشیات کے خلاف آپریشنز ان کے مابین رابطے اور انسدادی ایجنسیوں کو میدان میں لانے سے نکلے جو ایک الگ تھلگ ایلیٹ فورس حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

امریکہ کا ذاتی مفاد

ہمارے ملک میں لوگ ہیروئن کے استعمال سے پہلی بار 1979ء میں آشنا ہوئے۔ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد ہیروئن نے افیون کے متبادل جگہ حاصل کر لی کیونکہ مذکورہ آرڈیننس نافذ ہونے کے بعد افیون فروشوں کو لائسنس دینے کا سلسلہ بند کر دیا گیا تھا۔ ایک جائز اور نسبتاً کم نقصان دہ راستہ بغیر سوچے سمجھے محض جذبات میں آ کر بند کر دیا گیا اور وہ خلا پُر کرنے کے لیے ایک خلاف قانون نیز بہت ہی خطرناک لعنت کو پاؤں جمانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلات آگے آئیں گی۔

ایک مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر رشید چوہدری نے منشیات کے عادی افراد کے علاج معالجہ اور بحالی کے مراکز قائم کرنے پر زور دیا تاکہ اس مسئلہ پر طلب کی جانب سے بھی حملہ کیا جا سکے کیونکہ طلب جس قدر کم ہو، رسد اسی قدر گھٹ جاتی ہے۔ لیکن امریکی انسدادی پہلو میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے تاکہ ان کے ملک کو منشیات کی فراہمی کم ہو سکے۔ جبکہ عالمی ادارہ صحت انسدادی اقدامات کے ساتھ ساتھ مریضوں کے علاج اور بحالی پر بھی زور دیتا ہے۔ بورڈ کے زیر اہتمام بہت سے اجلاس اور سیمینار منعقد ہوئے تاکہ علاج معالجہ نیز بحالی کی ضروریات کا اندازہ لگایا جا سکے۔

یونیورسٹیوں کے ذریعے منشیات کے حوالے سے اعداد و شمار اکٹھے کرنے کے لیے کئی سروے کرائے گئے۔ زیادہ تر عادی افراد معاشرتی حجاب کے باعث علاج کرانے سے گریزاں رہے۔ جو لوگ معالجوں تک پہنچے، انہوں نے علاج ادھورا چھوڑ دیا۔ پرانی عادت عود کر آنے اور پھر سے نشہ شروع کر دینے والوں کی شرح بھی بہت زیادہ تھی، نشہ میں مبتلا افراد کے مخالفین سماجی ماحول کے باعث تعاون کرنے کو تیار نہیں تھے۔

ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات نے علاج معالجہ اور بحالی کے لیے زبردست محنت کی۔ انہوں نے تفصیلی تجزیئے کیے، نیز ان حالات اور عوامل کی فہرست تیار کی جو نشہ کا عادی بنانے کا سبب بنتے ہیں مثلاً بیروزگاری، مایوسی ومحرومی، بٹے ہوئے خاندان، مجرمانہ ماحول، ذہنی الجھن وخلجان نیز مذہبی تعلیم کا فقدان۔

سروے سے ظاہر ہوا کہ مسئلہ جس سطح پر نظر آتا ہے اس سے کہیں زیادہ ہمہ گیر اور گہرا ہے۔ صوبہ سرحد اور شمالی علاقوں میں بعض دیہات ایسے بھی ہیں جن کی سو فیصد آبادی منشیات کی رسیا ہے اور صورت حال پوری قوم کی طرف سے کوشش اور جہاد کا تقاضا کرتی ہے۔ نارکوٹکس بورڈ نے سروے اور چھان بین کے بعد سفارش کی کہ عام ہسپتالوں میں منشیات کے مریضوں کے لیے علیحدہ وارڈ بنائے جائیں۔ اس سے نشہ کے مریضوں کی حوصلہ افزائی ہوگی کیونکہ اگر انہیں علاج کے لیے خصوصی ہسپتالوں میں جانا پڑا تو بے نقاب ہونے کے خوف سے علاج نہیں کرائیں گے۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹروں اور حکیموں سے بھی مشورہ کیا گیا تاہم وہ جامع اور معقول تجاویز پیش نہیں کر سکے۔

اقوام متحدہ نے صوبہ سرحد میں افیون کی جگہ دوسری فصلیں اگانے کے پروگرام کے لیے سرمایہ فراہم کیا۔ صوبہ سرحد خصوصاً قبائلی علاقوں میں وسیع رقبہ ایسا ہے جس میں صرف افیون کاشت کی جاتی ہے۔ کسانوں کو دیگر اجناس مثلاً گندم یا کماد لگانے کے لیے پانی، بیج، کھاد اور مشینری درکار ہوتی ہے جبکہ پوپی کی کاشت کے لیے ان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مزید برآں انہیں دوسری فصلیں کاشت کرنے کے لیے تربیت کی بھی ضرورت تھی۔ کیونکہ اب تک وہ اپنے کھیتوں میں نسل در نسل صرف پوپی کاشت کرتے آئے تھے۔

صوبہ سرحد کا کاشتکار نہ تو اپنی فصل کے ضرررساں اثرات سے آگاہ تھا نہ ہی اسے اس کی کچھ فکر تھی۔ اس کے نزدیک یہ کسی دوسری فصل کی مانند ایک فصل تھی اور بس۔ اسے قائل کرنا اور دوسری فصل کی کاشت پر آمادہ کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ صرف قانون سازی یا مالی امداد کافی نہیں تھی۔ اس کے لیے اس کے پورے طرز زندگی کو بدلنا تھا۔ بہر حال صاحبزادہ رؤف اور ان کے مخلص، محنتی اور دھن کے پکے ڈائریکٹر پلاننگ عبدالودود خاں نے اس پروگرام کو ضلع سوات کے سب ڈویژن بونیر میں کامیابی سے ہمکنار کر کے دکھا دیا جو دوسرے علاقوں کے لیے ایک نمونہ بن گیا۔

اس کے بعد دوسرا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کاشتکاروں نے ان علاقوں میں تو واقعی دوسری فصلیں بو دیں جن میں وہ پوپی کاشت کرتے تھے تاہم انہوں نے پوپی کے لیے دوسرے رقبے تیار کر لیے۔ ان

علاقوں تک بھی متبادل پروگرام شروع کرنے کی ضرورت تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ پوپی کی کاشت روکنے کے لیے مسلسل کوشش کرنی پڑے گی، ساتھ ہی اس قسم کی اطلاعات موصول ہونے لگیں کہ افغانستان میں بھی پوپی کے زیر کاشت رقبہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ قبائلی لوگ سرحد کے دونوں طرف آباد تھے اور ممنوعہ اشیاء کی تجارت بہت آسان تھی۔ اگرچہ یہ ایک ہشت پہلو مسئلہ تھا، تاہم اس کے حل کی اچھی ابتدا کر دی گئی۔

یوسف اورکزئی، انتہائی سینئر پولیس افسر اور نارکوٹکس بورڈ کے اولیں چیئر مین تھے۔ انہوں نے مسئلے کے دیگر پہلوؤں کی نسبت قانون پر سختی سے عملدرآمد اور پکڑ دھکڑ پر زیادہ زور دیا جو امریکی سوچ کے عین مطابق تھا۔ اس کے عوض امریکیوں نے انہیں تیز رفتار گاڑیاں، منشیات کا سراغ لگانے والی کِٹ، تفتیشی کِٹ، کیمرے اور دوسرا تفتیشی سامان فراہم کیا۔ ان کے برعکس صاحبزادہ رؤف نے امریکیوں کو ترغیب دی کہ وہ علاج اور بحالی پر زیادہ توجہ دیں۔ اس بارے میں ترقیاتی مواد، فلمیں اور دوسرا مواد فراہم کریں تاکہ لوگوں میں منشیات کے خلاف جانکاری پیدا کی جاسکے۔ انہوں نے متبادل فصلوں کے لیے اقوام متحدہ سے فنڈز بھی حاصل کیے۔ دوسری ایجنسیوں سے رابطہ قائم کیا گیا اور منشیات کے خلاف زوردار مہم شروع کر دی گئی۔

صاحبزادہ نے منشیات کے خلاف انتھک جدوجہد کی۔ تاہم وہ اس لعنت کا مکمل طور پر استیصال نہیں کر سکے۔ کیونکہ ایسی کامیابی دنیا میں کسی جگہ بھی حاصل نہیں کی جاسکی۔ جب انہیں تبدیل کر دیا گیا تو معاملات پھر کنٹرول سے باہر ہو گئے۔ جنرل ضیاء نے ایسا قدم کیوں اٹھایا تھا۔ یہ بات میرے لیے اب تک ایک معما ہے۔

صاحبزادہ کے عزم کی پختگی اور صائب نقطۂ نظر کو دنیا بھر میں سراہا گیا اور انہیں ایک سے زیادہ بار انٹرنیشنل نارکوٹکس کنٹرول بورڈ کا چیئرمین منتخب کیا گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اسی شعبہ میں بین الاقوامی مشیر بن گئے۔ وہ 6 اگست 1994ء کو اسلام آباد میں نیند کے دوران اللہ کو پیارے ہو گئے اور انہیں وزیر آباد (گوجرانوالہ) کے نزدیک ان کے آبائی گاؤں وایاں والی میں دفن کیا گیا۔ وہ ایک بڑے آدمی تھے جن میں قیادت کی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ پاکستان اور پولیس کے لیے ان کی موت بہت بڑا نقصان تھی۔

بیورو آف پولیس ریسرچ میں تبادلہ

1979ء میں نارکوٹکس بورڈ میں تقرری کے علاوہ مجھے کچھ عرصہ کے لیے فیڈرل انسپکشن کمیشن کا ممبر بھی بنا دیا گیا۔ وہاں میں نے کیا کیا اور کیا کرنے سے انکار کر دیا، اس کی تفصیلات باب 32 میں بیان کی گئی ہیں۔ میری درخواست پر کمیشن کے چیئرمین جنرل صغیر حسن نے مجھے اضافی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا اور میں دوبارہ نارکوٹکس بورڈ میں چلا گیا۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد میرا تبادلہ بطور ڈائریکٹر بیورو آف پولیس ریسرچ (اسلام آباد) میں ہوگیا۔ بیورو کے ڈائریکٹر جنرل ارباب مختار بہت سینئر اور اچھے افسر تھے۔ دوسرے ڈائریکٹر الیاس محسن تھے۔ وہ تبادلہ مجھے قطعاً راس نہیں آیا کیونکہ میرا خاندان لاہور میں اقامت پذیر تھا۔ میرے بیٹے اور بیٹیاں وہاں کے مختلف اسکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم تھے، وہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ بہر حال پولیس سروس میں اس طرح کی مشکلات سے اکثر واسطہ پڑتا ہے۔

جن دنوں میں لیڈی ایچی سن ہسپتال (لاہور) میں زیر علاج اپنی بیوی کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ لوگوں کے بے پناہ ہجوم نے غصہ میں پاگل ہو کر امریکی سفارتخانہ (اسلام آباد) کو آگ لگا دی۔ ریڈیو تہران سے یہ خبر نشر ہوئی کہ جن شر پسندوں نے خانہ کعبہ پر جبراً قبضہ کر لیا ہے اور بہت سے حاجیوں کو یرغمال بنا لیا ہے انہیں امریکہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یہ ایک انتہائی جذباتی مسئلہ تھا جس نے لوگوں کو امریکہ کے خلاف مشتعل کر دیا۔ غم وغصہ میں بپھرے ہوئے ہزاروں مظاہرین امریکی سفارت خانہ پہنچے اور اسے جلا کر راکھ کر دیا۔ ایک امریکی مارا گیا اور متعدد جلنے سے شدید زخمی ہو گئے۔

پولیس بروقت نہیں پہنچ سکی کیونکہ اس کی پوری نفری جنرل ضیا کی حفاظت پر مامور تھی جو اس روز عین اس موقع پر سادگی اور عام آدمی کے ساتھ یکجہتی کا مظاہرہ کرنے کے لیے سائیکل پر راولپنڈی شہر کا دورہ کر رہے تھے۔ اسلام آباد میں پولیس کی نفری شہر کی ضروریات کے لیے ویسے ہی کم تھی۔ امریکی بڑے پریشان ہوئے، خود صدر کا بھی برا حال تھا۔

ہنگامی کارروائی کے طور پر جو ہمارے حکمرانوں کا طرّۂ امتیاز ہے، ضیا نے اسلام آباد کے لیے جداگانہ انتظامیہ تخلیق کرنے کا حکم دے دیا۔ جس کے تحت وفاقی دارالحکومت کا علیحدہ آئی جی پولیس اور چیف کمشنر مقرر کرنا تھا۔ میرے باس ارباب مختار کو وزارت داخلہ کی طرف سے 15 دن میں نئے سیٹ اپ کا ڈھانچہ تیار کرنے کا حکم ملا۔ ارباب نے بڑے شائستہ لہجہ میں مجھ سے پوچھا۔

"کیا آپ یہ کام کرنے کے لیے آ سکتے ہیں؟" میں نے انہیں تسلی دی کہ قطعاً پریشان نہ ہوں میں

اس کام کو 15 دن کی بجائے چند گھنٹوں میں مکمل کر دوں گا۔

"کیسے؟" انہوں نے بے تابی سے دریافت کیا۔

میں نے انہیں بتایا کہ اسی قسم کا ایک پلان میں نے 1972ء میں بحیثیت ایس ایس پی تیار کیا تھا جس میں ہر پہلو کو مدنظر رکھا گیا تھا یہاں تک کہ جوتے کے آخری تسمے کو بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کو سامنے رکھ کر صرف مصارف کی لاگت میں آج کل کے نرخوں کے مطابق ردوبدل کرنا ہوگا یا آئی جی کی نئی تخلیق کردہ آسامی کے اخراجات کا اضافہ کرنا ہوگا۔ انہوں نے ایس ایس پی اور ڈی آئی جی راولپنڈی کے دفاتر سے مذکورہ اسکیم کی نقل حاصل کرنے کی کوشش کی، تاہم ناکام رہے۔ میں نے چوہدری معین سے بات کی جنہیں مصطفیٰ کھر نے اس اسکیم پر جزوی عملدرآمد کے نتیجہ میں اسلام آباد کا اولین ایس پی مقرر کیا تھا۔ ان کے پاس سے مذکورہ اسکیم کی نقل مل گئی جو فوراً ارباب مختار کو پہنچا دی گئی۔ انہوں نے ضروری ردوبدل اور کمی بیشی کر کے وہی اسکیم مقررہ وقت سے پہلے سیکرٹری داخلہ روئیداد خاں کو پیش کر دی۔ اس پر فوری عملدرآمد کا حکم صادر ہوا تاہم وزارت خزانہ اپنی روایات کے مطابق سدراہ بن گئی، اور مطلوبہ فنڈز دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے 1972ء میں دارالحکومت کے لیے جس قسم کی پولیس کا خواب دیکھا تھا، وہ جدید فورس کے جملہ وسائل کے ساتھ ساتھ اہلیت، نرمی اور پیشہ وارانہ مہارت کا نمونہ ہوتی۔ لیکن بدقسمتی سے 20 سال گزرنے کے باوجود مجوزہ سطح پر نہیں پہنچ سکی۔

ملک محمد نواز کو اسلام آباد کا پہلا انسپکٹر جنرل مقرر کیا گیا۔ انہوں نے پولیس کو اسلام آباد کی دور دور تک پھیلی ہوئی آبادی کی ضروریات کے مطابق بنانے کے لیے شاندار منصوبہ بنایا۔ ان کے پاس بعض دوسرے اچھے منصوبے بھی تھے۔ بدقسمتی سے انتہائی کنجوس وبخیل وزارتِ خزانہ نے مطلوبہ فنڈز نہیں دیئے۔ البتہ پرویز راٹھور' بطور ایس ایس پی اسلام آباد' وزیراعظم نواز شریف کے ساتھ ذاتی تعلق کی بدولت بہت سی اصلاحات کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

تبادلہ اور منسوخی

1979ء کے آخری دنوں میں مجھے اپنے دفتر میں قاضی محمد اعظم' انسپکٹر جنرل پنجاب کا حکم موصول ہوا کہ ''آدھ گھنٹے کے اندر اندر'' راولپنڈی پہنچوں اور وہاں ڈی آئی جی کا منصب سنبھال لوں۔

(پہلے جن تبادلوں میں کئی ہفتے نہیں کئی دن صرف ہو جاتے تھے۔اب وہ گھنٹوں میں ہونے لگے ہیں۔افسروں کو شطرنج کے مہروں کی طرح ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ بٹھانے میں بڑی تیزی آ گئی ہے) انہوں نے ہدایت کی کہ میں اپنا کام "مستعدی اور سختی کے ساتھ انجام دوں" کیونکہ حکومت انتخابات ملتوی کرنے والی ہے اور اس کے خلاف کسی جانب سے کوئی احتجاج سامنے نہیں آنا چاہیے۔ان کا خیال تھا کہ ایس ایس پی راولپنڈی کے طور پر میں نے بڑی سختی سے کام لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ 1973ء میں یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ کی احتجاجی تحریک میرے ضلع میں کوئی برگ و بار پیدا نہیں کر سکی تھی۔ وہ اب بھی اسی طرح کے نتائج چاہتے تھے۔انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ میری سختی اور سنگ دلی نہیں بلکہ جمہوری انداز کا منصفانہ سلوک تھا جس کے باعث کسی شورش کو اُبھرنے کا موقع نہیں ملا۔ بہر حال میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ مجھے ایسا حکم اسٹیبلشمنٹ ڈویژن سے بھی ملنا چاہیے۔انہوں نے جواب میں کہا کہ وہاں سے حکم جاری ہو چکا ہے جو مجھے جلد ہی مل جائے گا۔

اس کے بعد مجھے بریگیڈیئر رحیم' جوائنٹ سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کی کال موصول ہوئی' انہوں نے بھی یہی کہا کہ میں راولپنڈی پہنچ کر نئے عہدہ کا چارج لے لوں۔ میں نے جواب دیا کہ میرے باس پشاور گئے ہوئے ہیں' میں ان کی غیر حاضری میں اپنی سیٹ نہیں چھوڑ سکتا۔اس پر انہوں نے کہا کہ "یہ تمہاری مرضی پر ہے۔اگر تم اسے مناسب تصور نہیں کرتے تو بے شک نہ جاؤ۔تاہم تمہارے لیے آرڈرز یہی ہیں کہ نئی سیٹ فوراً سنبھال لو۔" میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ "میں نوٹیفیکیشن موصول ہونے پر ہی عملی قدم اٹھاؤں گا۔"

اس موقع پر میں سخت تذبذب کا شکار تھا۔ڈی آئی جی راولپنڈی کے طور پر پوسٹنگ ذاتی طور پر میرے لیے بہت بڑی پُرکشش تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ میری دلی خواہش تھی کہ فوری طور پر راولپنڈی جا کر نئے عہدے کا چارج سنبھال لوں کیونکہ میں جس پوسٹ پر کام کر رہا تھا' ایک تو اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی' دوسرے وہاں اچھی ٹرانسپورٹ کی سہولت بھی میسر نہیں تھی۔ الیاس محسن اور میں ایک پرانی ویگن میں آیا کرتے تھے جو زیادہ تر آف روڈ رہتی تھی۔ناچار مجھے اپنے دوست محمد ارشد چوہدری کے گھر سے' جہاں میں بطور مہمان مقیم تھا' دفتر تک پیدل جانا پڑتا تھا۔

لیکن میرے اخلاقی احساس اور سماجی رکھ رکھاؤ نے مجھے یک لخت قدم اٹھانے کی اجازت نہیں

دی۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ یکا یک ایک ذہین افسر کو اس کی اہم پوزیشن سے بے دخل کر دوں اور وہ بھی حکمرانوں کے ناپسندیدہ مقاصد کے لیے۔ میں نے اس الجھن کا ذکر اپنے عزیز دوست عبدالخالق اعوان سے کیا تو وہ بھی میرے خیالات سے متفق نظر آئے۔

میں نے ریسیور اٹھایا اور غلام اصغر ملک، ڈی آئی جی راولپنڈی کو نئی پیش رفت سے مطلع کیا۔ انہوں نے مبارکباد دیتے ہوئے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ میں ان کی جگہ لے رہا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ''مجھے چارج لینے میں غیر ضروری جلد بازی اچھی نہیں لگتی، اگرچہ آئی جی صاحب کی خواہش یہی ہے کہ میں فوراً چارج سنبھال لوں، بہر حال میں نے آپ کو مطلع کرنا ضروری سمجھا۔

''نہیں، نہیں۔ میں بہت خوش ہوں۔'' ادھر سے جواب آیا۔ وہ پوری طرح نارمل بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے ان کی آواز میں دبی ہوئی تلخی محسوس کی اور کہا: ''بے تکلف ہو کر بات کریں۔ آپ میرے دوست اور رفیقِ کار ہیں۔ کیا آپ اپنی سیٹ پر قائم رہنا چاہتے ہیں؟'' میری بے تکلفی اور ہمدردانہ رویے کے نتیجہ میں ان کے حقیقی احساسات زبان پر آ گئے۔ وہ کہنے لگے:

''اگر انتخابات تک موقع دیا جائے تو میں اسی پوسٹ پر کام کرنے کو ترجیح دوں گا۔''

''ایسی صورت میں آپ کیا کریں گے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''میں جنرل کے ایم عارف سے بات کروں گا اور میری بابت آرڈرز منسوخ کر دیئے جائیں گے۔'' انہوں نے برجستہ جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں آج آپ کے دفتر نہیں آؤں گا۔ اس دوران آپ کوشش کر کے دیکھ لیں''۔

بحیثیت ڈی آئی جی راولپنڈی میری پوسٹنگ کے احکام دن کی روشنی نہیں دیکھ سکے۔ قاضی اعظم مجھ سے بے حد برہم ہوئے۔ میں نے انہیں منانے کی کوشش کی لیکن وہ مجھ سے ملنے پر بھی آمادہ نہیں ہوئے۔

حاجی اکرم اور قاضی اعظم آپس میں گہرے دوست تھے، بعد ازاں حاجی اکرم نے مجھے بتایا کہ جب میں نے فوری طور پر چارج نہیں لیا تو قاضی اعظم نے اسے اپنی بے عزتی سمجھا۔ دریں اثنا جنرل عارف نے ان سے شکایت کی کہا انہوں نے ''پی پی پی کے آدمی'' کو راولپنڈی کا ڈی آئی جی لگا دیا ہے۔ حاجی صاحب کے مطابق بیچارے قاضی کو اپنی ملازمت بچانا مشکل ہو گیا۔ حاجی اکرم نے اس بات پر مجھے

بہت برا بھلا کہا کہ منافقت کی اس دنیا میں ایسا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

میرے لیے یہ بات بڑی تکلیف دہ تھی کہ مجھ پر ''سیاسی رجحانات کی طرف مائل افسر'' کا لیبل لگا دیا گیا۔ جس کی وجہ محض یہ تھی کہ میں سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتا تھا اور بعض لوگوں کو یہ چیز پسند نہیں تھی۔ اندریں حالات میں پیدل چل کر اپنے دفتر جانے اور اس خام خیالی میں خامہ فرسائی کرنے پر مست و مطمئن تھا کہ اپنے ملک کو آنے والے فرقہ وارانہ اور سیاسی طوفانوں سے بچا سکوں گا۔



باب18

کیا بھٹو واقعی مجرم تھے؟

ایف ایس ایف کے متعلق بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ فوج کے متوازی تنظیم ہے۔ اسے اس کی مجرمانہ کارکردگی کے باعث ''بھٹو کے پالتو غنڈوں کا گینگ'' کے نام سے بھی پکارا گیا۔ نفاذِ مارشل لا کے فوراً بعد اس فورس کے معاملات کی تفصیلی چھان بین شروع کردی گئی تھی۔ لاہور ریجن میں یہ کام میرے دوست وجاہت لطیف (ڈائریکٹر ایف آئی اے) کو سونپا گیا اور مجھے ان کا معاون بنا دیا گیا۔

دھماکہ خیز انکشاف

تفتیش کے دوران ایف ایس ایف کا اے ایس آئی محمد ارشد، چوہدری عبدالخالق، ڈپٹی ڈائریکٹر ایف آئی اے لاہور کے سامنے پیش ہوا۔ اس نے پیشکش کی کہ اگر اس پر تشدد نہ کیا جائے تو وہ سب کچھ سچ بتانے کو تیار ہے۔ اس نے ایف ایس ایف کے متعدد سیاہ کارناموں پر سے پردہ اٹھایا اور یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ ایف ایس ایف ہیڈ کوارٹرز میں قائم ایک سپیشل سیل کا رکن تھا جس میں انتہائی قابلِ اعتماد افسر شامل تھے جنہیں خفیہ اور حساس مشن سونپے جاتے تھے۔ اس سیل کا سربراہ ایس پی میاں محمد عباس تھا اور اس کے ممبران کا اس سے اوپر کسی سے رابطہ نہیں تھا۔

اس کے بعد اُس نے بم کا ایک گولا پھینک کر زوردار دھماکہ کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایف ایس ایف کے ان افراد میں شامل تھا جنہوں نے اس کار پر فائرنگ کی تھی جس میں احمد رضا قصوری ایم این اے، ان کے والد نواب محمد احمد خان اور خاندان کے دیگر افراد سوار تھے۔ فائرنگ کے نتیجہ میں نواب احمد خان مارا گیا جبکہ دوسرے افراد زخمی ہوئے۔ ارشد نے اس بھیانک مشن کی منصوبہ بندی اور اس پر عملدرآمد کی تفصیلات بھی بیان کیں۔

ایک دن میں وجاہت لطیف کے دفتر میں ''ٹائم میگزین'' کی ورق گردانی کررہا تھا جب انہوں نے مجھے ارشد کے چونکا دینے والے انکشافات سے آگاہ کیا۔ میں ان کی زبانی وہ تفصیلات سن کر حیران رہ گیا اور ہمہ تن گوش ہوکر ان کی باتیں سننے لگا۔ اپنے دور کے مشہور ترین قتل کیس کا معمہ حل ہوگیا تھا۔ مزید تفصیلات شرکائے جرم سے پوچھ گچھ کر کے حاصل کی جاسکتی تھیں۔

وجاہت لطیف نے مجھ سے پوچھا۔ اب کیا کرنا چاہیے؟ میں نے مشورہ دیا کہ فوراً اپنے ڈائریکٹر جنرل ایم ایس انور کو ارشد کی بیان کردہ تفصیلات سے مطلع کریں اور ان سے مزید ہدایات لیں۔ (اس وقت

تک قتل کیس ایف آئی اے کے زیر تفتیش نہیں تھا) وجاہت فوراً اسلام آباد پہنچے۔ اگلے دن واپسی پر انہوں نے بتایا کہ ڈی جی نے جنرل ضیا سے بات کی تھی انہوں نے ہدایت کی کہ قتل کیس کی تفتیش ایف آئی اے کو اپنے ہاتھ میں لے لینی چاہیے۔ وہ کیس مقامی پولیس نے 1974ء میں درج کیا تھا جس کے مستغیث احمد رضا قصوری کے اصرار پر ابتدائی رپورٹ میں بھٹو کو اہم ملزم نامزد کیا گیا تھا۔

جب ایف آئی اے لاہور قتل کیس کی تفتیش میں پوری طرح جت گئی تو ایف ایس ایف کے دیگر معاملات کے بارے میں انکوائری سرد خانے کی نذر ہو گئی اور میں نارکوٹکس بورڈ میں واپس آ گیا۔ مجھے پتہ نہیں چل سکا کہ بھٹو کس حد تک براہ راست ملوث تھے کیونکہ میں تفتیش سے وابستہ نہیں رہا، اس لیے میں یہاں خود کو صرف ان معاملات تک محدود رکھوں گا جو مجھے ذاتی طور پر معلوم تھے یا دوستوں کے ذریعے میرے علم میں آئے۔

جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ابتدائی تفتیش کے بعد بھٹو کو قتل کیس میں گرفتار کر لیا گیا' تاہم لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس کے ایم اے صمدانی نے انہیں ضمانت پر رہا کر دیا۔ دوسری بار انہیں مارشل لا ضابطہ کے تحت حراست میں لیا گیا تاکہ پھر ضمانت نہ ہو سکے۔ ایف ایس ایف کا ڈائریکٹر جنرل وعدہ معاف گواہ بن گیا۔ اس کی طرف سے دیگر شرکائے جرم کو پھنسانے والی شہادت فراہم کرنے پر اسے جان کی امان اور مقدمہ بازی سے نجات مل گئی۔ سعید احمد خان' بھٹو کے چیف سیکورٹی افسر' سردار عبدالوکیل خان ڈی آئی جی لاہور اور اصغر خان ایس ایس پی لاہور استغاثہ کے اہم گواہ بن گئے۔ گویا جو افراد بھٹو کو اپنی ''وفاداری وجاں نثاری'' کا یقین دلانے نیز ان کی ''حکومت کو مستحکم اور مضبوط کرنے'' کے لیے مجرمانہ اور غیر قانونی افعال کا ارتکاب کرتے رہے تھے۔ اب وہی انہیں قتل کا مجرم ٹھہرانے کے لیے میدان میں آ گئے۔ یہ ایسے سینئر افسران کا کردار ہے جنہیں حکمران بڑی سادگی سے ''قابلِ اعتماد اور وفادار'' سمجھ لیتے ہیں۔

مجھے وہ پرانی بات یاد آ گئی جو میں نے بطور ایس ایس پی راولپنڈی 1973ء میں بھٹو کے گوش گزار کی تھی کہ سعید احمد خان جو ایک معاملہ میں خلافِ قانون کام کی ترغیب دے رہا ہے' کسی دن آپ کے خلاف گواہی کے کٹہرے میں کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس وقت بھٹو نے میری بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ سعید احمد خان کو بھٹو کے خلاف بیان دیتے ہوئے دیکھ کر مجھے اپنی پیش گوئی کے الفاظ یاد آ گئے۔ میں عدالتی

کارروائی سننے کے لیے اس وقت تک روزانہ جاتا رہا جب تک "چار پولیس افسران پر مشتمل گینگ" کے بیانات مکمل نہ ہو گئے۔ میں نے سوچا ممکن ہے مجھے دیکھ کر بھٹو کو میرے وہ الفاظ یاد آ جائیں جو میں نے پانچ سال قبل نادانستہ طور پر کہے تھے۔ لیکن وہ ان بدمعاش آدمیوں کے پینترے بدلتے ہوئے چہروں پر نظریں جمائے ہوئے تھے اس لیے ہماری طرف قطعاً نہیں دیکھا۔ وہ لازماً پچھتا رہے ہوں گے کہ ایسے بے ضمیر افسروں پر اعتماد کیوں کیا۔ بدقسمتی سے ایسی ندامت صرف اس وقت ہوتی ہے جب آدمی اقتدار سے محروم ہو جائے۔ ظاہر ہے اس وقت کا پچھتاوا کسی کام نہیں آتا۔

مسعود محمود اور سعید احمد نے کیس میں بھٹو کے کردار کی بابت انتہائی مبہم و بے معنی' پیچیدہ اور گمراہ کن بیان دیا۔ انہوں نے کسی بھی طرح اپنے قصور کا اعتراف نہیں کیا۔ جہاں تک ایف ایس ایف کے ملازمین کے کردار کا تعلق تھا' استغاثہ کی کہانی بالکل واضح تھی۔ بظاہر وہ کوئی ذاتی محرک نہیں رکھتے تھے' جبکہ بھٹو کی بابت قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاید وہ سیاسی بنیاد پر کوئی محرک رکھتے ہوں۔ "مسعود محمود کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ ذاتی وجوہات کے باعث کوئی محرک رکھتا تھا؟" میں نے یہ سوال ملک وارث سے پوچھا جس نے ابتدا میں واقعہ قتل کی تفتیش کی تھی۔ اس نے جواب دیا کہ جہاں تک اسے معلوم ہے کوئی واضح اور قطعی شہادت یا اشارہ دستیاب نہیں۔

کیا مسعود محمود بھٹو کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خود کو پراسرار طریقہ سے لائق و فائق اور کارآمد ثابت کرنے کی خاطر ملازمت کے حوالہ سے کوئی محرک رکھتا تھا؟ ایسے سول اور پولیس افسر خاصی تعداد میں ہوتے ہیں جنہیں اس کام میں بڑی مہارت ہوتی ہے کہ اپنی افادیت ثابت کرنے کے لیے دھوکے بازی سے کام لیں اور دوسروں کو ایسے کاموں میں لگا دیں۔ خواہ وہ باس کے مفاد میں ہوں یا نہ ہوں۔ تاہم ایسی فضا پیدا کرنے سے جس میں ان کی موجودگی ناگزیر بن جائے' ان کا اپنا اُلو ضرور سیدھا ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ پسند نہیں کرتے کہ ان کا باس ان کے علاوہ کسی دوسرے پر نظر بھی ڈالے۔ وہ اس پر ایک حاسد محبوبہ کی طرح قبضہ جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اسے سب سے الگ تھلگ اور بدظن کر دیتے ہیں اور پھر اپنے لیے اس کے انحصار کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ میں کوئی قطعی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا کیونکہ اس کیس میں زنجیر کی بہت سی کڑیاں غائب تھیں۔

مسعود محمود نے عدالت میں عجیب و غریب پوزیشن اختیار کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ وہ مسلسل

وقار احمد اسٹیبلشمنٹ سیکرٹری کے خوف میں مبتلا رہا۔ اس سے وہ کیا ثابت کرنا چاہتا تھا؟ کیا اسے یہ خوف تھا کہ اس کا کیریئر خراب ہو جائے گا؟ اگر ایسی بات تھی تو اسے کیریئر کو کامیاب بنانے کے لیے کچھ کرنا چاہیے تھا۔ خواہ پراسرار قتل کا ارتکاب ہی کیوں نہ کرنا پڑے جس سے بھٹو سکون محسوس کریں کہ مسعود محمود نے ایک بڑی سر دردی سے نجات دلا دی ہے۔

احمد رضا قصوری بھٹو کی پارٹی میں ہونے کے باوجود ان کے لیے مسائل پیدا کر رہا تھا اور اصل نشانہ وہی تھا' لیکن اقدامِ قتل کی کوشش میں خوش قسمتی سے بچ گیا۔ میں اس کے یا سعید احمد کے بیان میں اس امر کا اشارہ تلاش کرتا رہا کہ آیا بھٹو نے احمد رضا قصوری کے قتل کا واضح حکم دیا تھا۔ تاہم دونوں کے بیان مبہم اور غیر واضح بلکہ گول مول تھے۔ کیا خوف نے مسعود محمود کو اعصابی دباؤ میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ ایسی چیزوں کے متعلق سوچ بچار کرے یا بھٹو کے زوال کے بعد اسے پہلے سے زیادہ خوف لاحق ہو گیا تھا؟ ایک شخص جو وقار احمد کی طرف سے اس قدر شدید مرضیاتی خوف میں مبتلا ہو گیا' وہ فوجی حکومت کے اس سے کئی گنا زیادہ خوف میں مبتلا ہو سکتا ہے جسے طاقتور اسٹیبلشمنٹ سیکرٹری کے مقابلہ میں بہت زیادہ آمرانہ اختیارات حاصل تھے۔

میرے نزدیک مسعود محمود ہمیشہ ایک نفسیاتی کیس رہا۔ اس کا اندازہ مجھے اس کے ساتھ ایک ملاقات کے دوران ہوا جو پولیس کلب لاہور کی ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ اس سے قریباً ڈیڑھ مہینہ پیشتر اس نے بھٹو سے میرا ایف ایس ایف میں تبادلہ منظور کرایا تھا' لیکن مجھے ایف ایس ایف کی بجائے نارکوٹکس کنٹرول بورڈ میں بھیج دیا گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں نے متبادل پوسٹنگ چوہدری فضل الٰہی (صدرِ مملکت) کے ذریعے کرائی تھی۔ وہ میرے ساتھ انتہائی شرافت و نرمی سے پیش آیا اور مجھے ایک طرف لے جا کر پوچھنے لگا کہ میں نے اپنا تبادلہ کیسے منسوخ کرا لیا جبکہ اس کی منظوری خود بھٹو نے دی تھی؟ میں فوراً سمجھ گیا کہ اس کا ذہن کیا سوچ رہا ہے' اس لیے میں نے اسے تنگ کرنے کے خیال سے کہہ دیا کہ:

''سر نارکوٹکس بورڈ میں میرے تبادلہ کی منظوری اسی شخص نے دی ہے جس نے پہلے ایف ایس ایف میں میری پوسٹنگ کے احکام جاری کیے تھے''۔

یہ سن کر وہ میرے لیے سراپا مؤدب بن گیا اور بولا:

''کیا تم بھٹو صاحب کو ذاتی طور پر جانتے ہو یا کسی کے ذریعے ان سے سفارش کرائی تھی؟''

''سر میں انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں پہلے راولپنڈی کا اور بعد میں لاہور کا ایس ایس پی رہ چکا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

مسعود محمود بے حد متاثر ہوا اور میرے جیسے جونیئر افسر کی اس طرح خوشامد کرنے لگا جیسے کوئی دل لبھانے والا سیلز مین گاہک کی کرتا ہے۔ مجھے اس وقت بے حد لیکن خوشگوار حیرت ہوئی جب اس نے کہا: ''تمہاری جب بھی بھٹو کے ساتھ ملاقات ہو' میرے متعلق اچھی باتیں کرنا۔ تم میرے لیے چھوٹے بھائی کی طرح ہو۔''

وہ صحیح معنوں میں ایک موقع پرست اور جاہ طلب آدمی تھا۔ میں بھٹو کے کبھی قریب نہیں رہا تھا اور کسی تقریب میں بھی ان سے نہیں ملا تھا۔ لیکن مسعود اپنے کیریئر کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔

عدالت کے باہر ٹکا اقبال کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے مجھے یکدم خیال آیا کہ خوف اور خوفناک حالت پر ردِ عمل کی شدت کے پیش نظر مسعود محمود کا ڈاکٹری معائنہ کرانے کی ضرورت ہے۔ جب میں نے اقبال کو پولیس کلب والا واقعہ سنایا تو انہوں نے اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا اور اچانک پنجابی میں کہنے لگے:

''ایس پاگل نے مروا دتا اے'' یعنی اس بیوقوف نے بڑی مشکل میں پھنسا دیا ہے۔

''کس کو بھٹو کو یا سعید احمد کو؟'' میں نے فوراً سوال کیا۔

''ہر شخص کو'' انہوں نے متانت سے جواب دیا۔

اقبال ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ہر ایک یعنی عدالت' فوج' بھٹو' پاکستان قومی اتحاد' پی پی بلکہ خود پاکستان .... محض اس لیے شیطانی چکر میں پھنس گیا تھا کہ بعض شیطانی دماغوں نے بھٹو کو اس قسم کے انتظامی سہارے فراہم کر کے جو شروع میں خوشنما لگے' تباہی کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ سب سے مؤثر اور کامیاب حکومت کی بنیاد سچائی پر استوار ہوتی ہے' مکر و فریب کی چالوں پر نہیں۔ بھٹو ایک دفعہ پھنس گئے تو بد معاشی کے پھندے سے نکل نہیں سکے۔ اب انہیں ان کے ''جاں نثار اور وفادار'' ساتھیوں کے چنگل سے نکالنا کسی کے بس میں نہیں رہا تھا۔

سماعت میں جلد بازی

بھٹو کو لاہور ہائیکورٹ کی طرف سے ضمانت منظور ہونے کے بعد دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور قتل کے کیس میں مقدمہ چلانے کے لیے سیشن جج لاہور کے سامنے پیش کیا گیا۔ پھر وہ مقدمہ لاہور ہائیکورٹ کو منتقل کر دیا گیا جہاں پانچ ججوں پر مشتمل فل بنچ نے، جس کا سربراہ چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین جیسا دبنگ اور کم آمیز جج تھا' اس کی سماعت کی۔ وکیلِ صفائی نے اعتراض کیا کہ کیس کی براہ راست ہائیکورٹ میں سماعت سے اپیل کا ایک چانس کم ہو گیا ہے لیکن اسے مسترد کر دیا گیا۔ کیس کی روزانہ سماعت کی گئی۔ اس تیز رفتاری کو بھی نشانۂ تنقید بنایا گیا مگر لاحاصل۔ ایسا لگتا تھا کہ عدالت چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی فریقِ صفائی کی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔

جنرل ضیا نے بے احتیاطی سے یا جان بوجھ کر اس تأثر کو ہوا دی کہ اگر ہائیکورٹ نے بھٹو کو بری کر دیا تو مارشل لا کے تحت سزا دی جائے گی۔ بھٹو بین الاقوامی شہرت کے حامل سیاست دان تھے اور مقدمہ کے ساتھ بھی ذاتی سے زیادہ سیاسی مضمرات وابستہ تھے۔ کچھ عرصہ بعد بھٹو نے بطور احتجاج کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا تو مقدمہ سراسر سیاسی رنگ اختیار کر گیا۔

مہر علی انور سے جو میرے پرانے دوست اور سندھ اسمبلی کے سابق رکن تھے' کیس کی سماعت کے دنوں میں لاہور میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ

''بھٹو کے مقدمہ کی وجہ سے پورا سندھ آتش بداماں ہے۔''

''کیوں؟'' میں نے دریافت کیا

''سندھی استغاثہ کی کہانی پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ پنجابی جج ایک سندھی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نسلی تعصب کا مسئلہ بن گیا ہے۔ سائیں بھٹو کے خلاف کیس کی سماعت پنجابی جج کر رہے ہیں اور پھر بھی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نسلی مسئلہ نہیں بنے گا۔'' انہوں نے وضاحت سے جواب دیا۔

''چونکہ قتل کی واردات لاہور میں ہوئی تھی' اس لیے کیس کی سماعت لاہور میں ہو سکتی تھی۔'' میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں یہ بات سمجھتا ہوں لیکن سندھ میں کوئی ان قانونی جزئیات کو نہیں مانتا۔ ان پر سندھ ہائیکورٹ میں مقدمہ چلایا جاسکتا تھا۔'' انہوں نے سندھ کے ردِعمل کا صاف اور سادہ طریقہ سے اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اس رات میں بمشکل سو سکا۔ میری اہلیہ بلقیس نے پوچھا کہ میں کیوں پریشان ہوں۔ میں نے علی انور سے جو کچھ سنا تھا۔ اسے بتایا تو وہ بڑی معصومیت سے کہنے لگی...... ''اس سلسلہ میں آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ آپ تو کبھی بھٹو کے فین نہیں رہے۔''

''یہ بھٹو کی زندگی کا مسئلہ نہیں بلکہ ان کی پھانسی کے ممکنہ مضمرات ہیں جنہوں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ اس مقدمہ کی وجہ سے پاکستان علاقائی اور نسلی خطوط پر تقسیم ہوگیا ہے۔'' میں نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ زیادہ قائل نہیں ہوئی۔

''آپ کا کیا خیال ہے ایسے بے سروپا دلائل کی بنا پر قتل کا کیس ختم کردیا جائے؟'' اس نے جوابی حملہ کیا۔

''پاکستان کا کچھ نہیں بگڑے گا اپنی صحت کا ستیاناس نہ کریں اور آرام سے سو جائیں۔''

''مجھے اُمید ہے ملک کو کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''تم خبطی ہوگئے ہو۔'' اس نے مجھ پر دوبارہ چوٹ کی۔

''جانِ من' پاکستان اہلِ پاکستان کے جذبات واحساسات کا نام ہے' محض ایک ملک کا نام نہیں۔ پہلے دل ٹوٹتا ہے' اس کے بعد روح پرواز کر جاتی ہے۔ پھر جسم مٹی کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ علاقہ ایک سوکھے ہوئے پتے کی مانند اپنے مرکز سے کٹ جاتا ہے۔'' میں بلقیس کے مقابلے میں خود سے زیادہ مخاطب تھا۔ مجھے پورے جسم خصوصاً ریڑھ کی ہڈی میں درد محسوس ہونے لگا۔

میں بھٹو کو کوسنے لگا کہ انہوں نے اپنے اِردگرد مسعود محمود جیسے لوگوں کو کیوں اکٹھا ہونے دیا۔ اس قسم کے لوگ بزعم خویش قانون بن جاتے ہیں اور لوگوں کو بے رحمی کے ساتھ انتشار کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ لوگ پاگل ہوگئے ہیں۔ ان کا دماغ درست کرنے کے لیے ڈنڈا استعمال کرنا چاہیے۔ ناقابلِ برداشت حالات کون پیدا کرتا ہے اور لوگوں کو پاگل پن پر کون اُکساتا ہے؟ یہ وہی مسعود محمود تھا جس نے فروری 1952ء میں ڈھاکہ میں لسانی مسئلے پر نکلنے والے جلوس پر فائرنگ کا حکم دیا جس سے بہت سے

طلبا مارے گئے۔ یہ شروع کی ان اہم غلطیوں میں سے ایک تھی جو تین سال بعد مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سبب بنیں۔ میں یہ سوچ کر کانپ اُٹھا کہ اس کے حالیہ کرتوتوں کے باعث پاکستان پر کیا بیتے گی۔ شاید میری اہلیہ درست کہہ رہی تھی کہ میں سودائی ہو گیا تھا۔

اگلے دن میں کمر درد کے سلسلے میں سروسز ہسپتال (لاہور) گیا۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر عنایت نے میرا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد تشخیص کیا کہ مجھے ذیابیطس ہے۔

''کیا آپ کے خاندان میں کسی کو یہ مرض لاحق ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں، میرے والدین یا دادا/ دادی اور نانا/ نانی میں سے کسی کو یہ بیماری نہیں تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

انہوں نے مزید بتایا کہ مجھے ذیابیطس ہونے کا سبب انتہائی درجہ کی ذہنی پریشانی ہے۔ ان کی تشخیص درست تھی۔ 1947ء کے مہاجر کیمپوں کی سوہانِ روح مصیبتیں اور ان کی تلخ یادوں سے میرے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ بنگلہ دیش کا ظہور جن حالات میں ہوا' ان کا خیال اکثر ستاتا رہتا تھا۔ اب ملک کا مستقبل مجھے بے حد پریشان کرنے لگا تھا۔ میں اسی وقت سے اس مرض میں مبتلا ہوں۔

بھٹو کیس کی وجہ سے پورا ملک ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس کیس سے نمٹنے کے لیے اور ضیا کے ہاتھ مضبوط کرنے کی غرض سے قومی اتحاد کو حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ میرے دوست محمد ارشد چوہدری سائنس و ٹیکنالوجی کے وزیر بن گئے۔ بھٹو کی پارٹی اور ان کے مدّاحوں کا خیال تھا کہ بھٹو کو سزا دینا ممکن نہیں ہو گا' نہ ہی اسکے لیے کافی شہادت موجود ہے۔ تاہم عدالت نے بھٹو کی عدم موجودگی میں (کیونکہ آخر میں انہوں نے کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا تھا) سماعت مکمل کر کے انہیں اور دیگر ملزمان کو سزائے موت سنا دی۔ اس فیصلہ سے لوگوں کو زبردست دھچکا لگا۔ تاہم کچھ زیادہ ردِ عمل دیکھنے میں نہیں آیا کیونکہ ابھی سپریم کورٹ میں اپیل کا مرحلہ باقی تھا۔ علاوہ ازیں بیگم نصرت بھٹو' بینظیر بھٹو' پی پی پی کے اکثر لیڈر اور ہزاروں کارکن جیلوں میں ڈال دیئے گئے تھے تا کہ امن و امان کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔ لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے جیلوں میں بہت سے کارکنوں کو کوڑے مارے گئے۔ صورتحال انتہائی کشیدہ، تاہم کنٹرول میں تھی۔

کھر دم دبا کر بھاگ گئے

نفاذِ مارشل لا کے بعد میں نے عید کے دن مصطفیٰ کھر سے ملاقات کی۔ وہ مارشل لا کے متعلق میری پیش گوئی سے خاصے متاثر نظر آئے اور مستقبل کے بارے میں میری رائے دریافت کی۔ میں نے تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے مختصراً بتایا کہ مارشل لا اس وقت تک نافذ رہے گا جب تک بھٹوئی حکومت کے خلاف رہیں گے۔ نیز جب تک حالات اس نہج پر نہیں آ جاتے کہ جو کچھ کیا گیا ہے اسے تحفظ دے دیا جائے۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ نفاذِ مارشل لا کا فوری سبب وہ خود بنے کیونکہ یہ بات عام طور پر کہی جا رہی تھی کہ وہ ملک میں خانہ جنگی شروع کرانے والے ہیں۔

''میں نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔'' انہوں نے احتجاج کیا۔

''ممکن ہے' آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔'' اس کے بعد میں نے آئندہ کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی جس میں ٹیپ کا بند یہ تھا کہ

''پی پی پی میں بھٹو کے بعد دوسرا نمبر آپ ہی کا ہے' اس لیے وہ آپ کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔''

''اُن کے پاس میرے خلاف کچھ نہیں ہے۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا جس کی بنا پر میرے خلاف کارروائی کی جا سکے۔'' کھر نے زور دے کر کہا۔

''وہ آپ کے خلاف لیاقت باغ فائرنگ کیس سمیت بہت کچھ ڈھونڈ نکالیں گے۔'' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

اس ملاقات کے چند دن بعد میں نے اخبارات میں پڑھا کہ کھر بعض جرنیلوں سے ملنے کے بعد لندن چلے گئے ہیں۔ وہ 1986ء میں یعنی مارشل لا اٹھائے جانے کے بعد واپس آئے اور ایئرپورٹ پر ہی گرفتار کر لیے گئے۔ کھر 1988ء میں ضیا کی موت تک نظر بند رہے۔ اڈیالہ جیل (راولپنڈی) سے رہائی کے بعد وہ حاجی اکرم کے گھر آئے جہاں میں بھی موجود تھا۔ ہماری پورے گیارہ سال بعد دوبارہ ملاقات ہوئی۔ انہوں نے چھُوٹتے ہی سوال کیا:

''اگلا مارشل لا کب لگے گا؟ اس دفعہ میں تمہاری بات فوراً مان لوں گا۔''

پی پی پی کو مرکزی دھارے میں شامل رکھا جائے

میرے دوست چوہدری اعتزاز علی ایڈووکیٹ نے بیگم نصرت بھٹو کا کامیابی سے دفاع کیا اور لاہور ہائیکورٹ کے حکم پر ان کی نظر بندی ختم کردی گئی۔ وہ کیس جیتنے پر بڑا فخر محسوس کر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنی ذہانت کے بل پر بھٹو کے خلاف قتل کا مقدمہ بھی جیت سکتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ بیگم نصرت بھٹو کی اس آئینی درخواست کو بھی منظور کرا سکتے تھے جس کے ذریعے مارشل لا کے نفاذ کو چیلنج کیا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے متعلق بے جا دعوے کر رہے ہیں اور قانون کے عمومی طریق کار پر بہت زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ زندگی کی بابت بڑی جذباتی سوچ رکھتے تھے اور بھٹو خاندان کے ساتھ ان کی وابستگی بڑی گہری تھی۔

''ملک کی سب سے بڑی عدالت نے غیر معمولی صورتِ حال کے پیش نظر آئینی انحراف کو نظر انداز کردیا بلکہ جائز قرار دے دیا اور اب ہر چیز اس فیصلہ کی روشنی میں حرکت کرے گی۔'' میں نے انہیں یاد دلایا۔ مزید عرض کیا کہ:

''آپ نے بہت دیر کردی' اب اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔''

''معاملات یقیناً حد سے زیادہ خراب ہوں گے۔'' انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا۔

''ملک کے بنیادی قانون کو پامال کردیا گیا ہے۔ ہم سب اس بزدلانہ اقدام میں برابر کے شریک ہیں۔ اے کے بروہی سب سے بڑے مجرم ہیں جنہوں نے سپریم کورٹ میں مارشل لا کا دفاع کیا۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔ مستقبل تاریک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگے۔ میں نے ان کے جذبات کی شدت محسوس کی اور انہیں تسلی دینے لگا' لیکن وہ بے حد افسردہ و دل گرفتہ تھے۔ اس لیے میں نے انہیں سنجیدہ بلکہ ایک حد تک دہشت انگیز بحث میں الجھا دیا۔

''کیا آپ بھٹو کے انجام کی بابت پریشان ہیں؟'' میں نے پوچھا

''ہاں' بہت زیادہ''۔ انہوں نے جواب دیا

''وہ بھٹو کو پھانسی پر لٹکا دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان ختم ہوجائے گا۔ سندھ علیحدگی اختیار کرلے گا۔ پنجاب اپنی زمین میں محصور ہوجائے گا اور بارڈر پار کے سکھوں کے رحم و کرم پر ہوگا۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان افغانستان کے ساتھ مل جائیں گے۔ خیر بخش مری اور اجمل خٹک وغیرہ پہلے سے وہاں موجود ہیں۔ ضیا بیوقوفوں کی طرح بھارت کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے والے

ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ پھر سے رونے لگے۔

''آپ بہت دور کی سوچ رہے ہیں۔ ممکن ہے بھٹو کو پھانسی نہ دی جائے۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں قطعاً نہیں۔ وہ بھٹو کو لازماً تختۂ دار پر کھینچیں گے۔ یہ پاکستان کو تباہ کرنے کی امریکی سازش ہے۔'' انہوں نے اصرار کیا۔

''بھٹو پاکستان کے مترادف نہیں ہیں۔ آپ انہیں بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔''

''قائداعظمؒ کے بعد وہ واحد لیڈر ہیں جو امت مسلمہ کو نیا حوصلہ اور ولولہ دے سکتے ہیں۔ انہوں نے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو یکجا کیا۔ دشمن سے مقبوضہ علاقہ اور جنگی قیدی واپس لیے۔ ملک کو متفقہ دستور دیا اور لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کرائی۔ وہ ایک عظیم بین الاقوامی مدبّر ہیں۔ ان کے بعد طوفانی سیلاب آئے گا جو سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔'' اب وہ کسی قدر ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ ان کی جذباتی کیفیت ختم ہونے کو تھی۔

''ہاں یہ درست ہے کہ وہ بہت ذہین اور نامی گرامی لیڈر ہیں' سقوطِ ڈھاکہ کے بعد قومی یکجہتی ان کے اپنے مفاد میں تھی تاکہ وہ مشرقی حصہ کے بغیر موجودہ پاکستان کے غیر متنازعہ حکمران اور لیڈر بن سکیں۔'' میں نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

''آپ بھٹو کے معاملہ میں انصاف نہیں کر رہے' اصل بات یہ ہے کہ آپ انتہائی تنگ ظرف ہیں اور حقائق کو چھپا رہے ہیں۔ وہ بھارت کے خلاف ایک ہزار سال تک لڑنے کا عزم رکھتے ہیں۔ فوج کو مشرقی پاکستان میں بری طرح شکست ہو گئی تھی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ انہوں نے باقیماندہ پاکستان کو بچایا جبکہ اندرا گاندھی اپنی قوم کو نئی خوشخبری سنانے کی باتیں کر رہی تھی۔ ممکن ہے مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں بھارت اور روس کا بھی کوئی ہاتھ ہو تاہم پاکستان کو چار قومیتوں میں تقسیم کرنے کے ناپاک منصوبوں کو بھٹو نے کامیابی سے ناکام بنایا۔ 1972ء میں سندھ میں جو لسانی ہنگامے ہوئے وہ براہ راست روس کی شرارت تھی۔ بھٹو کی جان ہر قیمت پر بچانی چاہیے۔'' اب وہ ایک طرح سے رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔

''آپ کی بات درست ہے' لیکن اس معاملے میں بھلا میری کیا بساط۔ ہم صرف دعا کر سکتے

ہیں۔ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں' اس میں بڑا وزن ہے۔1970ء کے الیکشن کے بعد اقتدار ملنے کی اُمید سے مایوس ہو کر بھٹو واقعتاً یحییٰ خان کے سازشی ہاتھوں میں کھیلتے رہے اور ملک کی شکست وریخت میں بہت بڑا عامل بن گئے تھے' بہر حال جمہوریت کا کمال اور خوبی یہ ہے کہ وہ تہذیب اور زبان کے اختلاف کے باوجود برادریوں کو اقتدار اور اثر ورسوخ میں شریک رکھتی ہے۔ میں بھٹو کو ملک کی یک جہتی واتحاد کا ایک اہم عنصر خیال کرتا ہوں۔ جیسا کہ آپ کی رائے ہے۔ انہیں قومی اتحاد کی علامت کے طور پر باقی رہنا چاہیے۔ مردہ بھٹو کی ہڈیاں ملک کے اتحاد واستحکام میں کھاد کا کام دیں گی۔ اے کاش' انہوں نے اس وقت وہ غلطی نہ کی ہوتی لیکن اب ہمیں ویسی ہی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ آپ بیگم بھٹو کے قریب ہیں۔ وہ ایران نژاد ہیں اور کسی نسلی گروہ سے تعلق نہیں رکھتیں۔ انہیں پی پی پی کو قومی اتحاد کی علامت بنانا چاہیے خواہ بھٹو کو پھانسی ہو جائے۔ انہیں اور پی پی پی میں شامل کسی دوسرے شخص کو گروہی اور علاقائی خطوط پر نہیں سوچنا چاہیے۔ پاکستان اسی طرح محفوظ رہ سکتا ہے۔ براہ کرم یہ نکتہ انہیں بار بار سمجھائیں۔'' میں نے ایسی باتیں کر کے انہیں پھر سے گہرے جذبات میں گم کر دیا۔

وہ میری بات کے کچھ قائل نظر آئے۔ پھر بولے'

''کیا تم جرنیلوں کو کوئی اچھی بات نہیں سمجھا سکتے؟ تم ایک بہت سینئر اور صاحب فراست افسر ہو۔''

''میں ضرور کوشش کروں گا۔ لیکن ان کے ساتھ میرے تعلقات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ میں اپنے جرنیلوں کے بارے میں زیادہ خوش فہم اور پُر اُمید نہیں ہوں کیونکہ ان میں سے اکثر تاریخ کے شعور سے بے بہرہ ہیں۔ وہ مدبّر نہیں' وہ محض ایک طاقتور فورس کے نمائندے اور علامت ہیں۔ وہ صرف لوگوں کو دبانے اور کچلنے کی ترکیبوں سے واقف ہیں۔ وہ اس بدبودار صورت حال کو جوں کا توں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ بہر حال ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ جو کچھ بچ سکے وہ بچائیں۔'' انہوں نے میرے طرزِ استدلال سے اتفاق کیا اور کہنے لگے:

''میں کوشش کروں گا کہ بیگم بھٹو اور پی پی پی کو تمام مشکلات کے باوجود قومی دھارے میں شامل رکھا جائے۔'' اس کے بعد انہوں نے پوچھا:

''صورت حال کو ابتری سے بچانے نیز بھٹو کی جان بچانے کے لیے کوئی مشورہ؟''

میں اس بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا میں نے جواب دیا۔

"میرے خیال میں اگر بیگم صاحبہ امریکیوں کے ساتھ اختلافات ختم کرلیں تو بہتر ہوگا۔"

اصغر علی نے بیگم بھٹو کے ساتھ بہت سی ملاقاتیں کیں اور مجھے بتایا کہ وہ قومی سیاست کرنے کے موقف پر قائم ہیں خواہ جرنیل ان کے شوہر کو پھانسی کیوں نہ دے دیں۔ وہ کسی علاقائی یا نسلی مقصد کے لیے کام نہیں کریں گی۔ اصغر علی نے ان تصورات کی بابت بینظیر کی موجودگی میں بیگم صاحبہ سے بحث کی جو اصغر کے بقول نوعمر ہونے کے باوجود خاصی تیز اور سمجھدار لگتی تھی۔

میں نے اصغر علی کے خدشات سے چوہدری ارشد کو آگاہ کیا جو اب ضیا کی حکومت میں ایک وزیر تھے اور ان سے درخواست کی کہ سنگین مضمرات کے پیشِ نظر بھٹو کی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں۔ اگر سپریم کورٹ اپیل کو مسترد کردے تو سزائے موت کو عمر قید میں بدلوانے کی کوشش کریں۔ وہ ان لائنوں پر کام کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ وہ اصغر علی سے بھی ملے اور مختلف تدابیر پر غور کیا۔ ارشد نے بیگم بھٹو سے خفیہ طور پر ملنے کا وعدہ بھی کیا لیکن بوجوہ ملاقات نہیں ہوسکی۔

میں نے ارشد چوہدری سے یہ بھی کہا تھا کہ میرے قیاس کے مطابق بھٹو کی پھانسی کے بعد حکومت میں قومی اتحاد کا کوئی رول باقی نہیں رہیگا۔ انہیں حکومت میں شامل کرنے کا واحد مقصد یہ تھا کہ قومی اتحاد کے حامیوں سے بھٹو کی پھانسی کی تائید کرائی جائے۔ اس کے بعد پی این اے کو استعمال شدہ مانع تولید جھلی (Condom) کے طور پر حکومت سے بارہ پتھر باہر پھینک دیا جائے گا۔ وہ میری دلیل سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے، لیکن آخرِ کار یہی کچھ ہوا۔

"جنرل ضیا نے اقتدار کے نشہ سے لطف اندوز ہونا شروع کردیا ہے اب اس سے نجات پانے کے لیے پی پی پی اور پی این اے کو متحد ہونا پڑے گا۔"

میں نے اس قسم کی باتیں چوہدری ارشد کے گھر نوابزادہ صاحب سے کیں تو وہ خفا ہوگئے۔ انہوں نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا کہ جنرل ضیا پی این اے کے قائدین کو اپنی اغراض کے لیے استعمال کررہا اور بیوقوف بنا رہا ہے۔

جن دنوں بھٹو کی اپیل سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت تھی یہ افواہ سننے میں آئی کہ جج تقسیم ہوگئے ہیں۔ اس لیے عام طور پر قیاس کیا جانے لگا کہ سزائے موت عمر قید میں بدل دی جائے گی۔ بھٹو نے اپنے

کیس کے بارے میں ذاتی طور پر بھی دلائل دیئے۔ ان کے بیان کو عدالت کی اجازت کے بغیر کتابی صورت میں شائع کرنے کی کوشش کی گئی۔ تاہم اس کتاب کی ساری کاپیاں زیرِ طبع حالت میں ہی لاہور میں ضبط کر لی گئیں۔ بعد ازاں وہ کتاب انڈیا میں "If I Am Assassinated" کے عنوان سے شائع ہوئی' اس کی کچھ جلدیں سمگل کر کے پاکستان لائی گئیں اور فوٹو کاپیاں کر کے عوام تک پہنچائی گئیں۔

سپریم کورٹ نے طویل سماعت کے بعد 3:4 کی نسبت سے ہائیکورٹ کے فیصلہ کو بحال رکھا۔ بہت سے لوگ یہ توقع کر رہے تھے کہ جنرل ضیا جو چوہدری فضل الٰہی کے مستعفی ہونے پر صدر مملکت بھی بن گئے تھے' پھانسی کی سزا کو عمر قید میں بدل دیں گے۔ لیکن جنرل کے قریبی حلقوں کو یقین تھا کہ وہ بھٹو کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ارشد چوہدری عمرہ کرنے گئے تو مکہ مکرمہ میں خواب دیکھا کہ بھٹو کو پھانسی ہو گئی ہے اور انہوں نے بطور احتجاج وزارت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ انہوں نے واپسی پر مجھے اپنا خواب سنایا تو میں نے تجویز کیا کہ آپ اسی وقت مستعفی ہو جائیں تاکہ بھٹو کو پھانسی نہ ہو سکے' اس طرح آپ ملک کو ایک بھاری صدمہ سے بچا لیں گے' مگر انہوں نے میری بات نہیں مانی۔

بھٹو کی طرف سے نظر ثانی کی درخواست دائر کی گئی لیکن مختصر سماعت کے بعد وہ بھی مسترد کر دی گئی۔

ایک دن فیڈرل انسپکشن کمیشن کے چیئرمین جنرل صغیر حسین نے جن کے ساتھ میں کچھ عرصہ کام کر چکا تھا' میرے ساتھ بھٹو کی پھانسی کے مضمرات پر بحث کی۔ میں نے کہا کہ اس پر سندھ میں شدید ردِ عمل ہو گا اور ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ ان کے بقول انہوں نے بھٹو کو معافی دلانے کی بہت کوشش کی مگر ضیا اپنی ضد پر قائم رہے۔ انہیں یہ خوف لاحق تھا کہ بھٹو زندہ رہے تو لازماً بدلہ لیں گے۔

''چیف آف آرمی سٹاف کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے پوچھا

''کم از کم ہمارے ملک میں کوئی بھی شخص آرمی چیف کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' انہوں نے میری بات کی تائید کی۔

''بھٹو جذباتی ہو رہے ہیں۔ انہیں حکومت کو چیلنج کرنے کی بجائے خاموشی اختیار کر لینی چاہیے تھی۔'' جنرل صغیر نے کہا۔ تھوڑے سے وقفہ کے بعد پھر گویا ہوئے:

''اب انہیں بہر صورت پھانسی دی جائے گی۔ تم ایک تجربہ کار پولیس افسر ہو' یہ بتاؤ کہ پبلک ردِ عمل اور ہنگاموں کو کم سے کم کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟''

''بہترین صورت تو یہ ہے کہ بھٹو کو پھانسی نہ دی جائے۔ براہ نوازش ایک دفعہ کوشش کریں' دوسری صورت میں عام انتخابات کی تاریخ کا اعلان اکثر لوگوں کو مطمئن کر دے گا اور سیاسی طور پر سرگرمِ عمل لوگوں کی توجہ اُدھر مبذول ہو جائے گی۔ لیکن یہ صورتحال کو نارمل کرنے کی ایک تدبیر ہے۔ بہترین حل یہ ہے کہ بھٹو کی جان بچائی جائے۔ اسے جیل میں رکھا جائے اور الیکشن کرا دیئے جائیں۔ اس صورت میں معاملات انتہا تک نہیں جائیں گے۔'' میں نے اس وقت کے حالات کے مطابق مشورہ دیا۔ انہوں نے کہا:

''آپ کی بات دل کو لگتی ہے'' یہ کہہ کر وہ مارشل لا ہیڈ کوارٹرز روانہ ہو گئے۔ وہ دوسری بار بھی بھٹو کے لیے رحم کی بھیک حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ تاہم متبادل تجویز منظور کر لی گئی اور انتخابات کا اعلان پھانسی سے پہلے کر دیا گیا۔

رسہ ایک ہے اور گردنیں دو

بھٹو کی جاں بخشی کے لیے سربراہانِ مملکت سے لے کر عام آدمی اور مغربی دنیا سے لے کر عالمِ اسلام تک سے اپیلیں موصول ہونے لگیں۔ ملائشیا کے بانی اور سابق وزیر اعظم تنکو عبدالرحمٰن بنفسِ نفیس کوالالمپور سے اسلام آباد پہنچے اور جنرل ضیا کو ان کے ناپاک ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ سابق صدر مملکت چوہدری فضل الٰہی نے جنرل ضیا کو متاثر کن انداز میں ذاتی خط لکھا اور ان سے ملنے کی کوشش کی مگر وہ طرح دے گئے۔

ضیا بھٹو سے بہت زیادہ خوفزدہ تھے۔ انہیں پختہ یقین تھا کہ اگر بھٹو پھانسی کے پھندے سے بچ گئے تو انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے کیونکہ انہیں ہمیشہ کے لیے جیل میں رکھنا یا جلاوطن کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ یہی بات انہوں نے اس طرح کہی کہ ''رسہ ایک ہے اور گردنیں دو' یا تو ان کی گردن رسے سے لٹکے گی یا میری۔'' ایک بار یوں بھی کہا کہ ''قبر ایک ہے اور مردے دو' یا بھٹو کو قبر میں جانا ہوگا یا مجھے۔'' بھٹو نے اپنے مخالفین کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کے پیشِ نظر ضیا کی بات قابلِ فہم تھی۔ تاریخ کا گہرا شعور رکھنے کے باوجود معتوب وزیر اعظم نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔

ایک دن سعودی سفیر ریاض الخطیب نے میری موجودگی میں چوہدری ارشد سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ:

''میں بڑی عجیب الجھن میں پھنس گیا ہوں' میں نے جلالتہ الملک شاہ خالد کو یقین دہانی کرادی ہے کہ جنرل ضیا ان کی طرف سے جاں بخشی کی اپیل مسترد نہیں کریں گے کیونکہ جنرل ضیا نے مجھے ذاتی طور پر یقین دلایا تھا۔ اس کے بعد شاہ خالد نے ان سے اعلانیہ اپیل کی۔ لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ جنرل ضیا بھٹو کو پھانسی دے کر رہیں گے۔'' اتنی تفصیل بتانے کے بعد سفیر موصوف نے چوہدری صاحب سے' جو ان کے ذاتی دوست تھے' مشورہ مانگا۔ آیا انہیں دوبارہ شاہ خالد سے گذارش کرنی چاہیے کہ وہ جنرل ضیا کو ان کا وعدہ یاد دلائیں' بشرطیکہ ان کی طرف سے شاہ کی بات مان لینے کا کوئی امکان ہو؟''

''اس کا قطعاً امکان نہیں ہے۔'' ارشد چوہدری نے جواب دیا۔

''آپ اپنی پوزیشن مزید خراب نہ کریں۔'' میں نے چوہدری ارشد سے پنجابی میں درخواست کی (تا کہ ریاض الخطیب سمجھ نہ سکیں) کہ انہیں شاہ خالد سے ایک بار پھر ملنے دیں۔ ممکن ہے اس دفعہ بات بن جائے مگر وہ متفق نہیں ہوئے۔

ریاض الخطیب کے رخصت ہو جانے کے بعد میں نے ارشد چوہدری سے پوچھا آپ نے سفیر کو دوبارہ کوشش کرنے سے کیوں روک دیا؟''

''میں یقینی طور پر جانتا ہوں کہ ضیا کسی قیمت پر بھٹو کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے میں نے ریاض الخطیب کے اعتماد کو' جو وہ مجھ پر کرتے ہیں' ٹھیس پہنچانا مناسب نہیں سمجھا۔''

اس وقت میری وہ آس ٹوٹ گئی جو میں ملک کو ایک نادیدہ طوفان اور اس سے پھیلنے والی تباہی سے بچانے کی بابت رکھتا تھا۔ بہر حال میں نے صورتحال کو بدلنے کے لیے کچھ ناکام کوششیں ضرور کیں۔

بھٹو کی موت پی پی پی کو ختم کر دے گی

ایک دن میں نوابزادہ نصر اللہ خان کی طرف گیا اور ان سے بھٹو کی پھانسی کے نتائج پر تبادلہ خیال کیا۔ انہوں نے اپنی اس ٹھوس رائے کا اظہار کیا کہ بھٹو کو پھانسی نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے تجویز کیا کہ وہ اس طرح کی ایک پبلک اپیل کریں' اس سے دوسروں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ اس تجویز کو آگے بڑھائیں اور ایسی فضا پیدا کریں جو جنرل ضیا کو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دے۔ لیکن وہ عمومی بیان دینے

پر تیار نہیں ہوئے کیونکہ اس سے پاکستان تو ق ادا ں میں انتشار پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ بہر حال وہ جنرل ضیا سے ملنے اور بھٹو کی جان بخشی کی اپیل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

26 مارچ کو میں مولانا مودودی سے ملا اور بھٹو کو پھانسی کے نتائج پر بحث کی۔ ان کی ٹھوس رائے یہ تھی کہ بھٹو ایک بدمعاش آدمی ہے اسے اس کے گناہوں کی سزا لازماً ملنی چاہیے۔

''میں یہ نہیں کہتا کہ وہ کوئی اچھا آدمی ہے۔ بلاشبہ وہ مجسم برائی ہے۔ لیکن لوگ جذبات میں اندھے ہو جائیں گے اور مردہ بھٹو کے حق میں نکل کھڑے ہوں گے۔ وہ سیکولرازم کا حامی ہے جبکہ ضیا اسلام پسند ہے۔ جب لوگ ضیا کا ساتھ چھوڑ کر اس کی حمایت کریں گے تو اسلام ایک مذاق بن جائے گا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ یحییٰ خان کے ظلم وتشدد کے باعث ڈھاکہ میں بہت سے شریف آدمی ''اسلام مردہ باد'' کے نعرے لگانے لگے تھے۔ میں بھٹو کے لیے نہیں بلکہ اسلامی اقدار کے لیے پریشان ہوں' براہ مہربانی آپ جنرل ضیا سے بات کریں اور بھٹو کو بچانے کی کوشش کریں' اسے جیل میں سڑنے دیں اور قوم نیز اس کی اسلامی اقدار کو نقصان پہنچائے بغیر گھل گھل کر مرنے دیں۔''

لیکن مولانا ٹس سے مس نہ ہوئے' کہنے لگے:

''بھٹو پیپلز پارٹی کا دوسرا نام ہے۔ اس کی موت کے ساتھ ہی پی پی پی بھی ختم ہو جائے گی اس خبیث کو مرنے دیں۔ بھٹو کے بعد پی پی پی زیرو ہو جائے گی۔ آپ فکر نہ کریں۔ اسلام کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔'' میں نے اپنی دلیل تین بار دہرائی مگر لاحاصل۔ آخر میں مولانا نے کہا۔

''آپ جو کچھ کہتے ہیں' اس میں خاصا وزن ہے۔ تاہم بہتر یہی ہے کہ اسے اس انجام سے دوچار ہونے دیا جائے۔ زندہ بھٹو اور بھی زیادہ خطرناک ہوگا۔'' وہ انتہائی کمزور اور افسردہ نظر آ رہے تھے۔ میں نے ان سے اجازت لی اور مایوس و نامراد لوٹ آیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

دوسرے دن میاں احمد علی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا:

''تم بھٹو کو بچانے کے لیے اتنی تگ و دو کیوں کر رہے ہو؟ یہ بظاہر ایک سیاسی سرگرمی ہے اور تم ایک سرکاری ملازم ہو۔ کیا یہ سروس رولز کے خلاف نہیں؟''

''میں پاکستان کا ملازم ہوں' برسر اقتدار لوگوں کا نہیں۔ سروس رولز انگریزوں کے نوآبادیاتی نظام کا ورثہ ہیں اور اس وقت غیر متعلقہ بن جاتے ہیں جب ملک کا مستقبل معرضِ خطر میں ہو۔ میں ایک

برے حادثہ کا رخ موڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے روزمرہ کی جزئیات کے بارے میں کوئی فکر نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

عیاری، خوشامد اور ہٹ دھرمی پر مبنی حکمتِ عملی

جنرل ضیا نے عالمی لیڈروں کی طرف سے کی گئی اپیلوں کو سیاستدانوں کی ٹریڈ یونین ازم کا نتیجہ قرار دے کر مسترد کر دیا۔

اس نے بھٹو کو پھانسی دینے کے فیصلہ میں سیاستدانوں کی شراکت کو لازمی سمجھا تاکہ ان کے درمیان مستقل دراڑ پڑ جائے۔ وہ اس کے جال میں پھنس گئے اور کابینہ نے ضیا کے فیصلہ کی توثیق کر دی۔ اگرچہ رحم کی اپیل پر غور کرنا صدر کا ذاتی استحقاق ہوتا ہے لیکن ضیا نے بھٹو کے بعض رشتہ داروں کی طرف سے کی گئی رحم کی اپیل بھی جو بھٹو کی خواہش کے برعکس تھی، کابینہ کے ہر رکن کے ساتھ صلاح مشورہ کے بعد مسترد کی۔ حتیٰ کہ ارشد چوہدری نے بھی مکہ میں دیکھے ہوئے خواب کے باوجود ان سے اختلاف نہیں کیا۔

جنرل ضیا نے 23 مارچ 1979ء کو عام انتخابات کا اعلان کر دیا جو اسی سال 18 اکتوبر کو ہونے تھے۔ اس طرح بھٹو کی پھانسی کا راستہ صاف ہو گیا۔ عام طور پر کہا جانے لگا کہ اس اعلان سے نہ صرف پھانسی پر مخالفانہ ردِعمل غیر موثر ہو جائے گا بلکہ قومی اتحاد سے جان چھڑانے کی راہ بھی ہموار ہو جائے گی۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں یہ ایک مناسب اقدام ہے؟'' جنرل غلام حسن نے فیڈرل انسپکشن کمیشن کے دورہ کے دوران مجھ سے پوچھا۔

''ہاں یہ مناسب اقدام ہے'' میں نے جواب میں کہا۔

''کیوں نہ ہو آپ تربیت یافتہ چالوں کے ماہر بلکہ ماہرِ حربیات ہیں اور آپ کی مہارت بڑی چالاکی سے ہمارے اپنے لوگوں کے خلاف استعمال ہوتی ہے۔''

''تم سول ملازمین تربیت یافتہ خوشامدی اور چاپلوس ہوتے ہو، ان دونوں میں کیا فرق ہے؟'' انہوں نے جوابی حملہ کیا۔

''سر! کوئی فرق نہیں، مکاری کو سراہنے اور ہٹ دھرمی پر مبنی حکمتِ عملی اختیار کرنے سے اچھی کاک ٹیل (شرابوں کا آمیزہ) بنتی ہے۔'' ہم ایک انتہائی سنجیدہ معاملہ پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

میں انتہائی مایوس اور دل شکستہ لاہور پہنچا۔ میں نے اصغر علی کو بتایا کہ بھٹو کو پھانسی دی جانے والی ہے۔ مناسب ہے کہ آپ سہالہ جائیں جہاں نصرت بھٹو اور بینظیر بھٹو نظر بند ہیں' اور انہیں سیاست کے مرکزی دھارے میں شامل رکھنے کی کوشش کریں۔ وہ منحوس خبر سن کر بے حد غمگین ہوئے اور انہیں اسی وقت دمہ کا دورہ پڑ گیا۔ بیگم بھٹو کا وکیل ہونے کے ناطے انہیں بیگم بھٹو سے ملنے کی عام اجازت تھی' لیکن اب کی بار پھانسی کے کئی دن بعد ملاقات کر سکے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ بھٹو خواتین اب بھی منفی اور علاقائی کی بجائے قومی سیاست کرنے کا عزم رکھتی ہیں۔

بھٹو کی پھانسی سے پہلے بطور احتجاج خودسوزی کے چند واقعات ہوئے لیکن جنرل ضیا پر ان کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ انسپکٹر جنرل حاجی حبیب الرحمٰن نے پولیس کو ہدایت کی کہ خودسوزی کرنے والوں کو بچانے کی کوشش کی جائے۔ ضیا کو یہ ہدایت ناگوار گزری اور آئی جی سے وہ حکم واپس لینے کو کہا۔ حاجی صاحب اپنے موقف پر ڈٹ گئے' ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ازروئے قانون پولیس افسر کا بنیادی فرض ہے کہ جہاں انسانی زندگی کو خطرہ لاحق ہو' وہاں مداخلت کرے۔ اس کے برعکس جنرل کی رائے یہ تھی کہ اگر خودسوزی کرنے والے افراد موقع پر ہی دم توڑ جائیں تو دوسروں کو حوصلہ شکنی ہوگی۔ حاجی صاحب کو اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ٹرانسفر کر دیا گیا۔

کہانی ختم یا نئی زندگی

4 اپریل 1979ء کی منحوس تاریخ کو چوہدری ارشد نے صبح سویرے مجھے فون کیا اور بتایا کہ ''بھٹو کو پھانسی دے دی گئی ہے۔'' اس کے بعد طویل وقفہ۔ نہ میرے منہ سے کچھ نکلا' نہ ہی وہ کچھ کہہ سکے۔ میرا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ خوف کا خاتمہ خوف سے ہوتا ہے اور تشدد سے تشدد جنم لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے پیٹ میں انتہائی شدید درد ہونے لگا...... مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بدن میں جان نہیں رہی۔

جب یہ افسوس ناک خبر لوگوں تک پہنچی تو وہ سکتہ میں آ گئے۔ لاہور میں آتش زنی' توڑ پھوڑ اور جنوں خیز احتجاج کے واقعات رونما ہوئے۔ بیگم بھٹو اور بینظیر بھٹو کو میت دیکھنے اور آخری رسومات میں شرکت کی اجازت بھی نہیں دی گئی جو ایک غیر ضروری اور غیر دانشمندانہ احتیاطی تدبیر تھی۔ ان دونوں کو کئی دن

بعد بڑے سخت پہرہ میں قبر پر جانے کا موقع دیا گیا۔

سندھ میں گہری خاموش چھا گئی جبکہ جنرل خوش ہو رہے تھے کہ انہوں نے آہنی پنجہ کے ذریعے صورتحال پر قابو پالیا ہے۔ میں نے فیڈرل انسپکشن کمیشن میں بعض افراد کو اس بات پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے پایا کہ سندھیوں کو خوفزدہ کر کے خاموش کرادیا گیا ہے۔

اس طرح کی بہت سی کہانیاں سننے میں آئیں کہ بھٹو کو پھانسی سے پہلے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ کہ وہ موت کے خوف سے بے ہوش ہوگئے تھے۔ لیکن وہ سب جھوٹی نکلیں۔ بھٹو نے آخری مرحلہ پر کافی پینے کی خواہش ظاہر کی اور شیو کی تاکہ بڑھی ہوئی داڑھی کو صاف کرسکیں۔ کیونکہ ''وہ اس حالت میں نہیں مرنا چاہتے تھے کہ مُلا نظر آئیں۔'' وہ خود چل کے تختہ دار تک گئے۔ انہوں نے ایک دلیر انسان کی طرح موت کو گلے لگایا۔ بھٹو اپنے ارادتمندوں کے لیے شاندار مثال قائم کر گئے۔ اکیلا یہی کارنامہ کسی دوسرے کام کے مقابلہ میں بھٹو کے نام کو عرصہ دراز تک زندہ اور لوگوں کو حوصلہ دینے والے کے طور پر باقی رکھے گا۔

پھانسی کے بعد بیگم بھٹو اور بینظیر بھٹو کو قید تنہائی کا عذاب بھگتنا پڑا۔ بھٹو کے بیٹے مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو لندن میں تھے۔ انہیں جونہی باپ کی پھانسی کی اطلاع ملی انہوں نے انتقام لینے کا تہیہ کرلیا۔ انہوں نے فوری طور پر پیپلز لبریشن آرمی تشکیل دی جو بعد ازاں ان کے بیس کابل میں منتقل ہونے کے بعد الذوالفقار تنظیم (AZO) کے نام سے مشہور ہوئی۔

بھٹو سے چھٹکارا پانے کے ساتھ ہی ضیا نے قومی اتحاد سے بھی نجات حاصل کرلی۔ اس کے لیے جو بہانہ بنایا گیا وہ بڑا خوش نما تھا۔ سیاسی وزرا سے جو سب کے سب اتحاد سے تھے' 21 اپریل کو اس بہانے سے استعفے لے لیے گئے کہ انہیں آئندہ الیکشن میں حصہ لینا ہے اس لیے اپنی سیٹیں چھوڑ دیں۔

اس کے ساتھ ہی پاکستان قومی اتحاد کے ٹکڑے ہوگئے۔ تحریکِ استقلال نے پہلے ہی علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ دوسری جماعتیں بھی ایک ایک کر کے الگ ہوگئیں۔ مسلم لیگ دو گروپوں میں بٹ گئی۔ مولانا کوثر نیازی نے ''پیپلز پروگریسو پارٹی'' کے نام سے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنالی۔ حفیظ پیرزادہ نے سیاسی سرگرمیاں ترک کردیں۔ ممتاز بھٹو بہت پہلے سندھی قوم پرست لیڈر بننے کا عندیہ ظاہر کر چکے تھے۔ وہ سندھی محاذ قائم کر کے ملک کو کنفیڈریشن میں تقسیم کرنے کا پرچار کرنے لگے۔

تاریخ کو مسخ کرنے والے کاموں کی ابتدا

1979ء کا سال ہماری تاریخ میں غلط راستوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ بھٹو کی پھانسی، پاکستان قومی اتحاد کی شکست وریخت، الذوالفقار کی تشکیل، حدود آرڈیننس کا نفاذ، فرقہ وارانہ منافرت جس نے آگے چل کر دہشت گردی کی شکل اختیار کر لی۔ ایران، عراق جنگ کا آغاز اور افغانستان پر روس کے قبضہ نے ملک کے لیے بہت سے چیلنج اور مسائل کھڑے کر دیئے۔ 1979ء میں برائی کے جو بیج بوئے گئے وہ آہستہ آہستہ بدی کے تناور درخت بن گئے۔

عام انتخابات جو 18 اکتوبر 1979ء کو کرانے کا مقدس وعدہ کیا گیا تھا، غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیئے گئے۔ پی پی پی کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتیں بھی ماسوائے جماعتِ اسلامی، جمہوریت اور الیکشن کرانے کا مطالبہ کرنے لگیں۔ جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد جنرل ضیا کے ساتھ شیر و شکر ہو گئے۔ دریں اثنا ایک دہشت گرد تنظیم ''الذوالفقار'' کی گھن گرج سنائی دی۔ بیرونی امداد معطل ہو جانے سے اقتصادی مسائل نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ سعودی عرب کی طرف سے امداد ملنے کی اُمید کو یقینی بنانے کے لیے قوانین کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کا عمل (اسلامائزیشن) زور و شور سے جاری تھا۔ حالانکہ اس عمل کے نتیجہ میں معاشرہ تفریق و انتشار کا شکار ہو رہا تھا۔ عراق، ایران کے ساتھ بھرپور جنگ میں مصروف ہونے کے باوجود پاکستان کے سنی علما کو بھاری رقوم فراہم کر رہا تھا تاکہ وہ اہل تشیع کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔

لیکن جنرل ضیا کی لڑکھڑاتی اور ڈگمگاتی حکومت کو اس وقت سہارا مل گیا جب روسی فوجیں افغانستان میں گھس آئیں۔ اس کے چند ہفتے بعد ریگن صدر کارٹر کے جانشین بن گئے۔ انہوں نے افغانستان کو روس کی شیطانی سلطنت کے خلاف اپنی گلوبل پالیسی کا سنگ میل بنا لیا۔ روس کا خون اس طرح نچوڑنا کہ افغانستان اس کے لیے ویت نام بن جائے، امریکہ کا اولین مقصد قرار پایا۔ پاکستان نے کمیونزم کے خلاف ''مقدس جہاد'' میں فرنٹ لائن سٹیٹ کا کام دیا۔ امریکہ نے اس کی فوجی و اقتصادی امداد کے لیے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیئے۔ پاکستان میں داخل ہونے والے لاکھوں افغان مہاجرین کے لیے آنے والی ''انسانی امداد'' اس کے علاوہ تھی۔ مہاجرین کے ساتھ حسن سلوک اسلامی روایت کے مطابق قرار دیا گیا جس سے عالمِ اسلام میں ضیاالحق کا امیج خاصا بہتر ہو گیا۔

باہر سے ٹھوس سہارا ملنے کے بعد ضیا حکومت اس قدر دلیر ہو گئی کہ اس نے جمہوریت کے بارے

میں؛ اگر واقعی اس کے کچھ عزائم تھے' سارے دعوے بالائے طاق رکھ دیئے۔ یہاں تک کہ خود جمہوریت کو ''غیر اسلامی'' قرار دے دیا گیا۔ قائداعظمؒ کی ایک ڈائری ''دریافت'' کر لی گئی اور اپنے دعویٰ کی تائید میں اس کا حوالہ دیا جانے لگا۔ تاہم اس ڈائری کو کبھی شائع نہیں کیا گیا۔ سیاسی مخالفت کو بے اثر بنانے کے لیے ضیا نے مذہبی عناصر کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے لگے جو انہیں ''عظیم مجاہد اسلام'' کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کے نقطۂ نظر کو زکوٰۃ فنڈ اور سعودی ریال کے ذریعے تقویت پہنچائی جاتی تھی۔

مشترکہ مقصد ہاتھ آ گیا

دوسری طرف مارشل لا کی چاق و چوبند مشینری رات دن اپنی اصل حریف پی پی پی کو کچلنے میں مصروف تھی۔ اس کے اکثر لیڈروں کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے یا الیکشن لڑنے کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا۔ ایف آئی اے اور پولیس والے ان لیڈروں کے خلاف زرعی اصلاحات سے متعلق معاملات کی چھان بین کرنے اور ان کے سیاہ کرتوتوں' غلطیوں اور حماقتوں کا کھوج لگانے نیز کارکنوں کے خلاف جھوٹے مقدمات بنانے میں مصروف ہو گئے۔ کئی ہزار کارکن گرفتار کر لیے گئے' انہیں کوڑے مارے گئے اور چھوٹے بڑے مقدمات میں ملوث کر کے پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ فوجیوں پر مشتمل خصوصی اور سرسری عدالتیں پی پی پی کے مخلص کارکنوں کو سزائیں دینے میں مصروف تھیں۔ بہت سے کارکن مارشل لا کی سختیوں سے بچنے کے لیے خفیہ راستوں سے برطانیہ' لیبیا' افغانستان اور بھارت وغیرہ میں چلے گئے۔

وہ سیاستدان جن کے برسرِ اقتدار آنے کا کوئی امکان نہیں تھا' ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور ضیا کے خلاف مشترکہ مقصد ڈھونڈنے لگے۔ چوہدری ارشد کی رہائش گاہ سیاستدانوں کی بیٹھک بن گئی۔ وہاں میں نے نوابزادہ نصر اللہ اور رانا ظفر اللہ سے ملاقات کی جو ضیا کے زبردست نکتہ چین بن گئے تھے اور محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کے ساتھ واقعی دھوکہ ہوا ہے اور جرنیل داؤ گھات میں ان سے بڑھ گئے ہیں۔ وہ اصغر خان کو برا بھلا کہنے لگے جنہوں نے یہ کہہ کر انہیں گمراہ کیا تھا کہ اگر بھٹو حکومت کی جگہ مارشل لا لگ جائے تو وہ 90 دنوں میں الیکشن کی ضمانت دیتے ہیں۔ یہ 1980ء کے شروع کی بات ہے جب انتخابات کے دور دور کوئی آثار نہیں تھے۔ انہوں نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ حکومت ظلم و جبر عوام کو کچلنے اور دبانے کے حربوں میں تمام حدود پھلانگ گئی ہے اور پیپلز پارٹی کو' خصوصاً سندھ میں' دیوار سے لگا دیا گیا ہے۔

نصراللہ خان اس نقطۂ نظر کے حامی تھے کہ پی پی پی کو ظلم وجور کے خلاف اس کی جدوجہد میں تنہا نہ چھوڑا جائے ورنہ وہ ایک علاقائی پارٹی بن جائے گی۔ حالات کے جبر اور حکمرانوں کی تنگ نظری و تنگ دلی کے باعث قومی اتحاد والے اور پی پی پی ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ظلم و تشدد کا مل کر مقابلہ کرنے کی غرض سے صف بندیاں ہونے لگیں۔ تاہم اپوزیشن پارٹیوں کا نیا اتحاد ایم آر ڈی قائم ہونے میں پورا ایک سال لگ گیا۔ اس وقت مجھے اے حمید کی وہ بات یاد آ گئی کہ مارشل لا ختم کرانے کے لیے پی این اے اور پی پی پی کو مل کر جدوجہد کرنی ہوگی۔

ضیا کا اسلامی نظام

بھٹو کی پھانسی کے بعد امریکہ اور دوسرے ممالک نے پاکستان کی امداد معطل کر دی تھی۔ ضیا نے فنڈز حاصل کرنے کی جستجو میں سعودی عرب کو خوش کرنے کی ٹھان لی۔ اس مقصد کے لیے قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا ناخوشگوار پروگرام شروع کر دیا۔ اس سے پہلے وہ حدود آرڈیننس نافذ کر چکے تھے جس کے ذریعے شریعت کی مقرر کردہ بعض سزاؤں کا نفاذ عمل میں آیا۔ تاہم بہت سی قانونی تحریفات کرنی پڑیں۔ اب انہوں نے جملہ فوجداری مقدمات کی سماعت اور سزاؤں کے لیے اسلامی قوانین نافذ کرنے کا تہیہ کر لیا۔

بیورو آف ریسرچ پولیس میں تعیناتی کے دوران مجھے اس موضوع پر ایک نوٹ لکھنے کو کہا گیا تھا۔ مجھے بذاتِ خود شرعی احکام کے نفاذ سے بڑی دلچسپی تھی۔ تاہم میری رائے یہ تھی کہ اگر یہ کام جلد بازی میں اور لوگوں کو تعلیم و ترغیب کے ذریعے تیار کیے بغیر کیا گیا تو بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی نیز مختلف فرقوں کے مابین کئی سنگین تنازعات اٹھ کھڑے ہوں گے۔ دیوانی معاملات مثلاً نکاح‘ طلاق اور وراثت وغیرہ پہلے ہی ہر فرقہ کے پرسنل لا کے مطابق ہیں۔ زنا اور منشیات جیسے فوجداری جرائم کو بھی اسلامی قوانین کے تحت قابلِ تعزیر قرار دے دیا گیا ہے۔ دیگر فوجداری قوانین کو ابھی نہیں چھیڑنا چاہیے‘ کیونکہ مختلف فرقوں خصوصاً شیعہ اور سنیوں کے درمیان بہت سے بنیادی اور ناقابلِ مفاہمت اختلافات موجود ہیں۔ علاوہ ازیں اسلام کے تعزیری پہلو کی بجائے اس کے صلۂ رحمی پر مبنی رخ کو نمایاں کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔

میں نے اپنے نوٹ میں فرقہ واریت کے سیاسی پس منظر پر بھی روشنی ڈالی۔ ’’سنت‘‘ اور ’’جماعت‘‘ کی اصطلاح بجائے خود ایک فارمولا کا نام ہے جسے بہت عرصہ پہلے علامہ اشعری نے روشناس

کرایا تھا اور پھر امام غزالی نے اسے بہتر شکل میں پیش کیا۔ جب باطنی' معتزلہ' خوارج اور دوسرے لوگ معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے کو کافر اور واجب القتل قرار دینے لگے۔ اس وقت یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ہر گروپ دوسروں کے نزدیک کافر ٹھہرے گا اور امت مسلمہ فرقوں میں تقسیم ہو کر تباہ ہو جائے گی۔ چنانچہ عمومی اتفاقِ رائے سے طے پایا کہ ایسے لوگوں کو جو سنت (رسولِ اکرمؐ کا معروف راستہ) اور جماعت (اکثریت کا اتفاقِ رائے) کی پیروی کرتے ہوں' کافر نہ کہا جائے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد یہ بذاتِ خود ایک فرقہ بن گیا جسے ''اہلِ سنت والجماعت'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔

جنوبی ایشیا میں اہلِ تشیع کا اثر و رسوخ مغل بادشاہ ہمایوں کی ایران واپسی کے بعد بڑھا۔ بعدازاں وہ اس وقت موجب نزاع بن گیا جب شیخ احمد سرہندی نے جو مجدد الف ثانیؒ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں' اکبر کے دینِ الٰہی اور شیعہ عقائد کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ ان کے ایک پیروکار شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر شیعوں کے کٹر مخالف بن گئے۔ اس وقت سے شیعوں اور سنیوں کے مابین زبردست قسم کی تفریق و تقسیم چلی آ رہی ہے۔

میں نے مذکورہ مقالہ میں لکھا تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ مشترکہ دشمنی نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو متحد رکھا تھا۔ اب ان میں تقسیم و تفریق ڈالنے والا کوئی قدم اُٹھایا گیا تو پنڈورا بکس کھل جائے گا۔ اس لیے میرے خیال میں مکمل تاریخی تناظر کا جائزہ لیے بغیر شریعت کے نفاذ میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ''لیکن میرے مشورہ پر پوری طرح توجہ نہیں دی گئی اور بعض اقدامات تجویز کیے گئے۔ شیعوں کو پتہ چلا تو انہوں نے اسلام آباد میں وفاقی سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کر لیا اور تین دن کے بعد اسی وقت قبضہ چھوڑا جب ان کے بیشتر مطالبات تسلیم کر لیے گئے۔ اس سے سنیوں خصوصاً دیوبندیوں میں زبردست ردِعمل ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک سپاہ صحابہ (سنی) اور تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ (شیعہ) کے مابین دہشت گردی پر مبنی ناپاک جنگ جاری ہے جس میں دونوں طرف سے سینکڑوں افراد مارے جا چکے ہیں۔ فرقہ وارانہ دہشت گردی خصوصاً پنجاب میں امن وامان کی خرابی کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب بن گئی۔ اس موضوع پر مزید تفصیلات کے لیے باب نمبر 41 ملاحظہ کیجئے۔

باب19

ایف آئی اے کا استعمال

وفاقی ادارہ تحقیقات (Federal Investigation Agency) جسے مختصراً ایف آئی اے کہا جاتا ہے' وفاق سے تعلق رکھنے والے معاملات اور ایسے جرائم کی تفتیش کرتا ہے جو وفاقی قوانین کے دائرہ میں آتے ہوں۔ یہ وفاقی ملازمین کے خلاف انسدادِ رشوت ستانی کے امور میں تفتیش کرنے والا اہم ترین ادارہ ہے اور اس سلسلے میں اسے وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ مجھے مارچ 1980ء میں ایف آئی اے میں بطور ڈائریکٹر راولپنڈی ریجن تعینات کیا گیا۔ میرے دائرۂ اختیار میں صوبہ سرحد' شمالی علاقہ جات' اسلام آباد اور راولپنڈی ڈویژن شامل تھے۔ اپریل 1981ء میں مجھے ڈائریکٹر ایف آئی اے لاہور لگا دیا گیا۔ میں نے دونوں جگہ کرپشن کے متعدد معاملات کی تفتیش کی' ان میں سے چند کا ذکر باب نمبر 32 میں کیا گیا ہے۔

میاں محمد اسلم حیات وٹو ایف آئی اے کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ وہ ایک متقی' دلیر' مستقل مزاج اور راست گو پولیس افسر تھے جن کی دیانت پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ایک ماہر پیشہ ور تھے اور اپنے کام پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ میں ان کے ساتھ 75-1973ء کے دوران میں اس وقت بھی کام کر چکا تھا جب وہ ایڈیشنل آئی جی پنجاب تھے۔

سیاستدانوں کو ہراساں کرنا

فوجی حکومت نے بعض جاگیرداروں کے خلاف جو ممتاز سیاستدان بھی تھے' بہت ساری شکایات اکٹھی کر لیں جن کا تعلق زرعی اصلاحات کے ضوابط کی خلاف ورزی سے تھا اور مارشل لا کے ایک حکم کے

تحت وہ سارے کیس تحقیق کے لیے ایف آئی اے کو بھیج دیئے گئے تھے۔ محمد اسلم باجوہ کو جو لاہور میں میرے پیشرو تھے' زرعی معاملات میں ماہر سمجھا جاتا تھا اس لیے وہ ملک بھر سے موصول ہونے والے مقدمات کی چھان بین کرتے تھے۔

مجھے ان فائلوں میں کوئی خاص چیز نہیں ملی۔ الزامات کا تعلق عام طور سے زرعی ریکارڈ میں پہلے کی تاریخ پر انتقال درج کرانے یا محکمہ مال کے عملہ سے ملی بھگت کر کے پیداواری یونٹوں کو کم ظاہر کرنے سے تھا۔ نواب بہاولپور کے خاندان کے خلاف ایک کیس میں الزام لگایا گیا تھا کہ زمین کی ملکیت ظاہر کرنے والے فارم 1972ء میں بروقت جمع نہیں کرائے گئے۔ چونکہ مقررہ تاریخ تک فارم جمع نہ کرنا جرم تھا اس لیے سی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز چاہتا تھا کہ نواب خاندان کے خلاف کارروائی کی جائے۔ چنانچہ بہت سے ارکان خاندان کے خلاف کیس درج کیے گئے' تاہم یہ پہلو بڑا مضحکہ خیز تھا کہ اس وقت تک سپریم کورٹ نے موروثی حصص کا تعین نہیں کیا تھا اور یہ طے کرنا باقی تھا کہ کس کے پاس کتنی زمین ہے۔ اس لیے مقررہ تاریخ تک فارم جمع کرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

نواب صادق حسین قریشی' سابق گورنر پنجاب اور ان کے خاندان کے خلاف مقدمہ کا تعلق 1954ء میں 20 سالہ ٹیوب ویل سکیم کے تحت الاٹ شدہ اراضی سے تھا۔ اگر مذکورہ زمین ان کی ملکیت میں شامل کر لی جاتی تو وہ اور ان کے خاندان کا ہر فرد 8 ہزار پیداواری یونٹ (زیادہ سے زیادہ حدِ ملکیت) سے زائد اراضی رکھنے کا مجرم ٹھہرتا تھا۔ تفتیشی افسر نے انہیں نہ صرف مقررہ حد سے زائد اراضی رکھنے بلکہ ریکارڈ میں جعل سازی اور 1972ء سے پہلے کی ملکیت ظاہر کرنے کا بھی قصوروار ٹھہرایا۔ اس نے اس سلسلے میں ملتان کے ڈپٹی کمشنر حفیظ اللہ اسحاق' ملک جہانگیر اور دیگر افسران مال کو بھی ریکارڈ میں جعل سازی کرنے کا ذمہ دار قرار دیا۔

میں نے فائل کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا اور اس بات پر حیران ہوا کہ نواب صادق حسین قریشی نے 1974ء کی بجائے 1972ء میں زمین کی ملکیت حاصل کرنے کی کوشش کیوں کی جبکہ 1954ء کی سکیم کے مطابق انہیں 1974ء میں وہ جائز طریقے سے مل جاتی' الا یہ کہ انہوں نے خود کو اور اہل خاندان کو انتہائی بھونڈے انداز میں فوجداری مقدمات میں پھنسانے کا ارادہ کر لیا ہو۔ اس لیے وہ سارا کیس سراسر بے بنیاد لگتا تھا لیکن نواب صادق قریشی اور محکمہ مال کے افسران مارشل لا کی وجہ سے خوفزدہ

تھے۔ میں نے وہ کیس کسی کو طلب کیے بغیر میرٹ پر خارج کر دیا۔

اس کے بعد میں نے کئی اور کیس بھی اسی طرح خارج کر دیے۔ اس پر سی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز میں زرعی اصلاحات کے مقدمات کا انچارج بریگیڈیئر بہت برہم ہوا۔ اس نے میری تحریری جواب طلبی کی۔ میں نے اسے رپورٹ بھیجی کہ ان مقدمات کا اندراج ہی کسی جواز کے بغیر تھا۔ اس کے بعد اس نے پھر کبھی مجھے تنگ نہیں کیا۔

1984ء میں حفیظ اللہ اسحاق کے ساتھ‘ جب کہ ہم دونوں نیپا (لاہور) میں ایک کورس کر رہے تھے‘ اس موضوع پر بحث ہوئی تو انہوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ان کے خلاف کیس جنرل ضیا اور صادق قریشی کے مابین مفاہمت کے نتیجہ میں خارج کیا گیا تھا۔ جب میں نے انہیں اصل پوزیشن بتائی تو وہ یہ جان کر بڑے حیران ہوئے کہ میں نے اس کیس کو اپنے طور پر ختم کیا تھا۔ بہر حال فوجی حکومت جاگیردار سیاستدانوں کو خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ ان میں سے بہت سے جو زرعی اصلاحات کی خلاف ورزیوں میں ملوث تھے‘ بعد ازاں جنرل ضیا کی قائم کردہ مجلسِ شوریٰ میں شامل ہو گئے۔

سیٹھ عابد

میں احمد میاں سومرو کو اس وقت سے جانتا تھا جب ساٹھ کی دہائی کے آخر میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے سینئر ڈپٹی سپیکر تھے۔ ان کی سفارش پر 1982ء میں ان کا دوست سیٹھ عابد حسین مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے درخواست کی کہ ایف آئی اے لاہور نے سمگلنگ کے ایک کیس میں اس کی بریت کے خلاف لاہور ہائیکورٹ میں جو اپیل دائر کر رکھی ہے‘ وہ واپس لے لی جائے۔ میں نے اسے بتایا کہ ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ معاملہ ایک عدالت میں زیرِ التوا ہے اس کا حتمی فیصلہ ہونے دیں۔ مگر وہ مطمئن نہیں ہوا۔ پھر اس نے اچانک پوچھا:

”کیا محمود بھائی نے آپ کے ساتھ بات نہیں کی؟“

”وہ کون ہیں؟“ میں نے جوابی سوال کیا۔

”محمود ہارون‘ وزیر داخلہ۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”نہیں انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔“ میں نے جواب دیا۔ اب میرے اندر تجسس پیدا

ہو گیا تھا۔

''کیا ضیا بھائی نے بھی بات نہیں کی؟'' اس نے اگلا سوال داغ دیا۔

''نہیں۔'' جب اس کی طرف سے اتنے اونچے تعلقات کا حوالہ دینے پر بھی میں نے کسی قسم کی حیرت ظاہر کیے بغیر دو ٹوک جواب دیا تو وہ مایوس ہو کر لوٹ گیا۔

مذکورہ بالا کیس اس کے خلاف 1976ء میں اس وقت درج کیا گیا تھا جب پولیس اور رینجرز نے اس سے سونے کی بھاری مقدار، گھڑیاں اور کرنسی برآمد کر کے ضبط کر لی تھی۔ ایف آئی اے نے تفتیش کر کے کیس عدالت کو بھیج دیا۔ ایف آئی اے کا دعویٰ تھا کہ مذکورہ بالا اشیا ملک سے باہر سمگل کرنے کے لیے جمع کی گئی تھیں جبکہ وکیل صفائی کا مؤقف یہ تھا کہ وہ اشیا سمگل نہیں کی جا رہی تھیں بلکہ انہیں کالا دھن ظاہر کرنے کے لیے ایک جگہ جمع کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ ایسا اعلان کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے مقرر کردہ آخری تاریخ قریب آ رہی تھی۔ (پولیس نے مقررہ تاریخ سے دو دن پہلے چھاپہ مار کر سارا مال قبضے میں لے لیا تھا) عدالت نے صفائی کے مؤقف کو تسلیم کرتے ہوئے ملزم کو سمگلنگ کے الزام سے بری کر دیا۔ ایف آئی اے نے اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر رکھی تھی۔ سیٹھ عابد چاہتا تھا کہ اپیل واپس لے کر مال اسے دیا جائے۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔

ایک ہفتہ بعد مجھے وفاقی حکومت کی طرف سے جاری کردہ حکم موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ سیٹھ عابد و دیگران کے خلاف اپیل واپس لینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ یہ ہدایت اٹارنی جنرل کے نام تھی اور اس کی نقل برائے اطلاع و مزید کارروائی ایف آئی اے کو بھیجی گئی تھی۔ ایف آئی اے سے مشورہ تک نہیں کیا گیا تھا۔ ڈائریکٹر جنرل میاں اسلم حیات وٹو نے مجھے بتایا کہ سیٹھ عابد نے صدر کے ساتھ دوپہر کے کھانے پر ملاقات کی اور یہ حکم اس کے ایوانِ صدر سے نکلتے ہی ایسے جاری ہوا جیسے دن کے بعد رات آتی ہے۔ اٹارنی جنرل کی طرف سے اپیل واپس لینے پر عدالتی کارروائی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

اپیل کی واپسی کے بعد میں نے کمشنر انکم ٹیکس کو خط لکھا کہ ضبط کردہ اشیا جو سٹیٹ بینک میں جمع کرا دی گئی تھیں 1976ء کی شرح کے مطابق انکم ٹیکس وضع کرنے کے بعد مالک کو واپس کر دی جائیں کیونکہ اس کیس میں صفائی کا موقف یہی تھا کہ وہ سامان کالا دھن ظاہر کرنے کی نیت سے جمع کیا گیا تھا۔ از روئے قانون ٹیکس کی کٹوتی جائز ہے۔ بعد میں کوئی پتہ نہیں چلا کہ میرے مراسلے کی بابت سیٹھ عابد کا ردِ عمل کیا تھا۔

مذہب اور اختیارات کا غلط استعمال

بعض اوقات دیانتدار سرکاری ملازمین کے غلط مذہبی تعصبات بھی بہت بڑی ناانصافی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس طرح کے ایک کیس میں قومی تحویل میں لی گئی ایک فیکٹری کا مینیجر جو خاصا پڑھا لکھا اور بڑا لائق فائق تھا' ملوث پایا گیا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے کچھ فولاد بازاری قیمت سے کم نرخ پر فروخت کر دیا جس سے حکومت کو تیرہ ہزار روپے کا نقصان پہنچا۔ دورانِ تفتیش ایف آئی اے کے ایک انسپکٹر نے اسے مارا پیٹا۔ وہ مینیجر اگلے دن ہانپتا کانپتا اور غصہ میں بھرا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا:

''میں بڑی مشکل سے آپ تک پہنچا ہوں۔ انسپکٹر مجھے جان سے مارنے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے اس کی منت سماجت اور خوشامد کر کے جان بچائی ہے۔''

میں نے اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر جعفر خان کو جو بڑا قابل اور ایماندار افسر تھا' بلایا اور کیس کی تفصیلات کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ فولاد 1980ء میں بیچا گیا تھا جبکہ قیمتوں کا موازنہ 1984ء کی قیمت سے کیا گیا تھا۔ میں نے یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ملزم بالکل بے گناہ ہے انسپکٹر کے بارے میں معلومات حاصل کیں وہ بھی بڑا دیانتدار اور متقی افسر نکلا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔

چھان بین کرنے سے پتہ چلا کہ وہ شکایت چیف مارشل لا ہیڈکوارٹرز کی طرف سے آئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ ''ایک بھٹو نواز مرزائی بلاخوف وخطر اربوں روپے لوٹ رہا ہے۔'' میرا خیال تھا کہ اس میں لازماً کسی مذہبی دیوانے کا غیظ وغضب شامل ہے۔ میرا قیاس درست نکلا کارپوریشن کے سربراہ کا تعلق احمدیہ جماعت سے تھا جبکہ انسپکٹر کٹر شیعہ تھا۔ انسپکٹر تفتیش کے دوران مذہبی جنون میں مبتلا ہو گیا اور احمدی کو دہشت زدہ کرنے پر تل گیا۔ اس نے احمدی کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک وہ انسپکٹر کے مرشد کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو گیا۔ انسپکٹر کو اس بات پر بڑا ناز تھا کہ اس نے ایک غیر مسلم کو اپنے سرکاری اختیارات استعمال کر کے دائرۂ اسلام میں شامل کر لیا ہے۔ اس مقدمہ کو خارج کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے گئے۔ مجھے معلوم نہیں آیا وہ احمدی مستقل طور پر مسلمان ہوا تھا یا وقتی طور پر۔

فوجی افسروں کے خلاف شکایات

1980ء کی دہائی کے شروع میں نہ صرف سول افسروں بلکہ ان فوجی افسروں کے خلاف بھی

کرپشن کی بہت سی شکایات موصول ہوئیں جو مارشل لا ڈیوٹیوں پر تعینات تھے۔ شکایات کنندگان ایف آئی اے سے رابطہ کرتے تھے کہ ملزمان پر چھاپہ مارا جائے اور تحقیقات کی جائے لیکن ہم فوجی افسروں کے خلاف سی ایم ایل اے یا متعلقہ ایم ایل اے کی اجازت کے بغیر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ سی ایم ایل اے ہیڈکوارٹرز میں شکایات سیل کا انچارج بذاتِ خود ایف آئی اے کی طرف سے انکوائری کرنے پر فراڈ اور کرپشن میں ملوث پایا گیا اور اسے سزا دے کر جیل بھیج دیا گیا۔ وہ ایسے لوگوں کو خوفزدہ کر کے پیسے بٹور لیتا تھا جن کے خلاف شکایات موصول ہوتیں یا ازخود فرضی شکایات کی آڑ لے کر کارروائی شروع کر دیتا۔ وہ اس مقصد کے لیے بیگم ضیا کا نام استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔

جنرل فضل رازق چیئرمین واپڈا کے خلاف جو جنرل فضل حق گورنر سرحد کے بھائی تھے، کرپشن کے الزام میں جعفر خان ڈپٹی ڈائریکٹر کو براہ راست ڈائریکٹر جنرل کی طرف سے تحقیقات کا حکم ملا۔ ابھی انکوائری شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ شکایت کنندہ قیوم عارف کو سمری فوجی عدالت نے ایک سال کی قید بامشقت سنا کر جیل بھیج دیا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے ایک جنرل پر رشوت ستانی کا الزام لگا کر فوج کو بدنام کیا ہے۔ شکایت کنندہ بھی آرام سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔ وہ جیل سے مختلف افراد کے نام معقول شہادتوں کے ساتھ خطوط لکھتا رہا۔ آخرِ کار چار مہینے بعد صدر مذکورہ جنرل کو برطرف اور قیوم عارف کو رہا کرنے پر مجبور ہو گئے۔ قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں کہ شاید جنرل کو سفیر بنا کر باہر بھیج دیا جائے گا مگر انکوائری راستے کی دیوار بن گئی اور انکوائری افسر راشی جنرل کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔

بہت سے بے گناہوں کے خلاف کیس چل رہے تھے جنہیں مارشل لا کی دہشت سے خوفزدہ کر کے رشوت دینے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ بہت سے لوگ اپنی قیمتی جائیدادوں سے جبری قبضہ کے باعث محروم ہو گئے۔ اسی طرح کے ایک معاملہ میں ایک باوردی فوجی افسر میرے ایک دوست کے زیرِ تعمیر مکان سے سیمنٹ اور سریا اٹھا کر لے گیا۔ میرے دوست انتہائی طیش کی حالت میں میرے پاس آئے اور فوجی افسر کی شکایت کی۔ میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

اب انہوں نے طمانچہ کھانے کے لیے دوسرا گال پیش کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ اس فوجی افسر کے پاس پہنچے اور پوچھا: ''کیا آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں؟'' اس نے بڑی ڈھٹائی سے مزید سریا فراہم کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ میرے دوست نے اسے سریا تو دے دیا البتہ یہ ضرور پوچھا کہ ''تم میرا تعمیرتی

سامان کیوں اُٹھا کر لے گئے تھے؟''

''کیونکہ مجھے اپنا زیرِ تعمیر مکان مکمل کرنا تھا۔'' فوجی افسر نے بڑی بے شرمی سے جواب دیا۔ اس کے بعد وہ اپنا ذاتی فلسفہ بگھارنے لگا۔ ''اس بدمعاش (جنرل ضیا) نے مجھے دوبارہ مارشل لا کی ڈیوٹی کرنے کا موقع نہیں دیا۔ میرے پاس پیسے ختم ہو گئے۔ تم ذلیل تاجروں کے پاس تو بے پناہ دولت ہے۔ اس سے تمہاری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے میں نے ایسا کیا۔ اب تم جو چاہے کرلو۔'' میرے دوست اس فوجی افسر کی صاف گوئی سے بڑے متاثر ہوئے اور دوسرا گال پیش کرتے ہوئے ریٹائرمنٹ کے بعد اسے اپنی فرم میں اچھی ملازمت دے دی۔ آجکل وہ بہت اچھے دوست ہیں۔

ڈی آئی جی خالد مسعود پر جو کچھ گزری وہ افسانہ سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ میرے پاس مشورہ لینے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مارشل لا ہیڈکوارٹرز پنجاب زون کا ایک بریگیڈیئر ان سے دو لاکھ روپے کا تقاضا کر رہا ہے تاکہ ان کے خلاف اس مقدمہ کو دبا دے جو اس وقت رجسٹرڈ کیا گیا تھا جب وہ ڈی آئی جی بہاولپور تھے۔ میں نے سوچا شاید وہ دل لگی کر رہے ہیں، لیکن وہ تو بالکل سنجیدہ تھے۔ ''وہ بریگیڈیئر تو شراب نوشی میں آپ کا ہم نوالہ ہم پیالہ ہوا کرتا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے، لیکن اب بدل گیا ہے۔ وہ بڑی سختی سے تقاضا کر رہا ہے اور تین بار مطالبہ کر چکا ہے۔ کہتا ہے کہ اسے اپنی بیٹی کی شادی کرنی ہے۔'' خالد نے جواب دیا۔

''وہ آپ کا دوست ہے۔ مطلوبہ رقم اُدھار دے دو تاکہ وہ اپنی بچی کی شادی کر سکے۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''لیکن میرے پاس پیسہ نہیں ہے۔ خدا کی قسم میرے پاس کوئی دولت نہیں اگرچہ وہ سمجھتا ہے کہ میں بہت دولت مند ہوں۔'' خالد نے اپنی پوزیشن واضح کی۔ پھر سازشی لہجہ میں کہنے لگے: ''آپ اس پر چھاپہ کیوں نہیں مارتے؟ آپ ایف آئی اے کے ڈائریکٹر ہیں۔''

''میں یہ سن کر لرز گیا، مگر وہ مصر رہے جیسے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ ''اتنے سینئر فوجی افسر کے خلاف چھاپہ مارنا احمقانہ جسارت ہوگی۔'' میں نے مشورہ دیا کہ کسی جنرل سے بات کریں۔ چند دن بعد سننے میں آیا کہ وہ ملک سے باہر چلے گئے ہیں، پھر مارشل لا اُٹھائے جانے کے بعد 1986ء میں واپس آئے اور آج کل سروس میں ہیں۔

''الذوالفقار'' شکنجے میں

الذوالفقار تنظیم بھٹو کے بیٹوں (مرتضٰی اور شاہنواز) نے بنائی تھی۔ 1980ء کی دہائی کے شروع میں اس کے دہشت گردوں نے اپنی کارروائیاں تیز کر دیں۔ جنرل ضیا کے طیارہ کو راولپنڈی میں میزائل مارنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ بعض فوجی تنصیبات کو بم دھماکوں یا براہ راست فائرنگ کا نشانہ بنایا گیا۔ بھٹو کے مخالف دو اہم سیاستدانوں چوہدری ظہور الٰہی اور محسن بھوپالی کو قتل کر دیا گیا۔

الذوالفقار کو افغانستان' روس اور انڈیا کے علاوہ لیبیا' شام' پی ایل او اور بعض دوسرے روس نواز ممالک سے مالی امداد مل رہی تھی۔ نوجوانوں میں بھٹو کے بہت سے شیدائی الذوالفقار میں بھرتی ہونے کے لیے دستیاب تھے۔ بہت سے بدمعاش جو قبائلی علاقہ میں روپوش تھے' شہرت پانے اور مالی امداد نیز اسلحہ حاصل کرنے کی غرض سے اس تنظیم میں شامل ہو گئے۔ بہت سے سرگرم رکن گرفتار کر لیے گئے اور جو لوگ الذوالفقار کے عناصر سے دور کا تعلق رکھتے تھے یا ان کے رشتہ دار تھے' ان سے سپیشل برانچ کے تفتیشی سیل شاہی قلعہ (لاہور) میں پوچھ گچھ کی گئی۔ مخلص اور جاں نثار قسم کے کارکن تفویض کردہ مشن کی تکمیل پر ڈٹے رہے لیکن جو لوگ حالات کی مجبوری سے تنظیم میں شامل ہوئے تھے وہ پولیس اور فوج کے سامنے سرنڈر کرنے' راز فاش کرنے اور اپنے زیرِ تربیت یا مشن پر مامور ساتھیوں کی بابت معلومات فراہم کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

الذوالفقار کے آپریشنز کو بڑی سختی کے ساتھ کچلا گیا۔ سرکاری ایجنسیاں بے گناہ افراد بلکہ فوج اور پولیس کے افسران کو بھی اس امر کا معمولی سا شک پڑنے پر کہ وہ حکومت کا تختہ الٹنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے' گرفتار کر لیتی تھیں۔ میاں ظہیر احمد' ڈی آئی جی بہاولپور کو اس بنا پر اٹک کے قلعہ میں بھیج دیا گیا کہ ان کا نام ایک ایسے شخص کی ڈائری میں لکھا ہوا پایا گیا جس پر ضیا حکومت کے خلاف سازش میں ملوث ہونے کا شک تھا۔ انہیں وہاں ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ تک قید رکھا گیا لیکن ان کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں ہو سکا۔ ان کے معزز والد میاں بشیر احمد جو آئی جی مغربی پاکستان کے منصب سے ریٹائرڈ ہوئے تھے اس صدمہ کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ ایک بار میں نے ایک بہت ہی سینئر جنرل سے پوچھا کہ ''آپ لوگ اس قدر دہشت پسند کیوں ہو گئے ہیں اور ایسے ذمہ دار سینئر افسروں کو کسی شہادت کے بغیر جیلوں میں ڈالنا کیوں شروع کر دیا ہے؟'' وہ بولے ''محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے' اگر تمہارا اشارہ ظہیر کی طرف ہے تو یہ مت بھول لیے کہ وہ پی پی پی کے سردار ابراہیم صدر آزاد کشمیر کا داماد ہے۔'' میں نے خدا کا شکر

ادا کیا کہ میرا کوئی رشتہ دار کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں تھا۔

میرے دوست ناصر شمسی کا بھتیجا زاہد شمسی مشرقِ وسطیٰ کے بعض ممالک بشمول شام میں واقع زیارات مقدسہ پر حاضری دینے گیا۔ اسے اس شک کی بنا پر شاہی قلعہ میں پھینک دیا گیا کہ ممکن ہے اس نے شام میں مرتضیٰ بھٹو یا الذوالفقار کے کسی کارکن کو کوئی پیغام پہنچایا ہو۔ وہ ایک کاروباری آدمی تھا اور کسی کے ساتھ سیاسی وابستگی نہیں رکھتا تھا۔ نہ ہی اس کے دل میں پی پی پی کے لیے کوئی نرم گوشہ تھا۔ بھٹو نے ناصر شمسی کو برطرف کر دیا تھا اور وہ ملک چھوڑ گئے تھے اس لیے پورا خاندان پی پی پی کا مخالف تھا۔ لیکن زاہد کا دمشق میں جانا اسے شاہی قلعہ میں اذیت کا نشانہ بنانے کے لیے معقول بہانہ بن گیا۔ اس کے باپ کو اس کی گلوخلاصی کرانے میں کئی مہینے لگ گئے۔ زاہد اس وقت سے نفسیاتی مریض بن چکا ہے۔

ملک محمد حیات کو جو 70 برس کے معمّر دیہاتی اور شریف آدمی تھے اپنے بھائی کے ساتھ الذوالفقار کی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے الزام میں دھر لیا گیا۔ وہ ان اوّلین ذیلداروں میں سے ایک تھے جنہوں نے 1940ء کے عشرہ میں قائداعظمؒ کی اپیل پر اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا تھا اور اس کے بعد کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ ان کی گرفتاری کا سن کر مجھے سخت صدمہ ہوا۔ میں نے ایک بہت ہی ذمہ دار افسر سے جو ایسے معاملات کے انچارج تھے' درخواست کی کہ وہ غیر جانبداری سے معاملہ کی چھان بین کریں۔ انہیں اس نتیجہ پر پہنچنے میں تین مہینے لگ گئے کہ ملک حیات کو ان کے دشمنوں نے اس چکر میں پھنسایا تھا۔ اس کے بعد انہیں رہا کرانے میں مزید تین مہینے لگ گئے۔

جب میں نے اس سینئر افسر سے پوچھا کہ

''ایک بے گناہ بوڑھے آدمی کو رہا کرنے میں اتنی دیر کیوں لگ گئی؟''

''کیونکہ معاملہ بہت ہی اہم تھا۔'' اس نے جواب دیا

''وہ بے بنیاد' ناقابلِ پیش رفت اور بظاہر اتنی بے ہودہ شکایت زیادہ اہم تھی یا بوڑھے معزز اور شریف آدمی کی رہائی؟'' میں نے قدرے خفگی سے جوابی حملہ کیا۔ وہ بڑے کٹھور اور سنگدل نکلے' اشتعال میں آ کر کہنے لگے:

''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ بہت اہم شکایت تھی۔ بوڑھے آدمی کو دفع کریں ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہمیں ہر قیمت پر جنرل کی اسلامی حکومت کا تحفظ کرنا ہے۔''

میں نے خاموشی اختیار کرنے میں عافیت سمجھی۔ وہ ان کے باوجود غضب ناک تھے ایک دفعہ پھر گویا ہوئے:

''اس بوڑھے سے کہہ دیں کہ انسان بن کر رہے ورنہ اسے ہمیشہ کے لیے غائب کر دیا جائے گا۔'' میں اُن کے الفاظ سن کر کانپ اٹھا بلکہ دہشت زدہ ہو گیا۔ میں نے اُن کی بدرجۂ غایت مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور اپنا سامنہ لے کر لوٹ آیا۔

اس کے تھوڑے عرصہ بعد قسمت کا کرنا کیا ہوا کہ مذکورہ بالا افسر پر کرپشن کے انتہائی سنگین الزامات لگائے گئے اور وفاقی حکومت نے اس کی تفتیش میرے حوالے کر دی۔ میں نے اسے اپنے دفتر میں بے غیرتی سے خوشامدیں کرتے پایا۔ میں نے آخر تک اس کے ساتھ مناسب اور انصاف کے مطابق سلوک کیا۔ اسے شاہی قلعہ تو کیا عام جیل میں بھی نہیں بھیجا گیا بلکہ گرفتار بھی نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود وہ ہر وقت روتا اور گریہ زاری کرتا رہتا تھا۔ وہ اس بارے میں بڑا پریشان تھا کہ اگر معاملہ منظرِ عام پر آ گیا تو اس کی جوان بیٹی کی شادی نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ تفتیش کو منظرِ عام پر نہیں آنے دیا گیا۔

میں نے اس کے ساتھ ہر طرح کی ممکنہ انسانی ہمدردی روا رکھی تاہم حقائق پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ اسے حکومت کی طرف سے وہی سزا دی گئی جس کا وہ پوری طرح سے مستحق تھا لیکن میں نے اس کے ذاتی وقار کو ٹھیس پہنچانے کی ہرگز کوشش نہیں کی۔ البتہ میں نے اس سے یہ ضرور پوچھا, آیا اس نے کبھی ملک حیات اور اس جیسے دوسرے لوگوں کے ذاتی وقار کے بارے میں سوچا تھا جب وہ اسی طرح کی صورتِ حال سے دوچار تھے؟ اس نے کہا کہ اس نے اپنی ذات کے سوا کبھی کسی کے متعلق نہیں سوچا۔

رانا شوکت محمود کالج کے دنوں میں میرے دوست تھے۔ میں نے پولیس کی ملازمت اختیار کر لی اور وہ سیاستدان بن گئے۔ آج کل پی پی پی کے لیڈر ہیں۔ انہیں اور ان کی بیگم کو (جو نفسیات میں ایم اے ہیں) مارشل لا کے تحت گرفتار کر کے شاہی قلعہ لایا گیا اور قیدِ تنہائی کی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ ان کی اکلوتی بچی کو اکٹھے والدین سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے مختلف دنوں میں لایا جاتا اور ماں' باپ سے الگ الگ ملوایا جاتا تھا۔ رانا شوکت قلعہ میں نظر بند تھے جب ان کی حقیقی والدہ فوت ہو گئیں (ان کے والد کی دو بیویاں تھیں) تو انہیں تین دن کے لیے گھر جانے کی اجازت دی گئی تا کہ تعزیت کے لیے آنے والوں سے مل سکیں۔ میں تعزیت کرنے ان کے گھر گیا تو جہانگیر بدر اور ناظم شاہ (لاہور سے پی پی پی کے لیڈر) بھی موجود تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر پریشانی کا اظہار کرنے لگے۔ مبادا میرا وہاں آنا حکومت کی ناراضی کا

سبب بن جائے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں ذاتی حیثیت میں اپنے دوست سے تعزیت کرنے آیا ہوں۔ بہرحال آمرانہ حکومتیں معاشرتی وقار کی کٹر دشمن ہوتی ہیں۔ میرا رانا شوکت کے ہاں جانا میرے افسروں کے نزدیک ناعاقبت اندیشانہ اقدام قرار پایا اور اسے سیاسی سرگرمی سے تعبیر کیا گیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

ججوں کے ساتھ ناانصافی

سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے متعدد ججوں کو حکومت کی حمایت نہ کرنے پر گھر بھیج دیا گیا۔ ان میں بھٹو کو سزائے موت دینے والے لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس شیخ انوار الحق بھی شامل تھے جنہوں نے اپیل میں سزائے موت کی توثیق کی تھی۔ جسٹس صمدانی کو تو بہرطور جانا تھا کیونکہ انہوں نے بھٹو کی ضمانت منظور کر لی تھی۔ جب ان ججوں کو برطرف کیا گیا تو میرے ایک قریبی دوست نے جنرل ضیا کو یہ کہتے سنا کہ ”وہ ہم سے تنخواہیں بھی لیتے ہیں اور ہمارے خلاف فیصلے بھی دیتے ہیں۔ میں انہیں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ عمر بھر یاد رکھیں گے۔“

عبوری آئین کے حکم (پی سی او) کے تحت اعلیٰ عدالتوں کے تمام ججوں سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے منصب کا ازسرِنو حلف اُٹھائیں۔ اس موقع پر ناپسندیدہ ججوں کو حلف برداری کے لیے بلایا ہی نہیں گیا۔ پی سی او کے کامیاب آپریشن کے بعد اعلیٰ عدالتیں انسانی حقوق سے متعلق مقدمات میں دادرسی فراہم کرنے سے گریز کرنے لگیں۔ اس سے لوگوں کی محرومی و مایوسی میں اضافہ ہوا اور ایسے حلقوں میں بھی حکومت سے نفرت کا اظہار کیا جانے لگا جو پی پی کے حامی نہیں تھے۔

ٹھیک کام کرنے پر سزا

قاضی محمد اعظم نے اوائل 1984ء میں اسلم حیات کی جگہ ایف آئی اے کے ڈائریکٹر جنرل کا منصب سنبھالا۔ جنرل ضیا میاں اسلم حیات سے اس بات پر ناراض ہو گئے تھے کہ انہوں نے جنرل کی سفارش پر ایک انسپکٹر کو جو بہت جونیئر تھا اس کی باری سے پہلے ترقی دینے سے معذرت کر لی تھی۔ ضیا کے ایک پیر نے اسے پروموشن دینے کی سفارش کی تھی۔ جنرل ضیا نے اتنی سی بات پر ایک ادارہ کے سربراہ کو ہٹانے سے گریز نہیں کیا۔ قاضی اعظم نے آتے ہی اس بااثر انسپکٹر کو پروموٹ کر دیا۔

ایک دن قاضی اعظم نے مجھے انسپکٹر محمد شریف کے خلاف اسمگلروں کے ساتھ ساز باز کرنے کے جرم میں محکمانہ کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ میں نے پوری طرح چھان بین کی لیکن کچھ بھی نہیں ملا۔ اس لیے میں نے اسے چھوٹی موٹی سزا دینے کی سفارش کی۔ قاضی اس پر سخت برہم ہوئے اور مجھ سے کہا کہ اس کی برطرفی کی سفارش کروں کیونکہ وہ صدر کو یہی بات کہہ چکے تھے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ صدر مملکت انسپکٹر جیسے ادنیٰ افسر کے معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں۔ بہر حال میں نے معاملہ کی دوبارہ چھان بین کی لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ ناچار اپنی سابقہ رپورٹ دوبارہ لکھ کر پیش کر دی۔ ڈی جی اسے پڑھ کر طیش میں آ گئے اور کہنے لگے:

''تمہیں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔''

''کیوں جناب؟ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ درست کام کرنے پر مجھے سزا کیوں ملے گی؟'' میں نے بڑی نرمی سے عرض کیا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں صدر سے بات کر چکا ہوں۔ تم نے بدترین قسم کی حکم عدولی کا مظاہرہ کیا ہے تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''

انہوں نے فرعونیت بھرے لہجہ میں اپنی بات دہرائی اور مجھے اسی دن فیڈرل سیکورٹی سیل (راولپنڈی) میں بھجوا دیا گیا۔

میرے لیے وہ پوسٹنگ بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی کیونکہ میرے بچے لاہور میں زیرِ تعلیم تھے۔ بہر حال اگر کوئی شخص انصاف پسند اور سچا بننے کی کوشش کرتا ہے تو اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ میں نے اپنے حاکمِ بالا کی بلیک میلنگ اور دباؤ کے آگے سر نہیں جھکایا کیونکہ وہ میری سرشت کے خلاف تھا۔ بہت سے برسرِ اقتدار افراد خواہ صدر ہوں یا پٹواری' اپنی اتھارٹی کو اللہ کی طرف سے دی گئی امانت اور ذمہ داری کے طور پر استعمال نہیں کرتے بلکہ ان لوگوں کو بھیانک طریقے سے بلیک میل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جن کی حفاظت کا ذمہ انہیں سونپا جاتا ہے۔ آپ سیدھے راستے پر چلنے کے نتائج ہمیشہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ آزمائش کی گھڑی میں وہ ہمیشہ آپ کی حفاظت کرے گا۔ جیسا کہ بعدازاں میرے معاملہ میں ہوا۔ اللہ نے اس ٹرانسفر کی بدولت میرے لیے یکسر مختلف اور عظیم الشان کام میرے مقدر میں لکھ دیا تھا۔ مجھے ایسی پوزیشن پر تعینات کیا گیا جہاں میں نے ملک کو دوبارہ جمہوریت کی پٹڑی پر ڈالنے اور مایوسی' تفرقہ بازی' ڈیپریشن' فریب کاری اور خطرناک قسم کی بدنظمی کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔



باب20

ضیاءالحق اور انتخابات

وفاقی سیکورٹی سیل میں ملک کی اندرونی اور بیرونی صورتِ حال کے متعلق جملہ وفاقی اور صوبائی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طرف سے موصول شدہ رپورٹوں کا مطالعہ و تجزیہ کیا جاتا تھا۔ سیل والے صدر، وزیرِ داخلہ، صوبائی گورنروں اور بعض سینئر حکام کے لیے روزمرہ کی صورت حال کا ایک خلاصہ تیار کرتے تھے۔ سیاسی اور سلامتی کے امور کی بابت ایک 14 روزہ جائزہ کی تیاری بھی ہمارے فرائض میں شامل تھی۔ سیل کے ڈائریکٹر جنرل بریگیڈیئر ظفر اقبال بڑے شفیق، شائستہ اور غور و فکر کے عادی انسان تھے۔ وہ انسانی معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ میں نے اوائل 1989ء میں بحیثیت ڈائریکٹر مذکورہ سیل میں کام شروع کیا۔

میں نے مختلف رپورٹوں کا مطالعہ کیا تو مجھے ملک کی صورت حال اس سے کہیں زیادہ خراب لگی، جیسا کہ میرا قیاس تھا۔ ملک میں نافذ سنسر شپ اور مغربی میڈیا کی افغان وار سے گہری وابستگی نے جنرل ضیا کے کردار کے متعلق بہت سے واقعات کو منظرِ عام پر نہیں آنے دیا۔ سندھ نفرت سے ابل رہا تھا۔ بلوچستان

اور سرحد انتہائی جدید اور مہلک ہتھیاروں کی کھلی منڈیاں بن گئے تھے۔ تشدّد کی وارداتیں اکثر رونما ہوتی رہتی تھیں' جس سے ملک فرقہ وارانہ دہشت گردی کے علاوہ الذوالفقار اور افغانستان و بھارت کے ایجنٹوں کی گرفت میں آ گیا تھا۔ سندھ میں ڈاکو قوم پرستانہ جوش و جذبے اور قابلِ نفرت نظام سے انتقام لینے پر تلے ہوئے تھے۔ میں نے تین سال سے زیادہ عرصے کی رپورٹوں کا جائزہ لیا تو سندھ کے علاوہ جوان دنوں ایک فراموش کردہ معاملہ کی حیثیت رکھتا تھا' درج ذیل چار امور کو خصوصی توجہ کا مستحق پایا:

1- ناجائز اسلحہ

میں نے ایک تحقیقی مقالہ تیار کیا جس میں ان جدید ہتھیاروں کی بھاری مقدار کا ذکر کیا گیا جو جنگ افغانستان کی بجائے پاکستان کے چاروں صوبوں کی مجرم دنیا میں پھیلائے جا رہے تھے۔

میں نے اپنے مقالہ میں لکھا کہ جہاد کے لیے آنے والے چھوٹے ہتھیاروں کی 80 فیصد مقدار تیزی سے فروغ پانے والی بلیک مارکیٹ میں فروخت کے لیے پہنچائی جا رہی ہے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بہت سے مقامات ایسے تھے جہاں مذکورہ ہتھیاروں کی نیلامی کے باقاعدہ جمعہ بازار لگتے تھے۔ میں نے ان ہتھیاروں کے بڑے بڑے تاجروں' راستوں' منڈیوں اور اس کاروبار کے طریقوں کی فہرست مرتب کی۔ میں نے اس رپورٹ میں یہ تفصیلات درج کیں کہ دور دراز کے دیہات سے تعلق رکھنے والے مجرم پیشہ افراد صورتِ حال سے کس طرح ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ایک صدی سے زیادہ عرصہ سے نافذ اسلحہ لائسنس کے نظام کو نظر انداز کر کے خود کو دھڑا دھڑ مسلّح کر رہے ہیں۔ اسلحہ کی یہ مذموم تجارت انتہائی خطرناک اور زود اثر منشیات کے روز افزوں کاروبار کے ساتھ کی جا رہی تھی۔ منشیات اور ہتھیاروں کی تجارت کے معاشرتی مضمرات نقشوں کے ذریعے اور منطقی طریقے سے تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے تھے۔ آخر میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ انسدادی اقدامات فوراً بروئے کار لائے جائیں۔

صدر نے میری رپورٹ پڑھنے کے بعد پشاور میں گورنروں کی کانفرنس بلائی۔ پنجاب کے آئی جی پولیس لئیق احمد خان نے مجھ سے کہا:

''تمہارے مقالے سے مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی ہے۔ میں اس سے خون بہتے اور تشدد جنم لیتے دیکھ رہا ہوں۔ حالات واقعی خراب ہونے والے ہیں۔''

میں نے جواب میں کہا۔

''آپ کو اور آپ کی پولیس کو معاملات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ایک عشرہ کے بعد ہر طرف بحران ہی بحران ہوگا۔''

انہوں نے میری رائے سے مکمل اتفاق کیا۔ نتائج اس سے بھی بدتر نکلے اور وہ میں تھا جسے پانچ سال بعد بحیثیت آئی جی پنجاب بدترین حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک اور طرح کی صورتِ حال وہ تھی جس سے کانفرنس میں بیچارے بریگیڈیئر ظفر اقبال کو سابقہ پڑا۔ میرے مقالے پر زبردست تنقید کی گئی اور جنرل اختر عبدالرحمٰن ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی نے اسے ''انتہائی سنسنی خیز اور دہشت زدہ کرنے والا'' نیز ''قوتِ متخیلہ کی پیداوار'' قرار دیا۔

ہمارے دفتر واپس پہنچنے پر ظفر اقبال نے آئی ایس آئی کے انتہائی بااثر جنرل کی خفگی و برہمی کے حوالہ سے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ شاید انہیں نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ میں نے تسلی دی کہ فکر نہ کریں، ادھر سے ایسے ہی شدید ردِ عمل کی توقع تھی۔ میں نے بریگیڈیئر کے سامنے آئی ایس آئی کا وہ سارا مواد رکھ دیا جس کی مدد سے میں نے اپنا مقالہ مرتب کیا تھا اور انہیں بتایا کہ ہماری طرف سے ایک لفظ کا اضافہ بھی نہیں کیا گیا۔ میں نے کہا کہ ''تمام حقائق اور اعداد و شمار ان کی اپنی رپورٹوں سے نقل کیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم نے ایک ''کوما'' اور ''فل سٹاپ'' بھی تبدیل نہیں کیا۔ وہ میری اس وضاحت سے قدرے مطمئن نظر آئے اور سارا مواد اٹھا کر جنرل اختر کے پاس لے گئے۔ وہ یقیناً یہ بات بھول گئے ہوں گے کہ گزشتہ تین برسوں کے دوران ان کی ایجنسی کیا رپورٹ کرتی رہی ہے۔

جنرل اختر ہمارے مؤقف کو تو نہیں جھٹلا سکے البتہ ہمیں ایسی ''بے مقصد تحقیق'' سے روک دیا جس نے ہر طرف دہشت پھیلا دی تھی۔ یہ چیز ان کے مفاد میں تو تھی لیکن مؤثر اور فوری کارروائی نہ کرنے کے باعث قوم کو تشدد کے واقعات اور منشیات کے فروغ کی صورت میں طویل عرصہ تک سنگین نتائج بھگتنے پڑے بلکہ اب تک بھگت رہی ہے۔

2- فرقہ وارانہ نفرت اور کشیدگی

افغانستان کی جنگ اور ایران عراق لڑائی کے پس منظر میں گھناؤنی فرقہ وارانہ منافرت و مناقشت نے جنم لیا۔ میں نے اپنے پرانے مقالہ کو تازہ ترین حقائق اور اعداد و شمار کے ساتھ از سرِ نو مرتب کیا۔ میں نے متعلقہ مذہبی رہنماؤں کے درمیان قومی سطح پر اتفاقِ رائے پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور انتہا پسندی کی مذمت کرتے ہوئے ایسی تقاریر اور لٹریچر پر پابندی لگانے کی سفارش کی جو مختلف فرقوں کے مابین نفرت و تصادم کا سبب بنتا ہے۔ میں نے یہ سفارش بھی کی کہ مختلف فرقوں کے قائدین کو اعتماد میں لے کر بتایا جائے کہ دشمن اس فرقہ وارانہ منافرت کو ہمارے ملکی استحکام کو کمزور کرنے کے لیے کس طرح استعمال کر رہے ہیں۔ یہ کہ روس انڈیا اور افغانستان مختلف ذرائع سے شیعوں اور سنّیوں کو بھاری مقدار میں ہتھیار فراہم کر رہے ہیں۔

اس مقالے کا بھی کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا' محض معمول کی چند ہدایات جاری کردی گئیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ ''شر پسندوں کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں۔'' مذہبی رہنماؤں کو اعتماد میں لینے کی تجویز اس بنا پر رد کردی گئی کہ غیر ملکی مداخلت کو اس سطح پر زیرِ بحث نہیں لایا جاسکتا۔ میں نے رائے ظاہر کی کہ متعلقہ رہنماؤں کو اعتماد میں لینا اور دشمن کی چالوں اور ہتھکنڈوں کے بارے میں بریف کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اس طرح قومی سطح پر اتفاق رائے پیدا کیا جاسکے گا۔ لیکن وہ بات سخت ذہنیت رکھنے والے ایڈمنسٹریٹروں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ میری اس تجویز کو سیاسی قرار دے کر مسترد کردیا گیا۔

جب میں نے مذکورہ تجویز پر زمانہ طالب علمی کے ایک دوست منظور بھٹی سے تبادلہ خیال کیا تو وہ کہنے لگے: ''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ اتفاقِ رائے کا فقدان حاکمِ وقت (جنرل ضیا) کو سوٹ نہیں کرتا؟ 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' بڑا پرانا مقولہ ہے۔''

''ممکن ہے یہ درست ہوتا ہم اندرون ملک سنگین بدنظمی وافراتفری کسی بھی حکومت یا معاشرہ کے لیے فائدہ مند نہیں ہوسکتی۔ ان کا منشور 'متحد کرو اور خدمت کرو' ہونا چاہیے۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ افسوسناک حد تک غلط فہمی کا شکار ہیں۔ تفریق انتشار اور تقسیم غیر سیاسی قوتوں کو بڑا سوٹ کرتی ہے۔ اگر ملک میں مکمل امن وامان ہو تو ان کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔'' انہوں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں وضاحت کی اور مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ ان کی بات میں واقعی بڑا وزن ہے۔

3- دہشت گردی

دہشت گردی عام جرائم سے مختلف چیز ہے اور اس کے محرکات ہمیشہ سیاسی یا گروہی ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کے ساتھ مختلف طریقے سے نمٹنا چاہیے۔ الذوالفقار تنظیم (جو بھٹو کے بیٹوں نے بنائی تھی) اور خاد (روس کی پشت پناہی سے چلنے والی افغانستان کی انٹیلی جنس ایجنسی) اور اس کی ہم پلّہ بھارت کی ایجنسی ''را'' کی سرگرمیوں اور آپریشنز کے درمیان تمیز کرنے کی ضرورت تھی۔ الذوالفقار ملک کے اندرونی مسائل کے حوالے سے ایک سیاسی محرّک رکھتی تھی جبکہ ''خاد'' اور ''را'' دشمنوں کی حیثیت سے۔ بلاشبہ الذوالفقار کو پاکستان کے خلاف روسی انٹیلی جنس کی سرپرستی و پشت پناہی حاصل تھی، تاہم اسے اس کے سرپرستوں سے الگ تھلگ کرنے کی تدابیر بروئے کار لانا عین قومی مفاد کے مطابق تھا۔ الذوالفقار، خاد اور را کا اتحاد و اشتراک ہمارے لئے خطرناک تھا جسے ختم کرنے کے لیے سنجیدہ اور سرتوڑ کوششوں کی ضرورت تھی۔

میری تجویز ان کے کانوں کے اوپر سے گزر گئی۔ ان کے نزدیک اس کا واحد علاج طاقت کا استعمال تھا۔ دونوں طرف سے اسی پر زور دیا گیا حالانکہ حکومت کو نسبتاً زیادہ ضبط وتحمّل کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ لوگ الذوالفقار کی دہشت پسندانہ سرگرمیوں اور مارشل لا کی سختیوں کے درمیان سینڈوچ بن کے رہ گئے تھے۔

معاملہ وہاں تک پہنچ گیا جہاں سے واپسی ممکن نہیں تھی اور اس سے صرف وسیع النظری سے کام لے کر نمٹا جا سکتا تھا۔ تمام متعلقہ افراد ماضی اور حال میں رونما ہونے والے حالات کے قیدی بن کے رہ گئے تھے۔ ایک نئے سیاسی نظام کی ضرورت تھی، جبکہ ضیا کی نامزد کردہ مجلسِ شوریٰ یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتی تھی۔

4- ڈاکوؤں کا خطرہ

سندھ کے دیہی علاقوں میں ڈکیتی نے عام جرائم سے زیادہ سنگین صورت اختیار کر لی تھی۔ اسے مایوس و دل گرفتہ سندھیوں کی خاموش اشیرباد حاصل ہوگئی تھی۔ ایم آر ڈی کی احتجاجی تحریک کے دوران بعض جیلیں توڑی گئیں اور وحشیانہ جرائم کو تقدس کا درجہ دے دیا گیا تھا جس کی آڑ میں مجرموں کے ہاتھ یہ بہانہ آ گیا کہ وہ اپنے پسے ہوئے سندھی بھائیوں کے حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں۔ میں نے ایک رپورٹ مرتب کی جس میں صورتحال کا پس منظر بیان کرنے کے بعد فوری اور مؤثر اقدامات کرنے کی ضرورت پر

زور دیا گیا اور کہا گیا تھا اگر مجرمانہ سرگرمیوں کی بروقت روک تھام نہ کی گئی تو ان پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ مہلک ہتھیاروں کی آسانی سے دستیابی اور معاشرہ کی طرف سے خاموش حمایت کے پیش نظر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ لعنت رستے ہوئے ناسور کی طرح پھیل جائے گی۔ ان لوگوں کے لیے بھی صورت حال سے بچ نکلنا محال ہو جائے گا جو اس وقت مجرموں کی خاموش اور خفیہ طور پر مدد کر رہے ہیں۔ آخر میں خود سرپرستی کرنے والے ان کا نشانہ بنیں گے۔

میں نے تجویز پیش کی کہ اس سے پہلے کہ وہ جمالو کی طرح عوام کے ہیرو بن جائیں مجرموں کو لوگوں کی خاموش حمایت سے محروم کرنے کے لیے نہ صرف ڈاکوؤں کے خلاف سخت آپریشن کیے جائیں بلکہ معاشرتی و سیاسی اقدامات بھی بروئے کار لائے جائیں۔ (یاد رہے کہ جمالو سندھ کا ایک مشہور ڈاکو تھا جس کی تعریف میں آج بھی نغمے گائے جاتے ہیں) جب امن عامہ تباہ ہو جائے، جس کے اسباب عموماً سیاسی اور معاشرتی ہوتے ہیں تو اسے بحال کرنے کے لیے غیر معمولی کوششیں درکار ہوتی ہیں۔ سب سے زیادہ جسمانی قوت رکھنے والا فرد ہیرو بن جاتا ہے اور دوسروں پر غلبہ پا لیتا ہے۔ لوگ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے اصول کو سچ سمجھنے لگتے ہیں۔ سندھی ڈاکو نے بندوق کی طاقت کے بل پر مسلح اور باوردی پنجابی سپاہیوں کے مقابلے میں مقامی ہیرو کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ سندھیوں کی نظر میں عام طور سے دونوں کسی اخلاقی بنیاد سے محروم تھے اس لیے وہ اپنے آدمی کی طرف داری کیوں نہ کرتے؟ غصہ کی حالت میں انسان نتائج کی پرواہ نہیں کرتا۔ میں نے صورتحال کی جملہ پیچیدگیوں اور نزاکتوں کی نشاندہی کی لیکن اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ ایک بار پھر ''ڈاکوؤں کے خلاف سخت اقدامات'' کے لیے عمومی انداز میں ہدایات جاری کر دی گئیں اور بس۔

پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد میں مصالحت

میرے دوست اے حمید کی قیاس آرائی جس کا اظہار انہوں نے 1977ء میں کیا تھا 1981ء کی پہلی سہ ماہی میں اس وقت درست ثابت ہوگئی جب پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد میں شامل جماعتوں نے محسوس کر لیا کہ انہیں جنرل ضیا سے نمٹنے کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنی ہوگی۔ انہوں نے متعدد اجلاسوں کے بعد جن میں بیگم نصرت بھٹو، مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان، مولانا شاہ احمد نورانی، سردار عبدالقیوم، ولی خان، اصغر خان اور دیگر سرکردہ لیڈروں نے شرکت کی۔ ''تحریکِ بحالی جمہوریت'' یا ایم آر ڈی کے نام سے ایک

تنظیم بنائی۔ صرف جماعت اسلامی اور پیر پگارو نے اس تحریک میں شمولیت اختیار نہ کی کیونکہ وہ ان دنوں جنرل ضیا کے انتہائی قریب تھے۔

میں نے اس تنظیم کے قیام کی بابت نوابزادہ نصراللہ خان کے ساتھ چوہدری ارشد کی رہائش گاہ پر تبادلۂ خیال کیا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ پی پی ایک قومی جماعت ہے اور جنرل ضیا نے اسے دھکیل کر دیوار سے لگا دیا ہے۔ جس سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ پیپلز پارٹی علاقائی جماعت کا روپ نہ دھار لے چنانچہ ایم آر ڈی کی قومی سیاسی فورم کے طور پر تشکیل کی گئی ہے تاکہ جمہوریت کی بحالی کے لیے مشترکہ جدوجہد کی جا سکے۔

لوگوں کو 1983ء کے آخر تک مارشل لا سے چھٹکارا ملنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ وہ بدترین قسم کے ظلم و جبر اور کرپشن کے تحت سسک رہے تھے۔ افغانستان کی خونین جنگ نے ملک کے لیے بہت سے خطرات پیدا کر دیئے تھے۔ ان میں سے بدترین خطرہ دہشت گردی تھی جسے بھارت اور روس مل کر پروان چڑھا رہے تھے۔ منشیات اور ہتھیاروں کی فراہمی نیز سمگلنگ بااثر مافیا کے کنٹرول میں تھی۔ دہشت گرد بم دھماکے کر رہے تھے' بینکوں میں ڈاکے ڈال رہے تھے' کاروں میں بم پھٹ رہے تھے' قتل کی وارداتیں عام ہو رہی تھیں اور فوجی و دیگر اہم تنصیبات پر حملے ہو رہے تھے۔ چھوٹے بڑے تمام قابل ذکر سیاستدانوں کو ان کے اپنے صوبوں کے اندر گھروں میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ انہیں ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں جانے کے لیے بھی اجازت نامہ (Visa) حاصل کرنا پڑتا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو جو کینسر کا علاج کرانے بیرون ملک گئی تھیں' پیرس میں بیٹھ کر ضیا کے خلاف مزاحمتی تحریک منظم کرنے میں مصروف ہو گئیں جبکہ بے نظیر بھٹو نے جو کان کا علاج کرانے کی غرض سے لندن میں مقیم تھیں' وہیں سے جدوجہد شروع کر دی۔ دوسرے صوبوں میں آباد پنجابیوں پر حملے ہو رہے تھے اور وہ جان کے خوف سے اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ بیوروکریٹس کو خوفزدہ کر کے مکمل طور پر غلام بنا لیا گیا تھا۔ انصاف بڑی مہنگی قیمت پر بک رہا تھا اور ایذا رسانی انتہا پر تھی یہاں تک کہ فوج اور پولیس کے افسروں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا تھا۔ فرقہ وارانہ تنظیمیں خوب پھل پھول رہی تھیں اور مبینہ طور پر ایران' عراق' سعودی عرب اور دیگر ممالک کی طرف سے ان کی زیرِ حمایت جماعتوں کو بھاری امداد مل رہی تھی۔ جھنگ' پاراچنار اور بعض دوسرے مقامات پر شیعہ اور سنی دونوں کو روس کی طرف سے ہتھیار اور سرمایہ فراہم کیا جا رہا تھا۔

جنرل ضیا روس کی ننگی جارحیت کے خلاف اعلانِ جہاد کرکے اسلام کے علمبردار بن گئے تھے۔ یہ چیز ملک میں مذہبی منافرت کے باوجود رجعت پسند مذہبی طبقوں کو بہت اپیل کرتی تھی۔ پورا معاشرہ کسی اہم فیصلے کے انتظار میں تھا۔

ایم آر ڈی کی تحریک کا آغاز

اندرون ملک جبر وستم اس قدر شدید اور ناقابلِ برداشت ہوگیا کہ ضیا کی مخالف سیاسی قوتوں نے اس سے نجات پانے کے لیے جدوجہد تیز کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ 1983ء میں ایم آر ڈی نے اپنی ملک گیر تحریک شروع کردی۔ دیہی سندھ کی طرف سے فوجی حکومت کے خلاف سب سے زیادہ اور وسیع پیمانہ پر نفرت اور غم وغصے کا اظہار کیا گیا۔ جبکہ بڑے شہروں میں آباد اُردو بولنے والے سندھی (مہاجر) لاتعلق رہے کیونکہ ان کی پارٹی (ایم کیو ایم) کو بعض سرکاری ایجنسیوں نے تحریک میں شمولیت سے روک دیا تھا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی' رانی پور کے پیر' ہالہ کے مخدوم اور دیگر بہت سے سندھی سیاستدان تحریک کے ہراول دستہ میں شامل ہوگئے۔ تاہم وہ تحریک دوسرے صوبوں خصوصاً پنجاب میں زور نہیں پکڑسکی اور آخرِ کار کچل دی گئی۔ اس طرح اس نے قومی کی بجائے سندھی تحریک کا روپ دھار لیا اور سندھ کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

فوج نے سیاسی جلسوں اور جلوسوں کو کچلنے میں بڑی مستعدی سے کام لیا۔ بہت سے اجلاسوں میں' جن میں مجھے شرکت کا موقع ملا، کئی اعلیٰ سول اور فوجی حکام کو تحریک کو مؤثر انداز میں کچلنے پر مسرت کا اظہار کرتے پایا گیا۔ انہیں نتائج کی قطعاً پرواہ نہیں تھی حالانکہ سندھ سے بڑی تشویشناک اور مایوس کن خبریں آرہی تھیں۔ میں اپنے طور پر بے حد پریشان تھا۔

سندھ میں فوج اور پنجاب کے خلاف نفرت اور اشتعال زوروں پر تھا۔ روزمرہ کی رپورٹیں بڑی خوفناک تھیں' ایم آر ڈی کی تحریک کچل دی گئی' تاہم سخت جان علیحدگی پسند گروپ ابھی تک سرگرمِ عمل تھے۔ اس تحریک کو کچلنے میں جو جانی نقصان ہوا اور تباہی پھیلی اس سے پیدا ہونے والی تلخی سے جئے سندھ اور سپاف (SPAF) جیسے انتہا پسند گروپوں نے ''را'' کی مدد سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ طلبا غیظ وغضب میں اندھے ہوگئے اور جابجا جئے سندھ کے جھنڈے لہرانے لگے جبکہ سرکاری دفاتر پر قومی پرچم لہرانا محال ہوگیا۔

میں صورتِ حال کے متعلق روزمرہ کی رپورٹوں کا مطالعہ کرتے وقت پریشان و افسردہ ہو جاتا

تھا۔ مجھے اکثر مشرقی پاکستان کے 1971ء والے حالات یاد آنے لگتے۔ حمود الرحمٰن کمیشن میں بیان دینے کے بعد این اے رضوی کی جو حالت ہوئی تھی وہ میری نگاہوں میں گھومنے لگتی۔ مجھے وہ باتیں بھی یاد آنے لگتیں جو مہر انور علی نے 1977ء میں کہی تھیں۔ بعض اوقات میں اس قدر پریشان ہو جاتا کہ کئی راتیں بے خواب گزر جاتیں۔ بریگیڈیئر ظفر اقبال اور میں صورتِ حال پر گھنٹوں بحث کرتے۔ آخر کار ہم نے تہیہ کر لیا کہ حالات کی بہتری کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔

مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا گیا

بریگیڈیئر ظفر سندھ کے طویل دورہ پر گئے اور وہاں کے حالات کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ انہوں نے معاشرہ کے تمام طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں بشمول سول و فوجی ایڈمنسٹریٹرز سے ملاقات کی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ حد سے بڑھی ہوئی نفرت کے باعث بحالی جمہوریت کی تحریک انتہا پسندوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔ انہوں نے ایک تفصیلی رپورٹ میں سندھ کے بڑھتے ہوئے احساس محرومی پر روشنی ڈالی۔ لوگوں کے لیے روزگار اور معاشرتی و اقتصادی ترقی کے مزید مواقع پیدا کرنے کی تجویز پیش کی اور آخر میں کہا کہ مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ سیاسی سرگرمیاں بحال کر دی جائیں' اس طرح ان کا احساسِ محرومی دور ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ جو بھی قدم اٹھایا جائے گا' محض نمائشی ہو گا۔

بریگیڈیئر ظفر اقبال کی رپورٹ نے جنرل ضیا کو یہ احساس دلایا کہ نامزد کردہ مجلسِ شوریٰ ان کی زیادہ مدد نہیں کر سکے گی۔ جنرل نے سوچا کہ کوئی دیرپا حل تلاش کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ یہ ایک اچھا نقطۂ آغاز تھا' تاہم قدم آگے بڑھانے میں ایک بڑی رکاوٹ حائل تھی۔ سندھ کو انتہا پسندوں سے بچانا ضروری تھا' لیکن واحد متبادل صورت یہ تھی کہ وہاں پیپلز پارٹی کو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا جاتا۔ جبکہ جنرل کے نزدیک وہ ایک ملعون و مردود پارٹی تھی' یہ حقیقی مخمصہ تھا جس سے نکلنا ناگزیر ہو گیا۔ بریگیڈیئر ظفر اقبال نے دانشوروں کی طرح کاغذات پر نظریں جما کر اس نیک مقصد کے لیے زبردست محنت کی۔ میں بھی تن من دھن سے ان کی کوششوں میں شامل ہو گیا۔ ہم صدر کو بھیجی جانے والی ہر سمری میں سیاسی میدان میں پہل کرنے کی ضرورت پر زور دینے لگے اور آہستہ آہستہ طوفان کا رخ موڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ سفر خواہ کس قدر طویل کیوں نہ ہو' اس کا آغاز پہلا قدم اٹھانے سے ہی ہوتا ہے۔ جنرل کو بند گلی سے باہر نکلنے کا راستہ دکھا دیا گیا اور انہوں نے اعتدال پسند سندھیوں کی مدد سے دیرپا سیاسی حل کے بارے میں واقعی سوچنا

شروع کر دیا۔

بینظیر نے بھی دستِ تعاون بڑھایا۔ اوائل 1984ء میں جب علیحدگی پسند تو تیں آپے سے باہر ہو رہی تھیں۔ پی ایس ایف کے ایک طالب علم رہنما نے کالج کے طلبا تک بینظیر کا یہ پیغام پہنچایا کہ انہیں پاکستان کے خلاف بات نہیں کرنی چاہیے۔ ان کی جدوجہد مارشل لا کے خلاف ہونی چاہیے خود ملک کے خلاف نہیں ۔ یہ خالصتاً سندھی علاقہ سے کئی مہینے بعد جس کے دوران انتہا پسند بلا روک ٹوک طوفان اٹھاتے رہے' پاکستان کے حق میں بلند ہونے والی پہلی آواز تھی۔ جو طالب علم بینظیر کا پیغام لے کر آیا وہ سومرو تھا۔ افسوس ہے کہ مجھے اس عظیم محب وطن کا پورا نام یاد نہیں رہا۔ اس کا مذاق اُڑایا گیا اور آوازے کسے گئے' لیکن وہ سندھ کے ہر کالج میں پہنچا اور طلبا کو بے نظیر کا پیغام پہنچایا۔

درمیانی راستہ

میں نے روزانہ کی سمری میں اس صحت مند اور مثبت پیش رفت کو صدر کی توجہ کے لیے نمایاں کر کے پیش کیا' ساتھ ہی یہ تجویز بھی پیش کر دی کہ انتہا پسندوں کے منظرِ عام پر چھا جانے سے پہلے اعتدال پسند عناصر کی حوصلہ افزائی کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا لازمی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ صدر نے اس حصہ کو اپنے قلم سے خط کشیدہ کر دیا تھا۔ مجھے سرنگ کے آخری سرے پر روشنی کی کرن نظر آئی۔ سومرو اور پی ایس ایف کے دوسرے لیڈروں نے پاکستان کی حمایت میں سندھ بھر میں تحریک چلائی۔ بعض دوسرے طلبا بھی ان کے ساتھ آملے' اگرچہ ان کے اور مخالفین پاکستان کے مابین کئی بار زور کا رن پڑا۔ افسوس ہے کہ کچھ عرصہ بعد سومرو کو انتہا پسندوں نے قتل کر دیا' تاہم ہوا کا رخ کافی حد تک مڑ گیا تھا۔ بعد میں ہم نے سنا کہ سندھ سے غلام مصطفیٰ جتوئی سمیت بعض سرکردہ رہنماؤں تک کئی پیغامبروں نے یہ پیغام پہنچایا کہ ملک کو بحران سے نکالنے کے لیے کوئی درمیانی راہ تلاش کرنی چاہیے اور بھٹو خاندان کو اس سے باہر رکھنا چاہیے۔ جتوئی کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ بیگم نصرت بھٹو کی اجازت کے بغیر کوئی قدم اٹھانے پر آمادہ نہیں تھے۔ پیر پگاڑا شروع سے جنرل ضیا کے ساتھ تھے۔ تاہم پی پی پی کی قیادت کے مقابلہ میں ان کا اثر ورسوخ محدود تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیر صاحب کے مرید تعداد میں تھوڑے ہونے کے باوجود ان پر جان نچھاور کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مارشل لا ہیڈ کوارٹر سیاستدانوں کو قالین تلے دبانے یا وحشیانہ طاقت سے کچلنے کی بجائے پہلی بار صحیح سمت میں پیش قدمی کر رہا تھا۔ میں نے اس موضوع پر چوہدری ارشد کے ساتھ بات کی تو انہوں نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ وہ پی پی کے پاکستان نواز کردار سے خوش تھے۔ البتہ فوجی قیادت کے نئے اقدام کی بابت شکوک وشبہات کا شکار نظر آئے۔ وہ جنرل ضیا کی کسی بھی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے توقع ظاہر کی کہ صورت حال کی سنگینی کے باوجود نواب زادہ نصر اللہ خان کوئی قابلِ عمل حل ڈھونڈ لیں گے۔

میں نے ان کی بات بڑی توجہ سے سنی اور اختلاف کرتے ہوئے کہ نواب زادہ صاحب برطانیہ کے جمہوری اصولوں کی بات کرتے ہیں۔ جو موجودہ حالات میں قابلِ عمل نہیں۔ خواہ اس کی ابتدا جزوی کام سے کیوں نہ کی جائے۔ ایک بار سمت تبدیل کر لینی چاہیے۔ پھر سیاسی حالات اپنے اثرات خود پیدا کر لیں گے۔ اور ان میں اصلاح ودرستی کی جا سکے گی۔

پی پی پی کے سابق ایم پی اے راجہ منور جو بڑے تیز طرّار سیاستدان تھے' ان دنوں جنرل ضیا کے لیے کام کر رہے تھے۔ میری معلومات کے مطابق انہوں نے بھی جنرل کو غیر جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے کا مشورہ دیا تھا۔ غیر جماعتی انتخابات سے سیاسی جماعتوں کے تتر بتر ہو جانے کا قوی امکان تھا۔ دوسرے جنرل کو اپنی قوت مستحکم کرنے کے لیے سیاسی بیس مل جانے کی اُمید تھی۔ جنرل کو باور کرا دیا گیا کہ اس الیکشن سے انتہا پسندوں اور پی پی پی کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ اس طرح پرانے سیاستدان کھڈے لان لگ جائیں گے۔ نئے چہروں اور اعتدال پسندوں کو آگے آنے کا موقع مل جائے گا۔ ان کا انحصار جنرل ضیا پر ہوگا۔ جس سے اس کی سیاسی حیثیت کو خاصی تقویت ملے گی۔

جنرل کا مفاد پہلے نمبر پر

بطور صدر اپنی پوزیشن کو محفوظ بنانے کے لیے ضیا نے نفاذِ اسلام کے مسئلے پر ریفرنڈم کرانے کا پروگرام بنایا۔ اگر لوگوں نے اسلام کے حق میں ووٹ دیئے (جو بہر صورت انہیں دینے پڑیں گے) تو ایک عجیب وغریب منطق کی رو سے اس کا مطلب ہوگا کہ وہ ضیا کو اسمبلی کے اولین اجلاس کی تاریخ سے پانچ سال کی مدت کے لیے صدر رکھنا چاہتے ہیں۔ ایم آر ڈی نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا جو بڑا مؤثر رہا اور اس

دھمکی کے باوجود کہ ووٹ نہ ڈالنا مارشل لا کے تحت جرم تصور کیا جائے گا بہت ہی کم ووٹروں نے اپنا حقِ رائے دہی استعمال کیا۔ بہرحال ریفرنڈم کا نتیجہ بھاری اکثریت سے ضیا کے حق میں بتایا گیا اور دعویٰ کیا گیا کہ ووٹران کی بڑی تعداد نے ووٹنگ میں حصہ لیا جبکہ اپوزیشن نے اسے بہت بڑا فراڈ قرار دیا۔

ایم آر ڈی نے ریفرنڈم سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسمبلیوں کے لیے ہونے والے انتخابات کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا' انہیں اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ بڑی تعداد میں الیکشن لڑنے والے اُمیدوار عوام میں جوش وخروش پیدا کردیں گے اور انہیں بڑے پیمانے پر رائے دہی میں حصہ لینے پر آمادہ کرلیں گے۔ الیکشن کا اعلان ہوتے ہی اُمیدواروں کی بھاری تعداد اپنے سیاسی اور ذاتی پسِ منظر کی بنیاد پر اکھاڑے میں کود پڑی۔ ایم آر ڈی نے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا' اگرچہ ضیا مارشل لا کے تحت نااہل قرار دیئے گئے سیاستدانوں پر سے پابندی اٹھانے کو تیار تھے۔ ایم آر ڈی کے لیڈروں کو ایئر مارشل اصغر خان کی رہائش گاہ (ایبٹ آباد) پر اکٹھے ہونے کی اجازت مل گئی تھی۔ بہت سے قائدین الیکشن میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتے تھے' لیکن بینظیر نے لندن سے بائیکاٹ کا پیغام بھیج کر ان کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔

بینظیر اپنے مخمصے میں اسیر تھیں۔ وہ مارشل لا اٹھائے جانے سے پہلے واپس نہیں آنا چاہتی تھیں' کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ واپس جانے پر گرفتار کرلیا جائے گا۔ واپس نہ آنے کی صورت میں الیکشن میں حصہ لینا ممکن نہیں تھا۔ اگر پارٹی اکثریت حاصل کرلیتی تو پی پی کا کوئی دوسرا لیڈر مثال کے طور پر غلام مصطفیٰ جتوئی وزیراعظم بن سکتا تھا جو ان کے لیے کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں تھا۔

اگر پی پی الیکشن میں حصہ نہ لیتی تو دوسری پارٹیوں کی شراکت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے ایم آر ڈی کو بائیکاٹ کا فیصلہ ماننا پڑا۔ یوں سیاسی جماعتوں نے بس مِس کردی جس پر بعد میں بہت زیادہ پچھتاوے کا اظہار کیا گیا۔ جب انتخابات ہوئے تو لوگوں نے بھاری تعداد میں حصہ لیا کیونکہ وہ ایسا موقع ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے جمہوریت بحال ہونے اور اقتدار میں حصہ ملنے کی خواہ وہ کسی قدر محدود کیوں نہ ہو' راہ ہموار ہوتی تھی۔ 1983ء میں بلدیاتی اداروں کے دوسری بار انتخابات ہوچکے تھے اور وہ بڑے اچھے طریقہ سے کام کررہے تھے۔ پیپلز پارٹی کے کئی اہم ارکان نے بھی ذاتی حیثیت میں الیکشن لڑا۔ نئی اسمبلیوں نے 23 مارچ 1985ء سے کام شروع کردیا۔

مارشل لا کی چھتری

نئی اسمبلیاں تشکیل پانے کے باوجود مارشل لا جاری رہا کیونکہ جنرل ضیا کے خیال میں نوزائیدہ جمہوریت کے تحفظ کے لیے اس کا باقی رکھنا ضروری تھا۔ انہوں نے ''تا حکمِ ثانی'' چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ بھی اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا۔ آئین میں ترمیم کی گئی اور انتقالِ اقتدار کا نیا فارمولا وضع کیا گیا جس کے مطابق طے پایا کہ مارچ 1990ء تک وزیرِ اعظم کی نامزدگی کا اختیار صدر کو حاصل ہوگا۔ اگرچہ وہ کوئی مثالی انتظام نہیں تھا' بہرحال آگے کی طرف ایک قدم یقیناً تھا۔

جب وزیرِ اعظم کی نامزدگی کا مرحلہ آیا تو فیڈرل سیکورٹی سیل نے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد تجویز کیا کہ وہ سندھ سے ہونا چاہیے جسے پیر پگاڑا کی پشت پناہی حاصل ہو کیونکہ انہوں نے سندھ کے انتہائی شورش زدہ صوبے میں انتخابات کو کامیاب بنایا تھا۔ نتیجتاً محمد خان جونیجو کا انتخاب کیا گیا۔

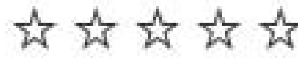
فیڈرل سیکورٹی سیل نے اس امر کی نشاندہی بھی کی کہ اسمبلی کو پارٹی ڈسپلن کے بغیر نہیں چلایا جا سکتا۔ جنرل ضیا جماعتی نظام کے سخت خلاف تھے کیونکہ وہ اسے اسلام کے منافی سمجھتے تھے۔ ان کی سوچ کو تبدیل کرنے کے لیے زبردست محنت کرنی پڑی۔ مجھے اس موضوع پر بریگیڈیر (ریٹائرڈ) عبدالقیوم کے ساتھ جو پنجاب سے سینیٹر بن چکے تھے' کئی اجلاس کرنے پڑے۔ ابتدا میں وہ بھی جماعت سازی کے حق میں نہیں تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ''مسئلہ کا حل کیا ہے؟ آپ ایوان کے معاملات کیسے کنٹرول کریں گے؟ سیاست کو سیاسی خطوط پر چلانا ہوگا۔ فوجی خطوط پر نہیں۔''

آخرِ کار وہ قائل ہوگئے۔ پھر انہوں نے ایک عام فہم مقالہ لکھا اور جنرل ضیا کو ترغیب دی کہ پاکستان مسلم لیگ بنانے کی اجازت دی جائے جس کے سربراہ محمد خان جونیجو ہوں۔ اس کے نتیجہ میں دوسری سیاسی پارٹیوں کو بھی کام کرنے کا موقع مل گیا۔ سیاسی کھیل پھر سے شروع ہوگیا اور مارشل لا پسِ منظر میں چلا گیا۔ جنرل ضیا کو اپنی مرضی کے خلاف سیاسی نظام کی صدارت کرنی پڑی۔ میں نے سوچا کہ اب ضیا کے لیے خود اپنے بچے کو ذبح کرنا آسان نہیں ہوگا۔

جمہوریت کے احیا کے بعد فیڈرل سیکورٹی سیل نے تجویز پیش کی کہ الذوالفقار کے کارکنوں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا جائے تاکہ جو لوگ ناقابلِ اصلاح صورتِ حال میں پھنس گئے ہیں' انہیں اس سے بتدریج نکلنے کا موقع مل سکے۔ دہشت گرد تنظیم کے مقاصد کو بڑی حد تک غیر موثر کر دیا گیا ہے' اب اسے چلانے والے اپنی صحت بھی گنوائیں گے اور روزی کے ذرائع سے بھی محروم رہیں گے۔ دشمن طاقتیں

انہیں اپنے مقاصد کے لیے گماشتوں کے طور پر استعمال کر سکتی ہیں اس لیے انہیں زیتون کی شاخ فراہم کرنے کا اقدام قومی نقطۂ نظر سے بھی کارآمد سمجھا جائے گا۔ مزید برآں اندرون ملک ان کی کڑی نگرانی کی جاسکتی ہے۔ اگر وہ سارے واپس نہیں آتے تب بھی ان کی بیرونِ ملک تعداد بے وقعت ہو کر رہ جائے گی۔

ہماری تجویز بہت زیادہ خطرات سے معمور سمجھی گئی۔ کس کے لیے؟ ملک کے لیے نہیں بشرطیکہ وہ لوگ قومی دھارے میں شامل ہو جائیں۔ غالباً فوجی حکومت کے ارکان کو ان سے خطرہ تھا۔ صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنے کے لیے جو حوصلہ اور بصیرت درکار ہوتی ہے۔ فوجی حکومت اس سے قطعی محروم لگتی تھی۔



باب21

نواز شریف سے تعارف

میاں ریاض الحق جو میرے دوست اور رشتہ دار بھی ہیں' ایکسائز اور ٹیکسیشن کے محکمہ میں ملازم

تھے۔ وہ اپنا تبادلہ سرگودھا سے لاہور کرانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ان کے تبادلے کی بابت بریگیڈیئر قیوم سے بات کروں جو میاں نواز شریف کے بہت قریب تھے۔ میں بریگیڈیئر عبدالقیوم کے ساتھ مارشل لا ہیڈکوارٹرز میں کام کر چکا تھا۔ میں نے بریگیڈیئر صاحب سے کہا کہ وہ اس سلسلے میں میاں نواز شریف سے بات کریں جو متعلقہ محکمہ کے انچارج وزیر تھے۔

میں نے اسی سلسلے میں 1984ء کے اواخر میں بریگیڈیئر قیوم کی رہائش گاہ پر میاں صاحب سے ملاقات کی۔ میں نے میاں صاحب کو بھولا بھالا' خوبصورت اور خوش لباس نوجوان پایا۔ انہوں نے بڑی فراخ دلی' دوستی اور بے ساختہ گرم جوشی کا مظاہرہ کیا حالانکہ یہ ان کے ساتھ میری پہلی ملاقات تھی۔ میں انہیں فوری طور پر پسند کرنے لگا۔

میری معروضات سن کر انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو فون پر کہا کہ میاں ریاض کے تبادلہ کے احکام جاری کر دے اور ان کی ایک نقل میری (راقم الحروف) رہائش گاہ پر بھیج دے۔ میں معاملہ پر ان کی فوری گرفت اور کسی الجھاؤ کے بغیر عملدرآمد کو دیکھ کر مزید متاثر ہوا۔ انہوں نے اس قسم کا کوئی تاثر نہیں دیا کہ وہ مجھ پر کوئی خصوصی نوازش کر رہے ہیں، الٹا یوں محسوس ہوا جیسے میں نے انہیں کام کرنے کا موقع فراہم کر کے ان پر کوئی احسان کیا ہے۔ مجھے وہ مختلف قسم کے سیاستدان لگے۔ میں ان کا انتہائی گرویدہ ہو گیا۔ محض اس چھوٹے سے کام کی بنا پر نہیں بلکہ انہوں نے جس اطمینان بخش طریقے سے ہر کام کیا' اسے دیکھ کر، ان کے باوقار طریقِ کار نے میرے ذہن پر ان کی شرافت کا ایک مستقل نقش ثبت کر دیا۔ واپس آتے ہوئے میرے دل نے گواہی دی کہ وہ ''مردے از غیب'' قسم کے انسان ہیں۔ اس کے بعد سے اب تک میں ان کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں کام کرتا رہا ہوں اور انہیں ہمیشہ مخلص' صاف گو اور مشکل صورتِ حال میں بھی راست باز پایا ہے۔ اگر کوئی شخص زیادہ چالاک بننے یا ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کرے تو کائیاں اور سرد مہر سیاستدانوں کے برعکس وہ غصہ کا اعلانیہ اظہار کرتے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد میں نے سنا کہ میاں صاحب 1985ء کے انتخابات میں لاہور سے قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کا الیکشن لڑ رہے ہیں۔ میں ان سے ملنے کے لیے ماڈل ٹاؤن میں واقع ان کی رہائش گاہ پر گیا۔ مگر وہ موجود نہیں تھے۔ میں اپنا فون نمبر چھوڑ آیا۔ انہوں نے شام کو مجھے فون کیا اور پوچھا آیا وہ میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔ یہی بات میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آیا الیکشن کے سلسلہ میں میں اپنی ذاتی حیثیت میں ان کے کسی کام آ سکتا ہوں کیونکہ میری برادری کے اور بہت سے رشتہ داران کے حلقہ میں

ووٹر تھے۔ میں ان کا اور ان کے شریفانہ طرزِ عمل کا بہت زیادہ گرویدہ ہو گیا اور واقعتاً ان کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہنے لگے:

''بشرطیکہ آپ وہ کام صرف اپنی ذاتی حیثیت میں کر سکیں، جس میں سرکاری پوزیشن کا کسی بھی طور دخل نہ ہو۔''

میں نے جواب دیا: ''آج کل عملی طور پر کوئی اہم کام میرے دائرۂ اختیار میں شامل نہیں اور میری طرف سے سرکاری اثر ورسوخ کے استعمال کا قطعی امکان نہیں۔''

اس کے بعد اس موضوع پر ہماری کبھی بات نہیں ہوئی۔ ان کے حلقہ میں آباد میرے رشتہ داروں اور دوستوں نے بتایا کہ وہ اپنے حلقہ میں بڑے مقبول ہیں اور بڑی مہارت اور سلیقے سے انتخابی مہم چلا رہے ہیں۔ نتیجہ نکلا تو وہ واضح فرق کے ساتھ دونوں سیٹیں جیت گئے۔

گورنر پنجاب نے اپنے آئینی اختیارات استعمال کرتے ہوئے نیز جنرل ضیا کی آشیرباد سے انہیں وزیرِ اعلیٰ نامزد کر دیا۔ پرانے سیاسی اور جاگیردار خاندانوں سے تعلق رکھنے والے مخدوم غلام حسن محمود، مخدوم الطاف، ملک اللہ یار، میاں آصف، چوہدری پرویز الٰہی اور کئی دوسرے اُمیدوار نظر انداز کر دیے گئے۔

فیڈرل سیکورٹی سیل میں کام کرتے ہوئے میں اس حقیقت سے آگاہ ہو گیا تھا کہ جنرل ضیا اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ محمد خان جونیجو اور نواز شریف سمیت کوئی سیاستدان اپنی پوزیشن مستحکم کرے اور زیادہ مضبوط بن جائے۔ انہوں نے 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات محض سندھ کی بند گلی سے نکلنے کے لیے کرائے تھے۔ سندھ میں پیر پگاڑا کے ساتھ اتحاد و اشتراک ناگزیر تھا اور ان کی خواہشات کا احترام کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ البتہ پنجاب میں انہوں نے یہ تدبیر استعمال کی کہ ایک غیر سیاسی نوجوان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا جو تمام معاملات میں ان کے مفادات کا تحفظ کر سکتا تھا۔ بہر حال انہوں نے نواز شریف کی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگایا۔ ان میں حقیقتاً سیاسی قابلیت موجود تھی اور وہ بہت سے لوگوں کی توقعات کے برعکس بہت تھوڑے عرصہ میں بہت بڑے لیڈر بن گئے۔

پنجاب میں تبادلہ

میں جون 1985ء میں بریگیڈیئر قیوم کی معرفت میاں صاحب سے ملا اور پنجاب میں تبادلہ کی

درخواست کی۔ انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولے:

”یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہوگی کہ آپ جیسا قابل افسر میرے ساتھ کام کرے۔“ میں ان ریمارکس سے خوش ہونے کی بجائے مزید متاثر ہوا۔ انہوں نے وفاقی حکومت سے میری خدمات فوراً طلب کر لیں۔

اجلال حیدر زیدی سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا اور پوچھا کہ ”مجھے پنجاب جانے سے کیوں دلچسپی ہے؟“ ”تاکہ آئی جی کے رینک میں ترقی کا اہل بننے کے لیے کم از کم دو سال فیلڈ میں کام کر سکوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مزید برآں میرے بیچ کے ساتھی عباس خاں صوبہ سرحد کے آئی جی بن چکے ہیں۔“ یہ سن کر انہوں نے میرے تبادلے کے احکام جاری کر دیئے اور یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ نواز شریف سے بات کریں گے کہ مجھے فیلڈ میں کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

میں نے جولائی 85ء میں حکومتِ پنجاب کو حاضری رپورٹ دی اور محمد صدیق چوہدری چیف سیکرٹری نیز ایس ڈی جامی (آئی جی) سے ملاقات کی۔ اس کے بعد میں وزیرِ اعلیٰ اور ان کے سیکرٹری مہر جیون خان سے بھی ملا۔ میں نے مہر صاحب کو اپنی فیلڈ پوسٹنگ کی خواہش سے آگاہ کیا۔ ایک سیاستدان کی نسبت وہ اس بات کو بہتر سمجھ سکتے تھے کیونکہ وہ خود ایک کیریئر آفیسر تھے۔

میں نے خاصا عرصہ انتظار کیا۔ اس دوران نہ تو میرے پوسٹنگ آرڈر جاری ہوئے' نہ ہی انتہائی کوشش کے باوجود دوبارہ وزیرِ اعلیٰ سے مل سکا۔ میں پریشان ہوگیا۔ جیون خان کو بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وزیرِ اعلیٰ میرے آرڈر کیوں جاری نہیں کر رہے' حالانکہ انہوں نے خود وفاقی حکومت سے میری خدمات طلب کی تھیں۔ انہیں دال میں کچھ کالا کالا محسوس ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ تبادلوں پر ایم پی اے اور ایم این اے اثر انداز ہوتے ہیں۔ جبکہ میں کسی کا سہارا لینے کے حق میں نہیں تھا۔

ڈھوک کھبّہ کیس

اگست 1985ء کے آخری ہفتہ میں ایک دن شام کو آئی جی صاحب نے مجھے فوری طور پر راولپنڈی روانہ ہو جانے اور ڈھوک کھبّہ میں 9 افراد کے قتل کی تفتیش اپنے ہاتھ میں لینے کا حکم دیا۔ میں پنجاب میں ”افسر بکار خاص“ (O.S.D) کے طور پر کام کرنے کے لیے نہیں آیا تھا۔ نہ ہی کوئی سینئر ڈی آئی

جی عام طور پر کسی فوجداری کیس کی تفتیش کرتا ہے۔ بہرحال میں نے معاملہ کو پوری سنجیدگی سے لیا۔

وہ بڑا المناک سانحہ تھا جس میں دو بھائیوں کے خاندان کے تمام افراد ماسوائے دو چھوٹے بچوں کے کند دھار آلات کے ذریعے بے دردی اور سنگدلی سے ذبح کر دیئے گئے تھے۔ پریس نے اس کیس کو شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا اور راولپنڈی میں زبردست ردِ عمل ہوا۔ جس کے نتیجہ میں آتش زنی اور لوٹ مار کے واقعات رونما ہوئے۔ پورے ملک خصوصاً پوٹھوہار کے علاقہ میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ جہاں اکثر خاندانوں کے سربراہ یا تو فوج میں ملازمت کرتے ہیں یا بیرونِ ملک گئے ہوئے ہیں۔

اخبارات میں قاتلوں کو ''ہتھوڑا گروپ'' کا نام دیا گیا کیونکہ قتل کی بعض دوسری وارداتوں میں بھی ہتھوڑا یا دوسرے کند دھار آلات استعمال کیے گئے تھے۔ عام طور پر قیاس کیا گیا کہ قاتلوں کو افغانستان اور بھارت کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔

نیم جمہوری حکومت پر زبردست دباؤ بڑھ گیا اور نکتہ چینی ہونے لگی۔ راولپنڈی میں اس وقت سول اور پولیس کے بہترین افسر موجود تھے جن میں کمشنر پرویز مسعود ڈی آئی جی افضل علی شگری اور ایس ایس پی چوہدری محمد یعقوب شامل تھے۔ راولپنڈی کی انتظامیہ نے مظاہروں پر تو بڑی ہنرمندی اور مستعدی سے قابو پا لیا۔ لیکن کیس کا سراغ نہیں لگا سکی۔

تفتیش میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ پیش آئی کہ واردات کا نشانہ بننے والا پورا خاندان قتل ہو گیا تھا اور کوئی دوسرا شخص کسی بھی طور مدد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے ممکنہ محرّکات قلمبند کیے جن میں ذاتی' خاندانی' کاروباری' سیاسی' سبوتاژ' رقابت' دھوکا دہی' دشمنی اور نفسیاتی مرض وغیرہ شامل تھے اور دستیاب شہادت نیز اشارات کا جائزہ لیا۔ نقب زنی یا ڈکیتی کے امکان کا جائزہ بھی لیا گیا۔ لاشوں کی ظاہری حالت اور میڈیکل معائنہ سے زنا بالجبر اور خواتین کی قصداً بے حرمتی کی علامات بھی پائی گئیں جو نفسیاتی نفرت ظاہر کرتی تھیں۔ ہر اشارے یا شہادت کے جز کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا تو وہ بند گلی میں جا کر ختم ہو گیا یعنی واردات کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

چند دن بعد اسی طرح کا ایک اور کیس مظفر آباد (آزاد کشمیر) کے نواح میں وقوع پذیر ہوا۔ اس میں بھی خاندان کے ہر فرد کو کند آلے سے قتل کیا گیا تھا' وقوعہ کے دوران کوئی چیخ پکار سننے میں نہیں آئی جس سے قاتلوں کی مہارت اور چابکدستی کا پتہ چلتا تھا۔

دونوں وارداتوں میں کچھ فاصلے پر ایک بھاری کلہاڑی پائی گئی جس کی پشت پر خون کے دھبے

تھے۔ شاید وہ پولیس کو گمراہ کرنے کے لیے کھیلی گئی ہو۔ بظاہر دونوں وارداتوں میں کوئی چیز چرائی نہیں گئی تھی۔ جس سے چوری کا امکان باقی نہیں رہا۔ اگر یہ مخصوص قسم کا جرم تھا تو سوال پیدا ہوا، آیا یہ دہشت گردی تھی یا ذاتی دشمنی؟

اس کے تھوڑے عرصہ بعد حویلیاں (ہزارہ) کے نزدیک دھرم پانی نامی گاؤں میں ایک پورا خاندان کند ہتھیاروں سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ وہاں بھی کچھ فاصلے پر بھاری کلہاڑا پایا گیا۔ میں نے بھی وقوعہ دیکھا۔ اس کیس میں بریگیڈیئر ظفر بھی میرے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہم نے کمال شاہ ڈی آئی جی ہزارہ اور ظفر قریشی اے ایس پی حویلیاں کے ساتھ تمام امکانات پر تبادلۂ خیال کیا۔ وہ دونوں بھی اس کیس کے سلسلہ میں بڑی محنت کر رہے تھے۔

دھرم پانی کے وقوعہ سے کچھ سراغ ملا۔ وہ واردات ایک دور دراز کے گاؤں میں ہوئی تھی۔ اس گاؤں میں کوئی شخص نوٹس میں آئے بغیر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ (راولپنڈی اور مظفر آباد کے مقاماتِ وقوعہ باہر سے آنے والے کے لیے آسانی سے قابلِ رسائی تھے) اس کیس کا جلد ہی سراغ لگا لیا گیا۔ جس کے محرکات میں زمین کا پرانا تنازع اور شادی کی کچھ پیچیدگیاں شامل تھیں۔ مجرموں نے بڑی احتیاط سے منصوبہ بندی کی تھی۔ ان میں سے ایک مظفر آباد کی جائے واردات دیکھنے بھی گیا تھا تاکہ تفتیش کنندگان کو دھوکا دینے کے لیے سابقہ واردات کے مشابہ ظاہر کیا جا سکے۔ بعض دوسرے کیس بھی اسی طریقے سے وقوع پذیر ہوئے، تاہم ان کا سراغ جلد مل گیا۔

ڈھوک کھبہ کیس کا سراغ آخرِ کار ٹیکسلا کے ڈی ایس پی مسعود بنگش نے لگایا جو ایک تیز طرار افسر تھا۔ مجرم کو پولیس کی گشتی پارٹی نے اس وقت پکڑ لیا جب وہ ٹیکسلا میں اسی طرح کی واردات کا ارتکاب کرنے کے بعد فرار ہو رہا تھا۔ اس نے ڈھوک کھبہ کیس سمیت بہت سی وارداتوں کا اعتراف کر لیا۔ وہ ایک نفسیاتی مریض تھا اور اپنی اذیت پسندی کی عادت کو تسکین دینے کے لیے بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

ڈھوک کھبہ کیس کی تفتیش کے دوران میں پنجاب ہاؤس (راولپنڈی) میں ٹھہرا ہوا تھا۔ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ وفاقی دارالحکومت کے دورہ پر آتے تو وہ بھی وہیں قیام کرتے تھے۔ میں نے کئی بار ان سے ملنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا، آخرِ کار نومبر 1985ء میں کامیاب ہو گیا۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا اور میرے زبان کھولنے سے پہلے ہی بول اٹھے:

’’میں جانتا ہوں‘ آپ کا مسئلہ کیا ہے‘‘

’’جناب والا! اگر آپ کو میرا مسئلہ معلوم ہے تو اسے حل کیوں نہیں کر دیتے؟‘‘ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ دیر پراسرار انداز میں خاموش رہے‘ پھر بولے: ’’اس سلسلے میں بعض رکاوٹیں درپیش ہیں۔‘‘

’’دوسرے اُمیدوار بھی یقیناً ہوں گے۔‘‘ میں نے قیاساً کہا۔ ’’نہیں‘ نہیں‘ یہ بات نہیں۔ بلاشبہ کئی اور خواہشمند بھی ہیں۔‘‘ وہ بات مکمل کیے بغیر پھر چپ ہو گئے۔ میں سوچنے لگا کہ وہ رکاوٹیں کیا ہو سکتی ہیں۔ اتنے میں وہ پھر گویا ہوئے: ’’میں نے تمہاری پوسٹنگ کرنا چاہی تھی لیکن جنرل جیلانی صاحب نے اتفاق نہیں کیا۔ وہ تمہارے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے۔ بریگیڈیئر قیوم بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بھی تمہارے کیس کی حمایت نہیں کی۔ اگر میں نے گورنر سے بات نہ کی ہوتی تو میں لازماً تمہاری پوسٹنگ کر دیتا۔ چونکہ میں بات کر چکا ہوں اس لیے مشکل ہو گیا۔ مجھے معلوم نہیں انہوں نے مخالفت کیوں کی۔ آپ کے خیال میں کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ آپ بریگیڈیئر صاحب سے بات کیوں نہیں کر لیتے؟‘‘

میں نے خاموشی اور توجہ سے ان کی بات سنی۔ پھر جواب دیا: ’’سر‘ میں آپ کی عنایت اور اعتماد کا بے حد شکر گزار ہوں۔ میں اس بات کے لیے بھی ممنون ہوں کہ آپ نے وفاقی حکومت سے میری خدمات طلب کیں۔ آپ کے لیے مجھے یہ بتانا ضروری نہیں تھا کہ گورنر نے میری پوسٹنگ کی مخالفت کی تھی۔ گورنر آپ کے محسن ہیں کیونکہ آپ کو انہوں نے ہی چیف منسٹر نامزد کیا تھا۔ آپ کو میری خاطر خود کو الجھن میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ براہ کرم آپ میری فیلڈ میں پوسٹنگ نہ کریں۔ چاہیں تو بے شک مجھے وفاقی حکومت میں واپس بھیج دیں۔ لیکن میں بریگیڈیئر قیوم سمیت کسی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں نے ہر بات آپ پر چھوڑ دی ہے۔‘‘

میری باتوں نے ان کے دل پر خاصا اثر کیا، کہنے لگے: ’’نہیں‘ نہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو واپس نہیں بھیجوں گا کیونکہ میں نے خود آپ کی خدمات مانگی تھیں۔ آپ کو واپس کرنا اچھا نہیں لگے گا۔ بہر حال میں کچھ نہ کچھ کروں گا۔‘‘ انہوں نے یقین دہانی کرائی۔ میں ان کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔ ان کی راست گوئی اور خلوصِ نیت نے ایک بار پھر بڑا متاثر کیا۔ میں نے ان پر مکمل اعتماد کیا اور جی میں ٹھان لی کہ

آئندہ انہیں یاددہانی بھی نہیں کراؤں گا۔

رقصِ مسرّت

آخرِ کار میں نے اپنی پوسٹنگ کے معاملہ کو بھلا دیا اور اپنی دوسری بیٹی سائرہ کی شادی کے انتظامات میں پوری طرح مصروف ہوگیا۔ بلقیس اور میں نے خریداری کے سلسلہ میں پشاور' ایبٹ آباد اور مظفر آباد کے کئی چکر لگائے۔ ہم اخروٹ کی لکڑی سے بنا ہوا ہلکا فرنیچر جس پر نقاشی کی گئی ہو' خریدنا چاہتے تھے تاکہ سائرہ اسے اپنے ساتھ مانچسٹر (انگلینڈ) لے جا سکے۔

1985ء کے آخری دن جب مارشل اٹھایا گیا' ہم مظفر آباد کے راستے پر رواں دواں تھے۔ میں نے جونہی ریڈیو پر جنرل ضیا کو پارلیمنٹ میں مارشل لا اٹھانے کا اعلان کرتے ہوئے سنا' خوشی سے ناچنے لگا۔ میں کار چلا رہا تھا' وہ بری طرح ڈول گئی اور ہم حادثے کا شکار ہونے سے بال بال بچے۔

''کیا آپ پاگل ہوگئے ہیں؟'' میری بیوی نے بڑی خفگی سے کہا۔

''ہاں میں خوشی کے مارے دیوانہ ہوگیا ہوں۔ مارشل لا ختم ہوگیا۔ مارشل لا رخصت ہوگیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اب پاکستان کا مستقبل محفوظ ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ یہ جمہوری احیا کا عظیم لمحہ تھا اور میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو رہا تھا۔

''ممکن ہے اللہ تعالٰی نے پاکستان کو بچا لیا ہو لیکن ہم آپ کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں۔ اگر آپ نے دوبارہ ایسی لاپروائی سے کام لیا تو ہم کسی گڑھے میں پڑے ہوں گے۔'' بلقیس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

میں ان کی اس بات پر ناراض ہوگیا۔ کار کھڑی کردی اور ان سے کہا۔ ''آپ بڑی اکھڑ اور اجڈ ہیں۔'' میں اس قدر جوش اور غصے میں بھرا ہوا تھا کہ اچانک زمین پر گر پڑا اور چلانا شروع کردیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ سٹپٹا گئی اور مجھے تسلیاں دینے لگی۔ میں نے اس سے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں خوشی سے بے قابو ہوگیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اسے مارشل لا کے دوران خصوصاً گزشتہ دو سالوں میں سندھ میں رونما ہونے والے حالات کے بارے میں بتایا۔

1986ء کے شروع میں سائرہ کی شادی کی تیاریوں پر میرا بہت زیادہ وقت صرف ہوا۔ شادی

کی تقریب 27 جنوری 1987ء کو انجام پائی۔ حسنِ اتفاق سے میں جونہی فارغ ہوا۔ بحیثیت ڈی آئی جی سرگودھا پوسٹنگ کے احکام مل گئے۔ اگلی صبح میں نے وزیرِ اعلیٰ سے ملاقات کی۔ فیلڈ پوسٹنگ کرنے پر ان کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا: ''آیا میرے لیے کچھ خصوصی ہدایات ہیں؟'' ''نہیں کوئی خاص ہدایات نہیں۔ لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا اور انصاف کرنا۔ سرگودھا سیاسی لحاظ سے بڑا حساس علاقہ ہے۔ یہ پہلو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا۔''

میں سرگودھا پہنچا اور شاہد حسن کی جگہ بطور ڈی آئی جی چارج سنبھالا۔ انہیں ڈی آئی جی راولپنڈی بنا دیا گیا تھا۔ وہ 1972ء میں جب زیرِ تربیت اے ایس پی کے طور پر راولپنڈی آئے تو میں وہاں ایس ایس پی کے عہدہ پر فائز تھا۔

عزتِ نفس کی بحالی

سرگودھا رینج خوشاب' میانوالی' بھکر اور سرگودھا چار اضلاع پر مشتمل ہے۔ خوشاب اور بھکر کو سرگودھا اور میانوالی سے الگ کر کے نئے ضلعے بنائے گئے تھے۔ یعنی اصل میں وہ رینج محض پرانے دو ضلعوں پر مشتمل تھی۔ نوید احسن میرے دوست اور کلاس فیلو اظہار الحق کے چھوٹے بھائی' کمشنر تھے۔ جب سرگودھا ڈویژن قائم کیا گیا تو پرانے ڈی سی ہاؤس کو کمشنر ہاؤس میں بدل دیا گیا۔ اس مکان سے بلقیس کی بڑی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ کیونکہ 1950ء کی دہائی کے وسط میں وہ اس مکان میں رہ چکی تھی جب ان کے والد میاں شفیع سرگودھا کے ڈی سی تھے۔ میرے سسر نے اپنی مشہور اُردو تصنیف ''1857ء'' اسی مکان میں قیام کے دوران لکھی تھی۔

مرزا محمد علی ایس پی میانوالی نے زبردست محنت کر کے امن وامان کی صورتحال بہتر بنائی تھی۔ میانوالی کا بارڈر صوبہ سرحد سے ملتا ہے۔ دریائے سندھ اسے شمالاً جنوباً قطع کرتا ہے۔ جس کے کناروں پر گھنے جنگلات ہیں' یہ جغرافیائی عوامل ڈاکوؤں کی پناہ گاہیں جبکہ آتشیں اسلحہ ومنشیات کے سمگلروں کو آسان راستہ فراہم کرتے ہیں۔ محمد علی ان سب عوامل سے آگاہ تھے۔ وہ قابلِ تحسین صلاحیت اور اپنے فرض کے ساتھ لگن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

محمد اشرف مارتھ (ایس پی بھکر) نے مجھے اپنی تفتیشی صلاحیتوں سے بڑا متاثر کیا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ چوہدری صالح محمد (ڈی ایس پی) کے بیٹے تھے۔

رانا محمد اقبال خان (ایس پی خوشاب) اپنے چاندی کی طرح سفید بالوں سے عمر رسیدہ لگتے تھے۔ اور پولیس میں بھرتی ہونے سے پہلے محکمہ جنگلات میں ملازمت کر چکے تھے۔ وہ بڑے قابل اور کھرے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات میں بے لچک تھے۔

میجر لئیق احمد خان ایس پی سرگودھا تھے۔ ان کی فوجی تربیت اور پس منظر پولیس کے کام میں بہت معاون ثابت ہوا۔

اگرچہ میرا کام خاصا ہلکا پھلکا تھا جس میں کوئی اہم انتظامی سردردی شامل نہیں تھی۔ تاہم مجھے ایک سنگین لیکن بڑی حد تک ایک عام مسئلے سے واسطہ پڑ گیا۔ اپنے عام فرائض کی بجا آوری کے دوران میرے سامنے بڑی تعداد میں ایسی اپیلیں پیش کی گئیں جو سزاؤں کے خلاف دائر کی گئی تھیں اور عرصۂ دراز سے معرضِ التوا میں پڑی تھیں۔ میں نے بعض اپیل کنندگان کو بلانے اور ان کی گزارشات سننے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سماعت کے دوران میں ان سے خاندانی پسِ منظر اور تعلیم و تربیت کے متعلق سوالات پوچھتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنا بہترین امیج پیش کرنے کی کوشش کرتا اور میں ایسا کرنے میں ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اس کے بعد میں نے زیادہ تر اپیلیں ضروری رپورٹوں کے لیے متعلقہ اضلاع کے ایس پی حضرات کو بھجوا دیں۔ تاکہ وہ ان کی موجودہ کارکردگی اور چال چلن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔

ایس پی حضرات نے میری پالیسی پر کسی مسرت کا اظہار نہیں کیا۔ ان کے نزدیک میں سزاؤں کے معاملے میں نرمی برت رہا تھا۔ جبکہ میں ان لوگوں کو اصلاح کا موقع دینا چاہتا تھا جو عزتِ نفس سے محروم ہو چکے تھے۔ جب میں نے ان پر اپنی سوچ واضح کی تو وہ بھی میری کوششوں میں شریک ہو گئے۔ اگلے مرحلہ میں میں نے معقول مدت کا نوٹس دینے کے بعد اضلاع کا دورہ کیا تاکہ اپیل کنندگان کی کارکردگی کو چیک کر سکوں۔ کچھ وقت گزرنے پر وہ ایس ایس پی صاحبان کے مطابق انتہائی مستعد اور فرض شناس اہلکار بن گئے۔ اگر انسانوں سے معاملہ کرتے وقت انسانی عظمت و وقار کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اس سے کہیں بہتر نتائج ممکن ہیں۔ بہر حال ہمدردانہ سوچ کا اطلاق صرف وہاں کیا گیا جہاں نااہلیت یا بیماری کے بہانہ کو سزا کی بنیاد بنایا گیا تھا۔ رشوت ستانی یا دیگر مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث اہلکاروں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات میں نے ایس پی صاحبان کی طرف سے دی گئی سزاؤں میں اضافہ کر دیا۔

میں نے ماتحت عملہ کی بروقت اور بامقصد نگرانی پر زور دیا۔ اپنے ایس پی اور ڈی ایس پی حضرات پر واضح کیا کہ نرم اور غیر محتاط نگرانی نے ماتحتوں کو کرپشن اور اختیارات کے غلط استعمال کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ شروع میں معاملہ سے صرف نظر کرنے اور پھر کڑی سزائیں دینے کا کوئی جواز نہیں بنتا کیونکہ لوگوں کے ساتھ پہلے ہی بڑی ناانصافی ہو چکی ہے۔ بروقت اور مناسب نگرانی پولیس کو غفلت و سستی اور بے حسی و بے اعتنائی میں پڑنے اور ناانصافی کی فضا پیدا کرنے سے روکتی ہے۔

ایک اچھے منتظم کو اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے چاہئیں۔ وہ چاق و چوبند انتظامیہ کے ساتھ غلط کار ماتحتوں کو رشوت اور ناانصافی سے بچنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ ایک انسپکٹر قتل کیس کی تفتیش کر رہا تھا جس میں کوئی دولت مند سنار ملوث تھا۔ مجھے خبر ملی کہ سنار نے اعلیٰ نسل کی ایک گائے انسپکٹر کی نذر کی اور بذریعہ ٹرک اس کے گھر بھجوائی تھی۔ میں نے متعلقہ ایس پی کو فوری تحقیقات کے لیے خط لکھا جس میں تمام حقائق بشمول ٹرک نمبر اور ڈرائیور کا نام درج تھے۔ انسپکٹر کو جونہی میرے مراسلے کا پتہ چلا، جس کے ساتھ ناقابلِ تردید خصوصی شہادت منسلک تھی، اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سرگودھا رینج سے اپنا تبادلہ کرا کے کہیں اور چلا جائے۔ وہ گائے اس کے اصل مالک کے پاس واپس پہنچ گئی اور نئے افسر نے میرٹ کے مطابق تفتیش کی۔ اس سے پورے علاقے میں یہ افواہ پھیل گئی کہ اگر رینج میں کسی افسر نے غلط کام کیا تو ڈی آئی جی کو پتہ چل جائے گا۔

اگر کوئی معاملہ متنازعہ ہوتا یا کوئی فریق تفتیش کی درستی کو چیلنج کرتا تو میں دونوں پارٹیوں اور تفتیش کنندہ کو بھی طلب کر لیتا اور گھنٹوں ان کے نقطہ ہائے نظر کو سنتا۔ بحث کے دوران حقیقت نکھر کر سامنے آ جاتی اور تفتیش کرنے والے افسر صحیح نتائج تک پہنچ جاتے۔

جس فریق کا کیس کمزور ہو وہ ہڑبونگ مچانے کی کوشش کرتا ہے اور کھلی تفتیش کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ اس کی بجائے وہ اپنے کیس کو ایسے افسر کے پاس لے جانا پسند کرتا ہے جو مقامی حالات کے بارے میں معلومات نہ رکھتا ہو یا جس پر اثر و رسوخ استعمال ہو سکتا ہو یا اسے رشوت دی جا سکتی ہو۔ سمجھدار افسر ایسی سازش کو خود تحقیقات و تفتیش کر کے نیز لوگوں کی سرگرمیوں کو کھلا قرار دے کر صداقت کا دامن تھام کر اور اپنے فیصلے کا موقع پر ہی اعلان کر کے ناکام بنا سکتا ہے۔ اسے اثر و رسوخ سے بچنے کے لیے اپنا کام بلا

تاخیر مکمل کرنا چاہیے۔ افسران بعض تاخیری حربے قصداً استعمال کرتے ہیں تاکہ ان سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاسکے۔ ایسی صورت میں سینئر نگرانوں کا فرض ہے کہ دیر تک انتظار کرنے کی بجائے ہوشیار و چوکس نظر سے نگرانی کریں۔ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے اور پھر معاملہ کو سدھارنے کے لیے کڑی سزاؤں کا سہارا لینا پڑے۔

کچھ عرصہ بعد میرے ایس پی قائل ہو گئے کہ بہتر و بروقت اطلاعات' مستعدی' چوکس نگرانی اور انسانی معاملات پر فوری توجہ دیر سے دی جانے والی خوفناک سزاؤں کے مقابلہ میں بہتر نتائج پیدا کرسکتی ہے۔

بہترین اہلکاروں کی تیاری

میں نے سروس کے دوران اہلکاروں کو دی جانے والی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ میں نے اپنی رینج میں زیرِ تربیت تمام اسسٹنٹ سب انسپکٹروں کے انٹرویو لیے اور ان سے پوچھا کہ اپنے عملی کیریئر کے شروع میں وہ مقررہ کورس کے علاوہ کیا چیز سیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ انہوں نے مفید اور عملی تجاویز پیش کیں۔ ان کی تجاویز جمع کرنے کے بعد میں نے احکام جاری کر دیئے کہ انہیں پہلے بطور محرر اور پھر تفتیش کنندگان کی حیثیت سے کام کرنا چاہیے۔ ان کی کیس فائلوں کی چھان بین علاقے کا تھانیدار یا ضلع کا ایس پی کرے گا۔ ان کی بعض فائلوں کا میں نے خود جائزہ لیا۔ میں نے انہیں ہر قسم کے مسائل سے نمٹنا سکھایا تاکہ ان میں یہ احساس پیدا ہو سکے کہ وہ اپنے سینئروں کی بیدار نگاہوں کے نیچے کام کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ میں نے اپنی رینج کے تمام انسپکٹروں اور زیادہ تر سب انسپکٹروں کے انٹرویو لیے تاکہ تفتیش کے معاملہ میں ان کی مہارت اور دوسری پیشہ ورانہ صلاحیت کا پتہ چل سکے۔ انہیں معقول مدت کا نوٹس دینے کے بعد میں ان سے کہتا کہ کسی ایسی کیس فائل کے بارے میں اچھی طرح تیاری کر کے آئیں جس کے متعلق انہوں نے سوچا ہو کہ اس کے لیے ان کی بہترین تفتیشی صلاحیتیں درکار ہیں۔ اس طرح میں نے انہیں پیشہ ورانہ کام کو بہتر بنانے اور اپنی کارکردگی کو باعثِ فخر سمجھنے کی ترغیب دی۔ شوکاز نوٹس جاری کرنے' سخت سزائیں دینے اور مسلسل خوف و ہراس میں مبتلا رکھنے سے ماتحتوں میں بے چینی و شکستہ دلی جنم لیتی ہے۔ جس سے ان کی پہل کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ ماتحتوں کو تنظیم کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے رہنمائی اور قیادت درکار ہوتی ہے۔ انہیں گدھوں کی

طرح فرسودہ مقصد کی طرف نہیں ہانک دینا چاہیے۔

ان انٹرویوز کے دوران مجھے سب انسپکٹر ملک شیر محمد کا پتہ چلا کہ وہ قابلِ ستائش پیشہ ورانہ معلومات رکھتا ہے اور دیانتدار افسر ہے۔ میں نے قتل کیس کی ایک فائل کا مطالعہ کیا جس کی تفتیش اس نے کی تھی۔ وہ مخالف گروپوں کے مابین بلا روک ٹوک لڑائی کا کیس تھا جو دن کے وقت بہت بڑے گاؤں کی ایک گلی میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ شیر محمد نے جائے وقوعہ کا نقشہ ایسی تفصیل سے اور اس قدر صحیح حالت میں بنایا کہ آدمی اس پر سرسری نظر ڈال کر ہی درست استنباط کر سکتا تھا۔ اس نے استغاثہ اور صفائی دونوں کے سارے بیانات منطقی انداز میں قلمبند کیے۔ پولیس افسران عام طور پر صفائی کے بیان ریکارڈ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ مبادا ان پر رشوت لینے یا ناجائز حمایت کا الزام لگا دیا جائے۔

اس نے ایک ایسے 18 سالہ لڑکے کا بیان جو لڑائی کی خبر سن کر کھیت سے بھاگتا ہوا آیا تھا' دیانتداری اور جامعیت کے ساتھ ریکارڈ کر کے بڑی خوداعتمادی اور انصاف کے شعور کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس لڑکے نے اپنے گھر سے لاٹھی اٹھائی تاہم آگے نہیں گیا کیونکہ لڑائی پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ شیر محمد نے اس کا نام ملزمان کے خانہ میں نہیں بلکہ خانہ نمبر 2 میں درج کیا جو ظاہر کرتا تھا کہ وہ معاملہ میں براہ راست ملوث نہیں۔ دوسرے فریق کو یہ بات ناگوار گزری۔ تاہم شیر محمد نے تفتیش اس قدر گہرائی اور دیانتداری سے کی تھی کہ اس کے اخذ کردہ نتیجہ کو اعلیٰ ترین عدالت نے بھی بحال رکھا۔ اسے اپنے راہ راست پر ہونے کا پختہ یقین تھا اس لیے کسی قسم الزام تراشی کی پرواہ نہیں کی۔

اس کی دیانتدار اور ماہرانہ تفتیش نے آخرِ کار متحارب فریقین کو بھی عقل و استدلال کی روشنی دکھائی جو گذشتہ چند برسوں میں اپنے درجنوں رشتہ داروں سے محروم ہو چکے تھے۔ بالآخر انہوں نے شیر محمد کو ثالث مان کر صلح کر لی۔ میں نے اسے انسپکٹر کے عہدہ پر ترقی دی اور اس کی تفتیش کو دوسرے اہلکاروں کے لیے نمونہ قرار دیا۔

چغل خور اور سازشی عناصر

بے نظیر بھٹو اپریل 1986ء کے دوسرے ہفتہ میں دورۂ پنجاب کے دوران میں لاہور سے واپسی پر ایک بھاری جلوس کی قیادت کرتے ہوئے سرگودھا پہنچیں۔ اس موقع پر کوئی بدمزگی پیدا نہیں ہوئی۔

پی پی پی کے لیڈر جہانگیر بدر اور ناظم شاہ جو میرے پرانے دوست تھے' اس بات پر میرا شکریہ ادا کرنے آئے کہ میں نے سیکورٹی کے بہت اچھے انتظامات کیے تھے۔

بلاشبہ جمہوری حکومت نے پی پی پی کو اپنے بند جذبات کا اظہار کرنے کی اجازت دے کر دانشمندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ فوجی حکومت کی طرح ان کے اظہار پر پابندی نہیں لگائی۔ حکومت کے اس جرأت مندانہ اقدام اور حسن تدبر کو خوب سراہا گیا۔

میں نے ایک دوست سے جو اسلام آباد میں ایک کلیدی منصب پر فائز تھے۔ اس سلسلہ میں بات کی تو انہوں نے بھی حکومت کی مدبّرانہ پالیسی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ نوزائیدہ جمہوریت کے خلاف محلاّتی سازشیں کرنے والے پہلے ہی سرگرمِ عمل ہو چکے تھے۔ صدر اور پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے کی سازش تیار کر لی گئی تھی۔ صدر کو بتایا گیا کہ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے درمیان جہانگیر بدر کے ذریعے خفیہ سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ اس لیے پنجاب میں پیپلز پارٹی کے جلوسوں کے ساتھ نرمی برتی جا رہی ہے۔ کسی نے جنرل ضیا کے کانوں میں یہ بات بھی ڈال دی کہ نواز شریف اور بھٹو خاندان کے مابین کوئی تنازع نہیں اور ان میں کسی وقت بھی صلح ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھٹو خاندان اور چوہدری ظہور الٰہی فیملی کے درمیان خونی تنازع کی باتیں بھی ہونے لگیں۔ چوہدری ظہور الٰہی کے قتل کی بات عام طور پر کہا جاتا تھا کہ وہ الذوالفقار کے کارکنوں کی کارستانی تھی۔ صدر ضیا کو یہ کہہ کر ڈرایا گیا کہ وزیرِ اعظم جونیجو سندھی ہیں' اس لیے انہیں دوسرے سندھی سیاستدان (بے نظیر بھٹو) کے ساتھ مفاہمت میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

افواہیں پھیلانے کی اس مہم کے کچھ نہ کچھ اثرات یقیناً نظر آئے۔ ایک طرف جونیجو کا اس بات پر مذاق اڑایا جانے لگا کہ وہ مارشل لا ختم کرنے کا کریڈٹ خود لے رہے تھے۔ دوسری طرف جنرل ضیا بھی اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگے اگرچہ وہ غیر ضروری اور بلا جواز تھا۔ ضیا نے اس وقت سے سبکی محسوس کرنی شروع کر دی تھی جب واضح اشارہ کے باوجود صدر کے منظورِ نظر خواجہ صفدر کو قومی اسمبلی کا سپیکر منتخب نہیں کیا گیا۔

بلاشبہ یہ جھٹکا مسلم لیگ کی تشکیل کا موجب بن گیا تاہم جنرل کا پارلیمنٹ پر سے اعتماد اُٹھ گیا کیونکہ وہ اس میں حسبِ منشا رد و بدل نہیں کر سکتے تھے۔ وزیرِ اعظم اور ان کی حکمران جماعت کو ایک ڈکٹیٹر اور مکمل اقتدار کے خواہاں صدر نیز پارلیمنٹ میں پائی جانے والی مثالیت پسند اور مسئلہ بن جانی والی اپوزیشن کو

ساتھ لے کر چلنا تھا۔ایم آر ڈی خصوصاً پی پی کی صورت میں باہر کی اپوزیشن بھی خطرناک تھی۔ یہ ایک کسے ہوئے رسے پر چلنے کے مترادف تھا اور ہر چیز کا انحصار امن وامان کی اچھی صورتحال پر تھا۔اس پس منظر میں جونیجو اور نواز شریف نے اپوزیشن سے مہذب انداز میں نمٹنے کے لیے جرأت مندانہ اور جمہوری طریق کار اپنایا۔لیکن اس سے اقتدار کی غلام گردشوں میں زبردست رقابت پیدا ہوگئی۔ابھرتا ہوا منظر واقعتاً پریشانی کا موجب بن گیا۔لیکن وہ کھیل کا حصہ تھا۔اقتدار کے گندے کھیل کا حصہ۔

نجومی کی پیش گوئی

سرگودھا میں مختصر تعیناتی کے دوران میں بابو قطب دین سے ملا جو بہت ہی دلچسپ بوڑھا آدمی تھا۔وہ ملاقات کے لیے میرے دفتر آیا اور کہنے لگا کہ اس کا آبائی گاؤں بھی بھارت کے اسی علاقے میں تھا' جہاں سے میں ہجرت کر کے آیا تھا۔ایک فطری لگاؤ اور میلان کے علاوہ میں نے اسے ایک اچھے انسان کی حیثیت سے بھی پسند کیا۔حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اپنی سادہ دیہاتی وضع قطع کے باوجود وہ بالکل صحیح انگریزی بولتا تھا۔اس نے بتایا کہ 1932ء میں میٹرک کرنے کے بعد اس نے سنٹرل گورنمنٹ سیکرٹریٹ نئی دہلی میں بطور کلرک ملازمت اختیار کی اور اسے پٹیل' نہرو' شاہنواز بھٹو بلکہ تھوڑا سا عرصہ قائداعظمؒ جیسے بڑے بڑے لیڈروں کے ساتھ بھی کام کرنے کا موقع ملا۔اس نے سب سے زیادہ عرصہ ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ گزارا جو آزادی کے بعد کانگریسی حکومت کے مردِ آہن بنے۔اس نے مجھے اس دور کے نمایاں افراد کے متعلق بہت سی دلچسپ کہانیاں سنائیں۔

اس کی حقیقی صلاحیتیں مجھ سے مخفی تھیں' یہاں تک کہ ایک دن حق نواز کیانی' ڈپٹی کمشنر میانوالی نے میرے ہمراہ اس سے لنچ پر ملاقات کی۔کیانی نے مجھ سے پوچھا:

''آپ اس شخص کو کتنے عرصہ سے جانتے ہیں؟''

''میں اس سے صرف چند دن پہلے ملا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔کیانی مسکراتے ہوئے کہنے لگے: ''قطب دین بہت بڑا نجومی ہے۔''

''میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔نہ ہی اس نے کبھی اس موضوع پر بات کی ہے۔'' میں نے انہیں بتایا۔

کیانی نے بتایا کہ انہیں قطب دین کی مہارت کا ذاتی تجربہ ہے۔وہ قریباً 20 سال پہلے جسٹس

ایم آر کیانی' جو لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے فوت ہوئے' کی رہائش گاہ پر اس سے ملے تھے۔ قطب دین نے حق نواز کے متعلق بہت سی پیش گوئیاں کی تھیں۔ انہیں اُس وقت اِس کی باتوں پر یقین نہیں آیا' تاہم بعد میں وہ ساری پیش گوئیاں درست ثابت ہوئیں۔

اعلیٰ منصب پر تقرری

میں نے لنچ پر بابو قطب دین سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ البتہ بعد میں اپنے گھر بلا کر اس سے دریافت کیا آیا وہ واقعی علمِ نجوم کا ماہر ہے؟ اس نے انکساری سے کام لیتے ہوئے نفی میں جواب دیا۔ جب میں نے اسے وہ باتیں بتائیں جن کا ذکر اس کے بارے میں حق نواز کیانی نے کیا تھا تو اس نے بادل نخواستہ تسلیم کیا کہ وہ اس مضمون کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا ہے۔ بعد میں اس نے ہماری تاریخ کے بعض اہم واقعات کی بابت ٹھیک ٹھیک پیش گوئیاں کیں۔ اس کے متعلق مزید تفصیلات بعد میں عرض کروں گا۔ فوری دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس نے مجھے سرگودھا سے ''بہت جلد'' تبادلہ کی خبر سنا دی۔ ''لیکن بابو جی مجھے اس رینج میں دو سال پورے کرنے ہیں۔ ورنہ مجھے ترقی نہیں ملے گی۔ براہ کرم میرا تبادلہ نہ ہونے دیں۔'' میں نے التجا کے انداز میں کہا۔

''افسوس ہے' میں اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرا علم یہی کہتا ہے۔ آپ کسی اعلیٰ منصب پر جائیں گے۔ اگلا سال آپ کی ترقی کا سال ہے۔'' انہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ قریباً ایک مہینے کے بعد وہ جمعہ کے دن ملنے کے لیے میرے گھر آئے۔ میں اپنے دوست منظور بھٹی کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھا۔

بابو جی نے آتے ہی سوال کیا:

''آپ نے لاہور جانے کے لیے ابھی تک رختِ سفر نہیں باندھا؟''

یہ 13 جون 1986ء صبح کے دس بجے کا واقعہ ہے۔

''سامان باندھنا مشکل نہیں۔ لیکن کسی حکم کے بغیر میں کیسے جا سکتا ہوں؟'' میں نے عذر پیش کیا۔

''میرے حساب کتاب کے مطابق آپ کو آج شام تک چلے جانا ہوگا۔ آپ کو احکام مل جائیں گے۔''

''میں فوراً روانہ ہو جاؤں گا اور بھٹی میرا سامان پہنچا دیں گے۔ لیکن بابو جی میں علمِ نجوم پر کچھ زیادہ یقین نہیں رکھتا۔'' میں نے جواب میں کہا۔

انہیں اپنی بات پر پختہ یقین تھا اس لیے اصرار کرتے رہے کہ ان کی پیش گوئی لازماً سچی ثابت ہوگی۔ چونکہ مجھے ان کے علمِ نجوم پر قطعاً یقین نہیں تھا اس لیے میں حیران ہونے لگا کہ وہ اس قدر وثوق سے کیسے کہہ رہے ہیں۔ نواز شریف ایڈیشنل آئی جی سپیشل برانچ (پنجاب) کے عہدہ کے لیے میرا انٹرویو لے چکے تھے' اور اس وقت تک یہ بات میں نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔ بابو جی اس بارے میں کہیں سے معلوم کر سکیں۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ آئی جی کو بھی میرے انٹرویو اور متوقع پوسٹنگ کا علم نہیں تھا۔

اسی دن شام پانچ بجے کے قریب مجھے اپنے پرانے دوست حاجی اکرم کی جو اس وقت ہوم سیکرٹری بن چکے تھے' ارجنٹ کال موصول ہوئی جس میں مطلع کیا گیا تھا کہ میرا قائم مقام ایڈیشنل آئی جی سپیشل برانچ کے طور پر تبادلہ کر دیا گیا ہے اور مجھے آج رات نئے منصب کا چارج لینا ہوگا۔ بابو قطب دین بھی وہاں موجود تھے۔ جب میں نے انہیں خبر سنائی تو اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک اور چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ان کے مشورہ پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ سامان باندھنے اور دیگر معاملات نمٹانے کا کام منظور بھٹی کے سپرد کرنا پڑا اور میں فوری طور پر بذریعہ کار لاہور کے لیے روانہ ہوگیا۔



باب22

سپیشل برانچ کی اصلاح

پنجاب کی سپیشل برانچ، جس کا چارج میں نے بطور ایڈیشنل انسپکٹر جنرل جون 1986ء میں سنبھالا، مختلف فوجی اور سول آمریتوں کے زیرِ اثر سرکاری سیکورٹی ایجنسی کے طور پر اپنے بنیادی کردار سے مکمل طور پر ہٹ کر سیاسی اور جفا شعار ادارہ بن گئی تھی۔ دشمن کے ایجنٹ یا جاسوس کو اتفاقیہ طور پر قابو کر لینا خارج از امکان نہیں تھا، لیکن اس کا اصل نشانہ زیادہ تر سیاسی حریف ہی رہے۔

برطانوی دور میں سپیشل برانچ سی آئی ڈی کا حصہ یعنی اس کا ایک سیکشن تھا جو امن عامہ پر سیاسی، فرقہ وارانہ، کسانوں کی تنظیم، محنت کشوں، طلبا اور خصوصی مفاد کے حامل دیگر گروپوں کے اثرات کا جائزہ لیتا اور ان کے بارے میں رپورٹیں پیش کرتا تھا۔ کرائم برانچ دوسرا سیکشن تھا جو منظم جرائم کا پتہ چلانے اور ان کی روک تھام کرنے کا ذمہ دار تھا۔

سی آئی ڈی کی سپیشل برانچ دشمن کے جاسوسوں، تخریب کاروں، دہشت گردوں اور شرپسندوں پر بھی نظر رکھتی تھی جو امن و سلامتی کے لیے خطرہ کا سبب بن سکتے تھے۔ یہ انتہائی اہم شخصیات (VVIPs) نیز اہم عمارات کی سلامتی کو لاحق خطرات کی بابت خفیہ معلومات اکٹھی کرتی اور ضروری حفاظتی اقدامات کرتی تھی۔ بہر حال سی آئی ڈی کے فرائض کا چارٹر خاصا لمبا چوڑا تھا جس میں بہت سی دوسری ذمہ داریاں بھی شامل تھیں۔ اسے عام طور پر ''حکومت کی آنکھیں اور کان'' قرار دیا جاتا تھا۔ وہ بروقت اقدامات تجویز کرتی تھی تاکہ مخصوص مفادات رکھنے والے گروپ اور دشمن قوتیں امن و امان کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ تحریکِ آزادی کے دوران اس ایجنسی نے بہت بری شہرت حاصل کر لی تھی اور یہ داغ آج بھی اس کے دامن سے وابستہ ہے۔

بعد ازاں برطانیہ میں سی آئی ڈی کو سپیشل برانچ کا نام دے دیا گیا تو پچاس کی دہائی میں پاکستان، بھارت، سری لنکا اور برطانیہ کی دیگر نوآبادیوں میں بھی وہی نام رکھ دیا گیا۔

سپیشل برانچ کے ذمے عام طور پر وہی ذمہ داریاں رہیں البتہ کرائم برانچ کو اس سے علیحدہ کر کے اسے منظم جرائم، تخریب کاری، دہشت گردی، وحشیانہ جرائم اور ریاست کی سلامتی کے لیے خطرہ بننے والے جرائم کے متعلق خفیہ معلومات حاصل کرنے اور ان کی تفتیش کرنے کا کام سونپ دیا گیا۔ ان کے درمیان ذمہ داریوں کی تقسیم کے نتیجہ میں سپیشل برانچ اور کرائم برانچ کو جداگانہ حیثیت دے دی گئی۔ نیز انٹیلی جنس اور مخالف انٹیلی جنس کے مابین رابطہ ختم کر دیا گیا۔ اب ان برانچوں کے مابین مؤثر رابطہ صرف اس صورت

میں ممکن ہے جب آئی جی کے پاس ان کے لیے خاطر خواہ وقت ہو جو ان کے پاس کبھی نہیں ہوتا' خواہ وہ کتنا ہی قابل اور بااثر کیوں نہ ہو۔

ریاست کے خلاف منظم جرائم کا سرغ لگانے اور روک تھام کرنے کے لیے ایک جامع انٹیلی جنس نیٹ ورک اور بروقت کارروائی کی ضرورت تھی۔ آپس میں رابطہ اور باہمی عمل کا اختیار صحیح اور بروقت کارروائی کے لیے ناگزیر تھا۔ سی آئی ڈی چیف سے وہ اختیار متبادل کمانڈ تخلیق کیے بغیر واپس لے لیا گیا۔ یوں کرائم برانچ محض انسپکٹر جنرل کا پولیس سٹیشن بن کے رہ گئی جس کے پاس نہ مطلوبہ امدادی عملہ تھا نہ وسائل۔ حقیقت میں اس کی حالت پولیس سٹیشن سے بھی بدتر تھی جہاں کارکردگی کا ایک جامع نظام معہ ریکارڈ اور اتھارٹی موجود ہوتا ہے۔ کرائم برانچ کے پاس ابتدائی اختیارِ سماعت نہیں ہوتا' محض آئی جی کی ظاہر اور مخفی اتھارٹی ہوتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ محض ایسے عام مقدمات کے لیے تفتیشی ایجنسی بن گئی جو آئی جی کی طرف سے بھیجے جاتے تھے۔ دوسری طرف سپیشل برانچ کی حیثیت فقط رپورٹنگ ایجنسی کی رہ گئی جس کے پاس نہ پیش قدمی کرنے کے اختیارات تھے نہ ساز و سامان۔ یوں دونوں برانچوں کی کارکردگی خراب سے خراب تر ہو گئی کیونکہ انہیں الگ الگ کرتے وقت کسی نے نتائج و مضمرات کو پیش نظر نہیں رکھا تھا۔

1958ء میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد سپیشل برانچ کا کردار مکمل طور پر تبدیل کر دیا گیا۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی اور سیاستدان ملک دشمن قرار پائے۔ سپیشل برانچ نے اپنی تمام تر توجہ مارشل لا کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں پر مرکوز کر دی۔ دیگر تمام ذمہ داریاں بے وقعت ہو گئیں۔ سیاسی جماعتوں کا معلومات اکٹھی کرنے اور انٹیلی جنس کا اپنا نظام تھا جبکہ فوجی حکومت کا سارا انحصار نوکر شاہی کے ذرائع پر تھا۔ اس طرح سپیشل برانچ کو مارشل لا کے ایک ونگ میں تبدیل کر دیا گیا اور اس کے کردار میں بنیادی تبدیلی آ گئی۔ وہ سرکاری سیکورٹی تنظیم کی بجائے سیاسی سنسر کا ادارہ بن گئی۔

بعد کی فوجی حکومتوں نے سپیشل برانچ کے سیاسی رول پر زیادہ زور دیا' اسے تقویت پہنچائی اور سیاستدانوں پر مظالم ڈھانے والی ایک ایجنسی بنا دیا۔ یہ برانچ سیاستدانوں کی تقریریں ہمیشہ ریکارڈ کرتی رہی ہے تاکہ اگر وہ قابلِ اعتراض الفاظ استعمال کریں تو ان کے خلاف کارروائی کی جا سکے۔ اس کے علاوہ ناپسندیدہ سیاستدانوں اور دانشوروں کے مقالات' نظموں' کتابوں اور اخباری بیانات کی چھان بین کرتی تھی۔ خطرناک سیاسی مجرموں کو شاہی قلعہ (لاہور) میں نظر بند رکھا جاتا تھا اور سپیشل برانچ کے تربیت یافتہ

ماہرین ان سے پوچھ گچھ کرتے تھے۔

اب سوال پیدا ہوا کہ مارشل لا اٹھا لینے کے بعد کسے نشانہ بنایا جائے؟ قدرتی بات ہے کہ مخالف سیاستدان ہی نشانہ بن سکتے تھے۔ ملک کے حقیقی دشمنوں، دہشت گردوں اور دشمن ممالک کے تخریب کاروں کو اس لیے اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ سیاستدانوں کو آسانی سے گرفتار کیا جا سکتا ہے جبکہ جاسوس جُل دے کر بچ نکلتے ہیں۔ آرام طلب پولیس افسران ہمیشہ بیٹھی ہوئی فاختاؤں کو پکڑ کر اپنی کارکردگی کو چار چاند لگاتے ہیں۔ وہ دشمن کے ایجنٹوں کو پکڑنے کے پیچیدہ اور مشکل کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔

میں نے زیادہ مشکل کام کرنے کا تہیہ کر لیا۔ میری اوّلین ترجیح یہ تھی کہ "خاد" "را" اور "کے جی بی" کے تخریب کاروں پر ہاتھ ڈالا جائے جو جنگِ افغانستان کے باعث بڑے سرگرم تھے اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے سیاسی میدان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا بلکہ ان سیاسی افراد پر کڑی نظر رکھی جو امن عامہ کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔

میں نے مرحلہ وار پروگرام کے تحت اسپیشل برانچ کا رخ صحیح سمت میں موڑنے اور اس کا کردار تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا تا کہ اس کا امیج بہتر ہو سکے۔ یہ بہت مشکل ہدف تھا۔ لیکن میں نے اسے صبر و استقامت اور مسلسل محنت سے حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ نواز شریف نے بے نظیر کی دھماکہ خیز واپسی کے معاملہ کو جس تحمل اور دانشمندی سے ہینڈل کیا، اسے دیکھ کر ان پر میرا اعتماد مزید پختہ ہو گیا تھا۔ اس اعتماد میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا جب انہوں نے میرے آنے سے پہلے ہی شاہی قلعہ میں قائم سپیشل برانچ کا سیل بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ میرے پیشرو نے انہیں اس سے باز رکھنے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔ وزیرِ اعلیٰ کے دور اندیشی پر مبنی اس قسم کے فیصلوں سے مجھے یہ حوصلہ ملا کہ سپیشل برانچ کی اصلاح اور تنظیم کرنی چاہیے۔

میں نے نواز شریف کے ساتھ بحیثیت ایڈیشنل آئی جی پہلی باقاعدہ میٹنگ میں ہدایات مانگیں تو پتہ چلا کہ وہ سپیشل برانچ کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں رکھتے۔ کسی دوسرے سیاستدان یا حکمران کی طرح ان کا خیال بھی یہی تھا کہ سپیشل برانچ کا کام مخالف سیاستدانوں نیز اپنی پارٹی میں موجود باغیوں پر کڑی نظر رکھنا ہے۔ یہ بات قابلِ فہم تھی کیونکہ کئی عشروں سے یہی دستور چلا آ رہا تھا۔

بہر حال ان کے اخلاقی اور مذہبی رویوں سے میری حوصلہ افزائی ہوئی جو ظاہر کرتے تھے کہ ان

کے اندر صحیح کام کرنے کی صلاحیت موجود ہے بشرطیکہ اسے صحیح تناظر میں پیش کیا جائے۔ مثال کے طور پر وہ اس بارے میں بڑے سرگرم تھے کہ پولیس تشدد کے مراکز شاہی قلعہ (سپیشل برانچ) اور حویلی دھیان سنگھ (سی آئی اے سنٹر) فوری طور پر بند کر دیئے جائیں۔ ان کے خیال میں قلعہ کی کوٹھڑیاں انتہائی مکروہ اور نفرت انگیز بن چکی تھیں۔ انہیں بند کرنا حکومت کی نیک نامی کا موجب بن سکتا تھا۔ لیکن میرے نزدیک عمارتوں سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات حکومت اور پولیس کے رویّہ وطرزِ عمل میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ سپیشل برانچ کے عملہ کو عارضی طور پر ایوانِ تجارت روڈ (سابق ریس کورس روڈ) پر واقع وسیع و عریض عمارت دے دی گئی جو کسی زمانہ میں برطانیہ کے ڈپٹی ہائی کمشنر کی رہائش گاہ تھی' بعد ازاں وہاں ایل ڈی اے کا دفتر آ گیا اور آج کل چلڈرن کمپلیکس اور نظامت کتب خانہ جات عامہ کے دفاتر ہیں۔

میں نے اگلی ملاقات میں ان سے معلومات اور انٹیلی جنس کی بابت ان کی ترجیحات دریافت کیں۔ انہوں نے میری ذات اور صلاحیتوں پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور کہا کہ میں انہیں تمام متعلقہ مسائل سے باخبر رکھنے کے لیے اپنی بہترین کوششیں جاری رکھوں۔ انہوں نے بڑی بے تکلفی سے بتایا کہ وہ مجھے زیادہ گہرائی سے نہیں جانتے' لیکن ہوم سیکرٹری (حاجی اکرم) نے میرے بارے میں بڑے وثوق سے کہا اور ہر طرح کی ضمانت دی تھی' اس لیے میں متعلقہ مسائل پر ان سے تبادلہ خیال کر لیا کروں۔

اس کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''آپ کے خیال میں کون سے شعبے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں؟''

''امن و امان' خصوصاً خاد اور را کے ایجنٹوں کی طرف سے دہشت گردی کی وارداتیں اور بم دھماکے۔ اگر اس محاذ پر معاملات کنٹرول سے باہر ہو گئے تو نہ صرف ملک کی سلامتی خطرہ میں پڑ جائے گی بلکہ اپوزیشن بھی اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ بات ہے تو اسے اپنی اولین ترجیح سمجھیں اور اس قسم کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہونا چاہیے ورنہ میں تمہیں ذاتی طور پر ذمہ دار سمجھوں گا۔'' انہوں نے یہ بات ایسے حاکمانہ انداز میں کہی کہ مجھے ان کا وہ انداز اچھا نہیں لگا۔ میں نے اپنے دل میں کہا شاید میں نے خواہ مخواہ اپنے لیے مصیبت کھڑی کر لی ہے۔ میں نے فیڈرل سیکورٹی سیل کی معلومات اور تجربہ کی بنیاد پر بڑے تحمل کے ساتھ پس منظر بیان کیا اور اس بات پر زور دیا کہ اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے پوری انتظامی مشینری کو حرکت میں لایا جائے۔ سپیشل برانچ ایسے خطرات کا

کھوج لگانے اور جوابی اقدامات تجویز کرنے کا بنیادی تاہم محدود کردار ادا کرتی رہے گی۔ سراغ لگانے پر مبنی جامع رپورٹ تیار کی جائے جس میں مسائل کی نشاندہی کی گئی ہو اور ان کا حل تجویز کیا گیا ہو۔

بعدازاں میں نے وزیرِاعلیٰ کے ساتھ اپنی بات چیت کے بارے میں انسپکٹر جنرل ایس ڈی جامی کو بریف کیا۔ انہیں امن وامان کو سب سے بڑا مسئلہ قرار دینے کی بات پسند نہیں آئی۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ ان کی (آئی جی کی) ذات پر نکتہ چینی کے مترادف تھا۔ میں نے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا مگر وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ میری مخلصانہ اور دیانت دارانہ کوشش تھی کہ ان کے اور میرے درمیان مستقل غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ بہر حال میں اپنے مؤقف پر قائم رہا کیونکہ میں نے سپیشل برانچ کو راہِ راست پر لانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

میں نے وزیرِ اعلیٰ کے حسبِ ہدایت سٹریٹجی پر مبنی مقالہ کی تیاری شروع کر دی اور انتہائی نازک شعبوں کی فہرست بنانے لگا جہاں قومی سلامتی معرضِ خطر میں تھی۔ میرے خیال میں جغرافیائی وسیاسی اور علاقائی جہتوں کو دہشت گردی سے لاحق خطرہ سب سے زیادہ توجہ کا مستحق تھا۔ جو افغانستان کی لڑائی اور ایران' عراق جنگ کا نتیجہ تھا اور انڈیا بھی اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ دوسرا مسئلہ وحشیانہ جرائم کا منظم انداز میں وقوع پذیر ہونا تھا۔ یعنی مہلک ہتھیاروں اور خطرناک منشیات کی خلاف قانون روز افزوں درآمد جو پورے معاشرتی نظام کو بری طرح درہم برہم کر رہی تھی۔

اس کے علاوہ فرقہ وارانہ منافرت نے بہت زیادہ شدت اور سنگینی اختیار کر لی تھی جو امنِ عامہ کو تباہ کر سکتی تھی۔ سیاسی میدان میں محنت کشوں اور طلبا کے محاذ پر پائی جانے والی تلخی وکشیدگی اگرچہ سیاسی سرگرمیاں شروع ہونے سے قدرے کم ہو گئی تھی' تاہم طویل مارشل لا کا مکروہ ورثہ سنگین معاشرتی مسئلہ کے طور پر اب بھی موجود تھا۔

دوسرے قابلِ توجہ شعبوں کی فہرست خاصی طویل تھی۔ میں نے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے مخصوص انسدادی تدابیر اور حکمتِ عملی بھی تجویز کی۔ علاوہ ازیں پولیس کی خامیوں اور کمزوریوں کا بھی تنقیدی جائزہ لیا جن کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اس معاملہ میں عرصۂ دراز تک غفلت برتی گئی۔ ان میں فنڈز کی کمی' تربیت میں خامی اور ساز وسامان کی شدید قلت نمایاں مسائل تھے۔ سنگین چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے ٹرانسپورٹ اور مواصلات کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ انتظامی امور کی عمومی صورتِ حال کو اختصار

سے بیان کرنے کے بعد میں نے آئی جی کا لحاظ کرتے ہوئے خود کو سپیشل برانچ کے معاملات تک محدود رکھا تاکہ غلط فہمی مزید نہ بڑھے۔

مقالے میں سپیشل برانچ کی تنظیمِ نو کے مختلف پہلو بھی بیان کیے گئے تھے۔ عمارات' ٹرانسپورٹ اور مواصلات وغیرہ کے لیے اصلاحی تجاویز کے علاوہ برانچ کو جدید خطوط پر ڈھالنے کی ضرورت پر بطورِ خاص زور دیا گیا تھا۔ یہ بات بڑی افسوس ناک اور حیرت انگیز تھی کہ پنجاب کی سپیشل برانچ جیسی اہم خفیہ اور سیکورٹی تنظیم کے پاس 1986ء تک زیادہ ترقی یافتہ آلات مثلاً ویڈیو کیمرا' فیکس یا پرسنل کمپیوٹر وغیرہ تو بڑی دور کی بات ہے' عام ریڈیو ٹیپ ریکارڈر یا خاموش کیمرہ بھی نہیں تھا۔

سپیشل برانچ کے پاس قدیم ترین ہونے کے باوجود جدید ترین حربہ تشدد اور ہراسمنٹ کے ذریعے اختیارات کا جابرانہ استعمال ہی تھا۔ اس ایجنسی کی ترقی اس وقت بند ہوگئی جب وہ ظالمانہ نظام کی لونڈی بن گئی۔ وہ ریاستی سلامتی کو لاحق خطرات سے نمٹنے کے لیے مطلوبہ لگن اور اہلیت دونوں سے محروم تھی۔ اس کی ساری توجہ سیاستدانوں پر مرکوز تھی جو ایک آسان ٹارگٹ تھا۔ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کو چھپانے کے لیے اخبارات میں شائع شدہ مواد "سیکرٹ" (خفیہ) کے الفاظ لکھ کر اور فائلوں میں رکھ کر پیش کر دیا جاتا تھا۔ واحد اضافہ جو مشاہدہ میں آتا وہ اکثر جھوٹی اور من گھڑت رپورٹنگ ہوتی تھی۔

میں نے اپنے مقالے میں سپیشل برانچ میں درج ذیل تین نئے سیکشن قائم کرنے کی تجویز پیش کی:

1- انسدادِ دہشت گردی سیل: جو کافی اور خصوصی طور پر تربیت یافتہ سٹاف پر مشتمل ہو اور دہشت گردی کی روز افزوں وارداتوں پر توجہ مرکوز کر سکے۔

2- سیکورٹی سیکشن: جو اہم شخصیات وعمارات کی سیکورٹی سے نمٹ سکے۔

3- ریسرچ وریفرنس سیکشن: جو تعلیم یافتہ سٹاف پر مشتمل ہو۔ جو دستیاب معلومات کا اپنے بہترین استعمال کے لیے تجزیہ کر سکیں اسے مرتب کر سکیں اور محفوظ رکھ سکیں۔ جو محض پیش گوئیوں' قیاسات اور ادھوری خبروں پر مبنی کارروائی سے گریز کریں۔

میں نے اپنے طویل تجربہ کے دوران دیکھا کہ حساس عہدوں پر فائز بہت سے حکام چیف ایگزیکٹو کو اس کے اصلی یا فرضی سیاسی مخالفین کے بارے میں انتہائی مخالفانہ مشورہ دیتے تھے تاکہ وہ صحیح اطلاعات کی عدم فراہمی کے سلسلہ میں اپنی نالائقی کو چھپا سکیں۔ وہ اس کے ذہن پر سوار خوف اور وسوسوں سے ڈر کر اس کا دل جیتنے کی کوشش کرتے۔ ایسی چالیں اسے نفسیاتی مریض بنا دیتیں اور اپنے دشمنوں کو

جابرانہ ہتھکنڈوں سے کچلنے پر ابھارتیں۔ قانون کی طرف سے اس طرح کے ردِ عمل کا مظاہرہ کیا جاتا تو وہ ایسی صورتحال میں پھنس جاتا جس سے نکلنا اس کے بس میں نہ ہوتا۔

اس لیے مجھے اس بات پر قطعاً حیرت نہیں ہوئی کہ سپیشل برانچ کے پولیس افسروں نے اپنی محدود وسعت نظر کی بنا پر مجوزہ تبدیلیوں کی حمایت کرنے سے کنی کترائی۔ مجھے اپنے نقطۂ نظر کا حامی بنانے کے لیے خاصی محنت کرنی پڑی۔ واحد استثنا ایس پی تنویر حمید تھے۔ میں خوش نصیب تھا کہ وہ میرے ساتھ کام کر رہے تھے۔ میں نے اپنے نظریات کا سرسری خاکہ ان کے سامنے رکھا اور انہوں نے سٹریٹجی پر مبنی مقالہ لکھنے کا مشقت طلب کام مکمل کر دیا۔

تنویر حمید بعدازاں ڈی آئی جی بنے' وہ بہت بڑے دانشور' ذہین' دانشمند اور دور اندیش افسر تھے۔ اور انسانی' معاشرتی و سیاسی مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ تنویر اپنی ذمہ داری کے شعبہ میں ہونے والی تازہ ترین پیش رفت سے بخوبی آگاہ ہونے کے علاوہ انٹیلی جنس کام کے لیے خاص طور پر موزوں طبیعت رکھتے تھے اور صحیح معنوں میں سپیشل برانچ کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے تھے۔ 1994ء کے وسط میں ان کا اچانک تبادلہ کر کے او ایس ڈی بنا دیا گیا۔ تکنیکی لحاظ سے افسر بکار خاص لیکن اصل میں انہیں ذلیل کرنا مقصود تھا۔ وہ قریباً دس سال سے سپیشل برانچ میں کام کر رہے تھے اور کبھی کہیں جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ انہوں نے اس بے عزتی کو بری طرح محسوس کیا اور وہی ذہنی اذیت (Tension) ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ چنانچہ تھوڑا ہی عرصہ بعد اگست 1994ء میں ملک عدم کو کوچ کر گئے۔ ان کی عمر محض 46 برس تھی۔ پولیس ایک بہت ہی قابل اور دانشور افسر سے محروم ہو گئی۔

ایس پی انتظامیہ حمید اسلم ملک نے جنہیں جدید ٹیکنالوجی سے آگاہی حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا' متعلقہ مواد مثلاً سلائڈز' گراف اور چارٹ حاصل کرنے کے لیے زبردست محنت کی تاکہ ایک مؤثر تمثیل پیش کی جا سکے۔ مجھے اپنے سٹریٹیجک مقالے کو حتمی شکل دینے کے لیے باہر سے مدد لینی پڑی۔ میں نے اپنے انتہائی فاضل اور رہنمائی کے اہل دوست اے حمید کو بلایا۔ انہوں نے برانچ کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی ایک جامع اسکیم تیار کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا۔ اس منصوبہ کو قطعی شکل دینے میں قریباً ایک سال لگ گیا۔

میں نے وزیرِ اعلیٰ کے سامنے ایک جامع اور قائل کرنے والی تمثیل (Presentation) پیش کی۔ اس میٹنگ میں انور زاہد چیف سیکرٹری' حاجی اکرم ہوم سیکرٹری اور ایس ڈی جامی' آئی جی بھی شریک ہوئے۔ میاں صاحب نے کسی ترمیم کے بغیر پوری اسکیم کی منظوری دے دی۔

سپیشل برانچ کی تنظیمِ نو

وزیرِاعلیٰ نے میرے دوست محمد عبدالحمید کا (جن کا ذکر اس کتاب میں اے حمید کے طور پر کیا گیا ہے) نئے قائم شدہ ریسرچ اینڈ ریفرنس سیکشن کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے تقرر بھی منظور کر لیا۔ میں اس بات کا قائل تھا کہ سب سے کٹی ہوئی یعنی الگ تھلگ اور اندر کی طرف دیکھنے والی سپیشل برانچ کو باہر کے ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو جدید اور غیر متعصّبانہ اندازِ فکر رکھتا ہو اور اس کے فرسودہ آپریشنز میں اہم تبدیلیاں متعارف کرا سکے۔ اے حمید بظاہر نظر انداز کردہ مسائل پر تنقیدی نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اہم مسائل کا مؤثر عملی اور اس کے ساتھ ساتھ اقتصادی لحاظ سے کم خرچ حل پیش کرنے میں بھی ماہر تھے۔ جدید ترین دفتری ٹیکنالوجی کے متعلق ان کا وسیع علم برانچ کی تنظیم نو کرنے اور اسے جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں بہت مددگار ثابت ہوا۔

انہوں نے ٹیلی کمیونیکیشنز سے کام کا آغاز کیا۔ 1987ء میں فیکس مشین پر کام کی ابتدا واقعی کسی انقلاب سے کم نہ تھی۔ جس کی بدولت علاقائی دفتر سے روزمرّہ رپورٹوں کی ٹرانسمشن پر ٹیلی فون کالوں کی صورت میں اٹھنے والے بھاری اخراجات بہت ہی کم ہو گئے۔ اگرچہ یہ ٹیکنالوجی ڈیڑھ سو برس پیشتر ایجاد ہوئی تھی اور مغرب میں فیکس مشین 25 سال سے زیرِ استعمال تھی لیکن ہمارے ملک میں بالکل غیر متعارف تھی حتیٰ کہ تجارتی مقاصد کے لیے بھی درآمد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ پابندی 1989ء میں اٹھائی گئی۔ فیکس مشین کی خریداری کے لیے خصوصی منظوری درکار تھی، کسی سرکاری محکمہ میں ایسی نظیر موجود نہیں تھی۔ میں فائل ہوم سیکرٹری کے پاس لے کر گیا تو انہوں نے بڑے تعجب سے پوچھا: ''یہ فیکس مشین کیا بلا ہے؟''

''سچی بات یہ ہے کہ میں خود بھی اس سے واقف نہیں۔ البتہ اس قدر جانتا ہوں کہ یہ میرے دفتر کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوگی۔'' میں نے جواب دیا۔ میری نظر میں ان کا شخصی احترام ٹیکنالوجی سے زیادہ اہم تھا اس لیے فوری منظوری مل گئی۔

الیکٹرانک پی بی ایکس (PBXS) جو انٹرکام فون کے طور پر بھی استعمال ہوتے تھے، صدر اور علاقائی دفاتر میں نصب کیے گئے۔ بعدازاں انہیں لیزڈ لائنوں سے مربوط کر دیا گیا تاکہ فوری اور لامحدود فون کالوں کا سلسلہ قائم ہو جائے اور اس کا سالانہ مقرر کردہ بل ادا کیا جا سکے۔ اس نیٹ ورک کے ساتھ کمپیوٹرز کا رابطہ جوڑنے سے یہ سسٹم مکمل ہو جاتا ہے جو آج کل کی جملہ ضروریات پوری کرتا ہے۔

شخصی کمپیوٹر کو جوان دنوں سرکاری دفاتر میں ایک اور انوکھی چیز سمجھی جاتی تھی، کو بتدریج اور صبر و سکون کے ساتھ دفتری ماحول کا حصہ بنایا گیا۔ چونکہ ہماری واحد ضرورت لفظ کی پراسیسنگ تھی۔ ہم نے رپورٹوں اور بریفس کی تیاری کے لیے رفتار، درستی اور استعداد کار میں خاطر خواہ اضافہ کر لیا۔ سپیشل برانچ حکومت پنجاب کا وہ پہلا دفتر تھا جس میں شخصی کمپیوٹرز استعمال ہوتے تھے، وہ بعدازاں انتہائی کمپیوٹرائزڈ بن گئی۔ اس پر خرچ ہونے والی رقم محض چند لاکھ روپے تھی۔

متعدد دیگر ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کارآمد ساز و سامان خریدا گیا۔ جس میں آڈیو اور ویڈیو ٹیپ ریکارڈر، ساکن اور ویڈیو کیمرے شامل تھے۔ پرانے اور خستہ حال ریکارڈ کو محفوظ کرنے کے لیے ایک مائیکروفلمنگ یونٹ نصب کیا گیا۔ لابریری کو جو بڑی ابتر حالت میں تھی۔ ازسرِ نو منظم کر کے کارآمد ریفرنس سیکشن بنا دیا گیا۔

صدر دفتر کی عمارت میں مرمت اور تزئین و آرائش کا کام ہو رہا تھا۔ جب میں نے اے حمید سے مجوزہ منصوبوں پر ایک نظر ڈالنے کو کہا۔ اگرچہ وہ انجینئر نہیں تھے پھر بھی ایسی تبدیلیاں تجویز کیں جن کی بدولت معمولی اضافی خرچ سے دفتر میں دگنی جگہ بن گئی۔

ان کی طرف سے بار بار تصوّراتی اور اختراعی تجاویز پیش کرنے کے باعث دوسری بہت ساری تبدیلیاں بروئے کار لائی گئیں۔ میں نے آئی جی پولیس بننے کے بعد بھی ان کے علم اور تجربہ سے بھرپور استفادہ کیا۔

انسدادِ دہشت گردی سیل

اس سیل کے لیے میں نے فوج سے مدد مانگی تاکہ اونچی سطح کی انٹیلی جنس میں ان کی مہارت سے استفادہ کیا جا سکے۔ خاصی تگ و دو کے بعد ہمیں ایک انتہائی تعلیم یافتہ اور ٹرینڈ ریٹائرڈ فوجی افسر لیفٹیننٹ کرنل محمد اشرف کی خدمات میسر آ گئیں۔ انہوں نے انٹیلی جنس، کاؤنٹر انٹیلی جنس اور دہشت گردی سے نمٹنے کے متعدد کورس کر رکھے تھے۔ انہیں کنٹریکٹ پر ڈی آئی جی (انسدادِ دہشت گردی سیل) مقرر کر دیا گیا۔ ان کی تقرری بہت ہی فائدہ مند اور کارآمد ثابت ہوئی۔

سیکورٹی سیکشن

سیکورٹی سیکشن کی سربراہی کی ڈی آئی جی کے سپرد کی گئی تھی جس کے ماتحت ایک ایس پی (سروے) اور دیگر سٹاف کا تقرر کرنا تھا جو انتہائی اہم شخصیات و عمارات کی سیکورٹی کو درپیش خطرات کا تجزیہ کر کے حسبِ ضرورت تدابیر بروئے کار لا سکے۔

ٹریننگ اسکول اور مستقل عملہ

سپیشل برانچ کے سٹاف کو ان کے مخصوص اور حساس فرائض کے باوجود پولیس کے عام کیڈر والی تربیت دی جاتی تھی۔ اس لیے ان کی خاطر ایک جداگانہ سکول کا قیام ناگزیر ہو گیا تھا۔ چونکہ سٹاف کو اپنی وسعت نظر اور عملی اقدام کے لیے مہارت کو بہتر بنانے کی خاطر طویل عرصہ قیام کرنا پڑتا تھا۔ پس تجویز کیا گیا کہ ان کی خدمات عارضی بنیادوں پر ضلع پولیس سے مستعار حاصل کرنے کی بجائے نچلے سٹاف کا 75 فیصد براہ راست بھرتی کر لیا جائے جو مستقلاً سپیشل برانچ میں رہیں (باقی 25 فیصد حسبِ سابق ڈیپوٹیشن پر منگا لیے جائیں) یہ دونوں تجویزیں منظور کر لی گئیں۔ بجٹ کی مختلف مدّات پر نظر ثانی کر کے۔ ان کی وضاحت کی گئی اور بجٹ میں اضافہ کر دیا گیا۔

انسدادِ دہشت گردی سیل اور سپیشل برانچ سکول کے لیے چوہنگ (نزد لاہور) میں ایک وسیع کمپلیکس کی تعمیر شروع کی گئی جس میں دفتر اور رہائش کے لیے مطلوبہ عمارتیں ہوں گی۔ سکول میں جدید ترین ساز و سامان اور سہولتیں مہیا کی جائین گی۔ تاکہ سٹاف کو سارے ہنر اور طریقے بشمول فوٹو گرافی' مواصلات' درست نشانہ بازی' ہتھیاروں کے بغیر لڑائی نیز فیکس مشین اور کمپیوٹر کا استعمال سکھایا جا سکے۔ انٹیلی جنس بیورو اور آرمی سکول آف انٹیلی جنس کے ساتھ تفصیلی صلاح مشورہ کے بعد بڑی محنت سے سلیبس کو بہتر بنایا گیا۔ کرنل اشرف' میجر قدیر' آفتاب سلطان اور چوہدری محمد اشرف مارتھ نے تربیتی اسکول کو ترقی دینے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

صورتِ حال کے بارے میں روزمرّہ رپورٹ

میرے سیکورٹی پر بہت زیادہ زور دینے کے باوجود سیاسی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا کیونکہ ان کا امنِ عامہ پر سب سے زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اس بارے میں فیلڈ سٹاف معلومات اکٹھی کرتا اور معمول کے مطابق صدر دفتر کو بھیج دیتا تھا (ہم سیاسی تنقید کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیتے تھے کیونکہ اس سے

حکمرانوں کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے امکانات بڑھ جاتے تھے) بہرحال غلّے کو بھوسے سے الگ کرنے کے لیے روزمرہ رپورٹ کا حجم اوسطاً 65 صفحات سے گھٹا کر صرف 15 صفحے کر دیا گیا جس میں صرف وہ امور درج کیے جاتے جو سیکورٹی کے نقطۂ نظر سے زیادہ اہم ہوتے اور امن و امان سے تعلق رکھتے۔ رپورٹ کی زبان بھی انگریزی کی بجائے اُردو کر دی گئی تاکہ وہ وقت اور توانائی بچ سکے جو ترجمہ کرنے میں صرف ہوتی تھی اور اس تکلیف دہ مسئلہ سے نجات مل سکے جو سٹاف میں اچھے مترجموں کی گھٹتی ہوئی تعداد کے باعث پیدا ہو گیا تھا۔ اے حمید نے انگریزی کی بجائے اُردو اختیار کرنے سے متعلق بہت سے ادارتی اور تخلیقی مسائل حل کر دیئے۔ انہوں نے ایک نیا اور جدید لے آؤٹ بھی متعارف کرایا جس سے روزمرّہ رپورٹ کی جلد تیاری اور اسے آسانی سے پڑھنا ممکن ہو گیا۔

انتظامی بدنظمی پر توجہ

وزیرِ اعلیٰ بلکہ آئی جی کے اردگرد پائے جانے والے لوگوں نے بھی انہیں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ مجھے روزانہ پانچ مرتبہ ان سے ملنا اور اس وقت تک کی موصول شدہ رپورٹیں پہنچانا پڑتی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر غیر اہم ہوتی تھیں۔ میں نے اس بے مقصد اور لاحاصل مشق سے تنگ آ کر ان کے ساتھ ایک خصوصی ملاقات کی۔ اور انہیں وضاحت سے بتایا کہ تعداد میں بہت زیادہ اور ادھوری خبریں چیف ایگزیکٹو کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ وہ انتظامی گڑبڑ اور غلط احکام کو واپس لینے کا سبب بنتی ہیں جس کے نتیجہ میں بحران اور انتشار جنم لیتا ہے۔ چیف منسٹر کسی بھی طور آپریشنل آفیسر نہیں ہوتا۔ اسے محض پالیسی ساز فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ اسے قیامِ امن کے سلسلے میں کیے جانے والے روزمرّہ اقدامات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ موقع پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سب سے سینئر افسر ہوتا ہے اسے آپریشنل فیصلے کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ ورنہ فیلڈ افسران پہل کرنا چھوڑ دیں گے اور چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے بھی سب سے اعلیٰ افسر مجاز کی منظوری کے منتظر رہیں گے۔ میاں صاحب نے میری بات سے اصولی طور پر تو اتفاق کر لیا تاہم صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ بات ان کے دل کو نہیں لگی۔

''نواب آف کالاباغ ایک اچھے ایڈمنسٹریٹر تھے۔ وہ بہت زیادہ باخبر رہتے تھے۔ انہیں اس بات کی خبر بھی مل جاتی تھی کہ فلاں افسر کے باورچی خانہ میں کیا پک رہا ہے؟'' انہوں نے کہا:

''ان کی کامیابی کا سبب یہ نہیں تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

"ان کی اصل خوبی یہ تھی کہ وہ افسروں کی اچھی طرح چھان بین کے بعد پوسٹنگ کرتے تھے اور پھر ان پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔ حد سے زیادہ خبریں اکٹھا کرنا، عیاری پر مبنی اقدام لگتا ہے۔ جس سے آپ کے اور آپ کے سینئر افسران کے مابین اعتماد کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ آپ انہیں ہدایت کریں کہ امنِ عامہ قائم رکھنے کے لیے قانون اور مقررہ طریقِ کار پر عمل کریں۔ تیز طرار لوگ ایسی صورت میں بھی آپ کو چھوٹے موٹے فیصلوں میں الجھانے کی کوشش کریں گے تا کہ وہ خود ذمہ داری سے بچ سکیں۔ انہیں ایسے معاملات کے لیے وقت نہ دیں۔ براہ کرم آپ صرف پالیسی کے بارے میں فیصلے کریں۔ اس طرح آپ ممکن حد تک دانشمندانہ پالیسی پر عمل کر سکیں گے۔ جونیئر حکام نے اپنے غیر ضروری ردِ عمل سے جو اشتعال پیدا کر دیا ہے۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو جائے گا' پھر آپ سکون کے ساتھ آگے بڑھ سکیں گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ میری تجویز ان کے دل میں اترتی جا رہی تھی، تاہم وہ ضرورت کی بجائے تجسس کے تحت اس بات پر اصرار کیے بغیر نہ رہ سکے کہ انہیں سیاستدانوں اور افسروں کے متعلق اچھی طرح باخبر رکھا جائے۔ اس ملاقات کے بعد وزیرِ اعلیٰ کی طرف سے بار بار ٹیلی فون کالوں کا سلسلہ گھٹتے گھٹتے برائے نام رہ گیا۔

سیاستدانوں کا تعاقب بند کر دیں

"آپ ان بدشکل پک اپ گاڑیوں کو سیاستدانوں کے تعاقب میں کیوں دوڑاتے ہیں؟" ایک دن وزیرِ اعلیٰ نے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے جواب دیا: "سر اس کا مقصد ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا اور ان کی سلامتی کو یقینی بنانا ہوتا ہے۔ یہ دستور عرصۂ دراز سے چلا آ رہا ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی عملی فائدہ نہیں۔ یہ اس شخص کو مشتعل کرنے والی بات ہے جس کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ وہ سراسر کسی نجی کام کے لیے جا رہا ہو' مثلاً "کسی محبوبہ سے ملنے کے لیے۔"

وہ مسکرائے اور بولے:

"چوہدری صاحب' کوئی شریفانہ طریقہ اختیار کریں' یہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

میں نے ان کی ہدایت پر حرف بحرف عمل کیا۔ اہم اور مخالف سیاستدانوں کی جامد اور متحرک دونوں طرح کی نگرانی کی جاتی تھی۔ میں نے اس برہم کرنے والے بھونڈے طریقے کو ختم کرنے کے

اقدامات کیے جو برطانوی دور سے چلا آ رہا تھا اور فوجی حکومتوں نے اسے اور بھی زیادہ جارحانہ وسفا کانہ انداز میں استعمال کیا تھا۔

سب سے پہلی نگرانی جو میں نے ختم کی وہ راؤ رشید سابق آئی جی (پنجاب) کے گھر کی تھی۔ انہوں نے اپنے دوست ملک وارث (ریٹائرڈ ایس پی) کے ذریعے مجھ سے رابطہ کر کے نگرانی بحال کرنے کو کہا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ''اپنے مکان کے باہر سپیشل برانچ کے آدمیوں کی موجودگی میں میں خود کو چوروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ تصور کرتا ہوں۔'' یہ سن کر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ واحد مقصد تھا جو اتنے بھاری خرچ سے حاصل کیا جا رہا تھا۔

پیشتر ازیں جب میں نے اپنے افسران کو راؤ رشید کے گھر کی نگرانی ختم کرنے کی تجویز پیش کی تو انہیں اس قدر ناگوار گزرا گویا ایسا کرنے سے آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ ایک ایس پی نے کہا کہ ''سر! اسے انتہائی خطرناک آدمیوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے' جنرل ضیا نے ذاتی طور پر ہدایت کی تھی کہ اس پر کڑی نظر رکھی جائے۔''

میں نے اس سے پوچھا:

''کیا آپ کو اس نگرانی کے ذریعے اس کے کسی خطرناک اقدام کا پتہ چلا؟''

''نہیں' ٹھیک طور پر نہیں۔'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔

پھر بولے: ''اگر نگرانی نہ کی جاتی تو ممکن ہے کچھ کارروائی کر گزرتا۔''

''ہمیں محض قیاس آرائی سے کام نہیں لینا چاہیے اور اپنے کمیاب ذرائع ایسے کاموں پر ضائع نہیں کرنا چاہئیں۔ ہمیں سیاستدانوں کو ہراساں کرنے کی بجائے تخریب کاروں کا سراغ لگانا چاہیے۔ جو بم دھماکے کرتے اور لوگوں کو ہلاک کرتے ہیں۔'' میں نے انہیں سمجھایا۔

راؤ رشید کے گھر سے پہرہ ہٹانے کے بعد میں نے ان کے گھر میں ایک باورچی رکھوا دیا جو ان کے لیے بھی اور میرے لیے بھی بڑا مفید ثابت ہوا۔

میں نے عملی طور پر جامد اور متحرک ہر قسم کی نگرانی ختم کرا دی۔ اس پر بہت سے سیاستدانوں کو جو اس کے عادی ہو گئے تھے' حیرت ہوئی۔ ایک دن پی ڈی پی کے چوہدری محمد ارشد میرے دفتر میں آئے اور پوچھا کہ ''نوابزادہ نصر اللہ کی رہائش گاہ (32 نکلسن روڈ) سے 'دوستوں' کو کیوں ہٹا لیا گیا ہے؟''

''کیونکہ نواز شریف کو نوابزادہ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے

جواب دیا۔

''وہ ملک کے سب سے زیادہ ذہین اور تجربہ کار سیاستدان ہیں' آپ کو ان کی طرف سے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔'' چوہدری نے اسی لہجہ میں جواب دیا۔

''ہم صرف پاکستان دشمن تخریب کاروں کی نگرانی کرتے ہیں۔ میاں صاحب شاندار روایات کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور ایسی مکروہ کارستانیوں کو ختم کرنے کے خواہاں ہیں۔ نوابزادہ سے ملک کو کوئی خطرہ نہیں۔''

میں نے دیانتداری اور خلوصِ نیت سے ان پر اصل پوزیشن واضح کر دی۔

''یہ فضول بات میرے دل کو نہیں لگتی۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کے علاوہ بھی لازماً کوئی وجہ ہوگی جس سے آپ یقیناً آگاہ ہونگے۔'' پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ ''ہم اچھے دوستوں اور کارکنوں سے محروم ہوگئے۔ آپ کے ملازم بہت کار آمد تھے۔ ہم ان کے ہاتھ ہوٹل سے چائے اور کھانا منگوا لیتے تھے۔ پھر بے شک وہ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاتے تھے۔ براہ کرم ان میں سے کم از کم ایک کی ڈیوٹی ضرور لگا دیں۔''

جب وہ دوبارہ ملے تو نوابزادہ صاحب کا قول سنایا کہ ان کے مطابق ''چوہدری سردار تیز سیاسی ذہن رکھتے ہیں۔'' اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں ہر ایک کی نظروں میں سیاستدان بن گیا تھا۔ کیونکہ میں نے ایک پرانی انتظامی برائی ختم کر دی تھی۔ سپیشل برانچ کی طرف سے کسی سیاستدان کی نگرانی کو پیشہ ورانہ کام سمجھا جاتا تھا جبکہ نگرانی کو ہٹا لینے یا کسی سیاسی معاملہ میں مداخلت نہ کرنے کو ''سیاسی چال'' قرار دے دیا گیا۔ ایک پرانا دستور اپنے طور پر قابلِ قبول بن جاتا ہے۔ خواہ اسے تقدّس حاصل نہ ہو۔ شاید اپوزیشن کے ہاتھ سے نکتہ چینی کا ایک اہم نکتہ چھین لیا گیا تھا۔

اگر حکومت شائستگی اختیار کر لے تو وہ اس پر کس طرح نکتہ چینی کر سکتے ہیں؟

شروع شروع میں شاہی قلعہ میں سپیشل برانچ کی سب جیل کے خاتمہ پر بھی شک ظاہر کیا گیا۔ جب نواز شریف نے بعض عمدہ روایات قائم کرنے کی کوشش کی تو اپوزیشن کو آمرانہ حکومتوں کے تلخ تجربہ کے پیش نظر جو سچائی کی بجائے جھوٹے ہتھکنڈوں پر انحصار کرتی تھی' یقین نہیں آیا۔ میں نے چوہدری ارشد کو ان کا اپنا قول یاد دلایا جسے وہ اکثر دہرایا کرتے تھے کہ ''سچائی ہمیشہ فتح مند ہوتی ہے۔'' وہ بولے: ''آیئے

دیکھتے ہیں۔"

ناجائز دباؤ کے حامی

صحت مند رجحانات کے ساتھ ساتھ نواز شریف پر بعض منفی اثرات بھی کام کر رہے تھے۔ ایسے لوگ موجود تھے جو انہیں نواب آف کالا باغ اور مصطفیٰ کھر کی طرح سخت اور جابرانہ اقدامات کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ ان کا مشورہ تھا کہ مخالفین کے کمزور پہلوؤں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اور خبریں حاصل کر کے انہیں بلیک میل کیا جائے۔ جھوٹے مقدمے بنا کر ان پر دباؤ ڈالا جائے اور تھانوں نیز جیلوں میں تشدد کر کے ہراساں کیا جائے۔ پنجابیوں کو قابو میں رکھنے کا بس یہی طریقہ ہے۔ پنجاب کی یہی تاریخ اور مزاج ہے۔ حاجی اکرم، ڈاکٹر صفدر محمود اور چوہدری سردار کے مشورے ردی میں ڈالنے کے قابل ہیں۔ حاکم کی شرافت کو کمزوری سمجھا جاتا ہے۔"

مجھے بتایا گیا کہ پنجاب کی قریباً نصف کابینہ نے خالصتاً سیاسی اجلاسوں میں اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا تھا۔ سول اور پولیس کے بعض انتہائی سینئر افسروں نے بھی نواز شریف کو ایسا ہی مشورہ دیا۔ مارشل لا دور کے کچھ سرکردہ افراد نے بھی یہی نسخہ تجویز کیا۔ وزیر اعلیٰ پر بہت زیادہ دباؤ تھا کیونکہ وہ ایسی اہم آرا کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے لاہور ایئر پورٹ پر بعض وزرا کی موجودگی میں سپیشل برانچ کی خراب کارکردگی پر غصے اور عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ گو مجھے وہ طریقہ ناگوار گزرا۔ تاہم دور اندیشی سے کام لیا اور انہیں یقین دلایا کہ زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر کے ان کی توقع پر پورا اترنے کی کوشش کی جائے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ انہیں گمراہ کیا جا رہا ہے۔ جس کا نتیجہ صرف یہ نکلے گا کہ ایک طرف اتحادی اور دوست ناراض ہوں گے اور دوسری طرف سیاستدان۔

اس وقت ایئر پورٹ پر موجود وزرا میں سے ایک مس شاہین عتیق الرحمٰن موجود تھیں جو جنرل عتیق الرحمٰن کی صاحبزادی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "میرے والد کی بطور گورنر کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ بڑی باریکی سے جانتے تھے کہ صوبے میں کیا ہو رہا ہے۔"

میں نے ان سے پوچھا:

"کیا آپ کو معلوم ہے ان کی آنکھیں اور کان کون لوگ تھے؟"

"نہیں، میں نہیں جانتی۔" انہوں نے قدرے تامل کے ساتھ کہا۔

''تاہم وہ بڑے باخبر تھے۔'' پھر گویا ہوئیں۔

''وہ میں تھا جو مارشل لا ہیڈ کوارٹرز میں ان کے بیکار یا کارآمد ایس پی انٹیلی جنس کے طور پر کام کرتا تھا۔'' میں نے انہیں اور نواز شریف کو بتایا۔

میں سمجھ گیا کہ میں نے اپنے اوپر خطرناک حملہ کے امکان کا رخ موڑ دیا ہے۔ مجھے اُمید تھی کہ نواز شریف ریاستی مشینری کا ظلم و جبر اور دہشت استعمال کرنے کی بجائے اپنی طبعی شرافت اور انصاف پسندی پر عمل پیرا رہیں گے۔ انہیں راہ راست پر رکھنے کے لیے میں نے کہا کہ ''سر آپ نے ایم آر ڈی کے احتجاج کو اپنے ٹھوس اور شائستہ طریقے سے بے اثر بنا کر بہت بڑی کامیابی حاصل کی جبکہ بہت سی حکومتیں بشمول مارشل لا حکومتیں، بری طرح ناکام ہوگئیں۔ براہ کرم ان لوگوں کے مشورہ پر کان نہ دھریں جو ناکام ہو چکے ہیں۔'' وہ میری بات سے بڑی حد تک متفق نظر آئے۔

میں نے اپنی درست رائے پر اصرار کرنے کی بجائے ان کی کارکردگی کو سراہا' تاکہ انہیں حوصلہ ملے اور وہ انصاف نیز رواداری کی راہ پر گامزن رہیں۔ میں نے یہ کہہ کر ان کے مذہبی رجحان کو بھی نمایاں کیا کہ دیانتداری نہ صرف آخرت میں بلکہ اس دنیا میں بھی کامیابی کی ضامن ہے۔

ہوم سیکرٹری حاجی اکرم اور چیف سیکرٹری انور زاہد میری باتیں سن کر بہت خوش ہوئے۔ جو ان کے ساتھ ایئرپورٹ پر ہوئی تھیں۔ انور زاہد' صدیق چوہدری کی جگہ چیف سیکرٹری بنے تھے۔ میں انہیں اس وقت سے جانتا تھا جب 50 کی دہائی کے وسط میں ان کا تقرر بطور اے سی ٹوبہ ٹیک سنگھ ہوا تھا اور میں ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھا۔ وہ بہت اچھے انسان اور صاحب بصیرت ناقابلِ چیلنج دیانت اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک افسر تھے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

باب23

بین الاقوامی دہشت گردی

1987ء کے دوران ہمیں تخریب کاری اور دہشت گردی کے بدترین واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت افغانستان کی جنگ عروج پر تھی۔ معاملات کو بدتر صورتِ حال سے دوچار کرنے کے لیے افغان انٹیلی جنس ایجنسی خاد کا چیف ڈاکٹر نجیب اللہ ملک کا صدر بن گیا۔ اس نے خاد کی تخریب کارانہ مہارت کو روسی ایجنسی کے بی جی اور بھارتی ایجنسی را کے تعاون سے دگنے جوش وخروش سے استعمال کیا۔ دفاع' مواصلات اور دیگر اہم تنصیبات نیز لوگوں سے پر ہجوم والے عام مقامات کو نشانہ بنایا گیا۔ اہداف کا انتخاب احتیاط سے کیا جاتا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ نقصان ہو اور وسیع پیمانہ پر خوف وہراس پھیل جائے۔

مارچ 1987ء میں علامہ احسان الٰہی ظہیر جو اہلحدیث کے ایک ممتاز دینی رہنما تھے' اپنے 9 ساتھیوں کے ہمراہ ایک بم دھماکے میں شہید ہو گئے جبکہ 64 افراد زخمی ہوئے۔ اہل حدیث کی طرف سے ملک بھر میں شدید ردِعمل ظاہر کیا گیا۔ انہوں نے شیعوں پر شک کیا اور احتجاجی تحریک میں انہیں بطورِ خاص نشانہ بنایا۔ دشمن کا مقصد واضح طور پر یہی تھا کہ دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیا جائے۔ وہ یہی کام پاراچنار اور شمالی علاقہ جات میں کامیابی سے کر چکے تھے۔ شیعہ' سنی منافرت ایران' عراق جنگ کی وجہ سے پہلے ہی شدت اختیار کر چکی تھی۔ دشمن اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا' تاکہ یہاں عدم استحکام پیدا ہو اور افغانستان پر دباؤ میں کمی آئے۔

9 اپریل 1987ء کو راولپنڈی کے گنجان کشمیری بازار میں کار بم دھماکہ ہوا جس میں 65 کلو گرام دھماکہ خیز مواد استعمال کیا گیا تھا۔ اس سانحہ میں 18 افراد ہلاک اور 50 سے زیادہ زخمی ہوئے۔ لاہور میں ریلوے سٹیشن، ٹیکسی سٹینڈ اور جنرل بس سٹینڈ پر منٹوں کے وقفے سے یکے بعد دیگرے تین دھماکے ہوئے جن میں بہت سے افراد مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ کراچی کے بوہری بازار میں ایک بم دھماکہ ہوا جس میں چالیس افراد جاں بحق اور ایک سو سے زائد زخمی ہوئے۔ صوبہ سرحد میں پاک فضائیہ کی تنصیبات کو نشانہ بنایا گیا۔ بلوچستان اور سرحد کے مہاجر کیمپوں میں بار بار بم دھماکے کیے گئے۔ دشمن کے ایجنٹوں کی تخریبی سرگرمیاں چھوٹے قصبات مثلاً احمد پور شرقیہ، خان پور، گوجرہ، ننکانہ صاحب، مری بلکہ دور دراز کے دیہات تک پھیل گئیں۔ پلوں، نالیوں، سرنگوں، ریلوے لائنوں، بس سٹینڈز، ہوائی اڈوں، پرہجوم بازاروں اور دفاعی تنصیبات پر بم نصب کیے گئے۔ ان حادثات سے وسیع پیمانہ پر خوف وہراس پھیلنا قدرتی بات تھی۔

حکومت اور انتظامیہ پر زبردست دباؤ تھا۔ حزبِ اختلاف کا اتحاد (ایم آر ڈی) علماء اور عوام حکومت کی افغان پالیسی کے خلاف سراپا احتجاج تھے۔ افغان مہاجروں کے خلاف غم وغصہ سے بھرپور جلوس نکلنے لگے۔ مجرموں کو پکڑنے میں ناکامی پر انٹیلی جنس ایجنسیوں اور پولیس پر کڑی تنقید ہونے لگی، لیکن انہیں چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح متحرک نہیں کیا گیا۔

میں نے تجویز پیش کی کہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے سپیشل برانچ میں ترجیحی بنیادوں پر انسدادِ دہشت گردی سیل تشکیل دیا جائے۔ جہاں دہشت گردوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کر کے مؤثر کارروائی کی منصوبہ بندی کی جاسکے۔ میں برانچ کے ملازمین سے کام لینے کے علاوہ پولیس اور فوج کے ریٹائرڈ افسر بھرتی کرنا چاہتا تھا۔ جنہیں تخریب کاری اور دہشت گردی کا توڑ کرنے کی تربیت اور تجربہ حاصل ہو۔ تاہم محکمہ مالیات نے حسب معمول تعاون نہیں کیا اور میرا پلان مسترد کر دیا گیا۔ ملک قومی بحران کی لپیٹ میں تھا، لیکن انہیں اس کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ ہمارے بیوروکریٹ ایسے معاملات میں اکثر غیر حقیقت پسندی سے کام لیتے اور مزاحم ہوتے ہیں، جب تک انہیں بذاتِ خود نتائج کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے۔ جبکہ اچھی اور مؤثر انتظامیہ میں ذمہ داری اور اختیارات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

میں نے اپنی جامع اور مفصل سکیم کے ساتھ وزیراعلیٰ سے ملاقات کی۔ وہ فوراً معاملہ کی تہہ تک پہنچ

گئے اور متعلقہ انتظامی سربراہوں کا اجلاس طلب کر لیا۔ انسدادِ دہشت گردی سیل 72 گھنٹوں کے اندر وجود میں آ گیا جس نے پولیس و فوج کے تجربہ کار افسروں کے ساتھ جو انٹیلی جنس کا ٹھوس تجربہ رکھتے تھے، دو ہفتوں کے اندر کام شروع کر دیا۔ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد اشرف کو سیل کا ڈی آئی جی مقرر کیا گیا۔ اس سیل نے جلد ہی بہت سے مجرم پکڑ لیے۔ انہوں نے دشمن کے ہولناک منصوبوں کا انکشاف کیا۔ لیکن سیل کے بعض شاندار کارنامے بیان کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ ہمارے بیوروکریٹس قومی سطح کے بحران سے بھی کس طرح عام انداز سے نمٹتے ہیں۔

بے قصور ٹھہرانے والے رویہ کی مذمت

وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو نے وفاق اور چاروں صوبوں کی سیکورٹی ایجنسیوں کا گورنر ہاؤس لاہور میں اجلاس بلایا۔ جس میں میں نے بھی شرکت کی۔ اجلاس میں شریک ہر شخص نے معمول کے مطابق تشویش کا اظہار کیا۔ حسبِ معمول سخت ہدایات اور تنبیہات جاری کی گئیں۔ انٹیلی جنس ایجنسیوں اور پولیس کی طرف سے معمول کی یقین دہانیاں کرائی گئیں کہ ''وہ مجرموں کا کھوج لگانے کے لیے زمین آسمان ایک کر دیں گے اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچا کر دم لیں گے۔'' وزیرِ اعظم کو یہ تشویش لاحق تھی کہ ان کی حکومت تنقید کا نشانہ بن رہی تھی اور انتظامیہ اس لیے پریشان تھی کہ اس پر نااہلی و نالائقی کا الزام لگایا جا رہا تھا۔ بحث میں کوئی نیا یا تجزیاتی نکتہ پیش نہیں کیا گیا۔ جس سے اس کوشش کو نئی سمت ملتی، نہ ہی مسئلے کا حل تلاش کرنے کی حقیقی لگن اور تڑپ نظر آئی۔ تھوڑی بہت ڈانٹ ڈپٹ اور ہلہ گلہ ضرور ہوا لیکن نتیجہ خیز فیصلے نہیں کیے گئے۔

مجھے اس سنگین قومی مسئلے کے بارے میں اپنی اپنی جان بچانے والا رویہ دیکھ کر بڑا دکھ اور تشویش ہوئی۔ اجلاس میں سب سے جونیئر ہونے کی بنا پر میں پہلے تو ہچکچاتا رہا تاہم بے کیف و بدمزہ کارروائی سے تنگ آ کر میں نے بولنے کی اجازت مانگی اور گزارش کی کہ اب تک ہم مجرموں پر ہاتھ ڈالنے، ان کے ذرائع کا پتہ چلانے اور ان کی خفیہ سرگرمیوں کو سمجھنے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ یہ کہ ''خاد'' کے بی جی اور را پر الزام لگانا بہت آسان ہے، لیکن ہمیں اجتماعی اور مربوط کوششوں کے ذریعے مجرموں کو پکڑنا چاہیے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تمام ذرائع سے کام لینا چاہیے۔'' اس کے بعد میں نے اعلیٰ سطحی اجلاس کی توجہ اپنی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی حالتِ زار کی طرف مبذول کرائی جن سے دنیا کی دوسری سپر پاور اور اس کے اتحادیوں کے خلاف بھرپور خفیہ جنگ لڑنے کی توقع کی جا رہی تھی۔

یہ پس منظر بیان کرنے کے بعد میں نے وزیرِاعظم سے درخواست کی کہ وہ اپوزیشن سمیت پوری قوم سے اپیل کریں کہ متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ لوگوں کی توانائیوں کو حرکت میں لانا اور ان سے کام لینا مرکزی قیادت کا کام ہے۔ یہ قوم کے خلاف مختلف نوعیت اور خطرناک قسم کی جنگ ہے، جسے سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اس موقع پر ہر ایک کو میدان میں آنا اور دشمن کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے لوگوں کو نہ صرف دہشت گردوں کے خاکوں سے روشناس کرانا چاہیے بلکہ ان کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے سیکورٹی اقدامات سے بھی آگاہ کرنا چاہیے۔ میڈیا کو چاہیے کہ لوگوں کو تخریب کاروں کے ذرائع اور طور طریقوں کے متعلق آگاہ کرے۔ انتظامیہ اور شہری دفاع کی تنظیموں کو ہنگامی بنیادوں پر بنائے گئے منصوبوں کے ساتھ تیار رہنا چاہیے تاکہ دہشت گردی کی روک تھام کر سکیں اور اس کا سراغ لگا سکیں۔ اگر پوری قوم مستعدی سے کام لے تو دشمن کے ایجنٹ چھپنے یا پناہ گاہیں تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

میں نے اپنے خیالات کو زوردار طریقے سے واضح کرنے کے بعد آخر میں کہا: ''سر آپ کو سارے نظریاتی اور مادی وسائل کے ساتھ لڑائی لڑنے کے لیے قوم کو تیار و بیدار کرنا ہوگا۔ آپ اپوزیشن کو بھی ساتھ لے کر چلیں۔ آپ مناسب سمجھیں تو قوم سے خطاب بھی کر سکتے ہیں۔''

وزیرِاعظم اور دیگر شرکائے اجلاس نے میری بات پوری توجہ سے سنی۔ پھر انہوں نے تمام متعلقہ افراد کو میرے تجویز کردہ خطوط پر تفصیلی ہدایات جاری کیں۔ میڈیا سے کہا گیا کہ وہ عوام الناس میں خوف و ہراس پیدا کیے بغیر اپنی سلامتی کی بابت شعور بیدار کرے۔ پریس نے اعتماد میں لینے کے بعد زبردست سیلف کنٹرول اور گہرے احساسِ ذمہ داری کا مظاہرہ کیا اور لوگوں میں صحیح سمت کا احساس پیدا کرنے میں بڑی مدد دی۔ ہر ضلعی انتظامیہ نے نگرانی کرنے اور نقصان پر قابو پانے کے لیے شہری دفاع اور شہریوں کی کمیٹیاں تشکیل دیں۔ اپوزیشن سمیت تمام طبقات کے لوگ ہر سطح پر ہنگامی انتظامات کرنے لگے۔ حزبِ اختلاف حکومت کی ناکامیوں پر نکتہ چینی کرتی رہی لیکن تعمیری انداز میں کیونکہ انہیں مختلف سطحوں پر اعتماد میں لیا گیا اور بریف کیا گیا تھا۔ ان تمام اقدامات نے لوگوں کی توانائیوں کا رخ حکومت کے خلاف احتجاج سے موڑ دیا بلکہ بعض معاملات کا سراغ لگانے کے لیے بروقت اطلاع دینے اور لوگوں کی نگرانی کرنے کے معاملہ میں انتظامیہ کی مدد بھی کی۔

آئیے اب دیکھتے ہیں کہ بیوروکریٹس کا ردِعمل کیا تھا۔ اجلاس کے بعد ایک سینئر اور تیز طرار افسر

نے مجھ سے کہا کہ ''تم بہت چالاک لگے۔ تم نے وزیرِ اعظم کو سیاسی چالوں میں الجھا کر ہم سب کو بچا لیا۔ یہ ایک اچھی ترکیب تھی۔ اگرچہ عوام کچھ نہیں کر سکتے اور پریس سب سے زیادہ غیر ذمہ دار ہے۔''

مجھے اپنے خیالات کے متعلق اس قسم کی بے سروپا باتیں سن زبردست دھچکا لگا۔ میں نے کوئی چالاکی نہیں دکھائی تھی۔ جو کچھ کہا' پورے یقین اور خلوصِ نیت سے کہا تھا۔ آپ عوامی تعاون کے بغیر خصوصاً جب وہ نشانہ بن رہے ہوں ایک طاقت ور دشمن سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ لوگوں میں اس سے کہیں زیادہ دب کر اُبھرنے کی صلاحیت اور لڑنے کے لیے توانائی ہوتی ہے۔ جتنا کہ بیوروکریٹ انہیں کریڈٹ دیتے ہیں۔ ایک تخریبی لہر کا تو کیا ذکر جو ایک سپر پاور نے پیدا کی تھی اور اس کی پشت پناہی کر رہا تھا' لوگوں کے تعاون کے بغیر آپ عام جرائم کے خلاف بھی نہیں لڑ سکتے۔ بہت سے گرم مزاج بیوروکریٹس کے نزدیک لوگوں کو اعتماد میں لینے کی ضرورت نہیں تھی جبکہ دوسروں کے خیال میں وہ محض بیوقوف بنانے اور استحصال کرنے کے لیے ہیں۔

سپیشل برانچ (پنجاب) نے وہ چیلنج انتہائی سنجیدگی سے قبول کر لیا۔ ہم نے اپنی انٹیلی جنس ایجنسیوں اور دوسرے صوبوں کی پولیس کے ساتھ مؤثر رابطہ قائم کیا۔ مشکوک افراد اور ان کے ٹھکانوں کی مسلسل نگرانی کی جانے لگی۔ شہریوں کے تعاون سے ہمارے خفیہ ذرائع میں معقول اضافہ ہو گیا اور ہم نے بہت سی جہتوں میں کام شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں انسدادِ دہشت گردی کے صبر آزما کام کے حوصلہ افزا نتائج نکلنے لگے۔ سیل نے نہ صرف پنجاب بلکہ دوسرے صوبوں میں بھی دہشت گردی کی بہت سی وارداتوں کا کھوج لگا لیا۔

اگلے سال امریکی ماہرین کی ایک ٹیم یہ جاننے کے لیے ہمارے پاس آئی کہ ہم نے اتنی بڑی کامیابی کیسے حاصل کر لی۔ انہوں نے بتایا کہ 1987ء میں پاکستان تخریب کاری اور دہشت گردی کا سب سے بڑا نشانہ تھا۔ انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ ہماری کامیابی کی شرح سب سے زیادہ ہے جو اس قسم کی دہشت گردی کی تاریخ میں کسی ملک نے حاصل کی۔ میں نے انہیں ان طریقوں کی بابت تفصیلی بریفنگ دی جو ہم نے وارداتوں کا سراغ لگانے کے لیے استعمال کیے تھے۔

لیفٹیننٹ کرنل اشرف اور ان کے سٹاف نے واقعی سخت محنت اور شب و روز کام کیا۔ ان کے ماتحت ریٹائرڈ پولیس افسران کی کارکردگی بھی قابلِ ستائش تھی۔ چوہدری زمان ایک ریٹائرڈ ایس پی تھے' وہ

طویل تجربہ رکھتے تھے اور اس موضوع پر ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ انہیں بھگت سنگھ کے وقت سے لے کر اب تک دہشت گردی کے جملہ واقعات کی تفصیلات یاد تھیں۔ اپنے طویل تجربہ کی بنا پر مجرموں کی سمت کا تعین اور ممکنہ راہِ فرار کی نشاندہی کے سلسلے میں ان کے اشارے حیرت انگیز طور پر غیب دانی کے مظہر ہوتے تھے۔ مذکورہ سیل نے افغان مہاجرین کی صفوں میں موجود، نیز پاکستان کے تربیت یافتہ تخریب کاروں اور ان کی استعداد کی بابت مفصل معلومات حاصل کیں۔ اس نے انٹیلی جنس بیورو، فیڈرل سیکورٹی سیل نیز سرحد بلوچستان کی پولیس سے مدد لی۔ تمام ایجنسیوں نے ہماری مدد کرنے میں بہترین کارکردگی دکھائی۔

اب چند نمایاں اور اہم وارداتوں کی طرف آتے ہیں۔ ہم اس بارے میں بھی اظہارِ خیال کریں گے کہ ہم نے اتنی بڑی کامیابی کیسے حاصل کی۔ سیکورٹی کے نقطۂ نظر سے اکثر واقعات میں تخریب کاروں کے اصل نام ظاہر نہیں کیے گئے۔

چکوال کی راہ پر

انٹیلی جنس بیورو دو تخریب کاروں کی نگرانی کر رہا تھا جو قبائلی علاقہ سے آ رہے تھے۔ ان کے پشاور پہنچنے پر نگرانی کا کام مقامی پولیس نے سنبھال لیا۔ تخریب کار پشاور سے جی ٹی روڈ پر راولپنڈی کی طرف مڑ گئے۔ پشاور کے ڈی آئی جی کمال شاہ نے راولپنڈی کے ڈی آئی جی شاہد حسن کو مطلع کیا اور ان سے کہا کہ اٹک سے آگے نگرانی اپنے ہاتھ میں لے لیں تاکہ تخریب کاروں کو ان کی منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد کچھ مشکوک مواد کے ساتھ یا کسی فوجداری کیس میں مثال کے طور پر بم نصب کرتے ہوئے گرفتار کیا جا سکے۔ ڈی آئی جی راولپنڈی نے اٹک کے پل پر متعین پولیس کو الرٹ کر دیا۔

اٹک کے ڈی ایس پی انچارج نے اپنے ہدف (کار) کو پل پر لگائے گئے بیریئر کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس نے پہچان کر انہیں روک لیا اور اس خیال سے کہ شکار ہاتھ سے نہ نکل جائے، دونوں کو حراست میں لے لیا۔ راولپنڈی کے ڈی آئی جی نے اس بارے میں مجھے مطلع کیا تو میں نے کہا کہ انہیں تفتیش کے لیے فوراً لاہور بھیج دیں۔ بہتر تو یہ تھا کہ مشتبہ افراد پر نظر رکھی جاتی اور انہیں ان کی منزل پر پہنچنے دیا جاتا، لیکن پولیس کے وسائل کی خستہ حالی نے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اگر ڈی ایس پی پولیس کی آسانی سے قابلِ شناخت پک اپ میں ان کا تعاقب کرتا تو مشکوک افراد آسانی سے اس گاڑی سے بچ کر نکل جاتے۔

اُن تخریب کاروں (کمال اور نصیب) سے انسدادِ دہشت گردی سیل میں طویل پوچھ گچھ کی گئی۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں، سرپرستوں، گروپوں، تربیت، اہداف، طریقِ کار اور وسائل و ذرائع کے بارے میں بہت سی مفید معلومات فراہم کیں۔ ان کے مطابق تخریب کاروں کے ہر آٹھ یا دس گروپ کے بعد کٹ آؤٹ سسٹم کام کرتا تھا۔ کسی گروپ کو دوسرے کے مشن سے آگاہی حاصل نہیں تھی۔ بہر حال ہم ایسی 28 ٹیموں کے ممبران کی شناخت کرنے میں کامیاب ہو گئے جنہیں کے جی بی کے سٹاف نے جلال آباد، کابل اور تاشقند میں تربیت دی تھی۔ اس پسِ منظر کے متعلق ہمارے پاس کچھ معلومات پہلے سے تھیں۔ ان کی مدد سے ہم نے ایک رپورٹ تیار کر لی۔

تخریب کاروں نے ضلع چکوال کے پہاڑی علاقہ میں سلیم نامی شخص کے ڈیرے کا انکشاف کیا جہاں دھماکہ خیز مواد اور کار بم کے دیگر آلات چھپائے گئے تھے۔ ان کی اپنی منزلِ مقصود وہی ڈیرہ تھا۔ وہاں سے مواد لے کر انہیں کسی پر ہجوم جگہ کا انتخاب کرنا تھا تاکہ کار وہاں کھڑی کر کے ریموٹ کنٹرول سے دھماکہ کر سکیں۔ مشن مکمل کرنے کے بعد انہیں ایک محفوظ راستہ سے کابل لوٹ جانا تھا۔ تاکہ وہاں پہنچ کر اپنی ''اُجرت'' وصول کر سکیں۔

''تم پر ہجوم مقام کیوں چنتے ہو؟'' ان سے پوچھا گیا۔

''کیونکہ اس طرح زیادہ دہشت پھیلتی ہے۔'' ایک نے جواب دیا۔

''ہمیں ہدایات دی گئی تھیں کہ زیادہ سے زیادہ جانی نقصان کریں۔ ہمیں ہر لاش کے عوض دس ہزار روپے اور فی زخمی تھوڑی سی رقم ملتی ہے۔ ہم اگلے دن کے اخبارات میں شائع ہونے والی تفصیلات سے اس کا ثبوت حاصل کر لیتے ہیں۔ ہم اب تک اس طرح کے گیارہ مشن مکمل کر چکے ہیں جن میں ڈیرہ اسماعیل خان اور لاہور ریلوے سٹیشن کے بم دھماکے نیز پشاور میں ایئر فورس کی تنصیبات کو نشانہ بنانے کی وارداتیں شامل ہیں۔'' دوسرے نے انکشاف کیا۔

انہوں نے ہمیں تخریب کاری کی 23 وارداتوں کے متعلق مفید معلومات سے آگاہ کیا جن کا ارتکاب انہوں نے خود یا دوسری ٹیموں نے کیا تھا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی جس سے پوری تصویر قریباً واضح ہو گئی۔

''کیا تمہیں بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہلاک یا مجروح دیکھ کر ترس نہیں آتا؟'' میں

نے سوال کیا

''نہیں' بالکل نہیں' یہ دوسرے بزنس کی طرح ایک کاروبار ہے۔ ہمیں اس کام کا معقول معاوضہ ملتا ہے۔ اگر بہت زیادہ لوگ مارے جائیں تو ہمیں خوشی ہوتی ہے کیونکہ ایسی صورت میں زیادہ رقم ملتی ہے۔ ہم اخبار اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور رقم وصول کر کے اگلے مشن پر روانہ ہو جاتے ہیں۔'' انہوں نے قطعاً ندامت کا اظہار نہیں کیا۔

''تم نے کوئی اور کام کرنے کی بجائے یہ مکروہ دھندا کیوں اختیار کیا؟'' میں نے ایک ملزم سے پوچھا۔

اس کے جواب میں اس نے ایک عجیب کہانی سنائی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ قبائلی علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے پاکستان آرمی میں بھرتی ہوئے۔ تربیت کے بعد ان کی پاراچنار میں پوسٹنگ کر دی گئی۔ تھوڑے دنوں بعد وہاں زبردست شیعہ سنی فساد ہوا جس میں دونوں طرف کے بہت سے افراد مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ صورتِ حال کو کنٹرول کرنے کے لیے ان کی رجمنٹ بھیجی گئی۔ کمال' نصیب اور ان کے چھ دیگر ساتھی جن کا تعلق ایک خاص فرقہ سے تھا۔ اس رائے کے حامل تھے کہ ان کے کمانڈنگ آفیسر نے فسادات پر قابو پانے کے لیے حسبِ ضرورت طاقت استعمال نہیں کی' ورنہ ان کے فرقہ سے تعلق رکھنے والے اتنے افراد ہلاک نہ ہوتے۔ اسی غم و غصہ کی حالت میں ایک رات انہوں نے اپنے کمانڈنگ افسر کو نرغہ میں لے لیا اور آتشِ انتقام بجھانے کے لیے اس پر فائرنگ کی۔ اس کے بعد وہ اپنے ہتھیاروں سمیت فوج سے بھگوڑے ہو گئے۔

ان کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے گئے تو وہ جان بچانے کی غرض سے افغانستان بھاگ گئے۔ وہاں بیروزگاری اور بھوک سے واسطہ پڑا تو تخریب کاری شروع کر دی اور خاد کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ اس سلسلے میں فوج کی تربیت بہت کام آئی۔ انہیں بم تیار کرنے اور اسے نصب کرنے کی مزید ٹریننگ دی گئی۔ ابتدا میں جو مشن سونپے گئے ان کا تعلق پلوں اور مواصلات کے دیگر ذرائع کے نیچے بارودی سرنگیں نصب کرنے سے تھا۔ دوسرے مرحلہ میں انہوں نے دفاعی تنصیبات کو نشانہ بنایا۔ جس وقت ہم نے انہیں پکڑا اس وقت وہ خاصے تجربہ کار ہو چکے تھے اور انہیں وسیع پیمانہ پر تباہی پھیلانے والے بڑے بڑے

منصوبے سوچے جا رہے تھے۔ ان کی گرفتاری کے تیسرے دن سلیم کے ڈیرے پر چھاپہ مارا گیا اور دھماکہ خیز مواد قبضے میں لے لیا گیا۔ البتہ سلیم کسی نہ کسی طرح بچ نکلا۔

اس کامیابی نے ملک بھر میں بہت سی وارداتوں کا سراغ لگانے اور مجرموں کو گرفتار کرنے میں مدد دی۔ انسدادِ دہشت گردی سیل نے کامیابی سے ان میں اپنے آدمی داخل کر دیئے' ان کے محنت سے بچھائے ہوئے جال کو توڑ دیا اور کم از کم وقتی طور پر دشمن کا توازن خراب کر دیا۔ تفتیش کے دوران جمع کی گئی معلومات فوری طور پر فیڈرل ایجنسیوں اور صوبوں کی پولیس کو پاس کر دی گئیں۔ انہوں نے کچھ تخریب کاروں کو فوراً قابو کر لیا جب کہ بعض دوسرے کچھ عرصہ گزرنے کے بعد پکڑ لیے گئے۔

فٹ بالر کا دھماکہ

9 اپریل 1987ء کو راولپنڈی کے کشمیری بازار جیسے گنجان آباد علاقہ میں کار بم دھماکہ ہوا جس میں 18 افراد مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ آس پاس کھڑی ہوئی متعدد گاڑیوں کو نقصان پہنچا۔ ماہرین نے بتایا کہ وہ بم 65 کلو وزنی تھا۔ جس کار میں اسے نصب کیا گیا تھا' اس کے پرخچے اڑ گئے۔ البتہ اس کا انجن محفوظ رہا جو قابلِ شناخت حالت میں تھا۔

راولپنڈی کی تفتیشی ٹیم کے لیے انجن شہادت کا قیمتی جزو ثابت ہوا۔ وہ ایک سوزوکی کار تھی' اس لیے کراچی میں اس کی تیار کرنے والی فرم سے رابطہ کیا گیا۔ فروخت کے ریکارڈ اور دیگر دستاویزات سے پتہ چلا کہ وہ کار کوئٹہ کے ایک شخص کو فروخت کی گئی تھی۔ پھر وہ ڈیلروں کے ذریعے کئی ہاتھوں سے گزری تاہم دستاویزات میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ ایک کار ڈیلر نے تین نوجوانوں کے چہرہ کی شناخت بتائی جنہوں نے وہ کار نقد ادائیگی پر خریدی تھی۔ مزید تفتیش کرنے پر عقدہ کھلا کہ سب سے آخر میں وہ کار علی فٹ بالر (اصل نام) اور اس کے ساتھیوں کو بیچی گئی تھی۔

علی فٹ بالر قبائلی علاقہ میں رہتا تھا اور اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ وہ لرزہ خیز وارداتوں کے لیے مشہور تھا اور لوگوں پر اس کی بڑی دہشت تھی۔ چیکنگ کرنے پر پتہ چلا کہ وہ افغانستان گیا ہوا ہے۔ اس کی طویل اور صبر آزما نگرانی کی گئی۔ وہ کئی ہفتوں کے بعد لوٹا۔ لیکن بلوچستان پولیس کا کوئی ملازم اس پر ہاتھ ڈالنے کو تیار نہیں تھا' کیونکہ جوابی انتقام کا خطرہ تھا۔ یہ بڑی پریشان کن بات تھی کہ اتنے گھناؤنے جرم میں ملوث شخص شہر میں موجود تھا اور سرکاری مشینری اس کے مقابلہ میں بے بس نظر آ رہی تھی۔ ڈی آئی جی

راولپنڈی نے وزیرِ اعلیٰ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے جنرل ضیا کو رپورٹ دی۔ جنرل نے بلوچستان کے گورنر سے بات کی اور فوجی کمانڈر کو مدد کرنے کا حکم دیا۔ معاملہ کے اتنی اعلیٰ سطح تک پہنچ جانے کے باوجود علی کو پکڑنے میں تامل سے کام لیا جا رہا تھا۔

آخرِ کار ایک نوجوان اے ایس پی نے جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے علی کو قابو کر کے راولپنڈی پولیس کے حوالے کر دیا جو کوئٹہ میں مقیم تھی۔ وہ ٹیم ملزم کو لے کر فوراً بلوچستان سے نکل آئی۔ مبادا جوابی حملہ ہو جائے۔ انہوں نے قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے بھی توقف نہیں کیا تا کہ قبائلیوں کو شرارت کا موقع نہ مل سکے۔ وہ انتہائی رفتار سے گاڑی چلا کر ملتان پہنچ گئے۔ علی کے قبیلہ والوں کو اس کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا تو وہ غصہ سے پاگل ہو گئے اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر پولیس پارٹی کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ اس وقت تک علی کو ان کی پہنچ سے بہت دور پنجاب پہنچا دیا گیا تھا۔ انہوں نے اے ایس پی پر قاتلانہ حملہ کیا، مگر وہ بال بال بچ گیا۔ وہ کوئٹہ سے تبادلہ کروا کر پنجاب آ گیا تا کہ قبائلی دوبارہ حملہ نہ کر سکیں۔

علی فٹ بالر سے سختی کے ساتھ چھان بین کی گئی تو اس نے ساری تفصیلات اُگل دیں۔ اسے خاد کی طرف سے اپنے ساتھیوں کو ایک سیکنڈ ہینڈ کار فراہم کرنے اور دیگر اخراجات کے لیے تین لاکھ روپے دیے تھے اور دھماکہ خیز مواد فراہم کیا گیا تھا۔ وہ اور اس کے دو ساتھی کار اور دھماکہ خیز مواد کو ایک ٹرک پر لاد کر روانہ ہوئے۔ ایک رات ڈیرہ غازی خان میں قیام کیا اور اگلے دن گوجرانوالہ پہنچے۔ وہاں کار، دھماکہ خیز مواد اور دیگر اشیا ٹرک سے اُتار لی گئیں۔ ڈرائیور کو قطعاً شک نہیں گزرا کہ ان کے پاس کوئی خطرناک مواد ہے۔ علی اور اس کے ساتھیوں نے وہ مواد سڑک کے کنارے واقع ایک افغان ہوٹل سے کار میں لوڈ کیا۔ پھر وہ کار کو راولپنڈی لے گئے اور کشمیری بازار میں پارک کر کے ریموٹ کنٹرول سے دھماکہ کر دیا۔

علی کے دو ساتھیوں کو گرفتار کرنے میں مزید تین مہینے لگ گئے۔ پوچھ گچھ سے ہمیں سندھ اور بلوچستان میں اس قسم کی کئی وارداتوں کا سراغ لگانے میں مدد ملی۔ ان کے طریقہ ہائے واردات اور سرپرستوں کا بھی پتہ چلا اور انہیں مؤثر طور پر الگ تھلگ کر دیا گیا۔ علی کو سزائے موت سنائی گئی۔ تاہم بے نظیر بھٹو نے دسمبر 1988ء میں وزیرِ اعظم بننے کے بعد سزائے موت کو عمر قید میں بدلنے کا عام اعلان کیا تو وہ پھانسی کے پھندے سے بچ گیا۔

تخریب کاروں کے جو بہت سے گروپ پکڑے گئے ان کی کہانیاں بھی اسی طرح کی تھیں۔ انسدادِ دہشت گردی سیل کی مختلف ٹیموں نے کامیاب تفتیش اور مؤثر تعاقب کر کے تخریب کاروں کی کمر توڑ دی۔ بعض کو افغانستان سے گرفتار کیا گیا۔ 1988ء اور 1989ء میں تخریبی کارروائیوں کی تعداد خاصی گھٹ گئی۔

زیادہ تر تخریب کار بیروزگار اور مایوسی کا شکار تھے۔ جو مجرمانہ ماحول اور صحبت کے زیرِ اثر غلط راہ پر چل پڑے۔ ان میں سے بعض بکھرے ہوئے خاندانوں کے تکلیف دہ ماحول سے تعلق رکھتے تھے جب کہ دوسرے بیوی یا محبوبہ کی بیوفائی کے باعث مجرم بن گئے تھے۔ کچھ ایسے نوعمر تھے جو ایران عراق جنگ شروع ہونے کے بعد مشرقِ وسطیٰ میں ذرائع معاش سے محروم ہونے کے بعد جرم کی دنیا میں داخل ہوئے۔ بعض کو خود افغانستان کی لڑائی نے جرائم پر اُبھارا اور موقع سے فائدہ اٹھانے لگے۔ دشمن کو ایسے عناصر کا استحصال آسان نظر آیا' لیکن ہم نے اس کے اقدامات کو غیر مؤثر بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

میں نے صدر اور وزیرِ اعظم کو اس کامیابی کے بارے میں حقائق اور اعداد و شمار کے ساتھ بریف کیا۔ ہم نے جملہ مجرموں' ان کے ساتھیوں' سرگرم افراد' سرپرستوں' ان کی پناہ گاہوں' طریقہ ہائے واردات' اہداف' ہتھیاروں اور مواد کی معہ دشمن کے منصوبوں کے پس منظر کی فہرست تیار کر لی تھی۔

بریفنگ کے دوران بعض اقدامات تجویز کیے گئے جن میں انسدادِ دہشت گردی سیل کو مضبوط بنانے کے لیے ٹیکنیکل سامان کی فراہمی شامل تھی۔ صدر ہماری کامیابی پر اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے موقع پر ہی اعلان کر دیا کہ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہو لے سکتے ہیں۔ ہم نے برڈووڈ بیرکس (لاہور) میں چند تفتیشی کمرے فراہم کرنے کا مطالبہ کیا کیونکہ شاہی قلعہ کی کوٹھڑیاں خالی کرنے کے بعد ہمارے پاس تفتیش کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ صدر نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ فوج سے مطلوبہ بیرکس فراہم کرنے کو کہیں گے' لیکن بعد میں کچھ نہیں ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ وفاقی حکومت نے ہمیں پھوٹی کوڑی بھی نہیں دی حالانکہ ہماری سر توڑ کوششوں سے اس وقت تخریب کاری کا زور خاصا ٹوٹ گیا تھا۔ کامیابی کی صورت میں ہمیں ٹرخا دیا گیا۔ اگر ہم ناکام ہو جاتے اور دہشت گردی کا خطرہ اپنی جگہ موجود ہوتا تو شاید ضرورت کی ہر چیز مل جاتی۔



باب24

شاہینوں اور فاختاؤں سے واسطہ

وسط1986ء میں بینظیر بھٹو نے اعلان کیا کہ وہ لاہور آئیں گی اور ''امن کی فاختاؤں'' کی مہم شروع کریں گی۔ اس بیان نے وزیرِ اعلیٰ' چیف سیکرٹری' آئی جی اور دوسروں کو پریشان کر دیا' ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوگا۔ اپوزیشن کی ہمیشہ خواہش ہوتی ہے کہ حکومت کی طرف سے غیر ضروری ردِ عمل کا اظہار کیا جائے۔ بہت سی حکومتیں واقعی ایسا کرتی ہیں۔ میرے خیال میں جواب متوازن ہونا چاہیے کیونکہ بہت شدید یا بہت نرم ردِ عمل معاملات کے مزید بگاڑ کا سبب بن سکتا ہے۔ میرا قیاس یہ تھا کہ وہ کوئی اہم بات نہیں ہوگی۔ اگرچہ کوئی بھی میری رائے سے اتفاق کرنے کو تیار نہیں تھا۔ تاہم وہ سپیشل برانچ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو اجلاس ہوا اس میں طے پایا کہ غیر ضروری ردِ عمل ظاہر نہ کیا جائے' لیکن اگر معاملہ خراب ہو گیا تو ایڈیشنل آئی جی (سپیشل برانچ) کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔ میں نے یہ ذمہ داری بخوشی قبول کر لی۔

''فاختاؤں کا امن'' کے سلسلے میں نکلنے والا جلوس ''ایک ناکام شو'' تھا۔ جو لاہور ریلوے سٹیشن سے شروع ہو کر تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا' جہاں معمولی تعداد بھی زیادہ نظر آتی ہے' داتا دربار پر اختتام پذیر ہو گیا۔ راستے میں جلوس والوں نے مسلم لیگ کے دو جھنڈے جلا دیے۔ اس پر وزیرِ اعلیٰ بہت برہم ہوئے۔ ہر ایک مجھے قصوروار ٹھہرا رہا تھا کیونکہ میں نے صورتِ حال کی ''مکمل ذمہ داری'' قبول کر لی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ اگر پولیس جلوس میں مداخلت کرتی تو لازماً تصادم ہو جاتا جس کے نتیجہ میں بہت سے لوگ زخمی ہوتے بلکہ مارے بھی جاتے۔ ایسی صورتحال اپوزیشن کو خوب سوٹ کرتی اور نہ صرف لاہور میں بلکہ کہیں اور بھی آتش زنی' توڑ پھوڑ کی وارداتیں اور ہنگامے شروع ہو جاتے۔

میری وضاحت کسی نے قبول نہیں کی۔ ایک انتہائی سینئر اور تیز طرار افسر نے کہا کہ ''کوئی بھی حکومت خواہ وہ کیسی ہی کمزور کیوں نہ ہو' اس چیز کو برداشت نہیں کرتی۔ آپ نے حکومت اور پولیس دونوں کو

تضحیک کا سامان بنا دیا ہے۔"

"محض دو جھنڈے جلائے جانے پر؟" میں نے استفہامیہ انداز میں کہا۔

"لگتا ہے آپ کے نزدیک مسلم لیگ کے جھنڈوں کی کوئی اہمیت نہیں۔" نواز شریف نے دھیمے لہجے میں رائے زنی کی۔

"نہیں سر' میں مسلم لیگ کے پرچم کو بے پناہ اہمیت دیتا ہوں لیکن سوال اس سے بھی زیادہ بنیادی نوعیت کا ہے۔ کیا آپ یہ پسند کرتے کہ صوبہ میں اس سے زیادہ سنگین اور مسلسل گڑبڑ شروع ہو جاتی جو آخرِ کار خود آپ کی حکومت کو لے بیٹھتی؟"

یہ اشرفیاں لٹیں اور کوئلوں پر مہر والی بات ہو گی۔ اگر آپ اخبارات دیکھیں تو آپ پیپلز پارٹی کو دفاعی پوزیشن پر پائیں گے۔ پریس طاقت استعمال کرنے کی بجائے جو شدید ردِ عمل کا سبب بن سکتا تھا۔ ان کے غیر جمہوری رویہ پر تنقید کر رہا ہے۔ میں نے ممکنہ حد تک اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

غلام حیدر وائیں میری مدد کو آگے آئے اور میرے نقطۂ نظر کی حمایت کی۔ اس کے بعد ان سے پریس کے ساتھ رابطہ کرنے کو کہا گیا۔ جب اگلے دن سرکار کا نقطۂ نظر اخبارات میں شائع ہوا تو پی پی نے دفاعی پوزیشن اختیار کر لی کہ انہوں نے جھنڈوں کو چھوا تک نہیں تھا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ وہ جھنڈے ان سپیشل برانچ والوں نے نذرِ آتش کیے تھے' جنہیں نواز شریف نے بھیجا تھا تاکہ توڑ پھوڑ کی کارروائی پی پی کے کھاتہ میں ڈال کر اسے بدنام کیا جا سکے۔ سپیشل برانچ والوں کو دونوں طرف سے موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا تھا۔

میں اخباری تراشے نواز شریف کے پاس لے گیا' وہ ان پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہنسنے لگے۔ میں نے ان کے خوشگوار موڈ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا: "سر یہ جمہوری نظام کی خوبی ہے۔ وائیں صاحب کے ایک ہی بیان نے انہیں دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ طاقت کا استعمال انہیں خوب راس آتا اور آج آپ دفاعی پوزیشن میں ہوتے۔ آپ کی حکومت کے مقابلے میں فوجی حکومت طاقت کے استعمال کی بہت زیادہ استعداد رکھتی تھی۔ جب مارشل لا والے پی پی کو نہیں کچل سکے تو آپ اسے کس طرح ختم کر سکتے ہیں؟ آپ کے پاس شرافت اور ضبط و تحمل کا ہتھیار ہے جو مارشل لا کے تمام ہتھیاروں سے زیادہ خطرناک ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا وہ پہلے ہی دفاعی پوزیشن پر ہیں۔ آئندہ وہ کبھی مسلم لیگ کے جھنڈے

نہیں جلائیں گے۔''

''آپ ایک اچھے سیاستدان ہیں چوہدری صاحب' مگر میں آئندہ کوئی گڑبڑ نہیں دیکھنا چاہتا۔'' انہوں نے واضح الفاظ میں کہا۔ گویا انہوں نے بالواسطہ طور پر میرے مؤقف کی تائید کردی تھی۔

''ٹھیک ہے سر' آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' میں نے یقین دہانی کرائی۔ واپس آتے ہوئے میں اس بات پر خوش ہونے لگا کہ میں نے یہ ثابت کر کے معاملات کو سیدھے راستے پر ڈال دیا ہے کہ سیاسی امور میں انتظامی فورس کا غلط استعمال تعمیر کی بجائے تخریب کا باعث بنتا ہے۔ تاہم یہ بات موجبِ تشویش تھی کہ ایک واضح سیاسی مقصد کے لیے طاقت استعمال نہ کرنے پر مجھے ''سیاستدان'' کا لقب دے دیا گیا۔ یہ بڑا بھونڈا مذاق تھا کہ سیاسی معاملات سے انتظامی کی بجائے سیاسی انداز میں نمٹنے کی تدبیر کو سیاست سے منسوب کر دیا جائے۔ بہرحال یہ ان کا قصور نہیں تھا۔ گزشتہ تین عشروں سے ہماری کوئی سیاسی سمت نہیں تھی اور ہر کام انتظامی انداز سے کیا جا رہا تھا۔ اس لیے انتظامیہ کو سیاست سے پاک کرنے کے عمل کو بھی سیاسی معاملہ سمجھ لیا گیا۔ ملازمت کے دوران میرے ساتھ کئی بار ایسا ہوا۔ لیکن میں ہمیشہ اپنے اس پختہ یقین پر قائم رہا کہ سیاسی معاملات سے انتظامی انداز میں نہیں نمٹنا چاہیے۔ میں غلط راہ پر پڑی ہوئی سوچ کو درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ اس قدر پختہ ہو چکی تھی اور اتنے وسیع پیمانہ پر پھیل چکی تھی کہ جو پولیس افسر یا سرکاری ملازم سیاسی کارکنوں کو مارنے پیٹنے اور تشدد کی وکالت کرتا اسے پیشہ ور افسر سمجھا جاتا جبکہ آزادی نقل وحرکت اور اظہار رائے کے حامی کو سیاستدان قرار دے دیا جاتا۔ جو معاشرہ ایک طویل عرصہ برطانیہ کے آمرانہ نظام کے تحت گزار کر آزاد ہوا تھا۔ اس کا ماحول سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ اس سے مجھے آرویل کی مایہ ناز کتاب ''1984ء'' میں درج اس طرح کے نعرے یاد آ گئے کہ ''جنگ امن ہے''، ''آزادی غلامی ہے''، ''جہالت میں قوت ہے۔''

یومِ آزادی پر تصادم

اس کے فوراً بعد ہمیں ایک اور چیلنج سے واسطہ پڑ گیا۔ ایم آر ڈی نے 20 ستمبر 1986ء سے احتجاجی تحریک شروع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ حسبِ معمول مجھے صوبائی کابینہ کو بریف کرنے کا حکم ملا۔ میرے خیال میں تحریک کے امکانات مدھم تھے کیونکہ جمہوری نظام بحال ہو چکا تھا۔ عوام ایسے پروگرام سے

زیادہ متاثر نہیں ہوتے جس میں واضح سمت کا فقدان ہو۔ پھر عوام میں یہ احساس بھی موجود تھا کہ جنرل ضیا ابھی منظر سے نہیں ہٹے اور حالات خراب ہونے کی صورت میں دوبارہ مارشل لا لگا سکتے ہیں۔ اس لیے تحریک کا مقصد یہ لگتا تھا کہ ان لوگوں کو انتشار پر اُبھارا جائے جنہوں نے حال ہی میں اسمبلیوں کے لیے ووٹ ڈالے تھے۔ بہر حال سب سے اہم عامل یہ تھا کہ پنجاب کی قیادت بے نظیر کی لندن سے واپسی کے بعد ان کے طوفانی دوروں سے بڑی دانائی اور دوراندیشی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئی۔ میں نے آخری نکتہ پر جان بوجھ کر زور دیا اور ایک سیلزمین کی سی فطری مہارت و چرب زبانی سے کام لیا جو خوشامد کی حد تک پہنچ گئی تھی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ وہ گھبراہٹ میں ضرورت سے زیادہ ردِعمل کا اظہار نہ کر بیٹھیں۔ میں نے یہ کہہ کر اپنے نکتہ کو مزید ذہن نشین کرایا کہ کسی تحریک کو آہنی ہاتھوں سے کچلنا دراصل اسے ہوا دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس وقت مارشل لا دور کا جبر و ستم قصہ ٔ پارینہ بن چکا ہے۔ اس لیے جمہوری فضا میں ایم آر ڈی کی تحریک کی کامیابی کا بہت کم امکان ہے۔

کابینہ نے میرے تجزیہ سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ خلاف توقع مسرت کا اظہار بھی۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا۔ میں ان کی طرف سے غیر ضروری ردِعمل کے بغیر انہیں متوازن راہ پر رکھنا چاہتا تھا۔ غلام حیدر وائیں نے تجویز پیش کی کہ مسلم لیگ کو یومِ آزادی (14 اگست) کے موقع پر مینارِ پاکستان پر جلسہ عام کرنا چاہیے۔ ہم میٹنگ سے باہر نکلے تو چیف سیکرٹری اور ہوم سیکرٹری نے مجھ سے پنجابی میں کہا:

''مروا دِتا ای''۔

بلاشبہ جلسہ عام سے بجائے خود ایک انتظامی اور سیکورٹی مسئلہ پیدا ہونے کا خدشہ تھا لیکن اس وقت اس سے بھی بڑی پیچیدگی پیدا ہوگئی جب ایم آر ڈی والوں نے بھی فسادی کا کردار ادا کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ 14 اگست کو وہ بھی مینارِ پاکستان پر جلسہ کریں گے۔ بیک وقت دو اعلانوں سے کشیدگی بڑھ گئی اور تصادم کا زبردست خطرہ پیدا ہوگیا۔ انتظامیہ پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ حاجی اکرم کا خیال تھا کہ جمہوریت ابھی بحال ہوئی ہے اور امن و امان میں سنگین خلل پڑنے کا مطلب ایک اور مارشل لا کو دعوت دینا ہوگا۔ کسی کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ دونوں جلسے الگ الگ مقامات پر منعقد کر لیے جائیں لیکن آئی جی پولیس (ایس ڈی جامی) اس کے حق میں بھی نہیں تھے کیونکہ راستے میں تصادم کا خطرہ تھا۔

بہر حال پی پی پی نے بعد میں اعلان کر دیا کہ ان کا جلسہ موچی گیٹ میں ہوگا۔ سہمی ہوئی

انتظامیہ اس اعلان سے بھی مطمئن نہیں ہوئی۔ مسلم لیگی قیادت پہلے دو مختلف مقامات پر جلسوں کے حق میں تھی' لیکن آخر میں خوفزدہ انتظامیہ کا نقطۂ نظر غالب رہا۔ مسلم لیگ کے صدر محمد خاں جونیجو نے لیگ کا جلسہ منسوخ کر دیا۔ وہ توقع کر رہے تھے کہ ایم آر ڈی والے بھی ایسا ہی کریں گے۔ لیکن وہ بیرون موچی دروازہ جلسہ کرنے پر مصر رہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے 144 کا سہارا لے کر رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ بے نظیر کے پنجاب میں داخلہ پر پابندی لگا دی گئی اور انہیں لاہور کے لیے روانگی سے قبل ہی کراچی میں گرفتار کر لیا گیا۔ مارشل لا ختم ہونے کے بعد کسی سیاسی سرگرمی کے خلاف یہ اولین انتظامی کارروائی تھی۔ جنرل ضیا بڑی احتیاط سے صورتِ حال پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

ایک طرف پی پی پی اور ایم آر ڈی والے جلسہ کرنے پر مصر تھے' دوسری طرف حکومت نے پابندی پر عمل درآمد کرانے کا تہیہ کر لیا۔ اندریں حالات تصادم ناگزیر نظر آنے لگا۔ پی پی پی کے کارکنوں نے مقررہ تاریخ کو دن کے تین بجے بیرون موچی گیٹ جمع ہونے کا اعلان کر دیا۔ جلسہ گاہ میں اس کے اِردگرد اور موچی گیٹ کو آنے والی تمام سڑکوں پر نیز گلیوں میں پولیس تعینات کر دی گئی۔ دوپہر کے قریب وزیرِ اعلیٰ کے پرسنل سٹاف آفیسر اسرار احمد نے مجھے بتایا کہ گوالمنڈی سے تعلق رکھنے والے لیگ کے کارکن خواجہ ریاض محمود نواز شریف کو کھلی جیپ میں شہر کا دورہ کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں کیونکہ پی پی پی میدان سے بھاگ گئی ہے۔ میاں صاحب کا یوں کھلی جیپ میں باہر نکلنا سیکورٹی اور امن و امان کے کئی مسائل کھڑے کر دیتا اور اگر تین بجے پی پی پی کارکنوں کے نکلنے کی صورت میں کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو اس کا ذمہ دار میاں صاحب کو ٹھہرایا جاتا۔ اس لیے میں نے وزیرِ اعلیٰ کو امکانی صورتِ حال کے بارے میں بریف کیا اور ان سے درخواست کی کہ شہر کا دورہ کرنے سے سے گریز کریں۔ انہوں نے میرا مشورہ قبول کر لیا۔ اسرار احمد نے بروقت اطلاع دے کر حکومت کو سیکورٹی کے بہت سے مسائل سے بچا لیا تھا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد گڑبڑ شروع ہو گئی۔ ہر طرف سے ہجوم نکلنے لگے جن کا رخ موچی گیٹ کی طرف تھا۔ پولیس نے پابندی پر عملدرآمد کی کوشش کی لیکن اس کی ساری کوششیں دھری رہ گئیں اور سرکلر روڈ اس وقت میدانِ جنگ کا منظر پیش کرنے لگی جب رانا شوکت محمود نے کوتوالی کے نزدیک پابندی کو توڑ دیا۔ ایک اور گروپ جس کی قیادت جہانگیر بدر اور ناظم شاہ کر رہے تھے' لوہاری گیٹ سے برآمد ہوا۔ لوہاری گیٹ تھانہ پر اور اس کے باہر کھڑی ہوئی گاڑیوں پر پہلے فائرنگ کی گئی اور بعد میں آگ لگا دی گئی۔ تھانہ

کے اندر پولیس والے گھیرے میں آ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مایوسی کے عالم میں اختر علی مونگا' ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کے حکم پر جو اس وقت تھانے میں موجود تھے' جوابی فائرنگ کر کے اپنی جانیں بچائیں۔

جب میں نے سنا کہ ہجوم نے پولیس والوں کا گھیراؤ کر لیا ہے اور ان پر فائرنگ کی جا رہی ہے تو میجر مشتاق احمد ڈی آئی جی لاہور سے درخواست کی کہ وہ فوراً جائے وقوعہ پر پہنچیں۔ مشتاق ایک دلیر اور صاحبِ تدبیر افسر تھے۔ وہ بلا تاخیر موقعہ پر پہنچے اور صورتِ حال کو کنٹرول کر لیا۔ پابندی توڑنے والے بہت سے افراد گرفتار کر لیے گئے اور ہجوم کو منتشر کر دیا گیا۔ اس کشمکش کے دوران نئی انارکلی کے آس پاس چار افراد مارے گئے۔

ہلاک شدگان پر کس نے فائرنگ کی اور کیوں کی؟ وہ ایک تفتیش طلب مسئلہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ چار افراد مارے جا چکے تھے اور ان کی ہلاکت مزید گڑبڑ کا سبب بن سکتی تھی۔ یہ واقعہ ایک اچھی اور شائستہ جمہوری حکومت کے لیے رسوائی کا سبب بن گیا۔ حاجی اکرم (ہوم سیکرٹری) پریشان ہو گئے۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ جنرل ضیا موقع کی تاک میں ہیں' میں نے ان کے ساتھ فون پر تبادلہ خیال کیا۔ ہم دونوں کی رائے یہ تھی کہ متعلقہ فریق کو مطمئن کرنے کے لیے معاملے کی انتہائی غیر جانبدارانہ تحقیقات کرانا ضروری ہے۔

شہر میں گڑبڑ اور چار اموات کی خبر سن کر چوہدری انور ظہور مجھ سے ملنے کے لیے میرے دفتر میں آئے۔ وہ بھی اس بات سے پریشان تھے کہ جمہوری حکومت کے خوشنما چہرے پر بدنما داغ لگ گیا ہے اور لوگ طاقت کا سہارا لینے پر نواز شریف کو مطعون کر رہے ہیں۔

''نواز شریف کو خود معلوم نہیں کہ معاملہ یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟'' میں نے وضاحت پیش کی۔

''لوگوں کو اس سے کچھ غرض نہیں۔ انہیں تو اصل نتیجہ سے غرض ہے جو نظر آ رہا ہے۔ وہ صوبہ کے وزیرِ اعلیٰ ہیں انہیں یہ ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک شریف انسان ہیں اور یقیناً پریشان ہوئے ہوں گے۔ آپ فوراً جائیں اور انہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کریں۔'' چوہدری انور نے مشورہ دیا۔

میں ان کے مشورہ پر 7 کلب روڈ (وزیرِ اعلیٰ ہاؤس) گیا۔ میاں صاحب نمازِ عصر ادا کرنے کے بعد اکیلے بیٹھے تھے اور واقعی بہت افسردہ و پریشان لگ رہے تھے۔ انہیں بحیثیت وزیرِ اعلیٰ کسی عام ہنگامے

میں اموات سے پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔

''سر جو کچھ ہوا انتہائی افسوسناک ہے۔ لیکن ہنگاموں میں تو ایسے واقعات یقیناً ظہور پذیر ہوتے ہیں۔'' میں نے دھیمے لہجہ میں کہا۔ لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں ہوئے۔

''میں جانتا ہوں کہ ان اموات سے اپوزیشن کی تحریک کو تقویت ملے گی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اب یہ ہو چکا ہے تو ایسی انتظامی تدابیر بروئے کار لانی ضروری ہیں کہ ہنگاموں پر قابو پایا جا سکے اور متاثرہ افراد کے لیے انصاف کی بہم رسانی کو یقینی بنایا جا سکے۔ اگر کسی افسر نے اپنے اختیارات کا غلط استعمال کیا ہے تو اسے اس کے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔'' میاں صاحب نے زور دے کر کہا۔

میں نے مختلف اقدامات تجویز کیے جن میں عدالتی تحقیقات کرانے کا مشورہ بھی شامل تھا۔

''مجھے تحریک کی زیادہ فکر نہیں البتہ اموات نے پریشان کر دیا ہے۔ چوہدری صاحب مرنے والوں کے پس ماندگان کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ اس بارے میں میری رہنمائی کریں۔''

''مالی امداد واحد قدم ہے جو ان کے لیے اٹھایا جا سکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ میاں صاحب انتظامی و سیاسی مضمرات کے بارے میں فکر مند ہونے کی بجائے اموات پر زیادہ غمگین تھے۔ میں ان کی تشویش میں یقیناً شامل تھا لیکن مجھے امن و امان کے پہلو سے زیادہ دلچسپی تھی۔

اس کے بعد میں حاجی اکرم سے ملنے گیا جو قریب ہی رہتے تھے۔ میں نے انہیں وزیرِ اعلیٰ کی ذہنی کیفیت کے بارے میں بتایا تو حاجی صاحب کہنے لگے: ''وہ ایک نوجوان اور رحم دل انسان ہیں اس لیے بہت زیادہ پریشان لگتے ہیں۔''

وزیرِ اعلیٰ نے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے اعلیٰ سطح کا ہنگامی اجلاس بلایا۔ جلسے جلوسوں پر دفعہ 144 کے تحت پابندی تین دن کے لیے لگائی گئی تھی۔ سعید مہدی کمشنر لاہور نے تجویز کیا کہ پابندی میں توسیع نہ کی جائے اور ایم آر ڈی کو دل کا غبار نکالنے کا موقع دے دینا چاہیے جس سے سب نے اتفاق کیا۔ وزیرِ اعلیٰ نے کمشنر کو ہدایت کی کہ متاثرہ خاندانوں کی دلجوئی پر خصوصی توجہ دی جائے۔

احتجاج کو غیر موثر کیسے بنایا جا سکتا ہے؟

ایم آر ڈی نے 14 اگست کے خونیں واقعات سے مشتعل ہو کر احتجاجی تحریک کی تاریخ جو شروع میں 20 ستمبر مقرر کی گئی تھی، پہلے کر دی۔ یہ ایک تکنیکی غلطی تھی کیونکہ انہوں نے اپنا ہوم ورک صحیح طریقہ سے

نہیں کیا تھا اور انہیں حالات سے مجبور ہو کر تیاری کے بغیر تحریک کا آغاز کرنا پڑا۔ حکومت نے جلوس نکالنے کی اجازت دے دی تاہم جہاں کہیں بھی توڑ پھوڑ دیکھنے میں آئی شرپسندوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ احتجاجی جلوس صوبہ بھر میں تین دن کے اندر ختم ہو گئے ماسوائے لاہور کے جہاں دو ہفتے تک روزانہ جلوس نکلتے رہے۔ لیکن ان کا حجم ہر روز تیزی سے سکڑتا گیا۔ پولیس نے زیادہ تر سرگرم کارکنوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ جہانگیر بدر' راؤ رشید' سلمان تاثیر اور ناظم شاہ وغیرہ لیڈر روپوش ہو گئے جبکہ دوسرے لیڈروں کی نقل و حرکت پر پابندی لگا دی گئی۔ بے نظیر کو کراچی میں ان کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔

جب انتظامی تدابیر ناگزیر ہو گئیں اور حالات نے ان کا جواز فراہم کر دیا تو پنجاب کی انتظامیہ اور پولیس نے بڑی مستعدی و پھرتی سے کام کیا۔ اس کی کمان حاجی محمد اکرم (ہوم سیکرٹری) نے سنبھال لی تھی وہ اُن انتہائی قابل سول افسروں میں سے ایک تھے جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھے۔ حاجی صاحب بظاہر بڑے شفیق و مہربان اور منصف مزاج تھے۔ لیکن جہاں قانون اور حالات کا تقاضا ہوتا' وہاں بڑی سختی کا مظاہرہ کرتے۔ اس کی وجہ ان کا یہ پختہ یقین تھا کہ اگر آدمی صحیح وقت پر فیصلہ کن انداز میں عمل نہ کرے تو بہت زیادہ جانی و مالی نقصان کا خدشہ ہوتا ہے۔ ایک باشعور اور انتھک منتظم کا فرض ہے کہ موقع کے مطابق فیصلہ کرے اور صورتِ حال کو سختی سے اور استقامت کے ساتھ کنٹرول کرے۔

ایم آر ڈی کی تحریک پر کسی مزید جانی و مالی نقصان کے بغیر قابو پا لیا گیا۔ تاہم اس نے ایک انتظامی مسئلہ کھڑا کر دیا۔ وہ یہ کہ مارشل لا کے دوران تمام اختیارات صوبائی دارالحکومت میں مرتکز کر دیئے گئے تھے۔ مشکوک افراد کی نظر بندیاں اور گرفتاریاں سپیشل برانچ کی فہرستوں کے مطابق کی گئی تھیں۔ جو جامع یا حقیقت پر مبنی نہیں تھیں کیونکہ صدر دفتر دور تھا اور اضلاع میں نچلے درجہ کا سٹاف معیار کے مطابق نہیں تھا۔ ان فہرستوں اور دیگر ناقص و نامکمل معلومات کی بنیاد پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو ہر قسم کی ہدایات جاری کر دی گئیں۔ یہ ایک غیر تسلی بخش انتظام تھا۔ خصوصاً ہنگامی حالات یا سیاسی ہنگاموں میں اس کی کوئی افادیت نہیں تھی۔

میں نے وزیر اعلیٰ کو تجویز پیش کی کہ اختیارات کا ارتکاز ختم کر دیا جائے اور ڈی ایم (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) نیز ایس پی صاحبان کو یہ اجازت دے دی جائے کہ دستیاب معلومات کی روشنی میں فوری کارروائی کر سکیں اور ہدایات کے لیے دارالحکومت کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے اختیارات سے کام لیں۔ ڈی ایم قانونی اتھارٹی ہوتا ہے۔ حکومت کو اس کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ ماسوائے یہ کہ

اسے بروقت معلومات اور مطلوبہ رابطہ فراہم کر دیا جائے۔ تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور ایس پی صاحبان کو ہدایت کر دی جائے کہ حکومت ان سے امن وامان قائم رکھنے کی توقع رکھتی ہے' اس لیے کسی شخص کو نظر بند کرنا چھوڑنا یا کوئی دیگر قانونی کارروائی کرنا ان کی صوابدید پر منحصر ہوگا۔ یہ ایک قانونی درست اور کامیاب طریق کار تھا جو عرصہ دراز سے مروج تھا۔

وزیرِ اعلیٰ نے چیف سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل کے مخالفانہ خیالات کے باوجود میری تجویز سے اتفاق کیا۔ ضلعی انتظامیہ کو اختیارات تفویض کرنے کے دوررس نتائج نکلے کیونکہ ذمہ دار افسروں نے صوبائی دارالحکومت کی بے محل اور دیر سے موصول ہونے والی ہدایات پر عمل کرنے کی بجائے موقع پر ہی حقیقت پسندانہ فیصلے کر لیے۔

ایم آر ڈی کی احتجاجی تحریک میں غلط رخ اختیار کرنے اور موقع ومحل کے بغیر شروع ہونے کی بنا پر جوش وخروش پیدا نہیں ہوسکا۔ چھوٹے صوبوں خصوصاً سندھ کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات نے سیاسی اتحادوں اور گروپوں کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایم آر ڈی نے اپنی بچی کھچی سیاسی قوت ضائع کرنے کے بعد اپنی بلا مقصد تحریک رسمی طور پر ختم کر دی اور وقتی طور پر سیاسی منظر سے غائب ہوگئی۔

بہرحال نوکر شاہی نے جو غیر ضروری اشتعال پیدا کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ مخالفانہ سرگرمیوں کا موقع فراہم کر دیا۔ نوکر شاہی کی بھاری غلطیوں کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن میں یہاں محض چند واقعات نقل کرنے پر اکتفا کروں گا۔

تحریک کے دوران بہت سے لیڈروں کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے تھے۔ ان میں سے بعض کو گرفتار کر لیا گیا جب کہ دوسرے زیرِ زمین چلے گئے۔ ان میں راؤ رشید بھی شامل تھے جو تحریک کے ملتوی ہونے تک چھپے رہے۔ وہ میرے آئی جی رہ چکے تھے۔ انہوں نے اپنے دوست ملک وارث (ریٹائرڈ ڈی ایس پی) کے ذریعے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ آیا وہ ابھی تک پولیس کو مطلوب ہیں؟ چونکہ تحریک ختم کر دی گئی تھی اس لیے کسی شخص کو گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ سرگرم اور سرکردہ لیڈروں کی گرفتاری' صورتِ حال کو کنٹرول کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ اگر اسے جاری رکھا جاتا تو نقصان دہ ثابت ہوتا اور احتجاج کو طول دینے کا سبب بن جاتا۔ اس کے باوجود جب میں نے ذمہ دار افسروں سے راؤ

رشید کے وارنٹ واپس لینے کو کہا تو انہوں نے میری بات نہیں مانی۔ ان کا زاویہ نظر یہ تھا کہ اگر وارنٹ پر عملدرآمد کرانا مطلوب نہیں تھا تو اس کے جاری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ وارنٹ جس مقصد کے لیے جاری کیا گیا تھا' وہ مقصد پہلے ہی پورا ہو چکا ہے۔ مگر میری کوئی بھی دلیل کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ ان کے نزدیک وارنٹ کا اجرا زیادہ اہمیت رکھتا تھا جبکہ تحریک یا احتجاج غیر متعلقہ تھا۔

میں نے وزیر اعلیٰ سے ملاقات کی اور زیر التوا وارنٹوں کی ضرورت ختم ہو جانے کے بارے میں بات چیت کی۔ وہ معاملہ کو فوراً سمجھ گئے اور تمام غیر تعمیل شدہ وارنٹ واپس لینے کا حکم دے دیا۔ تاہم متعلقہ افسر خوش نہیں تھے۔ میری تجویز یہ بھی تھی کہ تلخی اور کشیدگی کم کرنے کے لیے زیرِ حراست کارکن رہا کر دیے جائیں۔ اس کی بھی مخالفت کی گئی۔ اہلکار اذیت دینے کی ذہنیت رکھتے ہیں اور بدلتے ہوئے حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ نواز شریف اپنے کھلے اور متحرک ذہن کے ساتھ بات کو فوراً سمجھ گئے اور نظر بندی کے جملہ احکام منسوخ کر دیے۔ پولیس نے 14 اگست کے واقعہ کی بابت نامعلوم احتجاج کنندگان کے خلاف قتل' آتش زنی اور توڑ پھوڑ کے مقدمات درج کر لیے۔ ایک طرف جہانگیر بدر' سلمان تاثیر اور ناظم شاہ کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرایا گیا۔ دوسری طرف پیپلز پارٹی نے نواز شریف کے خلاف کیس درج کرایا جس میں انہیں قتل کی وارداتوں کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ سیاسی لڑائی گلیوں سے تھانوں اور عدالتوں میں منتقل ہو رہی تھی۔ دونوں طرف سے لگائے گئے الزامات سے انتقام اور غلط بیانی کی بو آ رہی تھی۔ جس سے ماحول کے کشیدہ اور غلط روایات قائم ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

حاجی اکرم کی رائے یہ تھی کہ سیاسی عمل کو پراگندہ نہیں ہونا چاہیے جس میں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا جائے۔ میں نے ان کے خیالات سننے کے بعد عرض کیا کہ:

''یہ کوئی نئی بات نہیں۔''

''ہاں یہ درست ہے۔ تاہم میاں صاحب کے دور میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے۔ وہ خدا سے ڈرنے والے شریف النفس انسان ہیں اور ہمیں ان کو ایسے واقعات سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کے گرد چند بدقماش افراد اکٹھے ہو گئے ہیں۔ اگر ایک دوسرے کے خلاف جھوٹے کیس درج کرانے کا سلسلہ چل نکلا' جیسا بھٹو دور میں ہوا کرتا تھا' تو ایک شیطانی چکر شروع ہو جائے گا جو پورے جمہوری نظام کا ستیاناس کر دے گا۔'' انہوں نے گہری تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''اب کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔

''آیئے ان سے ملتے ہیں اور انہیں ایسی بے بنیاد باتوں کے خراب نتائج کے بارے میں بریف کرتے ہیں۔ ایسی باتیں کسی کے مفاد میں نہیں جاتیں۔ بلکہ ہر شخص کو ایسی دلدل میں دھنسا دیتی ہیں جس میں سے کوئی بھی نہیں نکل سکتا۔ ہمیں اخلاقی جرأت کے ساتھ صحت مند روایات قائم کرنی چاہئیں۔'' انہوں نے جواب میں کہا۔

''ہمیں اس معاملے پر آئی جی کے ساتھ بھی تبادلۂ خیال کرنا چاہیے۔'' میں نے تجویز کیا۔

''نہیں' اس سے سارا معاملہ خراب ہو جائے گا۔'' حاجی اکرم نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

''ہمیں اکیلے میاں صاحب کو قائل کرنا چاہیے اور انہیں بدمعاش لوگوں کے غلط مشوروں سے بچانا چاہیے۔ انہیں ان مکار لوگوں کے جال میں پھنسنے سے بچنا چاہیے۔ میاں صاحب کو قابلِ فخر روایات قائم کرنی چاہئیں۔''

''ممکن ہے نواز شریف کو ان سارے واقعات کا پوری طرح علم ہی نہ ہو۔'' میں نے کہا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ آیئے ہم چلیں اور انہیں بریف کریں۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہم سیدھے 7 کلب روڈ پہنچے۔

وزیراعلیٰ نے حاجی اکرم کے خیالات سے مکمل اتفاق کیا اور انہیں تفتیش کی نگرانی کرنے کی ہدایت کی تاکہ کوئی بھی قدم حقائق اور میرٹ کے خلاف نہ اٹھایا جائے۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ جہانگیر بدر اور پی پی پی کے دوسرے لیڈروں کے خلاف شکایت ایک ریٹائرڈ پولیس افسر کے ذریعے موصول ہوئی تھی۔ حاجی اکرم نے گزارش کی: ''میاں صاحب براہ کرم پولیس افسروں کے مشورہ کے سلسلہ میں پوری احتیاط برتیں۔ بھٹو کو پولیس افسروں کے غلط مشوروں نے ہی مروایا تھا جو صرف اتنا جانتے تھے کہ جھوٹے مقدمات کا حربہ کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔ بھٹو ان کے شیطانی چکر میں پھنس گئے۔ آپ کو اس جال سے بہر صورت بچنا ہوگا۔''

وہ سارے مقدمات میرٹ پر نمٹا دیے گئے جن میں جانبداری کا قطعاً دخل نہیں تھا۔ حاجی اکرم نے نواز شریف کو سیاسی مخالفین کے ساتھ جھوٹے مقدمات کے سہارے لڑنے کی غلطی سے بچالیا۔ میاں صاحب بذاتِ خود مثبت اخلاقی سوچ رکھتے تھے' تاہم حاجی اکرم نے ان کے نقطۂ نظر کو دانشمندانہ مشورہ سے

تقویت پہنچائی۔ نواز شریف نے اس کے بعد بحیثیت وزیرِ اعلیٰ اپنے پورے دور میں کبھی دفعہ 144 نافذ نہیں کی۔ انہوں نے جھوٹے مقدمات درج کرانے یا جابرانہ طاقت کے استعمال پر انحصار نہیں کیا۔ ان کا امیج اس وقت یقیناً خراب ہوا جب انہوں نے ٹکا اقبال' سلمان تاثیر' ڈاکٹر ملیحہ لودھی (ایڈیٹر نیوز اسلام آباد) اور چوہدری غلام حسین (مالک و مدیر ہفت روزہ "سیاسی لوگ") اور فیکٹس انٹرنیشنل کے خلاف مقدمات میں اس پالیسی کو نظر انداز کر دیا۔

بدمزاج لوگوں کو رام کرنا

سیاسی مخالفین کے ساتھ منصفانہ اور ہمدردانہ سلوک کر کے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے اور غیر ضروری مسائل سے بچنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ناظم حسین شاہ کو ایک ایف آئی آر میں ملزم نامزد کیا گیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے دو بار میرے گھر آئے۔ وہ بے حد پریشان لگ رہے تھے۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ جب تک نواز شریف وزیرِ اعلیٰ ہیں، کوئی زیادتی نہیں ہوگی، مگر انہیں یقین نہیں آیا۔ آخرِ کار ان کے خلاف وہ کیس خارج کر دیا گیا۔ ناظم شاہ اور جہانگیر بدر میں' جنہیں گرفتار بھی نہیں کیا گیا، اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ نواز شریف کو انصاف کرنے کا کریڈٹ دیتے۔ دوسری طرف اقتدار کے اعلیٰ ایوانوں میں نواز شریف پر الزام لگایا جا رہا تھا کہ وہ پی پی والوں کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔

معمول کے مطابق راولپنڈی اور اسلام آباد میں اہم لوگ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اگر پی پی کے لیڈروں کو اس جھوٹے کیس میں پھنسا دیا جاتا تو اس پارٹی کی کمر ٹوٹ جاتی۔ وہ مخالفین کے خلاف جھوٹے مقدمات کے استعمال کا تجربہ رکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس بات کو درست مان لیا کہ نواز شریف نے ایک دولت مند آدمی ہونے کی بنا پر پی پی کے لیڈروں خصوصاً جہانگیر بدر کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کر لیا ہوگا۔ حتیٰ کہ انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر میاں اسلم حیات بھی اس افواہ پر یقین کر بیٹھے۔ انہوں نے مجھ سے دوٹوک انداز میں پوچھا: "کیا جہانگیر بدر اور نواز شریف کے مابین کوئی معاملہ طے پا گیا ہے؟"

"نہیں سر' میری معلومات کی حد تک کوئی ڈیل نہیں ہوئی۔ البتہ ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران اور اس کے بعد ان کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کیا گیا جو کامیابی کا سبب بنا۔" میں نے جواب دیا۔

میاں اسلم حیات نے جو بذاتِ خود بڑے شریف آدمی ہیں' میری بات پر یقین کر لیا جبکہ اکثر لوگوں کو اس بات پر یقین نہیں آیا کہ کوئی شخص گھسے پٹے راستے پر چلے بغیر کامیاب ہو سکتا ہے۔ ان

کے ذہنوں کو سالہا سال کی چالبازیوں اور بدمعاشیوں نے خراب کر دیا تھا اور وہ اس چکر سے کبھی نہیں نکل سکے۔

ایم آر ڈی کی تحریک میں مختلف تنظیموں سے تعلق رکھنے والے محنت کشوں کا بڑا حصہ تھا۔ ان میں اے این پی کے افراد سب سے نمایاں تھے۔ طارق لطیف جو بڑے مشہور لیبر لیڈر اور نیپ کے صوبائی صدر تھے' وہ اس وقت سے میرے دوست تھے جب میں 1973ء میں لاہور کا ایس پی تھا۔ طارق نے مجھ سے کہا کہ اگر اُسے گرفتار نہ کیا جائے تو وہ اے این پی کے مزدوروں کو ایک مرحلہ وار پروگرام کے تحت پانچ دنوں میں تحریک سے نکال لے گا۔ نواز شریف صنعت کار ہونے کی بنا پر اس بات کو ذاتی طور پر پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اسے ناقابلِ اعتماد بھی سمجھتے تھے۔ وہ طارق کو جیل میں ڈلوانا چاہتے تھے' اس لیے اسے گرفتاری سے بچانا انتہائی مشکل تھا۔ بہر حال میں نے کوشش جاری رکھی۔

ایک دن مناسب موقع دیکھ کر میں نے وزیر اعلیٰ سے کہا: ''سر آپ امن چاہتے ہیں اور میں بھی تشدد آمیز ذرائع اختیار کیے بغیر امن قائم کرنے کا خواہاں ہوں۔ مجھے اس سے نمٹنے کا موقع دیں۔ وہ میرا دوست ہے۔'' میں نے دست بستہ گزارش کی۔ میاں صاحب نے میری بات مان تو لی مگر انتہائی ہچکچاہٹ کے ساتھ۔ طارق نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور اپنے مزدور تحریک سے الگ کر لیے۔ جب میں نے میاں صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا:

''آپ بڑے کامیاب سیاستدان ہیں۔''

''نہیں سر' میں سیاستدان نہیں ہوں۔'' میں نے احتجاج کے لہجے میں کہا۔ ''میں طاقت کے غیر ضروری استعمال یا بنی نوع انسان کو زنجیروں میں جکڑنے کے خلاف ہوں۔ اچھے پولیس افسر کو کم سے کم طاقت استعمال کرنی چاہیے اور وہ بھی اس وقت جب ناگزیر ہو جائے۔ پولیس افسر کا بنیادی فرض مسائل کو حل کرنا ہے اور میں نے یہی کچھ کیا ہے۔'' وہ میری بات پر زیرِ لب مسکرائے۔

چوہدری انور ظہور اور غلام میراں کاشمیری بالترتیب ٹرانسپورٹ اور بینکاری میں انتہائی مشہور لیبر لیڈر اور میرے دوست تھے۔ انہوں نے بھی اپنے آدمی تحریک سے الگ کر لیے۔ اس طرح کسی مزدور رہنما کو جیل بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اسی طرح طلبا کے ساتھ شرافت اور نرمی کا برتاؤ کیا گیا۔ مزدوروں' طالب علموں اور سیاسی کارکنوں کے ساتھ باوقار اور دانشمندانہ سلوک نے آنے والے برسوں کے لیے عدم تشدد کی راہ ہموار کر دی۔ معاشرہ کو ریاستی جبر کے اندھا دھند استعمال نے خوفزدہ کر دیا تھا۔ تاہم صوبائی

انتظامیہ کے شریفانہ سلوک نے احتجاج کی لہر کو ٹھنڈا کر دیا۔

وہ سرکاری ملازمین اور پولیس افسران جنہیں دہشت پھیلانے اور تشدد کرنے کے علاوہ کوئی گر یاد نہیں تھا' بڑے مایوس ہوئے۔ وہ نواز شریف کو ''کمزور حکمران'' اور مجھے ''سیاستدان'' کہنے لگے۔ اس قسم کی باتیں ان کے کانوں تک بھی یقیناً پہنچتی ہوں گی' ''شرافت کو کمزوری سمجھا جاتا ہے۔'' وہ بعض اوقات کہا کرتے تھے۔ اس وقت تک مجھے پتہ چل گیا تھا کہ بعض بدقماش افراد واقعی ان کے گرد اکٹھے ہوگئے ہیں۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پی پی پی کی ریلی

پیپلز پارٹی کی طرف سے اکتوبر 1986ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے مقام پر ایک کسان ریلی منعقد کرنے کا اعلان کیا گیا اور غیاث الدین جانباز چیف منتظم بنا دیے گئے۔ انتظامیہ پریشان ہوگئی کیونکہ ایوب خان کے خلاف احتجاج کے دوران اسی مقام پر مولانا بھاشانی کے زیر قیادت جوز بردست اور پُر تشدد ریلی ہوئی تھی۔ اس کی تلخ یادیں ابھی تک باقی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کوئی متاثر کن شو نہیں ہوگا۔ لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر نے جو ان دنوں سپیشل برانچ میں بطور اوایس ڈی کام کر رہے تھے' ایک تفصیلی رپورٹ تیار کی اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ طاقت کا اوسط درجے مظاہرہ ہوگا۔

چوہدری صدیق چیف سیکرٹری نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے اور ریلی پر پابندی لگانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن میں نے اس بنا پر مخالفت کی کہ آزادی اظہارِ رائے وتقریر پر پابندی لگانا جمہوری حکومت کو زیب نہیں دیتا۔ وہ میری بات مان گئے' تاہم انتظامیہ کے لیے امن وامان کے وسیع انتظامات کرنے کی غرض سے کڑی ہدایات جاری کر دیں۔ وہ واقعی اوسط درجے کا شو ثابت ہوا' جیسا کہ کرنل سلطان حیدر کا اندازہ تھا۔

میں بار بار ''جمہوری حکومت'' اور ''جمہوری اصولوں'' کا جو حوالہ دیتا تھا تو بہت سے افسر مجھے ترچھی نظر سے گھورتے تھے۔ طویل عرصہ تک آمرانہ حکومتوں کے برسر اقتدار رہنے کی وجہ سے ایسا ہونا بالکل فطری تھا۔ تاہم میں نے اپنے پختہ یقین کی بدولت اپنا کام جاری رکھا۔ میں نے جمہوری نظام کو مستحکم کرنے کے لیے دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کی کیونکہ میں آمروں کی تنگ نظری اور موقع پرستی کے باعث ملک

کی شکست وریخت کا منظر قریب سے دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ میں نے خلوصِ نیت سے اعلانیہ طور پر کوشش کی کہ امن وامان کے لیے جمہوری رویوں کے فوائد کو اُجاگر کیا جائے۔ امنِ عامہ کو مشتعل لوگ خراب کرتے ہیں جو موجودہ صورتِ حال سے خوش نہیں ہوتے۔ اگر انہیں تقریروں اور جلوسوں کے ذریعے دل کا غبار نکالنے کی اجازت دے دی جائے تو احتجاج اور تشدد ختم ہو جاتا ہے۔ جمہوری حکومتیں امن وامان قائم رکھنے کے لیے غصے کی لہروں کو بہہ جانے کی اجازت دے کر زیادہ عقلمندی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ وہ ان لہروں کی راہ میں پل اور ڈیم تعمیر کر کے رکاوٹ نہیں ڈالتیں۔ جب آمروں کے پوری احتیاط سے تعمیر کردہ پل اور ڈیم پھٹتے ہیں تو راستے میں آنے والی ہر شے خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے۔



باب25

نواز شریف کے خلاف گٹھ جوڑ

جو لوگ اندھی طاقت کے مؤثر ہونے پر یقین رکھتے تھے' انہوں نے نواز شریف کی شرافت کو انتظامیہ پر ان کی ڈھیلی گرفت سے تعبیر کیا۔ جاگیرداروں کا خیال تھا کہ ایک نوجوان جو کاروباری اور صنعتی پس منظر رکھتا ہے' ایسے صوبے پر حکومت نہیں کر سکتا جس میں جاگیرداروں اور زمینداروں کو غلبہ حاصل ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان میں سے کوئی جاگیردار پنجاب کا حکمران بنے جو گھوڑے پر سوار ہو اور اپنے ہاتھ میں چابک رکھتا ہو۔ وسط 1986ء میں پیر پگاڑا نے اچانک میاں صاحب کے خلاف تند وتیز بیانات

دینے شروع کردیے۔ ملک اللہ یار کھنڈا، سردار ظفر اللہ خان [illegible] میاں آصف، عابدہ حسین، میاں صلاح الدین، احمد سعید کرمانی، مخدوم زادہ حسن محمود، یوسف رضا گیلانی اور پرانی نسل سے تعلق رکھنے والے دیگر جاگیردار بھی اعلانیہ ان کی مخالفت کرنے لگے۔

پیر پگاڑا کے مخالفانہ طرزِ عمل کو وزیراعظم محمد خان جونیجو کی طرف سے مخالفت کی علامت سمجھا گیا۔ کیونکہ وہ پیر پگاڑا کے گہرے عقیدت منداور مرید تھے۔ اختلاف کرنے والوں نے یہ تاثر دینا چاہا کہ نواز شریف کو وزیراعظم بھی پسند نہیں کرتے۔ اس قسم کی افواہیں بھی پھیلائی گئیں کہ نواز شریف نہ تو سیاسی پس منظر رکھتے ہیں، نہ ہی مسلم لیگ میں ان کا کوئی اپنا گروپ ہے، اس لیے وہ ارکان اسمبلی کو کنٹرول نہیں کرسکتے۔ اسمبلی بذاتِ خود مختلف النوع افراد کا رنگ برنگا ہجوم تھا جو غیر جماعتی الیکشن میں محض اپنی قوتِ بازو سے منتخب ہوئے تھے۔ وہ کسی پارٹی ڈسپلن کے پابند نہیں تھے نہ ہی ان کے سامنے کوئی مشترکہ نصب العین تھا جو مشترکہ جدوجہد میں نظریاتی جوش وجذبہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔

نواز شریف نے جو فطرتاً بڑے فراخ دل ہیں صوبائی اور قومی اسمبلی کے اراکین پر دل کھول کر نوازشیں کیں جن میں رہائشی اور تجارتی پلاٹوں کی الاٹمنٹ، ان کے رشتے داروں کے ان کی پسند کے مطابق تبادلے اور ان کے قریبی اعزہ کی باوقار عہدوں پر تقرریاں شامل تھیں۔ جس کے لیے انہیں قواعد وضوابط میں بھی نرمی کرنی پڑی۔ اس طرح انہوں نے ان کے دلوں میں خاصی جگہ بنالی۔ سیاست کے پرانے کھلاڑیوں کو ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ناگوار گزری۔ انہوں نے میاں صاحب پر کرپشن اور عورتوں سے معاشقوں کے الزامات لگا کر ان کی پشت میں چھرا گھونپنے کی کوشش کی۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان تھے، اس لیے مخالفین نے ہر قسم کے معاشقے ان سے منسوب کردیے۔ بہرحال اس منفی پروپیگنڈہ کا زیادہ اثر نہیں ہوا۔

اقتدار کی کشمکش نے جلد ہی طبقاتی جنگ کی شکل اختیار کرلی۔ جاگیردار اور زمیندار صدیوں سے حکمرانوں کے ساتھ اقتدار میں شریک چلے آرہے تھے۔ زمین اُن کی آمدنی کا اہم ذریعہ تھی۔ جبکہ فوج اور زمیندار بادشاہوں اور کاشتکاروں کے مابین رابطہ کا کام دیتے تھے۔ یہ سلسلہ برطانوی راج کے دوران بھی چلتا رہا اور آزادی کے بعد بھی قائم رہا۔ حالیہ برسوں میں صنعت وتجارت کے ظہور اور دیہی آبادی کی شہروں کی طرف نقل مکانی سے نیا طبقہ وجود میں آیا۔ اس طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے نواز شریف نے ایک حریف قوت کی شکل اختیار کرلی۔ بعض جاگیردار سیاستدانوں نے مجھ سے کہا کہ اگر وہ کامیاب ہوگئے تو دوسروں کی حوصلہ افزائی ہوگی اور اقتدار پر جاگیرداروں کی گرفت کمزور پڑ جائے گی۔ اس لیے انہیں نواز

شریف کا تختہ الٹنا پڑے گا اور انہوں نے اس کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

پرویز الٰہی مقابلہ پر آ گئے

جولائی 1986ء میں ملک وارث جو ایک ریٹائرڈ ایس پی تھے' یہ خبر لائے کہ پنجاب کے وزیر بلدیات چوہدری پرویز الٰہی کی پیٹھ ٹھونکی جارہی ہے کہ وہ نواز شریف کی جگہ لینے کے لیے میدان میں آ جائیں۔ وارث کو یہ بات چوہدری تجمل حسین (ایم این اے) نے بتائی تھی جو چوہدری پرویز الٰہی کے قریبی رشتہ دار تھے۔ چوہدری شجاعت حسین ان دنوں وفاقی کابینہ میں شامل تھے۔ ظہور الٰہی خاندان کو پنجاب میں سیاسی لحاظ سے بہت مضبوط سمجھا جاتا تھا۔ چوہدری پرویز الٰہی کو مسلم لیگ کے صدر جونیجو کے مرشدِ خاص پیر پگاڑا کی اشیرباد بھی حاصل تھی۔ میاں صاحب کے دیگر مخالفین اور جاگیردار بھی وقت آنے پر پرویز الٰہی کی حمایت کے لیے تیار ہو گئے۔

سیاسی منظر واقعی بڑا بھیانک تھا۔ نواز شریف ایک معصوم فاختہ کی طرح لگتے تھے جس پر بھوکے باز اپنے تیز پنجوں کے ساتھ جھپٹنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ میں نے سپیشل برانچ کے سربراہ کی حیثیت سے حاجی اکرم (ہوم سیکرٹری) کو معاملہ سے آگاہ کیا۔ وہ بہت پریشان ہوئے کیونکہ ایسا گٹھ جوڑ اس کمزور جمہوری نظام کے لیے ضرر رساں ثابت ہو سکتا تھا جو ابھی دنوں بحال ہوا تھا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ میں وزیر اعلیٰ کو پرویز الٰہی کی متوقع بے وفائی سے آگاہ کروں اور بتاؤں کہ اس کے بعد مخدوم الطاف احمد (وزیرِ خزانہ) اور پھر دوسرے وزرا بھی ساتھ چھوڑ جائیں گے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ ''کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ میں پہلے اس خبر کی مزید تصدیق کرلوں' سازش کی گہرائی کا تعین کرنے کے بعد وزیر اعلیٰ کو مطلع کروں؟''

''ٹھیک ہے' ایسا کرنا بہتر ہوگا' تاہم آپ کو پھرتی سے کام کرنا چاہیے مبادا وقت ہاتھ سے نکل جائے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

میرے دیگر ذرائع سے موصول شدہ خبر کی تصدیق ہوگئی۔ حاجی اکرم نے بھی اپنے آزاد ذرائع سے اسی طرح کی تصدیق حاصل کرلی۔ میں نے ہر ضلع میں سیاسی گروپ بندیوں اور فریقین کے مابین محاذ آرائی کی صورت میں متوقع صف بندیوں کا تجزیہ مرتب کیا۔ پوری طرح باخبر ہونے کا مطلب تھا کہ وہ

پوری طرح تیار رہیں۔ کسی واقعہ پر ردِعمل ظاہر کرنے کی بجائے اس کی بابت قبل از وقت سوچنا اور پیش بندی کرنا فائدہ مند ہوتا ہے۔ میں نے صوبہ بھر کے ایم پی ایز اور ایم این ایز کے گروپ اور رشتہ داریاں ظاہر کرنے والے چارٹس تیار کیے۔

تمام اضلاع میں ایک دوسرے کے مخالف جاگیردار اور سیاسی خاندان موجود تھے جو ہمیشہ برسرپیکار رہتے تھے۔ میرے تجزیہ میں یہ بات کہی گئی تھی کہ میاں صاحب واحد لیڈر ہیں جو اس طرح کے مخالف عناصر کو غیر جماعتی ایوان میں اکٹھا رکھ سکتے ہیں۔ چوہدری پرویز الٰہی زیادہ سے زیادہ ہر ضلع میں ایک گروپ یا ایک آدھ ایم پی ایز کو توڑ سکتے ہیں۔ دوسرا گروپ لازماً ان کی مخالفت کرے گا۔ اس طرح نواز شریف جو سیاست میں نووارد ہیں کسی پیشگی صف بندی کے بغیر زیادہ سے زیادہ ایم پی ایز کو اپنے ساتھ رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

جنرل ضیا غیر جانبدار بن گئے

میاں صاحب شروع میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے کہ چوہدری پرویز الٰہی ان کے خلاف توڑ جوڑ میں شریک ہیں' اگرچہ انہیں اپنے سیاسی ذرائع سے اپنے خلاف بعض اقدامات کی اطلاعات مل چکی تھیں۔ وہ اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے جوابی اقدامات کرنے لگے۔ حاجی اکرم نے وزیر اعلیٰ کو مشورہ دیا کہ جنرل ضیا کی حمایت حاصل کی جائے' لیکن میں خاموش رہا۔ واپسی پر میں نے حاجی اکرم سے کہا کہ جنرل ضیا اپنا آپشن کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ قبل از وقت قدم نہیں اٹھائیں گے۔ کیونکہ وہ ایک انتہائی پراسرار کھیل' کھیل رہے ہیں۔ جنرل صاحب پنجاب کے وزیر اعلیٰ کو وزیر اعظم کا توڑ کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کھل کر اس کی حمایت کریں گے جو ایوان میں اپنی اکثریت ثابت کرنے کی پوزیشن میں ہوگا۔ مجھے یہ بات ''سیاسی لوگ'' کے ایڈیٹر رائے سعید ایم پی اے اور جنرل ضیا کے بہنوئی ڈاکٹر بشارت الٰہی کے ذریعے معلوم ہوئی تھی۔

''آپ نے میاں صاحب کو یہ بات کیوں نہیں بتائی؟'' حاجی اکرم نے مجھ سے سوال کیا۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہمت ہار بیٹھتے۔ انہیں سیاسی طور پر کامیابی حاصل کرنے دیں۔ اس عمل سے گزریں گے تو ان میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں گے۔ مزید برآں اس وقت صدر کے رویہ کی بابت کوئی قیاس آرائی کرنا اپنی بریفنگ کو خود خراب کرنے والی بات ہوگی

جو خطرہ سے خالی نہیں۔'' حاجی صاحب نے میری رائے سے اتفاق کیا۔

چند دن بعد چوہدری پرویز الٰہی اقتدار کے لیے قسمت آزمائی کرنے کی غرض سے کھل کر سامنے آ گئے۔ اسمبلی چیمبر میں میری ان سے ملاقات ہوئی تو مجھے ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے۔

''آپ نواز شریف کا اس طرح کھل کر اور ثابت قدمی سے کیوں ساتھ دے رہے ہیں؟ جب کہ اگلے چند دنوں میں ان کا دھڑن تختہ ہونے والا ہے۔ ہر شخص میرے ساتھ ہے' کوئی بھی ان کا ساتھ نہیں دے گا۔ بریگیڈیئر قیوم' میری حمایت کرنے کے لیے ایبٹ آباد سے آ رہے ہیں۔ آپ تذبذب میں کیوں پڑے ہوئے ہیں؟''

''کیونکہ وہ وزیر اعلیٰ ہیں اور انہیں باخبر رکھنا میری ذمہ داری ہے۔ میں صرف اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ میں نہ تو اپنے فرائض سے تجاوز کر رہا ہوں نہ ہی کسی کی طرفداری۔ میرے خیال میں میاں صاحب کو کسی طور شکست نہیں ہو گی۔ آپ ان کے ساتھ اپنے دیرینہ خوشگوار تعلقات کیوں خراب کر رہے ہیں؟''

میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ دوٹوک جواب دیا۔

انہیں یہ بات اچھی نہیں لگی' کہنے لگے۔

''حاجی اکرم' ڈاکٹر صفدر محمود اور آپ صرف تین افسر ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ وہ اپنی سیٹ پر قائم رہیں گے۔''

''ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ تاہم صورتِ حال کے بارے میں ہمارا قیاس یہی ہے۔'' میں نے ان کو صاف اور کھری بات بتا دی۔ اس کے بعد بھی میں ان کے ساتھ خلوص سے پیش آتا رہا۔

بریگیڈیئر قیوم واقعی ایبٹ آباد سے آئے اور صباح الدین جامی (آئی جی) کے ہاں قیام کیا۔ انہوں نے فریقین کے مابین صلح کرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔

صورتِ حال بلا شبہ غیر یقینی تھی۔ دونوں طرف سے بہت زیادہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا تھا اور جھوٹی افواہیں پھیلائی جا رہی تھیں۔ ہر فریق ناشتہ' لنچ یا ڈنر کا اہتمام کر کے اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہا تھا' جبکہ بعض اراکین اسمبلی نے دونوں طرف ضیافتیں اڑائیں۔ یہ سوچ بتدریج غالب آنے لگی کہ پرویز الٰہی بازی جیت جائیں گے۔ کیونکہ وہ سیاسی پس منظر رکھتے تھے اور طاقتور لابیاں ان کی حمایت کر رہی تھیں۔ لیکن میں اپنی رائے پر قائم رہا۔

اکتوبر 1986ء میں اسمبلی کا اجلاس فوری امور کے لیے بلایا گیا۔ اگر اسمبلی حکومت کے حق میں اکثریت کا اظہار کیے بغیر ملتوی کر دی جاتی تو شر پسند غیر یقینی صورتِ حال کا بھرپور فائدہ اٹھاتے۔ غیر جمہوری قوتیں خاموشی سے صورتِ حال کا جائزہ لے رہی تھیں اور حاجی اکرم نے نوزائیدہ جمہوریت کو نقصان پہنچنے کا جو خدشہ ظاہر کیا تھا' وہ بلا جواز نہیں تھا۔

اعتماد کا ووٹ

حاجی اکرم اور میں نے ڈاکٹر صفدر محمود کے ساتھ صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیا۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ نواز شریف کو سیشن کے آخری روز اعتماد کا ووٹ حاصل کر لینا چاہیے تاکہ غیر یقینی صورتِ حال کا خاتمہ ہو سکے اور ان کے خلاف جو مہم چل رہی ہے' وہ دم توڑ جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بارے میں وزیرِ اعلیٰ کے چھوٹے بھائی شہباز شریف سے بات کی تو انہوں نے اس رائے کی مخالفت کیا اور خدشہ ظاہر کیا کہ ایسا قدم نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

بہر حال ہماری پختہ رائے یہی تھی کہ مسئلہ کا واحد حل اعتماد کا ووٹ ہے۔ وگرنہ ایم پی ایز کو پروپیگنڈہ کے توڑ جوڑ سے گمراہ کیا جا سکتا ہے جب وہ کسی ایک مقام پر اکٹھے نہ ہوں۔ ہم نے وزیر اعلیٰ سے بات کی۔ میں نے اپنا تجزیہ تحریری طور پر پیش کر دیا۔ جس میں نشان دہی کی گئی تھی کہ 260 کے ایوان میں ان کی پارٹی کے زیادہ سے زیادہ 18 ارکان ان کے خلاف ووٹ دیں گے۔ اس لیے انہیں ڈرنے یا فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

وزیر اعلیٰ نے 23 اکتوبر کو انتہائی جذباتی تقریر کے بعد اعتماد کا ووٹ مانگا۔ ایوان میں موجود مسلم لیگ کے جملہ اراکین اسمبلی نے ماسوائے پانچ کے بلند آواز اور پُر جوش نعروں کے ساتھ اپنی حمایت کا اعلان کیا۔ یوں میاں صاحب نے ایوان کا اعتماد حاصل کر کے اپنے سیاسی مستقبل کو بچا لیا۔

نواز شریف نے اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کے لیے ذاتی اثر و رسوخ اور انتظامیہ کو استعمال کیا۔ انہوں نے ایم پی ایز کو خوش رکھنے کے لیے انہیں ترقیاتی فنڈز دیئے' تبادلوں اور تعیناتیوں میں ان کی خواہش کا احترام کیا اور بہت سے طریقوں سے نوازا' تاہم جبر اور دباؤ ڈالنے کے لیے پولیس سے کام نہیں لیا۔ اس طرح وہ اس تباہی سے بچ گئے جو بھٹو نے شیطان صفت اور بد اندیش پولیس افسروں کے مشورہ پر عمل کر کے

خود پر مسلط کر لی تھی۔ حاجی اکرم کا مشورہ بالکل درست ثابت ہوا کہ اس نوع کے اثر و رسوخ سے گریز کریں، سچائی کامیابی کا واحد راستہ ہے، شاطرانہ چالیں نہیں۔

جنرل ضیا اعتماد کے ووٹ کی کارروائی کے ایک ہفتہ بعد لاہور کے دورہ پر آئے تو انہوں نے یہ کہہ کر نواز شریف کی اعلانیہ حمایت کا اعلان کیا کہ ''ان کا کلّہ بڑا مضبوط ہے۔'' جس سے ان کی مراد یہ تھی کہ نواز شریف کو ان کی ٹھوس پشت پناہی حاصل ہے۔ انہوں نے بڑے پراسرار انداز میں یہ بھی کہا کہ پیر پگاڑا ور محمد خان جونیجو نواز شریف کو ان کی جگہ سے ہٹانے میں ناکام ہو گئے ہیں۔

جس وقت ضیا وزیرِ اعلیٰ کو مبارکباد دے رہے تھے، حاجی اکرم نے بڑی معنی خیز اور شوخی آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ نواز شریف کے خلاف کتنی گہری سازش کی گئی تھی اور انہیں اس سے کس طرح بچایا گیا۔ یہ صرف ہمیں جانتے ہیں۔ شاید میاں صاحب کی شرافت اور خلوصِ نیت نے ان کے اقتدار کو بچالیا۔ اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کہ وہ چوہدری پرویز الٰہی کے ساتھ جلد ہی اس طرح شیر و شکر ہو گئے جیسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔



باب26

محرّم کے فسادات

1986ء کے اختتام پر ملک میں سیاسی سرگرمیاں پھر سے شروع ہوتے ہی حکمران جماعت (مسلم لیگ) اور پیپلز پارٹی کے درمیان محاذ آرائی ہونے لگی۔ سیاسی عمل پی پی کو پھر سے قومی دھارے میں لا رہا تھا۔ اقتدار میں شراکت کے لیے جدوجہد قواعد وضوابط کے اندر رہے تو لوگوں کو انتہائی قدم اٹھانے سے بچا لیتی ہے۔ جمہوری نظام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔

سندھ میں مہاجرین اور سندھیوں کے مابین لسانی تقسیم جسے بعض مخصوص مفادات رکھنے والوں نے ہوا دی' جڑ پکڑ چکی تھی۔ کراچی میں ایک طرف مہاجر اور دوسری طرف پنجابی و پٹھان کے درمیان مزید تقسیم نے بھی کام دکھایا۔ اب مفاہمت ومصالحت کے پل تعمیر کیے جا رہے تھے۔ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کے پرانے اصول کی جگہ ''متحد کرو اور خدمت کرو'' کا نیا نعرہ اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ میرے لیے ذاتی طور پر یہ بات موجبِ اطمینان تھی کہ جمہوری عمل برگ وبار لانے لگا جیسا کہ میں نے دو سال قبل جنرل ضیا کے لیے اپنی سمری میں تجویز کیا تھا کہ سندھ میں اعتدال پسندوں کی فوری طور پر مدد اور حوصلہ افزائی کی جائے ورنہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

لیکن حضرتِ انسان جیسا کہ وہ فطرتاً نزاع پسند اور جھگڑالو ہے' امن عامہ کو تباہ کرنے کے اسباب پیدا کر لیتا ہے۔ ایران' عراق جنگ اور ضیا کی اسلامائزیشن کے باعث شیعہ' سنی آویزش بڑھ گئی تھی۔ انٹیلی جنس ایجنسیوں کے مطابق محرم کے جلوس میں گڑبڑ کا امکان تھا۔ سپیشل برانچ نے ان مقامات کی نشان دہی کی جہاں مقررہ راستے کے مسئلہ پر اور نماز کے اوقات کے دوران گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دونوں فرقوں کے متوقع شر پسندوں کی فہرستیں بھی تیار کر لی گئیں۔ پہلی دفعہ تمام اضلاع کے لیے مکمل معلومات مرتب کی گئیں اور ان پر مشتمل خاصا مواد قبل از وقت متعلقہ اداروں کو ارسال کر دیا گیا۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ نے حاجی اکرم کی فعال قیادت میں تمام کمشنروں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو الرٹ کر دیا۔ انہوں نے عاشورہ کے سلسلہ میں انتظامی اقدامات کی بابت بریفنگ کا اہتمام کرنے کی ہدایت بھی کی۔

میں نے حکمتِ عملی پر مبنی رپورٹ تیار کی جس میں انتظامی اقدامات کے علاوہ تجویز کیا گیا تھا کہ

ایم پی ایز' ایم این ایز اور بلدیاتی کونسلروں معاشرہ کے بڑے بوڑھوں اور تمام فرقوں کے سرگرم علما کو اتحاد بین المسلمین کونسلوں میں شامل کرنا چاہیے۔ جو ڈویژن' ضلع' تحصیل' قصبہ بلکہ گاؤں کی سطح پر بھی تشکیل دی جائیں۔ متوقع شرپسندوں کو انتظامات میں شامل کر لیا جائے اور انہیں امن و امان قائم رکھنے کی ذمہ داری سونپ دی جائے۔ تاکہ قیامِ امن میں حصہ دار بن سکیں' فساد پھیلانے میں نہیں۔ عام طور سے انا کا مسئلہ تھا جو چھوٹی موٹی مقامی رنجشوں سے پیدا ہوا۔ گڑبڑ کی بیخ کنی وہیں سے کرنے کی ضرورت تھی' جہاں سے اس کی ابتدا ہوئی۔

ایک اور تجویز یہ تھی کہ ہر ضلع میں ایک صوبائی وزیر کو انچارج بنا دیا جائے جو انتظامی مشینری اور معاشرہ کے مختلف طبقات کے مابین موثر رابطہ کا اہتمام کرے۔ انتظامیہ کو موثر اور مضبوط بنانے کے لیے منتخب نمائندوں کے ذریعے عوام کی حمایت بھی حاصل کرنی چاہیے۔ اس طرح ایم این ایز اور ایم پی ایز کو انچارج وزیر کی معرفت قیامِ امن کے کام میں شریک کرنے سے مطلوبہ نتائج حاصل کیے جا سکیں گے۔

وزیرِ اعلیٰ نے میرے تیار کردہ تجزیئے پر کابینہ کے روبرو پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ہر ضلع ایک وزیر کے حوالے کر دیا۔ وہ خود صوبائی کونسل برائے اتحاد بین المسلمین کے سربراہ بن گئے جس میں تمام فرقوں کے سرکردہ علما شامل تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہر مجلس اور تعزیہ کے جلوس کے لیے امن کمیٹی کو موقع پر موجود ہونا چاہیے تاکہ کوئی مسئلہ پیدا ہو تو اسے وہیں حل کر لیا جائے۔ حکومت ان کے لیے ٹرانسپورٹ اور دیگر ضروریات کا انتظام کرے گی۔ فوج کو بھی چوکس کر دیا گیا تاکہ فرقہ وارانہ امن کو کوئی سنگین خطرہ لاحق ہو تو اس سے نمٹا جا سکے۔ اس سے پہلے کبھی اس طرح کے جامع اور مکمل انتظامات نہیں کیے گئے تھے' کیونکہ کسی نے بھی مسئلہ کا اتنی گہرائی سے جائزہ نہیں لیا تھا۔ میں نے سابقہ تجربے سے فائدہ اٹھایا کیونکہ یہ معاملہ 1979ء سے میری نظر میں تھا اور میں نے متوقع الجھنوں سے نمٹنے کے لیے ایک پلان تیار کر رکھا تھا۔

ایران' عراق اور سعودی عرب کی طرف سے ان کے زیرِ سرپرستی کام کرنے والے مذہبی گروہوں کو بھاری رقوم مل رہی تھیں۔ اس سرپرستی کا اصل مقصد گڑبڑ پیدا کرنا اور مذہبی منافرت کو ہوا دینا تھا۔ بہرحال ملک کے اندر اور باہر ایسی مضبوط قوتیں موجود تھیں جو جمہوری نظام کو اس کی بحالی کے پہلے ہی سال کے دوران تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ مارشل لا کے دوران قبائلی علاقہ جات' پاراچنار' ڈیرہ اسماعیل خاں' بھکر' جھنگ' کراچی اور دوسرے مقامات پر مذہبی فسادات ہوتے رہے تھے۔ ملک دشمن اور جمہوریت

کی مخالف قوتیں عاشورہ کے موقع پر گڑبڑ کرنا چاہتی تھیں۔ خوش قسمتی سے مجھے ان کے منصوبوں کے متعلق بروقت اطلاعات مل گئیں۔ میرے خیال میں انہیں جواب دینے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ ان کے ناپاک عزائم کو عوام کی حمایت اور مدد سے ناکام بنا دیا جائے۔ میں نے کابینہ' اتحاد بین المسلمین کونسلوں اور پوری انتظامیہ کو اعتماد میں لے کر ان کی سازش بے نقاب کر دی۔ دشمن نے جو انتظامات کر رکھے تھے' ہم نے انہیں ناکام بنانے کے لیے جوابی اقدامات کا انتظام کر لیا۔

لاہور میں 10 محرم کو ریلوے واشنگ لائنز کی مسجد کے قریب خلاف معمول وقت پر یعنی بہت صبح سویرے' جب کسی کو اس کی توقع نہیں ہوتی' سنگین گڑبڑ شروع ہو گئی' چند اجنبی افراد نے امام اور مقتدیوں پر حملہ کر دیا اور منٹوں میں کارروائی کر کے بھاگ گئے۔ اکثریتی فرقہ یعنی سُنیوں کو اشتعال دلانے کے لیے بھس میں چنگاری ڈال دی گئی تھی۔ امن کمیٹی اور انتظامیہ کو صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے زبردست جدوجہد کرنی پڑی۔ اس کے بعد کسی نے مغلپورہ میں ایک ایسے امام بارہ کو آگ لگا دی جس کا انتظام و انصرام سنیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس طرح دور دور تک گڑبڑ پھیل گئی۔ جس سے نبی پورہ اور لال پل کے علاقہ میں کئی جھڑپیں ہوئیں۔

رانا مقبول احمد ایس ایس پی لاہور نے جو بہت ہی قابل اور دلیر افسر تھے' صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے ذاتی طور پر مداخلت کی تو شرپسندوں نے انہیں نشانہ پر رکھ لیا۔ اس جھڑپ کے دوران ان کے دو دانت ضائع ہو گئے اور بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا۔ حملہ آور جانتے تھے کہ رانا مقبول کی موجودگی میں ان کے ناپاک ارادے پورے نہیں ہو سکتے' اس لیے انہوں نے بڑی کامیابی سے لاہور پولیس کو وقتی طور پر اس کے کمانڈر سے محروم کر دیا۔ شرپسند ایک جگہ واردات کرتے اور اچانک غائب ہو جاتے' پھر کسی اور جگہ ناگہاں نمودار ہوتے اور کارروائی کر کے بھاگ جاتے۔ انتظامیہ اور پولیس نے انسدادی کارروائیاں تیز کر دیں اور ساری ریزرو پولیس متاثرہ علاقوں میں پھیل گئی۔

شرپسندوں نے تعزیہ کے اصل جلوس سے توجہ ہٹانے کے لیے جس کی نگرانی شہری رضا کار کر رہے تھے' نئے علاقے منتخب کر لیے۔ اگر شرپسندوں کو پتہ چل جاتا کہ ہنگامی حالات کے باعث بڑے جلوس کے ساتھ بہت تھوڑی پولیس چل رہی ہے تو معاملات کنٹرول سے باہر ہو جاتے۔ باہر کے علاقوں میں جو اشتعال انگیزی کی گئی تھی اس پر بھاری پولیس فورس کے ذریعے قابو پا لیا گیا۔ شام کو ''حق چار یار گروپ''

کی طرف سے بھاٹی گیٹ کے باہر حسبِ معمول چیر پھاڑ اور پتھراؤ کیا گیا' لیکن جب بڑا جلوس پُر امن طور پر کربلا گامے شاہ میں داخل ہو گیا تو ہر شخص نے سکھ کا سانس لیا۔

پولیس نے ہتھیار کھولنے میں بہت جلد بازی سے کام لیا۔ بڑے جلوس کے پُر امن طریقہ سے داخل ہو جانے کے بعد کسی شخص نے کربلا گامے شاہ کے عقب کی جانب سے داتا دربار کی طرف فائرنگ کی اور دو بے گناہوں کا خون کر دیا۔

قاتل چپکے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اہلِ تشیع پر شک کیا گیا کیونکہ گولیاں کربلا گامے شاہ کی طرف سے چلائی گئی تھیں۔ شیعوں کی طرف سے داتا دربار پر حملہ کی افواہ مساجد کے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ اہلِ لاہور داتا دربار کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس افواہ سے پورے شہر میں اشتعال پھیل گیا اور ہر طرف غم و غضب کی لہر دوڑ گئی۔ دوسری طرف شیعہ اشتعال انگیز اپیلیں کرنے لگے' بعض شیعہ خاندان محفوظ مقامات پر منتقل ہو گئے کیونکہ مختلف محلوں میں ان پر ہجوم کی طرف سے حملے کیے گئے تھے۔

دریں اثنا پولیس کے موبائل دستے انتہائی تیز رفتاری اور مستعدی سے حرکت میں آ گئے۔ امن کمیٹیوں کو ایم این ایز' ایم پی ایز اور بلدیاتی کونسلروں کی مدد سے زیادہ فعال بنایا گیا۔ لاہور کے ڈپٹی کمشنر شہزاد حسن نے ان سب کو متحرک کرنے میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ان سب نے انتظامیہ کے ساتھ مل کر ہنگاموں کی روک تھام اور شہریوں کے تحفظ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

شیعہ اور بریلویوں کے مابین تصادم

مجھے اہل تشیع اور بریلویوں کے مابین تصادم کا منظر بڑا عجیب لگا کیونکہ شیعہ اور بریلوی حضرات مل جل کر رہتے ہیں جب کہ شیعہ اور دیوبندیوں کی آپس میں نہیں بنتی۔ شیعہ داتا دربار کو اسی طرح مقدس و محترم سمجھتے ہیں جس طرح بریلوی۔ پس یہ بات یقینی تھی کہ اس فساد میں کسی تیسرے فریق کا ہاتھ تھا۔ اس صبح کو رونما ہونے والے واقعات کا طریقہ واردات بھی اسی سمت اشارہ کر رہا تھا۔

حاجی اکرم اس خیال سے پریشان تھے کہ سیاسی نظام کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا کیونکہ امن و امان کی وسیع پیمانہ پر خرابی کا ذمہ دار ہمیشہ سول انتظامیہ کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ امن عامہ بہر صورت قائم رکھنا لازمی ہوتا ہے خواہ کرفیو کیوں نہ لگانا پڑے۔

ناچار آدھے لاہور یعنی مال روڈ کے مشرق کی طرف واقع حصہ میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ حاجی صاحب اس نقطۂ نظر کے حامی تھے کہ کرفیو فوج طلب کیے بغیر پولیس کا لگانا چاہیے تاکہ جمہوری حکومت پر یہ الزام نہ لگنے پائے کہ وہ امن وامان قائم رکھنے میں ناکام ہوگئی ہے۔ لیکن آئی جی ایس ڈی جامی کے خیال میں کرفیو نافذ کرنے کے لیے پولیس ناکافی تھی اس لیے فوج طلب کر لی گئی۔ فوج نے شہر بھر میں گشت کیا اور اہم مقامات پر کیمپ لگا لیے۔ مگر موقع پر حقیقی کام پولیس نے انجام دیا یا امن کمیٹیوں نے۔

اگلے دن فوج کی طرف سے تجویز پیش کی گئی کہ پورے شہر میں کرفیو لگا دیا جائے۔ وزیرِ اعلیٰ نے اس مسئلہ پر غور وخوض کرنے کے لیے اجلاس بلایا۔ ہوم سیکرٹری نے تجویز کی مخالفت کی کیونکہ لازمی اشیائے ضرورت کی فراہمی کا معاملہ پہلے ہی دگرگوں تھا۔ تازہ سبزیاں، دودھ، مچھلی اور دوسری غذائی اشیاء کمیاب ہوگئی تھیں۔

ایک انتہائی سینئر افسر نے کہا:

''ان بے وقوفوں کو اپنے کیے کی سزا بھگتنے دو۔ انہیں صرف اسی صورت میں پتہ چلے گا کہ امن کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔''

حاجی اکرم نے جواب دیا: ''عام شہری شر پسند نہیں ہوتے، شورش پھیلانے والوں نے ہمیں چکر میں ڈال دیا ہے۔ ممکن ہے وہ سرحد پار چلے گئے ہوں۔ بچارے عوام کو عذاب میں مبتلا رکھنے کا کیا فائدہ؟ ہمیں یہ تاثر بھی نہیں دینا چاہیے کہ لاہور محاصرے کی حالت میں ہے اور صورتِ حال مزید خراب ہوگئی ہے۔ اس کی بجائے ہمیں یہ تاثر دینا چاہیے کہ صورتِ حال معمول کی طرف پلٹ رہی ہے۔ ہمیں کرفیو زدہ علاقہ میں کمی کرنی چاہیے اور اشیاء کی فراہمی کو مستعدی سے باقاعدہ بنانا چاہیے۔''

وزیرِ اعلیٰ نے میٹنگ میں شریک بہت سے افسروں کے مشورہ کے برعکس حاجی صاحب کی رائے سے اتفاق کیا۔ تیسرے روز لاہور نارمل حالت میں آ گیا۔ اگر اسی روز کرفیو کو وسعت دے دی جاتی تو صورتِ حال کے معمول پر آنے میں شاید پورا مہینہ لگ جاتا۔ دوسری طرف شہریوں کی شکایات کے انبار لگ جاتے اور حکومت کے خلاف نفرت بڑھ جاتی۔

جنرل ضیا شیعہ سنی آویزش کے فوراً بعد لاہور آئے اور بریفنگ کے لیے 7 کلب روڈ پہنچے۔ لاہور کے کمشنر سعید مہدی نے انہیں واقعات کی تفصیل سے آگاہ کیا جس کی ابتدا معروف مذہبی راہنما ڈاکٹر

اسرار احمد کی اشتعال انگیز اور فرقہ وارانہ تقریر سے ہوئی تھی۔ انہوں نے دوسرے سنی راہنماؤں کی ایسی ہی تقاریر کا ذکر بھی کیا۔ جنرل نے حکم دیا کہ ان سب کے خلاف بلا تاخیر سخت کارروائی کی جائے۔

بریفنگ یک طرفہ بن گئی تھی اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی کارروائی میں گڑبڑ کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے بریفنگ کا کام میں نے خود سنبھال لیا اور صدر کو تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا۔ تنازعہ کا سبب طرفین کی تقاریر اور حرکات تھیں۔ تاہم ایسے معاملات میں وہ معمول کی بات تھی۔ 10 محرم کو ریلوے واشنگ لائنز کی مسجد میں پہلی واردات کا ارتکاب بظاہر شیعوں نے کیا تھا۔ شام کو داتا دربار پر فائرنگ بھی شیعوں کی طرف سے آئی تھی۔ یہ واقعات تخریب کاروں کے پہلے سے پیش بندی کردہ اور پیشگی منصوبہ بندی کے تحت کیے گئے طریقۂ واردات کی نشاندہی کرتے تھے۔ اگر صرف سنی علما کے خلاف کارروائی کی جاتی تو گڑبڑ پھیل جانے کا خطرہ تھا کیونکہ اکثریتی فرقہ کی طرف سے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا جاتا۔ میں نے تجویز کیا کہ عدالتی تحقیقات کے بعد قانون کے مطابق غیر جانبدارانہ کارروائی کی جائے اور یہ کہ دونوں فرقوں کے قائدین کے مابین مذاکرات ہونے چاہئیں۔ گورنر سجاد حسین قریشی نے میرے نقطۂ نظر کو پسند کیا۔ اس کے بعد لاہور کے ڈی سی کو حقائق کی روشنی میں کارروائی کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اگر میں بروقت مداخلت نہ کرتا تو یک طرفہ کارروائی کی جاتی جس سے ان فرقوں کے مابین کشمکش میں اضافہ ہو جاتا۔

جونیجو کا شک

اس کے تھوڑے عرصہ بعد وزیر اعظم جونیجو لاہور آئے اور شیعہ سنی کشمکش کی بابت بریفنگ کا اہتمام کرنے کو کہا۔ انہوں نے صدر کو دی گئی بریفنگ پر خفگی ظاہر کی اور اسے وزیر اعظم کے انتظامی اختیارات میں مداخلتِ بے جا قرار دیا۔ میں نے انہیں ایک گھنٹہ کی طویل بریفنگ دی۔ جس میں عاشورہ کے روز ہونے والے فسادات کی ابتدا، طریق کار اور اس کے تاریخی منظر پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے مجھ سے بہت سے سوال کیے۔ انہوں نے شک ظاہر کیا کہ ان گھناؤنے فسادات کے پسِ پردہ کوئی سازش کارفرما تھی جس کا مقصد ان کی جمہوری حکومت کو عدم استحکام سے دوچار کرنا تھا۔ انہوں نے لاہور کی انتظامیہ کے خلاف سخت ترین کارروائی کرنے کا عندیہ دیا۔

”سر ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو۔ سازش کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم پیشتر

ازیں اسی طرح کے بلکہ اس سے بھی بدتر فسادات ہو چکے ہیں۔ 1963ء میں جب میرے سسر میاں محمد شفیع لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے، یہاں بدترین قسم کے فسادات ہوئے تھے۔ اُسی سال سندھ کے چھوٹے سے شہر خیر پور میں شیعہ سنی فسادات کے دوران 200 افراد مارے گئے تھے۔ یہ بنیادی طور پر ایک جذباتی مسئلہ ہے اور لوگ عقیدہ کے معاملہ میں اکثر عقل وخرد کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ ملک دشمن گڑ بڑ پھیلاتے اور صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمیں اس کا حوصلہ مندی اور تحمل سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ سردست آپ کی انتظامیہ نے حالات کے مطابق اور دانشمندانہ کارروائی کر کے حالات پر قابو پالیا۔'' میں نے ٹھہر ٹھہر کر وضاحت کی۔

وزیراعظم میری معروضات سننے کے بعد مطمئن ہو گئے تاہم میں نے ان کے اور صدر کے مابین اختلافات کی وسیع خلیج محسوس کی۔ انہیں یہ بھی شک تھا کہ نواز شریف کا جھکاؤ جنرل ضیا کی طرف ہے۔ میرے دوست سلمان فاروقی نے جو ان دنوں ایڈیشنل سیکرٹری برائے وزیراعظم کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، مجھے بتایا کہ جونیجو کو گمان ہے کہ حاجی اکرم اور میں اکثر معاملات میں نواز شریف کا ساتھ دیتے ہیں۔

''میں میاں صاحب کے ساتھ محض اپنی ڈیوٹی کرتا ہوں'' میں نے فاروقی کو بتایا۔ ''وزیراعظم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں؟ کیا وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی ڈیوٹی ادا نہ کروں۔ اس کے متعلق کم سے کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بڑی عجیب بات ہے۔'' مجھے دلی اذیت پہنچی تھی۔

''آپ زیادہ محسوس نہ کریں۔'' انہوں نے تسلی دی۔ ''تم میرے دوست ہو۔ میں نے تم سے اس لیے ذکر کر دیا کہ تم محتاط رہو، بس اتنی سی بات ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ حاجی اکرم اور میں رقابتوں اور سازشوں کے کراس فائر (Cross Fire) میں پھنس گئے تھے۔ محلاتی سازشی ہمیں اس لیے نشانہ بنا رہے تھے کہ ہم اپنا کام دیانتداری کے ساتھ اور ٹھیک طریقے سے کر رہے تھے۔ ہم اس سے بچ سکتے تھے اگر ہم نمایاں نہ ہوتے اور حالات کے دھارے کے ساتھ بہنے لگتے۔ لیکن کوئی باضمیر شخص ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے بہت سے تیز طرار اور تجربہ کار افسروں سے واسطہ پڑا جو منافقانہ انداز میں کام کرتے ہیں اور بگڑتی ہوئی صورتِ حال کی اصلاح کے لیے کچھ نہیں کرتے تاکہ بعد میں ان پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہ ہو۔

حاجی صاحب اور میں نے میاں نواز شریف کے خلاف ان کی پارٹی کے اندر ہونے والی سازشوں کے دوران نیز شیعہ سنی فسادات کے موقع پر باوقار طریقے سے اور دیانتداری سے اپنے فرائض ادا کیے تھے اور اس بات کو نظر انداز کر دیا تھا کہ کون کس کے خلاف کیا کھیل کھیل رہا ہے۔ ہم نے حکومت کی طرف سے اپنی اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریاں اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ ادا کیں۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ جمہوری نظام کو کوئی نقصان پہنچے کیونکہ ایسا قدم کسی طور ملک کے مفاد میں نہیں تھا۔ ہم نے 1986ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کو 1983ء سے مختلف انداز میں ہینڈل کیا۔ اسی طرح شیعہ سنی فساد پر بڑی ہوشیاری، غیر جانبداری اور دانشمندی سے قابو پایا۔

ہم پنجاب میں نواز شریف کے ساتھ بڑے حساس اور اہم عہدوں پر کام کر رہے تھے وہ اپنے راستے پر ایک شریف آدمی کی متانت اور وقار کے ساتھ گامزن تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کی صفوں میں باہمی چپقلش کو شرافت کی حدود سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ صدر، وزیر اعظم اور پیر پگاڑا پر مشتمل ٹرائیکا کو اپنے گوناگوں مسائل درپیش تھے۔ ہم نے میاں صاحب کو جب بھی ضرورت پڑی ایمانداری اور خلوصِ نیت سے مشورے دیئے اور تجزیے پیش کیے۔

جن لوگوں نے نواز شریف کا تختہ الٹنا چاہا لیکن کامیاب نہیں ہوئے، وہ اب ہم تینوں پر اپنا غصہ نکال رہے تھے اور ہم پر سیاسی معاملات میں حصہ لینے کا الزام لگا رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے وزیر اعلیٰ کو ہمیشہ سیاسی مسائل کا انتظامی حل تلاش کرنے سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ ہم نے انہیں مخالفین کے خلاف جھوٹے مقدمات درج کرانے سے باز رکھا۔ اس حربہ کو ماضی کے اکثر حکمرانوں نے استعمال کیا اور آخرِ کار وہی حربہ ان کی تباہی کا سبب بن گیا۔ ہم نے میاں صاحب کو پولیس کے غلط استعمال سے باز رکھ کر ہمیشہ اخلاق کے مطابق اور مثبت کردار ادا کیا۔ وہ بذاتِ خود خدا ترسی کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔ ہم محض ان کی حوصلہ افزائی کرنے میں کوشاں رہے۔

باب 27

انوکھے بلدیاتی انتخابات

پنجاب میں 1987ء بلدیاتی اداروں کے انتخابات کا سال تھا۔ یہ عام انتخابات سے بھی بڑی مشق تھی جس میں یونین کونسلوں' ڈسٹرکٹ کونسلوں اور میونسپل کارپوریشنوں کے لیے زوردار مقابلے ہوئے۔ انتخابی حلقے چھوٹے تھے اس لیے لوگوں نے زیادہ جوش وخروش سے حصہ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امن وامان کی صورتِ حال زیادہ اور وسیع پیمانے پر خراب ہوگئی۔ سپیشل برانچ کو نت نئے واقعات پر کڑی نظر رکھنی پڑی۔ پنجاب کے اکثر ایم پی ایز اور ایم این ایز اپنے ضلعوں میں بلدیاتی اداروں کے رکن بھی تھے۔ اس طرح وہ چیئرمین اور میئر جیسے بااختیار وباوقار عہدوں پر بھی فائز تھے۔

اگرچہ عام انتخابات نومبر 1987ء میں ہونے والے تھے' تاہم میں نے سال کے ابتدائی دنوں میں ہی انتخابات سے متعلق مطالعہ' تحقیق اور سروے شروع کردیا۔ میں اپنے ضلعی افسروں کے اے ایس آئی کی سطح تک اجلاس اکثر طلب کرتا اور انہیں بریف کرتا کہ انتخابی امکانات کا سروے کس طرح کرنا ہے۔ پھر سابقہ رائے دہی کے طریقوں سے ان کا موازنہ کرتا۔ انہیں متوقع اُمیداروں کے لیے اندازاً ووٹ ڈالنے والوں کی فہرست تیار کرنی تھی جس کا آغاز وارڈ یا گاؤں کی سطح سے کرکے ضلع کی سطح تک جانا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی قوت کے سرچشموں' مثلاً خاندانی پس منظر' جائیداد' دولت' برادری' مذہبی اثرورسوخ اور مقامی یا جماعتی بنیاد پر سیاسی گروپ کی نشان دہی بھی کرنی تھی۔ ایسے سروے اس لیے ضروری تھے کہ قیامِ امن وامان سے متعلق منصوبے ان کے مطابق تیار کرنے تھے۔ میرے افسروں نے اسے اعصاب شکن کام سمجھا' لیکن میں نے انہیں بتایا کہ اگر یہ کام چھوٹی اکائی مثلاً وارڈ یا گاؤں کی سطح سے شروع کیا جائے تو چنداں مشکل نہیں۔ اگر وہ مرحلہ مکمل کرلیا جائے تو باقی محض جمع تفریق اور ان کے گروپوں نیز رشتہ وتعلقات کی نشان دہی کرنے کا کام رہ جائے گا جس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اے حمید نے جواب سپیشل برانچ میں بحیثیت ڈائریکٹر تحقیقات کام کر رہے تھے' اس کام کے لیے بہت اچھے فارم تیار کیے تاکہ ماضی کی طرح محض قیاس آرائیوں سے کام لینے کی بجائے سائنسی تجزیہ کیا جا سکے۔ ان علاقوں کی جن میں امن و امان کا مسئلہ پیدا ہونے کا امکان تھا، الیکشن کے وقت قانون نافذ کرنے والے اداروں کی رہنمائی کے لیے نقشوں اور چارٹوں کے ذریعے نشاندہی کی گئی۔ پولیس عملہ کو ہدایت کی گئی کہ اس کام کے لیے دیہات میں محکمہ مال کے عملہ (زیادہ تر پٹواری) سے مدد لی جائے اور قصبوں نیز شہروں میں بلدیاتی اداروں کے ملازمین کا تعاون حاصل کیا جائے کیونکہ مطلوبہ ریکارڈ ان کی تحویل میں ہوتا ہے۔

جب فیلڈ افسروں نے بنیادی اکائیوں کا سروے مکمل کر لیا تو انہیں اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ انہیں پتہ چل گیا کہ مختلف سطحوں پر برادریاں کس طرح بڑوں کے زیرِ اثر اور ان کی گرفت میں ہوتی ہیں اور ذات پات' عقیدہ' رشتہ داری' پیشہ نیز دوستی و دشمنی کے تعلقات کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ میرے بعض افسروں نے بنیادی سروے کرنے کے بعد سیاسی پنڈتوں کی طرح باتیں بنانی شروع کر دیں۔ انہیں ہر ضلع اور شہر میں سیاسی وابستگیوں اور ان کے طور طریقوں کو سمجھنے میں تھوڑا وقت اور لگا۔ ساتھ ہی امن و امان کے لیے ممکنہ خطرات کا اندازہ بھی ہو گیا۔ ڈویژن اور صوبہ کی سطح پر بھی اسی طرح کے اعداد و شمار اکٹھے کر لیے گئے۔

جون 1987ء تک میرے دفتر میں پورے صوبے کے اعداد و شمار پر مشتمل ضخیم جلدیں دستیاب تھیں۔ علاقائی اور صدر دفاتر کی سطح پر تھوڑی سی محنت اور تخیل سے کام لے کر ہم نے قومی اور صوبائی اسمبلی کے حلقہ ہائے انتخاب کی بابت صورتِ حال کا اندازہ بھی لگا لیا۔ کیونکہ ہمارے پاس علاقہ اور ووٹرز کے متعلق معلومات پہلے سے موجود تھیں۔ یہ مطالعہ سیاسی اور انتظامی اغراض کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔

ہم نے جو معلومات اور مواد بروقت تیار کر لیا تھا وہ بہت سے مواقع پر کام آیا۔ میں آج ماضی پر نظر ڈالتے ہوئے علی وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم نے 1987ء کے بلدیاتی الیکشن کے لیے وہ معلوماتی مواد اکٹھا نہ کیا ہوتا تو شاید 1988ء اور 1990ء کے عام انتخابات منعقد نہ ہو پاتے۔ اس مواد نے حکمران طبقہ کو صحیح وقت پر حوصلہ دیا اور ان میں اعتماد پیدا کیا۔ ورنہ جمہوری نظام کی بساط بہت پہلے لپیٹ دی جاتی۔ بعض دلچسپ واقعات اور ملک کے انتہائی اہم افراد کے افکار و تاثرات زیرِ نظر کتاب میں کسی اور

جگہ بیان کیے جائیں گے۔ سردست میں خود کو بلدیاتی الیکشن کے سلسلہ میں رونما ہونے والے چند واقعات تک محدود رکھوں گا۔

بلاواسطہ انتخاب کی تجویز

وفاقی وزیر بلدیات چوہدری انور عزیز نے متوقع نتائج کے بارے میں اپنا علیحدہ جائزہ تیار کیا۔ ان کا اخذ کردہ نتیجہ یہ تھا کہ بلدیاتی الیکشن میں پی پی پی بھاری اکثریت سے جیتے گی اور مسلم لیگ کی بلدیاتی اداروں میں کوئی سیاسی قوت نہیں رہے گی۔ مارچ 87ء میں ان کی طرف سے بریفنگ کے بعد وفاقی کابینہ نے فیصلہ کیا کہ حکمران جماعت کو فائدہ پہنچانے کے لیے بلدیاتی الیکشن کے طریق کار میں تبدیلی کر دی جائے۔ تجویز یہ تھی کہ یونین کونسلوں کے انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کرائے جائیں اور اس طرح منتخب ہونے والے ارکان ڈسٹرکٹ کونسلوں اور میونسپل کارپوریشنوں کے لیے الیکٹورل کالج کا کام دیں۔ دراصل یہ ایوب خان دور کے بنیادی جمہوریتوں کے نظام کو بحال کرنے کی تجویز تھی۔ جس میں یونین کونسلوں سے اوپر صوبائی اسمبلی اور قومی اسمبلی بلکہ صدر کا انتخاب بھی بالواسطہ رائے دہی کی بنیاد پر ہوتا تھا۔

انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر میاں اسلم حیات نے میرے ساتھ بالواسطہ رائے دہی کے نظام پر تبادلہ خیال کیا میں نے انہیں بتایا کہ یہ طریقِ کار چلنے والا نہیں۔ پی پی پی اسے ہرگز قبول نہیں کرے گی اور احتجاجی تحریک شروع کر دے گی۔ انہوں نے بائیکاٹ والی بات سے تو اتفاق نہیں کیا البتہ اس معاملہ میں میرے ہم خیال نظر آئے کہ لوگ بالواسطہ انتخاب کو مسترد کر دیں گے اور وہ ردِعمل غیر مستحکم جمہوری نظام کے لیے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

انور عزیز نے وفاقی کابینہ سے جو کچھ منظور کرا لیا تھا' اس کا توڑ کرنے کے لیے میں نے اپنے منصوبہ پر کام شروع کر دیا۔ میں نے حاجی اکرم' ہوم سیکرٹری اور انور زاہد چیف سیکرٹری کو بریف کیا۔ میری رائے یہ تھی کہ قانونی تقاضے کے مطابق بلدیاتی الیکشن غیر جماعتی بنیادوں پر ہونے چاہئیں۔ اگر جماعتی بنیاد پر بھی کرائے گئے تو لوگ پارٹی کو نظرانداز کر کے مقامی مصلحتوں کے مطابق ووٹ ڈالیں گے۔ جو بھی منتخب ہوگا وہ سرکاری کیمپ میں جانا پسند کرے گا۔ ایسی صورت میں موجودہ اور مسلمہ نظام کو خراب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جو بہرحال حکمران پارٹی کے کام آنے والی چیز ہے۔ مسلم لیگ کے اعصاب پر یہ خوف سوار ہے کہ پی پی پی بھاری اکثریت سے جیت جائے گی جو زمینی حقائق کی رو سے درست نہیں۔ پیپلز پارٹی اور

ایم آر ڈی کی شرکت 1985ء کے غیر جماعتی الیکشن کو قانونی جواز عطا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ بالواسطہ طریق انتخاب کی صورت میں دونوں احتجاج شروع کردیں گی اور امن وامان کو سنگین خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ انور زاہد اور حاجی صاحب دونوں نے میری رائے سے اتفاق کیا۔

اس کے بعد ہم تینوں غلام حیدر وائیں کے پاس پہنچے۔ وہ ایسے معاملات کی بابت ٹھوس معلومات اور رائے رکھتے تھے۔ وہ بھی ہماری رائے سے متفق ہوگئے۔ اس روز وزیرِ اعظم اور وزیرِ اعلیٰ دونوں لندن میں تھے۔ وائیں اس معاملے میں اس قدر فکر مند تھے کہ انہوں نے میاں صاحب کے ساتھ لندن میں رابطہ قائم کیا۔ وہ نہ صرف خود مان گئے بلکہ انہوں نے وزیر اعظم کو ترغیب دینے کا وعدہ بھی کرلیا۔ معاملہ کو خصوصی اہمیت اس لیے دی گئی کہ وزیر اعظم کو لندن سے واپسی کے فوراً بعد قوم سے خطاب اور بلدیاتی الیکشن کے طریقِ کار کا اعلان کرنا تھا۔

چیف سیکرٹری نے مجھے اسلام آباد جانے اور چوہدری انور عزیز کو بریف کرنے کو کہا۔ سلمان فاروقی وزیر اعظم ہاؤس میں بلدیاتی اداروں سے متعلق امور کے انچارج تھے۔ وہ سندھ کے سیکرٹری بلدیات رہ چکے تھے اور مضمرات کو سمجھتے تھے۔ میں نے پہلے ان کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا۔ پھر اقبال جونیجو (جائنٹ سیکرٹری وزیر اعظم ہاؤس) بھی بات چیت میں شامل ہوگئے۔ میں اس موضوع پر ایک پوزیشن پیپر تیار کر کے لے گیا تھا۔ سلمان اور اقبال نے مجھ سے مکمل اتفاق کیا۔ پھر ہم تینوں انور عزیز کے پاس گئے۔ سرتاج عزیز بھی ایک ماہر کی حیثیت سے مذاکرات میں شریک ہوگئے۔ انور عزیز نے شروع میں تو اپنی رائے پر اصرار کیا' لیکن جب میں نے زوردار دلائل دیئے تو آہستہ آہستہ اپنے موقف سے سرکنے لگے۔

سرتاج عزیز نے کہا: ''اس ساری مشق کی غرض وغایت بلدیاتی نظام کو بہتر بنانا ہے اور دیہات' یونین کونسلوں نیز ڈسٹرکٹ کونسلوں کے مابین رابطہ پیدا کرنا ہے تاکہ دیہی ترقی کو یقینی بنایا جاسکے۔ پھر ہمیں یہ کام کیوں نہیں کرنا چاہیے؟''

''آپ اس نظام کو اسی صورت میں بہتر بنا سکیں گے اگر آپ برسر اقتدار رہے۔ مجوزہ ترامیم سے غلط مقصد مراد لیا جارہا ہے کہ اس طرح نتائج میں دھاندلی کی جائے گی۔ حکومت سے باہر کی تمام سیاسی قوتیں آپ کی تجاویز کو مسترد کردیں گی خواہ وہ کیسی ہی نیک نیتی پر مبنی کیوں نہ ہوں۔ اس طرح امن وامان کا

سنگین مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ جس کے نتیجہ میں آپ کو شاید اقتدار سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں۔ کیا تمام اصلاحات کا ایک ہی ٹرم میں بروئے کار لانا ضروری ہے؟ آپ اپنی موجودہ کمزور پوزیشن کو مضبوط بنانے کے بعد ردوبدل اور اصلاح وترقی کا پروگرام جاری رکھ سکتے ہیں۔'' میں نے کھل کر بات کی۔

وہ تو قائل نہیں ہوئے البتہ انور عزیز معاملہ کو سمجھ گئے۔ ''اگر انتخابی حلقے چھوٹے کر دیئے جائیں تو اس میں کچھ حرج ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔ ''حلقوں کا سائز کم کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''البتہ یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ بہت چھوٹے حلقوں سے انتخابی عمل کے بڑی حد تک شخصی اور گندہ ہو جانے کا اندیشہ ہے' جب کہ وقتی طور پر نظام میں کوئی بہتری پیدا نہیں ہوگی۔'' میں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا' اس لیے اپنے دلائل پر مزید زور نہیں دیا۔

پی پی پی کو شکست یا نظام کی ناکامیابی

وزیرِ اعظم لندن سے راولپنڈی پہنچنے کے بعد اگلے دن انور عزیز اور سلمان فاروقی کے ہمراہ لاہور آئے۔ فاروقی نے بتایا کہ انہوں نے میرا تجزیہ وزیر اعظم کو دے دیا تھا اور وہ اس بات سے متفق ہو گئے ہیں کہ بالواسطہ الیکشن کا اعلان نقصان دہ ثابت ہوگا۔ انور عزیز نے اس بات پر خفگی کا اظہار کیا کہ میں نے پی پی پی کو شکستِ فاش دینے کی ''شاندار'' سکیم خراب کر دی ہے۔ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا: ''سر میں نہیں چاہتا کہ پورا سیاسی نظام ناکام ہو جائے۔'' جونیجو نے اعلان کر دیا کہ بلدیاتی الیکشن مروجہ نظام کے مطابق ہوں گے۔ انور عزیز اور دوسرے بہت سے مسلم لیگی اس اعلان پر بہت زیادہ سیخ پا ہوئے۔ ان میں سے اکثر نے حاجی اکرم کو اور مجھے نواز شریف کو غلط مشورے دینے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

اگلے دن مسلم لیگ کے دو نمایاں ایم این اے نعیم ملک اور صدیق کانجو میرے دفتر آئے اور مجھ سے پُرزور احتجاج کیا جیسے میں نے نواز شریف کے کان میں کوئی غلط بات کہہ دی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا میں نے اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کہا کہ وہ خود کو بے بنیاد خوف سے آزاد کرائیں اور پی پی پی کا جرأت سے مقابلہ کریں۔ ''اگر بعض مقامات پر پی پی پی جیت گئی پھر بھی آپ فائدے میں رہیں گے کیونکہ اس سے سیاسی نظام کے مضبوط ہونے میں مدد ملے گی۔''

پھر میں نے اپنی سوچ کو وضاحت سے بیان کیا۔ یہ کہ اپوزیشن ہمیشہ انتشار پھیلانے کے درپے رہتی ہے جب کہ ایک اچھی حکومت اس پر ٹھنڈے اور منصفانہ انداز میں کارروائی کرتی یا اپنا ردِعمل ظاہر کرتی

ہے۔ اپوزیشن خود کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہے جب کہ حکومت کا ردِ عمل بڑا مدبرانہ اور جرأت مندانہ ہونا چاہیے جس کی بنیاد قانونی اور اخلاقی اقدار پر ہو۔ بے جا خوف اپنے بڑے پن کا مالیخولیا اور اعصابی خلل خواہ کسی بھی فریق میں پایا جائے' معاملات کو خراب کر دیتا ہے۔'' آپ کو مستقبل کا سامنا کرنے کے لیے ٹھوس حقائق اور واضح افکار و تصورات کی ضرورت ہے۔

اس وقت اکثر حکام نتیجہ کے بارے میں بلاوجہ پریشان تھے اور بری طرح ہمت ہار بیٹھے تھے۔ میرے لیے حکومت میں شامل اہم افراد کا ایسا رویہ اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ بھٹو اور ان کے حکام نے 1977ء میں ایسے ہی ردِ عمل کا اظہار کیا تھا۔ 1983ء میں ایم آر ڈی کی تحریک پر سندھ میں جو جبر و تشدد کیا گیا' وہ بھی ایسے ہی رویہ کا آئینہ دار تھا۔ دراصل اکثر حکمران اپوزیشن کو مقابلے کے لیے تیار دیکھ کر اندھے ہو جاتے اور کمزور بن جاتے ہیں کیونکہ وہ اکثر اس وہم میں مبتلا رہتے ہیں کہ اس طرح وہ حکومت کرنے کے استحقاق اور جواز سے محروم ہو جائیں گے۔

میں نے حکومتوں کو یا تو آنے والا واقعات کا حد سے زیادہ رجائیت پسندانہ یا انتہائی مایوس کن اندازہ لگاتے دیکھا ہے۔ جب انہیں کمزوری محسوس ہوتی ہے تو وہ آسانی سے اپنے جابرانہ اختیارات کے فوری اور بے رحمانہ استعمال پر اتر آتی ہیں۔ جب کہ دانا اور دلیر حکمران ریاستی اختیارات کے استعمال میں صبر و تحمل سے کام لیتا ہے۔ وہ اپنے اختیارات کو صرف اس وقت استعمال کرتا ہے جب قانون اور اخلاقی اصول اس کا جواز فراہم کریں۔ اقتدار سے محرومی کا خوف آدمی کو مخبوط الحواس بنا دیتا ہے۔ یہ بات ان بیورو کریٹس کے متعلق بھی درست ہے جو اہم مناصب پر فائز ہوں۔ ان میں سے اکثر اختیارات سے محروم ہو جانے کے خوف میں مبتلا ہوتے ہیں اور اختیارات کو بچانے کے لیے ان کا بے تحاشا اور اندھا دھند استعمال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی برطرفی کی راہ خود ہموار کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صفدر محمود جو تاریخ کا گہرا اور وسیع مطالعہ کرتے کرتے سوکھ کر کانٹا بن گئے ہیں۔ نواز شریف کو ہمیشہ سمجھاتے رہتے تھے کہ وہ لوگوں کو دوست بنائیں' دشمن پیدا نہ کریں۔ ان کا معیاری نسخہ یہ تھا کہ ڈنڈے کو کفایت شعاری سے اور صرف وہاں استعمال کرنا چاہیے جہاں ناگزیر ہو۔ انہوں نے بھی میاں صاحب کو بلدیاتی الیکشن وقت پر اور پرانے نظام کے مطابق کرانے کا مشورہ دیا تا کہ شکوک و شبہات سے بچا

جا سکے اور لوگوں کی طرف سے ان کی قبولیت یقینی بن جائے۔

میاں صاحب کو ناچار پرانی ڈگر پر چلنا پڑا کیونکہ ان کی اپنی کابینہ کا نیز ایم پی ایز کا زبردست دباؤ تھا۔ وہ سب الیکشن ہار جانے کے تصور سے گھبرائے ہوئے تھے۔ پی پی پی نے ان کے دلوں میں خوف بٹھا دیا تھا' اگرچہ ان دنوں وہ پارٹی بھی ''امن کی فاختائیں'' نامی بے وقت کی تحریک ناکام ہو جانے کے مایوسی کا شکار تھی۔

میرے دوست ملک سلیم اقبال نے جو ان دنوں صوبائی وزیر تھے' ماڈل ٹاؤن پارک میں چہل قدمی کے دوران میرے اندازہ سے اختلاف کیا۔ وہ کم از کم آدھی کابینہ کے خیالات کی ترجمانی کر رہے تھے۔ وزیراعظم کے قریبی سیاستدانوں نے ان پر کام کیا اور وہ بھی ہمت ہار بیٹھے۔ لیکن جونیجو کے لیے پبلک میں کیے گئے اعلان سے پیچھے ہٹنا محال تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ کسی شخص نے اپنی چرب زبانی کے ذریعے میاں صاحب کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ میں نے انہیں گمراہ کیا ہے اور یہ کہ میری اصل ہمدردیاں پیپلز پارٹی کے ساتھ ہیں۔

وزیراعظم نے اقبال احمد خان وزیر قانون اور مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل کو حقائق معلوم کرنے کی ذمہ داری تفویض کی۔ شاید انہیں اس بات نے مزید پریشان کر دیا ہو کہ اس وقت تک نواز شریف بھی نتیجہ کی بابت شکوک میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وزیراعلیٰ میرے اخذ کردہ مثبت نتیجہ پر انحصار کر رہے تھے جب کہ ان کے اردگرد پایا جانے والا ہر شخص مخالف سمت میں اشارہ کر رہا تھا۔

پنجاب کابینہ کی ایک خصوصی میٹنگ بلائی گئی جس میں اقبال احمد خان بھی شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں بلدیاتی الیکشن زیرِ بحث آئے۔ میں نے کابینہ کو قریباً ایک گھنٹہ تک بڑے ٹھوس اور بعض اوقات جذباتی دلائل کے ساتھ بریف کیا۔ میں نے یہ وارننگ بھی دی کہ اس وقت پبلک میں کیے گئے اعلان سے پیچھے ہٹنا مہلک ہوگا اور حکومت کی کریڈیبلٹی ختم ہو جائے گی۔ میں شاید ضرورت سے زیادہ جذباتی اور بے تکلف ہو گیا تھا۔ میں نے کہا: ''اپنے اندر حقائق کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔ ضلع خانیوال میں حال ہی میں قومی اسمبلی کا جو ضمنی الیکشن ہوا' اس میں پی پی پی کے اُمیدوار نے محض 18 فیصد ووٹ لیے ہیں۔ بلدیاتی الیکشن میں پارٹی سے وابستگی کو کم سے کم مدِنظر رکھا جاتا ہے۔ پی پی پی کا حصہ لینا بھی نری حماقت ہوگی۔ وہ اپنا قومی کردار نظر انداز کر کے محلہ کی سیاست میں اُلجھ جائے گی۔ آپ کو اس صورتِ حال سے

فائدہ اٹھانا چاہیے اور جمہوری عمل کو پھلنے پھولنے کا موقع دینا چاہیے۔ پی پی پی کا ووٹ بینک اتنا بڑا نہیں جس قدر وہ احتجاج کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میاں صاحب کی فراست و تدبر نے اس کا بڑی کامیابی سے مقابلہ کیا ہے۔" میں نے آخری جملہ زور دے کر ادا کیا اور اس کا مطلوبہ اثر ہوا۔ غلام حیدر وائیں نے کھل کر میری حمایت کی۔ دوسروں نے بھی ان کی تقلید کی اور سٹیج بچھا دی گئی۔ حاجی اکرم نے بعد میں کہا کہ "آپ کی موثر تقریر نے انتخابات کو یقینی بنا دیا ہے۔" میری ساری کدو کاوش جمہوری نظام کے لیے تھی۔

بہرحال معاملہ پوری طرح واضح نہیں ہوا تھا۔ جنرل ضیا اور جنرل اختر عبدالرحمٰن کوئٹہ سے واپسی پر لاہور آئے۔ انہوں نے ایئرپورٹ پر ہی بلدیاتی انتخابات کے حوالہ سے امن و امان کی صورتِ حال پر بریفنگ چاہی۔ میں جملہ حقائق اور اعداد کے ساتھ بشمول 1979ء اور 1983ء کے بلدیاتی الیکشن میں جھڑپوں اور مرنے والوں کی تعداد کے پوری طرح تیار ہو کر گیا۔

جنرل اختر غلط فہمی پر مبنی اس تاثر کا شکار تھے کہ مذکورہ بالا انتخابات یک سر پُرامن تھے اور ان میں خونیں واقعات نہیں ہوئے تھے کیونکہ وہ مارشل لا کا دور تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ بلدیاتی الیکشن' فوجی تحفظ کے بغیر خونی غسل کا باعث بنیں گے اور ملک بحران بلکہ خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ میں نے انہیں قائل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی کہ وسیع پیمانہ پر ہنگاموں کا کوئی خطرہ نہیں۔ ووٹرز چھوٹے چھوٹے اور متعدد حلقوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اہم سیاسی رہنما نہ تو بڑے جلوس نکال سکیں گے نہ بڑے جلسے کریں گے۔ جھڑپیں اگر کوئی ہوئیں تو ذاتی سطح پر ہوں گی اور پولیس ان سے بخوبی نمٹ لے گی۔ اس لیے امن و امان کے درہم برہم ہونے کا کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن وہ قائل نہیں ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ پنجاب شاید پُرامن رہے' تاہم سندھ میں تو لازماً آتش فشاں پھٹے گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ جمہوری ماحول میں لوگ بڑے پُرامن طریقے سے پیش آتے ہیں کیونکہ یہ ان کی اپنی حکومت ہوتی ہے۔ انہوں نے اتفاق نہیں کیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہوگا؟ میرے خیال میں مارشل لا میں امن و امان کی حالت بہتر ہوتی ہے۔" انہوں نے اپنی رائے پر اصرار کیا۔

"سر امن و امان کا انحصار لوگوں کے رویہ پر ہوتا ہے۔ مارشل لا کے دور میں وہ ہمیشہ خفا رہتے ہیں اور غصے کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ جمہوری نظام میں انہیں دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جاتا ہے اس لیے خوش و خرم رہتے ہیں۔ لوگ سرکاری بسوں اور ٹریفک لائٹوں پر کیوں پتھراؤ کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ان

کے اپنے استعمال اور فائدے کے لیے ہیں۔ اس لیے کہ وہ خود کو قابلِ نفرت حکومت کا نشانہ سمجھتے ہیں۔ اگر لوگوں کی شکایات و تکالیف کا ازالہ نہ کیا جائے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور اجنبیوں کی طرح پیش آتے ہیں۔ اس وقت ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔'' میں نے وضاحت سے بتایا۔

اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے دوران میں یہ بات بھول گیا کہ میں جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین سے مخاطب ہوں۔ جب مجھے اس بات کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ بہرحال میں نے اپنے نقطۂ نظر پر کسی مفاہمت کے بغیر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ''جمہوریت لوگوں کے پاگل پن کا علاج ہے۔ اسے محض تقابلی بیان سمجھیں۔ بعض مواقع پر مارشل لا اچھا ہو سکتا ہے۔ ویسے مجھے مارشل لا کے خلاف کچھ نہیں کہنا۔''

انہوں نے بے چینی محسوس کی تاہم گفتگو کا موضوع بدل کر کہنے لگے: ''کیا تمہیں الیکشن کے دوران مسلح افواج سے کسی قسم کی مدد کی ضرورت پڑے گی؟''

میں نے فوراً جواب دیا: ''نہیں سر، میرے خیال میں کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پولیس صورتِ حال سے نمٹ لے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ سخت اقدامات کرو اور محتاط رہو۔''

انہوں نے دھیمے لہجہ میں کہا۔ پھر انہوں نے صدر اور وزیرِ اعلیٰ سے الگ الگ بات کی۔ آخر میں مجھے بلایا اور صدر سے کہنے لگے۔ یہ حد سے زیادہ پُر اعتماد اور رجائیت پسند پولیس افسر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ امن و امان کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔'' ضیا زیرِ لب مسکرائے، پھر دونوں جرنیل اسلام آباد روانہ ہو گئے۔

صدر کی روانگی کے بعد میاں صاحب نے مجھے زور سے تھپکی دی، میرا شکریہ ادا کیا اور اپنی کار میں گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ انہوں نے میرا شکریہ کس بات پر ادا کیا۔ بعد میں بھی اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ممکن ہے کسی نکتہ پر اختلافِ رائے پیدا ہو گیا ہو اور میرا نقطۂ نظر ان کی حمایت میں گیا ہو۔ بہرحال میں اس بات پر خوش تھا کہ میں نے ٹاپ کے دو جرنیلوں کے اعصاب پر سوار خوف کو، اگر پورے طور پر نہیں تو بڑی حد تک، دور کر دیا ہے۔

1992ء میں جب میں پنجاب کا آئی جی تھا، ایک تقابلی موازنہ میری نظر سے گزرا جو چار بلدیاتی انتخابات کے متعلق امن و امان کے نقطۂ نظر سے تیار کیا گیا تھا۔ جمہوری نظام کے دوران 1987ء

اور 1991ء میں جو بلدیاتی الیکشن ہوئے ان میں مختلف جھڑپوں اور لڑائیوں میں زخمی ہونے والوں اور مرنے والوں کی تعداد ان انتخابات کے مقابلہ میں بہت کم تھی جو مارشل لا کے تحت 1979ء اور 1983ء میں منعقد ہوئے تھے۔ ایک اور تحقیقی مطالعے سے جو 1992ء میں مرتب کیا گیا' پتہ چلا کہ مارشل لا کے دوران سیاسی کارکنوں' محنت کشوں' لیبر اور طلبا کے ہنگاموں میں جانی نقصان جمہوری دور کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھا۔ حالانکہ لوگوں کا عام خیال یہ ہے کہ مارشل لا کے دوران امن وامان کی صورتِ حال بہتر ہوتی ہے۔ واحد استثنائی واقعات فرقہ وارانہ فسادات تھے۔ تاہم دونوں ادوار کے دستیاب وسائل میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ (اس معاملہ کو باب نمبر 41 میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے)

تاریک بادلوں کے سایہ تلے

چونکہ میری دائیں آنکھ میں تکلیف بڑھتی جا رہی تھی' اس لیے مجھے بلدیاتی الیکشن سے پہلے آپریشن کے لیے امریکہ جانا پڑا۔ میں واپس آتے ہوئے مانچسٹر میں تھا جب میرے کزن غلام سرور نے فون پر اطلاع دی کہ حاجی اکرم کو ہوم سیکرٹری کے عہدہ سے ہٹا کر کسی کم اہم منصب پر لگا دیا گیا ہے۔ اور اقتدار کے ایوانوں میں میرے تبادلہ کی افواہیں بھی گشت کر رہی ہیں۔ میں نے سرور سے کہا کہ مزید معلومات حاصل کر کے مجھے مانچسٹر میں مطلع کریں تاکہ میں اپنے منصوبہ پر عمل کرسکوں اور 8 نومبر سے پہلے واپس نہ آنا پڑے۔

انہوں نے بعد میں بتایا کہ مختلف عناصر نے جنرل ضیا کو ورغلانے کی کوشش کی تھی کہ حاجی اکرم اور میں اعلانیہ ان کی مخالفت کرتے ہیں اور یہ کہ میں پی پی پی کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہوں۔ ہم دونوں کے متعلق باور کرایا گیا کہ ہم نے وزیر اعلیٰ کو گمراہ کیا ہے۔ ہم پر یہ شک بھی کیا گیا کہ ہم نے نواز شریف کے ذریعے وزیر اعظم کو بلدیاتی الیکشن کے بارے میں اعلان کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کے اندازہ کے مطابق ہم دونوں کی شرارت کے باعث بلدیاتی الیکشن کے نتائج پی پی پی کے حق میں جائیں گے۔ اس لیے ایک کو کھڈے لائن لگا دیا گیا ہے جب کہ دوسرے کو واپس آنے پر کسی کونے میں پھینک دیا جائے گا۔

میں 8 نومبر کو واپس آیا۔ بلدیاتی الیکشن میں ابھی تین ہفتے باقی تھے۔ میں نے اسلم خان سے ملاقات کی جو کاروبار میں ڈاکٹر بشارت الٰہی کے پارٹنر تھے اور ان کے توسط سے ڈاکٹر بشارت الٰہی سے ملا۔

میں نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ بلدیاتی الیکشن غیر جماعتی بنیادوں پر کرانے سے سیاسی نظام کو تقویت پہنچے گی۔ یہ عطیہ خود جنرل صاحب نے قوم کو دیا تھا۔ دراصل میں نے چوہدری انور عزیز کی اصلاحات کا راستہ روک کر جنرل کے نافذ کردہ نظام کی حمایت کی تھی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ میں نے ان کی مخالفت کی تھی۔

وہ دونوں میرے دلائل سے مطمئن ہو گئے۔ اُنہوں نے اسی شام جنرل کے ساتھ ڈنر کے دوران میری پوزیشن صاف کر دی۔ صدر نے میرے خلاف کارروائی کو بلدیاتی الیکشن کے نتائج آنے تک ملتوی کر دیا۔ وہ اس بات پر بے حد برہم تھے کہ حاجی اکرم اور میں نے نواز شریف کو گمراہ کیا اور اب ہر شخص الیکشن کے جال میں پھنس گیا ہے۔ اکثر حکمرانوں کی طرح وہ بھی دماغی خلل کا شکار اور تنگ نظر تھے۔ چیزوں کو ان کی اصل حالت میں دیکھنے کے لیے جرأتِ ایمانی درکار ہوتی ہے۔ یہ بات کس قدر افسوسناک تھی کہ صدر ملک کے جملہ دستیاب وسائل کی موجودگی میں اس بات کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے کہ مجھ جیسا ناتواں شخص بھلا اپنے طور پر کیا کر سکتا ہے۔

میں نے نواز شریف کو خاصا پریشان اور دل شکستہ پایا۔ میٹنگوں کے دوران وہ میرے اُمید افزا بیانات پر کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ البتہ یہ ان کی عظمت تھی کہ مجھے بولنے سے نہیں روکتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری غیر حاضری میں پیشین گوئیاں کرنے والوں نے انہیں خوفزدہ کر دیا تھا اور انہیں ایک خطرناک فیصلے کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ وہ یقیناً بڑے دباؤ میں تھے۔

میری غیر حاضری میں بیوروکریسی، امین اللہ چوہدری سیکرٹری بلدیات کی سربراہی میں ناپسندیدہ اُمیدواروں کو الیکشن سے پہلے، الیکشن کے دوران اور الیکشن کے بعد نا اہل قرار دینے کے لیے جابرانہ ہتھکنڈوں کے ساتھ حرکت میں آ گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ چیز پورے انتخابی عمل کو مشکوک بنا دے گی اور سختی اور تشدد، بائیکاٹ اور احتجاج کا سبب بنے گا، تاہم اعصابی خلل دُور دُور تک پھیل گیا تھا۔ طرح طرح کے شکوک میں مبتلا ہونے سے میرا وزن کم ہو گیا اور میں خود کو دفاعی پوزیشن پر محسوس کرنے لگا۔ اس کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری۔

اس کے بعد تھوڑا سا وقفہ آ گیا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے شہادتیں اکٹھی کی گئیں کہ لاہور کے میئر میاں شجاع الرحمٰن پی پی پی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے وہ بینرز نیز پمفلٹوں کے ذریعے خود

کو"عوام دوست" (پی پی پی کے اُمیدوار کا کوڈ نام) ظاہر کر رہے تھے۔ یہ شرارت خود مسلم لیگ میں پائے جانے والے ان کے مخالفین نے کی تھی۔ وہ خود صدر کی سرپرستی سے میئر کے منصب پر فائز رہے تھے اور پی پی پی کے شدید مخالف تھے۔ ان کو پی پی پی کا آدمی قرار دینا بظاہر انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ عدالتی چھان بین کے ذریعے اس بات کو ثابت کرنا محال تھا۔ یہ بات صدر کے لیے بھی خوش آئند نہیں تھی۔ بہر حال انہیں نا اہل قرار دینے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ یہ پروپیگنڈہ بڑے زور و شور سے کیا جا رہا تھا کہ وہ 1979ء میں پی پی پی کی طرف میلان رکھنے والے درجنوں کونسلروں کے نا اہل قرار پانے کے بعد اپنے زورِ بازو سے میئر بنے تھے۔ میرے نزدیک اس طرح کے بودے دلائل کا سہارا لے کر انہیں نا اہل قرار دینا انتہائی نامناسب اور بے محل تھا۔

میاں شجاع کے معاملہ نے زندگی کی بابت میرے نظریات اور اعتماد کو تقویت بخشی۔ میں نے نواز شریف کو کامیابی سے قائل کر لیا کہ اس کیس میں بہت سے مضحکہ خیز تضادات موجود ہیں۔ انہوں نے لاہور کے کمشنر حفیظ اللہ اسحاق کو ہدایت کر دی کہ میاں شجاع کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھایا جائے۔ میں نے انہیں اس بات پر بھی آمادہ کر لیا کہ دیگر بہت سے جھوٹے مقدمات ختم کر دیئے جائیں۔ میں چاہتا تھا کہ انصاف اور دیانتداری کا بول بالا ہو اور وہ پورے سیاسی عمل کے لیے نیک نامی کا سبب بنے۔

جب دوسرے کمشنروں کو پتہ چلا کہ میں نے وزیر اعلیٰ کو یہ ترغیب دی تھی کہ بعض افراد کو نا اہل قرار دینے پر زور نہ دیں تو وہ مجھے فون کرنے لگے کہ انہیں بھی اس ناپسندیدہ عمل سے نجات دلائی جائے۔ میں نے وزیر اعلیٰ کو مشورہ دیا کہ نا اہلیت کا حربہ ہرگز استعمال نہ کیا جائے کیونکہ یہ فعل ناپسندیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ نقصان دہ بھی ہے۔ تاہم وہ کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔ ان کے رفقائے کار اور مربیوں کے دل و دماغ پر جو خوف حاوی تھا اسے دور کرنا آسان نہیں تھا۔

27 نومبر کو لاہور کے کمشنر کی رہائش گاہ پر ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں اس مسئلہ کے مضمرات پر غور و خوض کیا گیا۔ پنجاب کے ایڈووکیٹ جنرل بھی میٹنگ میں شریک ہوئے۔ اجلاس کے دوران راولپنڈی اور فیصل آباد کے کمشنروں کے فون موصول ہوئے جو ایڈووکیٹ جنرل سے یہ دریافت کرنا چاہتے تھے کہ اگر ان کے اقدام کو ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا گیا تو اس کا کیا بنے گا۔ وہ ایسی کارروائی کے حق میں نہیں تھے، تاہم اس خیال سے ٹانگ پھنسائے بیٹھے تھے کہ وزیر اعلیٰ خفا نہ ہو جائیں۔

سیکرٹری بلدیات اس بات پر مصر تھے کہ قانون کے مطابق لازماً کارروائی کرنی چاہیے۔ میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مارشل لا اٹھائے جانے اور سیاسی جماعتوں کی بحالی کے بعد وہ دفعہ منسوخ ہوگئی ہے یہ چیز عدالتی چھان بین کے معیار پر پوری نہیں اترے گی اور غیر ضروری تلخی و کشیدگی پیدا کرنے کا سبب بنے گی۔

اس قسم کا بردباری پر مبنی اور منصفانہ نقطۂ نظر صرف اس صورت میں اختیار کیا جا سکتا تھا جب حکومت کو موافق و مثبت نتائج کا یقین ہوتا۔ حکمران طبقہ کے اعتماد کو میری ملک سے غیر حاضری کے دوران ''نجومیوں'' نے پہلے ہی متزلزل کر دیا تھا۔ یہ ایک کریہہ منظر تھا جو انجانے خوف کی وجہ سے ظہور پذیر ہو رہا تھا اور اسے وہ بیوروکریٹ تقویت پہنچا رہے تھے جو ہمیشہ حکمرانوں کے اشاروں پر ناچتے اور اپنی کھال بچا لیتے ہیں۔ خوفزدہ حکمران طبقہ غصے میں تلملا رہا تھا اور اس حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر تھا کہ پیپلز پارٹی بلدیاتی الیکشن میں حصہ لے کر اپنی پوزیشن کمزور کر لے گی۔ اس کی یہ غلطی 1985ء کے عام انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کی غلطی سے بھی بڑی ہوگی۔

وہ اجلاس رات گیارہ بجے ختم ہوا۔ طے پایا کہ اُمیدواروں کو انتخابات سے صرف ایک دن پہلے بھاری تعداد میں نااہل قرار دے دیا جائے تاکہ عدالتیں مداخلت نہ کر سکیں۔ بعض کا خیال تھا کہ یہ بڑی کامیاب ''شاطرانہ چال'' ہوگی جب کہ میں ڈر رہا تھا کہ اس چالاکی کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ مجھے یقین تھا کہ اس اقدام کے خلاف لوگوں کا ردِعمل بڑا شدید ہوگا اور امن و امان کو سنگین خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ مجھے وہ بریفنگ یاد آ گئی جو میں نے جنرل اختر عبدالرحمٰن کو دی تھی اور انہوں نے عوامی فسادات کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ حالات کا اُبھرتا ہوا منظر بھی اخلاقی لحاظ سے بیزار کن تھا۔ میں یہ سوچ کر کانپ اٹھا کہ تین دن بعد یعنی ووٹنگ کے دن کا منظر کس قدر ڈراؤنا اور بھیانک ہوگا۔

بھیانک منظر

میں اسی ذہنی کیفیت میں کینال بینک روڈ سے اپنے گھر فیصل ٹاؤن جا رہا تھا۔ اے حمید میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ شاید پورے جمہوری نظام کو تباہ کرنے کے لیے کوئی سازش کی جا رہی ہے۔ انہوں نے متوقع نتائج کی اس قدر بھیانک منظر کشی کی کہ میں نے وزیر اعلیٰ سے فوری طور پر ملنے کا فیصلہ کر لیا' حالانکہ اس وقت خاصی رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے فیروز پور کی طرف مڑنے کو کہا

تاکہ ہم ماڈل ٹاؤن جا سکیں۔ وہاں پہنچ کر میں نے شہباز شریف سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ میاں صاحب سے فوری اہمیت کے ایک معاملہ پر بات کرنی ہے۔

"لیکن اس وقت کیوں؟" انہوں نے پوچھا

"کیونکہ معاملہ بڑا اہم اور فوری نوعیت کا ہے۔" میں نے جواب دیا

انہوں نے اندر جا کر بڑے بھائی کو جگایا۔ میاں صاحب میرے بے وقت آنے پر قدرے خفا اور پریشان دکھائی دیے۔ میں صورتِ حال کا سامنا کرنے کو تیار تھا۔

"کیا سب اچھا ہے؟" انہوں نے پریشان کن لہجہ میں دریافت کیا۔

"نہیں سر! اگر آپ نے کل یا پرسوں لاہور سے پی پی کے 50 فیصد اُمیدواروں کو نااہل قرار دے دیا تو میرے خیال میں زبردست ہنگامہ ہوگا۔ ممکن ہے انتخابات پُرامن ماحول میں ہو جائیں لیکن الیکشن کے دوسرے دن پی پی کی ساری قیادت جو اس وقت ملک بھر میں بکھری ہوئی ہے' لاہور میں اکٹھی ہو جائے گی اور اس مسئلہ کی آڑ لے کر ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ آپ ان کی مجتمع قوت کا سامنا کیسے کریں گے؟ احتجاج کرنے کے لیے معقول بہانہ ان کے ہاتھ آ جائے گا۔ اگر عدالتی فیصلہ کے مطابق ان سیٹوں پر ووٹنگ ملتوی کرنی پڑی تو وہ پیپلز پارٹی کی زبردست فتح ہوگی۔ یہ اس کا ایک اور اہم پہلو ہے جو بنیادی طور پر غیر اخلاقی ہے۔ براہ کرم اتنے زیادہ لوگوں کو نااہل قرار دے کر اپنے لیے مصیبت کھڑی نہ کریں۔"

میں نے یہ سب کچھ ایک سانس میں کہہ دیا۔ دل میں خوفزدہ بھی تھا کیونکہ اس وقت تک ہر شخص میری رائے کے خلاف ہو گیا تھا۔

وہ فوراً میری بات سمجھ گئے اور کہا کہ اس سلسلے میں کل ایک میٹنگ بلائیں گے۔

"اس وقت تک بہت دیر ہو جائے گی۔ ممکن ہے بعض کمشنر اس سے پہلے قانونی نوٹس جاری کر دیں۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے۔" انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

"آپ سیکرٹری بلدیات کو ہدایت کر دیں کہ وہ تمام کمشنروں کو کل صبح کے اجلاس میں حتمی فیصلہ ہونے تک مزید کارروائی سے روک دیں۔" میں نے ان سے اس طرح عاجزانہ التماس کی گویا خود اپنے

لیے کسی نوازش کا طلب گار ہوں۔ انہوں نے حسب ضابطہ سیکرٹری بلدیات کو ہدایت کردی اور اگلی صبح کو اجلاس کے لیے دس بجے کا وقت مقرر کردیا۔

قوانین استعمال کرنے کے لیے ہوتے ہیں

اگلی صبح کے اجلاس میں چیف سیکرٹری' سیکرٹری بلدیات' کمشنر لاہور اور میں نے شرکت کی۔ چیف سیکرٹری نے میرے خیالات اور سوچ سے اتفاق کیا۔ کمشنر محتاط آدمی تھے' وہ خاموش رہے۔ وہ ایسا تاثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ ناخوشگوار صورتِ حال کا سامنا کرنے کو تیار نہیں کیونکہ ایسا کہنے سے وزیر اعلیٰ کے برہم ہونے کا خطرہ تھا۔ میں ان کی احتیاط کو سمجھ گیا۔ سیکرٹری بلدیات بڑے باتونی تھے۔ وہ بڑے پیمانہ پر کارروائی کے حق میں تھے اور کوئی بھی خطرہ مول لینے کے خلاف تھے۔ میرے نزدیک کارروائی کرنے میں کئی خطرات مضمر تھے' نہ کرنے میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے اپنے تمام دلائل دہرائے۔ یہ کہ پی پی پی جیتنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ مسلم لیگ سمیت کوئی بھی دوسری پارٹی اس پوزیشن میں نہیں۔ جو بھی جیتے گا وہ حکومتی پارٹی میں شامل ہوجائے گا۔

سیکرٹری بلدیات نے نکتہ اٹھایا کہ: ''ایسے قانون کا کوئی فائدہ نہیں جسے استعمال نہ کیا جاسکے۔''

میں نے جواب دیا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ایک قانون ہے۔ جو 1979ء کے غیر سیاسی ماحول میں اچھا تھا۔ لیکن 1987ء میں اس کی کوئی افادیت نہیں رہی۔ آپ کے پاس یہ قانون موجود ہے کہ قاتل کو پھانسی دی جائے گی۔ لیکن اگر کوئی شخص قتل کا ارتکاب نہ کرے تو آپ کسی کو پھانسی پر نہیں لٹکا سکتے۔ ایسے قانون کو لاگو کرنے کا کوئی جواز نہیں جو ایسے مسائل پیدا کردے جن سے بچنا ممکن ہو اور وہ حکومت کی بدنامی کا سبب بن سکتا ہو۔ حکمران جماعت جیتنے والی ہے۔ میں یہ بات سپیشل برانچ کے چیف کی حیثیت سے پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ ہمیں بتدریج ارتقا پانے والے سیاسی عمل کا چہرہ دھندلا نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

میاں صاحب کہنے لگے: ''چوہدری صاحب پرسوں سے پہلے نتیجے کا پتہ نہیں چل سکتا۔ اب تو پتہ پھینک دیا گیا ہے۔ اس وقت ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ ہمیں قانون کو سوچ سمجھ کر اور احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ کسی بھی بلدیاتی ادارہ میں بہت کم لوگوں کو نااہل قرار دینا چاہیے اور وہ بھی انتہائی معقول اور جائز

صورتوں میں۔ آپ تمام متعلقہ حکام کو ایسی ہدایات جاری کردیں۔

چیف سیکرٹری کو مزید کارروائی کے سلسلے میں ہدایات دینے کے بعد میٹنگ ختم کردی گئی۔ میں اس بات پر بے حد خوش تھا کہ میرے خیالات اور موقف کے مطابق نظام کو تباہی سے بچالیا گیا ہے۔

کمشنر لاہور نے کمرے سے نکلتے وقت بڑے خلوص سے میرا شکریہ ادا کیا۔ ''آپ میٹنگ کے دوران میری حمایت میں کیوں نہیں بولے؟'' میں نے پوچھا۔

''ممکن ہے میاں صاحب یہ خیال کرتے کہ میں بزدلی دکھا رہا ہوں۔'' انہوں نے انتہائی خلوص اور ہوشیاری سے جواب دیا۔

یہ ''ممکن ہے'' کا جملہ اکثر سرکاری ملازمین کو درپیش سنگین مسائل کی نشاندہی کرتا ہے۔ کیونکہ بے بنیاد الزامات پر بہت سی سنگدلانہ برطرفیوں نے ان کو انتہائی غیر محفوظ اور سراسر چیف ایگزیکٹو کی خوشنودی پر انحصار کرنے والا بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں باس کی طرف سے من مانے تبادلوں کا خوف بھی دامن گیر رہتا ہے' جس سے اس کی گھریلو زندگی تباہ ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ان میں سے اکثر اس ادھیڑ بن میں لگے رہتے ہیں کہ وزیراعلیٰ کو کون سی بات خوش کرے گی۔ خواہ وہ ان کے لیے فائدہ مند نہ ہو۔

شکی مزاج سیاسی حکمران اس وقت خود کو سرکاری ملازمین سے بھی زیادہ غیر محفوظ سمجھنے لگتے ہیں جب انہیں مخالفین کی طرف سے دیئے گئے کسی چیلنج سے واسطہ پڑ جائے۔ ان کا پہلا میلان اس طرف ہوتا ہے کہ اپنی سیاسی بصیرت اور اثر و رسوخ کو کام میں لانے کی بجائے جس میں بہت زیادہ طاقت ہوتی ہے' انتظامیہ کے آہنی ہاتھ استعمال کیے جائیں۔ فوجی آمروں کے اعصاب پر بھی ہر طرح کا خوف' وسوسے اور توہمات سوار ہوتے ہیں۔ جب ضیا نے ''ایک رسہ اور دو گردنوں'' والی بات کی تھی' تو انہوں نے اپنے اندرونی خوف کا اظہار کیا تھا۔ سیاستدان بھی جب وہ اپوزیشن میں ہوں' فوجی یا سول حکومت کی طرف سے اپنے خلاف ریاستی مشینری کے استعمال سے خوفزدہ ہو کر اعصابی خلل میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایسا خوف' حقیقی ہو یا خیالی' پوری معاشرتی اور سیاسی فضا کو غبار آلود کرنے میں بڑا اہم اور خطرناک کردار ادا کرتا ہے۔ حکمران اور ان کے حریف حقائق کی چمکدار روشنی کی بجائے اپنے تفکرات کے تاریک سایوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اپنے تفکرات دور کرنے کے لیے مایوسی کے عالم میں قوانین میں ردوبدل

کرتے ہیں۔ لاقانونیت کو فروغ دیتے ہیں۔ سچائی کو مغلوب کرتے ہیں اور دھوکے باز بدکردار حکام کی عیاری ومکاری کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ کامیابی آخرِ کار سچائی سے حاصل ہوتی ہے' چالبازیوں سے نہیں۔

الزامات سے بری کرنے کا صلہ؟

بلدیاتی انتخابات 13 نومبر 1987ء کو منصفانہ اور پُر امن ماحول میں منعقد ہوئے جن کی بابت دھاندلی یا ہیرا پھیری کی کوئی شکایت سننے میں نہیں آئی۔ نتائج ملے جلے تھے۔ حکمران پارٹی نے اکثریت حاصل کر لی پی پی پی بھی خسارہ میں نہیں رہی۔ مری' حسن ابدال' ننکانہ صاحب اور پنجاب کے بعض دوسرے مقامات پر ایسے اُمیدوار بھی کامیاب ہو گئے جنہیں پی پی پی کی حمایت حاصل تھی۔ جنرل ضیا' جنرل اختر' ملک نعیم' صدیق کانجو' چوہدری انور عزیز' ملک سلیم اور میرے بہت سے دوستوں نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا' وہ سب ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ آخرِ کار میں سرخرو ہو گیا۔ تاہم اپنے طویل تجربہ کی بنا پر میں نے کسی سے اس بنا پر شکریہ کی توقع نہیں رکھی کہ اتنے طوفانوں کے باوجود میں نے انتخابات کی کشتی کو بخیر و عافیت ساحلِ مراد تک پہنچا دیا۔ میں خداوند کریم کا بے حد شکر گزار تھا کہ نواز شریف نے میرے مشورہ پر عمل کیا اور انہوں نے مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا تھا اس کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچی۔ میں اکثر بڑی عاجزی سے دُعا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے جو جھوٹے ثابت ہوئے۔ تاہم نتائج سے خوش ہو کر وہ بھی اپنی کامیابی کو حتمی شکل دینے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔

واحد شخص جس نے میرے تجزیے کو دل کی گہرائیوں سے سراہا، وہ ملک سلیم اقبال تھے۔ ''لیکن تم تو کہتے تھے کہ بلدیاتی الیکشن ہوں گے ہی نہیں' اور اگر ہوئے تو بالواسطہ طریقِ کار اختیار کیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ لوگ اسے مسترد کر دیں گے۔ ہنگامے شروع ہو جائیں گے اور ان کے نتیجہ میں پورے سیاسی نظام کی بساط پلٹ جائے گی۔ اسی طرح بڑے پیمانہ پر نا اہلیاں بھی ہماری نیک نامی کو داغ دار کر دیتیں۔ آپ نے یقیناً ایک زبردست کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ویل ڈن۔'' جب انہوں نے ایسے شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تو میں خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ البتہ ان کے آخری الفاظ بہت چبھنے والے تھے۔

''آپ بہت اچھا سیاسی ذہن رکھتے ہیں۔''

''نہیں، نہیں میں نے وہ سب کچھ سیاسی سوچ کے تحت نہیں کیا تھا۔'' میں نے قدرے دکھے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

''دراصل وہ میرے پختہ یقین کا معاملہ تھا۔ جب میں نے یہ کہا کہ انتظامیہ کو سیاسی مقاصد میں ملوث یا ایسی اغراض کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے' تو میں کوئی سیاست نہیں کر رہا تھا۔ میں نے محض یہ تجویز کیا تھا کہ سیاست، سیاسی خطوط پر کرنی چاہیے اور نااہلی کے انتظامی حربے استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ میں نے اپنے حقیقت پسندانہ تجزیے کے ذریعے آپ کی ہمت بندھائی تھی' آپ اسے سیاست کیوں کہتے ہیں؟ کیا میں اس لیے سیاستدان ہوں کہ میں آپ کو ایسے مشورے دیتا ہوں کہ انتظامی پھندوں اور جالوں میں نہ پھنسیں؟''

''میرا مقصد محض داد و ستائش کا اظہار کرنا تھا۔ آپ اس سے غلط مطلب مراد نہ لیں۔''

انہوں نے معذرت کا اظہار کیا اور بتایا کہ میرے متعلق جنرل ضیا بھی ایسی ہی رائے رکھتے ہیں۔

''ٹھیک ہے میں اسے بطور تعریف وستائش قبول کرتا ہوں۔ تاہم ضیاالحق کے کلمات تحسین کے بغیر۔'' میں نے ان کے اضافی تبصرہ پر احتجاج کیا۔ ''وہ ملک کے صدر بھی ہیں اور چیف آف آرمی سٹاف بھی۔ یہ ایک انوکھا امتزاج ہے۔ کہ وہ خود کو ایک پیشہ ور سپاہی سمجھتے ہیں جس نے ملکی سیاست میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ تاہم اس صورت میں ان پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ صدرِ پاکستان کے عہدہ کو غیر سیاسی قرار دیں۔ میں سیاستدانوں کی خدمت کرتا ہوں جب کہ وہ ان پر حکم چلاتے ہیں۔ اس کے باوجود آپ مجھے سیاستدان کہتے ہیں۔''

انہوں نے میرے کام پر مجھے دوبارہ شاباش دی جس سے ایسا محسوس ہوا کہ شاید میری کارکردگی کو ضرورت سے زیادہ سراہا جا رہا ہے۔

مالِ غنیمت ہتھیانے کے لیے دوڑ

بلدیاتی الیکشن کے دوسرا مرحلے میں ضلع کونسلوں' میونسپل کمیٹیوں' ٹاؤن کمیٹیوں کے چیئرمینوں اور میونسپل کارپوریشنوں کے میئرز کے بااختیار اور باوقار عہدوں پر ہاتھ صاف کرنا تھا۔ ہر کوئی مالِ غنیمت

لوٹنے کے لیے پاگل ہورہا تھا۔ جونیجو کی خواہش تھی کہ ان کے حامیوں کو زیادہ سے زیادہ عہدے ملیں۔ وہ یہ بات بھول گئے کہ بلدیاتی ادارے تکنیکی لحاظ سے غیر سیاسی تھے اور یہ سراسر صوبائی معاملہ تھا۔ وہ بحیثیت صدر مسلم لیگ اور وزیراعظم پاکستان اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کے خواہاں تھے۔ وہ نومنتخب کونسلروں اور بلدیاتی اداروں کے سربراہوں کا کنونشن بلانے کا ارادہ رکھتے تھے تاکہ اس میں بلدیاتی اداروں کے سربراہوں کے انتخابات کے لیے پارٹی کی حکمتِ عملی کا اعلان کرسکیں۔

محمد خان جونیجو اور نواز شریف کے درمیان اس مسئلہ پر اختلافِ رائے پیدا ہوگیا۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ بلدیاتی اداروں پر اپنا کنٹرول قائم کرے اور دوسرے کو بے دخل کردے۔ یوں دونوں کے مابین کھچاؤ صاف نظر آنے لگا اور باہمی اختلافات اخبارات میں موضوعِ بحث بن گئے۔ چونکہ وہ صوبائی معاملہ تھا اس لیے وزیراعلیٰ نتیجہ پر اثر انداز ہونے کے لیے بہتر پوزیشن میں تھے۔ بعد میں وزیراعظم کو خود احساس ہوگیا کہ اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیے۔

وزیرِاعلیٰ نے انتخابی نتائج کے فوراً بعد چیف سیکرٹری کو اور مجھے ناشتے پر مدعو کیا' جس میں ان کے بعض انتہائی قریبی ساتھی بھی شریک ہوئے۔ انہوں نے سنجیدگی سے تمام بلدیاتی اداروں کے لیے اپنے پسندیدہ سربراہوں کو کامیاب بنانے کے طریقوں اور ذرائع پر بحث کی۔ انتظامیہ ان کے لیے آسانی سے دستیاب ہونے والی مشینری تھی جسے مؤثر انداز میں استعمال کرنا تھا۔ بلدیاتی ادارے بہرصورت ڈپٹی کمشنروں اور کمشنروں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں' اس لیے وہ فیصلہ کن کردار ادا کرسکتے تھے۔ انہوں نے چیف سیکرٹری کے یا میرے خیالات جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ ممکن ہے انہیں ہماری موجودگی کا علم نہ ہو۔ ان کے خیال میں انتظامیہ کا اثرورسوخ ایک فطری اور جائز ہتھیار تھا جو انہیں دستیاب تھا۔

انہوں نے اجلاس کے اختتام کے قریب ہماری رائے دریافت کی۔ چیف سیکرٹری نے مجھے بولنے کو کہا۔ میں انتظامیہ کے ممکنہ غلط استعمال پر پہلے ہی وحشت محسوس کررہا تھا جس کے نتیجے میں غیر ضروری تلخی پیدا ہونے کا قوی احتمال تھا۔ اس لیے میں نے گزارش کی کہ مسلم لیگ کے حمایت یافتہ اکثر اُمیدوار جیت گئے ہیں۔ دوسرے مرحلہ میں ایسے حالات پیدا کرنا دانشمندی نہیں ہوگی جو پارٹی کے لیے غیر ضروری لڑائی کا سبب بنیں۔ ایسے حالات کیوں پیدا نہیں کرتے جن میں اکثریت والوں کو ان کی پسند کے اُمیدوار چننے کی اجازت دے دی جائے۔ جنہیں بعدازاں صوبائی قیادت قبول کرلے۔ وہ سب جوان

آدمی ہیں۔ جو آدمی سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرے اس کو چیف بنادیں۔ انتظامیہ کا اثر ورسوخ استعمال کر کے برا تاثر کیوں دینا چاہتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ آپ کے پسندیدہ اُمیدوار انتظامیہ کی مداخلت کے بغیر بھی اکثر صورتوں میں جیت جائیں گے۔ ہمیں صحت مند سیاسی روایات کو فروغ دینا چاہیے۔'' میں نے اپنا نقطۂ نظر زوردار طریقہ سے پیش کیا۔

چیف سیکرٹری نے میری بھرپور حمایت کی اور کہا کہ وہ اپنے افسروں سے مختلف اُمیدواروں کی حقیقی پوزیشن کی بابت رپورٹ حاصل کریں گے۔ تاہم مشیروں نے وزیر اعلیٰ پر زور دیا کہ پہلے اپنے پسندیدہ اُمیدوار نامزد کردیں' اس کے بعد انتظامی مشینری ان کے چناؤ کو یقینی بنائے گی خواہ انہیں اکثریت کی حمایت حاصل ہو یا نہیں۔ وہ اپنے سیاسی مفاد کے لیے وزیر اعلیٰ کی پوزیشن استعمال کرنے میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اجلاس اگلے ہفتے تک ملتوی کردیا گیا تاکہ اس دوران چیف سیکرٹری مختلف اُمیدواروں کے بارے میں رپورٹ حاصل کرسکیں۔ اجلاس میں موجود سیاسی مشیر ماسوائے غلام حیدر وائیں کے اس التوا پر بے حد برہم ہوئے۔

چیف سیکرٹری میری تجویز سے خوش تھے جب کہ دوسرے مکار بیوروکریٹس نے پریشانی محسوس کی۔ اجلاس کے بعد ایک صاحب مجھے ایک طرف لے گئے اور کہا کہ ''اگر آپ کی تجویز قبول کرلی گئی تو انتظامیہ کی ساری اہمیت ختم ہوجائے گی۔ بلدیاتی اداروں کے سربراہوں کو نامزد کرنا انتظامیہ کا حق ہے' اگر سیاستدانوں کو ان کی من مرضی کرنے کی اجازت دے دی جائے تو وہ ضرورت سے زیادہ پُراعتماد اور طاقتور بن جائیں گے اور انتظامیہ کو ایک کونے میں دھکیل دیا جائے گا۔ آپ بہت زیادہ سیاسی بن رہے ہیں۔ براہ کرم اگلی میٹنگ میں اپنے نقطۂ نظر پر زیادہ زور نہ دیں۔'' ان کے الفاظ سے مجھے زبردست دھچکا لگا۔ کیا میں یہ تجویز کرکے ''بہت زیادہ سیاسی'' بن گیا تھا کہ انتظامیہ کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے؟ یہ بڑی عجیب اور تکلیف دہ سوچ تھی۔ تاہم وہ بے چارا یہ قیاس کرنے میں بالکل حق بجانب تھا کہ وہ سراسر پیشہ ورانہ انداز میں بات کررہا ہے۔

ایک نقطۂ نظر اور بھی تھا۔ اجلاس میں شریک سیاستدانوں نے مجھے قابو کرلیا اور ترغیب دینے لگے کہ میں اپنی اس ''خطرناک'' تجویز پر زور نہ دوں کہ حقیقی اکثریت کو نمائندگی کا موقع دیا جائے۔ سیاستدان اپنے فائدہ کے لیے انتظامیہ کی مداخلت کے حق میں تھے۔ جب کہ انتظامیہ اپنی اہمیت جتانے کے لیے

مداخلت کرنے کی خواہاں تھی۔ سیاست واقعی بعض اوقات لوگوں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیتی ہے۔

چیف سیکرٹری نے اگلے اجلاس میں اپنی سروے رپورٹیں پیش کر دیں۔ اکثر بلدیاتی اداروں میں انہی افراد کو اکثریت حاصل تھی جنہیں وزیراعلیٰ ان کے سربراہ کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی بابت طے پایا کہ ان مقامات پر مداخلت نہ کی جائے' البتہ جھنگ' خانیوال' لاہور' راولپنڈی اور بعض دوسری جگہوں پر پسندیدہ اُمیدواروں کی مدد کی جائے۔ میری رائے یہ تھی کہ اس طرح کا کوئی کام ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اس دفعہ کسی نے میری بات نہیں سنی اور مجھے خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ میں اس بات پر مطمئن تھا کہ میں نے سیاسی مسئلہ میں انتظامیہ کی مداخلت کم کر کے اپنا معمولی کردار ادا کر دیا ہے۔ بلدیاتی انتخابات قانونی اور تکنیکی طور پر غیر سیاسی قرار دیئے گئے جب کہ تمام الیکشن اپنی تعریف کی رو سے سیاسی ہوتے ہیں۔ وہ غیر سیاسی اس لیے کہلائے کہ انتظامیہ کی مداخلت اور نا اہل قرار دینے کی راہ ہموار ہو سکے۔ میں سوچنے لگا کہ سیاستدان طبقہ اقتدار کا کس قدر بھوکا ہوتا ہے۔ وہ اخلاقی طور پر الیکشن کا سامنا کرنے سے خوفزدہ تھے۔ اب کامیابی کے بعد مرغوں کی طرح اکڑ اکڑ کر چل رہے ہیں۔ نواز شریف میں کم از کم یہ خوبی تو ہے کہ وہ دلیل کی بات سنتے ہیں اور اگر سب میں نہیں تو اکثر صورتوں میں اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

حرص کی کوئی حد نہیں

اگلا مرحلہ اس سے بھی بدتر تھا۔ نواز شریف کے اِردگرد سرکردہ سیاستدانوں نے مختلف اداروں میں پی پی پی کے کونسلروں کو توڑنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ معاملہ کابینہ کے اجلاس میں زیرِ بحث آیا جس میں میں بھی شریک تھا۔ پوری کابینہ نے اس تجویز کی حمایت کی۔ غلام حیدر وائیں حسبِ معمول واحد استثنا تھے۔ میرے نزدیک وہ ساری مشق لاحاصل اور نامناسب تھی۔ بعض سیانے افراد نے یہاں تک مشورہ دیا کہ اگر پی پی پی کے کونسلر بات نہ مانیں تو انہیں نا اہل قرار دے دیا جائے۔

مجھ سے بھی رائے مانگی گئی۔ میں نے اس منصوبہ کی مخالفت کی' تاہم اس کے سیاسی یا اخلاقی عدم جواز کے پہلو سے نہیں کیونکہ اس طرح وہ متاثر نہ ہوتے۔ میں نے ان کی مزاحمت کرنے کے لیے سراسر مختلف پوزیشن اختیار کرتے ہوئے کہا "انہیں پی پی پی سے توڑ کر ساتھ ملانا غیر دانشمندانہ ہوگا۔ اگر وہ خود بھی

مسلم لیگ کے کیمپ میں آنا چاہیں تو قبول نہ کریں۔ وہ اکثر مقامات پر اقلیت میں ہیں۔ انہیں اقلیت کی علامت کے طور پر قائم رکھنا چاہیے تاکہ پی پی پی کے اس دعویٰ کو جھٹلایا جاسکے کہ وہ ملک میں اکثریتی جماعت ہے۔ اس طرح مسلم لیگ دنیا پر ثابت کرسکے گی کہ حقیقت میں اکثریتی پارٹی وہی ہے۔ انہیں ان کے اقلیت میں ہونے کے ناقابلِ تردید ثبوت کے طور پر باقی رہنے دیں۔'' میں نے دیکھا کہ میرے اِردگرد تمام چہرے حیرت میں ڈوب گئے۔ یہ ان کے نزدیک انتہائی خلافِ معمول استدلال تھا۔ لیکن میں اپنے فہم کے مطابق سیاسی روایات کو فروغ دینے کی کوشش کررہا تھا۔ میں اپنے باطن میں جھانکے بغیر موقع کی مناسبت سے بول رہا تھا۔ تاہم اپنے استدلال پر خوشی محسوس کررہا تھا کہ آخرِ کار پی پی پی کے کونسلروں کو توڑ کر ساتھ ملانے کا منصوبہ ترک کردیا گیا۔

چند دن بعد بلدیاتی اداروں نے پُرامن فضا میں کام شروع کردیا۔ حکمران جماعت بڑی مغرور' حد سے زیادہ پُراعتماد اور فتح کے نشہ میں چور تھی۔ یہ نشہ آگے چل کر خود اس کے لیے مکافاتِ عمل بننے والا تھا۔ ایم آر ڈی اور پی پی پی کو زبردست سیاسی دھچکا لگا۔ ان کی سرکشی نارمل حالت بلکہ سیاسی ٹھہراؤ میں بدل گئی۔ جس سے امن وامان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا البتہ ان کا ووٹ بینک محفوظ رہا۔ 1983ء کی تحریک کے بعد تلخی کا طویل سفر طے کرکے دونوں تنظیمیں پُرامن اور پُرسکون سیاسی فضا میں داخل ہوگئیں۔

فوج نے اپنے پیشہ ورانہ فرائض سنبھال لیے اور سیاستدان پھر سے اپنی غلطیوں کا ارتکاب کرنے لگے۔ بہرحال سیاستدانوں نے خواہ وہ حکومت میں تھے یا اپوزیشن میں ارادتاً یا غیر ارادی طور پر رستے ہوئے زخموں کو مندمل ہونے میں مدد دی۔ یہ سیاسی نظام کی برکتیں تھیں۔ اگرچہ ہمیں جو سیاستدان میسر ہیں ان سے کسی خیر کی توقع نہیں۔ اگر وہ اپنی اصلاح نہ کریں تو پے در پے الیکشن کرا کے ان کی تطہیر کی جاسکتی ہے۔ سارے الیکشن صاف شفاف نہیں تھے، تاہم خوبیاں خامیوں پر غالب آتی ہیں۔ سیاستدانوں کو انتخابات سے ہرگز نہیں گھبرانا چاہیے۔ خوف تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ اگر وہ حقیقت کا سامنا کرنے لگیں تو لوگ ان کی عزت کریں گے خواہ وہ جیتیں یا ہار جائیں۔

جمہوریت کا آسان مطلب ہے اقتدار چھوڑنے کے لیے آمادگی' پاکستان الیکشن کے نتیجے میں قائم ہوا تھا اور یہ اسی صورت میں مستحکم ہوگا جب حکومت کے قانونی جواز کو انتخابات اور جمہوری نظام کے

ذریعے قائم رکھا جائے۔ علاقائیت کے جن پر صرف لوگوں کے تعاون سے قابو پایا جاسکتا ہے۔ فوج کی قوت سے نہیں۔

لوگوں کی خواہش کا ہرگز مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ ان پر اعتماد اور بھروسہ کریں۔ ان کے پاس بار بار جائیں خواہ کتنی دفعہ کیوں نہ جانا پڑے۔ وہ ملک سے ہرگز دغا نہیں کرتے بلکہ اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ وہی اس کے حقیقی محافظ اور پاسبان ہیں۔ جو کچھ ان کا ہے اس پر تحکمانہ دعویٰ نہ کریں۔ لوگوں کا اجتماعی شعور خود ساختہ ہیروز سے کہیں اعلیٰ وارفع ہوتا ہے۔



باب 28

جونیجو سائیں..........الوداع!

عشق اور محبت کی طرح اقتدار میں بھی کسی کی شراکت خوشی سے برداشت نہیں کی جاتی۔ اس لیے

اقتدار کے ایوانوں اور غلام گردشوں میں رقابتیں، شکوک و شبہات اور سازشیں معمول کی باتیں سمجھی جاتی ہیں۔ سازش کے رجحانات بکثرت پائے جاتے ہیں اور مصاحبین معمولی واقعات کو بھی بڑھا چڑھا کر سنگین خطرات کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ آخر میں اسی نسبت سے شکوک و شبہات سے کام لیا جاتا ہے۔

ضیا نے محمد خاں جونیجو کو جو ایک غیر معروف سیاستدان اور اوسط درجہ کی صلاحیت کے مالک تھے اس پختہ یقین کے ساتھ وزیرِ اعظم نامزد کیا تھا کہ جونیجو کی طرف سے ان کی حکومت کو خطرہ تو کجا کسی عام مسئلہ کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ تاہم اقتدار میں آنے کے بعد بونے بھی قد آور بن جاتے ہیں۔ اقتدار نے جونیجو جیسے تابع فرمان اور تابع مہمل شخص کو جست لگانے والی خواہشات کا اسیر بنا دیا۔ خصوصاً دورہ امریکہ کے بعد تو انہوں نے بہت ہی پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ پیر پگاڑا نے ایک حکایت میں جو ان کے اخباری بیانات کے ذریعے ان دنوں بہت مشہور ہوئی' جونیجو کو ایسے چوہے سے تشبیہ دی تھی جو دہاڑتا ہو اور خود بلی (جنرل ضیا) کو مغلوب کرنے کا خواہاں ہو۔

جونیجو کی نہ تو کوئی سیاسی بیس تھی' نہ ہی ایم این ایز کی اکثریت ان کی وفادار تھی کیونکہ وہ غیر جماعتی بنیاد پر منتخب ہوئے تھے۔ انہوں نے حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ مارشل لا انہوں نے ختم کرایا ہے۔ جس کا کریڈٹ بجا طور پر جنرل ضیا کو جاتا تھا۔ مزید برآں اس بات پر جنرل ضیا کا ممنون ہونے کی بجائے کہ انہوں نے جونیجو کو کئی آئینی بحرانوں سے نکالا تھا' موصوف اپنا آپ منوانے کے چکر میں پڑ گئے۔ دوسری طرف ان کے دل میں یہ ٹھوس خدشہ جاگزیں ہو گیا تھا کہ نواز شریف' جن کی پنجاب میں مضبوط سیاسی بیس تھی' صدر ضیا کی مدد سے ان کی جگہ نہ لے لیں۔ نتیجتاً انہوں نے پے در پے فاش غلطیاں کیں، جو آخرِ کار انہیں لے ڈوبیں۔ جونیجو کو' جنہوں نے یہ لاف زنی کی تھی کہ وہ جرنیلوں کو 800 سی سی کی سوزوکی کی کاروں میں بیٹھنے پر مجبور کر دیں گے' ایوانِ اقتدار سے اس طرح بے نیل مرام رخصت ہونا پڑا کہ وہ ہلکی سی آواز میں آہ و فغاں تک نہیں کر سکے۔ وزیر اعظم ہاؤس سے ان کی رخصتی یوں عمل میں آئی جیسے بلی چوہے کو سوراخ سے کھینچ کر دور پھینک دیتی ہے۔

1988ء کے سینٹ الیکشن

سینٹ کی ان آدھی نشستوں کا انتخاب مارچ 1988ء میں ہونے والا تھا جو دستور کی رو سے خالی

ہوگئی تھیں۔ پنجاب میں بعض گروپوں نے نواز شریف کی پوزیشن خراب کرنے کے لیے ان انتخابات کو طاقت کا مظاہرہ بنانے کی کوشش کی۔ آزاد اُمیدواروں کی بھاری تعداد نے کاغذاتِ نامزدگی داخل کرادیئے اور پس پردہ توڑ جوڑ شروع ہوگیا۔ عام طور سے قیاس آرائی کی جانے لگی کہ مسلم لیگ کے بہت سے ایم پی ایز پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کریں گے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ میاں صاحب کی سیاسی معاملات پر گرفت مضبوط نہیں۔ بہتوں نے شک ظاہر کیا کہ اس اقدام کے پسِ پشت وزیراعظم کا ہاتھ ہے۔

میرے تجزیہ کے مطابق جو محتاط مطالعہ پر مبنی تھا' اس کا کوئی امکان نہیں تھا' میاں شجاع الرحمٰن' رفیق غوری' مختار ٹکا' شفیق عارف اور دیگر آزاد اُمیدوار جو میدان میں تھے' میں ان میں سے اکثر کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ ممکن ہے ان کی ذاتی خواہشات کچھ رنگ دکھا رہی ہوں۔ تاہم اس اقدام کے پسِ پشت مجھے کوئی منصوبہ بندی نظر نہیں آئی۔ مگر میرے تجزیے پر کسی نے توجہ نہ دی۔ افواہیں پھیلانے والے وزیراعلیٰ کو خوفزدہ کرنے میں مصروف رہے۔ وہ لوگ یہ تاثر دے کر بداعتمادی کے بیج بو رہے تھے کہ ان کے خلاف سازش میں وزیراعظم کا ہاتھ ہے۔ آزاد اُمیدواروں کے اپنے مسائل تھے جنہیں وہ سودا بازی کے ذریعے حل کرنے کے خواہاں تھے جیسا کہ ہماری سیاست میں عموماً ہوتا ہے۔ لوگوں سے سیاسی رابطوں کے ذریعے محض ان کا ذہن اور مقاصد کو سمجھنے کی ضرورت تھی۔ اس کی بجائے میں نے انتظامیہ کو ان سے رابطہ کر کے ان پر اثر انداز ہونے میں سرگرم پایا۔ میں نے وزیراعلیٰ کو مطلع کیا اور اس کے ناپسندیدہ نتائج پر تفصیل سے بات کرنے کے بعد ان سے درخواست کی کہ انتظامیہ کو اس معاملہ میں دخل اندازی سے روکیں اور وہ اپنی سیاسی ٹیم کو اس معاملہ سے نمٹنے کی ہدایت کریں۔

انہوں نے غلام حیدر وائیں کو کہا کہ آزاد اُمیدواروں کے ساتھ رابطہ رکھیں۔ مجھے ہدایت کی گئی کہ میں وائیں صاحب کو اُمیدواروں کے پسِ منظر اور ان کی سرگرمیوں کی بابت تمام دستیاب معلومات و اطلاعات فراہم کروں۔ وائیں نے ان سے واقعی رابطہ کیا۔ قانون کا تقاضا تھا کہ ہر اُمیدوار کے کاغذات نامزدگی پر ایک تجویز کنندہ ایم پی اے اور دوسرے تائید کنندہ کے دستخط ہونے چاہئیں۔ چنانچہ وائیں نے پارٹی ڈسپلن کے تحت مسلم لیگ کے تجویز کنندگان اور تائید کنندگان سے رابطہ کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ آزاد اُمیدواروں کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح بہت سے اُمیدوار ہاتھ ملتے رہ گئے۔

جب اُمیدوار اپنے تجویز کنندگان کی حمایت سے محروم ہو گئے تو انتخابات سے باعزت طور پر علیحدگی اختیار کرنے کی تدابیر سوچنے لگے۔ اس کا انتظام خود نواز شریف نے کر دیا۔ میاں شجاع الرحمٰن اور مختار ٹکا حاجی اکرم کے پاس آئے اور اپنا نام واپس لینے سے پہلے وزیر اعلیٰ کے ساتھ ملاقات کی خواہش ظاہر کی، جس کا اہتمام کرا دیا گیا۔ رفیق غوری نے بھی وزیر اعلیٰ سے ملنا چاہا۔ ڈاکٹر صفدر محمود کے توسط سے ان کی ملاقات بھی کرا دی گئی۔ اس کے بعد انہوں نے بھی اپنا نام واپس لے لیا۔ شفیق عارف نے بھی ایسا ہی کیا۔

میں نے اپنے دوست ٹکا اقبال سے پوچھا: "آپ نے وزیر اعلیٰ سے اپنے یا اپنے بھائی مختار کے لیے کبھی کسی نوازش یا مہربانی کی درخواست نہیں کی، اب آپ ان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"

"محض چہرہ دکھانا مقصود ہے۔" چوہدری صاحب۔

انہوں نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ہم اپنے ووٹروں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے وزیر اعلیٰ کے کہنے پر اپنے نام واپس لیے ہیں۔ اس طرح لوگوں کی نظروں میں ہماری پوزیشن بہتر ہو جائے گی۔"

نام واپس لینے والے دیگر اُمیدواروں کی پوزیشن بھی ایسی ہی تھی۔ لیکن نواز شریف کے مخالفین نے اخباری بیانات میں الزام لگایا کہ یہ کارروائی کسی خفیہ سمجھوتہ کا نتیجہ ہے۔ جو کہ سراسر بے بنیاد تھا کیونکہ ان میں سے اکثر اُمیدوار اچھا پس منظر رکھنے والے خوددار لوگ تھے۔ نواز شریف نے سینٹ کے لیے اپنے اُمیدواروں کے بلا مقابلہ انتخاب کو یقینی بنا لیا۔ یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ بھٹو کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ یہ بے مثال کامیابی دیکھ کر مسلم لیگ کے بعض حلقے ان سے حسد کرنے لگے۔ اخبارات میں نواز شریف کو وزیر اعظم کے لیے خطرہ قرار دے دیا گیا۔ دراصل بینظیر نے کامیابی محض اس طرح حاصل کی کہ ایک سیاسی مسئلہ کو سیاسی طریقہ سے نمٹایا۔ انتظامیہ کے غلط استعمال کے ذریعے نہیں۔ بہت سے لوگ اسے ناممکن سمجھتے تھے، اس لیے انہیں یقین ہی نہیں آیا۔

دو انتہائی سینئر بیوروکریٹس مجھ سے اس بات پر خفا تھے کہ میں نے انہیں وزیر اعلیٰ کو انتظامی تراکیب سے خوش کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ان میں سے ایک نے مجھے "عظیم سیاستدان" قرار دیا۔ جس سے مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ میرا اس کے سوا کوئی کردار نہیں تھا کہ وزیر اعلیٰ کو انتظامیہ کے استعمال سے باز رکھا۔

اوجڑی کیمپ کا دھماکہ

10 اپریل 1988ء کی صبح کو میرے دوست اے حمید اسپیشل برانچ کے دفتر واقع سیٹلائیٹ ٹاؤن (راولپنڈی) میں کام کر رہے تھے جب اچانک بہت زوردار دھماکہ ہوا۔ متعلقہ ایس پی تو مجھے ابتدائی معلومات سے آگاہ کرنے کی بابت سوچتا ہی رہا جب کہ اے حمید نے فون اٹھایا اور فوری طور پر مطلع کر دیا۔ مرزا محمد علی' ایس پی نے ان کے بعد بتایا کہ اوجڑی کیمپ کے اسلحہ ڈپو میں آگ لگ گئی ہے اور اس میں ذخیرہ کردہ میزائل ہر طرف موت اور تباہی کی بارش برسا رہے ہیں۔ اس پر قابو پانے میں کئی گھنٹے لگے اور بہت سی جانیں ضائع ہو گئیں۔ اندازاً ایک سو افراد ہلاک ہوئے۔ جن میں سابق وفاقی وزیر اور مری کے حلقہ سے ایم این اے خاقان عباسی بھی شامل تھے۔ بے پناہ مالی نقصان اس کے علاوہ تھا۔

انور زاہد اور میں لوگوں کی مدد بحالی اور نقصان کی تلافی کے لیے بھاگم بھاگ راولپنڈی پہنچے۔ نواز شریف اس روز سرکاری دورہ پر مراکش سے لندن جانے والے تھے' انہوں نے اپنا دورہ منسوخ کر دیا اور فوراً راولپنڈی پہنچ گئے۔ وزیر اعلیٰ نے شہر کا دورہ کیا متاثرین کو دلاسہ دیا اور فوری امداد کا انتظام کیا۔ انہوں نے اپنے زیرِ نگرانی موقع پر ہی معاوضہ کی ادائیگی کرائی۔ یہ انتہائی تیز رفتار اور مستعدی پر مبنی امدادی آپریشن تھا جس کا اہتمام کسی حکومت کی طرف سے کیا گیا' میاں صاحب کی متحرک اور فعال قیادت نے معجزہ کر دکھایا۔ وہ بیوروکریٹس کی معمول کی سست کارروائی سے بدرجہا بہتر تھا۔

اوجڑی کیمپ کے دھماکہ سے حکمران حلقوں میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ افغانستان کی جنگ کے دوران بیرونی ممالک سے گولہ بارود کی جو بھاری مقدار موصول ہوئی اسے افغان مجاہدین کو فراہم کرنے سے پہلے اوجڑی کیمپ میں ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ وہ کیمپ گنجان آباد شہری علاقے میں واقع تھا اور آس پاس بسنے والے لوگوں کے لیے زبردست خطرہ تھا۔ پریس نے فوج خصوصاً آئی ایس آئی کی غفلت و لاپروائی کو بے نقاب کرنے کے لیے اس واقعہ کی زبردست تشہیر کی۔ آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل اختر عبدالرحمٰن اور موجودہ چیف جنرل حمید گل کو بطور خاص نشانہ تنقید بنایا گیا۔ وزیر اعظم نے فوری طور پر تین رکنی تحقیقاتی کمیشن مقرر کر دیا۔ قومی اسمبلی اس مسئلہ پر ایوان کے اندر بحث کرنا چاہتی تھی جب کہ اپوزیشن خصوصاً پیپلز پارٹی اس معاملہ کو آرمی چیف جنرل ضیا کے خلاف استعمال کرنے کے حق میں تھی۔

اپوزیشن اور بعض دوسری قوتیں صدر اور وزیر اعظم کے درمیان اختلافات پیدا کرنے میں سرگرم تھیں' صدر کو اس وقت زبردست دھچکا لگا جب جونیجو نے روسی اور امریکی دباؤ میں آ کر بنیادی مسائل خصوصاً افغانستان میں عبوری حکومت کی تشکیل کا حل تلاش کیے بغیر جنیوا معاہدہ پر دستخط کر دیے۔ جنرل ضیا

نے امریکیوں کو مصیبت زدہ افغانیوں کی بابت ذمہ داریوں سے پہلو بچا کر بھاگتے ہوئے دیکھا تو وہ سخت برافروختہ ہوئے۔ روسیوں کو میدان سے بھاگتے دیکھ کر امریکیوں نے خون میں نہائے ہوئے افغانیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور خود وہاں سے کھسک گئے۔ جنرل ضیا نے اس ساری صورتِ حال کا ذمہ دار جونیجو کو ٹھہرایا۔ صدر کے خیال میں وزیر اعظم نے معاہدہ جنیوا سے پہلے آل پارٹیز کانفرنس بلا کر جس میں پی پی پی بھی شریک ہوئی' ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ ضیا کے نزدیک تمام سیاستدان معاہدہ جنیوا پر دستخط کرنے کے جرم میں شریک تھے۔

اوجڑی کیمپ کی تباہی نے جنرل ضیا کی پریشانیوں میں بے پناہ اضافہ کر دیا اور اس معاملہ پر پارلیمنٹ و پریس میں زبردست نکتہ چینی ہونے لگی۔ دوسرے جنرل خوفزدہ ہو گئے کہ ان پر بھی سانحہ اوجڑی کیمپ کی ذمہ داری ڈالی جائے گی۔ اچانک ایسا محسوس ہونے لگا کہ فوج ملزموں کے کٹہرے میں کھڑی ہے اور پارلیمنٹ اس کا احتساب کرنے والی ہے۔ فوج کی ہائی کمان کے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت تھا۔ پارلیمنٹ جسے فوج نے خود غیر جماعتی الیکشن کے ذریعے تخلیق کیا تھا' اپنے ان اختیارات سے تجاوز کرنے لگی جو اسے تفویض کیے گئے تھے۔ جرنیلوں نے خود کو بند گلی میں گھرا ہوا محسوس کیا۔

جنرل ضیا کو باور کرا دیا گیا کہ مسلم لیگ اور پی پی پی کے درمیان ان کے خلاف خفیہ معاہدہ طے پا گیا ہے۔ یوں فوج اور سیاستدانوں کے مابین محاذ آرائی نے سنگین اور خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ ہم 1971ء 1977ء اور 1984ء کی طرف واپس جا رہے تھے اور ہر طرح کی تباہی کے امکانات صاف نظر آ رہے تھے۔ میں بے حد پریشان تھا کیونکہ آثار بتا رہے تھے کہ کوئی بھی تباہ کن آفت کسی بھی وقت نازل ہو سکتی ہے۔ جس سے اس ساری محنت پر پانی پھر جائے گا جو میں نے 1984ء میں فیڈرل سیکورٹی سیل میں کی تھی اور جمہوریت کی بحالی کے لیے نوٹس لکھے تھے۔ ہر چیز بھک سے اڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

میں نے ڈاکٹر صفدر محمود اور حاجی اکرم کو اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ وہ پہلے ہی اس قسم کے تفکرات میں مبتلا تھے۔ ہم نے نواز شریف سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ جو اگلے روز وزیر اعظم کے ساتھ کوریا جا رہے تھے۔ ڈاکٹر صفدر نے میاں صاحب کو بڑی وضاحت سے صورتِ حال کے بارے میں ہمارے خیالات سے آگاہ کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ صدر اور وزیر اعظم کے درمیان اختلافات ختم کرانے

میں اپنا کردار ادا کریں۔ اس کشیدگی کو اس طرح ختم کیا جا سکتا ہے کہ کسی بند کمرے میں ایوان کی دفاعی کمیٹی کے لیے بحث کا اہتمام کیا جائے۔ غلط فہمیوں اور ان کے نتیجہ میں جنم لینے والے شبہات کو دور کرنے کے لیے ڈاکٹر صفدر نے تجویز کیا کہ میاں صاحب صدر اور وزیر اعظم کو مذاکرات کی میز پر بٹھائیں تاکہ کوریا جانے سے پہلے چھوٹے موٹے اختلافات دور کر لیے جائیں۔ میاں صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ مصالحت کرانے میں اپنا کردار ضرور ادا کریں گے' لیکن ان کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ ہم بعد کے واقعات کو کنٹرول نہیں کر سکے کیونکہ وہ برق رفتاری سے ظہور پذیر ہو رہے تھے۔

جنرل ضیا ابھی معاہدہ جنیوا کے سلسلے میں ہونے والی بے وفائی اور سانحہ اوجڑی کیمپ کی بابت سیاستدانوں کے پریشان کن طرزِ عمل سے پہنچنے والی اذیت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پائے تھے کہ راولپنڈی میں ایک ایم پی اے اور چند نوجوان فوجی افسروں کے مابین افسوسناک جھگڑا ہو گیا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ایم پی اے نے اعلان کر دیا کہ وہ اس واقعہ کی بابت صوبائی اسمبلی میں تحریک استحقاق پیش کریں گے۔ اس سے کشیدگی کو مزید ہوا ملی۔ چونکہ وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ ملک سے باہر تھے' اس لیے صدر نے غلام حیدر وائیں اور ملک سلیم اقبال کو راولپنڈی بلایا تاکہ وہ صورتِ حال پر قابو پا سکیں۔

سلیم ملک نے صدر سے ملنے سے پہلے میرے ساتھ ملاقات کی۔ میں نے انہیں اپنی معلومات کی حد تک جرنیلوں کے خدشات کے بارے میں بریف کیا اور مشورہ دیا کہ صدر کو تسلی دیں کہ صوبائی اسمبلی میں فوج کے خلاف کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں نے ان سے کہا کہ "پوری اسمبلی کو سزا دینے کی بجائے ایک ایم پی اے کو سزا بھگتنے دیں۔ جنرل کو اس مقام تک مت دھکیلیں کہ وہ پورے نظام کی بساط لپیٹنے پر مجبور ہو جائے۔ آپ کو ان کے تمام خدشات دور کرنے چاہئیں۔" انہوں نے میری تجویز سے اتفاق کر لیا۔

سلیم اقبال نے وائیں سے تبادلہ خیال کیا۔ وائیں کی سوچ یہ تھی کہ وہ جنرل سے بات چیت کے دوران ایم پی اے کی حمایت کریں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ایم پی اے اور اس کے خاندان کو شادی کے موقع پر بعض فوجی افسروں نے ان کے گھر میں گھس کر زدوکوب اور بے عزت کیا تھا۔ اس کی شکایت بالکل بجا تھی اور اسے دلاسہ دینے کی واقعی ضرورت تھی۔ تاہم اس معاملہ کو مؤخر کیا جا سکتا تھا اور جنرل سے علیحدگی میں قصورواروں کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا جا سکتا تھا' یعنی وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ کی وطن واپسی کے بعد اس کا کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ لیکن وائیں اس معاملہ کو مؤخر کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

جنرل کے ساتھ مذاکرات کے دوران وائیں نے ایم پی اے کی وکالت کی تو ضیا فوراً سمجھ گئے کہ معاملہ کو اسمبلی میں اٹھانے کا مقصد فوج کو بدنام کرنا اور ان کی اتھارٹی کو چیلنج کرنا ہے۔ وائیں نے ضیا کو ہر چند یقین دلایا کہ ایوان میں بحث مباحثہ کے ذریعے تمام مسائل حل کر لیے جائیں گے تاہم جنرل ضیا جو طویل عرصہ سے بلا روک ٹوک اور بلا شرکتِ غیرے حکومت چلا رہے تھے' بات چیت سے مطمئن نہیں ہوئے۔ بدقسمتی سے وائیں میں مطلوبہ سفارت کارانہ مہارت اور شائستگی کا فقدان بھی تھا۔ اس لیے ضیا ان کے غیر ضروری دلائل سے مزید برہم ہو گئے آخر میں وائیں نے یہ کہہ کر سارا کھیل بگاڑ دیا کہ یہ معاملہ وزیراعظم اور وزیراعلیٰ کی واپسی کے بعد ان کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ وہ چاہتے تو مسئلہ کو حل کرنے کی ذمہ داری خود قبول کر کے اسے ٹھنڈا کر سکتے تھے' کیونکہ وہ خود بھی مسلم لیگ کے بہت سینئر لیڈر تھے۔

ملک سلیم اقبال نے اس ملاقات کے بعد مجھے بتایا کہ ضیا بہت برہم تھے اور انہوں نے بڑے طنزیہ انداز میں گفتگو کی۔ ''اسمبلیوں کی حیثیت کیا ہے؟ اور ممبروں کا استحقاق کیا معنے رکھتا ہے؟ فوجیوں کو بھی کچھ استحقاق حاصل ہے۔'' انہوں نے انتہائی خشم آلودہ لہجہ میں کہا۔ سلیم اقبال نے خدشہ ظاہر کیا کہ جنرل ضیا کسی کو معاف نہیں کریں گے اور انہوں نے انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ 29 مئی 1988ء کو جو کچھ ہوا اس کا پس منظر یہی تھا۔ وزیراعظم جونہی غیر ملکی دورہ سے اسلام آباد پہنچے' صدر نے آٹھویں ترمیم کے تحت اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے وفاقی حکومت اور قومی اسمبلی کا دھڑن تختہ کر دیا۔

نواز شریف جو وزیراعظم کے ساتھ گئے تھے۔ راولپنڈی سے فوراً لاہور پہنچے۔ ایک ملاقات میں انہوں نے انکشاف کیا کہ صدر کی طرف سے دیئے گئے عندیہ کے مطابق وہ نگران وزیراعلیٰ کے طور پر بدستور کام کرتے رہیں گے۔ نواز شریف کا خیال تھا کہ صدر کو ساتھ لے کر احتیاط اور ہنر مندی سے آگے بڑھنا چاہیے تاکہ آئندہ الیکشن کو یقینی بنایا جا سکے اور سیاسی نظام کو بچایا جا سکے۔ ''خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے صدر پاکستان کی حیثیت سے قدم اٹھایا ہے' چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت سے نہیں۔'' انہوں نے رائے ظاہر کی۔

معاملات کو نئے طریقے سے چلانے پر غور

30 مئی 1988ء کو صبح سویرے ارشد چوہدری نے مجھے کراچی سے فون کیا اور کہنے لگے:
''صدر نے یہ کیا کر دیا؟ کیا وہ پاگل ہو گئے ہیں؟'' ان کی آواز میں غصہ تھا۔ صدر نے ایک سندھی وزیراعظم کو پھانسی دے دی اور دوسرے کو برطرف کر دیا۔ انہوں نے سندھیوں کے زخم' جو مندمل ہونے لگے تھے' پھر سے ہرے کر دیئے ہیں۔ سندھ ابھی تک سلگ رہا ہے براہ نوازش اسے بچانے کی کوشش کریں جیسا کہ آپ ماضی میں کئی دفعہ خاموشی کے ساتھ اپنا کردار ادا کر چکے ہیں۔''

''سردست میں کیا کر سکتا ہوں؟'' میں نے دریافت کیا: '' میں انتہائی دل شکستہ و پریشان ہوں۔ آپ رہنمائی فرمائیں۔ میں وہ ہر کام کرنے کی پوری کوشش کروں گا جو ملک کے مفاد میں ہو۔'' ان کے پاس ایک واضح تجویز تھی' اس لیے فوراً کہنے لگے: ''ضیا اب نواز شریف پر بازی لگانے والے ہیں۔ چونکہ یہ دونوں پنجابی ہیں۔ اس لیے یہ سلسلہ چلنے والا نہیں۔ اس طرح سندھ میں احساسِ محرومی بڑھ جائے گا اور اسے کنٹرول کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ اب پیر پگاڑا بھی تعاون نہیں کریں گے کیونکہ برطرف شدہ وزیراعظم ان کے مرید ہیں۔ اگر وہ تعاون کرنے پر آمادہ ہو بھی جائیں تو جس اعتماد کو ٹھیس لگ چکی ہے' وہ بحال نہیں ہو سکتا۔ بے نظیر کے بعد واحد سندھی جو سندھیوں کو اپنے ساتھ لے کر چل سکتا ہے' غلام مصطفیٰ جتوئی ہیں' نئے نظام میں ان کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں اتحاد کی ضرورت پڑے گی۔ یہ باتیں میاں صاحب تک پہنچا دیں تاکہ وہ صدر سے بات کر سکیں۔''

ان کی تجویز میں واقعی وزن تھا۔ جتوئی نے پی پی پی سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی جداگانہ جماعت' نیشنل پیپلز پارٹی بنا لی تھی۔ جس میں غلام مصطفیٰ کھر سمیت بہت سے سرکردہ سیاستدان شامل ہو گئے تھے۔ تاہم وہ پارٹی آگے نہیں بڑھ سکی۔ یہ ساری باتیں پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے اس بارے میں جتوئی صاحب سے بات کر لی ہے؟ میں کبھی ان سے نہیں ملا اور ان کی پارٹی بھی ابھی نئی نئی ہے۔''

میں نے ان سے کہا کہ میاں صاحب کے ساتھ میری بات چیت سے پہلے آپ جتوئی صاحب سے ایک ملاقات ضرور کر لیں۔ چوہدری ارشد کی اس بات میں بڑا وزن تھا کہ سندھیوں کو یکہ و تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ میں نے حاجی اکرم سے چوہدری ارشد کی تجویز کا ذکر کیا۔ وہ خلوصِ دل سے اس بات کے خواہاں تھے کہ موجودہ حالات میں اقتدار کو ''پنجاب شو'' نہیں بننا چاہیے۔

نواز شریف نے نئی صورتِ حال پر حاجی اکرم سے تبادلہ خیال کیا جو ان دنوں ایڈیشنل چیف سیکرٹری کے طور پر کام کر رہے تھے۔ حاجی صاحب نے بعد ازاں مجھے بتایا کہ صدر نے نواز شریف کو مشورہ دیا تھا کہ مسلم لیگ کے صدر بن جائیں اور یہ بات میاں صاحب کے دل کو لگی۔ حاجی صاحب کی رائے اس کے برعکس تھی کیونکہ اس طرح وہ عملی طور پر محض پنجاب لیگ بن کے رہ جائے گی۔ مسلم لیگ کا صدر کسی چھوٹے صوبہ سے ہو تو زیادہ بہتر رہے گا۔

چوہدری ارشد نے دو دن بعد مجھے بتایا کہ وہ تجویز جتوئی کو پسند نہیں آئی۔ اس لیے اب مجھے میاں صاحب سے درخواست کرنی چاہیے کہ وہ ملک کے مفاد میں اپنے طور پر جتوئی صاحب کو قائل کریں۔ میں نے میاں صاحب سے بات کی مگر انہوں نے سندھ فیکٹر کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ پیر پگاڑا نے 8 جون کو جنرل ضیا سے ملاقات کی اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں' نگران کابینہ کی تشکیل میں اپنی شرائط ٹھونسنے کی کوشش کی۔ صدر نے ان کی بات نہیں مانی۔ یوں ان دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔

مجھے بعد میں پتہ چلا کہ پیر پگاڑا بعض معاملات میں ان کی بات نہ ماننے پر جونیجو کے خلاف ہو گئے تھے اور حقیقت میں انہوں نے اپنے مرید اور نامزد کردہ شخص کی برطرفی میں جنرل کا ہاتھ بٹایا تھا۔ اب وہ جنرل سے بہت کچھ آس لگائے بیٹھے تھے مگر انہوں نے گھاس نہیں ڈالی۔

صدارتی نظام کی ترغیب

ٹکا اقبال اور حاجی اکرم اس رائے کے حامی تھے کہ سندھ کو ہرگز نظر انداز یا بلڈوز نہیں کرنا چاہیے اور سر دست جتوئی واحد آپشن ہیں۔ اقبال کے اصرار پر میں نے صورتِ حال کا ایک تجزیہ مرتب کیا اور سندھ فیکٹر سے سیکورٹی کو لاحق مضمرات پر روشنی ڈالی۔ میں نے وہ تجزیاتی رپورٹ میاں صاحب کو پیش کی۔ دوسری طرف ٹکا اقبال نے کراچی میں جتوئی سے ملاقات کی۔ انہوں نے بعد میں مجھ سے ذکر کیا کہ جتوئی کا جواب کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا' کیونکہ ان کے خیال میں جنرل ضیا صدارتی نظامِ حکومت قائم کرنے پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ جس میں کسی سیاستدان کی قطعاً گنجائش نہیں تھی۔

بعد میں انکشاف ہوا کہ جنرل ضیا صدارتی نظام اس لیے لانا چاہتے تھے کہ وہ پارلیمانی نظام

سے سخت بیزار و مایوس ہو گئے تھے۔ مجھے یہ جان کر بڑی تشویش ہوئی کیونکہ میرے خیال میں صدارتی نظام علاقائی اور علیحدگی پسند قوتوں کے لیے موجب تقویت بن سکتا تھا' اور وہ نظام ملک کو پہلے ہی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا چکا تھا۔ ایوب خان کے صدارتی نظام نے عوام اور سیاستدانوں میں علیحدگی اور محرومی کا اس قدر شدید احساس پیدا کر دیا تھا کہ اس کے نتیجہ میں ہم مشرقی پاکستان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ایسا لگتا تھا کہ جنرل ضیا واقعی پاگل ہو گئے ہیں وہ ہر ایک پر شک کرنے لگے۔ انہوں نے براہ راست شخصی حکمرانی کی اسکیمیں بنانا شروع کر دیں۔ جس میں صرف مارشل لا کی کمی تھی۔ یہاں تک کہ پنجاب کی نگران کابینہ میں دو وزرا سے زیادہ توسیع کی اجازت نہیں دی۔ نواز شریف کو مزید وزرا کی اجازت حاصل کرنے کے لیے زبردست تگ و دو کرنی پڑی۔ مجھے بتایا گیا کہ توسیع کی اجازت اس وقت ملی جب جنرل ضیا قائل ہو گئے کہ بڑی کابینہ زیادہ لوگوں کو متاثر کر سکے گی اور صدارتی انتخاب جیتنے میں ان کی مدد کرے گی۔ جتوئی صدر کے عزائم کی بابت صحیح معلومات رکھتے تھے تاہم ٹکا اقبال کی ذہانت اور اصرار انہیں سیاسی جمود سے باہر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ انہوں نے جتوئی کو قائل کر لیا کہ صدر کو خطرناک صورتِ حال پیدا کرنے سے باز رکھنے کے لیے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے خواہ محدود ہی کیوں نہ ہو اور اپنے آپ کو سندھ کے حساس صوبہ سے ممکنہ متبادل کے طور پر پیش کرنا چاہیے۔ انہوں نے نواز شریف کو بھی سندھ فیکٹر کی اہمیت کا قائل کر لیا تھا۔ نواز شریف نے مجھے ہدایت کی کہ ٹکا کے ذریعے جتوئی کے ساتھ رابطہ رکھوں تاکہ مناسب موقع پر ان کے ساتھ بات چیت کی جا سکے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ٹکا کا صدر کے ساتھ بھی رابطہ تھا اور وہ صدر کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ صدارتی نظام حکومت آخر کار پنجاب شو بن کر رہ جائے گا۔ جس سے چھوٹے صوبوں خصوصاً سندھ میں نفرت بڑھے گی۔

اقبال نے جتوئی کو کوئی سیاسی کردار دینے پر زور دیا' تاہم صدر کا خیال تھا کہ شاید جتوئی رضامند نہیں ہوں گے۔ ٹکا نے جتوئی کو رضامند کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ انہوں نے صدارتی نظام حکومت کے مضر اثرات اُجاگر کرنے میں اپنے کارڈز بڑی عمدگی سے اور ملک کے بہترین مفاد میں استعمال کیے۔ صدر نے غیر جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے کے لیے 16 نومبر 1988ء کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ سیاسی جماعتیں بحال ہو چکی تھیں اور مسلم لیگ دو سال سے ملک پر حکومت کر رہی تھی۔ میں یہ سوچ کر حیرت میں ڈوب گیا کہ وہ اس واضح تضاد پر کیسے قابو پائیں گے۔ تاہم ہر صاحب شعور نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ جیسے بھی ہو سیاسی عمل کو بچایا جائے۔ پرانے سیاستدان محض پبلک کو خوش کرنے کے لیے نرم الفاظ

میں تنقیدی بیان دیتے رہے۔ جنرل ضیا وقتی طور پر پست ہو گئے تھے جبکہ سیاستدان محتاط اور چوکس تھے۔

مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ ایک کا نام جونیجو گروپ اور دوسرے کا نواز شریف گروپ رکھا گیا۔ دونوں گروپ الیکشن کے حامی تھے۔ جونیجو صدر کے ساتھ نباہ نہیں کر سکے جبکہ نواز شریف صدر کو اس لیے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے کہ مزید خطرناک اقدامات نہ کر سکیں۔ جونیجو گروپ تحلیل شدہ اسمبلیوں کی بحالی کا خواہاں تھا' تاہم ایسا قدم یقیناً بہت سی مشکلات کھڑی کر دیتا۔ جس سے جنرل ضیا مزید پریشان ہو جاتے۔ جنرل ضیا انتہائی قدم اٹھا چکے تھے اور اب انہیں سیاسی راستہ پر گامزن رکھنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

جنرل ضیا کو بریفنگ

جنرل ضیا امن و امان پر بریفنگ کے سلسلہ میں 9 اگست 1988ء کو لاہور کے دورہ پر آئے۔ اس وقت تک نواز شریف بھی صدارتی طرزِ حکومت کے حامی بن گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ انور زاہد اور میں اس تجویز کی حمایت کریں۔ مجھے معلوم تھا کہ ضیا کے قریب ترین ساتھی اور صوبہ سرحد کے نگران وزیر اعلیٰ جنرل فضل حق اس کے حق میں نہیں۔ سپیشل برانچ کے چیف کی حیثیت سے مجھے کہا گیا کہ امن و امان کی تازہ ترین صورتِ حال پر صدر اور پنجاب کابینہ کو بریفنگ دوں۔ نیز آئندہ الیکشن کی بابت اپنا تجزیہ بھی پیش کروں۔ میرے پاس تمام حقائق اور اعداد و شمار موجود تھے۔ جو میں نے بلدیاتی انتخابات کے لیے سروے کے سلسلے میں اکٹھے کیے تھے۔ میں نے بریفنگ میں پیش گوئی کی کہ پنجاب میں مسلم لیگ کو پی پی پر واضح برتری حاصل ہوگی اور ایم آر ڈی کے ٹکڑے ہو جائیں گے کیونکہ یہ ایک تحریک ہے' انتخابی اتحاد نہیں۔ 1985ء کے برعکس اس بار پی پی پی انتخابات میں لازماً حصہ لے گی۔ اس طرح میں نے جنرل ضیا اور مسلم لیگ میں ان کے حامی گروپ کی فتح کا اُمید افزا منظر پیش کیا۔

اس کے بعد میں نے حکومت میں مجوزہ تبدیلی کے موضوع کو لیا۔ میں نے عرض کیا کہ صدارتی نظامِ حکومت لوگوں کو پسند نہیں کیونکہ اس میں حکمران یک طرفہ' جابرانہ اور آمرانہ فیصلے کرتے ہیں۔ عوام پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ حکومت کو ترجیح دیتے ہیں۔ عوام ایوب خان کا تختہ الٹ کر اس طرزِ حکومت کے خلاف فیصلہ دے چکے ہیں حالانکہ ان کے دور میں بہت زیادہ ترقیاتی کام ہوئے تھے۔ لوگ اپنے نمائندوں کے ذریعے امورِ مملکت میں شراکت چاہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی حکمران مطلق العنان بن کر ان کی گردنوں پر مسلط رہے۔

جنرل ضیا نے میری معروضات پوری توجہ سے سنیں۔ خصوصاً اس وقت سراپا گوش ہو گئے جب میں نے بھٹو کی مثال پیش کی کہ اقتدار مطلق کی خواہش میں وہ اقتدار بھی گنوا بیٹھے جو 1977ء کے الیکشن میں سادہ اکثریت کے ذریعے ملنے والا تھا۔ بھٹو دو تہائی اکثریت حاصل کرنے کے چکر میں تھے تاکہ دستور کو صدارتی نظام حکومت کے مطابق ڈھال سکیں۔ انہیں اس طرف جست لگانے کی بھاری قیمت چکانی پڑی اور وزارتِ عظمیٰ کے ساتھ ساتھ اپنی جان سے بھی ہاتھ بیٹھے۔ بھٹو بڑے مضبوط وزیر اعظم تھے۔ کوئی ایم این اے ان سے اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ بلاشبہ وہ عظیم سیاسی قد کاٹھ کے مالک تھے۔ عوام نے ایوب خاں اور بھٹو کی مطلق العنانیت کو اعلانیہ مسترد کر دیا۔ میں نے جنرل اور پنجاب کابینہ کو صاف صاف بتا دیا کہ اگر صدارتی نظام نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو ایم آر ڈی اور دیگر سیاسی قوتوں کی طرف سے مزاحمت اور احتجاج کا زبردست خطرہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ میری گزارشات پر نواز شریف نے بے چینی محسوس کی' لیکن جنرل ضیا نے کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ انہوں نے صدارتی نظام کے خلاف میرے دلائل کو مکمل سکون اور پورے انہماک سے سنا۔

میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اپنی حالیہ تاریخ سے ایک واضح سبق جو ہمیں ملتا ہے' وہ یہ ہے کہ تمام حکومتوں کا خواہ سول تھیں یا فوجی' عوام نے اس وقت دھڑن تختہ کر دیا جب انتظامیہ نے ان کی سیاسی آزادیاں سلب کرنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس حکمرانی کا ایک شریفانہ انداز وہ ہے جس کا تجربہ پنجاب میں نواز شریف کر رہے ہیں۔ اس انداز نے حکمرانوں کو عوام میں مقبول بنا دیا ہے۔ عوام آزاد اور منصفانہ ماحول میں خوش رہتے اور خود کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ میاں صاحب نے یہ مثالی امن و امان اپنے قانونی اختیارات کے جابرانہ استعمال سے قائم نہیں کیا بلکہ اپنی شرافت و رحمدلی نیز مساوات و انصاف کے ساتھ گہرے لگاؤ کی مدد سے قائم کیا ہے۔ لوگوں نے جواب میں جوش و خروش اور تعریف و توصیف کا اظہار کیا۔ میں نے دیکھا کہ ان باتوں سے میاں صاحب باغ باغ ہو رہے تھے۔ دراصل میں یہ کوشش کر رہا تھا کہ انہیں موجودہ سیاسی نظام کو بچانے پر آمادہ و تیار کروں ورنہ جنرل ضیا ملک کو ایک بار پھر مطلق العنانیت کے بے لگام اور تاریک دور میں دھکیل دیں گے۔

میں نے بڑی ہوشیاری اور حکمت کے ساتھ اپنی بریفنگ کو خوشگوار اور شیریں الفاظ میں یہ ثابت کرنے کے لیے آگے بڑھایا کہ صدارتی نظام کے لیے ناقص تصور پر مبنی منصوبہ معاملات کو پیچیدہ بنا سکتا

ہے۔ جنرل صاحب ضرورت سے زیادہ کی خواہش میں حالات پر اپنی گرفت سے محروم ہو سکتے ہیں جیسا کہ ماضی میں بھٹو کے ساتھ ہوا۔ انہیں جو کچھ میسر ہے اسی کو ہوشیاری اور دانشمندی کے ساتھ کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے آخر میں ایک بار پھر جنرل کی حوصلہ افزائی کے لیے فتح کا نقشہ کھینچا تا کہ موجودہ سیاسی نظام کو بچایا جا سکے۔

ابتدا میں مجھے صرف سات منٹ دیئے گئے تھے لیکن بعد میں صدر نے کہا کہ میں وقت کی قید کا خیال کیے بغیر بریفنگ مکمل کروں کیونکہ وہ میری بریفنگ کے غیر معمولی انداز سے خاصے متاثر ہوئے۔ میری ایک گھنٹہ کی تقریر کے بعد آئی جی پولیس ہوم سیکرٹری اور چیف سیکرٹری نے مختصر اظہارِ خیال کیا اور عام طور پر میرے خیالات کی تائید وحمایت کی۔ اپنی اختتامی تقریر میں صدر نے میری بریفنگ کو سراہا۔ انہوں نے پنجاب کابینہ سے کہا کہ ''چوہدری سردار کا مشورہ اگرچہ میرے بنیادی خیالات کے برعکس ہے لیکن انتہائی کار آمد اور قابلِ توجہ ہے۔'' گورنر سجاد حسین قریشی اور نواز شریف نے بھی میرا شکریہ ادا کیا اور میری معروضات کو سراہا۔

میں اس بات پر خوش تھا کہ میں نے دیانتدارانہ خیالات کا اظہار کر کے اپنا فرض ادا کر دیا جو سیاسی عمل کو جاری وساری رکھنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ البتہ ملک سلیم نے اس پریشانی کا اظہار کیا کہ میں نے حد سے تجاوز کر کے اپنی ملازمت خطرہ میں ڈال دی ہے۔ میں نے ان سے کہا: ''صدر نے اطمینان کا اظہار کیا ہے تو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' انہوں نے جواب دیا: ''جنرل نے وہ سب کچھ محض دکھاوے کے لیے کہا تھا۔ وہ بعد میں تمہیں لازماً نقصان پہنچائیں گے۔''

''میں ایسے بے بنیاد تفکرات کو چنداں اہمیت نہیں دیتا اور اپنا فرض صحیح طریقہ سے اور ضمیر کے مطابق ادا کرتا رہوں گا'' میں نے جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت سے کام محض اس لیے خراب ہو جاتے ہیں کہ اعلیٰ عہدوں پر فائز حکام اعصابی خلل اور نفسیاتی دباؤ کے باعث صحیح فیصلے نہیں کر پاتے۔ میں ملازمت کے دوران کئی بار حکمرانوں کے سامنے بظاہر بہت سے ناخوشگوار تاہم معروضی لحاظ سے درست خیالات کا اظہار کر چکا تھا اور وہ اکثر میری بات سے متفق پائے گئے۔ اس کے باوجود ملک صاحب کی رائے نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا اور بریفنگ کے بعد کسی قدر بزدلی نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔

انور زاہد اور میں نے بریگیڈیئر صدیق سالک کے ساتھ جو جنرل ضیا کے انتہائی قریب تھے

طویل ملاقات کی۔ ان کے خیال میں انہیں نے الیکشن کا بہت ہی امید افزا نقشہ پیش کیا تھا۔ انہوں نے مزید کہا: ''مجھے آپ کے تجزیہ پر یقین نہیں آ رہا کہ مسلم لیگ جو پہلے ہی انتشار کا شکار ہے غیر جماعتی بنیاد پر ہونے والے انتخابات بھی جیت لے گی۔ امن وامان درہم برہم ہو جائے گا اور سول انتظامیہ میں کوئی سکت باقی نہیں رہے گی۔ یہ بات انتہائی خطرناک ہے۔ جب ایک بار عوامی طاقت کا مظاہرہ ہو جائے تو آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ ایسی صورت میں آپ مارشل لا بھی نہیں لگا سکتے۔ یہ مشرقی پاکستان جیسی صورتِ حال ہو گی۔ بے نظیر آگے آئے گی اور ہر چیز کو تباہ و برباد کر دے گی۔'' اس کے بعد انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: ''چوہدری صاحب آپ نے جنرل ضیا کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔''

میں نے انہیں انتہائی خوفزدہ پایا۔ انور زاہد نے بھی انہیں قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی رائے بدلنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ میں نے ان کے مایوس کن نقطۂ نظر کی بنیاد اور وجوہات دریافت کیں تو کہنے لگے کہ ان کے پاس بہت سے حلقوں کی طرف سے پیش کیے گئے متعدد تجزیے موجود ہیں۔ ''آپ واحد آدمی ہیں جو اُمید افزا رائے رکھتے ہیں۔ آپ نوشتۂ دیوار کو نہیں پڑھ سکتے۔'' مجھے یہ سوچ کر تشویش ہونے لگی کہ کہیں وہ بعد میں صدر کے ذہن سے میری بریفنگ کے اچھے اثرات زائل نہ کر دیں۔ میں نے اپنے غیر جانبدارانہ اور حقائق پر مبنی تجزیوں کے ثبوت میں انہیں اپنے سروے کی ضخیم نقول دکھائیں۔ مگر وہ اپنی رائے پر قائم رہے۔ میں نے بتایا کہ بلدیاتی الیکشن کے موقع پر بھی عوام بے حد خوفزدہ تھے۔ میں واحد آدمی تھا جس کے تجزیہ کی بعد کے واقعات نے توثیق کر دی۔ تاہم وہ قطعاً متاثر نہیں ہوئے۔ ان کے خیال میں صدارتی نظام ہی واحد حل تھا۔ اس قسم کی بے لچک اور مایوس کن آرا یا تو پروپیگنڈہ پر مبنی تھیں یا مفروضوں پر، جن میں خوف کے عنصر کا خاصا دخل تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جنرل اور سیاستدانوں کے اعصاب پر انتخابات کا خوف بری طرح سوار تھا۔

مسلم لیگ میں پھوٹ پڑ گئی

9 اگست کو میری زوردار بریفنگ کے بعد جنرل ضیا نومبر کے الیکشن کی سمت میں پیش قدمی پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے یہ عندیہ بھی دیا کہ مسلم لیگ اپنا سربراہ کسی چھوٹے صوبہ سے چن لے تو اسے متحد کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ انہوں نے پیر پگاڑا سے رابطہ کیا اور ان کی معرفت محمد خان جونیجو سے کہا گیا کہ وہ فدا محمد خان کے حق میں جو صوبہ سرحد کے پرانے مسلم لیگی تھے، دستبردار ہو جائیں۔ 12 اگست کو مسلم

لیگ کونسل (فدا گروپ) کا لاہور میں اجلاس ہوا جس میں مذکورہ سمجھوتہ کی توثیق کردی گئی۔ اس اجلاس میں ملک بھر کے نمایاں مسلم لیگی شریک ہوئے اور طے پایا کہ اگلے دن دونوں گروپوں کا اسلام آباد میں مشترکہ اجلاس ہوگا دونوں گروپ ایک ہوکر فدا محمد خاں کو اتفاقِ رائے سے صدر چن لیں گے۔

نواز شریف نے مجھے کہا کہ ٹکا اقبال سے دریافت کروں آیا غلام مصطفیٰ جتوئی مسلم لیگ میں شامل ہورہے ہیں؟ ٹکا جتوئی سے ملنے کے لیے ان کی رہائش گاہ پر پہنچے جو ان دنوں اسلام آباد میں مقیم تھے۔ میاں صاحب بھی جتوئی سے ملنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے راولپنڈی جانے کو کہا کیونکہ وہ خود مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے وہاں جانے والے تھے۔ میں نے 13 اگست کی صبح کو راولپنڈی میں ریلوے سیلون کے اندر ان سے ملاقات کی۔ انہوں نے مجھے اور ٹکا اقبال کو اپنے قریب موجود رہنے کی ہدایت کی کیونکہ وہ مسلم لیگ کے اجلاس کے بعد جتوئی سے ملنا چاہتے تھے۔ انہوں نے توقع ظاہر کی کہ اجلاس میں بہت کم وقت لگے گا کیونکہ پیر پگاڑا اور صدر نے تمام معاملات پہلے ہی طے کردیے ہیں۔ ٹکا اور میں اسلام آباد کے ہوٹل ہالیڈے اِن (موجودہ میریٹ ہوٹل) پہنچے اور لابی میں میاں صاحب کا انتظار کرنے لگے جہاں لیگ کا اجلاس ہورہا تھا۔ وہ محض فدا گروپ کا اجلاس تھا۔ جبکہ مشترکہ اجلاس اسلام آباد ہوٹل (آج کل ہالیڈے ان) میں ہونے والا تھا۔

ٹکا اقبال نے ہالیڈے ان کی لابی میں میاں صاحب سے ملاقات کی اور انہیں اسلام آباد ہوٹل میں نہ جانے کا مشورہ دیا۔ ٹکا کا نقطۂ نظر تھا کہ ہالیڈے ان کی اکثریت ان کے ساتھ ہے۔ اس لیے اقلیتی گروپ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں جو لازماً ہڑبونگ مچائے گا۔ لیکن نواز شریف نے ان کی بات نہیں مانی اور اسلام آباد ہوٹل روانہ ہوگئے۔ ٹکا مسلم لیگ کے ہجوم میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن بامر مجبوری وہ اور میں آدھ گھنٹہ بعد وہاں پہنچ گئے۔ ہم لابی میں کھڑے کافی پی رہے تھے اتنے میں وزیراعلیٰ کے پرائیویٹ سیکرٹری قمرالزمان بھاگتے ہوئے آئے اور بتایا کہ اجلاس میں ہنگامہ ہوگیا ہے اور رانا نعیم نیز جونیجو کے دیگر حامیوں نے میاں صاحب پر حملہ کردیا ہے۔

ہم دونوں تیزی سے ہال میں پہنچے تو وہ مچھلی بازار کا منظر پیش کررہا تھا۔ دونوں طرف سے بہت زیادہ شور مچایا جارہا تھا۔ بظاہر کسی کی سلامتی خطرہ میں نہیں تھی اس لیے ہم واپس لابی میں آگئے اور کافی پینے لگے۔

اجلاس میں فدا اور جونیجو گروپوں کا ادغام نہیں ہو سکا۔ اس کی بجائے جونیجو اور حامد ناصر چٹھہ نے بعد میں میرے خلاف بیان دیا جس میں کہا گیا تھا کہ نواز شریف سپیشل برانچ کے ایڈیشنل آئی جی اور ان کے آدمیوں کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ سفید جھوٹ تھا کیونکہ میرے ساتھ سپیشل برانچ کا ایک آدمی بھی نہیں تھا اور مجھے بھی ٹکا اقبال کی ساتھ کچھ دیر کے لیے لابی میں کھڑا دیکھا گیا تھا۔ میری موجودگی کا غلط مطلب اخذ کر کے نواز شریف کو بدنام کیا گیا۔ میں نے اپنے دوست عزیز قریشی سے' جو جونیجو گروپ کے سرکردہ رکن تھے۔ پوچھا کہ ''میرے خلاف ایسا بے بنیاد بیان کیوں جاری کیا گیا ہے؟''

انہوں نے بے تکلفی سے جواب دیا: ''یہ سیاسی گیم ہے اور آپ کے خلاف ذاتی طور پر کچھ نہیں کہا گیا۔'' میں نے زبردست احتجاج کیا' تاہم وہ معذرت کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ انہیں اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں تھی کہ اخبارات کے قارئین ایسی خبر پڑھ کر یہ سوچنے لگیں کہ میں سرکاری ملازم ہوتے ہوئے میاں صاحب کی مدد کے لیے سیاسی اجتماع میں گیا تھا۔ میری موجودگی کو ایسا رنگ دے دیا گیا کہ وزیر اعلیٰ اپنی سیاست کے لیے کلیتاً انتظامی مشینری پر انحصار کرتے ہیں۔

میاں صاحب نے اسلام آباد ہوٹل سے روانہ ہوتے وقت ٹکا اقبال اور مجھے فرنٹیئر ہاؤس پہنچنے کو کہا۔ وہاں انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ ظفر اللہ جمالی' وزیر اعلیٰ بلوچستان اور افضل حق وزیر اعلیٰ سرحد کے ساتھ جتوئی سے ملنا چاہتے تھے' لیکن جتوئی نے فرنٹیئر ہاؤس آنے سے انکار کر دیا۔

آخرِ کار ان سب کی ملاقات کے لیے میرے دوست چوہدری محمد ارشد کے گھر کا انتخاب کیا گیا۔ میں تینوں وزرائے اعلیٰ کو ارشد کے ہاں لے گیا اور ٹکا جتوئی صاحب کو لے آئے۔ یہ ایک طویل ملاقات تھی۔ مجھے معلوم نہیں ان کے مابین کیا طے پایا' البتہ ٹکا نے اتنا ضرور بتایا کہ جتوئی نے مسلم لیگ میں شامل ہونے سے معذرت کر لی' اور مسلم لیگ کے ساتھ این پی پی کے انتخابی اتحاد کی تجویز پیش کی۔ طے پایا کہ ایسا اتحاد صدر سے ملاقات کے بعد عمل میں آئے گا۔ جتوئی اسی شام صدر سے ملے۔ ٹکا کے بقول جتوئی کی رائے یہ تھی کہ صدر انہیں نگران وزیر اعظم نامزد کر دیں تو ایک بہتر سیاسی انتظام ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا: ''اگر صدر طے کر چکے ہیں کہ صدارتی نظامِ حکومت نہیں لایا جائے گا تو ان کے لیے ایسا کرنا چنداں مشکل نہیں۔'' ٹکا نے 14 اگست کو صدر سے طویل ملاقات کی۔ انہوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ صدر جتوئی کو وزیر اعظم نامزد کرنے پر متفق ہو گئے تھے اور جتوئی بھی ٹکا کی زبانی یہ خبر سن کر بے حد خوش ہوئے' لیکن 17 اگست کے فضائی حادثہ میں جنرل ضیا کی ہلاکت نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔

پیپلز پارٹی کا چار رکنی ٹولہ

مسلم لیگ واحد جماعت نہیں تھی جس کی صفوں میں تفریق وانتشار پایا جاتا تھا۔ پیپلز پارٹی کو بھی ایسا ہی مسئلہ درپیش تھا۔ 1988ء کے شروع میں اطلاعات ملیں کہ پنجاب پی پی پی میں دراڑ پڑ گئی ہے۔ بلدیاتی الیکشن اور پھر سینٹ کے لیے پنجاب سے مسلم لیگ کے اُمیدواروں کی بلا مقابلہ کامیابی نے نواز شریف اور ان کی پارٹی کا امیج بہت بہتر کر دیا تھا۔ ضیا کے سیاسی منظر سے غائب ہو جانے کے بعد صورتحال یکسر بدل گئی کیونکہ نہ تو سیاسی سرگرمیوں پر کوئی پابندی باقی رہی نہ ہی پریس پر۔ بہت سے افراد جو مارشل لا کے ڈر سے ملک چھوڑ گئے تھے واپس آ گئے اور عام زندگی گزارنے لگے۔ کوڑے مارنے اور جیلوں میں ڈالنے کی باتیں قصۂ پارینہ بن گئیں۔ سرکشی و بغاوت کی جگہ جو پی پی پی کا امتیازی نشان تھی' اختیارات' عہدوں اور الیکشن کی سیاست نے لے لی۔ بلدیاتی انتخابات میں شکست اور کسی تحریک کے جواز کی عدم موجودگی میں احتجاج کے باعث پی پی پی اپنا توازن کھو بیٹھی تھی۔ پارٹی کی صفوں میں مایوسی اور انتشار پھیل رہا تھا۔ جس کے نتیجہ میں اس کے لیے صحیح سمت کا سرغ لگانا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ اندرونی اختلافات اور گروہ بندی کی باتیں عام ہونے لگیں۔

انہی دنوں اخبارات میں ''چار کے ٹولے'' کی کہانیاں منظرِ عام پر آئیں جو پالیسی معاملات پر پارٹی کی قیادت سے شدید اختلافات رکھتے تھے۔ ملک وارث اس وقت راؤ رشید کے ساتھ کام کرتا تھا جن کا دفتر شاہ جمال کالونی میں تھا۔ میں وارث سے ملنے گیا تو اس نے بتایا کہ راؤ رشید' میاں احسان الحق' فضل سندھو اور ملک معراج خالد پی پی پی سے بیزار ہو چکے ہیں۔ راؤ رشید بذاتِ خود پریشان تھے۔ وارث کی خواہش تھی کہ میں نواز شریف سے بات کر کے ان چاروں سرکردہ لیڈروں کو حکومت کے قریب لے آؤں۔ مجھے اس کی تجویز پسند نہیں آئی کیونکہ میں اس طرح کی سودے بازی کے خلاف تھا۔ وارث نے اپنی تجویز کئی بار دہرائی۔ افضل سندھو اور میاں احسان نے بھی مجھ سے بات کی اور تجویز کیا کہ راؤ رشید کو صوبائی کابینہ میں شامل کر لیا جائے تو وہ مسلم لیگ میں آنے کو تیار ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ معراج خالد بھی ان کی پیروی کریں گے۔

ان کی تجویز اور اس پر اصرار میں حکومت کے لیے بہت بڑی ترغیب تھی لیکن میں اس کے خلاف تھا۔ وارث نے حاجی اکرم سے بھی بات کی۔ وہ بھی نہیں مانے۔ بلکہ وارث کی حاجی صاحب سے تو تو' میں

میں ہوگئی کہ وہ اس معاملہ میں ان کی مدد کیوں نہیں کر رہے۔ وارث کے مسلسل اصرار پر میں نے راؤ رشید سے وارث کے گھر ملاقات کی۔ راؤ رشید کو بعض پالیسی امور میں بینظیر سے شدید اختلاف تھا اور وہ نواز شریف سے ملنا چاہتے تھے۔ میں نے راؤ صاحب کو مشورہ دیا کہ انہوں نے سیاسی جدوجہد میں پی پی کے لیڈر کی حیثیت سے طویل عرصہ گزارا ہے۔ وہ سب کچھ یک دم ضائع ہو جائے گا۔ اس لیے اتنا بڑا اقدم اٹھانے سے پہلے مزید غور و فکر کر لیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے میاں صاحب کے ساتھ ان کی ملاقات کرانے میں مدد کرنی چاہیے۔ وہ اس کے بعد فیصلہ کریں گے آیا سیاست میں حصہ لینا چاہیے یا پی پی سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے۔ وہ بحیثیت آئی جی میرے باس رہ چکے تھے اور میں ان کی امانت و دیانت کا انتہائی احترام کرتا تھا۔ ان کے اصرار پر مجھے میاں صاحب سے بات کرنی پڑی۔ نواز شریف نے راؤ صاحب کو ناشتہ پر مدعو کر لیا۔ وارث نے ان کی ملاقات کرائی۔ دو گھنٹے کی طویل ملاقات ہوئی۔ راؤ رشید نے مجھے بعد میں بتایا کہ وہ میاں صاحب سے بڑے متاثر ہوئے' انہیں بالکل کھرا انسان پایا۔ وہ ان کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

ان دونوں میں کچھ عرصہ تک دوسری ملاقات نہیں ہو سکی۔ راؤ صاحب نے مجھ سے کہا کہ وہ میاں احسان اور افضل سندھو کے ہمراہ نواز شریف سے ایک اور ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش پر میں نے اس کا انتظام کرا دیا۔ میری معلومات کے مطابق معراج خالد کو اس تجویز سے اتفاق نہیں تھا۔ میاں صاحب راؤ رشید کو اپنی کابینہ میں شامل کرنا چاہتے تھے جبکہ وہ وفاقی وزیر بننے کے خواہاں تھے۔ نواز شریف اس معاملہ پر صدر سے مشورہ کرنے کے لیے 17 اگست کی صبح کو راولپنڈی پہنچے تو وہ بہاولپور کے لیے پرواز کر چکے تھے۔ میاں صاحب مری چلے گئے تاکہ صدر کی واپسی پر ان سے بات کر سکیں۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ صدر فضائی حادثہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور یک دم سارا سیاسی منظر تبدیل ہو گیا۔ راؤ رشید کراچی چلے گئے اور بے نظیر کے ساتھ اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر پی پی کے سنٹرل الیکشن آفس کا چارج سنبھال لیا۔ ان کے پچھلے منصوبوں پر خاموشی کا پردہ پڑ گیا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ وہی راؤ رشید بعد میں بے نظیر کے مشیر برائے اسٹیبلشمنٹ بن گئے تو مجھ پر سیاست میں حصہ لینے کا الزام لگا دیا۔ انہوں نے اس سلسلے میں میرے خلاف کئی اخباری بیان دیے کہ پنجاب سے مرکز میں میرے تبادلہ کے احکام بھی صادر کرا دیے۔ یہاں تک کہ میری معطلی اور آخرِ کار سروس سے برطرفی کا پلان بھی بنا لیا۔ بظاہر انہیں یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ میں ان کی موقع پرستی اور پی پی سے

بے وفائی کو بے نقاب کردوں گا۔ لیکن ایسی باتیں میرے اطوار کے یکسر خلاف ہیں' ان کی قلابازیوں کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے باوجود میں نے ان کے متعلق کبھی بات نہیں کی اور اپنی سراسر بلا جواز معطلی کا طویل عرصہ پیشہ ورانہ اخلاقیات کے مطابق خاموشی' صبر و تحمل اور وقار کے ساتھ گزارا۔



باب29

بہاولپور کا فضائی حادثہ

واقعات

وہ 17 اگست 1988ء کا افسوس ناک دن تھا۔ ڈاکٹر محمد عارف' چوہدری منظور اور اے حمید میرے دفتر میں بیٹھے تھے۔ جب مرزا محمد علی' ایس پی سپیشل برانچ راولپنڈی نے مجھے مطلع کیا کہ فوجی ذرائع کے مطابق سی130 طیارہ جس میں صدر اور دیگر افراد سوار تھے' بہاولپور کے قریب گر کر تباہ ہوگیا ہے۔ یہ سن کر ہر آدمی حواس باختہ ہوگیا۔ میں فوراً آئی جی نثار احمد چیمہ کے پاس پہنچا۔ وہاں سے ہم دونوں چیف سیکرٹری انور زاہد کے پاس گئے۔ جہاں ہم نے حادثہ کے ممکنہ نتائج و مضمرات پر تبادلۂ خیال کیا۔

ملک عبدالحمید کمشنر بہاولپور نے ہمیں اس وقت تک کی موصول شدہ معلومات سے آگاہ کیا۔ ہمارا فوری شک یہ تھا کہ یہ حادثہ کسی تخریبی کارروائی کا نتیجہ ہے۔ ہم ابھی مزید تفصیلات حاصل کرنے کی کوشش کررہے تھے' اتنے میں لاہور کے کمشنر چوہدری امین اللہ آگئے۔ انہوں نے کہا کہ لوگ حادثہ کے بارے میں جنرل اسلم بیگ' وائس چیف آف آرمی سٹاف پر شک کررہے ہیں۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' چیف سیکرٹری نے سوال کیا۔ ''کیونکہ انہوں نے اپنے طیارہ میں سے سی 130 کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھا اور یہ جاننے کے لیے بہاولپور یا ملتان نہیں رکے کہ صدر کے طیارہ کو کیا

ہوگیا ہے۔ اس کی بجائے وہ سید ھے راولپنڈی چلے گئے۔ ایسے حالات میں ان کے خلاف معمول طرزِ عمل نے اکثر لوگوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیا ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔ جب میں نے اپنے سٹاف سے پوچھا تو انہوں نے بھی لوگوں کے ردِ عمل کی بابت اسی طرح کی رپورٹیں موصول ہونے کا ذکر کیا۔ یہ بات بڑی حیرت انگیز تھی کہ اس قسم کی افواہ بڑی تیزی سے پھیل گئی۔

انور زاہد نے نواز شریف سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جو اس دن مری میں تھے۔ وہ حادثہ کی خبر سنتے ہی راولپنڈی روانہ ہو گئے تھے۔ وزیر اعلیٰ سیدھے ایک ہنگامی اجلاس میں چلے گئے جو سینٹ کے چیئر مین غلام اسحاق خاں نے بلایا تھا۔ چیف سیکرٹری نے کسی نہ کسی طرح انہیں باہر بلایا اور حادثہ کی تفصیلات سے فون پر مطلع کیا اور یہ بھی بتایا کہ لوگ جنرل اسلم بیگ کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ میاں صاحب نے جواب میں کہا کہ مذکورہ جنرل بھی اجلاس میں شریک ہیں۔

چیف سیکرٹری نے معاملات کی ممکنہ صورتِ حال کے متعلق پوچھا تو نواز شریف نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے مجھ سے مشورہ مانگا۔ ہم اس مسئلہ پر آپس میں پہلے ہی بحث کر چکے تھے اور ہماری متفقہ رائے یہی تھی کہ آئین پر حرف بحرف عمل کرنا چاہیئے اور انتخابات اعلان کردہ پروگرام کے مطابق ہونے چاہئیں۔ انور زاہد نے بھی اپنا مشورہ انہی خطوط پر دیا اور انتخابی نتائج کے بارے میں حوصلہ افزا تجزیہ بھی پیش کیا۔

"کیا وہ تجزیہ اس سانحہ کے بعد بھی کام دے گا؟" نواز شریف نے سوال کیا۔ چیف سیکرٹری نے وزیر اعلیٰ کو ہولڈ کرا کے میری طرف دیکھا۔

میں نے بے ساختہ جواب دیا "یس سر، دراصل ہمدردی کی لہر اس قسم کے امکانات کو بہتر بنا دے گی۔ جنرل ضیا کے اپنے پیروکار ہیں جو نتیجہ کو یکسر مسلم لیگ کے حق میں کر دیں گے۔" انور زاہد نے میرا جواب وزیر اعلیٰ کے گوش گزار کیا۔

کال ختم ہونے کے بعد انور زاہد نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا ہم نے ان کے سامنے بہت زیادہ خوش کن تصور پیش نہیں کر دیا؟" "نہیں جناب یہ بالکل حقیقت پسندانہ ہے۔" میں نے جواب میں کہا۔ چوہدری امین اللہ اور نثار چیمہ نے میری رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ انہیں یقین تھا کہ پی پی بھاری اکثریت سے جیت جائے گی۔ انور زاہد مجھ سے متفق تھے تاہم انہیں شک تھا کہ ضیا کے واقعی کچھ

پیروکار رہوں گے۔ میں بہرحال اپنی بات پر قائم رہا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ بڑے بڑے ہجوم یک بارگی جنرل ضیا کے جنازہ میں شرکت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ افغانستان کی جنگ نے انہیں معاشرہ کے ایک حصے کا ہیرو بنا دیا تھا۔

سعید مہدی کمشنر راولپنڈی نے بعد میں بتایا کہ اعلیٰ سطح کے اجلاس میں آئین پر عمل کرنے اور شیڈول کے مطابق الیکشن کرانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ میٹنگ میں یہ بھی طے پایا کہ اس سلسلے میں مرحوم صدر کے تمام فیصلوں کا احترام کیا جائے گا اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ انور زاہد نے میاں صاحب کو جو مشورہ دیا بڑا صائب اور بروقت تھا۔ اس نے ان لوگوں کو خاصا حوصلہ دیا اور صحیح راہ دکھائی جو ایک نازک موقع پر قوم کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے۔ غلام اسحاق خاں نے قائم مقام صدر کا منصب سنبھال لیا۔ جنرل اسلم بیگ چیف آف آرمی سٹاف بن گئے۔ جبکہ ایڈمرل سروہی کو جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا چیئرمین مقرر کر دیا گیا۔

آئی جی اور حمید اسلم ملک، ڈی آئی جی سیکورٹی سپیشل برانچ تفتیش کے لئے بہاولپور روانہ ہو گئے جبکہ انور زاہد اور میں وزیر اعلیٰ سے ملنے اور ضیا کے جنازہ میں شرکت کرنے کے لیے راولپنڈی چلے گئے۔

بہت سے مسلم لیگیوں نے نواز شریف کو مشورہ دیا کہ خود کو جنرل ضیا سے دور رکھیں کیونکہ سیاسی لحاظ سے ایسا قدم ان کے لیے فائدہ مند ہوگا، لیکن میاں صاحب نے اتفاق نہیں کیا۔ انہوں نے برملا اعتراف کیا۔ ''وہ میرے محسن تھے۔ میں ان کا ہمیشہ انتہائی احترام کروں گا۔ مجھے الیکشن کے نتیجہ کی کوئی فکر نہیں۔ بلکہ میری سوچ تو یہ ہے کہ ان کی وجہ سے ہمیں زیادہ ووٹ ملیں گے۔'' میں ان کے بلند اخلاقی احساس سے بڑا متاثر ہوا۔ اگلے دن جنازہ کا جو متاثر کن اور یادگار اجتماع دیکھنے میں آیا' اس سے ان کے خیالات اور میرے ابتدائی تجزیہ کی توثیق ہو گئی۔

حادثہ کی تحقیقات

پولیس نے شروع میں اس سانحہ کو اتفاقی حادثہ سمجھا۔ تاہم بعد میں قتل اور تخریب کاری کا مقدمہ درج کر لیا۔ میں نے حمید اسلم ملک کے علاوہ انسدادِ دہشت گردی سیل کے ڈی آئی جی کرنل محمد اشرف کو بھی تفتیش میں مدد دینے کی ہدایت کی۔ پولیس انکوائری اور تفتیش سے حادثہ کا کوئی ٹھوس سراغ نہیں ملا۔ کسی بھی

انٹیلی جنس ایجنسی کی طرف سے صدر کی سلامتی کو لاحق کسی واضح خطرہ کی پیشگی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ صدر کی زندگی کو لاحق خطرہ کی بابت الذوالفقار' پی پی' روس' انڈیا بلکہ امریکہ پر بھی شک کیا گیا' تاہم تفتیشی مقاصد کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ قیاس کے مترادف تھا۔

جہاز کا ملبہ محض چند سو میٹرز کے دائرہ میں بکھرا ہوا تھا' جو ظاہر کرتا تھا کہ وہ پہلے زمین سے ٹکرایا' اس کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور پھر اس میں آگ لگی۔ اس کے برعکس اگر وہ فضا میں پھٹ جاتا تو اس کے اجزا کئی کلومیٹر کے دائرہ میں بکھر جاتے۔ عینی گواہوں کی شہادت سے بھی یہی بات سامنے آئی۔ میزائل کی طرح کی کوئی چیز جہاز کو باہر سے لگی ہوتی یا جہاز کے اندر کسی چیز سے دھماکہ ہوا ہوتا تو وہ فضا میں بکھر جاتا اور اس کا ملبہ وسیع علاقہ میں پھیل جاتا۔ پرواز کے بعد جہاز کی نقل و حرکت ہائیڈرالک سسٹم یا دوسرے میکانزم پر پائلٹ کا کنٹرول نہ ہونے کو ظاہر کرتی تھی' کیونکہ موقع پر موجود دیہاتیوں کے مطابق وہ دائیں' بائیں یا اوپر نیچے ہچکولے کھا رہا تھا۔ گویا وہ صحیح سالم حالت میں زمین سے ٹکرایا۔ اس کا اگلا سرا اور ناک کئی میٹر نیچے تک زمین میں دھنس گئی۔ بعض مسافروں کے اعضا شدید آگ کے باوجود مکمل طور پر نہیں جلے تھے۔

ضیا کے دورہ کے انتظامات وہ جہاں کہیں بھی جاتے کلیتاً فوج کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ ایئرپورٹ پر سیکورٹی کے انتظامات کو بھی آرمی کنٹرول کرتی تھی۔ سول انتظامیہ کو اس کی بابت خبر بھی فوجی ذرائع سے فراہم کی جاتی تھی' ایوانِ صدر کی طرف سے نہیں۔ جہاں تک سول انتظامیہ کا تعلق تھا اس نے اپنا کام صحیح طریقہ سے کیا اور اس کی طرف سے سیکورٹی میں کوئی خامی یا نقص نہیں پایا گیا۔

طیارہ پر متعین پولیس سیکورٹی گارد نے تفتیشی ٹیم کو بتایا کہ جہاز کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کی ٹیکنیکل سٹاف نے اس وقت مرمت کی تھی جب وہ بہاولپور کے ہوائی اڈے پر کھڑا تھا۔ وہ دروازہ ہوا میں پورا کھل سکتا تھا جس سے طیارے کا توازن درہم برہم ہونے کا امکان موجود تھا۔ تفتیشی ٹیم نے تمام ممکنہ زاویوں اور مفروضات پر غور کیا۔ انتہائی اہم شخصیات کا سامان اور ان کے لیے تحائف فوج کے انتہائی ذمہ دار افسروں نے جہاز میں رکھے تھے۔ طیارہ کے مکینیکل طور پر فٹ ہونے کی بابت سرٹیفکیٹ پر خود پائلٹ نے دستخط کیے تھے۔ ایک چیز جو بالکل واضح تھی' وہ یہ کہ جہاز فضا میں نہیں پھٹا۔ اس لیے اس کے اندر دھماکہ خیز مواد کی موجودگی خارج از امکان تھی۔ آیا وہ دروازہ ٹیک آف کے دوران کھل گیا تھا یا ہائیڈرالک کنٹرول بے قابو ہو گیا تھا؟ اس کا تعین صرف ماہرین کر سکتے تھے۔

پولیس کی تفتیش نے کسی فیصلہ کن رائے کا اظہار نہیں کیا کیونکہ جو لوگ آخری منٹ کی روئیداد بیان کر سکتے تھے۔ وہ سب طیارہ کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ شیعہ عالم علامہ عارف الحسینی کو چند روز پہلے قتل کر دیا گیا تھا جس پر اہلِ تشیع انتہائی برہم تھے۔ جنرل ضیا ان کے جنازہ میں شرکت کے لیے پشاور پہنچے تو ان پر آوازے کسے گئے اور انہیں علامہ کا قاتل کہا گیا۔ اس چیز کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تفتیشی ٹیم نے کسی ایسے مشنری کا سراغ لگانے کی کوشش بھی کی، جس نے اپنی جان پر کھیل کر واردات کا ارتکاب کیا ہو، تاہم اس پہلو سے بھی کوئی ٹھوس ثبوت ہاتھ نہیں لگا۔

سب سے زیادہ قرین قیاس جو نظریہ پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ کاک پٹ کے عملہ کو پرواز کے فوراً بعد ایک گیس کے ذریعے مفلوج کر دیا گیا تھا' اس لیے ان کا جہاز پر کنٹرول نہیں رہا۔ ایک ماہرانہ رپورٹ میں بتایا گیا کہ جائے وقوع پر مذکورہ گیس کی کچھ نشانیاں ملی ہیں۔ اگر یہ بات درست ہے تو گیس لازماً ٹیکنیکل سٹاف میں سے کسی نے رکھی ہوگی جو مرنے کے لیے تیار تھا یا اس کے زہریلے اثرات سے بے خبر تھا۔ کوئی بھی شخص اجازت کے بغیر اور بلا چیکنگ جہاز کے قریب نہیں پھٹک سکتا تھا۔

بہر حال اس بات کا سراغ نہیں لگایا جا سکا کہ گیس کا کیپسول کاک پٹ میں کس نے رکھا کیونکہ

حیرت انگیز پیش گوئیاں کیں۔ انہوں نے ماڈل ٹاؤن پارک میں چہل قدمی کے دوران کہا کہ "جنرل ضیا کے ستارے گردش میں آ گئے ہیں۔ وہ اپنے انجام کو پہنچنے والے ہیں۔ وہ مزید برسر اقتدار نہیں رہ سکتے۔" مجھے ان کی باتوں پر حیرت تو یقیناً ہوئی لیکن میں نے انہیں سنجیدگی سے نہیں لیا۔ میرے خیال میں جنرل کی پوزیشن پہلے سے زیادہ مضبوط تھی۔ انہوں نے جس سیاسی نظام کی ترویج کی وہ کامیابی سے چل رہا تھا اور ان کے اقتدار کو بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جب میں نے ان کی پیش گوئی پر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تو وہ خفا ہو گئے۔ انہوں نے اس بات پر سبکی اور بے عزتی محسوس کی کہ میں نے ان کی پیش گوئی پر یقین کیوں نہیں کیا۔ میری پوری توجہ مبذول کرانے کے لیے انہوں نے مجھے رکنے کو کہا اور پھر بولے: "آپ میری بات توجہ سے نہیں سن رہے۔ ضیا ہلاک ہو جائیں گے' ان کی موت اسی سال 6 اگست کے بعد واقع ہو گی اور اس تاریخ کے بعد وہ کسی بھی وقت موت کے منہ میں جا سکتے ہیں۔"

میں اندرونی طور پر لرز کے رہ گیا تاہم اپنی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دی۔ ان کی خفگی دور کرنے کے لیے میں نے آہستہ سے کہا: "مجھے اُمید ہے انہیں کسی حملہ یا اسی طرح کی واردات میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ صدر کی سیکورٹی سپیشل برانچ کی ذمہ داری بھی ہے۔ اگر میرے دائرہ اختیار (پنجاب) میں کوئی کوتاہی سرزد ہوئی تو میں مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔"

انہوں نے فوری جواب دیا: "میں قطعی طور پر نہیں جانتا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے گا۔ تاہم اگر وہ زندہ رہے تو بہت بڑا معجزہ ہو گا۔ مطمئن رہیں آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔"

انہوں نے دوبارہ شکایت کی کہ میں ان کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا۔ اس وقت تک میں پوری طرح متوجہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ انہوں نے اپنے تخمینے بڑی محنت سے تیار کیے ہیں' بہت سی دفعہ کوشش کے باوجود ایک ہی نتیجہ نکلا ہے۔

اس پر میں نے کسی قدر تشویش سے کہا: "ایسی صورت میں نواز شریف کا کوئی مستقبل نہیں ہو گا۔ ممکن ہے وہ سیاسی گمنامی میں چلے جائیں کیونکہ ان کا سب سے بڑا سہارا جنرل ضیا ہی ہے۔"

"آپ ان کی بابت ایسا سوچتے ہیں تو ٹھیک ہے۔" انہوں نے مختصر جواب دیا۔

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں' " میں نے احتجاج کیا۔ "وہ مجھ پر بڑے مہربان ہیں۔ میں ہر طرح ان کی

بھلائی چاہتا ہوں۔ تاہم ان کے اور وزیراعظم کے مابین کشیدگی ہے۔ ضیاء کے بعد وہ کمزور ہو جائیں گے اور آخرِ کار محمد خان جونیجو انہیں اقتدار سے الگ کر دیں گے۔ یہ میرا قیاس ہے۔''

''نواز شریف ملک کی آئندہ سیاست میں بہت نمایاں کردار ادا کریں گے۔'' قطب دین نے بڑے اعتماد اور اصرار کے ساتھ کہا۔ ''کوئی شخص ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ ہر معاملہ ان کے حق میں جائے گا۔ ایک وقت آنے والا ہے جب وہ ضیاء اور جونیجو دونوں کی بلکہ ان کے خاندانوں کی بھی مدد کریں گے' ان کے ستارے بہت مضبوط ہیں اور میں یہ سب کچھ انتہائی محتاط تخمینوں کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔''

میں پریشان ہو گیا۔ ''اسمبلیوں کا کیا بنے گا؟'' میں نے سوال کیا۔ ''اس پورے نظام کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔'' انہوں نے برجستہ جواب دیا۔

ان دنوں صدر اور وزیراعظم کے مابین جو کشیدگی چل رہی تھی' خصوصاً اوجڑی کیمپ دھماکہ کے بعد اس میں جو شدت پیدا ہوئی' مجھے اس کا علم تھا۔ ملک نعیم کے ساتھ ایک طویل نشست میں میں نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ شاید صدر اسمبلیاں توڑنے کے لیے اپنا صوابدیدی اختیار استعمال کر گزریں' تاہم میں اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ باور کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ اس قسم کا انتہائی قدم اٹھائیں گے۔ صدر اور وزیراعظم کے درمیان اختلافات کی بابت معلومات کے باوجود میں نے نجومی کی پیش گوئیوں کو زیادہ اہمت نہیں دی۔

29 مئی 1988ء کو جب میں نے اسمبلیوں کی تحلیل کے متعلق سنا تو میں نے سوچا کہ بابو قطب دین نے جو کچھ بتایا تھا اس کی تہہ میں یقیناً کچھ سچائی تھی۔ اگلے دن بابو لاہور پہنچ گئے اور فخریہ انداز میں بولے: ''کیا میں نے آپ کو نہیں بتایا تھا؟'' میں نے ان کی ماہرانہ رائے کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

بابو قطب دین 6 اگست کو پھر میرے دفتر میں پہنچ گئے۔ چوہدری محمد ارشد' اے حمید اور بعض دیگر دوست بھی وہاں موجود تھے۔ جب قطب دین نے دعویٰ سے کہا کہ ''ضیاء الحق کے دن گنے جا چکے ہیں۔'' میں نے اس وقت بھی ان کی بات پر یقین نہیں کیا۔ وہ ارشد چوہدری کو میرے دفتر کے سائیڈ روم میں لے گئے اور اپنی پیش گوئی دہرائی۔

جب 17 اگست کو مرزا محمد علی نے ضیا کے طیارہ کو حادثہ پیش آنے کی بابت مجھے پہلی خبر دی تو قطب دین کی پیش گوئی میرے ذہن میں گھوم گئی۔

وہ اس کے بعد کئی بار مجھ سے ملے لیکن میں نے ان کی معلومات کو کبھی چیلنج نہیں کیا۔ حتیٰ کہ ایک

دن انہوں نے اپنی موت کی پیش گوئی کی کردی۔ وہ خود اپنی موت کے بارے میں کیسے جان سکتے ہیں؟ شاید علم نجوم کی بابت ان کی معلومات میں کوئی کمزوری پیدا ہو گئی ہے۔ میں اپنے دل میں سوچنے لگا۔ انہوں نے رونا اور چلانا شروع کر دیا اور مجھ سے کہا کہ وہ واقعی اڑھائی مہینے بعد فوت ہو جائیں گے۔ میں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی مگر انہیں اپنے علم پر پختہ یقین تھا۔ واقعتاً وہ اڑھائی مہینے بعد 28 جنوری 1989ء کو انتقال کر گئے۔ میں اس وقت سے اب تک حیرت میں کھویا ہوا ہوں۔ میرے لیے یہ ایک عجیب معمّا اور گورکھ دھندہ ہے۔



باب 30

1988 کے انتخابات

بہت سے حادثوں اور الجھنوں کے بعد جن میں جنرل ضیا کی موت کے مابعد اثرات بھی شامل تھے، ملک جلد ہی انتخابی بخار میں مبتلا ہو گیا۔ نواز شریف نے ملک بھر میں بہت سے حلقوں سے خطاب کیا

جن میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا تھا۔ انہوں نے ایک سٹیرنگ کمیٹی تشکیل دی جو وزرائے اعلیٰ سمیت چاروں صوبوں کے سینئر مسلم لیگیوں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے سرکردہ پارٹی لیڈروں پر مشتمل ایک نمائندہ کمیٹی بھی بنائی جسے ایسے اُمیداروں کا انتخاب کرنا تھا جو محض اپنے ذاتی اثر ورسوخ سے کامیاب ہوسکیں۔ اس میں عبدالستار لالیکا' ملک نعیم' صدیق کانجو' ملک سلیم اقبال اور غلام حیدر وائیں جیسے ممتاز لیڈر شامل تھے۔

وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ نے ہمیں ان تجزیاتی مطالعوں کی نقول فراہم کرنے کو کہا جو سپیشل برانچ نے بلدیاتی الیکشن کے لیے مرتب کیے تھے اور اب قومی وصوبائی انتخابات میں ان سے استفادہ مطلوب تھا۔ بعدازاں وہ نقول آصف وردگ اور ستار لالیکا کو بھیج دی گئیں جو شب وروز کام میں جتے رہتے تھے اور میاں صاحب جونہی طوفانی دوروں سے لوٹتے تو نت نئی تجاویز منظوری کے لیے پیش کردیتے تھے۔ نواز شریف واقعی خوش قسمت تھے جنہیں ایسے ذہین اور انتھک کام کرنے والے ساتھی میسر آئے۔

اس دو رکنی کمیٹی نے تجویز کیا کہ پنجاب اسمبلی میں قومی اسمبلی کے ہر حلقہ کے لیے اُمیدواروں کے پینل اور صوبائی اسمبلی کی سیٹ کے لیے ایک جوڑا بنا دیا جائے۔ یاد رہے کہ قومی اسمبلی کا ایک حلقہ صوبائی اسمبلی کے دو حلقوں کے برابر تھا۔ آصف وردگ نے ان تجزیاتی رپورٹوں کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد اُمیدواروں کے پینل بنانے کی تجویز پیش کی تھی۔ دوسری طرف ستار لالیکا مقامی اور علاقائی سیاست اور سیاستدانوں کے بارے میں اس قدر وسیع معلومات رکھتے تھے کہ انہوں نے اپنے طور پر اُمیدواروں کے پینل بنا دیئے۔ ان دونوں حضرات نے جو پینل تیار کیے' ان میں 95 فیصد نام مشترک تھے۔ لالیکا کی وسیع سیاسی معلومات کے بارے میں پتہ چلا تو میں نے ان کا نام ''سیاست کا رواں دواں انسائیکلو پیڈیا'' رکھ دیا۔

نواز شریف نے پبلسٹی امور کی نگرانی کے لیے ایک سہ رکنی کمیٹی الگ مقرر کی جو سراج منیر' حسین حقانی اور مجیب الرحمٰن شامی جیسے دانشوروں پر مشتمل تھی۔ ایک دن سراج منیر سے وزیر اعلیٰ ہاؤس میں پہلی ملاقات ہوئی تو میں ان کی ذہانت اور مطالعہ کی گہرائی سے بے حد متاثر ہوا۔ ان کے طرزِ عمل میں ایک خاص طرح کا وقار اور وضعداری تھی۔ وہ دل میں اتر جانے والی حکمت ودانائی کے ساتھ بولتے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ اواخر 1990ء میں محض 38 برس کی عمر میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ شیکسپیئر نے شاید ''رچرڈ سوم'' میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا کہ ''نوجوانی میں بہت زیادہ دانائی کا اظہار کرنے والے زیادہ عرصہ

زندہ نہیں رہتے۔"

حسین حقانی بڑے ذہین، فعال و متحرک اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک صاحب قلم ہیں۔ مجیب شامی مسلمہ قلمکار، تجزیہ نگار اور تجربہ کار صحافی ہیں۔ وہ ہفت روزہ زندگی اور ماہنامہ قومی ڈائجسٹ کے مالک مدیر ہیں۔ اس ٹیم کی سربراہی الطاف حسن قریشی کے پاس تھی۔ وہ ایک بالغ نظر ماہرِ فن، صاحب علم و فضل اور بڑے بااعتماد شخص ہیں۔ انہیں یہ خوداعتمادی زندگی کے طویل تجربے، صحافت اور تاریخ کے گہرے شعور سے حاصل ہوئی ہے۔ وہ ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ کے چیف ایڈیٹر اور پاکستان ادارہ قومی امور کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ اس کمیٹی کے پس منظر میں ڈاکٹر صفدر محمود کا نام بھی آتا ہے جو ایک مؤرخ اور زبردست ذہانت وفطانت کے مالک ہیں۔ نواز شریف گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کے شاگرد رہ چکے تھے۔

نشرواشاعت (Publicity) کمیٹی کی انتھک کوششوں اور کارکردگی نے مسلم لیگ کو پی پی پی کے ہاتھوں شکست سے بچالیا۔ سراج منیر نے مجھے بتایا کہ ان کی مہم کا اصل مقصد لوگوں کو پیپلز پارٹی کی اس اولین حکومت کی سختیاں اور مظالم کی یاددہانی کرانا تھی جو ذوالفقار علی بھٹو کے زیرِ قیادت 1970ء کے عشرہ میں کی گئی تھیں۔ میں نے سراج منیر سے کہا کہ اس دور کی بابت منفی پروپیگنڈہ شاید کارآمد ثابت نہ ہو سکے کیونکہ اس کے بعد آنے والا مارشل لا کا دور ظلم و تشدد میں پی پی پی کی حکومت سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ شاید انہیں میرے یہ ریمارکس پسند نہ آئے ہوں کیونکہ وہ جنرل ضیا کے زبردست مداح تھے۔

کمیٹی نے نواز شریف کی حکمرانی کے شائستہ اور فیض رساں طرزِ حکمرانی کا زبردست پروپیگنڈہ کیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ انہوں نے عوام کے جذبات قابو میں کر لیے تھے۔ میاں صاحب نے پنجاب پر اس رجحان کے ساتھ حکومت نہیں کی تھی کہ لوگوں کو امن و امان کے نام پر غلام بنایا جائے اور انہیں کچلا جائے۔ نواز شریف بڑے دیانتدار اور زبردست قوتِ ارادی کے مالک تھے وہ سختی اور جبر و استبداد پر مبنی اقدامات کے ذریعے جعلی تاثر دینے کے حق میں نہیں تھے۔ انہیں سچائی پر بھروسا تھا سیاسی چالبازوں پر نہیں۔ میرے اندازوں اور تجزیوں سے پہلے ہی ظاہر ہو گیا کہ پنجاب میں مسلم لیگ جیتے گی تاہم نواز شریف کے منصفانہ اور شائستہ اندازِ فکر نے اسے دوست اور دشمن دونوں کے لیے یقینی بنا دیا۔

جماعتِ اسلامی کا ساتھ

ایک دن میاں صاحب نے مجھ سے لاہور میں اپنے حلقے کی بابت میرا تجزیہ جاننے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے 1985ء کے نتائج کا حوالہ دیتے ہوئے حقائق اور اعداد و شمار پر مبنی تجزیہ پیش کیا تو انہیں جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ 1985ء میں انہوں نے 60 ہزار سے زیادہ ووٹ لیے تھے۔

''کوئی شخص مجھے شکست نہیں دے سکتا۔ میری سیٹ محفوظ ہے۔'' انہوں نے خوش فہمی سے کہا۔

''سر جب تک آپ جماعتِ اسلامی کے ووٹ حاصل نہیں کرتے کامیابی مشکوک ہے'' میں نے رائے ظاہر کی۔

''کیوں؟'' انہوں نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیونکہ 1985ء میں آپ کو پی پی پی کے ووٹ بھی اس لیے مل گئے تھے کہ پی پی پی نے الیکشن میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اس دفعہ آدھے ووٹ پی پی پی کو جائیں گے اور آدھے آپ کو ملیں گے۔ اس کا مطلب ہے دونوں اُمیدواروں کی کامیابی کا مساوی امکان ہے۔ اگر جماعتِ اسلامی کے 17 ہزار ووٹ آپ کو نہ ملے تو آپ ہار بھی سکتے ہیں۔'' میں نے وضاحت سے بتایا۔

میں نے الفاظ' حقائق اور اعداد و شمار کے استعمال میں احتیاط نہیں برتی کیونکہ انہیں سچ سچ بتانا میرا فرض تھا۔ وہ پریشان ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ مولانا فتح محمد' امیر جماعتِ اسلامی پنجاب نے جنہیں میں راولپنڈی کے دنوں سے جانتا ہوں' مجھے آپ تک یہ پیغام پہنچانے کو کہا تھا کہ جماعت الیکشن میں ان سے تعاون کرنے کو تیار ہے۔ وہ جماعت کے طلبا ونگ (اسلامی جمعیت طلبہ) کی مسلسل بے راہ روی اور دھونس' دھاندلی کے باعث جماعت کی بابت اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں مولانا فتح محمد کو یہ تجویز پیش کروں کہ جماعت ان کے مقابلے میں اپنا اُمیدوار کھڑا نہ کرے۔ میں نے گزارش کی کہ یہ سراسر سیاسی معاملہ ہے' اس لیے یا تو وہ خود بات کریں یا ان کا کوئی دوسرا رفیقِ کار۔

میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ دیگر بہت سے حلقوں میں بھی پوزیشن ایسی ہی ہے۔ جماعت کے ووٹوں کی تعداد مختلف علاقوں میں مختلف ہے جن میں قیادت کے حسبِ ہدایت ردوبدل ہو سکتا ہے۔ میں نے ایک جامع چارٹ کی مدد سے انہیں مختلف حلقوں میں جماعت کے ووٹوں کی تعداد سمجھائی اور یہ بتایا کہ وہ توازن پر کس طرح اثرانداز ہو سکتے ہیں۔ مولانا فتح محمد نے اسی حقیقت کے پیشِ نظر جماعتی سطح پر تعاون کی تجویز پیش کی تھی۔

آخرِ کار عظیم تر کامیابی کے امکان نے میاں صاحب کو جماعت سے تعاون کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے ستار لالیکا' ملک نعیم اور صدیق کانجو کو ہدایت کی کہ لیاقت بلوچ اور دیگر ارکان کے ذریعے جماعت سے بات کریں۔ چونکہ دونوں جماعتوں کے مابین تعاون لیاقت بلوچ اور جماعت کے دوسرے اُمیدواروں کے حق میں جاتا تھا اس لیے مذاکرات کے ذریعے خوشگوار فضا پیدا کی گئی اور طرفین ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

آئی جے آئی کی تشکیل

جنرل ضیا اپنی موت سے پیشتر سندھ کے احساسِ محرومی کی تلافی کے لیے غلام مصطفیٰ جتوئی پر خصوصی توجہ دے رہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ جتوئی مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں' لیکن جتوئی اپنی پارٹی (این پی پی) ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ ٹکا اقبال بھی این پی پی میں شامل ہو گئے وہ لیگ اور این پی پی کے درمیان اتحاد کے لیے کوشاں تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ 14 اگست کے فیصلہ کے مطابق جتوئی کو نگران وزیر اعظم بنایا جائے۔ انہوں نے جنرل حمید گل (ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی) سے درخواست کی کہ نئی حکومت کو ان فیصلوں سے آگاہ کر دیا جائے جو جنرل ضیا نے 14 اگست کو کئے تھے۔

27 اگست کو ایمر جنسی کونسل کے اجلاس میں نگران وزیر اعظم کی تقرری کے مسئلہ پر بحث ہوئی مگر غلام اسحاق خان نہیں مانے۔ انہوں نے اس نکتہ پر کونسل کی طرف سے زیادہ زور دینے کی صورت میں استعفا کی دھمکی دے دی۔ دراصل وہ ایسا تاثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ جرنیل انہیں انگلیوں پر نچا رہے ہیں۔ یہ بات بھی ان کے پیشِ نظر تھی کہ جب ضیا کی ہلاکت میں جنرل اسلم بیگ کے ملوث ہونے کی بابت افواہیں پھیلنے لگیں تو وہ دفاعی پوزیشن پر آ گئے تھے۔ غلام اسحاق خاں عبوری دور میں خود حکومت کرنے کے خواہاں تھے' کیونکہ وہ من مانے اختیارات سے لطف اندوز ہونے کے معاملہ میں خاصے بدنام تھے۔

سپریم کورٹ اور لاہور ہائی کورٹ میں دو اہم مقدمات زیرِ سماعت تھے جو حاجی سیف اللہ خاں (جونیجو کابینہ کے رکن) اور بے نظیر بھٹو نے دائر کئے تھے۔ ان کے فیصلے سیاسی صورتِ حال پر براہ راست اثر انداز ہو سکتے تھے۔ حاجی سیف اللہ نے قومی اسمبلی کی بحالی کے لیے پٹیشن دائر کی تھی جب کہ بے نظیر کیس کا تعلق الیکشن جماعتی بنیادی پر کرانے سے تھا۔ نواز شریف نے ان مقدمات سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنی

ساری توانائیاں انتخابی مہم کے لیے وقف کر دیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ بہر صورت فائدے میں رہیں گے۔ اگر اسمبلیاں بحال ہو گئیں تو وہ پھر سے اقتدار میں آ جائیں گے۔ اگر الیکشن جماعتی بنیادوں پر ہوئے تو وہ پی پی کے خلاف سارے ووٹرز کو اپنے گرد اکٹھا کر لیں گے۔ اعلیٰ عدلیہ کے فیصلوں سے قطع نظر انہوں نے مستقبل کے لیے واضح لائحہ عمل بنا لیا تھا۔

اعلیٰ عدالتوں نے اسمبلیوں کی بحالی کے خلاف اور جماعتی بنیادوں پر الیکشن کے حق میں فیصلے سنائے۔ یہ چیز سیاسی اتحادوں کا محرک بن گئی۔ الیکشن قریب آنے پر مسلم لیگ، جماعتِ اسلامی اور این پی پی ایک دوسرے کے قریب آ گئیں۔ چوہدری ارشد نے این پی پی کا فیکٹر سندھ پر خوشگوار اثرات مرتب کرنے کے لیے تخلیق کیا تھا۔ ٹکا اقبال نے جتوئی اور صدر ضیا کو قائل کر کے اسے عملی شکل دی۔ نواز شریف نے اس تصور کو اس کے منطقی انجام تک پہنچایا۔ مولانا فتح محمد نے مسلم لیگ اور جماعت کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا بیڑہ اٹھا لیا۔ جب کہ ستار لالیکا، ملک نعیم اور صدیق کانجو نے لیاقت بلوچ کے ذریعے اسے ایک حقیقت بنا دیا۔ لیاقت بلوچ نے قاضی حسین احمد، امیر جماعت اسلامی کو بھی اس مہم میں شامل کر لیا۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ جنرل فضل حق بھی قاضی پر اثر انداز ہوئے۔ ٹکا اقبال نے جنرل حمید گل سے درخواست کی کہ سیاسی اتحاد بنانے میں پھرتی سے کام لیں کیونکہ یہ قدم مرحوم صدر کی خواہش کے عین مطابق ہوگا۔ حمید گل افغان جنگ میں بری طرح الجھے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے ٹکا کو بریگیڈیئر امتیاز کے پاس بھیج دیا۔ اقبال کی بریگیڈیئر سے وہ پہلی ملاقات تھی اس لیے زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔

ٹکا کی روایت کے مطابق جتوئی نے نواز شریف، فضل حق اور قاضی حسین احمد کو اسلام آباد میں این پی پی کے لیڈر ڈاکٹر سرفراز کے گھر بلا لیا تاکہ وہاں سیاسی اتحاد کے مسئلہ پر غور کیا جا سکے۔ بریگیڈیئر امتیاز نے پیر فضل حق کو ہموار کیا جبکہ مولانا سمیع الحق کو ساتھ ملانے کا کارنامہ جنرل فضل حق نے انجام دیا۔ اگلے دن فخر امام اور آغا پویا کی جماعتیں بھی ان سے آن ملیں۔ یوں پی پی کے خلاف ایک انتخابی اتحاد وجود میں آ گیا جس کا نام "اسلامی جمہوری اتحاد" (آئی جے آئی) رکھا گیا۔ جتوئی اس کے پہلے صدر اور پروفیسر غفور احمد سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔

آئی جے آئی کی تشکیل کسی فردِ واحد کے ذہن کی تخلیق نہیں تھی۔ اس تصور کو عملی شکل اختیار کرنے

میں تین مہینے لگے۔ جس کے دوران مختلف افراد اور واقعات نے متنوع کردار ادا کیا۔ 29 مئی 1988ء کو اسمبلیوں کی تحلیل نیز سندھی وزیر اعظم کی برطرفی اور 17 اگست کو جنرل ضیا کی فضائی حادثہ میں موت سے پیدا ہونے والی صورتحال نے اس کی تشکیل کو ناگزیر بنا دیا۔ پی پی پی کے خوف سے اس کی مخالف قوتیں متحد ہوگئیں۔ اسی خوف کے باعث مسلم لیگ کے دونوں دھڑے جونیجو کی سربراہی میں اکٹھا ہونے پر مجبور ہوگئے۔

اس کے برعکس پی پی پی اکیلی رہ گئی کیونکہ ایم آر ڈی کا شیرازہ پہلے ہی بکھر چکا تھا۔ اس کے بعد پی پی پی کی قیادت سے یہ اہم غلطی سرزد ہوئی کہ اس نے اپنی مقبولیت کا غلط اندازہ لگاتے ہوئے من پسند افراد کو من مانے طریقے سے ٹکٹ دے کر اندرونی خلفشار اور اختلافات کا دروازہ کھول دیا۔ پی پی پی کے بہت سے خواہشمندوں کو جنہوں نے پارٹی کے لیے قربانیاں دی تھیں اور عرصہ دراز سے وفاداری کے ساتھ اس کے لیے کام کر رہے تھے۔ ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا گیا۔ ان میں سے بعض نے آزادانہ حیثیت میں الیکشن لڑا اور پارٹی کے اُمیدواروں کو شکست دی۔ بعض نے پارٹی کی قیادت پر ٹکٹ بیچنے کا الزام بھی لگایا۔

آئی جے آئی نے شاندار پلاننگ کا مظاہرہ کیا۔ آصف وردگ نے اتحاد میں شامل ہر پارٹی کو مقررہ تعداد میں سیٹیں دینے کی بجائے تجویز پیش کی کہ ایسے اُمیدواروں کو ٹکٹ دیے جائیں جن کی جیت کے امکانات روشن ہوں خواہ ان کا تعلق کسی بھی جماعت سے ہو۔ اس فارمولا نے ایک مشکل مسئلہ حل کر دیا۔ ہر اُمیدوار کی کامیابی کا اندازہ سپیشل برانچ کے مرتب کردہ اعداد و شمار اور سروے سے لگایا گیا۔ ہر پارٹی اس سروے کے غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہونے کی قائل ہوگئی۔

آئی جے آئی نے ایک سادہ سبز پرچم تیار کیا جس پر نو ستارے بنائے گئے تھے۔ اس سے نو پارٹیوں والے پاکستان قومی اتحاد کی یاد تازہ ہوگئی جس نے 1977ء میں بھٹو کی جابرانہ حکومت کے خلاف کامیاب تحریک چلائی تھی۔

سپیشل برانچ نے دونوں فریقوں کو حیران کر دیا

نومبر 1988ء کے انتخابات کا اہتمام و انعقاد عدلیہ کے زیرِ نگرانی عمل میں آیا۔ ہر ضلع میں سیشن جج کو ریٹرننگ افسر بنایا گیا تھا۔ انتظامیہ کو انتخابی عمل سے دور رکھنے کے لیے امن و امان قائم رکھنے کی ذمہ

داری سونپ دی گئی۔

ہمارا تازہ ترین سروے آئی جے آئی کی پنجاب میں قومی اسمبلی کی نشستوں میں تھوڑی سی کمی کی نشاندہی کرتا تھا' البتہ صوبائی اسمبلی میں اطمینان بخش فتح کے آثار نمایاں تھے۔ دونوں فریقوں کے جلسوں میں بڑے بڑے ہجوم دیکھنے میں آئے۔ اگر بینظیر بہت زیادہ مقبول تھیں تو نواز شریف بھی کم نہیں تھے۔ انہوں نے پورے صوبہ کا طوفانی دورہ کیا۔ جس کے دوران انہیں عوام کے عدیم المثال ہجوموں کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ سرگودھا میں تقریر کے دوران بینظیر سے یہ غلطی سرزد ہوگئی کہ انہوں نے نواز شریف کو ''پنجابی شوبوائے'' کہہ دیا۔ اس تقریر نے جس سے بینظیر کا صوبائی تعصب ٹپکتا تھا۔ نواز شریف کی بڑی مدد کی اور پنجاب میں بہت سے ووٹران کے طرفدار بن گئے۔

قومی اسمبلی کے الیکشن 16 نومبر کو پُرامن ماحول میں ہوئے۔ پی پی پی کو پنجاب میں آئی جے آئی پر تھوڑی سی سبقت حاصل ہوئی' جبکہ 19 نومبر کے صوبائی الیکشن میں آئی جے آئی نے واضح برتری حاصل کر لی اور 33 آزاد اُمیدوار کامیاب ہوئے۔ سپیشل برانچ اپنے سروے میں ان آزاد اُمیدواروں کی جیت کی بابت پہلے ہی پیش گوئی کر چکی تھی اور نواز شریف کا ان سے مسلسل رابطہ تھا۔ جونہی نتائج آنے شروع ہوئے وہ جیتنے والے آزاد اُمیدواروں کو مبارک باد دینے ان کے گھر پہنچ گئے۔ ان کی ذاتی کوشش کی بدولت 33 میں سے 32 آزاد ایم پی ایز اگلے ہی دن مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ جب پی پی پی کو ان کا خیال آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لیے پی پی پی کی قیادت نے میاں صاحب پر الزام لگایا کہ انہوں نے آزاد اُمیدواروں کو ساتھ ملانے کے لیے انتظامی مشینری استعمال کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس مقصد کے لیے انتظامیہ بلکہ اپنی جماعت کو بھی قطعاً استعمال نہیں کیا۔ البتہ ان کے ساتھ ذاتی طور پر رابطہ کیا تھا۔

سپیشل برانچ کی پیش گوئی 95 فیصد تک درست نکلی۔ جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ میں نے جنرل ضیا اور نواز شریف کے سامنے خوش آئند تصویر پیش کی تھی' وہ ہکا بکا رہ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میاں صاحب سمیت آئی جے آئی کی حیرت زدہ قیادت نے مجھے ''شعبدہ باز اور جادوگر'' ٹھہرایا جبکہ پی پی پی کی قیادت نے ''شرپسند'' قرار دیا۔ دونوں حقیقت سے دور تھے۔ میں نے محض اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھ کر اپنا فرض ادا کیا تھا اور نتائج کے بارے میں رائے قائم کرنے سے پہلے تفصیلات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ پیشِ نظر رکھا تھا۔

میں نے پوری لگن کے ساتھ کام کیا تاکہ جمہوری عمل مستحکم ہو اور فروغ پائے۔ اگر میں نے

انتخابی نتائج کے بارے میں اپنا دیانتدارانہ تخمینہ پیش نہ کیا ہوتا تو جنرل ضیا جمہوریت کے متعلق اس غلط اور غیر حقیقت پسندانہ پروپیگنڈہ کو جو انہیں ہر طرف سے سنائی دے رہا تھا یقیناً درست مان لیتے۔ میں نے جمہوری عمل کی بحالی میں بھی اپنا کردار ادا کیا جس کے نتیجہ میں 1985ء کے الیکشن ہوئے۔ میں نے 1987ء کے بلدیاتی الیکشن کے لیے حکومت کی اس وقت حوصلہ افزائی کی جب اونچے حلقوں میں ہر شخص خوفزدہ تھا۔ میں نے میاں صاحب کو 1988ء کے عام انتخابات کا دلیری سے سامنا کرنے پر آمادہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ انٹیلی جنس ایجنسیاں تمام حکمرانوں کو اپنی کھال بچانے کے لیے خوفناک رپورٹیں پیش کر کے اعصابی خلجان میں مبتلا کر دیتی ہیں' میں نے کسی شخص کو دھوکہ دینا پسند نہیں کیا۔ میری خواہش تھی کہ انتخابات ہوں بلاشبہ اس کے لیے حکمران طبقوں میں حوصلہ پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔

پی پی پی کی قیادت غلط فہمی کا شکار ہو کر اس بات پر یقین کر بیٹھی کہ میں نے اپنی پیش گوئی کو سچا ثابت کرنے کے لیے انتخابی نتائج میں لازماً گڑ بڑ کی ہوگی۔ بصورتِ دیگر میں اس قدر صحیح پیش گوئی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس وقت دلی افسوس ہوا جب پی پی پی کے قائدین کو اپنی ناکامیاں چھپانے کے لیے میری دیانتدارانہ محنت اور صورتِ حال کی غلط تاویلیں کرتے ہوئے پایا۔ بعض افراد مثلاً راؤ رشید وغیرہ جو اپنے پروپیگنڈہ کے اسیر تھے اور خیالی دنیا میں جی رہے تھے' بینظیر کو یقین دلا چکے تھے کہ پی پی پی کو پنجاب میں شاندار فتح حاصل ہوگی۔ جب ان کے اندازوں کے برعکس نتائج نکلے تو انہوں نے سچائی کا سامنا کرنے اور اپنی قیادت کو اصل حقائق سے آگاہ کرنے کی بجائے مجھے مطعون کرنا شروع کر دیا۔

وہ یہ بات تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھے کہ میں نے جمہوریت کے ساتھ لگاؤ کی بنا پر دیانتداری سے محنت کی تھی۔ اگر الیکشن نہ ہوتے تو وہ کیسے برسرِ اقتدار آ سکتے تھے؟ انتخابات اس لیے منعقد ہو سکے کہ اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد کو باور کرا دیا گیا تھا کہ پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے ہرگز نہیں جیت سکتی۔ 17 اگست کے حادثہ کے فوراً بعد میری بھی یہی رائے تھی۔ انتخابات عدلیہ کی نگرانی میں ہوئے اور ان میں دھاندلی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بچاری سپیشل برانچ کیا کر سکتی تھی؟ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے تخمینے پیش کر سکتی تھی' اس کا نہ کوئی اثر و رسوخ تھا' نہ اختیارات۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرکاری اثر و رسوخ آئی جے آئی کے حق میں گیا' لیکن سارا دارومدار اسی پر نہیں تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ نواز شریف کی متحرک' مخلصانہ اور صاف ستھری قیادت نے اپنی شریفانہ سیاست سے لوگوں کے دل موہ لیے تھے۔ اثر آفریں اور ذہانت پر مبنی پبلسٹی نیز بہتر اُمیدواروں کو آسانی

سے شکست نہیں دی جاسکی۔ پی پی پی نے غرور و تمکنت سے خود کو یکہ و تنہا کر لیا تھا۔ جس سے ایم آر ڈی میں پھوٹ پڑ گئی جبکہ پی پی پی کی مخالف پارٹیاں متحد ہو گئیں۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی کہ پی پی پی ان انتخابات کے بارے میں شکوک پھیلا رہی تھی جن کے نتیجہ میں اسے اقتدار ملا اور جس میں جتوئی و جونیجو جیسے برج الٹ گئے۔

منقسم مینڈیٹ

الیکشن کے نتائج ملے جلے تھے۔ دیہی سندھ نے بھاری اکثریت سے پی پی پی کے حق میں فیصلہ دیا اور دیگر تمام جماعتوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے برعکس مہاجروں نے جن کی کراچی اور حیدر آباد جیسے بڑے شہروں میں اکثریت تھی' لسانی بنیاد پر صرف ایم کیو ایم کو ووٹ دیئے ۔ سندھ میں لسانی تقسیم پوری طرح واضح ہو گئی' اگر چہ اس کا پیشگی ادراک کرنا چنداں مشکل نہیں تھا کیونکہ جبر و تشدد والے مارشل لا نے لوگوں کو اپنی بقا کے لیے چھوٹی چھوٹی شناختوں میں بانٹ دیا تھا۔ بلوچستان بڑی حد تک قبائلی خطوط پر چلنے لگا اور نواب اکبر بگٹی سیاسی منظر پر چھا گئے۔ وہاں پٹھانوں اور بلوچوں کے مابین اختلافات میں شدت آ گئی۔ صوبہ سرحد نے بڑی پارٹیوں یعنی پی پی پی' مسلم لیگ' اے این پی اور جماعتِ اسلامی کے حق میں منقسم فیصلہ دیا۔ افغانستان اور شکست خوردہ روس اس صوبہ پر اپنے اثرات نہیں ڈال سکے۔ پنجاب کے لوگوں نے بھی منقسم مینڈیٹ دیا جس کے مطابق قومی اسمبلی میں پی پی پی کو تھوڑی سی برتری حاصل تھی جب کہ صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ کا پلڑا واضح طور پر بھاری تھا۔

الیکشن کے بعد جو سیاسی منظر سامنے آیا اس میں چیک اینڈ بیلنس کا نظام خود بخود قائم ہو گیا۔ فوجی آمریت سے نجات حاصل کرنے کے بعد عوام نے جماعتی ڈکٹیٹر شپ بھی مسترد کر دی۔ لوگوں نے صحیح معنوں میں جمہوریت کے لیے ووٹ دیئے۔ لیکن تینوں اہم قائدین کو جمہوری نظام چلانے اور اس کا انتظام کرنے کا زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ بے نظیر بھٹو نے مارشل لا دور میں سختیاں جھیلیں تھیں اور ان کی تقریر میں تلخی صاف جھلکتی تھی۔ الطاف حسین قدامت پسند تھے' وہ حبس زدہ ماحول کی پیداوار تھے جو جماعتِ اسلامی کی متشدد سرگرمیوں اور ہٹ دھرمی سے کراچی میں پیدا ہو گیا تھا۔ نواز شریف نے اگر چہ تین سال تک ایم این ایز اور ایم پی ایز کو سنبھالے رکھا' لیکن انہیں وہ بوجھ غلط نظام کے تحت اٹھانا پڑا جو ان کے فطری میلان سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

سیاسی پارٹیوں کے پاس نظریات تھے اور ان کے اپنے مسائل تھے جبکہ انفرادی سیاستدان ذاتی مفادات کے اسیر تھے۔ 1985ء کے غیر جماعتی الیکشن نے ایسے ایم این اے اور ایم پی اے پیدا کیے جن کی نہ کوئی پارٹی تھی نہ منشور۔ نواز شریف نے انفرادی سیاست کی ذمہ داری نبھائی اور بکھری ہوئی اینٹوں کو یکجا کرنے کے لیے نظریاتی سیمنٹ فراہم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے نئے ارتقا پذیر سیاسی نظام کے محافظ کا کردار اپنے ذمے لے لیا۔ جس پر پی پی پی کی طرف سے نت نئے حملے ہو رہے تھے۔ پرانے سیاستدان مثلاً نوابزادہ نصر اللہ خان اور ولی خان ایسے سیاسی نظام کی تلاش میں تھے جو ملک کی کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچا سکے جب کہ نوجوان قائدین ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا رہے تھے۔

مصطفیٰ کھر نے جتوئی سے اس وقت علیحدگی اختیار کر لی جب وہ آئی جے آئی میں شامل ہو گئے۔ کھر پی پی پی میں شامل ہونا چاہتے تھے مگر نصرت بھٹو نے اجازت نہیں دی۔ انہوں نے آزادانہ الیکشن لڑا اور مظفر گڑھ سے قومی اسمبلی کی دو سیٹیں جیت کر اپنا آپ منوایا۔ کھر اور ایم آر ڈی کی ان جماعتوں نے جنہیں پی پی پی نے دھتکار دیا تھا آگے چل کر پی پی پی حکومت کے خلاف اہم کردار ادا کیا۔

اعداد کا کھیل اور تین سیانے

ملے جلے نتائج کو دیکھتے ہوئے اقتدار کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی۔ بے نظیر بھٹو فوری انتقالِ اقتدار کا مطالبہ کرنے لگیں کیونکہ پی پی پی کے پاس قومی اسمبلی میں سب سے زیادہ سیٹیں تھیں۔ اگرچہ اس کے پاس مطلوبہ اکثریت نہیں تھی۔ انہوں نے اسٹیبلشمنٹ پر الزام لگایا کہ انہیں وفاقی سطح پر اقتدار سے باہر رکھنے کے لیے سازش کی جا رہی ہے۔ پنجاب میں وزیر اعلیٰ کا سیکرٹریٹ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا اور آئی جے آئی کی جماعتیں صوبہ میں نمایاں کامیابی پر پھولے نہیں سما رہی تھیں۔

جلد ہی اعداد کا کھیل پوری سنجیدگی سے شروع ہو گیا۔ نواز شریف نے آئی جے آئی سے باہر کے زیادہ تر لیڈروں بشمول الطاف حسین اور مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ میں نے 7 کلب روڈ پر قاضی حسین احمد اور پروفیسر خورشید کو بریگیڈیئر امتیاز کے ساتھ سیاسی صورتِ حال پر بحث کرتے دیکھا۔ انہوں نے حساب لگایا کہ اگر ایوان کی تمام چھوٹی پارٹیوں کو ساتھ ملا لیا جائے تو نواز شریف دو تین ممبران کی "ٹیکسی سوار اکثریت" سے وزیر اعظم بن سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ "ٹیکسی سوار اکثریت" کی اصطلاح 1964ء میں اس وقت استعمال کی گئی تھی جب برطانیہ کی لیبر پارٹی محض چار ارکان کی اکثریت سے جیتی

تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اگر لیبر پارٹی کے پارلیمنٹ کو جانے والے ٹیکسی میں سوار چار ارکان کہیں ٹریفک میں پھنس جاتے تو وزیر اعظم ہیرالڈ ولسن کی حکومت کا دھڑن تختہ ہو سکتا تھا۔ بہر حال وہ حکومت ایک سیٹ کے فرق کے ساتھ بھی قائم رہی۔ یہاں تک کہ اس نے قبل از وقت الیکشن کرائے اور ان میں ہار گئی۔

تین سیانے مرکز میں آئی جے آئی کی حکومت بنانے میں بڑے سنجیدہ و سرگرم تھے اور میں ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہتا تھا۔ میں دیہی سندھ کے جذباتی ووٹ کا خیال کرتے ہوئے ڈرنے لگا تھا کہ اگر بے نظیر کو حکومت نہ دی گئی تو وہاں زبردست ردِ عمل ہوگا۔ 1984ء کا خوفناک منظر بھی میری نگاہوں میں پھرنے لگا۔ اس لیے میں چپ نہیں رہ سکا۔

''قاضی صاحب اعداد و شمار کسی بحران کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ اگر میاں صاحب وزیر اعظم بن بھی جائیں تو آپ سندھ کو کیسے کنٹرول کریں گے؟ وہاں مسلسل شورش رہے گی۔ سندھی سمجھیں گے کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ شامتِ اعمال لگتی ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ انہیں میری مداخلت ناگوار گزری۔

میں نے بعد ازاں اس مسئلے پر بریگیڈیئر امتیاز کے ساتھ بھی بات کی۔ ان کے پاس ایک خوفناک قسم کا منصوبہ تھا۔ ''اگر یہ سکیم کامیاب نہ ہوئی تو میاں صاحب قومی اسمبلی کی تحلیل اور نئے انتخابات کا مشورہ دے سکتے ہیں۔''

''ایسی تجویز پیش کر کے آپ میاں صاحب کو بدنام کرنا چاہتے ہیں؟'' میں نے قدرے درشت لہجہ میں کہا۔ تاہم عظمت اور اقتدار کے بارے میں ان کے اپنے خواب تھے۔ انہیں میری بات پسند نہیں آئی۔

مجھے یوں محسوس ہوا کہ ایک اور مارشل لا کی راہ ہموار کی جا رہی تھی۔ میں نے میاں صاحب سے کہا کہ وہ تابناک مستقبل رکھتے ہیں۔ اس لیے معمولی اکثریت سے وزیر اعظم بننے کی کوشش نہ کریں۔ اگر حالات نے انہیں قومی اسمبلی کی تحلیل کا مشورہ دینے پر مجبور کر دیا تو غیر جمہوری کارروائی کا داغ ان کے روشن مستقبل پر اثر انداز ہوگا۔ یہ کردار کسی اور کو ادا کرنے دیں مجھے یہ کوئی گہری چال لگتی ہے۔'' انہوں نے میری باتیں توجہ سے سنیں تاہم چپ رہے۔ یا تو انہیں وہ مشورہ پسند نہیں آیا یا اس پر غور کرنا چاہتے ہوں گے۔

''پاکستان کی قیمت پر نہیں''

میں نے سیاسی صورتِ حال پر وزیرِ اعلیٰ کے سیکرٹری فرید الدین احمد کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ وہ میرے خیالات سے متفق نظر آئے۔ پھر میں نے انور زاہد چیف سیکرٹری سے بات کی۔ وہ بھی میرے ہم خیال نکلے۔ انہوں نے تجویز کیا کہ ہم سب کو اکٹھے میاں صاحب سے ملنا اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم تینوں شام کے وقت 7 کلب روڈ پہنچے اور میاں صاحب سے ملے۔ حاجی اکرم عارضۂ قلب کی وجہ سے بیمار تھے اس لیے ہمارا ساتھ نہیں دے سکے۔

انور زاہد اچھے تجزیہ نگار تھے' انہوں نے ممکنہ خراب نتائج کا بڑی تفصیل سے نقشہ کھینچا مگر میاں صاحب وزیر اعظم بننے کے معاملے میں پوری طرح سنجیدہ نظر آئے۔ ایک نوجوان کا ایسی صورتِ حال میں بلند ترین سیاسی عہدہ کا خواہشمند ہونا قدرتی بات تھی۔ جب کہ ہمارے نزدیک ایسا قدم خطرناک ثابت ہوتا۔ میں جانتا تھا کہ حب الوطنی نواز شریف کی کمزوری ہے۔ اس لیے میں نے اس سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔

میں نے سندھ فیکٹر کو اپنے استدلال کی بنیاد بنایا اور وہیں سندھ میں ممکنہ خونریزی اور توڑ پھوڑ کی چارٹ کی مدد سے وضاحت کی۔ میں نے محسوس کیا کہ میاں صاحب پر عوام کی بغاوت سے پیدا ہونے والی مشکلات کا اثر ہونے لگا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ 1983ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کے بعد فوج بھی صورتِ حال پر قابو پانے میں ناکام ہوگئی تھی اور آخرِ کار جنرل ضیا کو معاملات کی اصلاح کے لیے سیاسی اقدامات کرنے پڑے تھے۔ اس لیے کسی بھی شخص کو وہ عمل نہیں دہرانا چاہیے جس کے زخم اب مندمل ہونے لگے ہیں۔ خصوصاً اس صورت میں جب عوام نے اپنا فیصلہ دے دیا ہے۔ 1970ء کے الیکشن کے بعد مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا' اس سے ہم سب آگاہ ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے عام احساسات کے خلاف چلیں گے تو نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلے گا۔ اگر وہی غلطی اس وقت بھی دہرائی گئی تو تاریخ ہمیں ہرگز معاف نہیں کرے گی۔ سندھ میں آگ لگ جائے گی۔ مواصلات کا سلسلہ درہم برہم ہوجائے گا۔ ریلوے اور سڑک کے رابطے منقطع ہوجائیں گے۔ کراچی سے کوئی بھی چیز ملک کے دیگر حصوں کو فراہم نہیں کی جاسکے گی۔ معیشت جام ہوجائے گی۔ سر آپ کس قیمت پر وزیر اعظم بننا چاہتے ہیں؟ آپ کو پاکستان کی قیمت پر یہ منصب حاصل نہیں کرنا چاہیے۔'' میں سراسر جذباتی ہوگیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بھی جذبات کی رو میں بہہ گئے تھے۔ ان کا چہرہ جوش و جذبہ سے تمتما رہا تھا۔

''نہیں پاکستان کی قیمت پر ہرگز نہیں۔'' انہوں نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا۔

''میں پاکستان کی قیمت پر ایسا قدم ہرگز نہیں اٹھاؤں گا۔ لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ حالات ایسا رخ اختیار کریں گے؟''

اس وقت تک میں جذبات سے مغلوب ہو چکا تھا۔ اس لیے انور زاہد نے جواب دیا۔ ''بلاشبہ سردار صاحب سو فیصد درست کہہ رہے ہیں۔''

''یہ بات ہے تو میں اس تجویز سے باز آیا۔ میرا سب کچھ پاکستان کے لیے ہے۔ میری عزت و آبرو، میری جان، میرا مال، میرا خاندان اور بال بچے سب کچھ پاکستان پر نثار۔ مجھے اُمید ہے پاکستان بے نظیر کے ہاتھوں میں محفوظ رہے گا۔ سندھی بہت اچھے ہیں۔ اگرچہ بے نظیر بڑی حد تک سندھی نہیں ہیں۔'' انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں جانتا تھا کہ نواز شریف ایک مختلف قسم کے سیاستدان ہیں۔ انہیں اپنی ذات کے مقابلے میں پاکستان زیادہ عزیز ہے۔ میں ان کے فیصلے سے انتہائی خوش ہوا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس عظیم لمحے کے بعد میں ہمیشہ کے لیے ان کا شیدائی اور مدّاح بن گیا۔



باب 31

بینظیر کی پنجاب پر چڑھائی

نواز شریف نے تو وزیر اعظم کے عہدہ کے لیے تگ و دو ترک کر دی تاہم بے نظیر مطمئن نہیں ہوئیں۔ وہ انہیں پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ پر بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ وہ مطالبہ کرنے لگیں کہ اقتدار پہلے وفاق میں منتقل کیا جائے اور صوبوں میں بعد میں تاکہ وہ بحیثیت وزیر اعظم گورنروں کو ہدایات دے سکیں کہ سیاسی حقائق میں کس طرح گڑبڑ کرنی ہے۔ صدر نے ہر قسم کی جانبداری یا دباؤ سے بچنے کے لیے طے کیا کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس ایک ساتھ ہوں گے اور ایوانوں کے منتخب ارکان بیک وقت حلف اٹھائیں گے۔ تاہم بے نظیر نے کوشش کی کہ نواز شریف حلف نہ اٹھا سکیں۔ انہوں نے وزیر اعظم بننے سے پہلے ہی گورنر سجاد حسین قریشی کو ہدایت کر دی کہ نواز شریف سے حلف نہ لیں، مگر وہ ان کے دباؤ میں نہیں آئے۔ انہیں اس حکم عدولی کی یہ سزا ملی کہ صرف چند دن بعد انہیں برطرف کر کے جنرل ٹکا خان کو گورنر مقرر کر دیا گیا۔ غلام اسحاق خان سجاد حسین کو ہٹانے کے حق میں نہیں تھے، لیکن جب بے نظیر نے ٹکا خان کو عہدۂ صدارت کے لیے نامزد کر دیا تو غلام اسحاق خان کو سودا بازی کرنی پڑی۔ انہوں نے پی پی پی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ٹکا خان کی گورنری سے اتفاق کر لیا۔ یہ پی پی پی کی طرف سے گندے کھیل کی ابتدا تھی۔

پی پی پی کی قیادت پنجاب میں عوام کے فیصلہ کا احترام کرنے کو تیار نہیں تھی۔ ٹکا اقبال نے اسلام آباد میں چوہدری اعتزاز احسن اور راؤ رشید سے ملاقات کی۔ ان کے خیالات سے پتہ چلا کہ وہ نواز شریف کو سرے سے سیاستدان ہی نہیں مانتے۔ انہیں ایک ''بگڑا ہوا بزنس مین'' سمجھتے ہیں جو ایک انکم ٹیکس آفیسر یا پولیس کے ڈی ایس پی کا دباؤ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ انہیں توقع تھی کہ پنجاب کی حکومت چند دنوں میں ختم ہو جائے گی۔

پی پی پی کی قیادت کے عزائم جلد ہی کھل کر سامنے آ گئے۔ بے نظیر کو اقتدار سنبھالے دو ہفتے بھی

نہیں ہوئے تھے جب انہوں نے قواعد کے مطابق وفاقی حکومت سے مشورہ کیے بغیر نادر شاہی حکم جاری کردیا کہ پنجاب کے چیف سیکرٹری انور زاہد منصوبہ بندی و ترقیاتی بورڈ کے چیئرمین خالد جاوید اور راقم الحروف کی خدمات وفاقی حکومت کی سپرد کردی جائیں۔ اسی حکم کے تحت وزیر اعلیٰ کو اعتماد میں لیے بغیر متبادل افسر بھی بھیج دیئے گئے۔ نواز شریف تلملا اُٹھے۔

اگر وزیر اعلیٰ کا اپنے ماتحت افسروں پر کنٹرول نہ ہو تو کوئی اس کے اختیارات کو تسلیم نہیں کرتا۔ چنانچہ حکومت پنجاب نے لکھ بھیجا کہ اصول کے مطابق باہمی صلاح مشورہ کے بغیر ایسے تبادلے نہیں ہوسکتے۔ وفاقی حکومت کو ناچار صلاح مشورہ کرنا پڑا۔

نواز شریف کی قدم قدم پر توہین و تضحیک

پی پی پی کی قیادت نے انتخابات میں دھاندلی کے جھوٹے الزام لگا کر سر توڑ کوشش کی کہ نواز شریف کو وزیر اعلیٰ کا حلف نہ اٹھانے دیا جائے۔ اس معاملہ میں منہ کی کھانے کے بعد ان کے اختیارات پر حملہ کردیا۔ مجبوراً میاں صاحب نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی ٹھان لی۔ انہوں نے ارادہ کرلیا کہ 25 دسمبر کو وزیر اعظم لاہور آئیں گی تو انہیں خوش آمدید کہنے ہوائی اڈے پر نہیں جائیں گے۔ اس سے اختلافات کی خلیج مزید وسیع ہو جاتی۔ انور زاہد اور بعض دوسرے افسروں نے انہیں اس فیصلے پر نظر ثانی کرنے کا مشورہ دیا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ راؤ رشید نے مجھ سے کہا کہ وزیر اعلیٰ کو وزیر اعظم کا استقبال کرنے پر آمادہ کروں۔ میں نے اپنی سی کوشش کرنے کا وعدہ کرلیا۔

بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی' سارک کانفرنس کے سلسلہ میں 29 دسمبر کو اسلام آباد آنے والے تھے۔ اس خبر نے مجھے میاں صاحب کے حب الوطنی پر مشتمل جذبات کو چھیڑنے کا موقع فراہم کردیا۔ جب میں نے دیکھا کہ عام دلائل ان پر اثر انداز نہیں ہو رہے ہے تو میں نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''ایک ہفتہ بعد راجیو گاندھی اسلام آباد آ رہے ہیں۔ کیا آپ ان کی آمد کے موقع پر ملک کی دو کیمپوں میں تقسیم پسند کریں گے؟ اگر آپ نے موقع کی مناسبت سے فیصلہ نہ کیا تو تاریخ کی عدالت میں قصوروار ٹھہریں گے۔'' انہوں نے میرے دلائل تحمل سے سنے اور خاموش رہے۔ اس کے بعد وضو کرنے غسل خانہ میں چلے گئے۔ میں اس شش و پنج میں پڑ گیا کہ خدا جانے ان کے دل میں کیا ہے۔ میں بے تابی سے ان کے

جواب کا انتظار کرنے لگا۔ میاں صاحب نے بڑی سوچ بچار کے بعد جواب دیا: ''ملک کی خاطر میں محترمہ کو خوش آمدید کہوں گا۔''

اس کے بعد انہوں نے میری توجہ ایک ذاتی معاملہ کی طرف مبذول کراتے ہوئے پوچھا: ''پی پی پی کے کارکنوں کے متعلق کیا خیال ہے؟ وہ میرے ساتھ ہمیشہ گستاخی و بدتمیزی سے پیش آتے ہیں۔''

''ہم سیکورٹی کے بہترین انتظامات کریں گے۔'' میں نے انہیں یقین دلایا۔

انہوں نے مجھے ذاتی طور پر اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا کہ میں پی پی پی کے کارکنوں کو ان سے دور رکھوں گا۔ میں نے راؤ رشید کو مطلع کر دیا کہ میاں صاحب وزیراعظم کو خوش آمدید کہیں گے بشرطیکہ اس موقع پر پی پی پی کے کارکن شرافت کا مظاہرہ کریں۔ انہوں نے اس بات کو یقینی بنانے کا وعدہ کر لیا۔

مگر وہ وعدہ جھوٹا ثابت ہوا۔ نواز شریف وزیراعظم کے استقبال کے لیے گئے تو پی پی پی کے کارکنوں نے ان کے ساتھ بدتمیزی کی۔ شاید ان کی توہین جان بوجھ کر کرائی گئی تھی۔ یہاں تک کہ بے نظیر بھی اپنے کارکنوں کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہو گئیں۔ وزیراعلیٰ نے طیارہ میں جا کر وزیراعظم کو خوش آمدید کہا۔ اس کے بعد بے نظیر بپھرے ہوئے کارکنوں کے جلوس میں آگے روانہ ہو گئیں۔

محترمہ کے حاشیہ برداروں نے ایئرپورٹ سیکورٹی فورس کے ایک افسر سے ملکی ساخت کا ایک بم بھی برآمد کر لیا۔ بظاہر وہ ایئرپورٹ کے بیرونی گیٹ پر رکھے گئے ایک گملے سے ملا تھا لیکن بدنیتی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ بے نظیر کی جان لینے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ یہ سفید جھوٹ تھا۔ وہ شیطانی ترکیبیں استعمال کر رہے تھے جن کا سچائی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

شام کو بے نظیر 7 کلب روڈ گئیں تو وہاں انہوں نے بڑے غرور و تمکنت اور سرد مہری کا مظاہرہ کیا حالانکہ نواز شریف نے خیر سگالی اور تعاون کی علامت کے طور پر انہیں خوبصورت شال کا تحفہ پیش کیا۔ بعد ازاں جب سارک ممالک کے سربراہوں کے اعزاز میں کھانا دیا گیا تو بے نظیر نے وزیراعلیٰ کے پروٹوکول میں کمی کر کے جان بوجھ کر ان کی توہین کی۔ انہوں نے اپنی حکومت کو خوش اسلوبی سے چلانے کا شاندار موقع ضائع کر دیا۔

گویا ابتدا ہی اچھی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنی پوزیشن اور اقتدار کو مضبوط و مستحکم کرنے کی بجائے پنجاب کی حکومت کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے حملوں کی

بجائے تھوڑے سے تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کیا جاتا تو نواز شریف کو وفاق کے ساتھ تعاون کرنے والا جونیئر پارٹنر بنایا جاسکتا تھا۔ شاید محترمہ کی سوچ مختلف تھی دراصل ان کی پرورش ہی مصائب و آلام اور نفرت و انتقام کے ماحول میں ہوئی تھی۔

راجیو کی ناز برداری

راجیو گاندھی سارک سربراہی کانفرنس میں شرکت کے لیے اسلام آباد پہنچے تو بینظیر نے ان کی حد سے زیادہ ناز برداری کی۔ یہاں تک کہ کشمیر ہاؤس کے بورڈ بھی سڑک پر سے ہٹوا دیئے مبادا راجیو گاندھی کو ناگوار گزرے۔ ممکن ہے بےنظیر ان نوازشات کا بدلہ چکانے کے لیے وہ سب کچھ کررہی ہوں جو ضیا آمریت کے کٹھن ایام میں راجیو اوران کی والدہ اندرا گاندھی کی طرف سے ان پر کی گئی تھیں۔ لیکن بات اس وقت حد سے بڑھ گئی جب ہمیں یہ کہا گیا کہ ہم اپنے سیکورٹی آرڈرز میں بھی کشمیر کا متنازعہ علاقہ کے طور پر ذکر نہ کریں حالانکہ وہ احکام سراسر اندرون ملک استعمال کے لیے تھے۔ وزیراعظم کے احکام پر عمل کیا گیا اگرچہ راجیو کو ستم زدہ کشمیریوں کی طرف سے زبردست خطرات لاحق تھے۔

اس سے بھی زیادہ افسوسناک موقع وہ تھا جب پولیس اور فوج کے سیکورٹی افسروں کو جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا، راولپنڈی ایئرپورٹ پر مشترکہ نیوز کانفرنس میں راجیو گاندھی کے منہ سے یہ سننا پڑا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اوران کے برابر میں بیٹھی ہوئی بےنظیر نے صرف مسکرا کر معاملہ کو نظرانداز کردیا۔ بےنظیر کی خاموشی سے ان کروڑوں پاکستانیوں کی دلآزاری ہوئی جنہوں نے اس واقعہ کا ذکر اگلی صبح کو اخبارات میں پڑھا۔ میں نے خود اور سیکورٹی کے دیگر افسروں نے دیکھا کہ بےنظیر راجیو کی خوشامدانہ انداز میں ناز برداریاں کررہی تھیں، انہیں اپنی عزت وتوقیر کا تو کجا ملک کے وقار کا بھی قطعاً لحاظ اور پاس نہیں تھا۔

انہی دنوں یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ بےنظیر نے سکھوں کی جنگِ آزادی کو کچلنے میں مدد دینے کے لیے راجیو کو خفیہ معلومات فراہم کی تھیں۔ دوسری بار وزیراعظم بننے پر بی بی سی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے خود اعتراف کیا کہ اگر وہ راجیو کی مدد نہ کرتیں تو خالصتان وجود میں آ گیا ہوتا۔

ضمنی انتخابات میں پی پی پی کی شکستِ فاش

پنجاب کے ایک سے زیادہ حلقوں میں جیتنے والے امیدواروں کی طرف سے خالی کردہ قومی اسمبلی کی 9 اور صوبائی اسمبلی کی 4 سیٹوں کے ضمنی انتخابات کا اعلان ہوا تو اخبارات نے بہت زیادہ اشتعال پیدا کر دیا اور ایسے محسوس ہونے لگا کہ سیاسی جماعتوں کی بجائے دو حکومتوں کے مابین معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔ وفاقی حکومت نے صوبائی حکومت کو نیچا دکھانے کے لیے اپنے جملہ اختیارات' اثر و رسوخ اور وسائل انتخابی مہم میں جھونک دیے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی' آئی جے آئی کے چیف جو اپنے آبائی حلقہ سے ہار گئے تھے' اب غلام مصطفیٰ کھر کی خالی کردہ نشست مظفر گڑھ سے اُمیدوار تھے۔ بے نظیر جتوئی کو اپنے لیے حقیقی خطرہ سمجھتی تھیں۔ کیونکہ سندھ کے ایک سینئر سیاستدان کی حیثیت سے وہ اپنے ساتھ کئی آزمودہ کار سیاستدانوں مثلاً نوابزادہ نصر اللہ خان اور ولی خاں کو ملا سکتے تھے۔ وہ جائز و ناجائز حربہ استعمال کر کے انہیں ہرانا چاہتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے وفاقی حکومت کے تمام وسائل مذکورہ حلقہ میں جھونک دیئے گئے۔ یہاں تک کہ ووٹرز کو مرعوب کرنے کے لیے سندھ سے مسلح افراد بھی منگا لیے گئے۔ جنہیں پنجاب پولیس نے بروقت حراست میں لے لیا۔

گورنر پنجاب جنرل ٹکا خان نے الیکشن کی صورتِ حال اور متوقع نتائج کا جائزہ لینے کے لیے ایک اجلاس بلایا۔ میں نے اپنی تحقیقات اور سروے کی بنیاد پر انہیں ٹھوس اور مناسب اندازے سے آگاہ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق 9 میں سے 7 سیٹوں پر آئی جے آئی کی کامیابی کا امکان تھا۔ انہیں میری پیش گوئی ناگوار گزری۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اس قسم کی ڈیوٹی 1970ء کے الیکشن میں بھی دی تھی جب وہ پنجاب کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے اور اس وقت بھی انہوں نے میرے تخمینوں سے اتفاق نہیں کیا تھا' حالانکہ وہ بالکل درست نکلے تھے۔ میرے اس دعویٰ نے انہیں مزید مشتعل کر دیا۔ نتائج کا اعلان ہوا تو آئی جے آئی نے واقعی سات سیٹیں جیت لیں جن میں جتوئی کی نشست بھی شامل تھی۔ پی پی کو صرف دو حلقوں میں کامیابی نصیب ہوئی۔

میں اس توقع کے ساتھ گورنر سے ملنے چلا گیا کہ وہ میرے صحیح اندازہ کی داد دیں گے۔ میں نے انہیں انتہائی برہم پایا۔ وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے کہ اس قدر درست تخمینہ لگانا ممکن ہے۔ ان کا خیال تھا کہ وزیر اعلیٰ کی ہدایت پر میں نے نتائج میں کچھ "سائنٹیفک قسم کی گڑبڑ" کی ہوگی۔ میں نے وضاحت کی کہ میں نے تخمینہ لگاتے وقت اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے تھے' تاہم وہ سچائی کا سامنا کرنے کو تیار

نہیں تھے۔

بعدازاں سینیٹر گلزار خاں نے مجھے بتایا کہ جنرل ٹکا خاں مجھ سے سخت ناراض ہیں۔انہوں نے گلزار سے کہا کہ ''سردار ایک اچھا افسر ہے لیکن نواز شریف کے لاڈ پیار نے اسے خراب کردیا ہے۔اس نے کوئی ترکیب استعمال کر کے آئی جے آئی کو اتنی سیٹیں دلا کر توازن ان کے حق میں کردیا ہے۔'' میرا ہتھیار محض سچائی تھا۔سچائی کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے ان سے ایسے الزام کی توقع نہیں تھی کیونکہ میں ان کی دیانت و امانت کی وجہ سے ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ان کی باتیں سن کر میری بڑی دلآزاری ہوئی اور میں نے زبردست کوفت محسوس کی۔

بندر کی بلا طویلے کے سر

وفاقی حکومت کو پنجاب کے ضمنی انتخابات سے سخت مایوسی ہوئی جس کا اظہار کرنے میں انہوں نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ٹکا خاں کی طرح بے نظیر کو بھی یہی بتایا گیا تھا کہ پی پی پی کو جو عبرتناک شکست ہوئی' اس کا ذمہ دار میں ہوں' ان کی پارٹی کے وہ لیڈر نہیں جنہوں نے انتخابی مہم بڑی بے دلی سے چلائی تھی۔ چنانچہ وفاقی حکومت نے حکومتِ پنجاب کے ساتھ اختلافات کا اصولوں پر تصفیہ کرنے سے پہلے ہی میری اسلام آباد میں پوسٹنگ کا حکم جاری کردیا۔میں نے صوبائی حکومت سے چارج چھوڑنے کی اجازت مانگی تو وزیراعلیٰ نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور مجھے دفتر میں حاضر ہونے کی ہدایت کی۔ میں حاضر ہوا تو وزیراعلیٰ نے کہا:

''آپ نے میرے ماتحت ایمانداری اور مستعدی سے کام کیا ہے۔میری خواہش ہے کہ آپ اپنا کام جاری رکھیں تاہم میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ کو کوئی گزند پہنچے۔ مجھے یہ بات قطعاً پسند نہیں کہ وفاق اور پنجاب کے مابین سیاسی اختلافات سے افسروں کا کوئی نقصان ہو۔اس لیے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مرکز میں نہ جانے سے آپ کا کیریئر متاثر ہوگا تو میری طرف سے آپ کو جانے کی اجازت ہے۔''

انہوں نے میری بھلائی و خیر خواہی کے معاملہ میں جو ذاتی دلچسپی لی' میں اس سے بے حد متاثر ہوا۔انہوں نے نہ تو مجھے رکنے کی ترغیب دی' نہ ہی مرعوب کرنے کی کوشش کی۔وہ چاہتے تو اپنی بات آسانی سے منوا سکتے تھے کیونکہ میں نے ان کے ماتحت تین سال کام کیا تھا۔اس عرصہ کی کارکردگی کے بارے میں ان سے اچھی سالانہ رپورٹیں لکھوائی تھیں۔رولز کے مطابق وفاقی حکومت کسی افسر کی کارکردگی کا جائزہ نہیں

لے سکتی جب تک صوبائی حکومت کی طرف سے رپورٹ موصول نہ ہو۔ دوسری طرف وفاقی حکومت مجھے معمولی سیاسی مقاصد کے لیے بطور مہرہ استعمال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

بہرحال وہ ایک ایسا کھیل تھا جسے دونوں کھیل سکتے تھے۔ دورانِ ملاقات میاں صاحب نے کہا: ''میں ان افسروں کی جگہ جنہیں وفاقی حکومت نے واپس بلایا ہے' ایسے صوبائی افسروں کا تبادلہ کرنے لگا ہوں جو وفاقی حکومت کے ماتحت نہیں ہیں۔'' میرے لیے ایسا سوچنا بھی گناہ تھا' اگرچہ اس طرح وفاقی حکومت کو ترکی بہ ترکی جواب دیا جا سکتا تھا' لیکن اس اقدام سے مرکزی حکومت کی وہ تمام کوششیں خاک میں مل جاتیں جو وہ حکومتِ پنجاب کے اختیارات نظرانداز کر کے دوسرے سینئر افسروں کو خوفزدہ کرنے کے لیے کر رہی تھی۔

مجھے یہ خوف لاحق ہوگیا کہ اگر سروسز کو صوبائی بنیادوں پر استعمال کرنا شروع کر دیا گیا تو ملک میں پھوٹ اور انتشار کو تقویت ملے گی۔ آل پاکستان سروسز وفاق اور صوبوں کے مابین مضبوط ترین رشتوں میں سے ایک ہے اور اس کے افسروں کو کسی صوبہ سے زیادہ تعداد میں دور بھیجنے سے وفاق کے تصور کو زبردست نقصان پہنچے گا۔ مجھے یہ قطعاً گوارا نہیں تھا کہ میں آل پاکستان سروسز کے خاتمہ کا سبب بنوں۔ اس لیے میں نے وزیرِ اعلیٰ پر زور دیا کہ وہ سروسز کو صوبائی رنگ نہ دیں خواہ انہیں سیاسی طور پر نقصان کیوں نہ ہو۔ انہیں اپنے اقدام کے مضمرات کو سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ جب بات ان کی سمجھ میں آ گئی تو وہ ملک کی خاطر عام طریقِ کار اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

تاہم وہ اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے کہ اگر وفاقی حکومت نے من مانے تبادلوں اور تعیناتیوں کے ذریعے افسروں کو ڈرانے اور دباؤ ڈالنے کا سلسلہ جاری رکھا تو انتظامیہ پر ان کا کنٹرول ختم ہو جائے گا۔ ان کی اس دلیل میں واقعی بڑا وزن تھا۔ میں نے گزارش کی کہ وفاقی اور صوبائی دونوں حکومتوں کے لیے آئین' قانون اور اصول و ضوابط کی پابندی لازمی ہے۔ ''پھر وفاقی حکومت اصول و ضوابط پر کیوں عمل نہیں کرتی؟'' انہوں نے غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''انہیں عمل کرنا چاہیے۔ اگر وہ نہیں کرتے' تب بھی آپ کو قومی مفاد میں قانون کی پابندی کرنی چاہیے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر میں تمہیں چارج چھوڑنے کی اجازت نہ دوں تو کیا یہ قواعد کی رو سے درست ہوگا؟''

"ہاں سر" میں نے جواب دیا۔ آپ انہیں دونوں ملکوں کے مابین مزید صلاح مشورہ کے لیے لکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے دوبارہ بڑی تشویش کے ساتھ کہا کہ وہ کسی بھی طور یہ بات پسند نہیں کریں گے کہ مجھے کوئی گزند پہنچے۔

عدالت میں سرخروئی

بہرحال وفاقی حکومت نے مجھے اپنے دائرہ اختیار میں لینے کے لیے قوانین' ضابطوں بلکہ شرافت و مصلحت کے عام تقاضوں کو بھی پامال کرتے ہوئے ذرا پرواہ نہیں کی۔ راؤ رشید نے اپنے دوست ملک وارث کے ذریعے کئی بار میرے ساتھ رابطہ کیا اور وعدہ کیا کہ اگر میں وفاقی حکومت کے حکم کی تعمیل کردوں تو جہاں چاہوں گا میری پوسٹنگ کردی جائے گی۔ میں نے اپنے ذاتی مفاد کا ملک کے اور اس سروس کے مفاد کے ساتھ جس سے میرا تعلق تھا' موازنہ کیا۔ میں نے اپنی ملازمت کی شاندار روایات قائم رکھتے ہوئے بینظیر کے والد کی نیک نیتی پر مبنی وہ پیشکش ٹھکرادی تھی جو انہوں نے 1973ء میں مجھے اپنے نمبر سے پہلے (Out of Turn) ترقی دینے کے سلسلہ میں کی تھی۔ اب وہ چاہتی تھیں کہ میں انہی روایات کو ایک معمولی سی بات کی خاطر نظر انداز کردوں اور ایک ناجائز مقصد کے حصول میں ان کی مدد کروں

راؤ رشید سابق انسپکٹر جنرل پولیس نے بھی جو عمر بھر قانون نافذ کرنے والے افسر کے فرائض انجام دیتے رہے تھے' اپنی سروس کی روایات کا قطعاً پاس نہیں کیا اور مجھے بار بار اچھی پوسٹنگ کی ترغیب دیتے رہے۔ میں نے بھی تہیہ کرلیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہوجائے قواعد وضوابط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گا۔

وزیراعظم نے ترغیب دینے اور خوفزدہ کرنے میں ناکام ہوکر مجھے معطل کردیا۔ زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے راؤ رشید نے میرے خلاف کئی اخباری بیان دیئے اور مجھ پر سیاست میں ملوث ہونے کا الزام لگایا۔ میں ان کی باتوں کا جواب دینے کی بجائے سب کچھ خاموشی سے سہتا رہا اور کسی کو یہ تک نہیں بتایا کہ ایک موقع پر راؤ رشید بے نظیر سے ناطہ توڑ کر نواز شریف کے ساتھ ملنے کے لیے بیقرار تھے۔ لیکن جنرل

ایک دن رانا شوکت محمود سے جن کے ہمراہ راؤ رشید بھی تھے' ایئرپورٹ پر اتفاقیہ ملاقات کے دوران راؤ رشید نے بڑے متکبرانہ انداز میں مجھ سے پوچھا: ''آپ وفاقی حکومت کی حکم عدولی کیوں کر رہے ہیں؟''

''میں حکم عدولی نہیں کر رہا' صرف قانون پر عمل کر رہا ہوں۔ میں ایک ادنیٰ اور تابع فرمان سرکاری ملازم کی حیثیت سے قانون کا احترام کر رہا ہوں۔ جبکہ طاقتور وفاقی حکومت اس کی دھجیاں بکھیر رہی ہے۔ براہ کرم قانون کا کچھ تو احترام کریں۔ میں اپنی طرف سے اس کی بہترین کوشش کر رہا ہوں۔''

مجھے چیلنج کرتے ہوئے انہوں نے بڑی رعونت سے کہا: ''پھر آپ عدالت انصاف کا دروازہ کیوں نہیں کھٹکھٹاتے؟''

میں نے وفاقی حکومت سے ہر چند کہا کہ وہ ہوش کے ناخن لے' مگر اس کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ ناچار میں نے معطلی کو لاہور ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کی انتھک کوششوں اور دلائل کے باوجود عدالت میں میرے نقطۂ نظر کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ میرے کیس کی پیروی جناب ایس ایم ظفر نے کی جن کا شمار ملک کے بہترین قانونی دماغوں میں ہوتا ہے اور جو لا کالج میں میرے استاد رہ چکے تھے۔ مقدمہ ان کے جونیئر سید زاہد حسین ایڈووکیٹ نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ میرے ہم جماعت اور ملازمت میں بیچ میٹ چوہدری منظور احمد اور زاہد حسین نے کیس کی تیاری میں میری زبردست مدد کی۔

میں نے جو مؤقف اختیار کی وہ آئین اور قانون کی رو سے درست ثابت ہوا۔ میں نے 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے ابتدا کر کے 1973ء کے سول سرونٹ ایکٹ کے تابع وضع کردہ تازہ ترین قواعد کا حوالہ دیا۔ جن کی رو سے آل پاکستان سروس کے کسی افسر کے خلاف کارروائی شروع کرنے کا اختیار کلیتاً اس صوبائی حکومت کو حاصل ہوتا ہے جس کے ماتحت مذکورہ افسر کام کر رہا ہو۔ یہ ایک منطقی بات ہے کیونکہ اگر مرکز اور صوبوں کے مابین اختیارات کی تقسیم مساوی اور مناسب نہ ہو تو وفاق نہیں چل سکتا۔ تاہم پی پی پی کی قیادت نے ابھی تک قانون پر عمل کرنے اور صوبوں میں اپنے سیاسی حریفوں کے ساتھ امن اور آشتی سے رہنے کا ڈھنگ نہیں سیکھا تھا۔

شکار کھیلنا' تعاقب کرنا اور بار بار چکر لگانا

میری معطلی کو مشکل سے ایک ہفتہ ہوا ہو گا جب وفاقی حکومت نے پنجاب کے آئی جی چوہدری

نثار احمد چیمہ کو مرکز میں بلا لیا۔ ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ میں جس کی صدارت وزیر اعلیٰ کر رہے تھے، مجھے کہا گیا کہ میں آئی جی کا چارج سنبھال لوں، لیکن میں نے بڑے نرم الفاظ میں معذرت کر لی، کیونکہ وفاقی حکومت کی طرف سے معطلی کے دوران ایسا کرنا انتہائی نامناسب ہوتا (اس سلسلے کی مزید تفصیلات کے لیے باب نمبر 34 ملاحظہ فرمایئے)

انور زاہد اور میں نے تجویز پیش کی کہ چوہدری منظور احمد کو جو اس وقت سیکرٹری پاپولیشن پلاننگ کے طور پر کام کر رہے تھے، آئی جی پولیس بنا دیا جائے۔ وفاقی حکومت اور راؤ رشید نے معقولیت کی تمام حدود پھلانگ کر چوہدری صاحب پر دباؤ ڈالا کہ وہ آئی جی نہ بنیں مگر ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔

اس کے بعد ستمبر 1989ء میں حاجی محمد اکرم ایڈیشنل چیف سیکرٹری، ڈاکٹر صفدر محمود سیکرٹری اطلاعات، چوہدری منظور احمد آئی جی اور رانا مقبول احمد ایس ایس پی لاہور کا یکطرفہ طور پر تبادلہ کر دیا گیا۔ وزیر اعلیٰ نے انہیں جانے کی اجازت دے دی کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا کچھ نقصان ہو۔ اب ان میں اس قدر اعتماد پیدا ہو گیا تھا کہ پی پی پی کا سیاسی لحاظ سے مقابلہ کر سکیں۔

بہر حال چوہدری منظور احمد کے مرکز میں تبادلہ کو ان کے لیے ہضم کرنا مشکل ہو گیا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ ایک کے بعد دوسرے آئی جی کو واپس بلا لیا گیا۔ اگر وہ سلسلہ جاری رہتا تو پنجاب حکومت اس حال کو پہنچ جاتی کہ اس کے پاس آئی جی بننے کا اہل کوئی افسر نہ رہتا۔ اس لیے وزیر اعلیٰ نے ارادہ کر لیا کہ ایسی صورت میں کسی ریٹائرڈ پولیس افسر کو کنٹریکٹ پر بھرتی کر کے آئی جی مقرر کر دیا جائے گا۔

وفاقی حکومت تنگ نظری سے کام لینے لگی تو وزیر اعلیٰ بہت زیادہ سیکورٹی طلب کرنے لگے۔ آئندہ جب بھی مرکز اور صوبوں کے مابین چپقلش ہوتی تو یہ طرز نمونہ کا کام دیتا۔ چونکہ وفاقی حکومت زیادہ سے زیادہ افسر واپس بلا رہی تھی، صوبائی حکومت ان کی جگہ صوبائی سروسز کے افسروں کو یا ریٹائرڈ افسروں کو کنٹریکٹ پر بھرتی کرنے کا سوچنے لگی۔ اس عمل سے آل پاکستان سروسز کا پورا ڈھانچہ دھڑام سے بیٹھ جاتا۔ میری طرح چیف سیکرٹری بھی بے حد پریشان تھے۔ نظام کو بچانا ضروری ہو گیا تھا۔

میں نے وزیر اعلیٰ کی اجازت سے وزیر اعظم کے پرنسپل سیکرٹری اوا ے یو عیسانی سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ اگر کسی ریٹائرڈ افسر کو آئی جی بنا دیا گیا تو سروسز کے ڈھانچہ اور وفاق کو سنگین خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ عیسانی جو ایک صاحب فہم افسر تھے، میرے نکتہ کو فوراً سمجھ گئے۔ میں نے ان سے درخواست کی

کہ وزیراعظم پر زور دیں چوہدری منظور احمد کو آئی جی پنجاب کے عہدہ پر واپس بھیج دیا جائے۔ نواز شریف انہیں قبول کر لیں گے۔ انہوں نے انور زاہد سے بات کی اور دونوں کے مابین طے پا گیا کہ چوہدری منظور کو واپس کر دیا جائے تو انہیں پنجاب کا آئی جی بنا دیا جائے گا۔ یوں ہم ایک بہت بڑے بحران سے بچ گئے۔

آصف زرداری کے ساتھ اتفاقیہ ملاقات

عیسانی سے ملنے کے بعد میں اسلام آباد میں ہی تھا کہ ایک دن وزیراعظم کے شوہر آصف علی زرداری سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ دراصل حاجی اکرم اور میں شیخ منصور، سابق ایم این اے (گوجرانوالہ) سے ملنے گئے تھے۔ ہم ان کے گھر چائے پی رہے تھے کہ خواجہ طارق رحیم کے ساتھ اچانک زرداری بھی آ ٹپکے۔ زرداری اپنی پولو کٹ میں تھے یعنی انہوں نے سواری والے لمبے بوٹ پہن رکھے تھے۔ ان کے ساتھ یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ خاصے نوعمر، سمارٹ اور پُرکشش لگ رہے تھے۔ میں نے اپنے دل میں بے نظیر کے انتخاب کو سراہا۔

جب میرا تعارف کرایا گیا تو زرداری کو بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے فوراً سوال کیا:

"آپ وہی چوہدری سردار محمد ہیں جو ہماری حکومت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟"

"نہیں جناب میں آپ کی حکومت کے پیچھے ہرگز نہیں پڑا ہوا بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ آپ میری ملازمت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں ایک ادنیٰ سرکاری ملازم ہوں۔ میں نے کبھی کسی اصول یا قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔ مجھے بلاوجہ معطل کیا گیا اور قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔" میں نے بڑے نرم اور آہستہ لہجہ میں جواب دیا۔ وہ مجھے گھورتے رہے اور پھر بولے: "آپ اتنے خطرناک نہیں لگتے، آپ مجھے بھلے آدمی لگتے ہیں۔"

میں کچھ سٹپٹا گیا اور ان سے کہا: "میں معذرت چاہتا ہوں۔"

حاجی اکرم اندر آئے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔ زرداری آرام دہ پوزیشن میں ہو گئے اور روانی کے ساتھ پنجابی میں گفتگو کرنے لگے۔ انہوں نے راؤ رشید کو صوبائی حکومت سے تعلقات خراب کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا، کیونکہ بقول ان کے وہ پنجاب کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتے تھے۔ پھر انہوں نے حاجی اکرم اور مجھ سے کہا کہ پنجاب کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے میں ان کی مدد کریں۔

حاجی اکرم نے انہیں بتایا کہ نواز شریف انتہائی اچھے آدمی ہیں اور ہم پر بہت مہربان ہیں۔ ہم کسی صورت میں ان کے خلاف کام نہیں کریں گے اور ان کے مفادات کے خلاف کارروائی میں فریق نہیں بنیں گے۔" زرداری نے جواب دیا: "میں ایک شریف آدمی سے ایسی ہی توقع رکھتا ہوں اور اس کے لیے آپ کی دل سے قدر کرتا ہوں۔"

"مرکز اور نواز شریف کے مابین ورکنگ ریلیشن شپ کے لیے مفاہمت ضروری ہے۔" حاجی اکرم نے مشورہ دیا۔

"میں آپ سے ان خطوط پر کام کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔" زرداری نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔

اس کے بعد میں زرداری سے کبھی نہیں ملا۔ حاجی اکرم نے وزیر اعلیٰ کو اتفاقیہ ملاقات کی روئداد سنائی اور بات چیت کی تجویز کے بارے میں بتایا۔ حاجی صاحب نے اس سلسلہ میں کچھ کام بھی کیا۔ تاہم تعلقات بہتر نہیں ہو سکے۔ معاملات اس حد تک آگے جا چکے تھے کہ واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

بے نظیر کے غیظ و غضب نے آئی جے آئی کے کسی سیاستدان سے وابستہ یا رشتہ و تعلق رکھنے والے سرکاری ملازمین کو بھی نہیں بخشا۔ ایسے افسروں کو طرح طرح سے ستایا اور تنگ کیا گیا تا کہ وہ ان کی لائن پر آ جائیں۔ پی پی پی کی حکومت فوجی آمر کے نقشِ قدم پر چل رہی تھی۔ جنہوں نے راؤ رشید جیسے اچھے افسروں کو بھی ہراساں کرنے سے دریغ نہیں کیا تھا۔ لیکن انسان اپنے ماضی سے شاذ ہی سبق سیکھتا ہے۔ اس کے برعکس نواز شریف نے سیاسی مخالفین کے معاملہ میں فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ پی پی پی کے لیڈروں کے بہت سے رشتہ دار پنجاب حکومت میں کام کر رہے ہیں' مگر انہوں نے ان کے خلاف کوئی گھٹیا یا انتقامی کارروائی نہیں کی۔ وفاقی حکومت کی طرف سے زبردست دباؤ میں ہوتے ہوئے بھی راہ راست پر رہے اور لوگوں کے ساتھ رحمدلانہ سلوک کیا۔ اعتزاز احسن کی اہلیہ کو جو پنجاب کے ایک تعلیمی ادارہ میں پڑھاتی تھیں قطعاً پریشان نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اعتزاز حسن بحیثیت وزیرِ داخلہ نواز شریف پر ذاتی حملے کرتے رہتے تھے۔ بعد میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ اسلام آباد میں رہنے کے لیے اپنی مرضی سے رخصت پر چلی گئیں۔ راؤ رشید کا ایک بھتیجا میرے ماتحت سپیشل برانچ میں کام کر رہا تھا' اس کے ساتھ اس کی صلاحیت واہلیت کے مطابق سلوک کیا گیا' راؤ رشید کے رشتہ دار کے طور پر نہیں۔ البتہ میاں صاحب سے سلمان تاثیر

(پی پی پی کے صوبائی لیڈر) کے معاملے میں غلطی ہوگئی۔ عثمان کو میاں صاحب کے خلاف ایک ذاتی رسوا کن مہم میں ملوث پایا گیا۔ وزیر اعلیٰ نواز شریف نے شدید ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے انہیں جیل بھجوا دیا۔ جب میں نے اس معاملہ میں ضبط و تحمل سے کام لینے کا مشورہ دیا تو انہیں سخت ناگوار گزرا۔ بہر حال کوئی شخص بھی غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا۔

نواز شریف کا تختہ الٹنے کی کوشش

پی پی پی کی وفاقی حکومت نواز شریف' ان کے خاندان بلکہ ان سے دور کا تعلق رکھنے والوں کے خلاف بھی انتقام میں مبتلا ہو کر غیر صحت مند روایات قائم کر رہی تھی۔ قومی تحویل میں لیے گئے بینکوں نے میاں فیملی کے اتفاق گروپ آف انڈسٹریز کو قرضے دینے سے انکار کر دیا۔ ریلوے نے جو اتفاق فونڈریز کے لیے درآمد کردہ سکریپ پہنچانے والا اہم ذریعہ تھا' کراچی سے سامان لانے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر مال گاڑیاں فراہم کرنے سے معذرت کر لی۔ واپڈا کو جو بجلی فراہم کرنے والا واحد ادارہ ہے' ہدایت کر دی گئی کہ اتفاق انڈسٹریز کو بجلی تو دی جائے تاہم ہر ممکن طریقے سے تنگ کیا جائے۔ واپڈا نے زیادہ رقوم وصول کرنے کا خود اعتراف کیا۔ ''جوناتھن'' نامی جہاز کو جو اتفاق فونڈریز کے لیے سکریپ لے کر آیا تھا کوئی مہینے تک کراچی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے کی اجازت نہیں دی گئی اور اس کی بابت شرطیں لگنے لگیں۔ یہاں تک کہ میرے دوست سراج منیر کو اس کے خلاف اخبارات میں زوردار مہم چلانی پڑی۔ پی پی پی کی قیادت اپنے حریفوں پر اسی قسم کے مظالم ڈھا رہی تھی' جن کا وہ ضیا دور میں خود نشانہ بن چکی تھی' جس سے اس کا امیج داغدار اور اخلاقی پوزیشن خراب ہو رہی تھی۔

نواز شریف کو ڈرا دھمکا کر مطیع و تابع فرمان بنانے کی کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد بے نظیر نے ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کا تہیہ کر لیا۔ وزیروں' مشیروں اور پی پی پی کے لیڈروں کا ایک جتھا نوٹوں سے بھرے ہوئے بریف کیس اور روزگار کی پیشکشوں کے ساتھ لاہور پہنچ گیا۔ ان کا مقصد آئی جے آئی کے ممبران صوبائی اسمبلی کی معقول تعداد کی ہمدردیاں حاصل کرنا تھا تاکہ نواز حکومت کا دھڑن تختہ کر دیا جائے۔ سپیشل برانچ کے چیف کی حیثیت سے میں نے میاں صاحب کو ان کی سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر رکھا۔ وہ بدترین قسم کی ہارس ٹریڈنگ میں ملوث تھے۔

سب سے پہلے آئی جے آئی کے اِن ایم پی ایز اور ایم این ایز کو نشانہ بنایا گیا جو زرعی بینک کے

نادہندہ تھے۔ انہیں فوری ادائیگی کا حکم دیا گیا۔ البتہ نواز شریف کا ساتھ چھوڑنے کی صورت میں انہیں مہلت دینے بلکہ مزید قرضے دلانے کا لالچ بھی دیا گیا۔ معزز اور باوقار ارکان اسمبلی نے جو اچھا خاندانی پس منظر رکھتے تھے، کسی قسم کی ترغیب و تحریص میں آنے سے صاف انکار کر دیا۔ سرزمین پنجاب کے وہ فرزند چٹان کی طرح ڈٹ گئے اور کسی دام تزویر میں نہیں آئے۔ اس سے پنجاب حکومت مزید مستحکم ہو گئی اور پی پی کے پانچ چھ عوامی نمائندوں نے جو قیادت کی پالیسیوں سے نالاں تھے، نواز شریف کی حمایت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہارس ٹریڈنگ کرنے والوں کو اس طرح منہ کی کھانی پڑی کہ وہ اپنی شبانہ روز بھاگ دوڑ اور طرح طرح کی ترغیبوں کے باوجود آئی جے آئی کا ایک بھی ایم پی اے نہیں توڑ سکے۔ جب وہ واپس گئے تو نوٹوں سے بھرے ہوئے کئی بیگ خالی ہو چکے تھے۔ کیونکہ دلال بہر حال کسی کے لیے مفت کام نہیں کرتے۔ سودا طے پائے یا نہ پائے وہ اپنا کمیشن وصول کیے بغیر نہیں رہتے۔ بہت سے بدمعاش اور دھوکے باز راتوں رات پہلے سے زیادہ امیر، پہلے سے زیادہ غلیظ اور پہلے سے زیادہ پلید ہو گئے۔

پی پی پی کے خلاف اپوزیشن کا اتحاد

پی پی پی کی قیادت کے غیر جمہوری اور ناشائستہ اقدامات نے جن کا مقصد پنجاب کی منتخب حکومت کا بستر گول کرنا تھا، ان لوگوں کو بھی بدظن کر دیا جو اس کا براہ راست نشانہ بنے تھے۔ انہیں یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ اکبر بگٹی بھی ہاتھ رنگنے والوں میں شامل تھے۔ ضیا شاہد نے جو ان دنوں مشہور اُردو روزنامہ ''پاکستان'' کے ایڈیٹر تھے، وزیر اعلیٰ کے چھوٹے بھائی شہباز شریف سے ملاقات کی اور پی پی پی کے خلاف تمام سیاسی جماعتوں کا بڑا اتحاد قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اسی ہفتے ارشد چوہدری کی طرف سے بھی اس قسم کی تجویز سامنے آئی۔ غلام مصطفیٰ جتوئی اس مقصد کے لیے پہلے ہی سرگرم تھے۔ چوہدری شجاعت اور غلام حیدر وائیں نے اس تجویز کی مخالفت کی جو آئی جے آئی کے لیڈروں اور قومی اسمبلی میں پارلیمانی قائدین کے طور پر اپنی پوزیشن برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ نواز شریف جو درمیانی مدت میں آئی جے آئی کے سربراہ منتخب ہو گئے تھے، شروع میں اپوزیشن کا متحدہ محاذ بنانے سے گریزاں تھے، بعد میں اس تصور کی افادیت کے قائل ہو گئے۔ جتوئی قومی اسمبلی میں مشترکہ اپوزیشن کا قائد بننے کے لیے بے تاب تھے۔

نوابزادہ نصر اللہ خاں نے ایم آر ڈی کے ان سابق عناصر کو جن کے ساتھ بے نظیر نے

برسراقتدار آنے کے بعد بیوفائی کی اور ان سے علیحدگی اختیار کرلی تھی اکٹھا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔
یوں اپوزیشن جماعتوں کا اتحاد (Combined Opposition Parties) جسے مختصراً ''سی او پی'' کہا گیا' بڑے طمطراق سے وجود میں آیا۔ جتوئی اس کے سربراہ نیز قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے قائد بنے۔ 237 کے ایوان میں حزبِ اختلاف کے ارکان کی تعداد 94 تک پہنچ گئی۔ چونکہ ساری جماعتیں حکمران پارٹی کے خلاف شیر وشکر ہوگئی تھیں اس لیے وفاقی حکومت کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ سی او پی کی تشکیل کے بعد پی پی عملاً تنہا رہ گئی۔ اب پنجاب حکومت کی بجائے وہ خود دفاعی پوزیشن پر آ گئی۔

اُردو ڈائجسٹ کے مدیر الطاف حسن قریشی نے سی او پی کی تشکیل کے دوران اور اس کے بعد اپنے ''پاکستان انسٹیٹیوٹ آف نیشنل افیئرز'' میں کئی سیمینارز منعقد کرائے جن میں تمام صوبوں سے دانشوروں' علماء' وکلا' اور دیگر حضرات کو مدعو کیا گیا تاکہ قوم کو درپیش سماجی اور سیاسی مسائل پر بحث مباحثہ کرکے لوگوں کو جذباتی نیز سیاسی طور پر ایک دوسرے کے قریب لایا جاسکے۔ وہ ملک میں لسانی' علاقائی اور فرقہ وارانہ تفریق وانتشار سے بے حد پریشان تھے۔

سی او پی کے قیام کو اس کے شرکاء نے ایک مثبت اور صحت مند قدم قرار دیا جو تمام مکاتبِ فکر اور معاشرہ کے جملہ طبقات کی نمائندگی کرتا تھا۔ دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں نیز سارے علاقوں اور مذہبی فرقوں کی ایک پلیٹ فارم پر موجودگی سے عوام کو ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں کے ذریعے ایک دوسرے کے قریب لانے کا کام لیا جاسکتا تھا۔ سراج منیر نے ایک فکر انگیز مقالہ میں سی او پی کو قومی سیاست کے زخمی جسد اور نفسیات کے لیے مرہم قرار دیا۔ انہوں نے پاکستان کو ایک ایسے گلدستہ سے تشبیہ دی جو مختلف رنگوں کے پھولوں پر مشتمل ہو۔ انہوں نے کہا کہ تصورات اور ذمہ داریوں میں تحمل اور برداشت کے ذریعے حصہ لینا چاہیے۔ اس مقالہ میں قومی اتحاد و یکجہتی کا جو ایجنڈا پیش کیا گیا تھا' میرے خیال میں وہ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کے برعکس ''اتحاد پیدا کرو اور خدمت کرو'' کا داعی تھا۔ اس کی نقول تمام قومی رہنماؤں کو فراہم کی گئیں۔ جتوئی' نواز شریف اور دوسروں نے اس کا مطالعہ کرکے مسرت کا اظہار کیا۔ مشہور روزنامہ ''جنگ'' نے اس مقالے کو دو قسطوں میں شائع کیا۔

کھر کی قلابازیاں

اس کے بعد بے نظیر حکومت کے خلاف اگلا منطقی قدم عدم اعتماد کی تحریک تھا۔ نواز شریف اور

جتوئی نے ایم کیو ایم کو جو بے نظیر کے رویہ سے بیزار ہو گئی تھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ نواز شریف نے صوبہ سرحد میں اپنے دوستوں کی معرفت فاٹا سے تعلق رکھنے والے ایم این ایز پر کام کیا جو پی پی کے حامی تھے۔ اپوزیشن نے پی پی کے بعض ناراض ایم این ایز کی ہمدردیاں بھی حاصل کر لیں۔

دوسری طرف نواز شریف کے ساتھیوں میں بھی انتشار و تفریق کے آثار نظر آنے لگے۔ میاں صاحب نے اپنے بعض قریبی دوستوں کے دباؤ میں آ کر میرا تبادلہ اینٹی کرپشن میں کر دیا تھا۔ ارشد چوہدری بھی ڈانواں ڈول لگتے تھے حالانکہ انہوں نے ایم کیو ایم کو توڑنے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا' ٹکا اقبال کو معاون خصوصی برائے وزیر اعلیٰ کے منصب سے ہٹا دیا گیا۔

اس کے بعد ایک اور دھچکا لگا۔ غلام مصطفیٰ کھر نے جو بہت سے رازہائے دروں اور سی او پی کے اقدامات سے آگاہ تھے' بے نظیر کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا اور بیش بہا معلومات کے ساتھ اپنی خدمات ان کی حکومت بچانے کے لیے پیش کر دیں۔ محترمہ نے ان کے سابقہ طرزِ عمل کو نظر انداز کر کے انہیں کھلے دل سے قبول کر لیا' وہ بڑی تیزی سے حرکت میں آئے۔ انہوں نے نہ صرف پی پی کے ناراض ارکان کو منا لیا بلکہ آئی جے آئی کے تین ممبران کو بھی توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ پی پی نے اپنے ایم این ایز کو سوات پہنچا دیا تاکہ ان میں سے کوئی ساتھ نہ چھوڑ سکے۔ جبکہ اپوزیشن کے ارکان کو مری اور دوسرے مقامات پر لیجا کر ہوٹلوں میں بند کر دیا گیا۔ سی او پی کے 107 ووٹ ہو گئے تھے اور حکومت گرانے کیلیے انہیں مزید 12 ووٹ درکار تھے۔ آخر میں اس نے 119 ووٹ اکٹھے کر لیے تاہم سی او پی کی قیادت سے یہ ہمالیائی غلطی سرزد ہو گئی کہ ان سب کو ایک چھت تلے اکٹھا نہیں رکھا گیا تاکہ ڈانواں ڈول ارکان کو یقین آ جاتا کہ ان کا پلڑا بھاری ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض ارکان ساتھ چھوڑ گئے۔ اس کے باوجود رائے شماری ہوئی تو بے نظیر کی حکومت بہت معمولی فرق سے اپنا وجود برقرار رکھ سکی۔

مصطفیٰ کھر نے پی پی کی قسمت سنوارنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ شکست خوردہ جتوئی کو اپنی سیٹ پر کھر نے ہی کامیاب کرا کے قومی اسمبلی تک پہنچایا تھا۔ پھر انہوں نے پانسہ پلٹا اور بے نظیر کی حکومت بچانے کے لیے ان سے جا ملے' وہ بڑے مضبوط لیڈر بن کر اُبھرے لیکن پی پی کے سینئر لیڈروں کی رقابت کا شکار ہو گئے۔ محترمہ نے ان کی خدمات سے استفادہ کرنے کے بعد انہیں نظر انداز کرنا شروع کر دیا تو وہ پھر ان کے مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ کچھ عرصہ بعد کھر نے محترمہ کی حکومت گرانے میں سرگرم حصہ لیا اور غلام

مصطفیٰ جتوئی کی نگران کابینہ میں وزیر بن گئے۔ یہ سب ہاتھ کی صفائی تھی۔

ایک سب انسپکٹر سابق آئی جی کو جُل دے گیا

جب پی پی پی کی حکومت اپنے خلاف تحریکِ عدم اعتماد کو ناکام بنانے کے لیے ایک ایک ووٹ حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش میں مصروف تھی۔ کمانڈر ایم اے آر عارف جو ایک ریٹائرڈ انسپکٹر جنرل اور پاک بحریہ کے سابق سربراہ تھے' ایک دھوکے باز کے چنگل میں پھنس گئے۔ وہ سب انسپکٹر راجہ ارسل اور اس کے باپ کو جانتے تھے۔ وہ دونوں ان کے ماتحت نوکری کر چکے تھے۔ راجہ ارسل کا راجہ اکرم کی معرفت جو امام بری کے خاص عقیدت مندوں میں سے ایک تھا' جہلم کے علاقہ سے تعلق رکھنے والے آئی جے آئی کے راجا افضل' راجا اقبال مہدی اور بعض دوسرے ایم این ایز کے ساتھ رابطہ تھا۔ راجہ ارسل نے کمانڈر عارف کو بتایا کہ آئی جے آئی کے کم از کم سات ایم این ایز اپنی وفاداریاں تبدیل کر کے پی پی پی میں شامل ہونے کو تیار ہیں بشرطیکہ انہیں دو کروڑ روپے فی کس دینے کا اہتمام ہو جائے۔ اور بیعانہ کے طور پر کچھ رقم پیشگی دیدی جائے۔

کمانڈر عارف اور نور محمد لنڈ (ایم این اے) ارسل کو بے نظیر کے سسر حاکم علی زرداری کے پاس لے گئے۔ انہوں نے معاملہ طے کرنے کے بعد اپنے بیٹے سے کہا کہ راجہ ارسل کو بطور پیشگی ایک کروڑ روپیہ دے دیں۔ عارف نے ارسل کی ضمانت دی۔ آصف زرداری نے انہیں ایک بریف کیس دیا جس میں ایک کروڑ کی رقم تھی۔ وہ رقم لے کر راجہ اکرم کے گھر پہنچے۔ ارسل نے پوری رقم سمیت بریف کیس اٹھایا اور عارف کی کار میں بیٹھ کر چمپت ہو گیا۔

کمانڈر عارف مصیبت میں پھنس گئے۔ ان کی کار بھی گئی اور کریڈی بلٹی بھی داؤ پر لگ گئی۔ آصف زرداری نے انہیں دھمکی دی کہ ایڈوانس کی رقم واپس نہ ملی تو اسلام آباد میں واقع ان کے گھر پر قبضہ کر لیا جائے گا اور ان کے بیٹے کو جو اسلام آباد پولیس میں ڈی ایس پی تھا' نوکری سے نکال دیا جائے گا۔

عارف نے ارسل کا سراغ لگانے کے لیے مجھ سے مدد مانگی۔ میں ان کی زبانی سارا قصہ سن کر دنگ رہ گیا۔ کیونکہ صرف چند مہینے پیشتر اس نے میرے ساتھ بھی اسی طرح کا ہاتھ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ مجھ سے ملنے آیا اور سرگودھا سے پی پی پی کے دو ایم پی ایز کی خدمات فراہم کرنے کی پیشکش کی بشرطیکہ

نواز شریف پیسہ خرچ کرنے پر آمادہ ہوں۔ میں نے اسے یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ میں بحیثیت سرکاری ملازم سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا۔ لیکن اس نے پولیس سروس کی برادری کا واسطہ دے کر اصرار جاری رکھا۔ میں جس قدر معذرت کرتا۔ اس کے اصرار میں اسی قدر اضافہ ہو جاتا۔ اس چیز نے میرے دل میں شکوک وشبہات پیدا کر دیئے۔ آخرِ کار میں نے اسے دوٹوک جواب دے دیا کہ مجھے اس تجویز سے کوئی سروکار نہیں۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ وہ مجھے اس کھیل میں ملوث کرنے پر اس قدر زور کیوں دے رہا تھا۔ محض تین دن بعد مجھے اس کا سبب معلوم ہو گیا۔ راؤ رشید نے جو وزیر اعظم کے خصوصی معاون تھے' مجھ پر سیاست میں ملوث ہونے کا برسرِ عام الزام لگایا اور وفاقی حکومت نے مجھے اسی الزام کی بنا پر معطل کر دیا۔ لیکن ان کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس لیے شہادت حاصل کرنے کی غرض سے ایک سابق آئی جی کو میرے پیچھے لگا دیا گیا تھا (شاید ''بھائی بندی'' اسی کو کہتے ہیں) بعد میں پتہ چلا کہ عارف کے پاس خفیہ ٹیپ ریکارڈر تھا۔ وہ چاہتے تھے میں اس معاملہ میں کچھ کہوں تو اسے ٹیپ کر کے ملوث کرنے والے مواد کی صورت میں آگے پیش کر دیا جائے۔ وہ آج تک اسی گمان میں ہیں کہ میں ان کی چال کو سمجھ نہیں سکا۔ اسی گمان کے تحت انہوں نے مجھ سے مدد مانگی اور میں ان کے ماضی کو فراموش کر کے ان کی مدد کرنے پر فوراً آمادہ ہو گیا۔

چند دن بعد عارف کے کسی واقف کار نے ارسل کو داتا دربار پر کار پارک کرتے ہوئے دیکھا اور مجھے آگاہ کر دیا۔ ارسل کے بیوی بچے شاہدرہ میں رہتے تھے۔ میں نے فوراً نئی انارکلی کے ڈی ایس پی چوہدری محمد اشرف وڑائچ کو ضروری کارروائی کی ہدایت کر دی۔ اس نے گھیرا ڈال کر ارسل کو گرفتار کر لیا۔ ارسل نے انسدادِ دہشت گردی سیل میں تفتیش کے دوران ہر چیز اگل دی۔ کار اس کے بھائی کے پاس سے برآمد ہوئی جو فوج میں میجر تھا۔ آدھی رقم راجہ محمد افضل ایم این اے کو پہنچا دی گئی تھی۔ راجہ افضل کو ارسل کی گرفتاری کا علم ہوا تو وہ فوراً انسدادِ دہشت گردی سیل پہنچے۔ وہاں انہیں ارسل کے ساتھ تنہائی میں بات چیت کا موقع دیا گیا تو انہوں نے ملزم کے پاؤں پکڑ لیے اور منتیں کرنے لگے کہ وہ اس معاملہ مین ان کا نام نہ لے۔ افضل کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ارسل سے گفتگو کر کے اپنے خلاف پھنسانے والی شہادت فراہم کر رہے تھے کیونکہ دونوں کی بات چیت خفیہ طریقے سے ریکارڈ کی جا رہی تھی۔

آصف زرداری اور بے نظیر کو ان کی گرفتاری کی خبر ملی تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کیونکہ اس سے ان کی ہارس ٹریڈنگ کا راز فاش ہونے کا خطرہ تھا۔ انہوں نے معاملہ کو پوشیدہ رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ چونکہ میں ان دنوں ڈائریکٹر انٹی کرپشن تھا اس لیے میرا اس کیس سے براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ دوسرے مجھے وزیر اعظم کو بلیک میل کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ کمانڈر عارف کی جان چھوٹ گئی۔ ان کا مکان ان کے پاس رہا اور ان کے بیٹے کی ملازمت بھی بچ گئی۔

بی بی کی حکومت کا دھڑن تختہ

6 اگست 1990ء کو لاہور سے نکلنے والے انگریزی اخبار ''نیشن'' میں اس کے ایڈیٹر عارف نظامی کے حوالہ سے صفحہ اول پر ایک خصوصی خبر شائع ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ صدر نے بی بی کی حکومت برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اسی ادارہ کے اُردو روزنامہ ''نوائے وقت'' نے بھی وہ خبر پہلے صفحہ پر شہ سرخی کے طور پر شائع کی تھی۔ میاں عبدالستار لالیکا نے مجھے بتایا کہ صدر آج شام قوم سے خطاب کرنے والے ہیں جس میں بی بی کی حکومت چلتا کرنے کا اعلان کیا جائے گا۔ وزیر اعظم اپنے حال میں مست ہونے کے باعث اس فیصلہ سے بے خبر تھیں کیونکہ ایجنسیوں میں سے کسی کو بھی یہ سن گن نہیں تھی کہ ایوانِ صدر میں کیا ہو رہا ہے' نہ ہی انہوں نے اخباری رپورٹ کی تصدیق کرنے کی زحمت گوارا کی۔ جن انٹیلی جنس ایجنسیوں پر انہوں نے ہمیشہ تکیہ کیا ان کی صلاحیت و مستعدی کا یہ عالم تھا کہ اتنے اہم واقعہ کا سراغ نہیں لگا سکیں۔ یہ بات چنداں موجب حیرت نہیں کہ بی بی کوئی جوابی قدم نہیں اٹھا سکیں اور غلط قوتوں پر بھروسا کرنے کی وجہ سے مار کھا گئیں۔

صدر نے شام کو واقعی ہاتھ دکھا دیا۔ انہوں نے بے نظیر کی حکومت برطرف کرنے کے ساتھ ساتھ قومی اسمبلی کا بھی تیا پانچہ کر دیا اور نئے الیکشن کے لیے 24 اکتوبر کی تاریخ مقرر کر دی۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کو نگران وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ میاں محمد اظہر نے جنرل ٹکا خان کی جگہ گورنر پنجاب کا منصب سنبھال لیا اور غلام حیدر وائیں نگران وزیر اعلیٰ بن گئے۔

حاجی اکرم اور میں نے نئے گورنر اور وزیر اعلیٰ کی تقریب حلف برداری میں شرکت کی جس میں نواز شریف بھی موجود تھے۔ اس موقع پر کسی شخص نے میاں صاحب سے کہا کہ کرنل خالد کو جو گورنر کے ملٹری سیکرٹری اور جنرل ٹکا خان کے فرزند تھے' تبدیل کر دیا جائے مگر میاں صاحب نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔

چنانچہ کرنل خالد میاں اظہر کے زمانہ گورنری میں بطور ملٹری سیکرٹری بدستور کام کرتے رہے۔

پی پی پی کی حکومت برطرف ہونے کے بعد میری معطلی کا دور بھی ختم ہوگیا۔ نگران وزیراعظم (جتوئی) نے میری معطلی کے احکام واپس لے لیے اور مجھے سروس پر بحال کردیا۔ انہوں نے مجھے گریڈ 21 دینے کی ہدایت بھی کردی کیونکہ میرے بیچ کے تمام ساتھیوں کو میری معطلی کے دوران مذکورہ گریڈ مل گیا تھا۔



باب32

وزیرِ اعظم نواز شریف

''آئندہ انتخابات کا نتیجہ کیا ہوگا؟'' نواز شریف نے 6 اگست1990ء کو نئے گورنر اور نگران وزیر اعلیٰ کی حلف برداری کی تقریب کے موقع پر مجھ سے سوال کیا۔ اگرچہ اب مجھے سپیشل برانچ کے ذرائع سے استفادہ کرنے کا موقع میسر نہیں تھا' تاہم اپنے سابقہ تجربہ کی بنا پر میں نے فوراً کہہ دیا کہ سی او پی پنجاب سے90 سیٹیں حاصل کرلے گا۔ انہوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''یہ بہت اُمید افزا ہے'' کیونکہ حاجی اکرم نے70 سے زائد نشستوں کا اندازہ ظاہر کیا تھا۔ میں نے وضاحت کی کہ میرا اندازہ سی او پی کے ایک اُمیدوار کے مقابلہ میں پی پی کے ایک اُمیدوار کی بنیاد پر ہے۔ چوہدری ارشد نے جتوئی کو قائل کرلیا تھا کہ اگر ایک کے مقابلہ میں ایک والا فارمولا اختیار کیا گیا تو پی پی کی جیت کا کوئی امکان نہیں۔

''اگر1970ء کے الیکشن میں بھی پی پی کی مخالف جماعتیں ایک کے مقابلہ میں ایک اُمیدوار کے فارمولا پر عمل کرتیں تو کو شکست فاش دی جاسکتی تھی۔'' میں نے میاں صاحب کو بتایا: ''بہر حال20 مہینے کی بدنظمی اور کرپشن کے بعد اس وقت پی پی کی کامیابی کے امکانات یقیناً مدہم اور کمزور ہیں۔''

میں پیر پگاڑا سے ان کی رہائش گاہ پر ملا تو انہوں نے میرے تخمینہ سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کے خیال میں ''ون ٹو ون'' (ایک کے مقابلہ میں ایک) والے فارمولا کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا' نہ ہی وہ ماضی میں کامیاب رہا تھا۔ وہ بہت سے پارلیمانی بورڈز کے صدر رہ چکے تھے۔ ان کا تجزیہ یہ تھا کہ ٹکٹوں کی تقسیم انفرادی پارٹیوں کے اندر سے مسائل کھڑے کردیتی ہے جبکہ سی او پی تو بہت بڑا اتحاد ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ارشد چوہدری نے1985ء اور1988ء کے انتخابی نتائج اور سپیشل برانچ کے سروے کی بنیاد پر بہت اچھا کام کررکھا ہے۔ سابقہ انتخابات میں ایسے کارآمد اور اچھی طرح مرتب کردہ اعداد و شمار دستیاب نہیں تھے۔ جہاں تک آئی جے آئی میں شامل جماعتوں کے اُمیدواروں کے انتخاب کا تعلق ہے وہ

1988ء میں کر لیا گیا تھا باقی پارٹیاں زیادہ مسائل کھڑے نہیں کریں گی' البتہ پنجاب سے واحد نمایاں شخصیت نوابزادہ نصر اللہ خان کی ہے انہیں لازماً ایڈجسٹ کرنا پڑے گا۔ دوسرے صوبوں میں سیاسی صف بندی اور سی او پی کے ایسے اُمیدواروں کا انتخاب جن کے جیتنے کے روشن امکانات ہوں' کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

میری وضاحت سننے کے بعد پیر پگاڑا نے خیال ظاہر کیا کہ اگر پارٹیاں جماعتی بنیاد پر کوٹہ کا مطالبہ نہ کریں اور مخصوص حلقہ مین جیتنے والے متوقع اُمیدوار کو قبول کر لیں خواہ اس کا تعلق کسی بھی جماعت سے ہو' تو ایسا ہوسکتا ہے۔ میں نے چند دن بعد ان سے دوبارہ بات چیت کی تو وہ قطعی پُر اُمید تھے کہ اگر صرف ایسے اُمیدواروں کو ٹکٹ دیئے جائیں جن کی کامیابی کے ٹھوس امکانات ہوں تو سی او پی واضح اکثریت سے جیت سکتی ہے۔

وہ تجویز نواز شریف اور ارشد چوہدری کے دل کو بھی لگی اور انہوں نے دوسری پارٹیوں کے سربراہوں سے بھی اسے منوالیا۔ سی او پی کا اجلاس جو اُمیدواروں کے چناؤ کے لیے جتوئی کے زیرِ صدارت منعقد ہوا' اس میں کسی الجھن کے بغیر 170 سیٹوں کا فیصلہ کر لیا گیا۔ باقی 20 سیٹوں کا فیصلہ اگلے دن ''ون ٹو ون'' کی بنیاد پر ہو گیا۔ صرف چند سیٹیں جن میں کچھ الجھن تھی' کسی تلخی کے بغیر کھلی چھوڑ دی گئیں۔ سی او پی کے لیے یہ واقعی بہت اچھا اور ماہرانہ آغاز تھا۔

اس کے برعکس پی پی پی کو اتحاد کے لیے صرف دو جماعتیں تحریکِ استقلال اور تحریکِ جعفریہ ملیں۔ اس کے علاوہ ان کے اتحاد کا نام ''پاکستان جمہوری اتحاد'' یکسر غیر معروف تھا۔ اسے متعارف کرانا بجائے خود ایک مسئلہ تھا۔ پی پی پی نے اپنے نام سے دستبردار ہو کر بہت بڑی غلطی کی کیونکہ وہ ایک مشہور نام تھا اور ووٹرز اس سے جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ پارٹی کو کئی دوسری مشکلات بھی درپیش تھیں۔ اس کے حالیہ دور حکومت کے دوران بدنظمی اور کرپشن کے جو کیس ہوئے وہ زبان زدِ عام تھے۔ بے نظیر اور ان کے ساتھیوں کے خلاف اعلیٰ عدالتوں میں نااہلی کے ریفرنس التوا میں پڑے تھے جو صدر غلام اسحاق کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ اسٹیبلشمنٹ بھی برطرف شدہ حکمران پارٹی کے خلاف تھی۔

ایسی صورتِ حال میں سی او پی کی کامیابی کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں تھی' خصوصاً مجھے سپیشل برانچ اور اس کے حقیقت پسندانہ تجزیہ سے استفادہ کرنے کی سہولت بھی میسر تھی۔ قومی اسمبلی کی 90 سیٹوں کی بابت

میری پیش گوئی بہت سے سیاستدانوں سرکاری حکام اور دانشوروں کے نزدیک بہت زیادہ رجائیت پسندانہ تھی' جب کہ مجھے اس بارے میں قطعاً کوئی شک نہیں تھا۔

بے نظیر حکومت کی برطرفی کے دو دن بعد ملک معراج خالد' سردار فاروق لغاری اور خواجہ طارق رحیم مجھ سے ملے' وہ صدارتی فرمان کو عدالت میں چیلنج کرنا چاہتے تھے اور اپنی کامیابی کے بارے میں پُراُمید تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ نواز شریف کو ان کا ساتھ دینے پر آمادہ کروں تاکہ اسمبلیوں کو عدلیہ کے ذریعے بحال کرایا جا سکے۔

''میں آپ کی تجویز نواز شریف کو کیسے پیش کر سکتا ہوں جبکہ یہ دو مختلف نوعیت کے کیس ہیں۔ پنجاب اسمبلی ان کے اپنے مشورہ پر توڑی گئی جب کہ قومی اسمبلی کو صدر نے تحلیل کیا ہے۔'' میں نے انہیں وضاحت سے بتایا۔

''ہم اس کی بابت بھی کچھ کریں گے۔'' طارق رحیم نے جواب دیا۔

تاہم یہ وضاحت نہیں کی کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا تھا۔

''افسوس کہ میں انہیں نامناسب مشورہ نہیں دے سکتا۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''میاں صاحب خود بھی خاصے ہوشیار ہیں۔ وہ اس کے مضمرات کو سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں سب سے بہتر یہ ہوگا کہ 24 اکتوبر کو ہونے والے الیکشن کو یقینی بنایا جائے۔ بہت سی قوتیں طرح طرح کے خوف اور وسوسے پھیلا رہی ہیں۔ آپ کو ان کی روک تھام کرنی چاہیے۔

انہیں میرے ٹھوس اور واضح خیالات پسند نہیں آئے۔ وہ ایک خود ساختہ دنیا میں رہ رہے تھے اور الیکشن کا سامنا کیے بغیر برسراقتدار آنا چاہتے تھے۔ ایسا محسوس ہوا گویا انہیں زمینی حقائق کا مکمل ادراک و شعور نہیں ہے۔

مارشل لا لگوانے کی کوشش

سراج منیر جو کہ نگران وزیراعظم غلام مصطفیٰ جتوئی کے عملہ میں شامل ہو چکے تھے۔ اپنا زیادہ تر وقت اسلام آباد کے ہالیڈے ان (موجودہ میریٹ) ہوٹل میں گزارتے تھے۔ میں ان سے ملنے گیا تو ان کے کمرہ میں کمپیوٹر اور کچھ عملہ مصروفِ کار دیکھا۔ وہ دفتری عملہ اور سامان ہونا چاہیے تھا۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ عزیز قریشی بھی اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں قیام پذیر تھے۔ حاجی قدر گل سابق ایم این اے

(فاٹا) بھی قریب ہی مقیم تھے۔ تھوڑی دیر بعد خواجہ خیر الدین بھی آ گئے جو پرائم منسٹر ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ بظاہر یہ گروپ اپنے اخراجات خود برداشت کر رہا تھا۔ لیکن ان کے پسِ پشت لازماً کسی کا ہاتھ ہوگا میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ کون تھا۔

وہ سب میرے دوست تھے‘ ان سب کی متفقہ رائے تھی کہ اگر الیکشن ہوئے تو ملک میں تباہی پھیل جائے گی۔ انہیں پختہ یقین تھا کہ پی پی پی پھر جیت جائے گی اور اس دفعہ انتقامی کارروائی کر کے فوج کو تہس نہس کر دے گی۔ ان کا خیال تھا کہ ملک کو انتخابات سے پہلے ہی خاصا نقصان پہنچ چکا ہے بلکہ 1970ء کے الیکشن کے نتیجہ میں دو ٹکڑے ہو چکا ہے۔ میں نے ان کے تجزیہ سے کھل کر اختلاف کیا۔ تاہم اس سوچ میں ڈوب گیا کہ یہ گروپ بے بنیاد شکوک پھیلا کر انتخابی عمل کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے۔

خواجہ خیر الدین نے کہا: ”آپ واحد آدمی ہیں جن کے خیال میں سی او پی جیت سکتی ہے۔ مجھے 1954ء کا اعادہ ہونے والا لگتا ہے جب مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ جیت گیا تھا۔ میں نے اس کی بابت پیش گوئی کی تھی مگر کمال اظفر کے والد نے جو چیف سیکرٹری تھے میری رائے سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ تم سارے بیورو کریٹس ایک جیسے ہو‘ ہمیں ایک مضبوط اور مستحکم حکومت درکار ہے جو ملک کا تحفظ کر سکے۔ سول حکومتیں ہمیشہ کمزور اور غیر مستحکم ہوتی ہیں۔ ہمیں صرف فوج بچا سکتی ہے۔“ دوسروں نے بڑے جوش و خروش سے ان کی تائید کی۔ مجھے ان کی باتیں سن کر زبردست دھچکا لگا۔ 1971ء میں مشرقی پاکستان کے اور 84-1983ء کے دوران سندھ کے خوفناک مناظر میری نگاہوں میں گردش کرنے لگے۔

میں نے دوٹوک الفاظ میں ان سے پوچھا

”کیا آپ مارشل لا لگوانا چاہتے ہیں؟“

”صرف یہی واحد حل ہے۔“ سراج منیر نے جواب دیا۔

میں نے انہیں 1971ء اور 1983ء کی صورتِ حال یاد دلائی پھر زور دے کر کہا: ”خدا کا شکر کریں ضیا نے 1985ء میں الیکشن کرا دیئے اور ملک بچ گیا۔ ملک کو الیکشن کرانے سے نہیں بلکہ نہ کرانے سے نقصان پہنچتا ہے۔ خدا کے واسطے حوصلہ کریں اور الیکشن لڑیں۔ پی پی پی کسی صورت نہیں جیت سکتی۔ اگر وہ جیت جائے تب بھی اسے حکومت کرنے کا موقع دینا مارشل لا کے نفاذ سے بہتر ہوگا۔

مگران پر میرے دلائل کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ شاید ان کا عرف میرے الفاظ سے زیادہ مضبوط تھا کہ ان کے ذہنوں کو نہیں بدل سکا۔ سراج نے آخر میں کہا: "یہ پی پی پی یا سی او پی کا سوال نہیں تمام سویلین ایک جیسے ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں ملک محفوظ نہیں ہوتا۔"

میں نے ارشد چوہدری سے اس گروپ کی سرگرمیوں کے بارے میں ذکر کیا تو انہوں نے کہا یہ "الیکشن روکو سیل" انتخابات کا راستہ بلاک کرنے میں سرگرمِ عمل لگتا ہے۔ چند دن بعد اس گروپ کی طرف سے تیار کردہ ایک مقالے کی نقل میرے ہاتھ لگ گئی جس میں مارشل لا کے نفاذ کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ میں نے وہ مقالہ ارشد چوہدری اور حاجی اکرم کو دکھانے کے بعد پنجاب کے چیف سیکرٹری انور زاہد کو دے دیا۔ چوہدری ارشد نے الیکشن کا راستہ روکنے کی سازش کو اخبارات کے ذریعے کامیابی سے بے نقاب کیا۔

قیاس آرائی کرنے والوں کی کایا پلٹ

ستمبر کے آخری ہفتہ میں مجھے (ریٹائرڈ) جنرل رفاقت کا فون موصول ہوا جو مجھ سے زیادہ واقف نہیں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ الطاف حسن قریشی اور زاہد ملک بھی ان کے پاس بیٹھے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے الیکشن کے نتائج کی بابت سوال کیا۔ جب میں نے اختصار کے ساتھ اپنا اندازہ پیش کیا تو انہیں یقین نہیں آیا۔ بہر حال انہوں نے الیکشن کے متعلق میرے علم، مطالعہ اور معلومات کو سراہا۔ الطاف قریشی نے انہیں الیکشن کی بابت میرے تخمینوں سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا تھا کہ 1988ء میں وہ بالکل درست ثابت ہوئے تھے۔

جنرل رفاقت، الطاف قریشی، زاہد ملک اور میں نے پنجاب سے الیکشن لڑنے والوں کی فہرست کا جائزہ لیا۔ پھر ہم ہر حلقے کا تجزیہ کرنے لگے۔ میرے پاس اعداد و شمار تھے جن کی بنیاد پر میں نے اپنے تخمینے مرتب کیے اور ہر حلقے میں ووٹرز کی تقسیم دکھائی تھی۔ طویل بحث کے بعد جنرل قائل ہو گئے کہ سی او پی پنجاب سے قومی اسمبلی کی 74 سیٹیں لازماً جیت لے گی۔ انہوں نے میری بتائی ہوئی تعداد 90 کو تسلیم نہیں کیا۔ ان کے بقول مختلف ایجنسیوں نے اس وقت تک انہیں جو مختلف تخمینے پیش وہ سب مایوس کن تھے۔ انہوں نے صدر کے سیکرٹری فضل الرحمٰن کے ساتھ گرین فون پر بات کی اور میرے تخمینہ کی بابت مطلع کیا اور کہا کہ انہیں بذاتِ خود اس بات کا یقین نہیں آیا کہ سی او پی پنجاب سے قومی اسمبلی کی 74 نشستیں حاصل کر لے گا۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ اس بارے میں صدر کو مطلع کر دیا جائے۔

بعدازاں وہ مجھے اپنے ساتھ فلیشمین ہوٹل (راولپنڈی) لے گئے تاکہ وہاں میں بہت سے نامی گرامی صحافیوں کو جن میں زیڈ اے سلہری' مجیب شامی' مصطفیٰ صادق' انقلاب ماتری اور محمد صلاح الدین شامل تھے' اپنے تخمینہ کی بابت بریف کرسکوں۔ وہ تیز بریفنگ چاہتے تھے' لیکن میں نے کہا کہ میں انہیں مبہم اور عام اندازوں پر مبنی تخمینہ نہیں دوں گا بلکہ ہر ہر حلقے کا اعداد و شمار کی روشنی میں تجزیہ پیش کروں گا۔ ان سے نتائج اخذ کرنا ان کا اپنا کام ہوگا۔ وہ ایک طویل نشست تھی۔ ان میں سے بعض کو میرے تخمینوں سے اتفاق نہیں تھا' اس لیے قیلولہ میں چلے گئے۔ بہرحال جب میں نے پوری تفصیلات پیش کیں تو زیادہ تر میرے تجزیے کے قائل ہو گئے۔

انقلاب ماتری نے سوال کیا:

''کیا آپ یہ سب کچھ پورے وثوق اور پختہ یقین سے کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں کیونکہ میں نے اعداد و شمار اور متعلقہ حقائق کا مطالعہ کرنے میں بڑی محنت کی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

اگلے دن مجھے ایوانِ صدر بلایا گیا۔ صدر کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر عجائب خان اور الیکشن کمشن کے سیکرٹری چوہدری شوکت علی نے میرے ساتھ طویل بات چیت کی تاکہ پنجاب میں مشکل حلقوں کا تجزیہ کیا جاسکے۔ میں نے کہا کہ پنجاب میں ایسے حلقے زیادہ نہیں ہیں۔ صرف جھنگ کا ایک حلقہ ہے جہاں سے عابدہ حسین کھڑی ہیں۔ چوہدری شوکت علی مایوس کن رائے رکھتے تھے' وہ محض اندازوں اور قیاس آرائیوں پر تکیہ کررہے تھے۔ ان کے پاس مکمل معلومات یا اعداد و شمار نہیں تھے۔ انہیں خود نواز شریف کے حلقہ کی بابت خدشات تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ سچائی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ بہرحال انہوں نے چند حلقوں کی نشاندہی کی جن پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ عام آدمی کی سطح پر محاذ آرائی اتنی شدید ہے کہ ان حلقوں کی بابت فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لوگ دو میں سے کسی ایک فریق کے حق میں ووٹ ڈالیں گے۔ آزاد یا مرغان بادنما اُمیدواروں کی کامیابی کا کوئی چانس نہیں۔

ان کے خیال میں اعجاز الحق کا حلقہ بھی اسی قسم کا تھا۔ جو اپنے باپ جنرل ضیاء کی موت کے بعد سیاست میں آئے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ تیسرے اُمیدوار ریاض حسین شاہ کو پڑنے والے ووٹ ضائع جائیں گے۔ جنہوں نے 1988ء میں 35 ہزار ووٹ لیے تھے۔ وہ ریاض شاہ کو دستبردار کرانا چاہتے

تھے۔ میرے نزدیک اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ بائیں بازو کی تنظیموں کے باعث انہیں بہت کم ووٹ پڑنے کی توقع تھی۔ وہ دستبردار نہیں ہوئے اور تین ہزار سے بھی کم ووٹ حاصل کر سکے۔ چوہدری شوکت علی کے خدشات کے برعکس نواز شریف اپنے تمام حلقوں سے خاصی لیڈ کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ بیگم عابدہ حسین مثبت رپورٹوں کے باوجود ہار گئیں۔

میں نے حاجی اکرم کے ہمراہ اجلال حیدر زیدی کے ساتھ طویل ملاقات کی' وہ بھی الیکشن کی نگرانی پر مامور تھے۔ میں نے اس سے پہلے ان کے ساتھ کبھی کام نہیں کیا تھا۔ تاہم میں نے انہیں انتہائی ذہین اور روشن دماغ پایا۔ جو سیاسی منظر کا قابلِ ستائش علم رکھتے تھے' تین دن کی بحث کے بعد وہ میرے تخمینوں کی درستی کے پوری طرح قائل ہو گئے۔ انہوں نے میرے خیالات پر اس قدر انحصار کیا کہ مجھے واپس لاہور جانے کی اجازت نہیں دی جب تک 24 اکتوبر کو الیکشن نہ ہو گئے۔

اقتدار کے ایوانوں میں اہم ترین افراد میں سے زیادہ تر کو اسمبلیوں کی تحلیل سے پہلے یقین ہو گیا تھا کہ پی پی پی میں کوئی جان نہیں رہی اور وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہے' تاہم جب ان کے جلوسوں کی بابت اس قسم کی رپورٹیں ملیں کہ ان میں بڑے بڑے ہجوم شرکت کر رہے ہیں تو وہ تصور ہوا ہو گیا۔ اب وہ نتیجہ کے بارے میں فکر مند اور شکوک میں مبتلا تھے۔ یہ چیز بڑی افسوسناک تھی کہ بڑے بڑے بیوروکریٹس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے اور انہیں عوام کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ اپنی پُرفریب دنیا میں رہتے تھے' بایں ہمہ خود کو لوگوں کے بارے میں فیصلے کرنے کا اہل سمجھتے تھے۔ ہالیڈے ان میں سرگرم عمل ''الیکشن روکو سیل'' کے ارکان بھی انہیں ڈرانے اور اعصابی خلل میں مبتلا کرنے کا سبب بن رہے تھے۔ البتہ اجلال حیدر زیدی نے لوگوں کو الیکشن کا سامنا کرنے کے لیے سب سے زیادہ حوصلہ دیا۔

الطاف قریشی نے مجھے بعد میں بتایا کہ مجھے پیش گوئیاں کرنے والوں کی دنیا میں کیسے شامل کیا گیا۔ انہوں نے صدر غلام اسحاق خان اور جنرل اسلم بیگ سے ملاقات کی اور ان دونوں کو الیکشن کے نتائج کی بابت بہت زیادہ پریشان اور فکر مند پایا۔ جب انہوں نے صورتِ حال کو بے حد مایوس کن دیکھا تو تجویز پیش کی کہ چوہدری سردار محمد سے تبادلہ خیال کیا جائے کیونکہ ان کے بقول میرے پاس زیادہ صحیح اور مثبت تصویر ہوتی ہے۔ ''یوں آپ کو وہاں بلایا گیا۔'' انہوں نے انکشاف کیا۔ میں اس بات پر خوش تھا کہ میں نے انہیں سیاسی راستے پر قائم رہنے کے لیے حوصلہ دیا۔ میں نے ان کے بے بنیاد خدشات اور وسوسے بڑی حد

تک دور کر دیے۔ ورنہ میں یہ سوچ کر ہی لرز جاتا ہوں کہ ناکامی کے عالم میں خدا جانے وہ کیا گزرتے۔ ممکن ہے ہالیڈے ان میں سرگرم سیل والے اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتے۔

''سب کو ساتھ لے کر چلو''

الیکشن کے نتائج نے میرے تخمینوں کے سو فیصد درست ہونے کی توثیق کر دی۔ سی او پی نے پنجاب میں میری پیش گوئی کے مطابق واقعی 90 سے بھی زیادہ نشستیں حاصل کر لیں۔ انتظامیہ اور حکومت کا اثر و رسوخ بھی ان کے کام آیا' تاہم نتائج میں کوئی قابلِ اعتراض گڑبڑ یا دھاندلی نہیں کی گئی۔ سارا کمال ''ون ٹو ون'' فارمولے کا تھا۔

رائے شماری کے دن میری نواز شریف سے دوپہر کے وقت ایئر پورٹ پر ملاقات ہوئی' وہ حاجی اکرم کے ساتھ فیصل آباد جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر تخمینہ کی بابت پوچھا۔ میں نے وہی جواب دیا جو پیشتر ازیں بتا چکا تھا۔ میں بالکل مطمئن تھا اور میں نے ایک پیشہ ور کے طور پر حساب لگا کر جواب دیا تھا۔ تاہم وہ اب بھی شکوک و شبہات میں مبتلا تھے۔ وہ ایک فطری بات تھی کیونکہ انہیں بیک وقت بہت سے محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا۔

رات کو نتائج آنے شروع ہوئے تو نواز شریف سی او پی کی حیرت انگیز کامیابی دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑے۔ کسی شخص سے فون پر بات کرتے ہوئے ان کے منہ سے نکل گیا کہ مسلم لیگ کسی دوسری جماعت کی حمایت کے بغیر حکومت بنا سکتی ہے۔ حاجی اکرم نے مداخلت کرتے ہوئے فوراً تصحیح کی کہ ''اس کامیابی میں آئی جے آئی اور سی او پی کی ہر پارٹی نے کردار ادا کیا ہے۔ آپ کوئی ایسی بات نہ کہیں جس سے اتحاد میں رخنہ پڑ جائے۔ اگر آپ کامیاب وزیر اعظم اور قومی رہنما بننا چاہتے ہیں تو ان سب کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔'' انہوں نے وضاحت کی۔ میاں صاحب بات کو سمجھ گئے۔ تاہم یہ بات پریشان کن تھی کہ ان کا ذہن کس طرح کام کر رہا تھا۔ بعد میں ان کے بعض تنگ نظر دوستوں اور غیر سیاسی عناصر نے انہیں اتحادیوں سے الگ کر دیا جو آخرِ کار ان کے زوال کا سبب بن گیا۔

میں نے روئداد خاں' اجلال حیدر زیدی اور جنرل رفاقت سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہارنے والا فریق نتائج کو تسلیم نہیں کرے گا۔ اس کی چند وجوہ ہیں۔ ''پہلی بات یہ کہ ہمارے ملک میں شروع سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ الیکشن میں شکست کو حوصلہ کے ساتھ قبول نہیں کیا جاتا۔ دوسرے پریس عوام کے

موڈ کو صحیح طور پر اُجاگر کرنے میں ناکام رہا جس نے نتائج کو غیر متوقع بنادیا ہے۔" میں نے تجویز کیا کہ سی او پی کو اپنی فتح پر کھل کر خوشی منانی چاہیے۔ عوام اپنے فیصلہ کی حقیقت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکیں گے۔ جب تک خوشی کے ذریعے اس کا اظہار نہ کیا جائے۔

حاجی اکرم نے بھی نواز شریف کو ایسا ہی مشورہ دیا۔ میاں صاحب نے شکرانہ کے نفل ادا کرنے کی غرض سے بادشاہی مسجد جانے کا فیصلہ کیا۔ بریگیڈیئر امتیاز اور بعض ڈرپوک بیوروکریٹس کی رائے تھی کہ اعلانیہ خوشی نہ منائی جائے۔ انہیں ڈر تھا کہ اس طرح مخالفین کا ردِ عمل زیادہ سخت ہوگا۔ وہ سیاسی شعور سے بے بہرہ تھے۔ اس مسرت میں جو تاخیر ہوئی' حریفوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے آہستہ آہستہ الیکشن کے صاف وشفاف ہونے کی بابت شکوک پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ اگر عوام میں وسیع پیمانہ پر اظہار مسرت کیا جاتا تو 1993ء میں جو ناخوشگوار واقعات رونما ہوئے' شاید ظہور پذیر نہ ہوتے۔

1993ء کے "شفاف الیکشن" حقیقت میں 1990ء کے الیکشن کی مثبت توثیق تھے۔ اگر سی او پی متحد رہتا اور 1993ء میں بھی ون ٹو ون فارمولے پر عمل کرتا تو یقیناً 1990ء جیسے نتائج نکلتے۔ میں نے 1987ء' 1988ء اور 1990ء میں جو تخمینے پیش کیے تھے 1993ء کے انتخابی نتائج نے ان کی توثیق کر دی۔

سی او پی کو خصوصاً پنجاب سے بھاری مینڈیٹ ملنے پر نواز شریف کا وزیر اعظم بننا یقینی ہو گیا تھا۔ نگران وزیر اعظم نے جو خود بھی سندھ اور سیالکوٹ سے منتخب ہو گئے تھے' قومی اسمبلی میں میاں صاحب کا نام تجویز کیا۔ سابق وزیر اعظم اور مسلم لیگ کے صدر محمد خان جونیجو نے تائید کی۔ وہ ایک عظیم اور تاریخی دن تھا جب ایک ہر دلعزیز سیاستدان کو ایوان کی بھاری اکثریت نے اپنا قائد منتخب کیا اور پورے ملک سے اس کی زبردست تائید کی گئی۔ سیاسی عمل شروع ہونے سے سات برس بھی کم عرصہ میں پرانے زخم مندمل ہو گئے تھے۔ 1983ء میں جتوئی کی والدہ نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے "پنجابی فوج مردہ باد" کے نعرے لگائے تھے اور اب جتوئی بذاتِ خود ایک پنجابی کا نام بلند ترین منصب کے لیے تجویز کر رہے تھے۔ جس کی تائید سندھ سے تعلق رکھنے والے ایک اور سندھی سابق وزیر اعظم کی طرف سے کی گئی۔ میرا ہمیشہ سے پختہ یقین ہے کہ پنجاب کا سیاسی چہرہ اس کے کرخت فوجی چہرہ سے کہیں زیادہ حسین و پرکشش ہے۔ ہم 1971ء کی ذلت ورسوائی سے بچ سکتے تھے اگر اس وقت ملک میں کسی سیاستدان کی

حکومت ہوتی۔



باب33

کرپشن ختم نہ کرنے کی تراکیب

کرپشن کا خاتمہ ہمیشہ عوام کے اہم مطالبات میں سے ایک مطالبہ اور اپوزیشن کے بلند آہنگ نعروں میں سے ایک نعرہ رہا ہے۔ لیکن جب حکمران کرپٹ افسروں کا احتساب کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو کیا صورتحال پیش آتی ہے؟ ایسے افسروں کی فہرستیں کیسے تیار کی جاتی ہیں؟ ثبوت کیسے حاصل کیے جاتے ہیں؟ حکمرانوں کے اصل مقاصد کیا ہوتے ہیں؟ آخر میں نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اس سلسلے میں چند واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ ایوب 'یحییٰ' بھٹو اور ضیا کے دورِ حکومت میں پسِ پردہ کیا ہوتا رہا۔

احتساب کا سلسلہ ایوب خان کے دور سے شروع ہوا جب اولین اہم آپریشن کیا گیا اور بعض انتہائی نمایاں سرکاری ملازمین' جو اپنی دیانتداری کے لیے مشہور تھے' کرپشن کے الزام میں ملازمت سے نکال دیئے گئے۔ متاثرین میں سے زیادہ تر وہ تھے جو کسی نہ کسی طرح جرنیلوں کو خوش کرنے میں ناکام رہے' ڈاکٹر عبدالرحیم (معروف ماہرِ زراعت) نے مجھے اس اذیت کی بابت بتایا جو تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے چیئرمین ظفر الحسن کو جنرل محمد اعظم خاں کے ہاتھوں اٹھانی پڑی۔ اعظم خاں پہلے جنرل تھے جنھوں نے 1953ء میں مرزائیوں کے خلاف تحریک کی سرکوبی کے لیے لاہور میں مارشل لا کے اختیارات کا مزہ چکھا تھا۔

جنرل صاحب چاہتے تھے کہ انہیں تھل کے علاقہ میں ٹیوب ویل اسکیم کے تحت 250 ایکڑ زمین الاٹ کر دی جائے۔ مذکورہ اسکیم کا تقاضا تھا کہ زمین ان لوگوں کو الاٹ کی جائے جو ٹیوب ویل لگانے کے خواہاں ہوں اور ٹیوب ویل کے لیے مالی امداد ان کو ملے گی جو پہلے سے زرعی اراضی کے مالک ہوں۔ یعنی درخواست دہندہ کے پاس دونوں میں سے کسی ایک چیز کا ہونا لازمی تھا۔ جبکہ جنرل صاحب کے پاس نہ زمین تھی' نہ ہی وہ ٹیوب ویل لگانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کے باوجود ان کی خواہش تھی کہ سرکاری زمین الاٹ کر کے مالی امداد فراہم کی جائے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ یہ فراڈ کے مترادف ہوگا تو وہ غصے میں

بڑبڑ کرتے اٹھ کر چلے گئے۔ان کے مرکزی وزیر بنے پر ظفر الحسن کی شامت آ گئی۔

ظفر بڑے دور اندیش اور صاحبِ بصیرت آدمی تھے۔قومی ایئر لائن (پی آئی اے) کا قیام‘ لاہور میں گلبرگ اور سمن آباد کی ہاؤسنگ سکیمیں‘ جوہر آباد کی منصوبہ بندی اور صحرائے تھل کی آبادکاری کے منصوبے انہی کے ذہنِ رسا کی تخلیق تھے۔ظفر کو سرکاری حلقوں میں اس قدر عزت واحترام حاصل تھا کہ جب انہیں برطرف کیا گیا تو میں نے اپنے سسر میاں شفیع کو زندگی میں پہلی بار سسکیاں بھرتے دیکھا۔ انہوں نے اسے شرافت وصلاحیت کا قتل اور بدترین درجہ کی ناانصافی قرار دیا۔

303افسران کی چھانٹی

یحییٰ خان کے دور میں لاہور کے مارشل لا ہیڈ کوارٹرز میں کرنل قیوم سرکاری ملازمین کے خلاف کرپشن کے مقدمات ہینڈل کرتے تھے۔کرپٹ افسران کی ایک فہرست تیار کی گئی جس میں 303افسران کے نام شامل تھے۔’’303‘‘ کا عدد عام لوگوں کے لیے بڑا پُرکشش تھا کیونکہ یہ انتہائی مقبول رائفل کا نام ہے جوان دنوں بڑا مہلک ہتھیار سمجھی جاتی تھی۔ڈی ایس پی صباح الدین جامی اور انٹی کرپشن کے قمرالاسلام (بعد میں وہ دونوں آئی جی بنے) ہمیشہ کرنل کے پاس موجود رہتے اور جب بھی اس کی طرف سے سخت الفاظ میں جھاڑ پڑتی یا ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی‘ وہ خوفزدہ ہو کر میرے کمرے کی طرف بھاگتے۔کرنل کی خواہش تھی کہ جن کے نام فہرست میں موجود ہیں‘ ان سب کو سزا ملنی چاہیے۔سزا دینے کے لیے گواہوں اور ثبوت کی ضرورت تھی۔کرنل کا اصرار تھا کہ اگر شہادت موجود نہیں تب بھی کہیں نہ کہیں سے حاصل کی جائے۔

حاجی حبیب الرحمٰن ایس ایس پی لاہور کا نام بھی مذکورہ فہرست میں شامل تھا‘ ان کے خلاف الزامات میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے کسی ٹھیکیدار سے ریت کے دو ٹرک مفت لیے تھے۔یہ ایک مضحکہ خیز الزام تھا لیکن بیوروکریسی اور لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے اس کا سہارا لیا گیا۔

مجھے ایک اعلیٰ سطح کے اجلاس میں شرکت کا موقع ملا جس میں بریگیڈیئر شیر باز موجود تھے۔اس میں 303افسروں کا مسئلہ زیرِ بحث آیا۔ہر شخص نے اس بات پر زور دیا کہ زیادہ سے زیادہ ثبوت اکٹھے کیے جائیں۔

’’کیا فہرست کسی ثبوت کے بغیر تیار کی گئی تھی؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’یہ انٹیلی جنس رپورٹوں کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے۔تائیدی شہادتیں بعد میں جمع کی جائیں گی۔‘‘

مجھے بتایا گیا۔

''ایسی صورت میں جب تک شہادتیں حاصل نہ کر لی جاتیں اس کا اعلان نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے رائے ظاہر کی۔

''یہ صدر کا حکم ہے، جس پر بحث نہیں ہو سکتی۔ پولیس افسروں سے ثبوت فراہم کرنے کو کہا گیا ہے۔ بصورتِ دیگر انہیں نااہل قرار دے کر برطرف کر دیا جائے گا۔''

''یہ تو پولیس اور 303 افسران دونوں کے ساتھ زیادتی ہو گی۔'' میں نے احتجاج کیا مگر بے فائدہ۔

''بریگیڈیئر شیر باز نے چائے کے وقفہ کے دوران کہا کہ میرا موقف غلط ہے یہ کہ ان 303 افسروں کو لازماً برطرف کرنا اور جیل بھیجنا چاہیے خواہ ان کے خلاف ثبوت موجود ہے یا نہیں۔

''لیکن کیوں؟''

''فہرست کا اعلان ہونے کے بعد یہ افسر زخمی سانپ بن گئے ہیں۔ اگر آپ ان کا سر نہیں کچلتے تو وہ آپ پر حملہ کر دیں گے۔ ان کے زہریلے پھن فوراً کھینچ لیں، ورنہ ڈنگ مارنے سے باز نہیں آئیں گے۔'' انہوں نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ سراسر زیادتی ہے۔ انصاف کسی ترغیب و ترہیب کے بغیر ہونا چاہیے۔'' میں نے اپنے موقف پر اصرار کیا۔

بریگیڈیئر شیر باز اور کرنل قیوم میرے دلائل کا توڑ نہیں کر سکے تو خفا ہو گئے اور زچ ہو کر کہنے لگے: ''سردار تمہارا نام بھی اس فہرست میں ہونا چاہیے تھا۔'' یہ سن کر میں ڈر گیا اور بحث بند کر دی۔ میں نے اس واقعہ کا اپنے ایک وکیل دوست سے ذکر کیا تو وہ بولے ''تم بیوقوف لگتے ہو۔ انصاف اور مارشل لا اکٹھے نہیں چل سکتے۔ مارشل لا دباؤ ڈالنے کے لیے ہوتا ہے، انصاف کرنے کے لیے نہیں۔ بل ڈوزر اور انصاف کا ترازو دو مختلف چیزیں ہیں۔'' ان کی بات سچائی سے یکسر خالی نہیں تھی۔

میں نے ہر طرف خوف و ہراس محسوس کیا۔ اختیار کے سامنے دانش کسی کام نہیں آتی اور یہاں تو اختیار مطلق تھا۔ عقل و دانش سے یکسر عاری۔ انصاف کے ترازو کے مقابلے میں بلڈوزر بہت بھاری تھا۔ آخرِ کار 303 افسروں کی چھٹی کرادی گئی تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور وہ انتہائی تابع فرمان ملازم بن

جائیں۔ مارشل لا ہیڈکوارٹرز کے بریگیڈیئر ایم ایم مصطفیٰ کے بقول ''وہ ڈسپلن کی پہلی خوراک تھی۔''

بعدازاں مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ حاجی حبیب الرحمٰن کو دو ٹرک ریت مفت لینے کے الزام میں بری کر دیا گیا تھا۔

بھٹو دور میں 1300 افسروں پر کیا گزری؟

فوجی حکومت کی غلطیوں سے کوئی سبق نہ سیکھتے ہوئے پی پی پی کی قیادت نے بھی تباہ کن ہمالیائی غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ ایک دن بھٹو کے ساتھ راولپنڈی سے لاڑکانہ کو پرواز کے دوران میں نے رفیع رضا اور خالد حسن کو ایک تقریر تیار کرتے ہوئے دیکھا جو وفاقی وزیر غلام مصطفیٰ جتوئی کو کرنی تھی اور اس میں 1300 کرپٹ افسروں کی برطرفی کا اعلان کرنا تھا۔ جتوئی بھی ان کے ہمراہ سفر کر رہے تھے۔

مجھے معلوم تھا کہ سرکاری ملازمین کرپشن کے خلاف سرکاری اعلانات کے باعث بے حد خوفزدہ اور سہمے ہوئے تھے۔ یحییٰ خان کی طرف سے 303 افسروں کے خلاف جو کارروائی کی گئی اس کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور اس نے ان کے اعتماد کو متزلزل کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے ایک بار پھر عقل و دانش کی حمایت میں بولنے کا فیصلہ کر لیا۔

''اگر آپ واقعی بکھرے ہوئے اجزا کو یکجا کرنا چاہتے ہیں تو اس اقدام کو واپس لے لیں اور اداروں کو مضبوط کرنے کی کوشش کریں۔'' میں نے رفیع رضا اور خالد حسن سے کہا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گیا۔ رفیع رضا نے بھٹو سے بات کی۔ وہ بھی تقریباً راضی ہو گئے تاہم کہنے لگے کہ اس معاملے پر کھر سے بھی بات کر لینے دیں۔ لاہور میں مختصر قیام کے دوران گورنر ہاؤس میں اس موضوع پر بحث ہوئی۔ مصطفیٰ کھر نے کہا: ''ہم نے عوام سے وعدہ کیا تھا کرپٹ افسروں کے خلاف کارروائی کریں گے۔'' وہ ان افسروں کو برطرف کر کے ان پر مارشل لا کے تحت مقدمات چلانا چاہتے تھے۔ سوئے اتفاق سے اس وقت ملک میں مارشل لا نافذ تھا اور بھٹو ملک کے پہلے اور تاریخ کے واحد سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

مسئلہ پر طویل بحث کے بعد وہ ازراہ خدا ترسی ''بدعنوان'' افسروں کو ریٹائر کرنے اور صرف ایسے ملازمین کے خلاف کارروائی کرنے پر آمادہ ہو گئے جن کے خلاف شہادت موجود تھی۔ وقار احمد جو اسٹیبلشمنٹ سیکرٹری بنے' ان افسروں میں سے ایک تھے۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر رہے کہ عدم تحفظ جتنا زیادہ ہوگا'

اختیارات کو اپنے ذاتی مفاد اور مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے غلط استعمال کرنے کی ترغیب اسی قدر مضبوط ہوگی۔

ان 1300 ملازمین کو جبری طور پر قبل از وقت گھر بھیج دیا گیا۔ یہ قدم بڑی جلد بازی میں اٹھایا گیا چنانچہ فہرست میں بعض ایسے لوگوں کے نام بھی شامل تھے جو پہلے ہی ریٹائر ہو چکے تھے بلکہ ان میں سے بعض قبروں میں ابدی نیند سو رہے تھے۔ میرے سابق باس ڈی آئی جی قاضی محمد اعظم بھی' جو ایک دیانتدار پولیس افسر تھے' ان میں سے ایک تھے۔ اسی طرح میرے قریبی دوست ناصر حسین شمسی بھی جن کا تعلق محکمہ انکم ٹیکس سے تھا' ناحق مارے گئے۔ اس معاملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بی بی سی کے نمائندہ نے بالکل درست کہا تھا کہ: ''ایوب خان نے 100 افسر نکالے تھے۔ یحیٰی خان نے 300 اور اب بھٹو نے 1300 کی چھٹی کر دی ہے۔ لگتا ہے کہ پاکستان میں کرپشن نے اسی نسبت سے فروغ پایا ہے۔''

جنرل اسحاق بھٹو کے ملٹری سیکرٹری نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ اس اقدام کا مقصد دباؤ ڈالنا' افسروں کو خوفزدہ کرنا اور پی پی پی کے مخالف ملازمین سے چھٹکارا پانا ہے تاکہ آئندہ دوسرے بھی مخالفت کی جرأت نہ کریں۔

ضیا نے کمیشن کو کھلی چھٹی دے دی

جنرل ضیا نے سرکاری ملازمتوں میں کرپشن کی روک تھام کے لیے ایک وفاقی معائنہ کمیشن تشکیل دیا۔ میجر جنرل صغیر حسین شاہ اس کے پہلے چیئرمین تھے جبکہ بریگیڈیئر صابر اور نعیم' کرنل سرور نیز دو پولیس افسر نواز سواتی اور خواجہ طفیل ارکان میں شامل تھے۔ مجھے پاکستان نارکوٹکس کنٹرول بورڈ میں اپنے کام کے ساتھ ساتھ اس کمیشن کا رکن بھی نامزد کر دیا گیا۔ جنرل نے افتتاحی اجلاس سے خطاب کیا اور بتایا کہ ''آپ کو کسی بھی شخص کے خلاف کسی بھی سطح پر کارروائی کرنے کے پورے اختیارات حاصل ہیں۔ آپ کسی شخص کو سزا دینے' جیل بھیجنے اور جسے چاہیں برطرف کرنے کے پوری طرح مجاز ہوں گے۔ کوئی فائل یا ریکارڈ مرتب کرنے کی ضرورت نہیں' آپ کا ذاتی اطمینان کافی ہے۔''

مجھے اس بات سے زبردست دھچکا لگا کہ کمیشن کو آئین و قانون سے بالاتر مکمل فری ہینڈ دے دیا گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یحیٰی دور میں 303 افسران کے کیس کس طرح نمٹائے گئے اور اس بھونڈے طریقہ

سے بھی واقف تھا جسے استعمال کرتے ہوئے جنرل ضیا نے 1300 افسروں کی چھٹی کردی تھی۔ اس سے سرکاری ملازمین کے مورال اور کارکردگی پر بہت ہی منفی اثرات مرتب ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ کرپشن میں کمی کی بجائے اضافہ ہوگیا۔ میں نے ملازمین کو خوفزدہ کرنے کے بہت سے ڈرامے دیکھے اور موجودہ ڈراما سب سے زیادہ مضحکہ خیز لگتا تھا کیونکہ ہمیں کسی ذمہ داری کے بغیر لامحدود اختیارات تفویض کردیئے گئے۔ اختیارات اور ذمہ داری کے مابین توازن اچھی انتظامیہ کا بنیادی اصول ہے۔ مگر یہاں اس توازن کو درہم برہم کردیا گیا۔

میں سرکاری ملازمین کے متعلق ایسا غیر سنجیدہ اندازِ فکر اپنانے پر بے حد پریشان تھا جب کہ دیگر ارکان لامحدود اختیارات ملنے پر انتہائی خوش تھے۔ میں نے اپنے خدشات کا نواز سواتی سے ذکر کیا جو ڈی آئی جی لیول کے پولیس افسر تھے۔ انہوں نے میرے خیالات پر برہمی کا اظہار کیا۔ پھر ازراہِ التفات کہنے لگے: ''آپ عجیب آدمی ہیں، وسیع اختیارات کی تفویض کو خطرناک سمجھ رہے ہیں۔ اس قدر اہمیت حاصل ہونے پر آپ کو خوش ہونا چاہیے۔''

میں ان دنوں اسلام آباد کے گورنمنٹ ہوسٹل میں مقیم تھا۔ خواجہ طفیل بھی میرے ساتھ تھے۔ ہم ایوانِ صدر (راولپنڈی) سے اکٹھے واپس آئے۔ انہیں میرے خیالات سے اتفاق نہیں تھا۔

''تم ایک فلاسفر ہو اور ایسا کوئی فلسفہ دستیاب نہیں جو بگڑے معاملات کو درست کرسکے، صرف ڈنڈا ہی کرپشن کی بیخ کنی کرسکتا ہے۔'' انہوں نے خیال ظاہر کیا۔

ڈنڈے کے بلا سوچے سمجھے اور زوردار استعمال کا مطلب ہوگا کہ مزید کرپشن پھیل گئی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مطلق اختیار آدمی کو مکمل کرپٹ بنا دیتا ہے۔ پہلا کام جو آپ کو کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اپنے آئی جی کو برطرف کردیں۔ اسے اٹھا کر اس کے دفتر سے باہر پھینک دیں۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ لوگ زور زور سے تالیاں بجائیں گے۔'' وہ میری بات نہیں سمجھے۔ ان کے نزدیک میں سنہالی زبان میں بات کررہا تھا۔

انعام الحق اور ڈی آئی جی خالد مسعود بھی ہوسٹل میں قیام پذیر تھے۔ انہیں ان اختیارات کی بابت جو جنرل ضیا نے کمیشن کو دیئے تھے، جان کر بیحد حیرت ہوئی۔

''ان اختیارت کے ساتھ میں پہلا کام یہ کرنا چاہوں گا کہ تم دونوں کو فوری طور پر برطرف کردوں اور مطلوبہ خوف وہراس پیدا کروں۔'' میں نے مذاق میں کہا۔ وہ مسکرانے کی بجائے سنجیدہ ہوگئے۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ بااختیار آدمی کا مذاق بھی اس کے قریبی دوستوں کو اس طرح خوفزدہ کرسکتا ہے۔

''چھوڑو یار۔ میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔'' میں نے شرمیلے پن سے کہا۔ اگر محض مذاق قریبی دوستوں کو پریشان کر سکتا ہے تو ان غریبوں کا کیا حال ہوگا جنہیں کمیشن کے انتہائی با اختیار ارکان جانتے بھی نہیں اور ان کے خلاف کارروائی پر کمر بستہ ہیں۔

میں نے انعام اور خالد سے درخواست کی کہ کمیشن کے لیے واضح قانونی اختیارات اور پابندیوں کے ساتھ فرائض کا چارٹر مرتب کرنے میں میری مدد کریں۔ اہم نکات جو ذہن میں ابھرے وہ یہ تھے کہ کمیشن خود کو دیگر امور کے علاوہ (الف) وفاق سے تعلق رکھنے والے امور (ب) انتظامی اختیارات اور (ج) ان تنازعات تک محدود رکھے جو عدالتوں میں زیرِ سماعت نہ ہوں۔

اس کا بڑا اثر ہوگا

اگلے دن میں نے جنرل صغیر سے پوچھا۔ آیا ہم فوج کے شعبہ آرڈیننس اور سپلائی کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتے ہیں' کہا جاتا ہے کہ وہاں کرپشن بڑے زوروں پر ہے؟

''نہیں ہرگز نہیں''۔ انہوں نے چلا کر کہا۔

''کیوں نہیں؟ شاید ہم سویلین ایسا نہ کر سکیں لیکن بحیثیت جرنیل آپ یقیناً ایسا کر سکتے ہیں۔ ورنہ اسے امتیازی سلوک سمجھا جائے گا۔'' میں نے انہیں الجھن میں ڈال دیا اور وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

اسی روز ایک انکم ٹیکس کمشنر ان کے پاس آیا جو چھ وفاقی سیکرٹریوں کے خلاف انکم ٹیکس چوری کے ثبوت لایا تھا۔ جنرل نے مجھے بلایا۔ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو ان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

''تیار ہو جاؤ' ہمیں ایک بہت اچھا کیس مل گیا ہے۔ ہم آج ہی کارروائی کی ابتدا کریں گے اور پورا ملک کانپ اُٹھے گا۔ اس کا یقیناً اچھا اثر ہوگا۔''

ان کی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا۔ جنرل صاحب کافی پی رہے تھے۔ میں نے درخواست کی کہ میرے لیے بھی کافی منگوائیں کیونکہ میں درمیانی عرصہ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ انہوں نے گھنٹی بجائی۔

''کیا میں ان سیکرٹریوں کے نام پوچھ سکتا ہوں' اگر معاملہ خفیہ نہ ہو تو؟'' میں نے استفہامیہ انداز میں دریافت کیا۔ دوسروں کے علاوہ انہوں نے آفتاب احمد خاں سیکرٹری اقتصادی امور' ایف کے بندیال' سیکرٹری محنت اور ان کے پیشرو اسلم عبداللہ کا نام لیا۔

''نادہندگان نے جو چوری کی اس کی مالیت کتنی ہے؟ اگر آپ کے پاس اعداد و شمار ہیں تو براہ کرم ان سے مطلع فرمائیں۔'' میں نے خود کو تعاون پر آمادہ ظاہر کرتے ہوئے دریافت کیا۔ انہوں نے انٹر کام پر بریگیڈیئر صابر سے اعداد و شمار معلوم کیے جو چند ہزار روپے تک تھے اور آفتاب احمد خان کے ذمے تو محض 27 روپے تھے۔

اس سے میرے ذہن میں ایک نکتہ آیا۔ آفتاب احمد خاں اس روز پیرس میں تھے اور پاکستان کو امداد دینے والے کنسورشیم کے چیئرمین کے ساتھ مذاکرات کر رہے تھے۔ جنرل کو ان کی بابت آگاہ کرنے کے بعد میں نے ان سے سوال کیا: ''سر کیا آپ محض 27 روپوں کے لیے آفتاب احمد خان کو برطرف کر کے پاکستان کو عالمی برادری کے سامنے رسوا کرنا چاہتے ہیں؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ انکم ٹیکس کے اس پاگل افسر کو کس چیز نے آپ کے پاس آنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے آخری جملہ بڑا زور دے کر ادا کیا۔

جنرل صغیر اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی کرسی سے اٹھے اور مجھے بڑی گرمجوشی کے ساتھ سینے سے لگا لیا۔

''آپ کا بے حد شکریہ سردار''۔ انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''یہ قدم انتہائی تباہ کن ثابت ہوتا۔ ان میں سے اکثر میرے دوست ہیں۔ میں جنرل ضیاالحق کی حکومت کا دھڑن تختہ کر دیتا۔ تم نے ہم سب کو بچا لیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' انہوں نے بریگیڈیئر صابر کو حکم دیا کہ سارے معاملہ پر کارروائی ملتوی کر دی جائے۔

''سردار کیا تمہیں معلوم ہے میں نے اپنی انکم ٹیکس ریٹرن کا کبھی مطالعہ نہیں کیا۔ میرا پی اے جو کچھ میرے سامنے رکھ دیتا ہے۔ یہ چیز ان سینئر افسروں کے معاملہ میں بھی یقیناً درست ہوگی جو قومی معاملات میں الجھے رہتے ہیں۔ مجھے واقعی بے حد افسوس ہے۔ میں بہت سنگین غلطی کرنے لگا تھا۔''

''ہر وہ کام اچھا ہے جس کا انجام اچھا ہو سر'' میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

میں جنرل کے دفتر سے نکل کر چنگھاڑتے ہوئے بھیڑیوں کے غار میں گھس گیا۔ دوسرے تمام ارکان فوجی بھی اور سویلین بھی مجھ پر برس پڑے کہ میں نے اتنا اچھا شکار کھو دیا۔ انہوں نے مجھے بات ہی نہیں کرنے دی۔ کرنل سرور نے تو مجھے ''بیوروکریسی کا ایجنٹ'' بنا دیا۔ میں نے سخت احتجاج کرتے ہوئے وضاحت کی کہ میں ''کسی کا ایجنٹ نہیں ہوں۔ میں خود ایک بیوروکریٹ ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔'' یہ کہتے

ہوئے میں باہر نکل گیا۔

مجھے اس وقت بہت دکھ ہوا جب نواز سواتی جیسے سینئر افسر نے جو بصورتِ دیگر ایماندار شخص تھے' مجھ پر ضیا کی ساری اسکیم غارت کرنے کا الزام لگایا۔ وہ چاہتے تو میرے خلاف تخریب کاری کا کیس بنا کر اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ جہاں روک تھام اور توازن نہ ہو اور لامحدود اختیارات چند ہاتھوں میں مرتکز ہو گئے ہوں۔ وہاں ہر بات ممکن ہوتی ہے۔ میں محض توازن پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ان سے کہا "سر انصاف پر مبنی معاملہ ہی بہتر معاملہ ہوتا ہے۔ ہم پر اپنے رفقائے کار اور عوام کی طرف سے یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔" وہ میری بات سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔

انعام الحق' خالد مسعود اور میں نے مل کر وفاقی کمیشن کے لیے 9 صفحات پر مشتمل فرائض کا چارٹر مرتب کیا اور جنرل صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انہوں نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور منظور کر کے ڈی او لیٹر کے ساتھ جنرل کے ایم عارف کو بھیج دیا تاکہ سی ایم ایل اے ہیڈ کوارٹرز سے حتمی منظوری لی جا سکے۔ میرے مسودہ کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اختیار کر کے مارشل لا ریگولیشن کے طور پر نافذ کر دیا گیا۔ جس کی رو سے کمیشن کو مشاورتی ادارہ بنا دیا گیا جو چھان بین اور شہادت جمع کرنے کے بعد محض یہ سفارش کر سکتا تھا کہ حاکم مجاز ضروری کارروائی کرے۔

پولیس افسران کے ستارے گردش میں

ضیا کے دورِ حکومت میں پنجاب پولیس کا ستارہ ہمیشہ گردش میں رہا۔ حاجی حبیب الرحمٰن کو پی پی پی کے خودسوزی کرنے والے مظاہرین کے لیے نرم گوشہ رکھنے پر آئی جی کی پوسٹ سے ہٹا کر ان کی جگہ قاضی محمد اعظم کو لگا دیا گیا۔ قاضی اعظم کو ترجیح دینے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انہیں پی پی پی سے ذاتی پرخاش تھی کیونکہ بھٹو نے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد انہیں گھر بھیج دیا تھا۔ قاضی اعظم نے پی پی پی والوں سے بدلہ لینے کے لیے پولیس کے 18 افسروں کا جبری ریٹائرمنٹ کے لیے چناؤ کیا۔ اس فہرست میں میاں سلطان اصغر' ذکاء الدین شفیع' مشتاق بخاری' ملک وارث اور چوہدری زمان جیسے افسروں کے نام شامل تھے جو اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت ومہارت کے لیے مشہور تھے۔

میں نے بریگیڈیئر عطا محمد سے جو جنرل سوار خاں مارشل لا ایڈمنسٹریٹر (پنجاب) کے مشیر تھے' اتنے اچھے افسروں کی چھانٹی کا سبب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا۔

''وہ انتہائی کرپٹ ہیں''

''نہیں سر' آپ کی معلومات یکسر غلط ہیں۔ وہ پولیس کے سب سے اچھے اور دیانتدار افسروں میں سے ہیں۔ میں اسی محکمہ سے تعلق رکھتا ہوں اور ان سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''میں نے انہیں بتایا۔

''ہم انہیں سبق سکھانا چاہتے ہیں۔ وہ سب بڑے منہ پھٹ خودسر اور خود پسند ہیں۔''انہوں نے بے ساختگی سے کہا۔

''آپ یہ سارا کھیل کیوں کھیل رہے ہیں؟''میں نے خشمگین لہجہ میں پوچھا۔ میں نے ایوب' یحییٰ اور بھٹو کی طرف سے کی گئی اسی طرح کی کارروائی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس سے عدم تحفظ اور ناانصافی کو فروغ ملتا ہے۔ کرپشن کا قلع قمع تو کجا اس میں کمی تک نہیں ہوتی۔

''ان بچاروں کے بال بچے ہیں۔ دوسرے جو سروس میں رہیں گے خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے برے وقت کے لیے دولت بٹورنی شروع کر دیں گے۔''

وہ میرے تنقیدی اندازِ فکر سے برہم ہو گئے اور بولے: ''میری سمجھ میں نہیں آتا' آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

''بے شک آپ نہیں سمجھ سکتے۔''اس کے بعد میں نے انہیں دسمبر 1971ء میں اپنے دفتر میں ان کی آمد کی یاد دلائی' جب وہ چند دنوں میں مشرقی پنجاب کا فوجی گورنر بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ میں نے طنزیہ لہجہ میں کہا: ''مجھے ابھی تک افسوس ہے کہ میں امرتسر کا ایس پی کیوں نہیں بنا سر۔''وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

بھٹو خاندان کے خلاف کرپشن کیس

یہ وسط 1980ء کی بات ہے میں اس وقت ڈائریکٹر ایف آئی اے (راولپنڈی) کے طور پر کام کر رہا تھا۔ ایک دن ڈپٹی اٹارنی جنرل آف پاکستان میرے دفتر میں آئے اور بتایا کہ حکومت نے بھٹو خاندان کے خلاف دیوانی کیس دائر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ابتدائی چھان بین سے پتہ چلا کہ بھٹو نے 70 کلفٹن ہاؤس (کراچی) اور ''المرتضیٰ''(لاڑکانہ) کو وزیراعظم کی سرکاری رہائش گاہ قرار دینے کے بعد ان کی تزئین و آرائش پر جو سرکاری رقوم خرچ کیں' ان کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس معاملہ میں شہادتیں ایف آئی اے راولپنڈی نے فراہم کرنی تھیں' کیونکہ کیس کی تفتیش میرے پیشرو چوہدری بدرالدین نے کی تھی۔ فوجداری کارروائی اس لیے ممکن نہیں رہی تھی کہ اصل ملزم (بھٹو) فوت ہو چکا تھا۔

میں نے فائلوں کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ کچھ اخراجات واقعی سرکاری فنڈز سے کیے گئے تھے۔
مجھے صدر کے ملٹری سیکرٹری جنرل اسحاق کے ساتھ کا وہ دورہ یاد آ گیا جس کے دوران اوائل 1972ء میں ہم مذکورہ دونوں مقامات پر گئے تھے اور سیکورٹی کے نقطۂ نظر سے بعض کام کرانے کی تجویز پیش کی تھی۔ بھٹو ان دونوں عمارتوں میں کسی تبدیلی کے خلاف تھے۔ جن کا ڈیزائن اٹلی کے ایک مشہور ماہرِ تعمیرات نے تیار کیا تھا۔ دوسرے بھٹو کے بقول اس وقت ان مصارف کے لیے ان کے پاس فاضل سرمایہ نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے جنرل اسحاق سے کہا تھا کہ سردست اس کام کو ملتوی کر دیا جائے۔
فائل کا دوبارہ مطالعہ کرنے سے پتہ چلا کہ ان مصارف کی منظوری بھٹو نے نہیں دی تھی۔ وہ تعمیراتی کام اس کے بہت عرصہ بعد کرائے گئے تھے اور تعمیرات عامہ کے افسر نے اپنے مراسلہ کی محض ایک نقل برائے اطلاع ملٹری سیکرٹری کو بھیجی تھی۔ کسی حاسد افسر نے بات کا بتنگڑ بنانے کے لیے معاملہ کو ایسا رنگ دے دیا۔
میں نے ڈپٹی اٹارنی جنرل سے کہا کہ ''آپ حکومت سے یہ سفارش کیوں نہیں کرتے کہ دیوانی کیس دائر کرنے کی بجائے، جس کے خارج ہونے کا قوی امکان ہے، دونوں مکانوں سے ایئر کنڈیشنگ کا سامان اتار لیا جائے۔ دنیا بھر میں وزرائے اعظم کو ان کے تحفظ و آسائش کے لیے ایسی سہولتیں سرکاری خزانہ سے فراہم کی جاتی ہیں۔ اس معاملہ میں بھٹو خاندان کے پیچھے پڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''
''اگر ثبوت ناکافی ہیں تو مزید ثبوت اکٹھے کر لیں۔'' ڈپٹی اٹارنی جنرل نے کہا۔ وہ بہر صورت حکمرانوں کی خواہش پوری کرنے کے خواہاں تھے۔ ''مزید کوئی ثبوت دستیاب نہیں اور میں اپنے پاس سے کچھ نہیں بنا سکتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ناچار انہیں اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا۔
اسی دوران سی ڈی اے کے ممبر انچارج سید ناصر رضوی سی ڈی اے کے چیئرمین کاظمی کو 1977ء کے الیکشن میں ٹرانسپورٹ وغیرہ ناجائز طور پر استعمال کرنے کے جرم میں ماخوذ کیا گیا۔ میں نے فائلوں کا مطالعہ کیا تو ان کے خلاف شہادتیں بڑی ناقص اور بودی تھیں۔ میرے نزدیک اصل مقصد انہیں ہراساں کرنا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آیا وہ دونوں دیانتدار تھے یا نہیں، تاہم ان کے خلاف جرم ثابت کرنے کے لیے کوئی مواد نہیں تھا۔ اس لیے میں نے کارروائی آگے نہیں بڑھائی، نہ ہی کسی نے بعد میں مجھے یاددہانی کرائی۔

شہزاد صادق (ماہر تیل و گیس) کا کیس بھی ایسا ہی تھا۔ وہ اندرون ملک تیل تلاش کرنے کا جذبہ لے کر تازہ تازہ امریکہ سے آئے تھے۔ انہوں نے ان ''مقدس'' قواعد کو نظر انداز کر دیا جو ایک نیک مقصد حاصل کرنے کی بجائے رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ ان کے خلاف او جی ڈی سی کے چیئرمین کی حیثیت سے چار کیس درج کر لیے گئے جو سب کے سب فضول نوعیت کے تھے۔ ایک کیس محض 56 روپے غلط استعمال کرنے کے بارے میں تھا۔ بعض مخصوص مفادات رکھنے والے انہیں ہراساں کرنا چاہتے تھے' اس لیے وہ مقدمات سے خوفزدہ ہو کر واپس امریکہ چلے گئے۔

میں نے مشکوک نوعیت کے بہت سے کیس جو اہم شخصیات کے خلاف درج کیے گئے تھے' فائل کر دیئے۔ اگرچہ ان میں سے نہ کوئی مجھ سے ملنے آیا نہ ہی میں نے ان سے جان پہچان پیدا کرنے کی کوشش کی۔

جزائر کناری کے پرندے

1980ء کے اواخر میں مجھے ایف آئی اے کے ہیڈ کوارٹرز سے جنرل ضیا کے ذاتی احکام کے تحت چھان بین کے لیے ایک فائل موصول ہوئی۔ کاغذات کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ 12 فوجی افسر ایک خفیہ آپریشن پر مامور کیے گئے تھے۔ جس کا تعلق جزائر کناری (افریقہ کے جنوب مغرب میں چینی سیاحوں کا مشہور ٹھکانہ) میں اسلحہ اور سرمایہ کے بھاری لین دین سے تھا۔ ان میں سے پانچ افسروں نے جنگِ افغانستان میں حصہ لینے کی بجائے ایران' عراق جنگ کے ایک ایسے ہی آپریشن میں حصہ لینے کو زیادہ سود مند سمجھا۔ وہ فوج سے بھگوڑے ہو گئے اور پھر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میں نے بار بار فائل کو پڑھا' مگر مجھے اس میں ایسی کوئی چیز نہیں ملی جو اس سلسلہ میں میری مدد کرتی۔ وہ افسر ملک کے اندر نہیں تھے اور تحقیقات سے اہم راز اور حساس آپریشن کے افشا ہونے کا خطرہ تھا۔ جنرل ضیا کی بدنظمی اور کرپشن پر تشویش قابل فہم تھی۔ تاہم اس کارروائی کے لیے ایف آئی اے صحیح فورم نہیں تھا۔ ان کے خلاف فوجی ضوابط کے تحت بہتر کارروائی ہو سکتی تھی۔ ضیا نے غصے کی حالت میں ایف آئی اے کی صلاحیت اور رسائی کا غلط اندازہ لگا کر کیس ادھر بھجوا دیا تھا۔ میں فائل ڈائریکٹر جنرل کے پاس لے گیا۔ انہیں اپنی رائے سے آگاہ کیا اور فائل وہیں چھوڑ کر لوٹ آیا۔ مجھے معلوم نہیں' بعد میں اس فائل پر کیا گزری اور افسروں کا کیا بنا۔ البتہ یہ ضرور سننے میں آیا کہ

بہت سے دیگر موقع پرستوں اور مہم جوؤں نے بڑا اثر کاری کے پرندوں کی پیروی کی۔

سپریم کورٹ کے سابق جسٹس صفدر شاہ کے خلاف انکوائری میرے بطور ڈائریکٹر ایف آئی اے (راولپنڈی) چارج لینے سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ انہوں نے بھٹو کیس میں اکثریت کے نقطۂ نظر کے برعکس بھٹو کو بری کرنے کی سفارش کی تھی۔ فائل سے ظاہر ہوا کہ انہوں نے ایل ایل بی کی ڈگری کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے لیکچروں میں حاضر ہوئے بغیر صفدر کے نام پر حاصل کی تھی۔ صفدر نامی اصل آدمی کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ کراچی کا رہائشی تھا جب کہ یونیورسٹی ایک پڑوسی ملک میں واقع تھی۔ جج موصوف انکوائری کے دوران چپکے سے کابل چلے گئے اور وہاں سے لندن پہنچے جہاں بڑی کسمپرسی کی حالت میں فوت ہوئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اگر مقدمہ کی عدالتی چھان بین کی جاتی تو کیا نتیجہ نکلتا' تاہم مارشل لا کے خوف نے جج کے حق میں بہتر فیصلہ کر دیا۔

اندھی دیانتداری

چوہدری محمد خان' ڈپٹی ڈائریکٹر ایف آئی اے (ملتان) نے انکم ٹیکس آفیسر شوکت پر دولت ٹیکس کے مقدمہ میں ایک شخص سے رشوت لینے کی اطلاع پر چھاپہ مارا۔ افسر کی دراز سے نشان زدہ نوٹ برآمد کر لیے گئے۔ اس کیس کو بڑی شہرت ملی اور ایف آئی اے کی کارکردگی کو خوب سراہا گیا۔ مارشل لا حکام نے حکم جاری کر دیا کہ اس کی سماعت خصوصی عدالت میں کی جائے۔ میں نے بھی اسے ایک ٹھوس کیس سمجھا۔

چند دن بعد افتخار باجوہ کمشنر انکم ٹیکس نے مجھے بتایا کہ متعلقہ نوجوان افسر ایک دیانتدار آدمی ہے۔ ممکن ہے اسے کسی اور نے چکر میں پھنسا دیا ہو۔ ''لیکن میرا ڈپٹی ڈائریکٹر بھی نیک آدمی ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ بعد ازاں میرے دوست ارشد چوہدری نے بھی جن کا تعلق ملتان سے ہے' مجھ سے بات کی کیونکہ ملزم کے باپ نے ان سے ملاقات کر کے انہیں بتایا تھا کہ یہ سارا چکر ان کے دور کے کسی رشتہ دار نے چلایا ہے۔

میں ملتان گیا اور معاملہ کی چھان بین کی۔ چوہدری محمد خان کو کیس کے سچا ہونے کا پختہ یقین تھا۔ جس میں ملزم رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ البتہ یہ نکتہ بڑا اہم تھا کہ رشوت کی رقم ملزم کے ''کلیتاً ذاتی قبضہ'' سے برآمد نہیں کی گئی تھی۔ ممکن ہے وہ لفافہ کسی شخص نے ملزم کی عدم موجودگی میں دراز میں رکھ دیا ہو۔ میں نے ریکارڈ چیک کیا تو پتہ چلا کہ ملزم کے پاس دولت ٹیکس کا کوئی کیس زیر سماعت نہیں تھا۔ البتہ ایسے ٹیکس کے

لیے متعلقہ فریق کو نوٹس جاری کیا گیا تھا۔ مزید جانچ پڑتال سے یہ بات سامنے آئی کہ درخواست دہندہ تو کاروباری تھا ہی نہیں، اور نہ ہی وہ کسی پیشہ سے وابستہ تھا' اس لیے اس پر دولت ٹیکس عائد ہی نہیں ہوتا تھا۔ اب چوہدری محمد خان بھی دوسری تاویلات سوچنے لگا۔

آخرِ کار یہ عقدہ کھلا کہ اس افسر کے ایک رشتہ دار نے جس کی بابت ملزم کے باپ نے شک ظاہر کیا تھا' درخواست دہندہ سے مل کر اس کے خلاف سازش کی تھی۔ اس رشتہ دار کو اس بات کا دُکھ تھا کہ نوجوان افسر اتنی اچھی سروس میں کیوں بھرتی ہوگیا۔ وہ حاسد شخص اس کے کیریئر کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے درخواست گزار کو 500 روپے دے کر اس افسر کو جال میں پھنسادیا اور وقتی طور پر ایف آئی اے والے بھی دھوکہ کھا گئے۔

اس کے بعد مارشل لا حکام کے لیے ایک مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ وہ اس افسر کو بے گناہ ثابت ہونے کے باوجود بری کرنا تو درکنار ضمانت پر چھوڑنے کو بھی تیار نہیں تھے۔ وہ شک کرنے لگے کہ ایف آئی اے والے رشوت خور افسر کے لیے جو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا' نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ایک انتہائی تیز طرار افسر نے مجھے مشورہ دیا کہ ملزم پر مقدمہ ضرور چلاؤ خواہ بے گناہ کیوں نہ ہو' ورنہ مارشل لا حکام خود تمہاری بابت مخالفانہ رائے قائم کرلیں گے۔ اس کی بے گناہی اور انتقامی کارروائی کو بھول جائیں۔ بہتر ہے کہ اپنے آپ کو بچائیں۔"

ان کے مشفقانہ مشورہ کے باوجود جو بڑے تجربے کا نچوڑ تھا' میں نے کسی ترغیب و ترہیب کے بغیر انصاف کرنے کا ارادہ کرلیا۔ میں ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ملتان کے پاس گیا اور اخذ کردہ نتائج کے بارے میں بتایا۔ وہ قائل ہوگئے اور افسر کو ضمانت پر رہا کردیا۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ اب پراسیکیوشن برانچ مصیبت میں پھنس گئی۔ ڈی ایم ایل اے اپنی سمجھ کے مطابق چھاپہ مارنے والے مجسٹریٹ اور ایف آئی اے کے عملہ کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں ایف آئی اے کو درپیش مشکلات تفصیل سے بتائیں کیونکہ درخواست دینے والے بہت عیار ہوتے ہیں اور اپنی چرب زبانی کے ذریعے جھوٹ کو سچ بنادیتے ہیں۔ سٹاف نے نیک نیتی سے چھاپہ مارا تھا۔ اصل ملزم درخواست دہندہ اور حاسد رشتے دار تھے۔ میں نے ان کے خلاف کارروائی کرنے کا وعدہ کرلیا۔ اس پر ڈی ایم ایل نے معاملہ کو نمٹانے کی اجازت دے دی۔ میں نے وہ کیس خارج کر کے

درخواست دہندہ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اس نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو کم و بیش 23 درخواستیں دیں جن میں میرے خلاف بے بنیاد الزام لگائے گئے تھے۔ اس کی تان اس بات پر آ کر ٹوٹتی تھی کہ میں نے ایک کرپٹ افسر کو ملی بھگت کر کے چھوڑ دیا ہے۔ میں بڑی الجھن میں پھنس گیا۔ مجھے کئی بار اپنی پوزیشن واضح کرنی پڑی' ایک دفعہ تو سچائی پر قائم رہنے کی بابت میرا اٹل فیصلہ بھی بری طرح کمزور پڑ گیا تھا' لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے مؤقف سے نہیں ہٹا۔

انصاف کرنا ایک محنت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ اس کے لیے دور اندیشی' جرأت' فراخ دلی اور غلط فہمیوں نیز مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے سچائی کے ساتھ مکمل لگاؤ ضروری ہے۔ ایف آئی اے کے افسر محمد خاں کی دیانتداری کے باوجود بچارے انکم ٹیکس افسر کو اس لیے مصیبت اٹھانی پڑی کہ حالات نے اس کے خلاف کروٹ بدل لی اور بد معاش رشتہ دار نے اس کے خلاف ریشہ دوانیوں کا جال بُن دیا۔ لوگ دوسروں کو اذیت پہنچانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔

تباہ کن غفلت اور لاپروائی

کسی کیس میں لاپرواہی برتنا اور اسے معمول کے مطابق نہ نمٹانا تباہی کا موجب کیسے بن سکتا ہے' اس بات کو سمجھانے کے لیے ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ چند مہاجرین نے 1947ء میں گوجرانوالہ کے قریب ایک گاؤں میں کچھ متروکہ زرعی اراضی پر قبضہ کر لیا۔ 1973ء میں حکومت نے ملک بھر میں ایسی اراضی کے قابضین کو مالکانہ حقوق دے دیئے۔ دوسروں کی طرح زیرِ بحث کیس میں بھی قابضین 100 روپے فی یونٹ کے حساب سے واجبات ادا کرنے کے بعد مالک بن گئے۔ بعد میں حکومت نے وہ اسکیم منسوخ کر دی تاہم جن لوگوں نے واجبات جمع کرا دیئے تھے' وہ متاثر نہیں ہوئے۔ جب شہر کے باہر سے گزرنے والی سڑک بنی تو اس زمین کی قیمت کئی گنا بڑھ گئی۔

کسی شخص نے جو مالکان اراضی سے حسد کرتا تھا' مارشل لا حکام کو درخواست دے دی کہ وہ اراضی جس کی مالیت 8 کروڑ بنتی تھی' مالکان نے علاقہ میں اسکیم کے آفیسر انچارج سے ساز باز کر کے برائے نام قیمت پر اپنے نام کرا لی ہے۔ کیس کی سطحی طور پر تفتیش کی گئی اور ملزم افسر سے کوئی وضاحت نہیں مانگی گئی۔ تمام سطحوں پر یک طرفہ نقطۂ نظر غالب رہا یہاں تک کہ کیس کو مارشل لا ضوابط کے تحت چلانے کی سفارش کر دی گئی۔ پھر وہ مقدمہ منظوری کے لیے وزارتِ داخلہ کو بھیج دیا گیا۔ ملزم کی اپنی بیوی نے جو متعلقہ

سیکشن افسر تھی، فائل کو معمول کے طور پر لیا اور منظوری کے احکام پر دستخط کر دیئے۔

میاں بیوی کو اس وقت زندگی کا سخت ترین دھچکا لگا جب ایف آئی اے والے شاہد کو گرفتار کرنے پہنچے۔ وزارتِ داخلہ کے جائنٹ سیکرٹری ضیاالحق نے مجھ سے کہا کہ افسر کا مؤقف سننے کے بعد کیس کا از سرِ نو جائزہ لوں۔ انہوں نے فون پر بتایا کہ شاہد کی بیوی آنکھوں میں آنسو لیے میرے پاس بیٹھی ہے۔ اس نے اپنے شوہر کے خلاف کیس کی منظوری دیتے وقت مناسب احتیاط نہیں برتی تھی۔

میں نے معاملہ کا بڑی احتیاط سے جائزہ لیا۔ بچارے افسر کے خلاف معمولی سا ثبوت بھی نہیں تھا۔ اس نے اس علاقہ کا چارج آٹھ سال بعد اس وقت سنبھالا جب ہر کام مکمل ہو چکا تھا۔ الاٹیوں نے 1947ء میں زمین کا قبضہ لیا جب ملزم پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ کارروائی میں بنیادی سقم یہ تھا کہ ملزم کو قاعدہ کے مطابق کسی بھی سطح پر اپنا مؤقف پیش کرنے کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ اس لیے وہ کیس خارج کرنا پڑا۔

افضل آغا کے خلاف بے بنیاد کیس

افضل آغا ایوب خاں کے آخری دور میں پنجاب کے چیف سیکرٹری بنے اور اس منصب پر 1974ء تک کام کرتے رہے۔ جب حنیف رامے نے مصطفیٰ کھر کی جگہ وزارت اعلیٰ کا چارج سنبھالا تو آغا کو کھر کا آدمی قرار دے کر اس پوسٹ سے تبدیل کر دیا گیا۔ اسے ناکافی سمجھتے ہوئے ایف آئی اے سے کہا گیا کہ ان کے خلاف شراب بیچنے کے کاروبار میں حصہ دار ہونے کی بنا پر مقدمہ درج کیا جائے۔ تفتیش کرنے پر پتہ چلا کہ فروخت کنندہ کو 1947ء میں لائسنس جاری کیا گیا تھا اور اس وقت آغا پر اس کی سرپرستی کا الزام ثابت کرنا ممکن نہیں تھا۔ جب تک 1947ء کو 1974ء نہ پڑھا جائے۔ میں آغا کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ وہ بڑے قابل، قوتِ فیصلہ کے مالک، کھرے اور دیانتدار ایڈمنسٹریٹر تھے۔ ان کے اخلاق و کردار پر بھی کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ بھٹو نے ان کے خلاف اس طرح کا جھوٹا کیس درج کرا کے ان کے ساتھ بڑا گھٹیا سلوک کیا تھا۔ جب وہ کیس مجھ تک پہنچا تو اذیت کے سات سال گزر چکے تھے، میں نے کیس کو بے بنیاد قرار دے کر خارج کر دیا۔

انسدادِ رشوت ستانی کے اداروں کی ابتدا

مجھے اس وقت انتہائی راحت محسوس ہوئی جب ستمبر 1989ء میں وزیر اعلیٰ نے مجھے ڈائریکٹر اینٹی کرپشن پنجاب مقرر کیا کیونکہ وہاں ذہنی ٹینشن نہ ہونے کے برابر تھی۔ تین سال تک بطور ایڈیشنل آئی جی

سپیشل برانچ' کٹھن فرائض انجام دینے کے بعد مجھے آرام و سکون کی واقعی ضرورت تھی۔ سابقہ منصب پر اپنے فرائض دیانتداری کے ساتھ ادا کرنے کی بنا پر میں ہر وقت آئی جے آئی اور پی پی کے مابین محاذ آرائی میں الجھا رہتا تھا۔ میں فریقین کو ترغیب دیتا تھا کہ ملک کو بہر صورت جمہوری راستے پر چلایا جائے۔ جرنیلوں اور مسلم لیگ کے رہنماؤں میں بہت سے ایسے تھے جو عام الیکشن تو کجا بلدیاتی الیکشن کا سامنا کرنے کی ہمت بھی نہیں رکھتے تھے۔

بحالیٔ جمہوریت کے لیے کوشش کرنے کے بعد اب میرا کام یہ تھا کہ کرپشن کی حوصلہ شکنی کروں۔ بہر حال میرا سابقہ کسی نئی چیز سے نہیں تھا' لارڈ کارنوالس کی انتظامی اصلاحات کے بعد سرکاری ملازمتوں میں کرپشن برائے نام رہ گئی تھی۔ افسروں کو معقول تنخواہیں ملتی تھیں اور 1920ء کی دہائی کے آخری سالوں تک افراطِ زر برائے نام رہ گیا تھا۔ افسروں پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی' تاہم ان کی ملازمت کو تحفظ اور استحکام میسر تھا۔ انتظامیہ اور سروسز کا نظام منصفانہ تھا جس میں قواعد و ضوابط اور پوری طرح متعین کردہ اختیارات نیز ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھا جاتا تھا' اس کے علاوہ پبلک کی اعلانیہ چیکنگ اور احتساب کا بندوبست بھی موجود تھا۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران وسائل کو اکٹھا کرنے کا دباؤ فوج کے شعبہ سپلائی میں بڑی پیمانے پر کرپشن کی شکایات کا سبب بنا۔ یہ لعنت بڑی تیزی سے پھیلی اور اس کے قلع قمع کے لیے انسدادِ رشوت ستانی کے ادارے مثلاً مرکز میں سپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ (بعدازاں اس کا نام ایف آئی اے رکھ دیا گیا) اور صوبوں میں محکمہ انسدادِ رشوت ستانی قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن لارڈ ویول آخری سے پہلے وائسرائے کی ڈائری میں درج ریمارکس کے مطابق محکمہ انسدادِ رشوت ستانی بے ایمان اور کرپٹ افسروں سے نمٹنے کی بجائے دیانتدار افسروں کو خوفزدہ اور بلیک میل کرنے کے لیے زیادہ استعمال ہوا۔

دلکش ترغیبات

آزادی کے بعد عدم تحفظ اور غیر یقینی صورتِ حال کے باعث مسائل پیدا ہوئے۔ بہت سے اخلاقی لحاظ سے کمزور افراد کے لیے متروکہ جائیداد کی ترغیبات ناقابلِ مزاحمت ثابت ہوئیں۔ مستقبل کے متعلق احساس عدم تحفظ' سماجی لحاظ سے گمنام رہنے کے فوائد اور راتوں رات امیر بننے کی خواہش نے لوگوں کو متروکہ جائیدادوں کی الاٹمنٹ اور قبضہ کرنے کے عمل میں بے ایمانی و بے اصولی پر ابھارا۔ بہر حال نئے ملک کی ابتدا میں مذہبی اور اخلاقی جوش و جذبہ نے بہت سے لوگوں اور سرکاری ملازمین کو ترغیبات کا

شکار ہونے سے محفوظ رکھا۔ وہ قانون کا احترام کرتے اور ملک کو اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ مخلص افسران مثلاً قدرت اللہ شہاب، جی احمد، میاں انور علی، قربان علی خاں اور آغا شاہی بے داغ کردار، دیانت اور اپنے کام سے لگن رکھنے والوں کے لیے روشن مثال تھے۔

کرپشن کا سیلاب اس وقت آیا جب جرنیلوں نے آئین اور قوانین کو پامال کر کے نگرانی اور توازن کا نظام تباہ و برباد کر دیا۔ جب ملک کی اعلیٰ ترین عدالت نے دستور کی منسوخی کو "نظریہ ضرورت" کے تحت جائز قرار دے دیا تو اندھی طاقت کو یہ حق مل گیا کہ وہ خود کو حق پر سمجھے۔ اختیارات چند ہاتھوں میں مرتکز کر دیے گئے اور جنہیں مطلق اختیارات حاصل تھے وہ سب سے زیادہ بدعنوان ثابت ہوئے کیونکہ انہیں عوام کی طرف سے احتساب کا کائی ڈر نہیں رہا۔ قانون اور اخلاقی اقدار کی اعلانیہ مٹی پلید کی گئی۔ طلبا، محنت کشوں، اساتذہ، کسانوں، مولویوں، دکانداروں اور باقی سب نے جس چیز کو چاہا اجتماعی طاقت کے بل پر جائز قرار دینا شروع کر دیا۔ یوں اخلاقی بحران شدید تر ہوتا گیا۔

1960ء کے عشرہ کے بعد آنے والی حکومتوں نے کرپشن سے بلا روک ٹوک ہاتھ رنگے اور اسے فروغ دیا۔ انہوں نے اختیارات چند ہاتھوں میں مرتکز کر کے نظام ہی تباہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی دیانتدار اور قابل افسروں کی ذاتی حسد و رقابت اور انتقام کی بنا پر چھانٹی کر کے ان میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کیا گیا۔ محکمہ انسدادِ رشوت ستانی ایماندار اور خوددار ملازمین کو ٹیکنیکل وجوہات پر پکڑنے کے لیے استعمال کیا گیا جبکہ راشی افسروں کو باہمی فائدے کے لیے لوٹ مار کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔

خوف وہراس پیدا کرنا

میں نے اپنے محکمہ کے تاریخی پس منظر سے آگاہی رکھتے ہوئے معاملات کو سدھارنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ میں نے معمول کے مطابق، اپنے دروازے سب کے لیے کھول دیئے۔ سرکاری ملازم کے طور پر میرے طویل تجربہ نے مجھے سکھایا تھا کہ دروازہ کھلا رکھنے کی حکمتِ عملی چھوٹے اہلکاروں کے مسائل کو کم سے کم کرنے کا واحد راستہ ہے۔

میں یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ فائلوں میں بیس بیس سال پرانے کیس دبے پڑے تھے۔ دفتر کے بعض سب سے پرانے اور دیانتدار افراد مثلاً چوہدری اللہ بخش اور شیخ خلیل کی رائے یہ تھی کہ مقدمات کی

سماعت میں تاخیر نے محکمہ انسدادِ رشوت ستانی کا مطلوبہ خوف پیدا کردیا ہے۔ ''لیکن یہ انصاف کا تقاضا نہیں۔'' میں نے ان سے کہا'' اگر کوئی شخص دیانتدار اور بے گناہ ہوتو بلا جواز تاخیر کے بارے میں آپ کا احساس اور ردِعمل کیا ہوگا؟'' ان کے ساتھ کبھی ایسا معاملہ پیش نہیں آیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ ''میں تم لوگوں کے خلاف تحقیقات شروع کروں گا اور پھر اسے زیرِ التوا رکھوں گا۔'' میرا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا' تاہم وہ سچ مچ خوفزدہ ہوگئے۔ میرا خیال تھا کہ اس قسم کی دھمکی شاید انہیں ان کے احمقانہ دستور العمل کے برے نتائج کا احساس دلادے گی۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔

مخالف فریق کا حقِ شنوائی

میں نے زیرِ التوا فائلوں کا مطالعہ کیا اور ان سرکاری ملازمین کو بلایا جن کے خلاف شکایات دائر کی گئی تھیں۔ میرے ذہن میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ وہ اپنے مقدمات کی پیروی کیوں نہیں کرتے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ محکمہ کے خوف اور ڈر کی وجہ سے پیش نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ جن مقدمات میں کوئی شہادت دستیاب نہیں ان میں بھی انہیں انصاف ملنے کی توقع نہیں۔ اس لیے وہ یہی بہتر سمجھتے ہیں کہ معاملات کو کھٹائی میں پڑا رہنے دو۔ ان کے التوا کو یقینی بنانے کے لیے وہ نچلے عہدیداروں کی مٹھی گرم کرتے تھے۔

کرپشن کے بہت سے نام نہاد کیس اصل میں محکمانہ سازشوں اور رقابتوں کا نتیجہ تھے جن کا مقصد مخالفین کی ترقی کا راستہ روکنا تھا۔ دیانتدار اور بے قصور ملازمین کو سب سے زیادہ نشانہ بنایا گیا۔ ان کے عیار اور خوش تدبیر حریف نہ صرف ان کے خلاف شکایات درج کرادیتے بلکہ اخبارات کے ذریعے ان کی تشہیر کا بندوبست بھی کرلیتے تھے۔

سازشوں کا نشانہ بننے والے بعض افراد اپنے دوستوں اور اہلِ خانہ کی نظروں میں رسوا ہوکر اعصابی الجھن میں مبتلا ہوگئے اور اعصابی خلل نے ان کا جینا حرام کردیا۔ وہ یہ بات ماننے کو قطعاً تیار نہیں تھے کہ میں ان کے ساتھ واقعی انصاف کرنا چاہتا تھا۔ وہ لوگ جب کبھی مجھے اعتماد میں لے کر اپنی بپتا سناتے میں یہ جان کر کانپ اٹھتا کہ وہ بلاوجہ کس مصیبت میں گرفتار ہیں۔

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انجینئر پر جو بیرونِ ملک سے تربیت لے کر آیا تھا' ایک ٹی سیٹ غائب کرنے کا الزام لگا دیا گیا' اس کے خلاف انکوائری گزشتہ ایک سال سے زیرِ التوا تھی۔ اس نے کئی بار ملک سے فرار ہونے کا ارادہ کیا مگر اس لیے ملتوی کرنا پڑا کہ اس کی بیوہ ماں اس کے ساتھ نہیں جا سکتی تھی۔ وہ بعض اوقات انتہائی مایوسی میں ماں کی موت کی دعا مانگا کرتا تھا۔ اس مقدمہ سے اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو زنگ لگ گیا۔ وہ کیس اس سے حسد کرنے والے بعض ساتھیوں نے اس لیے بنوایا تھا کہ وہ ترقی کر کے ان سے آگے نہ نکل جائے۔ آخرِ کار میں نے وہ کیس خارج کرا کے اس کی گلو خلاصی کرائی۔

افسر راہِ راست پر آ گئے

جس وقت میں زیرِ التوا مقدمات کے مطالعہ و تجزیہ میں مصروف تھا' میری خوش قسمتی کہ سید اظہر حسن ندیم کو میرا ایڈیشنل ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا۔ میں انہیں عرصہ سے ایک حساس آدمی بلند پایہ شاعر اور ممتاز دانشور کے طور پر جانتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دلیر اور دبنگ بھی تھے جیسا کہ ایک پولیس افسر کو ہونا چاہیے۔ وہ بطور اے ایس پی کیریئر کے آغاز میں کالا باغ (میانوالی) میں امن قائم کرنے کی کوشش کے دوران سینے پر گولی کھا چکے تھے۔ مارشل لا کے دوران بحیثیت ایس ایس پی گوجرانوالہ انہوں نے ایک سمگلر کی طرف سے رشوت کی بھاری پیشکش ٹھکرا دی تھی۔ ان کو جہاں بھی تعینات کیا گیا انہوں نے اپنی خدمات کی بدولت لوگوں سے زبردست احترام حاصل کیا۔

سید اظہر حسن ندیم نے میری ساری سر دردیاں اور بے چینیاں اپنے سر لے لیں۔ انہوں نے رانا واسع' شیخ خلیل اور چوہدری اللہ بخش کے ساتھ مل کر پرانے مقدمات کو میرٹ پر نمٹایا۔ میں اس بات پر خوش تھا کہ افسر اپنی گمراہ کن سوچ کے دائرہ سے باہر نکلنے لگے ہیں جس کے تحت بنی نوع انسان کو لامحدود مدت تک اذیت میں مبتلا رکھنا کسی بھی طرح کارآمد نہیں ہوتا۔ ان کو ان بری اقدار سے باز رکھنا جو سابقہ حکومتوں میں فروغ پا گئی تھیں۔ آسان بات نہیں تھی۔ بہرحال جب وہ راہِ راست پر آ گئے تو میرے لیے محفوظ راستے پر گامزن رہنا آسان ہو گیا۔

باب 34

پولیس افسران کی گھاتیں

غیر دانشمند حکمرانوں کو ہمیشہ ترغیب دی جاتی ہے کہ اپنے مخالفین سے نمٹنے اور امن و امان پر سخت کنٹرول رکھنے کے لیے ڈنڈا استعمال کریں۔ انہیں ایسے چالاک اور مکار پولیس والے نیز سرکاری ملازم آسانی سے مل جاتے ہیں، جو اخلاقی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر ان کی خواہشات کی تکمیل کے لیے ضرورت سے زیادہ آمادہ رہتے ہیں۔ ایسے افسروں کا سب سے بڑا حربہ جھوٹے کیس بنانا ہوتا ہے۔ اس کاروبار کی دیگر صورتیں اور گھاتیں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے بدکردار افسروں میں اخلاقی کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ اگرچہ ایسے اقدامات ہمیشہ نقصان دہ ہوتے ہیں تاہم حکمرانوں کو بآسانی شیشے میں اتار لیا جاتا ہے۔ بعض افسروں کی فطرت ایسے سانچہ میں ڈھل جاتی ہے کہ وہ بدمعاشی کو واحد کامیاب پالیسی سمجھنے لگتے ہیں اور حکمرانوں کو برے انجام سے دوچار کر دیتے ہیں۔ مجھے اپنی ملازمت کے دوران اس طرح کے بہت سے واقعات سے واسطہ پڑا۔

مجھے 1973ء میں پی پی پی کی حکومت کے خلاف یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ کی احتجاجی تحریک شروع ہونے کے فوراً بعد لاہور کا ایس ایس پی مقرر کیا گیا۔ تحریک کے دوران مولانا سلیم اللہ کو گرفتار کر کے حوالے کر کے حوالۂ زنداں کر دیا گیا۔ سی آئی اے نے ان کے بیٹے کو بھی جو کالج سٹوڈنٹ تھا' حراست میں لے لیا۔ مولانا کی پریشان حال اہلیہ نے مدد کے لیے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے چوہدری محمد صادق ڈی ایس پی (سی آئی اے) سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ مذکورہ لڑکے کو ٹریفک پولیس نے مال روڈ پر بم سمیت پکڑا تھا۔ مزید کرید نے پر پتہ چلا کہ لڑکے کو دراصل اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا اور بم برآمد نے ہونے والی کہانی سراسر من گھڑت تھی۔ میں نے حکم دیا کہ لڑکے کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے مگر ڈی ایس پی متامل تھا۔ اس کا مؤقف تھا کہ لڑکے کو دوسروں کے ساتھ تحریک کو کچلنے کی غرض سے حراست میں لیا گیا ہے۔

''لیکن معاملات سے نمٹنے کا یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔'' میں نے کہا۔

اگلے دن میں نے از خود پیش قدمی کر کے سارے زیرِ حراست طلبا کو' جنہیں اُس صورت حال کی آڑ لے کر نظر بند کیا گیا تھا' ضمانت پر رہا کرا لیا۔ تجربہ کار و عیار ڈی ایس پی نے اس اقدام کو میرے بھولپن اور سادگی سے تعبیر کیا۔

اسی طرح نوجوانوں کی تنظیم ''العقباء'' کے صدر حمید اللہ خاں کو بم رکھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ ایم اے کر چکا تھا اور صرف ایک سال پہلے پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کا سیکرٹری تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ مذکورہ بم اس کے دفتر میں رکھی ہوئی میز کی دراز سے ملا تھا۔ مجھے کچھ شک گزرا کیونکہ میں ذاتی طور پر جانتا تھا کہ وہ دہشت گرد قسم کا لڑکا نہیں۔ اس لیے میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''تم نے وہ بم دراز میں کیوں رکھا ہوا تھا؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔ اس نے بم کے بارے میں مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے اسے سنی سنائی کہانی سے آگاہ کیا تو بولا:

''میری تنظیم کا سرے سے کوئی دفتر ہی نہیں' پھر اس کی میز اور دراز کہاں سے آ گئی جس سے بم برآمد ہوا تھا؟''

تفتیش کرنے پر اس کی بات درست پائی گئی۔ میں نے چوہدری محمد امین' ایس پی کینٹ سے پوچھا کہ یہ جھوٹا کیس کیوں درج کیا گیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ کارروائی سردار وکیل خاں' ڈی آئی جی'

سپیشل برانچ کی ہدایت پر کی گئی تھی تاکہ لڑکوں کو خوفزدہ کرکے ان کو قابو میں رکھا جا سکے۔ میں نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''طلبا کو کنٹرول کرنے کا یہ طریقہ سراسر غیر اخلاقی اور احمقانہ ہے'' میں نے حمید اللہ کو فوراً ضمانت پر رہا کر دیا۔ سامراجی دور کے بہت سے گھاگ اور پرانے افسروں نے مجھے یقیناً ناتجربہ کار اور جذباتی قرار دیا ہوگا۔

طاہرہ مسعود جو ان دنوں ٹیلیویژن کی مشہور فنکارہ تھی اور اس کے خاوند چوہدری مسعود کے مابین کچھ تنازعہ چل رہا تھا۔ طاہرہ تحریکِ استقلال کی سرگرم کارکن بھی تھی اور حکمران جماعت پی پی اس تنازعہ سے سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ تھانہ سول لائنز نے سرکار کے اشارہ پر طاہرہ کو ان کے آٹھ ساتھیوں سمیت ڈاکہ کے کیس میں پکڑ لیا۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے طاہرہ کے متنازعہ مکان اور اس میں موجود ساز و سامان پر جبری قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ طاہرہ کے آٹھوں ساتھی طالب علم تھے اور تحریکِ استقلال کے طلبا ونگ سے تعلق رکھتے تھے۔

جب ایس پی کینٹ نے مجھے تفصیلات بتائیں تو مجھے کیس کی سچائی پر کچھ شک گزرا۔ جس وقت میں ایس پی سے مصروفِ گفتگو تھا مجھے فون پر گورنر کے حضور پیش ہونے کا پیغام موصول ہوا۔ میں گورنر ہاؤس پہنچا تو گورنر کی بجائے سردار وکیل خان اور ان کے دو خصوصی معاونین چوہدری طالب حسین اور شیخ جاوید الرحمٰن میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس کیس میں چند مزید افراد کو گرفتار کرنا ہے۔ انہوں نے 67 افراد کی فہرست میرے ہاتھ میں تھما دی جن میں بھاٹی گیٹ کے شیخ حفیظ اور شیخ نذیر کے نام بھی شامل تھے۔ وہ تحریکِ استقلال کے پُرجوش کارکن تھے۔

''یہ مناسب نہیں ہوگا'' میں نے ان سے کہا۔ ''یہ ایک غیر اخلاقی اقدام ہے۔ جس سے حکومت کی بدنامی ہوگی۔'' میرا جواب سن کر وکیل خاں طیش میں آ گئے اور بڑے ناصحانہ انداز میں کہنے لگے:

''میرے ساتھ بحث نہ کریں' آپ میرے حکم سے انہیں گرفتار کرنے کے پابند ہیں۔ حکومت بہتر جانتی ہے کہ اس کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا بُرا۔ ان کو حراست میں لینے سے تحریکِ استقلال کا بھٹہ بیٹھ جائے گا۔

''یہ بات ہے تو حکومت کو تحریری احکام جاری کرنے چاہئیں۔ میں اسی صورت میں گرفتاریاں کروں گا۔'' سردار وکیل خان کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ وہ ایک دم آگ بگولا ہو گئے۔ البتہ

چوہدری اور شیخ جاوید میرے نقطۂ نظر کو سمجھ گئے۔ ان دونوں نے نرمی سے کہا:

"آپ اس معاملہ میں حکومت کی مدد کریں۔"

"حکومت کی بہترین مدد یہ ہے کہ انصاف کیا جائے اور ایک کیس کو جو بصورتِ دیگر ٹیکنیکل نوعیت کا ہے' سیاسی رنگ نہ دیا جائے۔ میں حکومت کے لیے باعثِ بدنامی بننے والی کارروائی میں ہرگز فریق نہیں بنوں گا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں ان کے کمرے سے نکل کر سیدھا گورنر صاحب سے ملنے ان کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ انہوں نے مجھے اندر بلا لیا۔ میں نے انہیں پوری روداد کہہ سنائی۔ پتہ چلا کہ گورنر کھر نے مجھے قطعاً نہیں بلایا تھا۔ سردار وکیل خاں اور ان کے ساتھیوں نے غلط بیانی کی تھی۔ میں نے گورنر سے استدعا کی کہ ان لوگوں کو ایسے کاموں سے باز رکھیں جو حکومت کو پہلے ہی بہت بدنام کر چکے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں بعد میں گورنر اور ان کے مابین کیا باتیں ہوئیں۔ میری معلومات کے مطابق کھر یا بھٹو نے اس کیس میں قطعاً دلچسپی نہیں لی۔ ایسے جھوٹے مقدمات زیادہ تر سردار وکیل خاں اور چوہدری محمد امین جیسے مکار لوگوں کے ذہن کی اختراع تھے جو حکام بالا کو خوش کر کے انعامات کی توقع رکھتے تھے۔

طاہرہ اور ان کے ساتھی دو دن بعد ضمانت پر رہا کر دیئے گئے اور کیس کو حقائق اور میرٹ پر نمٹا دیا گیا۔ حفیظ خاں ایک خوبصورت نوجوان بھی طاہرہ کے ساتھ نظر بند تھا۔ نظر بندی کے دوران دونوں میں عشق پیچہ پڑ گیا۔ طاہرہ نے مسعود سے طلاق لینے کے بعد حفیظ خاں سے شادی کر لی اور سیاست کو خیر باد کہہ کر گھریلو خاتون کی زندگی بسر کرنے لگی۔

لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو

وزیراعظم بھٹو نے 1972ء میں غیر ملکی سفیروں کے اعزاز میں لاڑکانہ میں ایک تقریب منعقد کرنے کا پروگرام بنایا۔ سپیشل برانچ کے ڈی آئی جی سردار وکیل خان سے کہا گیا کہ ممتاز کو جو اس دور کی ایک مقبول رقاصہ اور اداکارہ تھی' اپنے حسن کا جادو جگانے اور رقص کے جلوے دکھانے کے لیے لاڑکانہ بھیجو۔ انہوں نے چوہدری عبدالغفور ایس پی سٹی کو وہ ذمہ داری سونپ دی۔ ممتاز فلموں کی شوٹنگ میں مصروف تھی' اس نے لاڑکانہ جانے سے معذرت چاہی مگر وکیل خاں اسے ہر قیمت پر لاڑکانہ پہنچانا چاہتے تھے۔

اتنی سی بات پر ایکشن شروع ہو گیا۔ تھانہ ٹبی کے ایس ایچ او نے ممتاز کے گھر پر دستک دی۔ وہ نہ

ملی تو طیش میں آ کر بوڑھی ماں کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔ اس کارروائی پر ممتاز آگ بگولا ہوگئی اور اس نے لاڑکانہ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے اعلیٰ شخصیات اور حکام کے ساتھ مراسم تھے۔ فلم سٹوڈیو ز نے ممتاز سے اظہارِ یکجہتی کرتے ہوئے ہڑتال کر دی اور شاہی محلہ کی ناچنے والی طوائفیں احتجاج کے لیے سڑکوں پر نکل آئیں۔ الغرض بات کا بتنگڑ بن گیا اور پورے شہر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ انقلابی شاعر حبیب جالب نے اس موقع کی مناسبت سے ایک نظم موزوں کر دی۔ جس کا عنوان تھا ''لاڑکانے چلو' ورنہ تھانے چلو' ' اس نظم کی وسیع پیمانہ پر تشہیر ہوئی اور لاڑکانہ کی تقریب کو طرح طرح سے ہدف تنقید بنایا گیا۔

مجھے ان ساری باتوں کا اس وقت پتہ چلا جب ایس پی لاڑکانہ نے فون پر پوچھا کہ فنکارہ ابھی تک کیوں نہیں پہنچی۔

''مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں' نہ ہی ایسا انتظام میری ذمہ داریوں میں شامل ہے۔''

''لیکن وزیراعظم کو تو یہی بتایا گیا تھا کہ ایس ایس پی لاہور اسے لاڑکانہ بھیجنے کا بندوبست کریں گے۔'' اس نے مزید کہا۔

تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وکیل خاں نے مجھے نااہل ظاہر کرنے کے لیے اپنی ذمہ داری میرے سر تھوپ دی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچتا' میرے ریڈر نے میری مدد کی پیشکش کرتے ہوئے کہا:

''سر اس ایکٹریس کو میں لاڑکانہ بھجوا سکتا ہوں۔''

''کیسے؟'' میں نے سوال کیا۔

''سر وہ میری مریدنیوں میں سے ایک ہے۔'' میرا ریڈر سیّد تھا اور بہت سی گلوکارائیں اور رقاصائیں اسے پیر مانتی تھیں۔

''ایسی بات ہے تو آپ یہ کام ضرور کریں۔'' میں نے اس سے کہا۔

ممتاز فوری طور پر اور بڑی خوشی سے لاڑکانہ چلی گئی۔ ہمارے حکمران جو پولیس پر اس قدر انحصار کرتے ہیں' یہ بات نہیں سمجھتے کہ عام پولیس افسر اس قدر بے تدبیر ہوتا ہے کہ ایک ناچنے والی لڑکی سے بھی اپنی بات نہیں منوا سکتا۔

دیانتداری مگر کس قیمت پر؟

ناانصافی ایک ایسا فعل ہے جس کے ارتکاب کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشے جاتے ہیں اور ناانصافی کرنے والے کو مکافاتِ عمل کے تحت ایک دن خود اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چوہدری سلطان غنی، ڈی ایس پی پرانی انارکلی، ایک دیانتدار اور ذہین افسر تھا۔ جن دنوں میں ایس ایس پی تھا وہ ایک قتل کیس کی تفتیش میں مصروف تھا۔ مجھے کئی درخواستیں موصول ہوئیں کہ ایف آئی آر میں جن تین افراد کو ملزم نامزد کیا گیا ہے، ان میں سے دو بالکل بے گناہ ہیں۔ ڈی ایس پی نے بھی تفتیش کے بعد زبانی طور پر اس کی توثیق کی مگر وہ اپنی رائے قلمبند کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔

''آخر کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا:

''اگر میں نے ان دونوں کو چھوڑ دیا تو مقتول پارٹی مجھ پر رشوت لینے کا الزام لگا دے گی۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم ایک بے بنیاد الزام سے اتنے خوفزدہ کیوں ہو؟ جب کہ سب تمہاری دیانتداری کے معترف ہیں۔'' میں نے سوال کیا۔

''سر میں اپنی نیک نامی کا تحفظ چاہتا ہوں۔'' اس نے اپنے خودساختہ جواز پر سے پردہ ہٹایا۔

''کس قیمت پر؟'' میں نے چلا کر کہا۔ ''دو بے گناہوں کو جھوٹے الزام میں سزا دے کر۔''

مجھے ایسی دیانتداری زہر لگتی ہے جس میں انسان محض الزام کے ڈر سے انصاف کا خون کرنے پر تل جائے۔ ایک دیانتدار افسر کو دو بے گناہوں کے ساتھ ناانصافی کے مقابلہ میں اپنی شہرت اور امیج کو اہمیت دینے پر ضمیر کی ذرا خلش محسوس نہیں ہوئی۔ میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ میں کیس کسی دوسرے افسر کے سپرد کر دوں۔ دوسرے افسر نے حقائق کی بنیاد پر چند دن میں فیصلہ سنا دیا۔

اپنے امیج کا بہت زیادہ خیال رکھنے اور احتیاط برتنے کے باوجود چوہدری سلطان غنی کو ایک دوسرے کیس میں جھوٹے الزامات لگا کر قبل از وقت ریٹائر کر دیا گیا۔ بعد میں انہوں نے شیخوپورہ میں وکالت شروع کر دی اور کچھ عرصہ بعد ان کا کام خوب چل نکلا۔

وہ کئی سال پہلے میرے ہاں آئے اور مجھ سے کہا کہ میں ان کے بہنوئی ہمایوں شفیع، اے ایس پی

(سیالکوٹ) سے بات کروں جو ایک مقدمہ قتل کی تفتیش کر رہا تھا۔ چوہدری سلطان کے مطابق اصل ملزم صرف ایک تھا جبکہ اس کے دو رشتہ داروں کو غلط طور پر ملوث کیا گیا تھا۔ میں نے اسے تھانہ پرانی انارکلی والا کیس یاد دلایا۔ اس نے بڑی معذرت اور تاسف کا اظہار کیا۔ ہمایوں شفیع نے کسی سفارش کے بغیر جرأت کے ساتھ سچائی کی پیروی کی اور دونوں بے گناہوں کو ڈسچارج کر دیا۔

کامیابی کا راز

بعض اوقات دیانتدار افسر بھی عہدہ میں ترقی پانے یا کسی پسندیدہ پوسٹ پر برقرار رہنے کے لیے سنگین قسم کی ناانصافی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ ایس پی شریف چیمہ ایک دیانتدار افسر تھا لیکن تاجپورہ (لاہور) کے جلسہ عام میں جس سے بھٹو کے حریف کھر نے خطاب کیا تھا' بعض شیطانی کام انجام دینے پر بڑے فخر کا اظہار کیا کرتا تھا۔

''تم نے وہ ساری شیطانی حرکتیں کیوں کی تھیں؟'' میں نے ملک وارث کے گھر اس سے باتیں کرتے ہوئے سوال کیا۔

''میں نے بالکل ٹھیک کیا میرے لیے اوپر سے ملنے والے احکام کی تعمیل لازمی تھی' خواہ وہ درست تھے یا غلط۔ ورنہ حکومت میرا تبادلہ کر دیتی۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر حکومت تبادلہ کر دیتی تو کیا ہو جاتا؟ تبادلہ اتنا اہم نہیں ہوتا کہ آدمی غیر قانونی احکام کی تعمیل پر آمادہ ہو جائے۔'' میں نے کہا

''سر میں پولیس میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا۔ میں نے ہمیشہ حکامِ بالا کے احکام کی تعمیل کی۔ اس کے نتیجہ میں میں ترقی کرتا ہوا ایس پی کے عہدہ تک پہنچا۔'' اس نے اپنی ترقی کے راز پر سے پردہ اٹھایا۔ میں سوچنے لگا نجانے اور کتنے ایسے ہوں گے جو اسی طرح کی حرکتیں کرتے ہوئے اعلیٰ عہدوں تک پہنچے۔

شاعر کا انصاف

میں استاد دامن کو جو پنجابی کے معروف شاعر تھے' شروع ہی سے بہت پسند کرتا تھا۔ چنانچہ لاہور کا ایس ایس پی بننے کے بعد ایک شام کو میں ان سے ملنے بادشاہی مسجد کے قریب ان کی ایک چھوٹے سے کمرہ (جسے حجرہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا) پر مشتمل رہائش گاہ پر چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئے اور اپنے دفاع میں

دلائل دینے لگے۔

''میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں' میری کتابیں ہی وہ خطرناک ہتھیار ہیں جو میں اپنے پاس رکھتا ہوں۔'' انہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

میرے بطور ایس ایس پی تقرر سے پہلے وہ دستی بم رکھنے کے جرم میں جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔

''استاد جی آپ قطعاً پریشان نہ ہوں۔ میں محض آپ سے ملنے آیا ہوں۔'' میں نے انہیں یقین دلانا چاہا۔ تاہم میری بات ان کے دل کو نہیں لگی۔

''ایس ایس پی بہت بڑا افسر ہوتا ہے بھلا وہ ایک غریب شاعر سے ملنے کیوں آئے گا۔

آیئے ہم چلیں۔ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ کی شاطرانہ باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔'' انہوں نے خفگی سے کہا۔ پولیس نے ان کو جس طرح ہراساں کیا اور ان کے ساتھ جو بدسلوکی کی گئی تھی' اس کی بنا پر وہ بہت غصے میں اور برافروختہ لگ رہے تھے۔ انہیں یہ یقین دلانے اور قائل کرنے میں اچھا خاصا وقت لگا کہ میں محض انہیں خراجِ تحسین پیش کرنے آیا تھا۔ آخرِ کار وہ مطمئن ہو گئے اور میرے ساتھ بڑی دیر تک بات چیت کرتے رہے۔

''میں وہسکی کا شوقین ہوں۔ پولیس چاہتی تو مجھے اس جرم میں پکڑ سکتی تھی۔ لوگ بھی اس کا یقین کر لیتے۔ لیکن یہ حکومت کی بڑی بچگانہ حرکت تھی کہ میرے جیسے بوڑھے آدمی کو جیل بھیجنے کے لیے ہینڈ گرنیڈ کی برآمدگی کا ڈرامہ رچایا۔ استاد جی نے بڑے دکھ سے کہا۔ میں نے ان کی رائے سے سو فیصد اتفاق کیا۔ اس کے بعد ہمارے مابین دوستانہ مراسم قائم ہو گئے جو مرتے دم تک برقرار رہے۔ انہوں نے ایسی چیزیں لکھنا بند کر دیں جو حکومت کی نظر میں قابلِ اعتراض ہوتیں' اگرچہ اس موضوع پر ہماری کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

استاد دامن کی گرفتاری بہت بڑی زیادتی تھی۔ بظاہر اس کا مقصد ایک عوامی شاعر پر جھوٹا مقدمہ چلا کے اس کی زبان بند کرنا تھا۔

''اس طرح کا جعلی کیس کیوں رجسٹر کیا گیا تھا؟'' میں نے متعلقہ ایس پی سے پوچھا۔

''ایسے خطرناک آدمی کو قابو کرنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ پھر کہنے لگا۔

''حکومت ایسے لوگوں کو نکیل ڈالنا چاہتی ہے اور ہم نے اسے خوب سبق سکھایا جیسا کہ 1960ء کی دہائی

کے شروع میں نواب کالا باغ کی ہدایت پر ایک اور خطرناک شاعر حبیب جالب کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اس وقت میں پرانی انارکلی کا ایس ایچ او تھا۔'' اس نے مجھے متاثر کرنے کے لیے بڑے فخر کے ساتھ اپنا فلسفہ بگھارنا شروع کیا۔

''کیا اس بدسلوکی سے حبیب جالب ایوب خاں کے خلاف نظمیں لکھنے سے باز آ گیا تھا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''نہیں' وہ حرامی اور بھی زیادہ سرکش ہو گیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ایوب خاں کو محرومِ اقتدار کر کے دم لیا۔''

''یہ بات ہے تو ہم سبق کیوں نہیں سیکھتے؟''

''سر یہی واحد اور آسان راستہ ہے۔'' اس نے دلیل پیش کی

''جب ہم سے کہا جاتا ہے کہ انہیں کنٹرول کرو تو اس کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ یہ شاعر لوگ پاگل ہوتے ہیں۔ ہماری ایک نہیں سنتے۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ انہیں ایسے مقدمات کے ذریعے جیلوں میں بند کر دیا جائے۔''

اس کے بعد اس نے مجھے کچھ سکھانے کی کوشش کی۔

''سر آپ کو اس قدر زیادہ اعتراض نہیں کرنے چاہئیں۔ آپ جوان آدمی ہیں اور میں ریٹائرمنٹ کے قریب ہوں۔ آپ کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے اور بطور پولیس افسر ناکام رہیں گے۔'' وہ مشفقانہ انداز میں کہنے لگا۔

پھر اس نے بتایا کہ وہ میرے سسر کے ساتھ اس وقت کام کر چکا ہے جب وہ لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ''میں نے میاں شفیع کو بھی مشورہ دیا تھا کہ غلافِ کعبہ کی نمائش میں مولانا مودودی کے ساتھ اس قدر تعاون نہ کریں۔ مگر وہ ایک جذباتی مسلمان تھے اور انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ انہیں بطور ڈی سی برطرف کر دیا گیا تھا۔ ممکن ہے آپ کے ساتھ بھی ایسا ہو جائے۔'' یہ ایک ایسے شخص کی طرف سے مستقبل کی بابت سنگین وارننگ تھی جو مجھ سے زیادہ تجربہ کار تھا۔

''نہیں مجھے ایسی کامیاب ٹرم کی ضرورت نہیں جو بدمعاشی پر مبنی ہو۔'' میں نے اس بوڑھے' مکار اور تیز و طرار ایس پی سے زیادہ جو ایسی مکاریوں کا 37 سالہ تجربہ رکھتا تھا' اپنے آپ سے کہا۔ ''ہمیں سچائی

پر عمل کرنا چاہیے اور جھوٹے کیس نہیں بنانے چاہئیں۔

اس کے صرف تین دن بعد وہی ایس پی میرے پاس آیا اور زار و قطار رونے لگا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''مجھے ایک پرانے لایعنی الزام پر برطرف کیا جا رہا ہے۔ الزام یہ ہے کہ میں نے پی پی پی کے ایک سرکردہ لیڈر کے خلاف، جو آج کل اہم شخصیت بن گیا ہے، ایک کیس درج کرایا تھا، اب وہ کہہ رہا ہے کہ مذکورہ کیس جھوٹا تھا۔''

''کیا وہ کیس واقعی جعلی تھا؟'' میں نے اُسے چڑاتے ہوئے سوال کیا۔

''اس وقت کی حکومت ان بدمعاشوں کے خلاف تھی اور میں نے حکومت کے اشارہ پر ایسا کیا تھا۔ آج کل میں ان کے کہنے پر دوسروں کے ساتھ وہی کچھ کر رہا ہوں۔ انہیں میری موجودہ کارکردگی کو سراہنا چاہیے اور بڑھاپے میں یوں ذلیل و خوار نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ گورنر، حکومت اور ہر شخص کو بدترین الفاظ میں کوسنے لگا۔ ''وہ میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کر کے کمینہ پن کا مظاہرہ کر رہے ہیں، میرے ساتھ انصاف ہونا چاہیے اور مجھ پر رحم کرنا چاہیے۔''

میں نے آئی جی سے بات کی اور انہیں بتایا کہ اس بیچارے کی ملازمت کے صرف 7 مہینے باقی رہ گئے ہیں۔ اس کی طویل ملازمت اور بڑھاپے کا کچھ خیال کریں۔ انہوں نے گورنر سے سفارش کر کے اسے باعزت طور پر ریٹائر کرا دیا۔

حکمرانوں کو گمراہ کرنا

ایک دفعہ مجھے صدرِ پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے احکام پر مشتمل ایک مراسلہ موصول ہوا جس میں ایک ''اغوا شدہ لڑکی'' کی برآمدگی اور ملزموں کی فوری گرفتاری کا حکم درج تھا۔ اس وقت میں ایس ایس پی راولپنڈی تھا۔ شکایت کنندہ پی پی پی کا کارکن تھا اور مری سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے شکایت کی کہ اس کی گریجوایٹ ہمشیرہ کو ان کے ہمسایہ نے گھوڑا گلی (مری) کے مشہور ٹرانسپورٹر راجہ محمد سرور اور راجہ غلام سرور کی مدد سے اغوا کر لیا ہے۔ اس نے یہ الزام بھی لگایا کہ راجہ برادران نے اس شیطانی فعل کا ارتکاب پی پی پی کے ایک غریب اور سرگرم کارکن کو خوفزدہ کرنے کے لیے کیا ہے کیونکہ وہ بڑے بااثر ہیں اور مسلم لیگ سے تعلق رکھتے ہیں۔

میں نے دستیاب معلومات کا جائزہ لیا اور ذاتی طور پر مری جا کر شکایت کنندہ سے ملاقات کی۔

مقدمہ درج کر کے لڑکی کو برآمد کرنے کے لیے تین ٹیمیں تشکیل دی گئیں۔ میں لڑکی کی برآمدگی سے پہلے عمر رسیدہ راجہ برادارن کو گرفتار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ لڑکی کا گریجوایٹ ہونا ظاہر کرتا تھا کہ وہ بالغ ہے اور ممکن ہے اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہو۔ میں اپنے تجربہ اور اخلاقی حکمتِ عملی کی روشنی میں کام کر رہا تھا' اگرچہ مجھے کئی پولیس افسروں نے مشورہ دیا کہ صدر کو خوش کرنے کے لیے راجہ برادرز کو فوراً گرفتار کرلوں' خواہ ان کا اس معاملہ سے واسطہ ہے یا نہیں۔ مگر میں دو معزز شہریوں کی شہرت کو کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر داغدار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لڑکی کو 21 دن کی انتھک کوشش کے بعد صوبہ سرحد کے علاقہ درگئی سے برآمد کرلیا گیا۔ اسے قانون کے مطابق ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے بیان دیا کہ وہ ملزم لڑکے کے ساتھ اپنی مرضی سے بھاگی تھی اور اس نے قانون کے تحت اس کے ساتھ شادی کرلی ہے۔ وہ بالغ تھی اور قانوناً ایسا کرنے کا حق رکھتی تھی۔ اس کے والدین فوت ہوچکے تھے۔ اس نے بھائی کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔ اسے ڈر تھا کہ بھائی جان سے مارڈالے گا۔

''سر صدر کے واضح احکام کی روشنی میں اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' ایس ایچ او نے مجھ سے دریافت کیا۔ اس کے لیے حکم شاہی فرمان کا درجہ رکھتا تھا خواہ اصل معاملہ کچھ ہی کیوں نہ ہو' کیونکہ وہ حکم سب سے بڑے حاکم کی طرف سے دیا گیا تھا۔

''آپ صرف قانون پر عمل کریں۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا۔

مقدمہ خارج کر کے لڑکے کو رہا کردیا گیا۔ اس پر شکایت کنندہ بھی طیش میں آ گیا۔ وہ بہر صورت اپنے خاندان کی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ حالانکہ قصور اس کی اپنی بہن کا تھا۔ اس نے مری میں صدر سے ملاقات کی۔ ہم سب کے خلاف بآواز بلند احتجاج کیا اور ہمیں سرمایہ داروں و جاگیرداروں کے گماشتے قرار دیا۔ بھٹو کو یہ بات بڑی ناگوار گزری کہ ان کے واضح احکام کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ انہوں نے سعید احمد خاں کو حکم دیا کہ معاملہ کی چھان بین کر کے تمام ملزمان کو جیل بھجوانے کا اہتمام کیا جائے۔

سعید احمد خان ایک ریٹائرڈ پولیس افسر تھے۔ میں نے انہیں کیس کے حقائق اور واقعات سے آگاہ کیا۔ معاملہ ان کی سمجھ میں آجانا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس وہ مجھے مشورہ دینے لگے کہ راجہ برادرز کو کچھ دنوں کے لیے سلاخوں کے پیچھے بھیجنا چاہیے تاکہ شکایت کنندہ مطمئن ہوجائے اور بھٹو صاحب کا غصہ ٹھنڈا

ہو سکے۔ لیکن میرا احساسِ ذمہ داری ایسا کرنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ میں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اسے اپنی توہین پر محمول کیا اور سخت برہم ہوئے۔

مجھ پر نا اہلی کا الزام لگانے کے لیے جب کہ ہر چیز میرے حق میں تھی' مجھ سے جواب طلبی کی گئی کہ لڑکی کو برآمد کرنے میں 21 دن کیوں لگے جبکہ صدر کی طرف سے واضح حکم دیا گیا تھا کہ اسے فوراً برآمد کیا جائے؟ میں نے ان کو تفصیلی جواب لکھ بھیجا جس میں پولیس کی سر توڑ کوششوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اس زبانی بحث کا حوالہ بھی دیا جس میں انہوں نے محض صدر کو مطمئن کرنے کے لیے غیر ضروری گرفتاریاں کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے مراسلہ کے آخر میں لکھا۔ ''مجھے کامل یقین ہے کہ صدر کسی خلافِ قانون کام کی خواہش نہیں رکھتے۔'' سعید احمد خان نے میرا جواب صدر کو پیش کرنے سے پہلے اس پر درج ذیل نوٹ لکھا۔ ''ایس ایس پی نے یونہی ٹامک ٹوئیاں ماری ہیں۔'' بھٹو نے فائل پر لکھا۔ ''اس معاملہ کو دفع کرو' لڑکی لازماً نفس پرست ہو گی۔'' صدر کے ملٹری سیکرٹری جنرل اسحاق نے وہ نوٹ مجھے دکھایا اور بتایا کہ ''صدر نے ہدایت کی ہے کہ یہ فائل سعید احمد خاں کو نہ بھیجی جائے۔''

چوہدری ظہور الٰہی کا اغوا

ایس ایس پی لاہور کا چارج لینے کے چند دن بعد مجھے کسی لڑکے کا فون موصول ہوا' جس کا نام یاد نہیں آ رہا' اس نے اطلاع دی کہ شفیع نامی آدمی کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اسے لاہور کے مغرب میں واقع چوہنگ کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ وہ پولیس کے ایمرجنسی سنٹر کو بھی مطلع کر کے فوری امداد کی درخواست کر چکا تھا۔ میں نے پولیس کنٹرول کو ضروری کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ اگرچہ مجھے اصل معاملہ کا علم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

ایک ہفتہ یا کم و بیش مدت کے بعد ایک دن میں گورنر کا استقبال کرنے ہوائی اڈہ پر گیا' تھوڑی دیر میں وکیل خاں بھی آ گئے اور کہنے لگے۔ ''چوہدری ظہور الٰہی نے لاہور ہائیکورٹ میں دائر کردہ ایک رٹ میں تمہیں صفائی کا گواہ نامزد کیا ہے۔'' میرے لیے وہ خبر بڑی حیران کن تھی۔

''معاملہ کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ اس پر انہوں نے مجھے فون کال کی بابت اور اس پر میری کارروائی کا ذکر کرنے کے بعد تاکید کی کہ میں ہائیکورٹ میں کوئی بیان نہ دوں۔

''میں نے کال واقعی وصول کی تھی' مجھے اس کا اقبال کرنا ہو گا اور میں عدالت میں سچائی پر قائم

رہوں گا۔"

"اس سے حکومت کی پوزیشن خراب ہوگی' کیونکہ جس شخص کو اغوا کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق ظہور الٰہی کیس سے ہے۔" انہوں نے کہا

"ایسی صورت میں اس کے ساتھ حکومت کا کیا تعلق بنتا ہے اور میں جھوٹ کیوں بولوں؟" میں نے دریافت کیا۔

"تم اس کے نتائج نہیں سمجھ سکتے۔" انہوں نے مجھے ایک طرف لے جا کر رازدارانہ انداز میں کہا: "چوہدری ظہور الٰہی کو بلوچستان بھیج دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ وہاں نمٹا جائے گا۔ ہم نہیں چاہتے کہ یہاں اس کا کوئی سراغ ملے یا پتہ چلے۔"

"اگر مجھے طلب کیا گیا تو میں عدالت میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔" میں نے ان پر واضح کر دیا۔ وہ غصہ کے مارے لال پیلے ہونے لگے اور میرے منہ پر مجھے بیوقوف کہہ گئے۔ میں نے مسکرا کر خاموشی اختیار کر لی۔

انہوں نے دھمکی دی کہ گورنر سے میری شکایت کریں گے۔ میں بدستور چپ رہا۔ مصطفیٰ کھر آئے تو وکیل خاں انہیں ایک طرف لے گئے اور دونوں میں خاصی دیر تک گٹ پٹ ہوئی۔ پھر گورنر نے مجھے اشارہ کیا کہ میں بھی ان کی گفتگو میں شریک ہو جاؤں۔

"تم وکیل خاں کی بات کیوں نہیں سنتے؟" کھر نے تحکمانہ لہجہ میں پوچھا۔

میں نے انہیں بتایا کہ یہ واقعہ حکومت کی مزید بدنامی کا باعث بنے گا۔

"کیسے؟" انہوں نے سوال کیا۔ میں نے پوری کہانی اور وکیل خاں کا بتایا ہوا پس منظر بیان کر دیا۔ وہ بڑے حیران ہوئے اور وکیل خاں سے پوچھا:

"یہ سارا معاملہ میرے علم میں کیوں نہیں لایا گیا؟" "اوپر سے ایسے ہی احکام ملے تھے۔" وکیل خاں نے آہستگی سے جواب دیا۔

"لیکن تم سے کس نے کہا تھا؟" کھر نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"مسٹر سعید احمد خاں نے" جواب ملا۔ کھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے دور چلے گئے۔

مجھے بعد میں پتہ چلا کہ مذکورہ درخواست واپس لے لی گئی اور چوہدری ظہور الٰہی کو بلوچستان سے

بخیر و عافیت ان کے گھر بھیج دیا گیا۔ وہ مسلم لیگ کے سرکردہ راہنما تھے اور ایوب خاں کے دور میں جماعت کے سیکرٹری جنرل رہ چکے تھے۔ ان دنوں بھٹو کے زبردست نکتہ چیں تھے۔ بعد میں مبینہ طور پر الذوالفقار کے آدمیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

کچھ عرصہ بعد سعید احمد خاں لاہور آئے اور ان کا کھیل خراب کرنے پر مجھے سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں۔ میں ان کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آیا اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ ایسے واقعات الٹے گلے پڑ جاتے ہیں۔ وہ یہ جان کر طیش میں آ گئے کہ میں نے گورنر کو بھی سب کچھ بتا دیا ہے۔ کہنے لگے: ''میں تمہارے گورنر کو بھی دیکھ لوں گا۔'' وہ سخت طیش کی حالت میں اور میں ٹھنڈے مزاج سے باتیں کرتا رہا۔ تاہم کسی اصول پر سمجھوتہ نہیں کیا۔

میں نے اس واقعہ سے آئی جی صاحب زادہ رؤف علی خاں کو مطلع کیا۔ وہ بڑے پریشان ہوئے۔ انہوں نے سعید احمد خان کو خطرناک آدمی قرار دیا۔ شام کو وہ اپنے ساتھ مجھے بھی گورنر کے پاس لے گئے اور ہم نے اس واقعہ کے مضمرات پر تبادلہ خیال کیا۔

''میں نے اس معاملے کی بابت بھٹو صاحب سے بات کر لی ہے۔'' گورنر نے بتایا۔ ان کی روایت کے مطابق بھٹو نے ان سے کہا تھا: ''مجھے پتہ نہیں یہ بدمعاش پولیس افسر میرے پسِ پشت کیا کرتے رہتے ہیں۔ انہیں کوئی احمقانہ حرکت نہ کرنے دیں۔''

''وکیل خاں پر کڑی نظر رکھیں۔'' انہوں نے صاحبزادہ کو تاکید کی۔

''سر' بھٹو صاحب سے کہیں کہ ایسے لوگوں کو لگام دیں' پیشتر اس کے کہ وہ کوئی بڑا قدم اٹھائیں۔'' آئی جی نے گورنر کو مشورہ دیا۔

واپس آتے ہوئے صاحبزادہ نے کہا: ''اب سعید احمد خان کھر کے خلاف ساز باز کرے گا۔ میں وکیل خاں سے نمٹ لوں گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''وہ اپنے طور پر ایسا کس طرح کر سکتے تھے؟'' میں نے پوچھا

''وہ کر سکتے ہیں اور اپنی اہمیت جتانے کے لیے ایسا کرتے رہے ہیں۔'' انہوں نے جواب دیا۔ پھر بولے: ''سعید احمد خاں' مسعود محمود اور وکیل خاں سوائے برائی کے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک خطرناک ''ٹرائیکا'' ہے۔ وہ ہم سب کو بدمعاشی اور تشدد کے جال میں پھنسانے کی کوشش کریں گے' آپ محتاط

رہیں۔"

میں گھر جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے ہوم سیکرٹری حاجی اکرم کے ہاں رک گیا اور انہیں پوری کہانی سنائی۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ اس واقعہ کی بابت پہلے ہی جانتے تھے' خود کھر نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔



باب35

آئی جی بننے سے گریز

وزیرِ اعلیٰ نے اکتوبر 1986ء میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے بعد مجھ سے انسپکٹر جنرل آف پولیس کا چارج سنبھالنے کو کہا۔ میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں بہت جونیئر ہوں۔ وہ کہنے لگے: "مجھے

معلوم ہے کہ عباس خاں جو تمہارے بیچ میں تم سے جونیئر تھے سرحد کے آئی جی بن گئے ہیں۔'' ممکن ہے انہوں نے اسٹیبلشمنٹ ڈویژن سے معلومات حاصل کی ہوں۔ ''لیکن سر ابھی مجھے آئی جی کے رینک میں رسمی طور پر ترقی نہیں ملی ہے۔'' میں نے مزید عذر پیش کیا۔

اس کے فوراً بعد فیڈرل پروموشن بورڈ کا اجلاس بلایا گیا۔ مجھے پتہ چلا کہ نمبر لگانے کے طریق کار کے مطابق میرے دو نمبر کم تھے۔ میں نے سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ آفتاب احمد خاں سے ملاقات کی اور انہیں درپیش مسئلہ سے آگاہ کیا۔ ان کے ساتھ یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ انہوں نے بتایا کہ بریگیڈیئر ظفر اقبال اس معاملے میں پہلے ہی بات کر چکے ہیں۔ پھر بتایا کہ ''میں نے فیڈرل سیکورٹی سیل سے وہ تمام مقالات منگا لیے ہیں جو آپ نے لکھے تھے۔ میں نے کسی سرکاری ملازم کی طرف سے اتنی گہرائی اور بصیرت کے ساتھ لکھے ہوئے مقالات کبھی نہیں دیکھے۔ آپ نے ایک نازک مرحلہ پر پاکستان کو راہِ راست پر ڈالا۔ آپ کو یقیناً ترقی ملے گی۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ نمبروں کی کمی کے بارے میں بالکل پریشان نہ ہوں' آپ جیسے افسر تو ملک کے لیے اثاثہ ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے بڑی گرم جوشی سے گلے لگا لیا۔ میں ان کی شفقت اور خلوص سے بے حد متاثر ہوا۔

پروموشن بورڈ نے سات افسروں کو آئی جی کے رینک میں ترقی دینے کی سفارش کی۔ اس فہرست میں میرا نمبر آخری تھا۔ پھر وہ سمری منظوری کے لیے وزیر اعظم کو بھیج دی گئی۔ مرزا محمد علی' ایس پی سپیشل برانچ راولپنڈی نے مجھے مطلع کیا کہ آئی جی پنجاب ایس ڈی جامی نے جونیجو سے ملاقات کی' اس کے بعد وزیر اعظم نے مذکورہ فہرست میں سے پانچ ناموں کی منظوری دے دی اور آخری دو نام اس بنا پر نظر انداز کر دیئے کہ سردست صرف پانچ اسامیاں خالی ہیں۔ محمد علی سمجھ گئے کہ وہ ساری کوشش فہرست میں سے میرا نام خارج کرانے کے لیے کی گئی تھی تاکہ میں آئی جی نہ بن سکوں' جامی کو اپنی سیٹ کے چھن جانے کا خطرہ تھا۔

بہر حال پروموشن میرا حق بنتا تھا۔ میں نے اس معاملہ سے وزیر اعلیٰ کو آگاہ کیا۔ انہوں نے وزیر اعظم سے بات کی تو جونیجو نے آسامی نہ ہونے کا بہانہ بنایا۔ نواز شریف نے انہیں بتایا کہ چوہدری سردار پہلے ہی قائم مقام ایڈیشنل آئی جی کے عہدہ پر کام کر رہے ہیں۔ صرف ایک آسامی کی ضرورت ہے۔ پھر وہ چوہدری منظور کو بھی پنجاب میں لے لیں گے' جو مجھ سے سینئر تھے۔ میاں صاحب کے اصرار پر وزیر اعظم نے

ایک مہینے بعد ہمارے پروموشن کی منظوری دے دی۔ میں ریگولر بنیاد پر ترقی ملنے کے بعد ایڈیشنل آئی جی' سپیشل برانچ کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ چوہدری منظور احمد کی خدمات بھی جلد ہی حکومتِ پنجاب کے سپرد کردی گئیں۔

میں نے چوہدری منظور کو مشورہ دیا کہ وزیراعلیٰ نے ترقی کے معاملہ میں ان کی جو مدد کی ہے' اس پر انہیں میاں صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے' میں انہیں وزیرِ اعلیٰ کے سیکرٹری نوید احسن کے پاس لے گیا' انہوں نے فوری طور پر ملاقات کرادی۔ چوہدری منظور اندر چلے گئے اور میں باہر نوید کے پاس بیٹھ گیا۔ چند منٹ چوہدری صاحب مسکراتے ہوئے تاہم کسی قدر حیران و پریشان باہر نکلے۔ ہمیں بھی حیرت ہوئی کہ ان کا انٹرویو اتنی جلدی کیسے ختم ہوگیا۔ میں نے پوچھا: ''کیا معاملہ ہے؟'' مگر وہ بدستور ہنستے رہے۔

آخر کار چوہدری منظور نے یہ بتا کر ہماری حیرت ختم کردی کہ انہوں نے میاں صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میاں صاحب خود بول پڑے اور کہنے لگے: ''نہیں قطعاً نہیں۔ میں نے تمہاری کوئی مدد نہیں کی۔ تمہاری مدد چوہدری سردار نے کی ہے۔ میں انہیں ترقی دلانا چاہتا تھا' آپ ان سے سینئر تھے' اس لیے تمہیں پروموٹ کرنا پڑا۔ میں تو آپ کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں۔ وہ آپ کے بارے میں بہت اچھی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں آپ کو پنجاب میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ کی مناسب جگہ پر پوسٹنگ کی جائے گی۔''

چوہدری منظور میاں صاحب سے پہلی بار ملے تھے وہ ان کی صاف گوئی سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے کہا: ''آج کل کے دور میں میاں صاحب فرشتہ ہیں۔ وہ سیاست میں کیسے چل سکیں گے؟ لوگ معمولی باتوں کے لیے بھی دوسروں کو ممنونِ احسان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر یہاں ایک ایسا آدمی بھی ہے جس نے مجھے ترقی دلائی' میرا پنجاب میں تبادلہ کرایا' مگر ایسا تاثر نہیں دینا چاہتا کہ وہ میرا محسن ہے۔ وہ واقعی انتہائی شریف آدمی ہیں۔'' میں نے منظور کو بتایا کہ میں پنجاب میں کیسے آیا تھا۔ وہ ایک مختلف قسم کے سیاستدان ہیں۔ بالکل دوسری طبیعت اور فطرت کے انسان ہیں۔

سازشی کہلانا پسند نہیں

مجھے دوسری بار فروری 1987ء میں آئی جی بننے کی پیشکش کی گئی۔ نواز شریف حاجی اکرم کو اور مجھے چہل قدمی کے لیے اپنی رہائش گاہ کے قریب واقع ''لائینز پارک'' لے گئے۔ انہوں نے حاجی اکرم سے

کہا کہ مجھے آئی جی بننے پر آمادہ کریں۔ اس وقت میری باقاعدہ ترقی ہو چکی تھی۔

''آپ آئی جی بننے سے خوفزدہ کیوں ہیں؟'' میاں صاحب نے اچانک سوال داغ دیا۔

''نہیں سر میں ہرگز خوفزدہ نہیں ہوں۔ دراصل میں سازشی نہیں کہلانا چاہتا۔ جامی نے میری ترقی کا راستہ روکنے کی کوشش کی تاکہ میں ان کی جگہ نہ لے سکوں۔ اب اگر میں ان کا جانشین بن گیا تو سارے زمانہ میں کہتے پھریں گے کہ میں نے ان کے خلاف ساز باز کر کے ان کی سیٹ پر قبضہ کر لیا ہے۔ میری بات پر کوئی بھی یقین نہیں کرے گا کہ مجھے وہ منصب میرٹ پر دیا گیا ہے۔ میرے نزدیک عزتِ نفس اور خودداری آئی جی کے باوقار منصب سے زیادہ اہم ہے۔ مجھے پورا یقین ہے ان شاء اللہ ایک دن یہ منصب مجھے ضرور ملے گا۔''

حاجی صاحب نے کہا: ''دوسرے لوگ اور آپ کے ساتھی کیا کہتے ہیں' اس کی پرواہ نہ کریں۔ آپ سینئر اور اس عہدہ کے اہل ہیں۔'' پھر میاں صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگے: ''سر آپ ان کے آرڈرز جاری کردیں یہ چارج لے لیں گے۔'' حاجی صاحب کے ان کلمات پر مجھے خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ اس کے ساتھ ہی ہماری ملاقات ختم ہوگئی۔

واپس آتے ہوئے راستہ میں حاجی صاحب نے میرے فلسفیانہ اور بزدلانہ طرزِ عمل پر خفگی کا اظہار کیا اور سرزنش کرتے ہوئے بولے: ''تم نے اس وقت بھی ایسے ہی طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا اور غیر ضروری تکلفات سے کام لیا تھا جب قاضی اعظم نے تمہیں راولپنڈی کا ڈی آئی جی بنایا تھا۔'' تنگ آ کر میں نے کہہ دیا: ''آپ اور میاں صاحب جو بھی فیصلہ کریں گے' مجھے منظور ہوگا۔'' میں ذہنی طور پر تیار ہو گیا لیکن مطلوبہ احکام جاری نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی نہ ہی میں نے کسی سے پوچھا۔ مجھے ایسی زیادہ خواہش بھی نہیں تھی' اس لیے میں نے اپنا کام جاری رکھا۔

جولائی 1987ء میں پنجاب کابینہ کا ایک اجلاس مری کے جناح ہال میں ہوا۔ جس میں صوبائی وزیر سردار عارف رشید نے ٹریفک پولیس کے ایک اے ایس آئی کی شکایت کی جس نے ان کی اہلیہ کے ساتھ بدتمیزی کی تھی' لیکن آئی جی جامی نے اے ایس آئی کا بھرپور دفاع کیا۔ کابینہ کے دیگر ارکان کو بھی پولیس سے شکایات تھیں۔ ان پر زبردست لے دے ہوئی اور فضا کشیدہ ہوگئی' یہاں تک کہ وزیر اعلیٰ کو مداخلت کرنی پڑی۔

جامی کا مزاج برہم تھا۔ میں ان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ میں نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی، مگر لا حاصل۔ انہوں نے بہت زیادہ سیاسی مداخلت کی شکایت کی اور کہا کہ انتظامیہ پاگل ہوگئی ہے۔ ان کا یہ کہنا بڑی حد تک درست تھا۔ جب فضا حد سے زیادہ کشیدہ ہوگئی تو تمام افسران کو ماسوائے چیف سیکرٹری و ہوم سیکرٹری اجلاس سے چلے جانے کو کہا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ طویل بحث کے بعد آئی جی کو معاملات ایک مہینہ کے اندر اندر درست کرنے کا موقع دیا گیا۔ اگلے مہینے جامی کا تبادلہ ہوگیا اور نثار احمد چیمہ نے قائم مقام آئی جی کی حیثیت سے چارج سنبھال لیا۔

کمزور اخلاقی موقف اختیار کرنے سے گریز

قریباً ایک مہینہ بعد میرے دوست خالق اعوان چیف سیکرٹری، انور زاہد سے ملے۔ انور زاہد نے اعوان سے کہا کہ ''میں چیمہ کو آئی جی بنانے میں دلچسپی رکھتا ہوں، کیونکہ وہ میرے دوست ہیں۔ لیکن چوہدری سردار کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ مجھے اُمید ہے، سردار کو ناگوار نہیں گزرے گا۔'' اعوان میری طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے، انہوں نے کہا: ''میں جانتا ہوں۔ چوہدری صاحب آئی جی بننے کی خواہش نہیں رکھتے۔ آپ چیمہ کے کیس کو آگے بڑھائیں۔''

خالق اعوان نے مجھے انور زاہد کے خیالات سے آگاہ کیا تو میں نے ان سے ملاقات کی۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے آئی جی بننے کی کوئی خواہش نہیں۔ میں جس جگہ کام کر رہا ہوں، وہیں خوش ہوں۔'' انہوں نے سمجھا کہ میں انہیں اپنے دل کی بات نہیں بتا رہا۔ چنانچہ انہیں قائل کرنے کے لیے مجھے خاصا وقت صرف کرنا پڑا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ میرے دل کی آواز ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ آگے جانے کے لیے مجھے بہت دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ بے صبری و بے چینی کبھی میری کمزوری نہیں رہی۔ اس دفعہ نواز شریف نے مجھ سے براہ راست نہیں کہا کہ میں آئی جی بن جاؤں۔ ممکن ہے وہ اس سوچ میں ہوں کہ میں اس وقت بھی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے بعد جلد ہی چیمہ کو آئی جی بنا دیا گیا۔

پھر اچانک نثار احمد چیمہ کا تبادلہ کر دیا گیا اور 1989ء کے شروع میں وفاقی حکومت نے انہیں واپس بلا لیا۔ وزیر اعلیٰ نے نئے آئی جی کا انتخاب کرنے کے لیے ایک اجلاس بلایا جس میں غلام حیدر وائیں، چوہدری شجاعت حسین، چوہدری نثار علی، انور زاہد (چیف سیکرٹری) ملک مجید، وزیر اعلیٰ کے سیکرٹری اور راقم

الحروف نے شرکت کی۔ مجھے کہا گیا کہ میں آئی جی کا چارج لے لوں۔ یہ تیسرا موقع تھا جب نواز شریف نے مجھے اس باوقار اور اعلیٰ عہدہ کی پیشکش کی۔

میں نے وزیراعلیٰ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ”وفاقی حکومت کی طرف سے معطلی کے فوراً بعد مجھے برتر عہدہ پر فائز کرنا نامناسب اور غلط ہوگا۔ اس وقت میری معطلی کو محض ایک ہفتہ یا دس دن ہوئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ یا مجھے ایسا موقف اختیار کرنا پڑے جو اخلاقی لحاظ سے کمزور ہو۔“ اس میں شک نہیں کہ میری پوزیشن بہتر ہو جاتی اور میرا خاندان جو میری معطلی سے پریشان تھا، مطمئن ہو جاتا، لیکن میں اصول کے مطابق چلنا چاہتا تھا۔ وگرنہ میری اس پیشہ ورانہ دیانت پر حرف آتا جسے میں نے اپنے پورے کیریئر کے دوران جان سے بڑھ کر عزیز رکھا تھا۔ میں نے اپنی ملازمت کو کبھی طاقت یا اختیارات کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ قانون کی بالادستی قائم رکھنے کا مشن تصور کیا۔ اختیارات ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی ذمہ داریوں کو ہمیشہ اللہ کی طرف سے سونپی گئی امانت سمجھا ہے۔

میرے خیالات سن کر میٹنگ میں شریک ہر شخص کو تعجب ہوا۔ سب نے میرے طرزِ عمل کو سراہا۔ انور زاہد نے بطور خاص تعریف کی۔ انہوں نے اور میں نے مل کر سفارش کی کہ چوہدری منظور کو، جو ان دنوں پنجاب میں بطور سیکرٹری پاپولیشن پلاننگ کام کر رہے تھے، آئی جی بنا دیا جائے۔ وفاقی حکومت اور راؤ رشید نے چوہدری صاحب پر دباؤ ڈالا کہ وہ نئی پوسٹنگ پر جانے سے معذرت کر لیں، تاہم ان کی کوششیں ناکام ہو گئیں اور چوہدری صاحب نے آئی جی کا منصب سنبھال لیا۔

کبھی صلہ کی توقع نہیں رکھی

1990ء کے الیکشن کے بعد انور زاہد نے، جنہیں نواز شریف نے اپنے پرنسپل سیکرٹری کے طور پر چن لیا تھا، مجھ سے ایک بار پھر پوچھا۔ آیا میں پنجاب کا آئی جی بننا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا ”منظور ہے لیکن میرے دوست منظور احمد کو اپنی ٹرم عزت کے ساتھ پوری کر لینے دیں۔“

”آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں کیا یہ آپ کی سوچی سمجھی رائے ہے؟“

انہوں نے سوال کیا۔ پھر خود ہی کہنے لگے۔

”اگر یہ بات ہے تو میں میاں صاحب کو بتاتا ہوں۔“

”بے شک۔ میں ڈائریکٹر انسدادِ رشوت ستانی کے منصب پر بے حد خوش ہوں۔“ میں نے ان سے کہہ دیا۔ چنانچہ چوہدری منظور بحیثیت آئی جی کام کرتے رہے۔

میاں صاحب کا خیال تھا کہ میں نے ان کی خاطر بہت سی تکالیف برداشت کی ہیں' اس لیے اس کے صلے میں مجھے کوئی پسندیدہ پوسٹ ملنی چاہیے۔ میں نے ان پر واضح کر دیا کہ میرا موٴقف شروع سے اصولوں پر مبنی اور قانون کے مطابق رہا ہے۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اسے لاہور ہائیکورٹ میں سرخروئی حاصل ہوگئی ہے۔ مجھے کسی معاوضہ یا صلہ کی خواہش نہیں۔ میں نے برتر عہدہ کو اتھارٹی کی بجائے ہمیشہ بھاری ذمہ داری سمجھا ہے۔ میں اپنے فرائض صحیح طریقہ سے ادا کرنا چاہتا ہوں جس کی بدولت لوگوں کی فلاح و بہبود میں کوئی کردار ادا کر سکوں۔ اس سے مجھے سکون بھی ملتا ہے اور راحت بھی۔

میں نے 1990ء میں ایف آئی اے کا ڈائریکٹر جنرل بننے سے بھی معذرت کر لی تھی کیونکہ میرے دوست اور بیج کے ساتھی وجاہت لطیف کو وہاں چارج لیے محض تین مہینے ہوئے تھے میں نے انہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ انور زاہد نے مجھ سے سندھ کا آئی جی بننے کو کہا مگر میں نے ڈائریکٹر انسدادِ رشوت ستانی کے طور پر کام کرنے کو ترجیح دی۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو کے عہدہ کی پیشکش کی جو پولیس کیڈر میں سب سے سینئر پوسٹ تھی۔ میرے دوستوں ڈاکٹر صفدر محمود اور حاجی اکرم نے بھی وہ عہدہ قبول کر لینے کا مشورہ دیا۔ مجھے وہ کام پسند تھا کیونکہ میرے مزاج سے مطابقت رکھتا تھا لیکن ظفر اقبال راٹھور کو وہ منصب سنبھالے صرف چار مہینے ہوئے تھے' اس لیے میں نے سوچا کہ انہیں اپنی ٹرم مکمل کرنے دی جائے۔

ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو کا عہدہ ایک دفعہ اور اس طرح پیش کیا گیا کہ وزیراعظم کے برادرِ خورد شہباز شریف نے مجھے کھانے پر بلایا اور اس بارے میں بات چیت کی۔ میں نے سوچا کہ اتنی حساس پوسٹ کی بابت وزیراعظم کو خود بات کرنی چاہیے تھی۔ میں کوئی بھی پوسٹ خواہ وہ کسی قدر اہم کیوں نہ ہو۔ نوازش کے طور پر قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ کیونکہ کسی کا ممنونِ احسان ہونے سے انصاف کے بارے میں میرے تصور کے متاثر ہونے کا خدشہ تھا۔

سرکاری ملازم محض کھلونوں کی طرح نہیں ہوتے۔ انہیں فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں۔ تبادلے اور تعیناتیاں سرکاری ملازم اور اس کے خاندان کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ خصوصاً بچوں کی تعلیم کے

نقطۂ نظر سے' لائق' مستعد اور مؤثر انتظامیہ رکھنے کے لیے صحیح آدمی کا صحیح جگہ پر اور صحیح وقت پر ہونا بہت ضروری ہے۔ تعیناتیاں حکمرانوں اور انتظامیہ کے ہاتھوں میں ایسا حربہ نہیں ہونا چاہیے جس سے ملازمین کو خوش کرنے یا تنگ کرنے کا کام لیا جائے۔ صاف ستھری اور با اثر انتظامیہ کے لیے لازمی ہے کہ سینئر ایڈمنسٹریٹر کو بھی قبل از وقت ترقی نہ دی جائے۔ ترقی مقررہ طریقہ سے میرٹ پر ملنی چاہیے۔ سرکاری ملازم کی عزتِ نفس اور خودداری کو کسی صورت ٹھیس نہیں لگنی چاہیے۔ سروس اور سینارٹی کے قواعد موجود ہیں جو افسروں کو ایسی پریشانیوں سے بچاتے ہیں اور پوری لگن کے ساتھ کام کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ میں نے بہت سے دیانتدار افسروں کو ان کے سینئروں کے سامنے نوکری بچانے یا ترقی پانے کے لیے جھکتے اور خوشامدیں کرتے دیکھا ہے۔ سینئر حکام ان کی خواہشات کے ساتھ خوب کھیلتے ہیں۔

میرے دوستوں میں سے اکثر میرے طرزِ عمل پر حیران ہوتے تھے۔ وہ میری ہمدردی میں میاں صاحب پر تنقید کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ ان کے خیال میں میاں صاحب ایک ایسے افسر کو نظر انداز کر رہے تھے جس نے اپنا سارا کیریئر ان کے لیے داؤ پر لگا دیا تھا۔ جب میں حقیقی پوزیشن کی وضاحت کرتا تو وہ اسے پاگل پن قرار دیتے۔ میرے ہم جماعت اور بیچ میٹ خاور زمان نے کہا: ''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ آئی جی کے منصب کو اپنے وقار سے کمتر سمجھتے ہیں اور کسی بہت اعلیٰ عہدہ پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔''

''میں پوسٹنگ کے بغیر نہیں ہوں اور ڈائریکٹر انسداد اور رشوت ستانی کوئی بری پوسٹ نہیں ہے۔'' میں نے انہیں بتایا:

''ہمارے ساتھی اس بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ اس بات پر حیران ہیں کہ آپ نے میاں صاحب کی طرف سے اتنی اچھی پیشکشیں کیوں ٹھکرا دی ہیں۔ وہ تو اس قسم کی پہلی ہی پیشکش پر اچھل پڑتے۔ آپ کے انکار کا کوئی خاص سبب ہوگا۔''

''ایک پولیس افسر کے لیے آئی جی کا عہدہ سب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہم دونوں نے بطور اے ایس پی کیریئر شروع کیا تھا اور اسے بحیثیت آئی جی ختم کرنے کے خواہاں ہیں۔ میں اس سے بلند تر منصب کی خواہش کیسے کر سکتا ہوں جب کہ اس سے اوپر کوئی عہدہ ہے ہی نہیں؟ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں میاں صاحب کے پاس جاؤں اور ان سے کہوں کہ اپنی سیٹ میرے لیے خالی کر دیں۔'' اس پر ہم دونوں دیر تک

کھلکھلا کر ہنستے رہے۔

بہت سے لوگ میرے رویہ کی اپنے طور پر تاویل کرتے تھے' تاہم میں نے ان کے ساتھ افلاطون کی سی لاتعلقی روا رکھی جو رائے عامہ کو "سائے کا سایہ اور حقیقت سے بعید" سمجھتے تھے۔

آئی جی کے عہدہ پر تقرر

پھر اچانک ایک بحران پیدا ہو گیا اور حالات نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا کہ میں زیادہ دیر تک اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکا اور آئی جی کا منصب سنبھالنا پڑا۔

17 جون 1991ء کو ٹریفک کے ایک اے ایس آئی نے مسلم لیگ کے دو ایم پی ایز کے ساتھ اسمبلی چیمبر کے سامنے بدتمیزی کی۔ انہوں نے کار کے شیشوں پر سیاہ رنگ کے پردے لٹکا رکھے تھے۔ یہ چیز خلافِ قانون تھی اور ٹریفک پولیس کی طرف سے ان دنوں اس کے خلاف ایک زوردار مہم چلائی جا رہی تھی۔ انہوں نے پولیس مین کے اعتراض کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور اسے ایک ادنیٰ اہلکار کے ہاتھوں اپنی بے عزتی پر محمول کیا۔ ادھر اے ایس آئی بھی اکڑ گیا۔

اسمبلی کا سیشن جاری تھا۔ دونوں ایم پی اے جذبات اور غصہ سے مغلوب ہو کر ایوان میں داخل ہوئے اور اپنی توہین پر بآواز بلند احتجاج کرنے لگے۔ انہوں نے اے ایس آئی اور ایس پی ٹریفک کے خلاف فوری اور سخت کارروائی کا مطالبہ کیا۔ دوسرے ارکان نے جو سب کے سب حکمران جماعت سے تعلق رکھتے تھے' نہ صرف اس مطالبہ کی حمایت کی بلکہ آئی جی کے تبادلہ کے لیے بھی شور مچانا شروع کر دیا' کیونکہ ان میں سے اکثر کسی نہ کسی وجہ سے ان سے ناخوش تھے۔ اس کے بعد سارے ایم پی ایز احتجاجی جلوس کی شکل میں مال پر آ گئے اور اپنے مطالبات پورے ہونے تک ایوان میں جانے سے انکار کر دیا۔ وزیراعلیٰ غلام حیدر وائیں اس احتجاج کی مزاحمت نہیں کر سکے۔ انہوں نے طیش میں آ کر اے ایس آئی اور ایس پی کے خلاف کارروائی کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ آئی جی کا تبادلہ بھی کر دیا۔

چوہدری منظور سرگودھا کے دورہ پر تھے' وہ فوراً لاہور پہنچے۔ مجھے اس واقعہ کا شام کو پتہ چلا تو میں ان سے ملنے گیا۔ انہیں اپنے تبادلہ پر دھچکا بھی لگا اور حیرت بھی ہوئی۔ یہ دباؤ اور مداخلت کی بدترین شکل تھی کہ ایک اے ایس آئی کی غلطی پر آئی جی کا تبادلہ کر دیا گیا۔ ایم پی ایز اپنا مطالبہ منوانے میں کامیاب ہو گئے۔

دراصل ایم پی اے صاحبان غلام حیدر وائیں اور آئی جی کی میرٹ پالیسیوں سے تنگ آ گئے تھے۔ وہ معاملات کو اپنے طریقہ سے چلانے کے خواہاں تھے۔ وہ اپنے حلقوں میں اپنی پسند کے ایسے ایس ایچ او ڈی ایس پی اور ایس پی چاہتے تھے جو ان کی مرضی کے تابع رہ کر کام کریں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو انتظامیہ جانبدار بن جاتی۔ ان کے سیاسی مخالفین کو نشانہ بنایا جاتا اور تفتیش کرنے والے افسروں کی غیر جانبداری مشکوک ہو جاتی۔ لوگوں کا پولیس افسروں پر سے اعتماد اٹھ جاتا اور وہ سیاسی لیڈروں کے اشارہ پر رقص کرتے نظر آتے۔

وزیر اعلیٰ اور آئی جی نے انتظامیہ کی بگڑتی ہوئی صورتحال کو میرٹ کی سخت پالیسی کے ذریعے کنٹرول کرنے کی کوشش کی‘ ایم پی ایز اس پالیسی سے نالاں تھے اور اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہارِ کرتے رہتے تھے۔ اس واقعہ نے جلتی پر تیل ڈالا۔ انہوں نے آئی جی کے تبادلہ کے لیے مل کر آواز اٹھائی تو وزیر اعلیٰ دباؤ کا سامنا نہیں کر سکے۔

انتظامی لحاظ سے یہ ایک غیر صحت مند روایت تھی۔ پولیس میں اس پر عام طور سے خفگی و ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ پریس نے بھی عوامی نمائندوں کے غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل پر کھل کر نکتہ چینی کی اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی حمایت کی۔ اے ایس آئی عوامی ہیرو بن گیا۔ میرے خیال میں انتظامیہ کی ساکھ بحال کرنے کی غرض سے آئی جی کا تبادلہ منسوخ کرنے کی ضرورت تھی‘ لیکن جس وقت میں نے چوہدری منظور سے ملاقات کی‘ تبادلہ کی خبر ریڈیو اور ٹیلویژن پر نشر ہو چکی تھی۔

اگلے دن مجھے وزیر اعظم کی کال موصول ہوئی۔ انہوں نے پہلے تو لاہور کے واقعہ کی بابت میرے خیالات معلوم‘ اس کے بعد فوراً اسلام آباد پہنچنے کو کہا۔ انور زاہد‘ پرنسپل سیکرٹری اور سعید مہدی ایڈیشنل سیکرٹری اور وزیر اعظم نے مجھ پر زور دیا کہ میں آئی جی کا چارج سنبھال لوں۔ سعید مہدی نے میری تقرری میں خصوصی دلچسپی لی کیونکہ ان کے خیال میں میں واحد افسر تھا جو پولیس اور ایم پی ایز کے ساتھ یکساں طور پر ثابت قدمی اور اچھے طریقہ سے نمٹ سکتا تھا۔ انہوں نے یہ بات پہلے ہی وزیر اعظم اور ان کے اردگرد کے لوگوں کے کان میں ڈال دی تھی۔

میں نے 18 جون کو شام 7 بجے چوہدری نثار علی (معاون خصوصی برائے وزیر اعظم) اور سعید مہدی کے ہمراہ وزیر اعظم سے ملاقات کی۔ وزیر اعظم کی رائے تھی کہ آئی جی کو ایم پی ایز کے دباؤ میں آ کر جس طریقہ سے تبدیل کیا گیا ہے اس سے انتظامیہ پر بُرا اثر پڑے گا۔ وہ بڑے پریشان لگ رہے تھے اور

وزیراعلیٰ کے احکام کومنسوخ کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ میں نے ان کے خیالات کی تائید کی تاہم انور زاہد کی سوچ یہ تھی کہ ایسی صورت میں وزیراعلیٰ کو مستعفی ہونا پڑے گا اور اس سے بہت سے سیاسی مسائل اور خود مسلم لیگ کے لیے سنگین مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ چوہدری نثار نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ میں نے یہ بات واضح کردی کہ انتظامیہ پہلے ہی تفریق کا شکار ہے۔ اگر ایم پی ایز تبادلوں، تقرریوں اور دوسرے انتظامی معاملات میں دخل دیتے رہے تو صوبہ میں نہ صرف انارکی پھیل جائے گی بلکہ بدنظمی کے باعث خود حکومت کا دھڑن تختہ ہوسکتا ہے۔

''تمہیں ایم این ایز اور ایم پی ایز کا تعاون اور حمایت بھی درکار ہے۔'' چوہدری نثار علی نے کہا۔

''ہاں۔ میں جانتا ہوں۔'' میں نے ان سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد میں نے بعض بنیادی مسائل بیان کیے جن سے بطور آئی جی مجھے واسطہ پڑنے والا تھا۔ ''اگر آپ مجھے آئی جی بناتے ہیں تو مجھے فری ہینڈ دینا ہوگا۔ آپ کو اس مسئلہ سے سیاسی طور پر نمٹنا ہوگا۔ آپ ایم این ایز اور ایم پی ایز کا ایک اجلاس طلب کریں اور اس معاملہ پر کھل کر بحث کریں۔ انہیں سمجھا دیں کہ وہ تیز طرار سرکاری ملازمین کو یہ موقع نہ دیں کہ انہیں بلیک میل کرسکیں جو اپنی پسند کی پوسٹنگ کروانا چاہتے ہیں۔ میں بھی اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ پولیس افسران کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس نہ جائیں۔ اس کے علاوہ میں انتظامی امور میں مداخلت برداشت نہیں کروں گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں عوامی نمائندوں کی طرف سے پیدا کیے گئے سیاسی مسائل کم سے کم کرنے کی کوشش کروں گا۔ تاہم انہیں ایک حد تک برداشت کرنا ہوگا۔ میں کسی بھی بنیاد پر کسی ناانصافی کی اجازت نہیں دوں گا۔ اسی طرح حکمران جماعت کے ارکان کو بھی چاہیے کہ وہ مجرموں کی سرپرستی نہ کریں۔ میں اس معاملہ پر خصوصی توجہ دوں گا کہ میرے افسر اور ماتحت انصاف پسند اور غیر جانبدار اہلکار ثابت ہوں۔ آپ میری مدد کریں، میں آپ کو اچھی پولیس فراہم کروں گا۔ اس کے ساتھ آپ اچھی حکمرانی کو یقینی بنا سکتے ہیں جس کا مطلب ہے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانا۔''

ان سب نے میرے خیالات سے اتفاق کیا۔ طے پایا کہ مسئلہ پر غور وفکر کرنے کے لیے پارٹی میٹنگ بلائی جائے اور ارکانِ اسمبلی سے کہا جائے کہ وہ انتظامیہ اور پولیس کے امور میں مداخلت نہ کریں۔

نواز شریف نے میرے دوٹوک تجزیہ کو سراہا۔ ان کی خواہش کے مطابق اگلے دن میں پرائم منسٹر سیکرٹریٹ گیا۔ سعید مہدی نے مجھے بتایا کہ وزیراعلیٰ اور چیف سیکرٹری بھی مجھے آئی جی بنانے کے حق میں

ہیں اور انہوں نے وزیر اعظم سے بات کرلی ہے۔ وہ آئی جی کو توہین آمیز طریقہ سے تبدیل کرنے پر پولیس کی صفوں میں پائے جانے والے غم وغصہ سے آگاہ ہو چکے تھے اور اس رائے کے حامل تھے کہ میں واحد آدمی ہوں جو پولیس والوں اور ایم پی ایز سے خوش اسلوبی کے ساتھ نمٹ سکتا ہوں۔ انہوں نے مجھے تیار رہنے کی ہدایت کی کیونکہ وزیر اعظم مجھے آئی جی مقرر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ وزیر داخلہ چوہدری شجاعت حسین سے انور زاہد کے کمرہ میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے نئے تقرر پر مبارکباد دی۔ اس وقت مجھے یقین ہو گیا اب اس ذمہ داری سے فرار ممکن نہیں رہا۔

انور زاہد کو اور مجھے وزیر اعظم چیمبر میں بلایا گیا۔ نواز شریف نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''چوہدری صاحب میں کل لاہور میں آپ کو ایئر پورٹ پر آئی جی کی وردی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نئے عہدہ پر آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ آپ کو مکمل فری ہینڈ دیا جائے گا۔'' انہوں نے مزید بات چیت کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ایک بھاری ذمہ داری کا بوجھ محسوس کرتے ہوئے ان کے چیمبر سے نکل آیا۔ اگلے دن یعنی 20 جون 1991ء کو میں نے آئی جی کی وردی میں انہیں خوش آمدید کہا۔ میں صبح کو نئے عہدہ کی ذمہداریاں سنبھال چکا تھا۔ چوہدری نثار علی نے جو میاں صاحب کے ساتھ آئے تھے' مبارکباد دیتے ہوئے کہا: ''ماشاء اللہ آپ بڑے سمارٹ اور دوسروں سے نمایاں وممتاز نظر آ رہے ہیں۔''

''آپ کے تہنیتی کلمات کا شکریہ۔'' میں نے جواب دیا۔ میرے قد کی بلندی' جو کہ چھ فٹ ہے' مجھے اپنے والدین سے ورثہ میں ملی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں دوسروں پر رعب ڈالتا پھروں۔''



باب 36

اعلیٰ منصب' کٹھن ذمہ داریاں

میرے دوست اور رفیق کار الیاس محمود نے مجھے ایک کتاب پڑھنے کو دی جس کا نام "Policing with the Consent of People" تھا اور وہ لندن میٹرو پولیٹن پولیس کے چیف کی لکھی ہوئی تھی۔ میں نے بڑے اشتیاق سے مطالعہ کرنے کے بعد کتاب ان کو واپس کر دی۔ اس کتاب نے انہیں مسحور کر لیا تھا اس لیے جب میں نے اس کی زیادہ تعریف و توصیف نہیں کی تو بڑے مایوس ہوئے۔ وہ مذکورہ کتاب کے مندرجات پر میرے ساتھ اکثر بحث مباحثہ کرتے رہتے تھے اور پاکستان میں بھی اسی طرح کا نظام قائم کرنے کے حق میں تھے۔ میرے خیال میں وہ نظام پاکستان کے حالات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ جب ان کا اصرار جاری رہا اور انہوں نے مجھے ''روایتی جابر پولیس افسر'' قرار دیا تو مجھے کہنا پڑا کہ اس طرح کا پولیس نظام ہمارے ملک میں نہیں چل سکتا۔

''کیوں نہیں چل سکتا؟'' انہوں نے برہمی کے عالم میں سوال کیا۔

''باہمی رضا مندی سے نگرانی کا نظام قائم کرنے سے پہلے آپ کو لوگوں کی مرضی کے مطابق حکومت قائم کرنی ہوگی۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ مارشل لا کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ کیا آپ کے خیال میں یہ عوام کی رضا مندی سے لگایا گیا ہے؟ باہمی رضا مندی سے نگرانی کا بندوبست کرنا پورے نظام کی نمائندگی کرتا ہے۔ جمہوریت بحال ہونے دیں۔ اس کے بعد ہم ایسے نظام کو مرحلہ وار ترقی دے سکتے ہیں۔ سردست آپ اور میں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے کہ ایسے خوشنما تصورات کے بارے میں کتابیں پڑھتے رہیں جو ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ جنرل ضیاء اس وقت تک آپ کی پسندیدہ کتاب پر پابندی نہیں لگائیں گے۔''

انہوں نے میری بات پورے انہماک سے سنی، پھر بولے:

''آپ ٹھیک کہتے ہیں، پورے نظام کی ازسرِ نو سمت بندی کرنا ضروری ہے۔ ہم محض نام کے آزاد ہیں۔ یہ 1980ء کا ذکر ہے۔

جب 1991ء میں آئی جی پولیس بن گیا تو باہمی رضا مندی سے نگرانی کے نظام کا تصور میرے ذہن میں پوری طرح واضح تھا مگر مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔ میں پیشتر ازیں چھوٹے عہدوں پر اس کی پریکٹس کر چکا تھا۔ اب مجھے پورے معاشرہ کی حمایت اور تعاون کی ضرورت تھی۔ معاشرہ کے پاس جانے سے پہلے مجھے اپنے افسروں اور جوانوں کا غیر مشروط تعاون اور حمایت درکار تھی۔ مجھے انتظامیہ اور حکومت کو اپنے

ساتھ لے کر چلنا تھا۔ مجھے عدلیہ کے قریب تر ہونے کی ضرورت تھی تاکہ انہیں یہ یقین دلا سکوں کہ ہم قانون اور اصولوں کی کتابوں پر سے گرد صاف کرنے لگے ہیں۔ مجھے معاشرہ کے جملہ طبقات کے سامنے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرنی اور ان کی بھرپور مدد حاصل کرنی تھی۔ اس کام کا ایجنڈا ہی بڑا حوصلہ شکن تھا۔

ہمیں برسرِ زمین جو چیلنج درپیش تھا' ان سے نمٹنے کے لیے کسی مافوق الفطرت انسان کی طاقت و صلاحیت درکار تھی۔ مجرم سرِ عام دندناتے پھرتے تھے اور جرائم کی شرح تشویش ناک حد تک بڑھ چکی تھی۔ جرم منظم' تشدد آمیز اور نفع بخش بن گیا تھا۔ با اثر افراد کے زیرِ سرپرستی سمگلنگ اور منشیات کی روز افزوں تجارت وسیع پیمانہ پر جاری تھی۔ سالہا سال گزرنے پر یہ نظریہ عام ہو گیا تھا کہ ایک شخص ہتھیاروں کی طاقت کے بل پر ملک کا مطلق العنان حکمران بن سکتا ہے تو ناجائز ہتھیاروں کے زور پر ایک شہر' وارڈ یا گاؤں میں غلبہ کیوں حاصل نہیں کیا جا سکتا؟

آبادی کا استحصال، شہری رنگ ڈھنگ اختیار کرنے کا عمل' بے روزگاری' منشیات نیز اخلاق' سماجی مذہبی اور خاندانی روایات کے زوال نے بہت سے مسائل پیدا کر دیے تھے' امتحانات کے ناقص نظام اور نمبروں پر انعام دینے کے طریق کار نے ایسے قبیح افعال کو جنم دیا جس نے اخلاق نیز استاد اور شاگرد کے مابین مقدس رشتہ کو تباہ کر دیا۔ اسکولوں اور کالجوں میں فیل ہونے والے مجرمانہ زندگی اختیار کرنے لگے۔ اسکول اور کالج جرائم اور بدمعاشی کی نرسریاں بن گئیں جہاں نوعمر مجرم پرورش پاتے تھے اور پولیس کو ان کا پتہ نہیں چلتا تھا۔

معیشت ڈانواں ڈول اور سرمایہ کاری زوال پذیر تھی۔ بینک اور کاروباری مراکز دن دہاڑے لوٹے جا رہے تھے۔ اغوا برائے تاوان معمول بن گیا تھا۔ تاجروں اور ان کے اہلِ خاندان کو باہر نکلنے کے لیے محافظ ساتھ رکھنے پڑتے تھے۔ واحد کاروبار جو فروغ پا رہا تھا وہ پرائیویٹ سیکورٹی ایجنسیوں کا تھا۔

حکومت ناکام ہو گئی تھی کیونکہ جرائم کی صورت حال بس سے باہر تھی۔ وزیر اعظم کو اپنا جاپان کا دورہ اس لیے منسوخ کرنا پڑ گیا کہ اسلام پورہ (لاہور) کے علاقہ میں ایک خاندان کے گیارہ افراد کے قتلِ عام سے شہر میں زبردست خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ معمول کی سرگرمیاں ماند پڑتی جا رہی تھیں جب کہ خوف اور افراتفری زوروں پر تھی۔

حکمرانوں اور بیوروکریٹس کو اس تمام صورت حال کا جو واحد حل سوجھا وہ یہ تھا کہ جس علاقہ میں کوئی تشدد آمیز اور سنسنی خیز جرم وقوع پذیر ہو وہاں کے ایس ایچ او، ڈی ایس پی یا ایس پی کو معطل کر دیا جائے۔ متاثر ہونے والے افسر خود کو حکومت یا سینئروں کے غیظ و غضب سے بچانے کے لیے اپنے سرپرست ایم این اے یا ایم پی اے کی طرف دوڑتے۔ وہ اس قسم کے مقدمات درج کرنے سے ممکن حد تک گریز کرتے تاکہ ان کی معطلی کا سبب نہ بن جائے۔

پست ہمت پولیس میں اتنی صلاحیت یا قابلیت نہیں تھی کہ پوری طرح مسلح اور تیز رفتار مجرموں کا مقابلہ کر سکے۔ مجرم کی جدید ترین ساخت کی کلاشنکوف یا یوزی (Uzi) کے مقابلہ میں پولیس والوں کے پاس فرسودہ و ناکارہ اور تھوڑا بہت ایمونیشن ہوتا۔ ملزموں کے پاس جدید ترین ماڈل کی تیز رفتار گاڑیاں تھیں، بیچارے ایس ایچ او کے پاس ان کا تعاقب کرنے کے لیے سالوں پرانی پھٹیچر گاڑی ہوتی۔ پولیس کے پاس جرائم اور مجرموں کا ترتیب وار ریکارڈ نہیں تھا، جب بھی کوئی سنسنی خیز جرم وقوع پذیر ہوتا، وہ گھبرا جاتے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ کیا کریں اور کہاں سے شروع کریں۔ حکومت کی طرف سے پولیس کو خوفناک چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری وسائل فراہم نہیں کیے گئے تھے۔

پنجاب پولیس پیشہ ورانہ طور پر تربیت یافتہ اور لگن سے کام کرنے والے افسروں اور جوانوں کی مستعد فورس نہیں رہی تھی۔ اسے اب قانون کی علامت اور حصولِ انصاف کا ذریعہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ لوگوں کو اذیت دینے والی لگتی تھی اور عدالتوں کی رائے کے مطابق ظلم ڈھانے اور ناانصافی کرنے والی فورس بن گئی تھی۔ یہ وردی کی حالت میں ایک ہجوم تھا جسے اس غرض سے بھرتی کیا جاتا اور تربیت دی جاتی تھی کہ ظالمانہ ہتھکنڈوں سے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلائیں اور غیر مقبول حکومتوں نیز آمریتوں کو تحفظ فراہم کریں۔ پولیس قانون کی بجائے انتظامیہ کا قوی بازو بن گئی تھی۔ جس کا کام حکمران کے احکام کی تعمیل کرنا رہ گیا تھا خواہ درست ہوں یا غلط۔ یہ اصولوں کی نہیں بلکہ حکمرانوں کی تابع فرمان تھی، جسے محض اپنی نوکریاں بچانے سے غرض تھی۔

میں پنجاب پولیس کو اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ میں نے اپنی ملازمت کا زیادہ حصہ اسی صوبہ میں گزارا تھا۔ میں پولیس کی بابت لوگوں کے احساسات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ پولیس کے فرائض اس قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ بہترین وقتوں میں بھی ہرگز ہردلعزیز نہیں بن سکی، بہرحال لوگوں سے احترام حاصل کرنا ناممکن نہیں تھا۔

سینئر افسران ماتحتوں کے مسائل حل کرنے اور ان کی رہنمائی کرنے کی بجائے انہیں ہر وقت عبرتناک سزاؤں سے ڈراتے رہتے تھے۔ دراصل افسروں نے اپنی کھال بچانے کے لیے دوسروں کو پھنسانے والا رویہ اپنا لیا تھا۔ ان میں حقیقت پسند اور راست گو بننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ ہر غلط کام کا الزام ماتحتوں کے سر تھوپ دیتے تھے۔ وہ ماتحتوں کو بے حس بنا کر سب سے بیگانہ کر دیتے تھے۔

تبدیلی ہمارے اندر سے ہی آنی تھی اور ہمیں اپنی مدد آپ کرنی تھی' میرے لیے کام جزو ایمان کا درجہ رکھتا ہے۔ میں نے اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے اور معاشرہ کے ہر حصے کو جگانے کا تہیہ کر لیا تا کہ وہ متحد ہو کر جرم اور مجرموں کے خلاف کام کر سکے۔ میرا ماٹو تھا "Faith not fraud, truth not tricks" جس کے معنی ہیں ''یقین محکم سے کام لو فراڈ سے نہیں' سچائی اختیار کرو مکارانہ چالیں نہیں۔''

خوشگوار تبسم اور بہرے لوگ

میں اپنے سینئروں کی انتہائی عزت کرتا تھا۔ تاہم میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی نامناسب یا ناجائز فعل وقوع پذیر ہو۔ مجھے زوال پذیر نظام کی اصلاح کرنی اور اپنی فورس کا نظم وضبط نیز مورال بحال کرنا تھا۔ میں نے چارج لیتے ہی ایسے بہت سے افسروں کا تبالہ کر دیا جو اہم شخصیات کے چہیتے بن گئے تھے۔ انہوں نے سر توڑ کوششیں کیں اور مجھ پر بے تحاشا دباؤ ڈلوایا مگر میں نے ایک بھی پوسٹنگ تبدیل نہیں کی۔ یہاں تک کہ بعض دیگر معاملات میں بھی پوسٹنگ یا تبادلہ کے ناجائز مطالبات پر قطعاً کوئی توجہ نہیں دی۔

وزیر اعظم نے مری میں اپنی جماعت کا اجلاس بلایا۔ چیف سیکرٹری کو اور مجھے بھی وزیر اعظم سے اور بعد ازاں وزیر اعلیٰ سے ملنے کے لیے طلب کیا گیا۔ اجلاس میں طے پایا کہ آئی جی کو فری ہینڈ دیا جائے اور انتظامی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ میٹنگ کے بعد لنچ کے دوران امجد وڑائچ نے جو گوجرہ سے ایم پی اے تھے' مجھ سے ملاقات کی۔ ان کے ساتھ پرویز الٰہی اور یک درجن کے لگ بھگ دوسرے ایم پی اے حضرات تھے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ڈی ایس پی نبی بخش لک کو ان کے حلقہ سے فوراً تبدیل کر دیا جائے۔

''آخر کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے فون پر بتایا گیا ہے کہ اس نے میرے بھائی خالد کو بغیر لائسنس کلاشنکوف رکھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا ہے۔'' ایم پی اے نے جواب دیا۔ ''یہ میری زبردست توہین ہے اور اب میں اپنے عوام کا سامنا نہیں کر سکتا۔'' ان کے ساتھیوں نے ان کی بھرپور حمایت کی۔

میں نے حقائق معلوم کرنے کا وعدہ کیا تاہم انہوں نے فوری تبادلہ کرنے پر اصرار کیا۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ ابھی چند منٹ پہلے پارٹی کے اجلاس میں آپ لوگوں نے کیا طے کیا تھا' مگر بے فائدہ۔ میں نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ اپنے کان بند کر لیے۔ وہ وزیراعلیٰ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے مجھ سے ڈی ایس پی کا تبادلہ کرنے کو کہا۔ میں ایم پی ایز کے ہجوم میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا' اس لیے کوئی جواب نہیں دیا۔ بعدازاں جب میں نے انہیں کیس کی نوعیت سے آگاہ کیا تو انہوں نے ہدایت کی کہ کیس کو میرٹ پر نمٹایا جائے۔ میں نے ڈی ایس پی کا تبادلہ نہیں کیا' اگرچہ ایم پی اے وزیراعلیٰ اور کابینہ کے ارکان پر دباؤ ڈالتا رہا۔

آخرِ کار وہ مسئلہ کابینہ کے اجلاس میں اٹھایا گیا۔ وہ چاہتے تھے میں ایم پی اے کو مطمئن کروں' مگر میں ثابت قدمی سے اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا۔ ''یہ میرا قانونی فرض ہے کہ ایم پی اے کے بھائی کو سزا دلاؤں اور میں کسی خوف یا سفارش کے بغیر اپنا فرض ادا کروں گا۔'' میں نے کابینہ کو بتایا۔ ناجائز ہتھیار قبضہ میں رکھنا نہ صرف بذاتِ خود ایک سنگین جرم ہے بلکہ دوسرے جرائم کے ارتکاب میں آسانی پیدا کرتا اور انہیں فروغ دیتا ہے۔ اگر میں اسے اس بنا پر چھوڑ دوں کہ وہ ایم پی اے کا بھائی ہے تو دوسروں کے خلاف کارروائی کیسے کروں گا؟ میں پارٹی سے عدم مداخلت کی توقع رکھتا ہوں تاکہ قانون پر صحیح معنوں میں عمل کیا جا سکے۔'' میں نے ڈی ایس پی کا تبادلہ نہیں کیا اور پھر وزیراعلیٰ نے بھی زیادہ زور نہیں دیا۔

اسی طرح کے ایک معاملہ میں گورنر میاں محمد اظہر نے ایک اجلاس کے دوران مجھ سے کہا کہ میں اپنے بہتر فیصلہ کے خلاف کام کروں۔ میں نے آہستہ سے معذرت کر لی' مگر ان کا اصرار جاری رہا جس سے مجھے چیف سیکرٹری' ہوم سیکرٹری اور دیگر سینئر حکام کی موجودگی میں بڑی کوفت ہوئی۔ انہوں نے اسی پر بس نہیں کی۔ تحکمانہ انداز میں کہنے لگے: ''پہلے آئی جی کو ایسے ہی رویہ کے باعث جانا پڑا تھا'' میرے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔

''کوئی دوسرا کام کرنے سے پہلے آپ میرا تبادلہ کرا دیں۔'' میں نے ان سے کہا۔ ''مجھے آئی جی کے عہدہ پر رہنے کا کوئی شوق نہیں' میں معاملات کو اپنے طریقہ سے نمٹاؤں گا۔'' انہیں رانا مقبول' ڈی آئی جی اور ایس ایس پی لاہور کے سامنے ایسے توہین آمیز کلمات سننے پڑے۔ وہ اصول کا معاملہ تھا۔ ورنہ میں ان کے خلاف نہیں تھا۔ میں طویل عرصہ سے انہیں ایک شریف آدمی کے طور پر جانتا تھا۔ اسے ان کی بڑائی

سمجھیں کہ اس ناخوشگوار واقعہ کے بعد غیر سے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

جنرل کی خواہش

چیف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز اپنے کزن ڈی ایس پی حامد نواز کا اس کی پسند کے مطابق تبادلہ کرانا چاہتے تھے۔ میں نے ان کی خواہش پوری کرنے سے معذرت کر لی کیونکہ حامد نواز کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ جنرل نے چوہدری نثار علی سے بات کی تو انہیں بتایا گیا کہ آئی جی کے بقول حامد نواز کرپٹ ہے۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' جنرل نے چلا کر کہا

''سبھی پولیس والے کرپٹ ہوتے ہیں۔'' پھر انہوں نے شہباز شریف سے رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے مجھ سے بات کی لیکن میں اپنی بات پر قائم رہا۔ میں ہر پولیس والے کو جتانا چاہتا تھا کہ اصل اتھارٹی کس کے پاس ہے۔ جب اسی حامد نواز نے خطرناک ڈاکوؤں کے ایک گروہ کو گرفتار کرنے میں اعلیٰ درجہ کی بہادری کا مظاہرہ کیا تو میں نے اسے خود بلایا اور بطور انعام اچھی جگہ پوسٹنگ کر دی۔

جنرل سے متعلق ایک اور کیس بھی تھا۔ انسپکٹر انور ورک کی جو کہ ایک دیانتدار افسر تھا، جہلم میں تعیناتی وہاں کے ایم این اے (جن کا تعلق آئی جے آئی سے تھا) راجہ افضل کو پسند نہیں تھی۔ انہوں نے جنرل آصف نواز کو اس طرح بھڑکایا کہ انہوں نے میرے خلاف انور زاہد سے شکایت کی اور الزام لگایا کہ انسپکٹر کی تقرری راجہ خادم حسین ایم پی اے کو، جو کہ میری برادری سے تھے، خوش کرنے کے لیے کی گئی ہے۔ یہ بالکل غلط تھا۔ میں نے جنرل صاحب سے راولپنڈی میں ملاقات کی اور انہیں اصل صورت حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے یہ کہتے ہوئے معذرت چاہی کہ انہیں صحیح بات نہیں بتائی گئی تھی۔

ترقی کے معاملات میں بھی میں نے ایک سخت پالیسی اختیار کی اور باری کے بغیر (out of turn) ترقیوں میں فریق بننے سے انکار کر دیا ماسوائے اس صورت کے جب غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کرنے کی بنا پر کوئی کیس میرٹ پر پورا اترتا۔ میرے عزیز ترین دوست اور قریب ترین رشتہ دار بڑے مایوس ہوئے کیونکہ میں نے کسی ایک کو بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں کیا۔ مجھے اپنے فطری رجحان طبع کے برعکس سخت رویہ اپنانا پڑا۔ دراصل میں نظم و ضبط اور کارکردگی کے گرتے ہوئے معیار کو بہتر بنانا چاہتا تھا۔ وہ

سب کچھ مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ کرنا بہت مشکل تھا۔

وزیراعظم نے مرزا محمد علی کو' جو ایک اچھے افسر تھے' ان کی باری سے پہلے ترقی دے کر فیصل آباد کا ڈی آئی جی لگانا چاہا۔ میں نے آخر تک اس کی مخالفت کی حتیٰ کہ میں اس وقت بھی ڈٹا رہا جب غلام حیدر وائیں اور چوہدری نثار علی وزیراعظم کے ذہن پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے مرزا محمد علی کو بلایا اور اس قسم کی سوچ پر سخت ناراضی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے وزیراعظم کی بات اس وقت بھی نہیں مانی تھی جب انہوں نے اپنے محافظ دستہ کے موٹر سائیکل پائلٹ کو اس کی باری سے پہلے ترقی دینے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ ان کی شرافت تھی کہ میری اس وضاحت کے بعد کہ اس سے ایک بُری مثال قائم ہوگی، انہوں نے مزید دباؤ نہیں ڈالا۔

دروازہ کھلا رکھنے کی پالیسی

تصویر کا دوسرا رخ بھی تھا۔ بعض ماتحت جو انصاف حاصل کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے' اپنے جائز حقوق کے معاملہ میں سیاستدانوں سے مدد کے طلبگار ہوئے۔ انہیں انہی کے افسروں کی بے حسی و سنگ دلی سے بچانے کی ضرورت تھی۔ اگر ماتحتوں کو یقین ہو کہ انہیں ان کے حقوق عام طریقے سے مل جائیں گے تو وہ اپنی خودداری پر ہرگز سمجھوتہ نہ کریں' نہ ہی مدد حاصل کرنے کے لیے بااثر لوگوں کے پاس جائیں۔

میں نے توازن قائم کرنے اور انصاف کو یقینی بنانے کے لیے اپنے دروازے سب کے لیے کھول دیے۔ سپاہی سے لے کر اوپر تک سب مجھ سے مل سکتے تھے۔ میں ان کا نقطۂ نظر سنتا اور ان کی شکایات جان سکتا تھا' میں نے ڈی آئی جی صاحبان اور ایس پی حضرات سے بھی کہا کہ ماتحتوں کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھیں' نیز سروس اور فلاح و بہبود کے معاملات میں دیانتداری اور انصاف کے جذبہ سے کام لیں۔ افسروں نے بطور ایک طبقہ خود کو ماتحتوں سے دور کر لیا تھا۔ اس طرح وہ خود کو ظلم و تشدد اور کرپشن کے الزامات سے بچانا چاہتے تھے۔ ایسے الزامات غیر قانونی حکومتوں کے ناجائز احکام ماتحتوں کو بھیجنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ خود کو حکمرانوں کے احکام کے مقدس پردہ میں چھپا لیتے تھے خواہ وہ احکام صحیح ہوتے یا غلط۔ انہیں اس احساسِ کمتری سے چھٹکارا دلایا گیا تو صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے ماتحت عملہ کے ساتھ ذمہ داریوں میں حصہ لینے لگے۔

افسروں کی اس بات میں کوئی صداقت نہیں تھی کہ وہ تھانہ کے عملہ کو تو برا کہتے تھے لیکن اپنے آپ کو فرشتہ سمجھتے تھے۔ سب سے پہلے تھانہ کے عملہ پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ ظلم و ناانصافی کے ستائے ہوئے لوگ سب سے پہلے انہی کے پاس جاتے ہیں۔ لیکن انہیں سینئروں کی طرف سے کوئی رہنمائی یا ٹھوس مدد یہاں تک کہ ہمدردانہ تعاون بھی نہیں ملتا۔ اس کا نتیجہ مایوسی' سنگدلی اور رشوت ستانی کی صورت میں نکلتا ہے۔ انہیں اس دلدل سے نکالنا افسروں کی ذمہ داری تھی۔

ابتدا میں انہیں میرے خیالات سنی سنائی باتوں پر مبنی محسوس ہوئے۔ جب میں نے انہیں مشورہ دیا کہ ماتحتوں کے ساتھ برابری کا سلوک کریں تو ان میں سے اکثر نے اپنے ماتحتوں کی طرف حقارت سے دیکھا۔ بعض ڈی آئی جی اور ایس پی اتنا حوصلہ اور شعور بھی نہیں رکھتے جتنا کہ بہت سے سپاہیوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر وہ اس بات کو کیسے مان لیتے؟ میرے خیالات بہتوں کو پریشان کر رہے تھے۔ تاہم میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ انہیں ان کے راحت بخش خلوت خانوں سے نکال کر زندگی و سرگرمی کے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے پہیوں میں تبدیل کر کے سانس لوں گا۔

سرگودھا میں سیمینار

میں نے سینئر افسروں سے کہا کہ وہ سب سے نچلے درجے کے پولیس والوں کے ساتھ ''ون ٹو ون'' ملاقات اور بات چیت کیا کریں' مگر وہ ہچکچاتے تھے۔ انہوں نے ڈی آئی جی صاحبان کی کانفرنس میں تو اس تجویز سے اتفاق کیا' لیکن اکثر نے اس پر عمل نہیں کیا۔ میں صبر و سکون سے ان کی روش دیکھتا رہا اور انتظار کرتا رہا مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ ناچار میں نے انہیں راستہ دکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

میری تجویز پر سرگودھا کے ڈی آئی جی احمد نسیم نے جو بڑے مہم جو اور ذہین افسر تھے' تھانوں کی کارکردگی پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا جس میں سرگودھا ڈویژن کے تمام درجوں کے پولیس افسروں' پروفیسروں' وکیلوں' ججوں' مجسٹریٹوں' دانشوروں' صحافیوں' کونسلروں اور ایم پی اے و ایم این اے حضرات نے شرکت کی۔ میں خود بھی شریک ہوا۔ وہاں معلومات افزا مقالات پڑھے گئے اور مختلف نقطہ ہائے نظر کی بابت آزادی سے اظہار کیا گیا۔ جس کا نتیجہ پولیس کی کارکردگی کے بارے میں گہرے اور وسیع فہم و ادراک کی صورت میں نکلا۔

ہم نے آزادانہ بحث مباحثہ اور تنقید کی حوصلہ افزائی کی۔ پولیس والوں نے اپنی حدود اور

مشکلات بیان کیں جب کہ عوام نے اپنی شکایات کا اظہار کیا۔ اختلاف وتفریق کے لمحات بھی آئے اور مصالحت ومفاہمت کے کچھ پل بھی تعمیر ہوئے۔ لوگوں نے پولیس والوں کا محاسبہ کیا جب کہ ایم این ایز اور ایم پی ایز نے انصاف اور امن کے لیے جدوجہد کرنے کے پختہ عزم کا اظہار کیا۔ ڈی آئی جی اور ایس پی صاحبان نے اس معاملہ کو پورے سکون سے سنا کہ تھانوں کے ایس ایچ او اور محرر وسائل کے بغیر ہنگامی نوعیت کے مسائل سے کس طرح نمٹتے ہیں۔ سیمینار میں ہونے والی بے تکلف بات چیت سے ظاہر ہوا کہ ان ایس پی صاحبان کے مقابلہ میں جو خود کو صرف معائنوں کے ذریعے غلطیاں پکڑنے کے عمل تک محدود کر لیتے ہیں' تھانہ کی خراب حالت کے متعلق عوام زیادہ جانتے اور بہتر شعور رکھتے ہیں۔

فتح شیر جوئیہ ایس ایس پی سرگودھا نے جو انسانی معاملات کا گہرا ادراک رکھتے تھے اور پولیس امور سے دلی لگاؤ کے لیے مشہور تھے' سیمینار کے انعقاد اور اس کی روداد مرتب کرنے میں شاندار کردار ادا کیا۔ انہوں نے سیمینار کو مثالی خطوط پر کنڈکٹ کیا اور دوسروں کے لیے ایک نمونہ بنا دیا۔ میں نے ڈی آئی جی اور ایس ایس پی صاحبان سے کہا کہ وہ اپنے ڈویژنوں اور ضلعوں میں سرگودھا رینج کی پیروی کریں تو میں بنفس نفیس ان کے سیمینارز میں شرکت کرنے کو تیار ہوں۔

سچائی کے لیے جہاد

سیمینار کے اگلے روز میں نے سرگودھا رینج کے پولیس والوں (سپاہی اور ان سے اوپر) کے ایک بھاری اجتماع سے خطاب کیا۔ میرا موضوع ''سچائی تمام امراض کے لیے اکسیر'' تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ جھوٹ پر تکیہ تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔ مثال کے طور پر جھوٹے مقدمات درج کرنا یا مقدمہ درج کرنے سے گریز کرنا' غلط قیاس کو ثابت کرنے پر اصرار کرنا اور اعداد وشمار کی جادوگری۔ اسی چیز کی مدد سے ہتھیاروں یا منشیات کی جعلی برآمدگیوں یا مجرموں کے ساتھ فرضی مقابلوں کے ذریعے جھوٹی کارکردگی دکھا کر انعامات اور ترقیاں حاصل کی جاتی ہیں' اس قسم کی حرکتوں نے پولیس کی کریڈی بلٹی تباہ کر دی ہے۔ دراصل یہ خود فریبی کی انتہائی تاریکی میں چھلانگ لگانے کے مترادف ہے۔

اپنی تقریر کے بعد میں نے سامعین کے کمنٹس مانگے۔ تھانوں میں کام کرنے والے عملہ نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔ وہ رسمی معائنوں یا سالانہ خفیہ رپورٹوں (جنہیں انگلش سرگم کی زبان میں Annual

Confidential Revenge کہا جاتا ہے) سے بجا طور پر خوفزدہ رہتے ہیں۔ ان کا انحصار بڑی حد تک اعداد وشمار پر ہوتا ہے۔

جو پولیس والے سچائی پر عمل اور اس کی پیروی کرنا چاہتے تھے' ان کے ہاتھ قانونی نظام کی موشگافیوں اور غیر لچکدار نکات نے باندھ رکھے تھے۔ بعض اوقات ایک ملزم کو اس لیے سزا نہیں دی جا سکتی کہ شہادت قانون کے مطلوبہ تقاضے پورے نہیں کرتی۔ ابتدا میں عدالتوں نے اس الجھن کو ملحوظ رکھا اور قدرے آزاد خیالی کی اجازت دیتی رہیں۔ اگر دوسری شہادت قائل کرنے والی ہوتی تب بھی عدالت زیورات کے اس عیار چور کو کیسے سزایاب کر سکتی ہے۔ جس نے ان کی شکل بدل کرنا قابلِ شناخت صورت میں بدل دیا ہو۔ لیکن بعد میں نادان آمروں اور حکمرانوں نے اپنے مخالفین کو جھوٹے الزامات میں اور ذاتی محرکات کے تحت پولیس والوں سے سزا دلانے کے لیے اس قانونی سقم سے خوب فائدہ اٹھایا۔

اسی طرح تھانے کا عملہ معطلی کے خوف سے ڈاکہ زنی' قزاقی' نقب زنی' کار چوری' اغوا برائے تاوان اور اموال سے متعلق دیگر سنگین جرائم میں فوری طور پر مقدمہ درج نہیں کرتا تھا۔ میں نے ایسے معاملات میں بلا سوچے سمجھے اور تنگ نظری پر مبنی معطلیوں کا سلسلہ بند کر دیا۔ اس کے بعد تھانے کا عملہ آزادانہ طور پر مقدمات درج کرنے سے قطعاً نہیں ہچکچاتا تھا اور حقائق کو چھپانے کی لعنت بڑی حد تک کم ہو گئی۔

میں نے سرگودھا کی طرح صوبہ بھر میں پولیس والوں کے بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب کیا۔ ان تقاریر کا نتیجہ بڑا حوصلہ افزا نکلا۔ جوانوں کو بے تکلفی اور جرأت مندی سے بولتے سن کر میرا دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ ایک سب انسپکٹر اعلانیہ کہا کرتا تھا کہ اس کے 28 سالہ تجربہ میں غلط بیانی سے کبھی نقصان نہیں ہوا۔ جب بھی تکلیف اٹھانی پڑی سچ بولنے کی بنا پر اٹھانی پڑی۔ اس لیے پولیس والے میرے منہ سے یہ بات سن کر ہمیشہ حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ اگر وہ سچائی پر کاربند رہیں تو انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ میں انہیں اس نکتہ پر یقین دہانی کراتا تھا اور وہ اس پر عمل پیرا ہونے کا پختہ ارادہ کر لیتے تھے۔ بعض صورتوں میں پوری سروس کے دوران انہیں پہلی بار ایسا کرنا پڑا۔ سچائی کے لیے میرے شروع کردہ جہاد کے مثبت نتائج برآمد ہونے لگے۔ حصولِ مقاصد میں مدد دینے کے لیے مجھے بہت سی تبدیلیاں اور اختراعات کرنا پڑیں' ان میں سے بعض کا مختصر تذکرہ قارئین کی نذر ہے۔

سالانہ انتظامیہ رپورٹیں

کرائم برانچ کے ڈی آئی جی صلاح الدین نیازی نے نشاندہی کی کہ سالانہ انتظامی رپورٹوں میں محض اعداد و شمار ہوتے ہیں' جن سے کچھ مفہوم پلے نہیں پڑتا۔ انہوں نے تجویز کیا کہ یہ رپورٹیں بیانیہ ہونی چاہئیں اور ان میں مختلف پہلوؤں پر تفصیلات درج کرنی چاہئیں۔ میں نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے فیصلہ کر لیا کہ ان رپورٹوں کو پولیس کی کارکردگی کے تمام پہلوؤں پر معلومات کا اہم ذریعہ بنایا جائے اور انگریزی کی بجائے اُردو میں لکھی جائیں تاکہ سارا عملہ آسانی سے سمجھ سکے۔ طے پایا کہ فارم تبدیل کر دیے جائیں۔ یہ ذمہ داری شعبہ تحقیق و ترقی کے ڈائریکٹر خالد لطیف کو سونپی گئی۔ انہوں نے انسپکشن اور سالانہ خفیہ رپورٹ کے نئے فارم تیار کیے۔ فیلڈ افسر کی اہلیت جانچنے کے لیے لوگوں میں عام احساسِ تحفظ کو پیمانہ بنایا گیا گمراہ کن اعداد و شمار کو نہیں۔ سچائی کے ساتھ لگاؤ اور عوام کا اطمینان مبہم دعووں اور بیانات سے کہیں بہتر تھا۔

خالد لطیف نے اے حمید کے مشورہ سے سالانہ انتظامی رپورٹوں کے لیے نیا فارم تیار کیا۔ اس کے عنوانات میں درج ذیل شامل تھے۔ ضلع کی مختصر تاریخ' اس کے جغرافیائی حالات' پیدائش و اموات کے اعداد و شمار' انتظامی سیٹ اپ (عدالتیں' پولیس' جیلیں) جرائم کا حال' اس کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ' نقشے اور گراف' جرائم کی روک تھام کے اقدامات پولیس والوں کی فلاح و بہبود' عمارات' ٹرانسپورٹ' سامان' نظم و ضبط' مورال' سپورٹ' پولیس کے شہدا کے حالاتِ زندگی اور ضلع کے ریٹائرڈ پولیس افسروں کے اعداد و شمار۔

ابتدائی فارم تمام ڈی آئی جی اور ایس پی صاحبان کو بھیجا گیا تو ملتان کے ڈی آئی جی میجر مشتاق اور سرگودھا کے ڈی آئی جی احمد نسیم نے بہت سی مفید اصلاحات تجویز کیں۔ گوجرانوالہ کے ڈی آئی جی سید اظہر حسن ندیم نے اسے مزید جامع اور مفصل بنایا۔ تمام تجاویز کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ابتدائی خاکہ کو حتمی شکل دی گئی۔ اس فارم پر مرتب کردہ رپورٹ نے سیلف انسپکشن طاقتور' کمزور اور تشویش کے شعبوں کو ظاہر کرنے والے خاکہ کے معاملہ میں جامع تبصرہ کی شکل اختیار کر لی۔ رپورٹیں لکھتے وقت افسروں کو ان کی کارکردگی اور ذمہ داری کے شعبوں کا گہرا جائزہ لینے کا موقع مل جاتا تھا۔ ان میں سے بہتوں نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے علاقہ کے مسائل اور الجھنوں سے زیادہ باخبر ہوگئے ہیں اور رپورٹوں کی تیاری کے بعد یہ کام

پہلے سے آسان ہوگیا ہے۔ اضلاع کے لیے سالانہ انتظامی رپورٹ کا نیا معیاری فارم تھانہ سے لے کر سینٹرل پولیس آفس تک تمام یونٹوں برانچوں اور شعبوں نے اپنالیا اور اسے ان کی ضرورت کے مطابق بنا دیا گیا۔

ڈسٹرکٹ رپورٹ کی سینکڑوں کاپیاں طبع کرائی گئیں اور تھانوں سمیت صوبہ کے تمام پولیس دفاتر کو فراہم کردی گئیں۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو بھی ان کی نقول فراہم کی گئیں تاکہ وہ جرائم کی صورت حال اور فوجداری انصاف مہیا کرنے والی مشینری کے انحطاط سے آگاہی حاصل کرسکیں۔ تعلیمی اداروں اور لائبریریوں کو بھی ڈاک بھیجنے کی فہرست پر رکھ لیا گیا تاکہ عوام کی آگاہی و بیداری میں اضافہ ہو اور مطالعہ کے لیے بنیادی مواد فراہم کیا جاسکے۔

ان رپورٹوں سے منصوبہ بندی و ترقی کے لیے رہنما خطوط کا کام لینا تھا اور انہیں ریفرنس مواد کے طور پر استعمال کرنا تھا۔ ان سے آنے والے سالوں کے لیے ترجیحات کی نشاندہی اور اہداف کے تعین میں بھی مدد لینی تھی۔ چونکہ ہر ایس پی نے اپنے پیشرو سے بہتر کام کرنے کی کوشش کی' اس لیے رپورٹوں کے مندرجات اور معیار مسلسل بہتر ہوتا گیا۔ ہر رپورٹ اوسطاً 200 صفحات پر مشتمل تھی۔ یوں صوبہ کے 34 اضلاع کی رپورٹوں کو یکجا کرنے سے قریباً 7000 صفحات کا انسائیکلو پیڈیا تیار ہوگیا۔ اگر مذکورہ رپورٹیں ہر سال لگاتار شائع ہوتی رہیں تو باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چند برسوں میں تحقیق اور حوالہ کے لیے کس قدر کارآمد اعداد و شمار اور معلومات جمع ہو جائیں گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ تمام رپورٹوں کے مندرجات کو کمپیوٹر میں فیڈ کیا جاسکتا ہے اور اس سے انتہائی کارآمد ڈیٹا بیس تیار کی جاسکتی ہے۔

مقاصد کے مطابق نظم وضبط قائم رکھنا

ڈی آئی جی صاحبان کی ایک کانفرنس میں سید اظہر حسن ندیم نے تجویز کیا کہ ''مقاصد کے مطابق نظم وضبط قائم رکھنے'' کے تصور کو متعارف کرایا جائے اور اسے سالانہ رپورٹوں میں شامل کرلیا جائے۔ اس مقصد کی خاطر تمام رینجوں' ضلعوں اور سب ڈویژنوں میں پولیس کے متعلق لوگوں کے خیالات معلوم کرنے اور جرائم کی روک تھام میں ان کے تعاون کو یقینی بنانے کے انتظامات کیے جائیں۔ اس تجویز کو دوسرے افسروں نے بھی پسند کیا۔ ہم نے تمام تھانوں' ضلعوں' تربیتی اداروں' برانچوں اور شعبوں سے کہا کہ وہ اپنی

کارکردگی کا جائزہ لیں۔ مشکل شعبوں کا تعین کریں اور اگلے سال کے دوران حل تلاش کرنے اور علاج ڈھونڈنے کے لیے انہیں پیش نظر رکھیں۔ ہر علاقہ یا یونٹ کا سرفہرست مسئلہ مختلف تھا۔ بعض کو منشیات کا مسئلہ درپیش تھا' بعضوں کو کار چوری کا جب کہ دوسروں کے لیے ڈاکوؤں کا خوف دردِ سر بنا ہوا تھا' ہر یونٹ کو اپنے ملازمین کے صلاح مشورہ اور اس کے دائرہ اختیار میں آباد لوگوں کی حمایت و مخالفت کے ذریعے اپنی ترجیحات و اہداف متعین کرنے تھے۔ میں ملازمین کی درخواستوں کی سماعت کے لیے مختلف ڈویژنوں میں گیا تو دیکھا کہ ان میں سے زیادہ تر تکمیلِ ذات کے نئے تصور سے خوش تھے۔ جرائم کی روک تھام کی بابت احساس' ذمہ داری کی ذاتی تحریک سے بیدار ہوا' اوپر کے حکم سے نہیں۔ ایس پی ملک خدا بخش اعوان نے تجویز کیا کہ ترجیحات اور مقاصد کو آخری باب کے طور پر سالانہ انتظامی رپورٹ میں شامل کر لینا چاہیے۔

مورال بلند کرنے کی تدابیر

بھکر کے ایس پی چوہدری تصدق حسین نے جو انسانی معاملات کا غیر معمولی ادراک رکھتے تھے' تجویز کیا کہ پولیس کا مورال بلند کرنے والا ماٹو اُردو میں متعارف کرانا چاہیے جو تمام عمارتوں اور مطبوعات پر کندہ اور طبع کرایا جا سکے۔ سید اظہر حسن ندیم نے پہلے ہی ''سچائی' دیانتداری اور جرأت'' پر مبنی ماٹو متعارف کرا دیا تھا۔ فیصل آباد کے ڈی آئی جی چوہدری محمد یعقوب نے تجویز پیش کی کہ پولیس کی تمام مطبوعات کے شروع ہی میں کوئی اچھا سا قول درج ہونا چاہیے۔ میں نے دوسروں کی آرا حاصل کرنے کے لیے تمام تجاویز متداول کرا دیں۔ اکثر افسروں نے اسے غیر ضروری سمجھا۔ لیکن میری خواہش تھی کہ مورال بلند کرنے والے الفاظ ہر ذہن اور دل سے نکلنے چاہئیں۔ چوہدری تصدق نے مجھے بعد میں بتایا کہ انہیں اپنے ضلع سے پولیس ماٹو کے لیے سو سے زائد تجاویز موصول ہوئیں۔

فیصل آباد میں ترجیحات اور اہداف کے سلسلہ میں ایک میٹنگ ہوئی۔ جس میں جھنگ سے تعلق رکھنے والے کانسٹیبل محمد زبیر (پیٹی نمبر 1272) نے بہت اچھی تقریر کی۔ اس کی پیش کردہ فہرست ترجیحات میں حسبِ ذیل چیزیں شامل تھیں:

(الف) سپاہی کو پیٹرول ڈیوٹی کے دوران مستعد ہونا چاہیے

(ب) مجرموں پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔

(ج) مجرموں کو دلیری کے ساتھ کچل دینا چاہیے۔

(د) بہر صورت سچائی پر قائم رہنا چاہیے۔

اس نے آخر میں کہا چونکہ وہ سب سے نچلے رینک میں ہے۔اس لیے اس کی پیش کردہ ترجیحات کو کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی۔میں نے اس کی تجویز نوٹ کی اور اس کا عجز وانکسار بھی۔

میں نے پولیس کے بھاری اجتماع سے اپنے اختتامی خطاب کے دوران واضح کیا کہ آئی جی اور حکومت کی اولین ترجیح ایک ایسی کانسٹیبلری (سپاہیوں کی جمعیت) ہے جو سچی لگن اور خوداعتمادی سے سرشار ہو۔ یہ ہمارے نظام کی بنیادی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس کے بجٹ میں سب سے زیادہ رقم کانسٹیبلری کے لیے رکھی جاتی ہے۔ان کے کردار پر زور دیتے ہوئے میں نے کہا کہ ان کی ترجیحات نہایت اہم ہیں اور وہ معاشرہ میں امن وسکون کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ہمیں جرائم اور دہشت گردی کے خلاف جدوجہد میں ان کے دلی جذبہ کی ضرورت ہے۔گزشتہ عشروں کے دوران جرائم کو جو تحفظ حاصل رہا اور فروغ ملا اس کا مقابلہ فقط شیر دل سپاہی کر سکتے ہیں۔ میں ان کے چہروں کو چمکتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔شاید انہیں آئی جی کی طرف سے ایسے الفاظ کی توقع نہیں تھی۔

رضامندی سے تبادلے

اپنی فورس میں یہ شعور پیدا کرنے کے بعد کہ انہیں اپنے مسائل کے لیے محض اپنی کمان کی طرف دیکھنا چاہیے' میں نے ان کے ذاتی اور خاندانی مسائل پیشِ نظر رکھتے ہوئے تبادلوں کے معاملہ میں ان کی پسند معلوم کرنی شروع کر دی۔ میں نے اجتماعی صلاح مشورہ کا نظام متعارف کرایا اور افسروں کی حوصلہ افزائی کی تا کہ وہ تبادلہ کی بابت فیصلہ ہونے سے پہلے میرے ساتھ آزادی اور بے تکلفی سے گفتگو کر سکیں۔ ان میں متاثرہ افسر بھی شامل ہوتے تھے۔اس طرح ہم اس قابل ہو گئے کہ صحیح آدمی صحیح جگہ پر لگا سکیں اور افسروں یا ان کے خاندانوں کو کم سے کم تکلیف ہو۔جب افسروں اور جوانوں کو میری سوچ کی اصلیت کا پتہ چل گیا تو وہ جوش وخروش سے تعاون کرنے لگے۔انہیں ان کی عزتِ نفس اور خودداری واپس مل گئی اور تبادلہ یا ترقی کے معاملات میں باہر کی مدد حاصل کرنے کے لیے ذلیل وخوار ہونے کی ضرورت نہیں رہی۔سفارش کا مسئلہ میرے لیے بھی اور ان کے لیے بھی ختم ہو گیا۔میں نے بطور آئی جی اپنے دوسالہ دور میں باہر کے دباؤ پر کوئی تبادلہ نہیں کیا۔ہر معاملہ پولیس کے اندر ہی طے ہوا۔

چونکہ ہر افسر مجھ سے ہر وقت مل سکتا تھا اس طرح مجھے ان میں سے بہتوں کے ذاتی مسائل کا پتہ چل گیا۔ مثال کے طور پر منیر پہاڑی کو گردے کی تکلیف تھی۔ ڈی ایس پی ملک اقبال کو اعصابی شکایت تھی جب کہ لیاقت بودلہ عارضہ قلب میں مبتلا تھے۔ میں نے اس چیز کو اپنا بنیادی فرض سمجھا کہ انہیں ایسی جگہ لگایا جائے جہاں انہیں کم سے کم تکلیف ہو۔ میں نے ایک ڈی ایس پی کو ملتان میں ایک بے ضرر کام پر لگا دیا کیونکہ اس کا اپنے تین بچوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے جو ذہنی طور پر نارمل نہیں تھے' وہاں رہنا ضروری تھا۔ 1993ء کے الیکشن سے پہلے جب نگران حکومت نے اپنی غیر جانبداری کا مظاہرہ کرنے کے لیے وسیع پیمانہ پر تبادلے کیے تو اسے بھی صوبہ کے دوسرے سرے پر بھیج دیا گیا۔ بھلا وہ بیچارا ڈی ایس پی انتخابات پر کیسے اثر انداز ہو سکتا تھا؟

جرائم کے خلاف اداروں کا تعاون

پولیس فوجداری نظامِ عدل کا ایک حصہ ہے اور مجھے اپنے کام کے سلسلے میں دیگر تمام اداروں کا تعاون درکار تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں بڑے دیانتدار اور ثابت قدم تھے۔ انہوں نے زندگی کا آغاز بڑی کسمپرسی کے عالم میں کیا تھا' اس لیے انہیں احساس تھا کہ سب کو موقع دینے کے لیے میرٹ پر عمل کرنا کس قدر اہم ہے۔ انہوں نے میرٹ کی برتری کے لیے پوری مستقل مزاجی اور صبر و تحمل کے ساتھ جدوجہد کی مگر اس وقت کے حالات میں بعض اوقات انہیں اپنی حد میں رہنا پڑا۔ انہوں نے مجھ پر کبھی غیر ضروری دباؤ نہیں ڈالا بلکہ جب بھی ضرورت پڑی ہماری پوری پوری مدد کی۔ وہ کسی احساسِ برتری میں مبتلا نہیں تھے اور دلیل کی بات سننے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ وہ صرف مسلم لیگ کی طرفداری کرنے میں تعصب سے کام لیتے تھے جس سے آئی جے آئی میں شامل دیگر پارٹیوں کے لیے مسائل پیدا ہو جاتے تھے' تاہم انتظامیہ کے معاملہ میں ایسا نہیں کرتے تھے۔

چیف سیکرٹری پرویز مسعود جو گورنمنٹ کالج (لاہور) میں میرے کلاس فیلو رہ چکے تھے' انتہائی تعاون اور مدد کرنے والے تھے۔ ہم اس سے پہلے بھی اکٹھے کام کر چکے تھے جب ستر کے عشرہ میں وہ لاہور کے ڈی سی اور میں ایس ایس پی تھا۔ ہوم سیکرٹری چوہدری نذیر احمد جنہیں انتظامی و عدالتی کام کا وسیع تجربہ حاصل تھا۔ صحیح رہنمائی کرنے والے اور دانشمند مشیر تھے۔ ان کے پیشرو اے زیڈ کے شیر دل کو تھوڑے ہی

عرصہ پہلے بلوچستان کا چیف سیکرٹری بنادیا گیا تھا۔ اس طرح ہم ان کی بھرپور اور فاضلانہ رفاقت سے محروم ہوگئے۔ مہر جیون خاں' ایڈیشنل چیف سیکرٹری بڑے بااثر' دانشمند اور دور اندیش افسر تھے۔ ان کے پختہ اور سوچے سمجھے تجزیے اور مشورے ہمیشہ کارآمد ہوتے تھے۔ میں ان کے ساتھ اس وقت کام کر چکا تھا جب وہ ہوم سیکرٹری تھے۔ جی ایم سکندر' سیکرٹری برائے وزیراعلیٰ واقعی بڑے معزز انسان' بہت سمجھدار اور سب کے ساتھ تعاون کرنے والے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ سلمان قریشی' ایڈیشنل آئی جی ایک راست باز انسان اور فعال وسرگرم ہونے کی بنا پر بڑے مددگار تھے۔ انہوں نے میرے بہت سے پروگراموں میں جن کی تفصیل میں آگے چل کر بیان کروں گا' میرا خوب ہاتھ بٹایا۔ میجر ضیاء الحسن' ایڈیشنل آئی جی' سپیشل برانچ اپنے فیلڈ میں خوب ماہر تھے۔ ان کی تیز نگاہوں سے کوئی چیز چھپی نہیں رہتی تھی۔ یہ واقعتاً بہت اچھی ٹیم تھی۔ ہم مشکل لمحات اور کٹھن کاموں میں تسلی وراہنمائی کے لیے ایک دوسرے سے مشورہ کرتے اور مدد لیتے تھے۔

ہمیں عدلیہ کی پوری مدد حاصل تھی۔ لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس میاں محبوب احمد لائق احترام شریف النفس' متقی' دلکش شخصیت کے مالک اور ہمیشہ زیرِ لب مسکرانے والے جج تھے۔ وہ انصاف کی علامت اور مینارۂ نور تھے۔ ججوں کی اہلیت بڑھانے' جرائم کنٹرول کرنے اور امن کو فروغ دینے میں بہت معاون تھے۔ انہوں نے ڈاکے' راہزنی اور منشیات کی سمگلنگ کی بعض سنگین وارداتوں میں سخت عدالتی نوٹس لیا' جن میں ماتحت عدالتوں نے ملزموں کی ضمانت منظور کر لی تھی۔ انہیں منشیات سے دلی نفرت تھی' انہوں نے موت اور تباہی کے سوداگروں کے خلاف کارروائی میں ہماری بڑی مدد کی۔ ملک مقبول الٰہی ایڈووکیٹ جنرل اور ان کے اسسٹنٹ نذیر احمد غازی نے منصوبہ کے تحت دائر کردہ درخواستوں اور بدنیتی پر مبنی مقدمات کے ذریعے پولیس کو ہراساں کرنے والے بدمعاش مافیا کے پیچیدہ اور آپس میں ملے ہوئے گروہوں کو بے نقاب اور ان کے باہمی تعاون کو ختم کیا۔ انہوں نے عیار و مکار مجرموں کے نیٹ ورک کی نشاندہی کر کے عدالتوں کا قیمتی وقت بچایا۔ غازی صاحب نے تفتیش کرنے والے پولیس ملازمین کے لیے ایک کارآمد گائیڈ بھی مرتب کی تاکہ وہ قانونی غلطیوں سے بچ سکیں۔

جرائم سے نمٹنے کے لیے انتظامیہ اور عدلیہ کے مابین اداروں کے طور پر اتحاد واشتراک انتہائی ضروری تھا۔ چیف سیکرٹری' ہوم سیکرٹری اور میں نے مل کر صوبے کا دورہ کیا۔ پولیس والوں اور مجسٹریٹوں

سے خطاب کیا اور ان پر زور دیا کہ خود کو حالات کے مطابق ڈھالیں۔ جب کہ چیف جسٹس نے سیشن ججوں اور جوڈیشل مجسٹریٹوں میں نئی زندگی پھونکی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ انتظامیہ کی کارکردگی کو قانون کے تقاضوں کے مطابق ڈھال کر اپنے گھر کو منظم کریں گے۔ پولیس مجسٹریٹوں اور عدلیہ نے ضلع کی سطح پر اپنی جداگانہ سلطنتیں قائم کر رکھی تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف مقاصد کے لیے کام کر رہے تھے جس سے مجرموں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ وہ اپنے مکار ایجنٹوں کے ذریعے ایک کو دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیتے تھے' ہم نے سیشن جج، ڈپٹی کمشنر اور ایس پی کے مابین سہ فریقی اجلاسوں کا سلسلہ پھر سے شروع کیا تا کہ مجرموں کے خلاف ان کی مشترکہ کوششوں میں ربط پیدا ہو سکے۔

جرائم کے خلاف جدوجہد میں صوبائی سطح پر عدلیہ، انتظامیہ اور پولیس کے سربراہوں کی ذاتی لگن بڑی معاون ثابت ہوئی۔ صورتِ حال کا جائزہ لینے کی غرض سے ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے راہزنوں' ڈاکوؤں اور منشیات کے سوداگروں کے لیے ضمانت قبل از گرفتاری کرا لینا مشکل نہیں تھا۔ میجر مشتاق احمد' ڈی آئی جی ملتان نے جب اپنے ڈویژن کی عدالتوں اور پولیس ریکارڈ کے حوالہ سے ضمانت کی درخواستوں پر سنائے گئے فیصلوں کا تجزیہ کیا تو بڑی ہولناک تصویر سامنے آئی۔ ایسا لگا کہ خطرناک مجرموں کو قانونی سزا کا قطعاً خوف یا فکر نہیں ہوتا۔ مجرموں کے طاقتور گروہ ان کی ضمانت کا انتظام خود بخود کر لیتے تھے۔ اکثر مجرم ایک ہفتہ یا مہینہ کے اندر میں جیل سے باہر آ جاتے تھے۔ وہ پھر سے اپنے دھندا میں لگ جاتے۔ ظلم کا نشانہ بننے والا مجرم کی ضمانت پر رہائی سے بے حد خوفزدہ ہو جاتا اور وہ اکثر صورتوں میں کیس ہار جاتا۔

میجر مشتاق نے مذکورہ اعداد و شمار حاصل کر کے انہیں مرتب کیا اور ڈی آئی جی صاحبان کی کانفرنس میں پیش کیا جس میں ہوم سیکرٹری بھی موجود تھے۔ صلاح الدین نیازی' ڈی آئی جی کرائم برانچ نے ان اعداد و شمار کی بابت لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس سے تبادلۂ خیال کیا۔ انہوں نے ضروری اقدامات کر کے صورتِ حال کو بڑی حد تک بہتر بنایا۔

استغاثہ۔ پولیس کی ذمہ داری

مقدمہ تیار اور دائر کرنے کا کام ہمیشہ سے پولیس اور ضلعی انتظامیہ کے ذمے ہوتا تھا۔ مارشل لا کے دوران یہ کام ایک خاص نظریہ کے تحت جو امریکی نظام کی نقالی کے سوا کچھ نہیں تھا' پولیس سے واپس لے لیا گیا۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ امریکہ کا نظام مجرموں کی حمایت کرتا ہے اور وہاں بمشکل ایک فیصد ملزموں کو

جیل بھیجا جاتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں پراسیکیوشن کا خاکہ نہیں کیا جاتا۔

نئے نظام میں ڈسٹرکٹ اٹارنی سے اگر وہ جرم ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتا تو کوئی جواب طلبی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ پولیس کو ناکافی تفتیش کا ذمہ دار قرار دے دیتا جو اکثر صورتوں میں غلط ہوتا تھا' کیونکہ اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کر سکتا تھا۔ شکایت کنندہ کو اپنے مسروقہ مال یا چھینی ہوئی کار کی برآمدگی سے غرض ہوتی تھی۔ جب پولیس کسی مجرم کو گرفتار کر لیتی تب بھی وہ اس کی سزایابی کا یقین نہیں دلا سکتی تھی۔ حکامِ بالا اور طاقتور لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

ہمارے مسلسل مطالبہ پر استغاثہ دائر کرنے کی ذمہ داری پھر سے پولیس کو سونپ دی گئی' لیکن صرف چھوٹے مقدمات میں۔ یہ محض آنکھوں میں دھول جھونکنے والی بات تھی۔ سنگین جرائم میں پراسیکیوشن کا کام' جو معاشرہ کا اصل مسئلہ ہے' بدستور ڈسٹرکٹ اٹارنیوں کے پاس رہا البتہ اس میں کچھ تبدیلی کر دی گئی کیونکہ ہم کم از کم ان کی توجہ اس طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ ہم سب ایک ایسے آتش فشاں کے دہانے پر کھڑے ہیں جو عنقریب پھٹنے والا ہے۔

ہتھیاروں کی سکھلائی

اپنے آدمیوں کے لیے میرا پیغام یہ تھا کہ ''براہ کرم عوام کی حفاظت پوری لگن اور جرأت کے ساتھ کریں۔'' میں نے انہیں متحرک کرنے اور تربیت دینے کا فیصلہ کر لیا تاکہ ان میں مجرموں کا سامنا کرنے کا حوصلہ اور اعتماد پیدا ہو۔ میری درخواست پر ایس پی ہمایوں شفیع نے صورت حال کے بارے میں ایک پولیس مین کے تجزیہ کا مطالعہ کیا اور اس موضوع پر دماغ لڑایا کہ انہیں اعلیٰ تربیت دے کر کیسے تیز طرار بنایا جا سکتا ہے۔ پولیس مین ہمیشہ کثیر الجہات اور پیچیدہ صورت حال میں گھرا ہوتا ہے اور اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پیش قدمی کر کے خوش دلی سے کام کرے۔

ہمایوں نے ایسے مسائل کی طویل فہرست تیار کی جن سے پولیس والے کو ٹریفک اور گلی میں گشت کے نقطۂ نظر سے لے کر ڈکیتیوں اور یرغمالیوں کو چھڑانے تک کے دوران واسطہ پڑ سکتا ہے۔ ان کی تعداد کئی سو تھی' ایسے مجرم کے مقابلہ میں جس کے پاس جدید ترین مہلک ہتھیار ہو' پولیس والے کے پاس فرسودہ ہتھیار اور ایمونیشن برائے نام ہوتا ہے۔ اگر کچھ میسر ہو تو تربیت نہ ہونے کے باعث اسے بھی استعمال نہیں

کر سکتا۔

یہ چنداں حیرت کی بات نہیں کہ پولیس والے سہمے ہوئے رہتے تھے۔ جب کہ مجرم دلیر ہو گئے تھے۔ ہر طرف مایوسی کے تاریک بادل چھائے ہوئے تھے۔ سینئر پولیس افسروں کی حفاظت پر مسلح دستے متعین تھے۔ جب میں نے آئی جی کا منصب سنبھالا تو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ آدھی پولیس اپنے ہی افسروں کے تحفظ پر مامور تھی۔ ایسی صورت میں عوام الناس کی حفاظت کون کرتا؟

میں نے اپنے مقصد کی وضاحت کرنے اور خود نمونہ پیش کرنے کی غرض سے اپنے ساکن اور موبائل گارڈز نیز حفاظتی دستہ ہٹا دیا۔ اس لیے نہیں کہ میں کسی حملہ سے خوفزدہ نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ مجھے اپنے پولیس والوں کی سلامتی سے زیادہ دلچسپی تھی۔ میں نے ہر شخص کو بتا دیا کہ اگر پولیس کو ہر دروازہ کی نگرانی کرنی پڑے تو اسے نگرانی کا نظام نہیں کہتے۔ تحفظ اور سلامتی کے پورے نظام کو موثر انداز میں کام کرنا چاہیے۔

میں نے تربیت کے مسائل سے نمٹنے کے لیے سینئر افسروں کی ایک کمیٹی تشکیل دی جو ماضی میں تربیت دینے کے کام سے یا فوج سے وابستہ رہ چکے تھے تاکہ ہتھیاروں کی ٹریننگ کے لیے ایک تیز رفتار پروگرام تیار کیا جا سکے۔ کمیٹی کے سربراہ سلمان قریشی' ایڈیشنل آئی جی تھے اور اس کے ارکان میں حسب ذیل شامل تھے: مسٹر ایم آر ضیاء کمانڈنٹ سہالہ کالج' ڈی آئی جی میجر مشتاق احمد' ڈی آئی میجر اکرم اور ہمایوں شفیع (اسسٹنٹ آئی جی)۔ انہوں نے نئے اور مختصر کورس تیار۔ ڈی آئی جی صاحبان نے اپنے اپنے ریجن میں فوج کی مقامی فارمیشنوں کی مدد سے خصوصی کورسوں کا اہتمام کیا۔ میجر مشتاق احمد ڈی آئی جی ملتان' عرفان محمود ڈی آئی جی ڈیرہ غازی خان' رانا مقبول ڈی آئی جی لاہور اور اظہر ندیم ڈی آئی جی گوجرانوالہ نے تربیت میں خصوصی دلچسپی لی اور ایک کے بعد دوسرے دستہ کو ٹریننگ دی۔ اس طرح جوانوں کو اعلیٰ درجہ کی تربیت مل گئی اور وہ مکمل تیاری کی حالت میں آ گئے۔ ان مختصر اور سخت کورسز سے سپاہیوں میں اعلیٰ درجہ کا اعتماد پیدا ہو گیا جس سے ان کے لیے مجرموں کا سامنا کرنا آسان ہو گیا۔

تربیت کے بنیادی مسائل حل کرنے کے لیے وسائل کی ضرورت تھی۔ ہم نے ایسے منصوبے تیار کیے جو کم سے کم وسائل کے متقاضی تھے۔ لیکن ہماری سر توڑ کوششوں کے باوجود حکومت اور محکمہ خزانہ نے جرائم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔

فیصل آباد میں امن وامان قائم رکھنے کا منصوبہ

شہروں کے وسیع پیمانہ پر پھیلاؤ نے امن وامان قائم رکھنا انتہائی مشکل بنا دیا تھا۔ جدید ترین ہتھیاروں کی آسانی سے دستیابی اور افراط کے باعث تشدد آمیز جرائم عام ہو گئے تھے۔ نقدی کے کاروباری مراکز اور بینکوں کو بطور خاص نشانہ بنایا جاتا تھا۔ شہروں میں مجرموں کے لیے پناہ گاہیں زیادہ محفوظ ہو گئی تھیں' اس کے علاوہ مسروقہ مال کو سٹور کرنا اور تاوان کے لیے اغوا کردہ افراد کو چھپانا آسان ہو گیا تھا۔ مجرم آسانی سے اور بلا روک ٹوک وارداتیں کرتے تھے کیونکہ امن وامان قائم رکھنے کے نظام میں شہروں کے پھیلاؤ کے مطابق توسیع نہیں کی گئی تھی۔ شہروں کے رہائشی حصے کی منصوبہ بندی کرنے والوں نے تھانوں' پولیس چوکیوں یا خیموں میں قائم ہنگامی چوکیوں کے لیے جگہ تک مخصوص نہیں کی تھی۔ جرائم کی نگرانی کرنے کا ذکر تو دور کی بات ہے' پولیس پٹرول یا اس کی موجودگی کو بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ پولیس نے محض ردِ عمل کا اظہار کیا' وہ بھی امن وامان سے متعلق مسائل میں' جرائم کے معاملہ میں نہیں۔

پولیس مین جس کا سامنا بچ نکلنے والے اور خطرناک مجرم سے تھا' سخت ہراساں اور شکستہ دل تھا۔ سینئر کمان جو کہ زمینی حقائق سے بے خبر تھی' محض ماتحتوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے' جھڑکنے دباؤ ڈالنے' دن کے وقت قیامِ امن کی ڈیوٹی پر اور رات کو بے مقصد پٹرول پر بھیجنے کا کام کرتی تھی۔ پولیس والے 24 گھنٹے ڈیوٹی پر رہنے کے باعث بہت زیادہ تھکے ماندے' صحت سے محروم اور چڑچڑے بن گئے تھے اور کوئی کام خوشدلی سے نہیں کرتے تھے۔ صورت حال واقعی مایوس کن تھی جو تنظیمِ نو اور بہت زیادہ وسائل کا تقاضا کرتی تھی۔ حکومت حالات سے آگاہ ہونے کے باوجود ہماری مدد کرنے کو تیار نہیں تھی۔ ہمیں جو کچھ بھی کرنا تھا اپنے ہی وسائل سے کرنا تھا۔

چوہدری افتخار احمد ایس ایس پی فیصل آباد نے امن وامان کے نظام کو دستیاب وسائل میں رہتے ہوئے بہتر و موثر بنانے کے لیے ایک تخیلاتی منصوبہ پیش کیا۔ انہوں نے خدا بخش ملک' ایس ایس پی سٹی کے تعاون سے' جو کہ ایک ہونہار اور خوش تدبیر افسر تھا۔ پورے فیصل آباد میں ہر تھانہ کے قانونی وجود کو قائم رکھتے ہوئے نگرانی اور گشت کا منصوبہ بنایا۔

شہر کو کاروباری اور رہائشی حلقوں میں تقسیم کیا گیا۔ پھر ان حلقوں کو شب و روز کی نگرانی کے لیے

مزید پٹرول بیٹس (Patrol Beats) میں تقسیم کر دیا گیا۔ ساکن چیک پوسٹوں اور متحرک پٹرول کو منظم کر کے واچ اینڈ وارڈ کے مربوط نظام سے منسلک کر دیا گیا۔ مواصلات کے نظام کو بھی اس کے مطابق جدید خطوط پر استوار کیا گیا۔ آبزرویشن ریکارڈ' کرائم ریکارڈ اور مجرموں کی شناختوں کو آپریشنل معلومات میں تبدیل کر دیا گیا۔ جدید معلومات کے سلسلے کو تفتیش میں مدد کی غرض سے استعمال کرنے کے علاوہ جرائم کی روک تھام اور موقع پر ہی سراغ رسانی کا بنیادی مقصد پورا کرنے کے لیے ترقی دی گئی۔ گشتی پارٹیاں' جو مناسب طور پر مسلح ہوتی تھیں اور انہیں روزانہ بریف کیا جاتا تھا' اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ کس چیز کی تلاش میں ہیں۔ دوسرے متعلقہ مسائل بھی حل کیے گئے۔ ان دو افسروں نے اپنے ماتحتوں کی مدد اور پہلے چوہدری محمد یعقوب' ڈی آئی جی بعد ازاں مرزا محمد' ڈی آئی جی کی رہنمائی میں انتہائی کارآمد اور تیزی سے کام کرنے والا نظام رائج کر کے دکھایا۔

جب اس منصوبہ کو ترقی دی گئی اور اس پر عملدرآمد کیا گیا' تو اس کی بدولت پولیس کی مناسب فاصلوں پر موجودگی ممکن ہوگئی۔ اس کے تحت 8 گھنٹے کی شفٹ کا نظام بھی شروع کر دیا گیا تاکہ جن لوگوں کے پاس زیادہ کام ہو' ان کے لیے کچھ آرام اور تفریح کو یقینی بنایا جاسکے۔ تفتیشی عملہ کو' جسے دوسروں سے الگ کر دیا گیا تھا' اب اپنے مقدمات پر توجہ مرکوز کرنے کے لیے خاصا وقت مل جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے ڈکیتی کی بہت سی سنگین وارداتوں اور بدمعاشوں کے کئی گروہوں کا سراغ لگایا جس کے نتیجہ میں بہت سے مجرم پکڑے گئے۔ چونکہ واچ اینڈ وارڈ کا نظام بھی انتہائی مؤثر ہوگیا تھا' اس لیے کئی مہینے تک ڈکیتی اور مال چرانے کی کوئی سنگین واردات وقوع پذیر نہیں ہوئی۔

لوگوں نے اس خوشگوار تبدیلی کو محسوس کیا۔ چیمبر آف کامرس و انڈسٹری فیصل آباد نیز وہاں کی انجمن تاجران نے اپنی برادری کی طرف سے شکریہ ادا کرنے اور پولیس کو انعامات دینے کا پروگرام بنایا۔ انہوں نے وزیرِ اعلیٰ سے تقریب میں شرکت کی درخواست کی مگر وہ تاجروں کی بار بار التجا کے باوجود سال بھر میں کوئی وقت نہیں نکال سکے۔ اگر جرائم کی لہر بلا روک ٹوک جاری رہتی تو وہ لوگوں کی شکایات سننے' پولیس کو برا بھلا کہنے اور ''فوری اور مؤثر کارروائی'' کا حکم صادر کرنے کے لیے یقیناً اور بلا تاخیر وقت نکال لیتے۔ دوسرے شعبوں کی طرح معاشرہ میں امن و امان کا بھی کوئی پرسانِ حال نہیں۔

چوہدری افتخار نے شہر میں قیامِ امن و امان سے متعلق اپنے منصوبہ پر تفصیلات قلمبند کر کے تمام افسروں میں تقسیم کیں۔ انہوں نے اس موضوع پر ڈی آئی جی اور ایس پی صاحبان کو ایک میٹنگ میں بریفنگ بھی دی۔ فیصل آباد پلان کی معمولی ردوبدل کے ساتھ کئی دیگر بڑے شہروں میں بھی پیروی کی گئی۔ البتہ لاہور میں نہیں اس کی وجوہات آگے چل کر بیان کی جائیں گی۔ اگر افرادی قوت' ٹرانسپورٹ' مواصلات' ہتھیار و ایمنیشن' پولیس پوسٹوں اور ہنگامی چوکیوں کے لیے اضافی وسائل فراہم کر دیے جاتے تو وہ منصوبہ مزید کارآمد بن سکتا تھا۔ بدقسمتی سے حکومت نے معاشرتی امن کے ایسے عمدہ منصوبہ کو بھی قطعاً ترجیح نہیں دی۔ حکومت اپنی تجوری کا منہ صرف اس وقت کھولتی ہے جب چاروں طرف دہشت پھیل جائے اور اس کی اپنی جان خطرہ میں پڑ جائے۔ اس حقیقت کا قطعی احساس نہیں کرتی کہ ملکی ترقی کے لیے امن ضروری ہے اور بدامنی تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

لاہور کے لیے منصوبہ

لاہور کے مسائل دوسرے بڑے شہروں سے مختلف تھے۔ اس لیے لاہور پولیس کی تنظیمِ نو کے لیے ایک نیا پلان تیار کیا گیا۔ اگرچہ وہ واچ اینڈ وارڈ نظام کی حد تک فیصل آباد پلان جیسا ہی تھا' رانا مقبول احمد' ڈی آئی جی' لاہور نے جو ایک انتھک محنتی افسر ہیں' اپنے تصور' اختراعی صلاحیت اور چار سال تک لاہور کے ایس ایس پی کی حیثیت سے کام کرنے کے تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منصوبہ تیار کرنے والی ٹیم کی قیادت کی۔ ان کی مدد کے لیے طارق کھوسہ' ایس ایس پی جو ایک انتہائی دیانتدار' محنتی اور ہوشیار افسر ہیں نیز کلب عباس' حامد مختار گوندل' ڈاکٹر شفیق' چوہدری سجاد اور زبیر جیسے ذہین و فطین ایس پی صاحبان کا جھرمٹ موجود تھا۔ علاوہ ازیں احمد خاں چدھڑ' غلام محمد کلیار' رؤف ڈوگر' مسعود عزیز' افتخار پیرزادہ اور بعض دوسرے ڈی ایس پی صاحبان نے بھی ہاتھ بٹایا۔

انہوں نے موٹر سائیکل سوار دستے منظم کیے جو بڑے مؤثر انداز میں اور پھرتی سے حرکت میں آتے تھے۔ ایک سکواڈ میں دو موٹر سائیکلیں ہوتی تھیں۔ ہر ایک پر ایک مسلح پنین (Pinion) سوار ہوتا تھا۔ ایک سکواڈ چار پیدل گشتی پارٹیوں کے برابر علاقہ کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

شہر کے ٹریفک کی ازسرِ نو تنظیم کی گئی۔ سٹاف اور زونوں میں اضافہ اور ردّوبدل کی تجویز پیش کی

گئی۔ زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ مزید کیڈر فورمز بنائے جائیں اور تجاویزات کا خاتمہ کیا جائے۔ وہ تجویز بڑی معقول تھی تاہم بہت سی اقتصادی وسیاسی مجبوریاں آڑے آ گئیں۔ ایک نیا ڈویژن' جو پانچ سب ڈویژن پر مشتمل ہو اور جس کا سربراہ ایس پی ہو' قائم کرنے کی تجویز دی گئی۔ بہرحال اپنی بہترین کوششوں کے باوجود لاہور پولیس آٹھ گھنٹے کا شفٹ سسٹم شروع نہیں کر سکی کیونکہ حکومت مطلوبہ فنڈز فراہم کرنے کو تیار نہیں تھی۔

لاہور سی آئی اے کے لیے طویل المقاصد تنظیم نو کی تجویز پیش کی گئی۔ جس کے تحت پانچ زون قائم کرنے تھے۔ ہر ایک زون ایک ڈی ایس پی کے ماتحت ہوتا' اسے ضروری سٹاف اور وسائل فراہم کیے جاتے۔ اس تجویز کے مطابق صرف ایک مرکزی کرائم ریکارڈ آفس قائم کرنا مطلوب تھا جس میں فیکس اور کمپیوٹر کی سہولتیں موجود ہوتیں۔ یہ منصوبہ عملی تقسیم اور تخصص (Specialization) کی واضح ضرورت ظاہر کرتا تھا' خصوصاً مال کے خلاف جرائم مثلاً ڈاکہ زنی' کار چوری' نقب زنی' بینک ڈکیتی وغیرہ۔ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ جرائم ریکارڈ کرنے کے لیے کمپیوٹر کا وسیع پیمانہ پر استعمال کیا جائے نیز سی پی او (سینٹرل پولیس آفس) اور کرائم برانچ کے ساتھ رابطہ کو موثر بنایا جائے۔

مجرموں کی شناخت اور سراغ لگانے کے لیے جس کے ساتھ مجرموں کی خاموش اور ویڈیو فوٹوگرافی کا جامع نظام ہو' ایک باقاعدہ مہم شروع کی گئی۔ طے پایا کہ مجرم کی وڈیو کلپ میں جو اس کی حراست کے دوران بنائی جائے خواہ وہ جیل میں ایک دن رہے یا رہا ہونے والا ہو۔ اسے چلتے پھرتے اور باتیں کرتے دکھایا جائے گا۔ ایسی تصویریں جنہیں ویڈیو کیسٹس پر ریکارڈ کیا جا سکے' بعد میں اس کی شناخت میں مدد دیں گی۔ سی آئی اے کی ٹیمیں سنگین جرائم کے موقع واردات پر جائیں گی اور انگلیوں کے نشانات وغیرہ لینے کے علاوہ متاثرہ افراد کو مشکوک تصاویر دکھائیں گی۔ بہت سی وارداتوں میں متاثرین مجرموں کو پہچان لیں گے اور ان کا سراغ لگانا آسان ہو جائے گا۔ سی آئی اے کے دیگر ضلعی انچارجوں کو بریفنگ کے لیے لاہور بلایا گیا اور ان سے کہا گیا کہ لاہور سی آئی آے کے نمونہ کی مقامی طور پر ردوبدل کے ساتھ تقلید کریں۔ (مزید تفصیلات کے لیے باب نمبر 38 ملاحظہ کیجئے)

پرانا تصور سیلاب کی نذر ہو گیا

پولیس نے 1992ء کے تباہ کن سیلاب کے دوران شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ پولیس کے جوان اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر سب سے پہلے متاثرہ علاقوں میں پہنچے اور ہزاروں بچوں' عورتوں اور مردوں کو طوفانی لہروں سے بچایا۔ یہ ابھرتا ہوا شریفانہ طرزِ عمل تھا جس نے شہریوں کی خدمت کے تصور کو فروغ دیا۔ مجھے جونہی جہلم کے ہمہ وقت مستعد ایس پی نسیم الزمان کی طرف سے آنے والے سیلاب کی اطلاع ملی' میں نے بذریعہ وائرلیس ہدایات جاری کر دیں کہ چناب' جہلم اور سندھ کے نشیبی اضلاع کی پولیس کو امدادی کاموں میں حصہ لینے کے لیے بلاتاخیر روانہ ہو جانا چاہیے۔ انہوں نے فوراً تعمیل کی۔ پولیس نے متاثرہ علاقوں کے باسیوں کو جو آنے والی آفت سے بے خبر تھے' ان کے گھروں سے نکالا' بعض اوقات زبردستی بھی کرنی پڑی۔ اس نیک مقصد کے لیے فورس کا استعمال خود لوگوں کے مفاد میں اور بالکل جائز تھا۔

پولیس کے جوانوں نے امدادی کیمپ لگائے نیز خوراک اور پانی کی فراہمی کا بندوبست کیا۔ یہاں تک کہ اپنی تنخواہوں میں سے ریلیف فنڈ میں چندہ بھی دیا۔ انہوں نے چھوڑی ہوئی جائیداد اور مویشیوں کی ایسی مستعدی کے ساتھ حفاظت کی کہ متاثرہ علاقوں میں چوری کی ایک بھی واردات نہیں ہوئی۔ لوگوں نے واقعی حیرت واستعجاب کا اظہار کیا اور پولیس والوں کے کام کو سراہا، جنہوں نے سچے جذبہ سے ان کی خدمت اور مدد کی۔ پولیس افسروں نے بھی اپنے اپنے علاقوں میں تحفظ اور امداد کے کام کو منظم کر کے شاندار کارکردگی دکھائی۔ ہر پولیس مین نے اپنے عام طریق کار سے ہٹ کر اور اپنے فرض سے بڑھ کر کام کیا۔ لوگوں کو اپنی آنکھوں پر بمشکل یقین آیا جب انہوں نے ڈی ایس پی صاحبان' انسپکٹروں اور سب انسپکٹروں کو دریاؤں اور نہروں کے شکستہ کناروں کی مرمت کے لیے وردی کی حالت میں اپنی پشت پر مٹی اور ریت کی بوریاں لاتے ہوئے دیکھا۔ اس منظر نے خاموش تماشائیوں کو ہاتھ بٹانے پر مجبور کر دیا۔

تخلیقی امنگ' الزام تراشی سے ہمیشہ قوی تر ہوتی ہے۔ گجرات کے سب انسپکٹر سلطان احمد نے اپنی جان پر کھیل کر ایک تباہ شدہ گاؤں کے قریباً 300 افراد کی جانیں بچائیں۔ جب دیہاتیوں نے گہرے احساسِ تشکر اور جذبۂ تحسین کے ساتھ نواز شریف کو بتایا کہ سلطان احمد نے یہ کارنامہ کس طرح انجام دیا تو وہ جذبات سے مغلوب ہو گئے اور اس کے حوصلہ وجرأت کی دل کھول کر تعریف کی۔ وزیراعظم نے موقع پر ہی اسے باری سے پہلے پروموشن دینے کا' جس کا وہ بجا طور پر مستحق تھا' اعلان کر دیا۔ وزیراعظم متاثرہ لوگوں کا حال معلوم کرنے کے لیے جہاں بھی گئے' وہاں اسی قسم کی کہانیاں سننے میں آئیں۔ پولیس کی نہ صرف عزت

اور تعریف کی جا رہی تھی بلکہ وہ حقیقت میں ہر دلعزیز بن گئی تھی۔ ہر طرف سے ''پولیس زندہ باد'' کے نعرے سننے میں آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان اضلاع کی پولیس نے بھی جو سیلاب سے محفوظ تھے' متاثرہ علاقوں کے لیے امدادی سامان بھیجا۔ انہوں نے اپنی جیب سے وزیراعظم کے امدادی فنڈ میں حصہ ڈالا اور چندہ اکٹھا کیا۔ قومی پریس نے پولیس کے مشنری جذبہ کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

پولیس کے اس ''غیر معمولی اور عجیب و غریب روّیہ'' کو دیکھ کر دوسری سروسز میں ان کے تخیل کے مطابق حسد کے جذبات پیدا ہوئے۔ بعضوں نے یہاں تک کہا کہ یہ ان کا ''پیشہ ورانہ کام نہیں تھا۔'' انہوں نے یہ بات فراموش کر دی کہ پولیس کا اصل کام ہی انسانیت کی خدمت ہے۔ خصوصاً مصیبت کے وقت تو یہ فرض اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ 1934ء کے پولیس رولز میں خود انگریز حکمرانوں نے اس قسم کے فرائض کو اس کے چارٹر میں شامل کیا تھا۔ یہ بعض گمنام سامراج پسند تھے جنہوں نے پولیس کو لوگوں کی خدمت سے ہٹا کر ظلم و تشدد پر ڈال دیا اور پھر اسے ''پولیس کا پیشہ'' قرار دے دیا۔

ایک بہت سینئر اور سنجیدہ و متین بیورو کریٹ نے کہا: ''مجھے یہ مت بتاؤ کہ وہ سب تھوڑے سے عرصہ میں فرشتے بن گئے ہیں۔''

میں نے جواب دیا: ''ٹھیک ہے' وہ فرشتے نہیں بنے' تب بھی میں یہ کوشش جاری رکھوں گا کہ ان میں سے کچھ افراد فرشتے بن جائیں۔ ویسے بھی اچھا انسان بننا فرشتہ بننے سے کہیں بہتر و افضل ہے۔''

غصے میں بھرے ہوئے بیورو کریٹ پر میری باتوں کا زیادہ اثر نہیں ہوا۔ اس نے سمجھا کہ میں رومانوی جذبات کی رو میں بہہ گیا ہوں۔ انہوں نے پھر زبان کو جنبش دی اور بولے:

''فکر نہ کریں۔ آپ جلد ہی مایوس اور پریشان ہو جائیں گے۔ وہ سرتاپا کرپٹ اور سنگدل ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ ان کے ساتھ سختی سے نمٹیں۔ کسی شفقت و مہربانی کا مظاہرہ نہ کریں اور انہیں سزا کی زبردست خوراک دیتے رہیں۔ آپ کامیاب رہیں گے اور لوگ دیر تک آپ کو دہشت گرد کے نام سے یاد رکھیں گے۔ میں ایک دوست کی حیثیت سے مشورہ دے رہا ہوں' ورنہ آپ ناکام ہو جائیں گے۔''

ایک انتہائی تعلیم یافتہ اور تجربہ کار ایڈمنسٹریٹر کی زبان سے' جو قوم کی کریم میں سے ایک تھا' ایسے الفاظ سن کر مجھے سخت دھچکا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ گھٹیا ترین درجہ کے دھوکے باز اور تربیت یافتہ ظالم و جابر کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ایک آزاد ریاست میں پولیس پر سیمینار

میں مذکورہ بالا بیوروکریٹ جیسے لوگوں کی سوچ پر پیچ وتاب کھا رہا تھا' جب اس نے مجھ سے سوال کیا:

''میں نے سنا ہے آپ پولیس پر کوئی سیمینار منعقد کر رہے ہیں؟''

''یس سر۔ میں' ''ایک آزاد ریاست میں پولیس کے کردار'' پر سیمینار کا اہتمام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ محض وقت اور توانائی کا ضیاع ہوگا جس سے پیشہ ورانہ سطح پر کسی فائدہ کی قطعی اُمید نہیں۔ بلکہ اس سے پولیس کی توجہ چوروں' ڈاکوؤں اور راہزنوں کو پکڑنے سے ہٹ جائے گی۔'' انہوں نے رائے ظاہر کی۔

میں نے انہیں یہ بات سمجھانے کی ہر چند کوشش کی کہ صورت حال کا جائزہ لینا اور لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر چلنا کس قدر اہم ہے مگر وہ باتیں ان کے اوپر سے گزر گئیں۔ شاید سالہا سال سے اختیارات کے استعمال نے ان کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ اس میدان میں وہ اکیلے نہیں تھے۔ اس طرح اور بھی بہت سے تھے جن کے نزدیک اس قدر اہم مسئلہ پر سیمینار منعقد کرنے کا خیال محض وقت کا ضیاع تھا۔ ان کے خیال میں پولیس کا کام طاقت کے خلاف طاقت کے جابرانہ استعمال کے سوا کچھ نہیں ہوتا تاکہ لوگوں کو قابو میں رکھا جا سکے۔

ہم نے سیمینار کے لیے بھرپور اور زبردست تیاریاں کیں۔ عنوانات اور ان کے خاکے تیار کرنے کے لیے طویل مباحثے ہوئے۔ ممتاز دانشوروں سے اپنی پسند کے موضوعات چننے کی التماس کی گئی اور مقالات کی تیاری کے لیے مطلوبہ امداد فراہم کی گئی۔ انتظامات اپنی آخری سطح پر پہنچ گئے تھے جب اچانک افتاد پڑی اور سیمینار کو منسوخ کرنے کی تدابیر کامیاب ہو گئیں۔ بیمار ذہنوں کے لیے صحت مند سوچ واقعی سوہانِ روح ہوتی ہے۔

عداوتوں کا خاتمہ

ہمارے معاشرہ میں مجرم اپنے آپریشنز کو منسوخ کرنے کے لیے شاطرانہ چالیں چلتے ہیں۔ ان کے گمراہ کن اطوار سیاستدانوں' مذہبی راہنماؤں' معاشرہ کے بزرگوں اور بعض اوقات قانون نافذ کرنے

والوں کو بھی پریشان کر دیتے ہیں۔ مجرموں اور ٹھگوں کی بھاری تعداد دیہات کے جاگیردار خاندانوں کی باہمی عداوتوں اور دشمنیوں کے بل پر خوب عیش کرتی ہے۔ چنانچہ ایک جاگیردار خاندان نے اپنے دشمنوں سے بچاؤ اور تحفظ کے لیے بدمعاش مقرر کر رکھے تھے۔

بہر حال بندوق بردار محافظ مفت میں نہیں ملتے۔ ان کی وفاداریوں کو یقینی بنانے کے لیے معقول تنخواہ اور دیگر مراعات دینی پڑتی ہیں۔ ناخوش یا غیر مطمئن ہونے کی صورت میں ان کے بھاگ جانے یا دشمنوں سے جا ملنے کا خطرہ رہتا ہے۔ ہم زمیندار کے مطالبات اپنے وسائل سے ایک حد تک ہی پورے کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اس وقت صرف نظر سے کام لینا پڑتا ہے جب ان کے بدمعاش محافظ دورانِ سفر راہزنی کر کے یا دیگر جرائم کے ذریعے پیسے کما لیتے ہیں۔ زمینداروں کو دھکیل کر ایسے مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے جہاں وہ نہ صرف مجرموں کو پناہ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں بلکہ جرم میں شریک ہونے کی بنا پر اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

انہیں اس دلدل سے نکلنا ضروری تھا۔ پولیس، جسے یہ فریضہ انجام دینا چاہیے تھا وہ بذاتِ خود ان تنازعات اور دشمنیوں کو اپنے فائدہ کے لیے استعمال کرتی تھی۔ اگر حریف پارٹیوں کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف زیادہ سے زیادہ کیس درج کرائے جاتے تو یہ صورتحال پولیس کے لیے بڑی نفع بخش ہوتی تھی۔ پولیس نے اس کہانی والے بندر کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس نے بلیوں کی لڑائی سے فائدہ اٹھایا اور ساری روٹی خود چٹ کر گیا۔

دیہات میں زیادہ تر دشمنیاں ایوب خاں کے ابتدائی دور میں بنیادی جمہوریت کا نظام رائج کرنے سے پیدا ہوئیں۔ یونین کونسلوں کے حلقہ ہائے انتخاب بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ جس کے نتیجہ میں تمام رشتہ داروں حتیٰ کہ خاندانوں کے اندر پھوٹ پڑ گئی۔ جس نے سیاست کو انتہائی شخصی رنگ دے دیا اور پُرامن معاشرہ کی جڑیں ہل کر رہ گئیں۔ زر زمین اور زن کے جھگڑے ہمیشہ سے چلے آ رہے تھے، جن کی تعداد محدود ہوتی تھی۔ بنیادی جمہوریت کے نظام نے نہ صرف ان کی تعداد میں بے پناہ اضافہ کر دیا بلکہ اگلے الیکشن پر پرانے زخم پھر سے ہرے ہونے لگے۔ سالہا سال پرانے معمولی جھگڑے شدید دشمنیوں میں بدل گئے۔ ان سے نمٹنے کے لیے بدمعاشوں کی ٹولیاں ساتھ رکھنی پڑتی تھیں جو اپنے سرپرستوں کی حفاظت کے نام پر معاشرہ کے امن و سکون کو غارت کرتی تھیں۔ میں نے اپنی ایک تقریر میں اپنے تحفظ کے لیے

بدمعاشوں کوساتھ رکھنے کے طریقہ کو "بدمعاش پال" کہہ کے تعبیر کیا تو سامعین خوب محظوظ ہوئے۔

میں نے اپنے طریقہ سے کام کا آغاز کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے چوہدری مختار احمد گوندل کے ساتھ جو ایک مشہور تجربہ کار افسر تھے اور ڈی آئی جی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ صوبہ بھر کا دورہ کیا۔ وہ زمانہ کا سرد و گرم چکھے ہوئے تھے اور دیہی زندگی کی بابت گہری بصیرت رکھتے تھے۔ ہم نے افسروں اور جوانوں کو تنازعات اور دشمنیوں کی تفصیلات جمع کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے بااثر افراد کی فہرستیں تیار کرنے کو کہا جو مستقل صلح اور مفاہمت کرا سکتے تھے۔

قصاص و دیت کا قانون نافذ ہونے کے بعد' جس میں ظلم کا نشانہ بننے والے فریق کو معاوضہ (دیت) ادا کیا جاتا ہے مصالحت کرانا نسبتاً آسان ہوگیا اور اسے قانونی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس لیے میں نے پولیس والوں سے کہا کہ وہ اپنا فرض ادا کریں۔ انہوں نے میری اپیل پر سچے مسلمانوں اور محبِ وطن پاکستانیوں کے جذبہ کے ساتھ لبیک کہا۔

پرانی دشمنیوں کے اعداد و شمار حیرت انگیز تھے۔ بگڑتی ہوئی صورت حال میرے تصور سے کہیں زیادہ خراب نکلی۔ فتح شیر جویہ ایس ایس پی سرگودھا نے معاشرہ کے بڑے بوڑھوں کی مدد سے اپنے ضلع میں ایک سال کے اندر چار ہزار تنازعات صلح کے ذریعے طے کرادیئے۔ ان میں سے بعض جھگڑے 1960ء کے عشرہ سے چلے آرہے تھے۔ ان کے بقول وہ تنازعات مجموعی تعداد کے 1/10 سے بھی کم تھے۔

شیخوپورہ میں ایس پی طارق سلیم ڈوگر اور ڈپٹی کمشنر وسیم افضل نے دو خاندانوں کو جو عرصۂ دراز سے برسرِ پیکار تھے۔ بڑی خوش اسلوبی سے شیر و شکر کرادیا۔ مصالحت ہونے پر ان بدمعاشوں کی چھٹی کردی گئی جو دونوں خاندانوں کے محافظ بنے ہوئے تھے۔ جب انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تو بے سہارا مجرموں کو ایک مہینے کے اندر اندر آسانی سے گرفتار کرلیا گیا۔ پتہ چلا کہ وہ بدمعاش گزشتہ 3 برسوں کے دوران آس پاس کے 19 دیہات میں 374 ڈکیتیوں کا ارتکاب کرچکے تھے۔

گوجرانوالہ کے ایس ایس پی ملک اقبال نے جو مصالحتی مہم شروع کی' اس کے دوران ایک ایسے کیس میں بھی صلح کرادی گئی جس میں طرفین کے سو سے زائد افراد قتل ہوچکے تھے۔

پولیس اور انتظامیہ نے رات دن محنت کرکے صوبہ بھر میں اس طرح کے ہزاروں مقدمات میں صلح کروائی اور لوگوں کو پرانی دشمنیوں سے نجات دلائی۔

پنچایتوں کی بحالی

میں نے دیہی معاشرہ میں دشمنی کی وجوہات کا قلع قمع کرنے کے لیے پنجاب کابینہ سمیت ہر جگہ اس بات کی پرزور وکالت کی کہ بنیادی جمہوریتوں کا نظام ختم کرکے اس کی جگہ پنچایت سسٹم بحال کیا جائے جس نے دیہات میں جھگڑوں کو کامیابی سے ختم کر دیا تھا اور صدیوں تک کے لیے امن قائم ہو گیا تھا۔ یونین کونسلیں سیاسی بنیاد پر منقسم ہونے کے باعث اپنی نوعیت کے لحاظ سے جانبدار تھیں اور مصالحانہ کوششوں میں غیر جانبدارانہ اور منصفانہ کردار ادا نہیں کر سکتی تھیں۔ پنچایتیں گاؤں کے ان بزرگوں پر مشتمل ہوتی تھیں جن کا سب احترام کرتے تھے اور ان کا انتخاب صرف اتفاقِ رائے سے کیا جاتا تھا۔ وہ چھوٹے موٹے معاملات میں' ان کے دشمنی میں تبدیل ہونے سے پہلے آسانی سے صلح کرا دیتے تھے۔ 1969ء میں ایوب خاں کے زوال کے بعد یونین کونسلوں سے متعلق قوانین میں جو ترامیم بروئے کار لائی گئیں' ان کی بدولت ان کے اختیارات بڑی حد تک کم ہو گئے اور دیہی زندگی میں ان کا کردار' خصوصاً مقدمات کا تصفیہ کرانے کے سلسلہ میں' صفر ہو کے رہ گیا۔ اس کے باوجود ان بیکار اداروں کے الیکشن میں سینکڑوں جانیں ضائع ہو جاتی ہیں' بعض اوقات اتنے افراد عام انتخابات میں بھی نہیں مارے جاتے جتنے بلدیاتی الیکشن میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔

ضلعی فورم

ظفر احمد قریشی ایس پی قصور بڑے حاضر دماغ اور اپنے کام سے سچی لگن رکھنے والے افسر تھے' انہوں نے ڈپٹی کمشنر جنید اقبال کے ساتھ مل کر معاشرہ میں قیامِ امن و امان اور پرانے مقدمات میں مصالحت کرانے کو ایک مزید جامع طریقہ سے استعمال کیا۔ دونوں افسروں نے ضلع کے ایم این اے' ایم پی اے' چیئرمین ڈسٹرکٹ کونسل' بلدیاتی اداروں کے سربراہوں' مجسٹریٹوں اور ڈی ایس پی صاحبان کی میٹنگ بلائی۔ عوامی نمائندوں نے تفصیلی بحث کے بعد اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ جرائم اور مجرموں کے خلاف جدوجہد میں کسی خوف یا حمایت کے بغیر حصہ لیں گے۔ انہوں نے عہد کیا کہ وہ کسی مجرم کی کسی بھی طریقہ سے نہ تو حمایت کریں گے نہ ہی اسے تحفظ دیں گے' کیونکہ انہیں احساس ہو گیا ہے کہ مجرم انہیں اور ان کے کارندوں کو مختلف طریقوں سے گمراہ کرتے ہیں اور ایسا تاثر دیتے ہیں کہ ایم این اے اور ایم پی اے اپنے

حریفوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے ان کی سرپرستی کرتے ہیں۔

ایس پی قصور نے جس پلیٹ فارم کو ترقی دی اس میں ضلع کے تمام سیاسی گروپ شامل تھے تا کہ بعد میں کسی انحراف کا امکان ہی باقی نہ رہے۔ اگر کوئی شخص کوئی بات چھپانے کی کوشش کرتا تو مخالف گروپ اسے فوراً بے نقاب کر دیتا۔ انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ کسی سرکاری ملازم کی تعیناتی یا تبادلہ کی سفارش نہیں کریں گے اور کسی انتظامی معاملہ میں دخل نہیں دیں گے۔ عداوتوں کو کم کرنے اور دیرپا مصالحتیں کرانے کے لیے تدابیر بروئے کار لانا بھی ضلع فورم کی ذمہ داری میں شامل کر لیا گیا۔

ضلعی فورم نے یہ بھی طے کیا کہ کوئی شخص کسی مقدمہ کی تفتیش بدلوانے کے لیے درخواست نہیں دے گا۔ تفتیش کی بار بار تبدیلی سے نہ صرف مقدمات کی پیش رفت متاثر ہوتی ہے بلکہ مقامی پولیس کی ذمہ داری بھی گھٹ جاتی ہے۔ وہ یہ عذر پیش کر سکتی ہے کہ تفتیش کے لیے کسی کی دوسری ایجنسیوں کو بار بار منتقلی جرم کے غیر مؤثر تدارک اور عدم سراغ یابی کا سبب بنی۔ اگر ناانصافی کی کوئی شکایت ہوتی تو معاملہ کو دادرسی کے لیے ضلعی فورم میں پیش کر دیا جاتا۔

طے پایا کہ ضلعی فورم کا ہر مہینے ایک اجلاس ہوگا تا کہ جرائم کی صورت حال اور دیگر متعلقہ مسائل کا جائزہ لیا جا سکے۔ ایک طرف عوامی نمائندوں نے عزم کر لیا کہ وہ اپنے کارکنوں کو جرائم کے خلاف حرکت میں لائیں گے' دوسری طرف ایس پی اور ڈپٹی کمشنروں نے صدقِ دل سے اقرار صالح کیا کہ اگر ان کا کوئی ماتحت اپنے فرائض کی بجا آوری میں غافل پایا گیا تو اس کے خلاف فوراً کارروائی کریں گے۔

قصور انتظامیہ کا تجربہ انتہائی کامیاب رہا۔ محض تین ماہ کے قلیل عرصہ میں ضلع میں جرائم کی تعداد برائے نام رہ گئی۔ جنرل ایڈمنسٹریشن کی حالت بھی بڑی حد تک سدھر گئی۔ غیر حاضری کے پرانے عادی ڈاکٹروں' سکول ٹیچروں اور دیگر سرکاری ملازمین نے جو محض اپنی تنخواہ لینے دفتر آیا کرتے تھے' باقاعدگی کے ساتھ ڈیوٹی پر آنا شروع کر دیا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اب کوئی ایم این اے یا ایم پی اے ان کی حمایت میں نہیں بولے گا اور ممکن ہے انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ اجتماعی خواہش شاندار کامیابی کے ساتھ کام کرنے لگی۔

میں نے رینجرز کے ڈی آئی جی صاحبان اور ضلعوں کے ایس پی حضرات کو لکھا کہ قصور کے نمونہ کی تقلید کریں۔ اکثر مقامات پر میں خود گیا اور ایڈمنسٹریٹروں' پولیس افسروں نیز عوامی نمائندوں کے سامنے اس نظریہ کی وضاحت کی اور تفصیل سے سمجھایا۔ ان میں سے اکثر نے اسے پوری سرگرمی کے ساتھ اختیار کر

لیا۔ بعض مقامات پر سیاسی گروبندی نے مسائل پیدا کیے۔ وہاں میرے دوست چوہدری واجد علی خاں نے جو ضلع شیخوپورہ کے فعال و متحرک ایم پی اے تھے، اپنے وسیع علم اور سیاسی گروہ بندی کے شعور وادراک کے ساتھ ہاتھ بٹایا۔ وزیرِ اعلیٰ نے انہیں اس مقصد کے لیے صوبائی افسر رابطہ نامزد کیا تھا۔

اوکاڑہ میں ایک نئی مثال قائم کی گئی وہاں رانا اکرام ربانی نے، جو پنجاب اسمبلی میں قائدِ حزبِ اختلاف تھے۔ ضلعی فورم قائم کرنے میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ شدید مخالفین مثلاً لیسین وٹو اور منظور احمد وٹو (سپیکر پنجاب اسمبلی) نے جرائم کے خلاف مل کر جدوجہد کرنے کا عہد کیا۔ چوہدری واجد علی خاں نے ایسی اثر انگیز اور قائل کرنے والی تقریر کی کہ اوکاڑہ میں سیاسی جماعتوں کے سارے دھڑے جرائم کے خلاف جہاد میں شامل ہو گئے۔

چوہدری واجد علی خاں نے راولپنڈی میں چوہدری نثار علی خاں اور راجہ بشارت کو ایک میز پر بیٹھنے پر آمادہ کرکے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔

شیخوپورہ میں ایس پی چوہدری اشرف مارتھ شروع میں ہچکچاہٹ کا شکار رہے کیونکہ وہ ایسے فورم کی افادیت کے کچھ زیادہ قائل نہیں تھے۔ تاہم چوہدری واجد علی خاں کے اصرار پر دو میٹنگوں کے انعقاد کے بعد اور جرائم میں تیزی سے کمی دیکھ کر اس قدر متحرک ہوئے کہ انہوں نے ایسے فورم تھانہ کی سطح تک منظم کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔

سرگودھا کے ایس ایس پی فتح شیر اور اٹک کے ایس پی ناصر درّانی نے ایک قدم آگے بڑھا کر اپنے اضلاع کے دیہات میں بھی اس قسم کے فورم تشکیل دیئے۔ بعد ازاں ظفر قریشی ایس پی سیالکوٹ تمام عوامی نمائندوں کو ایک فورم پر جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اتفاقِ رائے سے اپنائے گئے ضابطہ اخلاق نے تفتیش بدلوانے کے لیے بار بار درخواستیں دینے اور تبادلوں میں سیاسی اثر ورسوخ استعمال کرنے کے عمل کی بیخ کنی میں اہم کردار ادا کیا۔

لاہور کے ڈی آئی جی رانا مقبول اور کمشنر طارق فاروق نے ضلع فورم کا ایک اجلاس الحمرا آرٹ سنٹر (لاہور) میں منعقد کیا۔ جس میں شرکت کے لیے ضلع کے تمام ایم این اے، ایم پی اے صاحبان، کارپوریشن کے میئر اور برانچ کے سٹاف افسروں، ڈائریکٹر تحقیق و ترقی، انسپکٹروں اور چیدہ چیدہ سب

انسپکٹروں کو بلایا گیا۔لوگوں کی طرف سے اس قدر بھرپور جواب ملا کہ الحمرا کمپلیکس کے دونوں ہال سامعین سے بھر گئے۔کیونکہ رضا کارکور نے جرائم کے خلاف اجلاس کی اطلاع ملنے کے بعد اس میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

بعدازاں وزیراعظم نے اپنی پارٹی اور انتظامیہ کے نام ہدایات جاری کردیں کہ جرائم کے خلاف جہاد میں انہی خطوط پر حصہ لیں جن خطوط پر ہم کام کررہے تھے اور اس کے نتائج بہت ہی شاندار نکلے۔



باب37

تخلیقی سوچ کا ارتقا

میں نے 1991ء میں آئی جی کا منصب سنبھالا تو پنجاب میں جرائم کی صورت حال بڑی تشویش ناک تھی۔ ظلم و تشدد پر مبنی جرائم کی وارداتیں عام ہو رہی تھیں۔ پولیس جو بڑے دباؤ میں کام کر رہی تھی مجرموں کے کلاشنکوف بردار گروہوں سے خوفزدہ تھی۔ حکومت اور فوجداری انصاف فراہم کرنے والی انتظامیہ حیران و پریشان تھی۔ افسروں نے اس خوف سے کہ ان کا روزگار نہ چھن جائے پیش قدمی کرنا یا جرائم اور امن و امان کے مسائل کی بابت سوچنا ترک کر دیا تھا۔

میں نے افسروں اور جوانوں کو اس طرح کام کرتے دیکھا جیسے بے زبان جانوروں کو ہانکا جاتا ہے۔ ریاست کے دوسرے محکموں اور اداروں میں اپنے ہم منصبوں کی طرح پولیس والوں کو بھی مختلف فوجی حکومتوں نے روبوٹ کی سی اطاعت و فرمانبرداری کا سبق سکھا کر نفسیاتی طور پر دائم المریض بنا دیا تھا۔ ان کے لیے اوپر والوں کے احکام وصول کر کے ان پر بلاچون و چرا عمل کرنا لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔ جرائم کے سنگین چیلنجوں سے کامیابی کے ساتھ نہیں نمٹا جا سکتا جب تک فورس کے چھوٹے بڑے تمام ارکان دل جمعی کے ساتھ اس میں شریک نہ ہوں۔ ان میں قوت اور جذبہ پیدا کرنے کے لیے معاملہ کی بابت ان کی پوری سوچ کو تبدیل کرنا ضروری تھا۔

ان طریقوں میں سے ایک جس سے میں نے مؤثر انداز میں کام لیا' یہ تھا کہ ڈی آئی جی صاحبان اور دوسرے سینئر افسروں کی مسلسل کئی کانفرنسیں منعقد کرائیں تا کہ اصل مسائل پر تفصیلی غور و خوض کیا جا سکے اور یہ طے کیا جا سکے کہ ان سے نمٹنے کے لیے کون سی مختصر المیعاد اور طویل المیعاد تدابیر بروئے کار لائی جائیں۔ یہ کانفرنسیں نوعیت کے اعتبار سے سابقہ کانفرنسوں سے مختلف تھیں۔ میں نے دقیانوسی طرز کے احکام جاری نہیں کیے' نہ ہی سزا دینے کی دھمکیاں دیں۔ یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا تھا کیونکہ میں نے ایسی بہت سی بے معنی کانفرنسوں میں یہ سب کچھ ہوتے دیکھا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میرے افسر اپنے دماغ سے کام لیں اور محض حکامِ بالا کے احکام بجا لانے کی بجائے مسائل کے حل کی خاطر تجاویز پیش کریں۔ میں اس طریق کار کو فورس کی سب سے نچلی سطح تک پہنچانا چاہتا تھا۔

میں نے صوبائی ہیڈ کوارٹرز میں ڈی آئی جی اور ایس پی صاحبان کی کانفرنسوں سے کام کی ابتدا کی۔ اس کے بعد رینج کی سطح پر چھوٹی کانفرنسیں ہوئیں۔ جن میں رینج کے کم از کم آدھے ڈی آئی جی اور

قریبی اضلاع کے ایس پی صاحبان نیز رینج کے ڈی ایس پی صاحبان کے ساتھ ساتھ مرکزی پولیس دفاتر سے ڈی آئی جی کرائم برانچ کے سٹاف افسروں' ڈائریکٹر تحقیق و ترقی' انسپکٹروں اور چیدہ چیدہ سب انسپکٹروں کو بلایا گیا' آخرالذکر افسران بھی بحث میں حصہ لیتے تھے۔

صوبائی اور دیگر کانفرنسیں منتخب موضوعات و مسائل پر تخلیقی سوچ بڑھانے کے اجتماعی طریقوں پر کئی دن تک سوچ بچار کرنے کے بعد منعقد کی گئی تھیں۔ افسروں نے اپنی خصوصی دلچسپی کے موضوعات پر مقالات لکھے۔ اجلاس کا ایجنڈا اور مقالات پیشگی تقسیم کر دیئے جاتے تھے تاکہ اجلاس کے شرکاء پوری طرح تیار ہو کر آئیں۔ تیاریوں کی نگرانی اور مثبت نتائج حاصل کرنے کے لیے مختلف کمیٹیاں تشکیل دے دی گئیں۔

ایجنڈا کی تیاری اور دوسرا دفتری کام سلمان قریشی ایڈیشنل آئی جی' میجر ضیاء الحسن ایڈیشنل آئی جی سپیشل برانچ' خالد لطیف ڈائریکٹر تحقیق و ترقی' صلاح الدین نیازی' ڈی آئی جی کرائم برانچ اور ایم اے حمید ڈائریکٹر تحقیق' سپیشل برانچ نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا جب کہ چوہدری غلام حید ایس پی سروے' سپیشل برانچ اور ڈاکٹر طارق کھوکھر اے ایس پی نے کانفرنس کی کارروائی کو ریکارڈ کرنے اور ''محافظ'' کے خصوصی شمارے میں شائع کرانے کا اہتمام کیا۔ ڈویژنل سطح پر بھی اسی طرح کے انتظامات کیے گئے تھے۔

ڈویژنل سطح پر ہونے والی کانفرنس میں ایک دن کی توسیع کر دی جاتی اور اس کا انعقاد کھیل کے میدان یا پریڈ گراؤنڈ میں کیا جاتا تھا تاکہ سپاہیوں کی جمعیت بھی شریک ہو سکے اور اپنی تجاویز و آراء پیش کر سکیں۔ ڈی آئی جی' ایس پی ڈی ایس پی صاحبان اور ایس ایچ اوز سے کہا گیا کہ وہ بھی اپنے اپنے حلقہ میں اسی طرح کی میٹنگیں کریں۔

کانفرنس کی کارروائی قلمبند کر کے رینج کے ماہوار رسالہ کے خصوصی شمارہ میں شائع کی گئی تاکہ پوری فورس استفادہ کر سکے۔ صوبائی سطح پر منعقدہ ڈی آئی جی کانفرنس کی روداد پنجاب پولیس کے ماہنامہ ''محافظ'' میں اشاعت پذیر کرائی گئی تاکہ اسے تمام پولیس والوں اور فوجداری انصاف سے وابستہ محکموں کے افسران میں تقسیم کیا جا سکے۔

ایجنڈے پر موجود موضوعات زیادہ تر عملی مسائل تھے جن کا پولیس کو نہ صرف پنجاب میں بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی سامنا تھا۔ کئی عشروں سے سابقہ حکومتوں اور پولیس کی سینئر کمان نے ایسے

معاملات پر توجہ نہیں دی تھی۔ طویل غفلت سے نہ صرف جرائم میں اضافہ ہوا بلکہ پولیس کے نظم وضبط کی بابت سنگین صورت حال پیدا ہوگئی۔ میں نے نظرانداز کردہ مسائل پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ ان کا حقیقت پسندانہ حل بھی تجویز کیا۔

میں صوبائی کانفرنسوں میں مباحث کے میدان کو وسیع کرنے اور خیالات کی روانی کے لیے دوسرے صوبوں آزاد کشمیر اور وفاقی پولیس ایجنسیوں کے سینئر پولیس افسران کو بھی مدعو کرلیتا تھا۔ سندھ کے آئی جی قمرالاسلام' آزاد کشمیر کے آئی جی سروش رؤف علوی' مسعود شاہ آئی جی سرحد' غلام زمان مہمند آئی جی بلوچستان اور عباس خاں کمانڈنٹ پولیس اکیڈمی نیز ان کے افسروں نے گہری دلچسپی ظاہر کی۔

صوبائی سطح پر ہونے والی کانفرنسوں میں گاہے بگاہے چیف سیکرٹری' ہوم سیکرٹری' لا سیکرٹری' ایکسائز و ٹیکسیشن سیکرٹری' ایڈووکیٹ جنرل اور لاہور ہائیکورٹ کے رجسٹرار بھی شرکت کرتے۔ پروٹوکول یہ ہوتا تھا کہ شرکائے اجلاس میں سے سب سے سینئر سیشن کی صدارت کرتا۔ ڈویژنل سطح کی کانفرنسوں میں کمشنر' ڈپٹی کمشنر اور سیشن جج بھی شریک ہوتے تھے اور حکمتِ عملی پر مبنی تجاویز پیش کرتے تھے۔ فوجداری نظامِ عدل کی نچلی سطح پر بھی اس نمونہ کی پیروی کی جاتی تھی۔

منفرد ایجنڈا

یہ چیز واضح کرنے کے لیے کہ مباحث میں کس قدر وسعت ہوتی تھی' ڈی آئی جی صاحبان کی ایک کانفرنس کا ایجنڈا جو اوائل 1992ء میں ہوئی۔ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

☆ جرائم کی صورتحال کا جائزہ و تجزیہ۔

☆ جرائم کے خلاف جدوجہد میں سپیشل برانچ کا کردار۔

☆ منظم مجرموں کی بوگس اور ناکافی ضمانتیں۔

☆ گاڑیوں کی رجسٹریشن کے جعلی کاغذات اور ان کی چیسز نیز انجن نمبروں میں تحریف۔

☆ ناجائز ہتھیاروں' منشیات' گاڑیوں کی چوری' ملاوٹ' بدمعاشوں کی شناخت اور جرائم کی خفیہ نگرانی سے متعلق مسائل۔

☆ عدالت سے غیر حاضر رہنے والوں اور اشتہاری مجرموں کے خلاف کارروائی کی سٹرٹیجی۔

 تمام مقدمات کی رجسٹریشن اور ان کی فوری تفتیش سے متعلق مسائل، فوری سماعت کی عدالتوں کی طرف سے بری کرنے کی وجوہات نیز مقدمات کی صحیح پراسیکیوشن اور انہیں عدالتوں میں ٹھیک طریقہ سے دائر کرنا۔

 فیصل آباد کے شہری علاقوں میں قیامِ امن وامان کا منصوبہ، بشمول کام کی تقسیم، عملہ کے لیے شفٹ سسٹم اور پولیس کے امیج کو بہتر بنانا۔

 شہریوں کے اجتماعی طرزِ عمل اور پریشر گروپوں سے نمٹنے کے لیے مذاکرات کی تکنیک۔

 پولیس کمانڈ، مورال اور نظم وضبط کو درپیش چیلنج۔

 تھانوں اور ضلعوں میں واقع سی آئی اے ایجنسیوں کے فوجداری ریکارڈ کو جدید خطوط پر مرتب کرنے کے لیے اقدامات۔

 خطرناک مجرموں اور بدمعاشوں کے ساتھ ضلعی، سب ڈویژن اور تھانہ کی سطح پر نمٹنے کے لیے ہنگامی منصوبہ اور تربیتی ضروریات۔

 نہروں میں شگاف ڈال کر اور دوسری ترکیبوں سے پانی چرانے والوں کے خلاف کارروائی۔

 شہروں کے اندر اور شاہراہوں پر ٹریفک کا بندوبست بشمول ٹریفک حادثات اور ٹرانسپورٹ کے کاروبار میں کمیشن سسٹم سے پیدا ہونے والے مسائل۔

 ذاتی معاملات بشمول محکمانہ کارروائی، تحقیقات، اپیل، اردلی روم اور سالانہ خفیہ رپورٹیں۔

 ٹرانسپورٹ، مواصلات، اسلحہ ایمونیشن، دفتری ساز وسامان، اس کی خرید اور تقسیم کے لیے پولیس کی ضروریات۔

 ٹریننگ کے لیے طویل اور مختصر مدت کی سٹریٹیجی اور اس کے لیے مطلوبہ ساز وسامان۔

 قیامِ امن وامان کے معاملہ میں عوام کی شرکت بشمول رضا کاروں، ارکانِ اسمبلی، بلدیاتی اداروں، نمبرداروں، چوکیداروں، قومی رضا کاروں، شہری دفاع کا عملہ اور پرائیویٹ سیکورٹی ایجنسیوں کا کردار۔

 پولیس ہیروز کے حالاتِ زندگی۔

 پولیس کے شہدا اور غازیوں کی بہبود کے اقدامات بشمول اضلاع میں بہبود فنڈ کا اجراء۔

☆ ذرائع ابلاغ کے ساتھ پولیس کے تعلقات کی اصلاح' پولیس کے جرائد' مطبوعات اور لائبریریوں سے متعلق مسائل۔

☆ شہید ڈے اور پولیس ویک منانے نیز ثقافتی سرگرمیوں اور کھیلوں کا اہتمام۔

☆ آئندہ کی منصوبہ بندی' پانچ سالہ پلان نیز اگلے سال کے بجٹ کی تیاری۔

مزید گروپ ڈسکشن کے لیے درج ذیل موضوعات منتخب کیے گئے:۔

☆ چوری روکنے کے لیے اقدامات۔

☆ دیہی اور شہری علاقوں میں ناکہ بندی اور رکاوٹوں کو مؤثر بنانا۔

☆ شہری علاقوں میں بیٹ سسٹم کو منظم کرنا۔

☆ گوجرانوالہ رینج میں عوامی تعاون سے امن وامان قائم کرنے میں کامیابی۔

☆ پولیس اور پریس کے مابین مثالی تعلقات کی تدابیر۔

☆ منشیات کی بیخ کنی کے لیے اقدامات اور تدابیر۔

☆ شہروں میں عام مقامات پر خواتین کو ہراساں کرنے کا تدارک۔

☆ تھانوں' سب ڈویژنوں' ضلعوں' رینجوں اور کرائم برانچ میں ریکارڈ کی مربوط تیاری اور اس کی دیکھ بھال۔



باب 38

پولیس - جدید دور

''کسی نئے نظام کو متعارف کرانے کے لیے پہل کرنے کے مقابلہ میں کسی کام کو شروع کرنا زیادہ خطرناک کام کو انجام دینا یا اس میں کامیابی حاصل کرنا زیادہ غیر یقینی نہیں ہوتا۔'' یہ اقتباس جو کہ نکولو میکیاولی کی مشہور زمانہ کتاب "The Prince" سے ماخوذ ہے' میری ان کوششوں پر منطبق ہوتا ہے جو میں نے پولیس کو زمانہ جدید کے مطابق ڈھالنے کے سلسلے میں کی تھیں۔

نظامِ مواصلات اور پولیس کے دفتری آپریشن کو نئے سانچہ میں ڈھالنے کے لیے پولیس کو فوری طور پر جدید بنانے کی ضرورت تھی تاکہ جرائم ریکارڈز اور پیغامات کا فوری طور پر تبادلہ ہو سکے اور کارکردگی کو بہتر بنایا جا سکے۔ یہ کام کرنے سے پیشتر مختلف سطحوں پر بنیادی جان کاری دلانا ضروری تھا۔ اے حمید' ڈائریکٹر ریسرچ سیل سپیشل برانچ ''نٹوں اور بولٹوں'' کو سمجھتے اور منصوبہ پر کام شروع کرنے کی مہارت اور تجربہ رکھتے تھے۔

اگرچہ میں ٹیکنالوجی کے میدان میں زیادہ باخبر نہیں ہوں' تاہم ان کے ماسٹر پلان کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ اس کے بعض واضح اور عملی مقاصد حسبِ ذیل تھے:

(الف) ہر پولیس افسر کو (آئی جی سے لے کر اے ایس آئی تک) یہ اجازت دینا کہ وہ کسی بھی دوسرے افسر کے ساتھ کسی بھی وقت اور صوبہ میں کسی بھی جگہ گفتگو کر سکے (بوقتِ ضرورت دوسرے صوبوں میں بھی بشرطیکہ وہاں بھی ویسا نیٹ ورک موجود ہو)۔

(ب) تحریری پیغامات فوری طور پر ہر آپریشنل فیلڈ یونٹ (پٹرول یونٹوں' موبائل یا پیدل' تفتیشی یونٹوں' چیک پوائنٹس' امن و امان سے متعلق ڈیوٹی پر مامور اور سیکورٹی ڈیوٹی پر متعین یونٹوں) تک پہنچانا۔

(ج) خط و کتابت اور معلومات کا فیکس اور کمپیوٹر کے ذریعے برقی انداز میں تبادلہ۔

(د) نچلی سطحوں پر کمپیوٹرز کے بتدریج استعمال میں اضافہ سے دفتر کی کارکردگی اور پیپر ورک کو بہتر بنانا۔

(ہ) ضلعی سطح پر تمام ریکارڈ مائیکرو فلم اور آپٹیکل ڈسک پر محفوظ کرنا اور صوبائی سطح پر اس کا ڈپلیکیٹ

محفوظ کرنا۔

(و) اخراجات گھٹانے اور کارکردگی بہتر بنانے کے لیے جدید دفتری سازوسامان متعارف کرانا۔

ان مقاصد کے بابت کوئی بھی شخص تجویز پیش کرسکتا تھا' تاہم پلان کا سب سے اہم نکتہ یہ تھا کہ اے حمید سرمایہ کی زیادہ سے زیادہ بچت چاہتے تھے اور مختلف مراحل کی تکمیل کے لیے کروڑوں کی بجائے لاکھوں کی بات کرتے تھے۔ یاد رہے کہ وہ سپیشل برانچ میں رہتے ہوئے ان میں سے بعض کام بہت ہی کم لاگت پر کرا چکے تھے۔

بیوروکریٹوں کی طرف سے ڈالی گئی اور طریقِ کار کی بہت سی رکاوٹوں کے باوجود کچھ پیشرفت ہوئی۔ تمام ضلعی ہیڈکوارٹرز میں الیکٹرانک ایکسچینج لگائی گئی جس میں اس قدر گنجائش تھی کہ دفتر میں ہر شخص کو حسب ضرورت انٹرکام کی سہولت فراہم کی جاسکتی تھی۔ ہر ضلعی دفتر کو 3 سے 4 تک دوسرے یونٹوں کو اس سے بھی زیادہ سیٹ فراہم کرنے کے لیے پرسنل کمپیوٹرز خریدے گئے۔ استعمال میں اضافہ ہونے پر ان کی تعداد بڑھائی جاسکتی تھی۔ ہر ضلع اور رینج کے دفتر میں فیکس مشین نصب کردی گئی۔

ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ ایک تجویز یہ تھی کہ سب ڈویژن کی سطح تک تمام دفاتر کا ''ہاٹ لائنز'' کے ذریعے آپس میں رابطہ قائم کردیا جائے۔ اے حمید نے پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن کارپوریشن کے سینئر حکام کے ساتھ طویل ملاقات کی۔ جب انہوں نے اپنے منصوبہ کے مقاصد اختصار سے بیان کیے تو پی ٹی سی کے افسروں نے کہا کہ وہ ان مقاصد کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''یہ بہت پیچیدہ ہوگا۔'' اے حمید نے جواب دیا۔ آپ اس کی پیچیدگی کی فکر نہ کریں۔ آپ ہمیں صرف ہاٹ لائنیں فراہم کردیں' باقی کا انتظام ہم خود کرلیں گے۔'' کیا مناسب لاگت پر وہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ہاٹ لائنوں کے ساتھ جو انتہائی مہنگی تھیں' اے حمید نے صوبہ بھر کے لیے ایک متبادل نیٹ ورک کا منصوبہ بنایا جو کہ محکمہ کے اندرونی استعمال کے لیے تھا' جس پر عملاً دوبارہ کوئی لاگت نہیں آنی تھی۔

اے حمید کو نجی شعبہ میں بھی اسی طرح کی ذہنی الجھن کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے ''پاکٹل'' اور ''انسٹافون'' کے سینئر حکام کے ساتھ (ان دنوں ملک میں یہی دو کمپنیاں موبائل نیٹ ورک چلا رہی تھیں) طویل مذاکرات کیے اور ہر کمپنی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اسے اپنے ٹرانسمیٹرز کی فاضل صلاحیت کا کچھ

فیصد حصہ مخصوص کر دینا چاہیے اور صوبہ میں پولیس کے اندرونی استعمال کے لیے ایک کلوز ڈ نیٹ ورک قائم کرنا چاہیے۔ ایک پولیس افسر اپنے موبائل فون کے ذریعے پولیس نیٹ ورک پر سب کے ساتھ بات کر سکے گا، لیکن کمپنی کے دوسرے گاہکوں کے ساتھ نہیں۔ کمپنی پولیس سے فون کے حوالہ سے ہر مہینے ایک مقررہ رقم وصول کرے گی۔ اس بات سے قطع نظر کہ مہینہ بھر میں اس سے کتنی کالیں کی گئیں، پولیس یا تو فون خرید لے گی یا ان کا کرایہ ادا کرے گی۔

اس سے ہر شخص کو فائدہ پہنچتا۔ پولیس افسر اپنے ساتھیوں کے ساتھ صوبہ میں کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت بات کر سکتے تھے۔ محکمہ پولیس موجودہ لوکل اور ٹرنک کالز کے بلا کنٹرول مصارف کی بچت کر سکتا تھا اور اسے محض مقررہ رقم ادا کرنی تھی جو نسبتاً کم ہوتی۔ موبائل کمپنی اپنے ٹرانسمیٹر کی اضافی صلاحیت سے اچھا خاصا نفع کما لیتی تھی۔ علاوہ ازیں وہ دوسرے محکموں کے لیے اسی طرح کے نیٹ ورک قائم کرنے کے لیے پولیس کے ماڈل کو استعمال کر سکتی تھی۔ کمپنی کے سینئر حکام کے متعلق توقع تھی کہ وہ ایسے تصور پر جھپٹیں گے جو کمپنی کے لیے فائدہ مند ہو۔

وہ اس انوکھے تاہم بنیادی طور پر انتہائی آسان منصوبہ کے مضمرات کو نہیں سمجھ سکے۔ بہترین پیشکش جوان کی طرف سے کی گئی، وہ معیاری اخراجات میں کمی کے حوالہ سے تھی۔ نجی شعبہ کی برتری کا یہ حال تھا جس کی بابت بہت قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ نئے تصورات قبول کرنے کی زبردست لچک اور خواہش رکھتا ہے۔ خصوصاً اس صورت میں جب اسے بیرونی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا تعاون حاصل ہو۔

اے حمید نے مایوس ہونے کی بجائے اپنا دماغ لڑایا اور جلد ہی ایک متبادل پلان سوچ لیا۔ جو پہلے منصوبہ کی نسبت بہت بہتر اور سستا تھا۔ وہ موبائل کی طرح قریباً ویسی ہی سہولت فراہم کر سکتا تھا لیکن بہت تھوڑی لاگت پر۔

ہمسایہ ممالک کے تجربات سے استفادہ

دریں اثناء طے کیا گیا کہ سینئر افسروں کی ایک ٹیم کو ان ہمسایہ ملکوں کا دورہ کرنا چاہیے جو ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں تاکہ پتہ چل سکے کہ ان کا محکمہ پولیس اپنے مسائل سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے اور ہم ان سے کیا سیکھ سکتے ہیں یا ان کے ساتھ کس طرح مطابقت پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ ٹیم فروری اور مارچ 1992ء کے دوران ملائشیا، سنگاپور، سری لنکا اور بنگلہ دیش کے دورہ پر گئی اور ان کے

کمپیوٹر، ٹیلی مواصلات اور ریکارڈ کی دیکھ بھال کے طریقِ کار کا مطالعہ کیا۔ افسوس ہے کہ ویزا کی الجھن کے باعث انڈیا نہیں جاسکی۔

مذکورہ بالا چاروں ملک انگریزوں کی کالونیاں رہ چکے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد مختلف سمتوں میں چل پڑے۔ سنگاپور نے جو سب سے مالدار ہے، انتہائی بیش قیمت اور جدید ترین نظام اپنایا۔ تاہم دولت کے بل بوتے پر بھی ایک ایسی ریاست میں جس کی آبادی صرف 30 لاکھ ہے، اچھی صلاحیت، قومی سطح پر مربوط کوریج اور صارفین تک آسان رسائی کا بندوبست نہیں کیا جاسکا۔ مثال کے طور پر گاڑیوں سے متعلق تمام اعداد و شمار ایک جگہ دستیاب نہیں تھے اور ایک گاڑی کے متعلق، اگر اس کا رجسٹریشن نمبر معلوم نہ ہو تو سینٹرل کمپیوٹر سے تفصیلات حاصل کرنے کا کوئی متبادل طریقہ نہیں تھا۔ اس طرح جعلی پلیٹ نمبر استعمال کیے جانے کا امکان موجود تھا۔ سنٹرل ڈاٹا بیس کا تمام پولیس چوکیوں کے ساتھ رابطہ قائم نہیں کیا گیا حالانکہ سنگاپور کا کل رقبہ پنجاب کی ایک تحصیل سے بھی کم ہے۔ ایک پولیس چوکی کے انچارج نے اے حمید کو بتایا کہ ''اس کام پر بہت زیادہ لاگت آتی تھی، اس لیے اسے ترک کر دیا گیا۔''

ملائیشیا والے بھی اسی راستے پر گامزن تھے۔ وہ توقع کر رہے تھے کہ دولت ان کے تمام مسائل حل کر دے گی۔ مواصلات کے نظام پر بے پناہ خرچ کرنے کے باوجود وہ اپنے صرف 1/5 اضلاع کو آپس میں مربوط کر سکے۔ خدا جانے باقی کے لیے سرمایہ کا بندوبست کب تک ہوگا۔ ڈاٹا کو مرکزی کمپیوٹر سنٹر تک پہنچنے میں 90 دن لگتے۔ اہلِ ملایا کا یہ منفی رخ ظاہر کرتا ہے کہ وہ چینیوں کے مقابلہ میں کم محنتی ہیں اور وہاں سرکاری ملازمتوں میں فرزندِ زمین کو دوسروں پر ترجیح دی جاتی ہے۔

سری لنکا نے معمولی وسائل رکھنے کے باوجود اہم کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اے حمید نے ان کے مرکزی مواصلاتی سنٹر کا معائنہ کیا جو ملک کے تمام حصوں کو دارالحکومت سے ملاتا ہے۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ سری لنکا کے نظام سے ان کے بعض تصورات کے قابلِ عمل ہونے کی تصدیق ہوگئی۔ وہ غیر ملکی مدد سے چلنے والا منصوبہ تھا جس کے لیے ہر چیز (Turnkey) کی بنیاد پر فراہم کی گئی تھی۔ پھر بھی اے حمید نے بعض خامیاں نوٹ کیں۔ مثال کے طور پر ہنگامی صورت حال میں چوٹی کی قیادت بشمول مسلح افواج کے سربراہوں کو پیغام دینے کے لیے محض ایک فون سسٹم تھا۔

دوسری کامیابی سراسر ان کی اپنی تھی۔ ان کے فنگر پرنٹ بیورو نے سرمایہ کی کمی اس طرح پوری کی

کہ فنگر پرنٹس کے میچ کرنے کو کمپیوٹرائز کرنے میں انفرادی پسندی سے کام لیا۔ بہت سادہ طریقہ استعمال کرتے ہوئے انہوں نے فنگر پرنٹس کی درجہ بندی کے لیے چار ہندسوں کا کوڈ ڈویلپ کرلیا اور ڈاٹا کو ایک پرسنل کمپیوٹر میں فیڈ کردیا۔ اصل پرنٹس مائیکرو فارمز میں جمع کیے گئے جو کاغذی ریکارڈ کے مقابلہ میں قریباً 95 فیصد کم جگہ میں آ گئے۔

اے حمید کی درخواست پر ڈی آئی جی مہی ران سیلوارتنم (Maheran Selvaratnam) نے جو انتہائی خوش اخلاق اور مدد کرنے والے افسر تھے ان کے لیے فنگر پرنٹ بیورو کے ایک اضافی دورہ کا اہتمام کرادیا تاکہ وہ ان کے طریقِ کار کو تفصیل سے دیکھ اور سمجھ سکیں۔ جبکہ باقی ٹیم مالدیپ کے تفریحی دورہ پر چلی گئی۔ اے حمید قائل ہوگئے کہ ہمیں صوبائی اور ضلعی سطح پر فنگر پرنٹس ریکارڈ رکھنے کے لیے لنکا والوں کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ جو نہ صرف انتہائی مؤثر ہے بلکہ بہت سستا بھی پڑتا ہے۔ یعنی اس پر محض چند لاکھ روپے خرچ ہوتے ہیں۔

جنوب میں بغاوت کے موضوع پر ایک بریفنگ کے دوران بتایا گیا کہ اس کا ایک اہم سبب سرکاری ملازمتوں پر سیاستدانوں کا کنٹرول ہے۔ حصولِ روزگار کے لیے محض کسی ایم پی کی سفارش کافی ہے۔ اُمیدوار کی صلاحیت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت نوجوانوں میں انتہائی مایوسی پھیل گئی اور جے وی پی نے جو اس بغاوت کی پشت پناہی کرنے والی مارکسٹ تنظیم ہے صورت حال سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس میں ہمارے ایم پی ایز اور ایم این ایز کے لیے سبق ہے جو سرکاری محکموں میں تمام بھرتی اپنی ذاتی سفارش پر کرانا چاہتے ہیں۔ انہیں معاشرہ کے مفاد کے مقابلہ میں اپنے ووٹ کی زیادہ فکر ہوتی ہے۔

اے حمید کولمبو میں گھومتے پھرتے اور دارالحکومت کے بنیادی ٹریفک مسائل دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ انہوں نے ان میں سے بعض کے انتہائی آسان حل فوراً سوچ لیے۔ ان کا ارادہ تھا کسی دن متعلقہ حکام سے ان کے بارے میں بات کریں گے۔

بنگلہ دیش کی پولیس نے پاکستان سے علیحدگی کے بعد اپنے نظام میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کی ۔واحد تبدیلی جو دیکھنے میں آئی وہ یہ کہ صوبائی ہوم ڈیپارٹمنٹ ختم کر کے پولیس براہ راست وزارت داخلہ کے ماتحت کردی گئی ہے۔ دوسرے انہوں نے سب سے بڑے چار شہروں میں کمشنریٹ سسٹم رائج کردیا

ہے، جس کی ہمارے بہت سے پولیس افسران اب بھی خواہش رکھتے ہیں۔

جب اے حمید نے اپنی ٹیم کے سینئر پولیس افسران کے ساتھ میٹنگ کے دوران پنجاب کے ٹیلی مواصلاتی نظام کو جدید تقاضوں کے مطابق بنانے کے متعلق اپنے منصوبہ کا خاکہ پیش کیا تو ان کی طرف سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ اس بارے میں مزید تفصیلات فراہم کریں۔ انہوں نے نہ صرف سب کچھ بتانے کی پیشکش کی بلکہ بشرطِ فرصت عملدرآمد میں مدد دینے کا وعدہ بھی کیا۔ وہ اب بھی بنگلہ دیش جانے اور اپنے وعدہ پورا کرنے کو تیار ہیں۔

انصار اکیڈمی ڈھاکہ کا دورہ بڑا مفید ثابت ہوا۔ یہ ایسے رضا کاروں کا تربیتی مرکز ہے جو دیہات میں قومی تعمیر کی سرگرمیوں کو فروغ دیتے ہیں۔ اکیڈمی کے وسیع کمپلیکس میں مردوں اور عورتوں کو مختلف پیشوں اور فنون کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی روزی آپ کما سکیں۔ اب تک کئی لاکھ رضا کاروں کو تربیت دی جا چکی ہے۔ اے حمید انصار کے متعلق بہت کچھ جاننے کے خواہشمند ہیں تاکہ وہ اس قسم کی تنظیم کے لیے منصوبہ تیار کر سکیں۔

ڈھاکہ میں 30 ہزار کے قریب رکشے (غیر سرکاری ذرائع کے مطابق یہ تعداد 60 ہزار ہے) ٹریفک کے بہت سے مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ جونہی بتی سبز ہوتی ہے وہ ایک سیلاب کی صورت میں دوڑتے ہیں۔ تاہم کوئی حکومت انہیں "آف روڈ" کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی بلکہ شدید ردِعمل کے ڈر سے ان کی تعداد میں کمی بھی نہیں کر سکتی۔ ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ یہ عام آدمی کے لیے سواری کا سب سے سستا اور مناسب ذریعہ سفر ہے۔

وہاں ہماری ٹیم کا اتنی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا جو کسی اور ملک میں دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ جس سے پتہ چلا کہ بنگلہ دیش والے پاکستانیوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ایئر پورٹ پر انتہائی سینئر حکام نے ٹیم کا خیر مقدم کیا۔ ڈھاکہ کا بہترین ریسٹ ہاؤس جس میں دوسرے ملکوں کی وی وی آئی پی شخصیات قیام کرتی ہیں، ہماری ٹیم کے لیے مخصوص کیا گیا۔ ٹیم کے لیے دو کاریں ہمہ وقت تیار کھڑی رہتی تھیں۔ ہر کھانے کے وقت وہ کسی نہ کسی کے مہمان ہوتے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے، ان کے ساتھ وی آئی پی والا سلوک کیا جاتا۔ یہاں تک کہ راج شاہی جیل میں بھی۔ میزبانوں کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی خواہش نہیں تھی۔ پولیس اکیڈمی (راج شاہی) کا دورہ شیڈول میں شامل نہیں تھا۔ تاہم خالد لطیف کی

خواہش پر فوراً بندوبست کر دیا گیا۔ بنگلہ دیش کا ایک انتہائی لائق اور قابل افسر عبدالمنان ہمہ وقت اور ہر جگہ ٹیم کے ساتھ رہا۔

اے حمید کا تاثر یہ تھا کہ بنگلہ دیش والے ہمیں اپنے اس قدر قریب سمجھتے ہیں کہ اُن کا بس چلے تو اپنے ملک کو وہاں سے اٹھا کر ہماری سرحد کے ساتھ رکھ دیں۔

اے حمید نے مطالعاتی دورہ کے دوران ذاتی مطالعہ و مشاہدہ کی بنیاد پر کمپیوٹرائزیشن اور ٹیلی کمیونیکیشن کے میٹرک سسٹم نیز ریکارڈ نگہداشت کے نظام پر کام شروع کر دیا۔ کئی اور پراجیکٹ بھی تھے' جن کی انہوں نے منصوبہ بندی کی تھی۔ مائیکروفلمنگ اور جملہ پولیس افسران کے ریکارڈ بشمول لاکھوں فنگر پرنٹس کے ڈیٹا تیار کرنے کی سہولت بھی فراہم کرنی تھی۔ فیلڈ کے فرائض کے لیے ہاتھ میں پکڑنے والے ٹیپ ریکارڈرز' کمپیکٹ کیمرے اور دوسری کار آمد تاہم سستی چیزیں بھی متعارف کرانی تھیں۔

اجتماعی خطا

اے حمید کے ایک بڑے منصوبہ کو سازگار حالات میسر آ گئے۔ 1993ء کے آخر میں اعجاز اکرم ترقی پا کر ڈی آئی جی ٹیلی مواصلات بن گئے تھے۔ پولیس میں اصلاحات بروئے کار لانے کے جذبہ اور اپنے اہم منصوبوں کو مکمل کرنے کی خواہش کے تحت وہ اے حمید کی برانچ کے لیے کچھ اچھے تصورات دینے کے لیے ان کے پاس آئے۔ اے حمید نے جو اچھے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں' تجویز پیش کی کہ فرسودہ' ناکارہ اور ناقابلِ اعتماد ٹیلی پرنٹر سسٹم کی جگہ کمپیوٹر پر مبنی ٹیلی مواصلات کا نیٹ ورک لگایا جائے۔ وہ اس پر پہلے ہی کام کر چکے تھے۔ لیکن میرے بحیثیت آئی جی تبادلہ کے بعد اس پر عملدر آمد کے لیے انہیں کوئی مدد نہیں مل رہی تھی۔ انہوں نے ضلعی دفاتر میں نچلی سطح پر کمپیوٹر سکھانے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔

اعجاز اکرم ایک یتیم بچی کو گود لے کر اس پر خلوص نیت سے محنت کرنے لگے۔ انہوں نے کمپیوٹر کی وسیع پیمانہ پر تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی۔ اعجاز نے ایک اچھے رہنما کی خوبیوں اور جذبہ ایثار و قربانی کے ساتھ تہیہ کر لیا تھا کہ پولیس کی بعض انتہائی اہم ضروریات پوری کر کے دم لیں گے۔

ٹیلی مواصلات کے نیٹ ورک پر کام کر کے ان کے عملہ نے حساب لگایا کہ منصوبہ پر عملدرآمد کے بعد پولیس کو ہر سال 10 ملین روپے سے زیادہ کی بچت ہوگی۔ یہ اقدام آپریشنز میں شاندار اصلاح' کارکردگی میں اضافہ اور افرادی قوت میں بچت کا سبب بنے گا۔

کسی آدمی نے مذاق میں کہہ دیا کہ اس طرح سرمایہ بچانے والا منصوبہ ہاتھ لگنے پر حکومت پوری طرح مجاز ہوگی کہ اے حمید کو عمر بھر پوری تنخواہ ادا کرتی رہے' خواہ اس کے بعد وہ کوئی اور کام کریں یا نہ کریں۔ غالباً وہ بات حکومت تک بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ مارچ 1994ء میں انہیں اچانک او ایس ڈی بنا دیا گیا۔ جس کا مطلب ہوتا ہے کہ آدمی کوئی کام کیے بغیر گھر بیٹھے تنخواہ لیتا رہے۔ یاد رہے کہ انہیں بطور خاص سپیشل برانچ کے لیے بھرتی کیا گیا تھا' اور ان کا کسی دوسری جگہ تبادلہ نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن ایسی قانونی باریکیوں کی کون پرواہ کرتا ہے۔

اے حمید کو معمولی سی بات پر اعراف میں پھینک دیا گیا۔ بعض پولیس افسروں نے جوان کی ذہنی صلاحیتوں سے جلتے تھے اور منظور احمد وٹو (وزیر اعلیٰ پنجاب) کے منظورِ نظر بننا چاہتے تھے' ان پر الزام لگایا کہ وہ نواز شریف کے یارِ غار ہیں۔ انہوں نے اے حمید کے فوری تبادلہ پر زور دیا۔ وہ کبھی میاں صاحب کے قریب نہیں رہے تھے' اس وقت بھی نہیں جب وہ وزیر اعلیٰ تھے۔ نہ ہی ان سے خاص قسم کے کچھ فائدے اٹھائے تھے۔ جیسا کہ لنگوٹیے یار اکثر اٹھاتے ہیں۔ جہاں تک خفیہ خبریں میاں صاحب تک پہنچانے کا تعلق تھا۔ خفیہ اطلاعات کا تو کیا' عمومی نوعیت کی کوئی بریف' رپورٹ یا فائل کبھی ان کی معرفت اوپر نہیں جاتی تھی۔ انتہائی خفیہ دستاویزات جوان کے پاس آتی تھیں' وہ اخبارات ورسائل تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ انہیں پڑھ کر ان میں سے اتنی زیادہ خفیہ معلومات حاصل کر لیتے ہوں کہ پوری سپیشل برانچ مل کر بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس کے برعکس انہوں نے پورے سات سال پولیس کو درپیش آپریشنل مسائل کا مطالعہ کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کے لیے اپنا سارا وقت اور توانائیاں وقف کیے رکھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے جو کام کیا' وہی انقلاب کا موجب بن گیا۔ لیکن جب معمولی خود غرضی اور دماغی خلل کے تحت انہیں چلتا کر دیا گیا تو پھر اس کام کی قطعاً کوئی وقعت نہیں رہی۔

اس سے بھی اہم ایک اور وجہ یہ تھی کہ اے حمید پولیس کو ترقی دینے اور جدید حالات کے مطابق بنانے کے علمبردار تھے۔ اس کے لیے ایسی ذہنی کیفیت درکار ہوتی ہے جو نئے خیالات اور کاموں کو نئے

طریقہ سے انجام دینے کے عمل کو قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ لیکن بہت سے بیوروکریٹس ایسی تبدیلی کو ایک آفت اور مصیبت سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ پرانی مثالوں کے متلاشی رہتے ہیں اور خود کو جمود کی حالت میں محفوظ سمجھتے ہیں۔ کسی تبدیلی کو قبول کرنا تو دور کی بات ہے۔ وہ تبدیلی کی ضرورت سے بھی اتفاق نہیں کرتے۔ جس وقت میرے دفتر میں کمپیوٹرز خریدنے کا معاملہ زیرِ بحث تھا' ایک ڈی آئی جی نے جسے بہت پڑھا لکھا اور تیز طرار سمجھا جاتا تھا کہا:

''کمپیوٹر خریدنے کا کیا فائدہ؟ ہم ان کے بغیر ہی ٹھیک ٹھاک کام چلا رہے ہیں۔'' ان کے لیے نئے ذرائع اور طور طریقوں میں ناکامی یا پریشانی کا خطرہ ہی سوہانِ روح تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس بات سے بھی نفرت کرتے ہیں کہ ان کی کوتاہیاں دوسروں کے سامنے بے نقاب ہوں۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ معاملات جوں کے توں رہیں۔ اے حمید کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ عقل کی راہ میں حائل رکاوٹ کو ہٹانے کی ہمت نہیں رکھتے اور جہالت کی دلدل میں چہل قدمی کر کے خوش رہتے ہیں۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ انہوں نے اور میں نے جو کچھ بنایا تھا' ہمارے وہاں سے ہٹتے ہی بگڑنا شروع ہو گیا اور یہ سب کچھ انتقام کے طور پر کیا گیا۔

اب حمید کو جو سزا دی گئی اس کا فوری سبب ''اجتماعی غلطی'' تھی۔ وہ ان بہت سے برے کاموں کی بنیاد ہے جو پولیس والے کرتے ہیں۔ چونکہ وہ میرے بہت قریب تھے اور میں خود زیرِ عتاب تھا' اس لیے بعض لوگوں نے سوچا کہ ''دشمن کے دوست کو دشمن'' قرار دینے سے انہیں فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ خواہ اس سے ایک بے قصور آدمی اور خود پولیس کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچے۔ وزیرِاعلیٰ نے اس الزام کی آزاد ذرائع سے تصدیق کرنے کی بنیادی شرط پوری کیے بغیر ان کی بات ماننے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ ہمارے حکمرانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ کسی شخص کی طرف سے انہیں نقصان پہنچنے کا خفیف سا امکان ہے۔ تو اس پر فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ اُردو میں ایسے لوگوں کو ''کان کے کچے'' کہا جاتا ہے۔ ارسطو کے ایک قول سے بیش قیمت مشورہ ملتا ہے۔ کسی شخص نے اس سے کہا:

''میں نے ایک قابلِ اعتماد شخص سے آپ کے خلاف کچھ سنا ہے۔'' عظیم فلسفی نے جواب دیا:

''جو شخص دوسروں کے خلاف باتیں کرتا ہے' وہ قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا۔''

اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے اسے تمہید کے طور پر ذیل کہانی سنائی۔ ایک لومڑی کو پریشان حالت میں بھاگتے دیکھا گیا۔ کسی شخص نے پوچھا:

"کیا معاملہ ہے، تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟"

لومڑی بولی: "اونٹوں کو گھیر کر پکڑا جا رہا ہے۔"

"لیکن تم تو یقیناً اونٹ نہیں ہو۔ سوال کنندہ نے اس سے کہا۔

"بلا شبہ میں اونٹ نہیں ہوں۔ لیکن فرض کریں کسی بااختیار حاکم (بیوروکریٹ) نے مجھے "بچۂ شتر" (اونٹ کا بچہ) قرار دے کر میری گرفتاری کا حکم جاری کر دیا تو میں خود کو کیسے بچاؤں گی؟" دوراندیش جانور کا یہ جواب سن کر سوال کنندہ نے خاموشی اختیار کر لی۔



باب38

پولیس - جدید دور

"کسی نئے نظام کو متعارف کرانے کے لیے پہل کرنے کے مقابلہ میں کسی کام کو شروع کرنا

زیادہ خطرناک کام کو انجام دینا یا اس میں کامیابی حاصل کرنا زیادہ غیر یقینی نہیں ہوتا۔" یہ اقتباس جو کہ نکولو میکیاولی کی مشہورِ زمانہ کتاب "The Prince" سے ماخوذ ہے، میری ان کوششوں پر منطبق ہوتا ہے جو میں نے پولیس کو زمانہ جدید کے مطابق ڈھالنے کے سلسلے میں کی تھیں۔

نظامِ مواصلات اور پولیس کے دفتری آپریشن کو نئے سانچہ میں ڈھالنے کے لیے پولیس کو فوری طور پر جدید بنانے کی ضرورت تھی تاکہ جرائم ریکارڈز اور پیغامات کا فوری طور پر تبادلہ ہو سکے اور کارکردگی کو بہتر بنایا جا سکے۔ یہ کام کرنے سے پیشتر مختلف سطحوں پر بنیادی جان کاری دلانا ضروری تھا۔ اے حمید، ڈائریکٹر ریسرچ سیل سپیشل برانچ "نٹوں اور بولٹوں" کو سمجھتے اور منصوبہ پر کام شروع کرنے کی مہارت اور تجربہ رکھتے تھے۔

اگرچہ میں ٹیکنالوجی کے میدان میں زیادہ باخبر نہیں ہوں، تاہم ان کے ماسٹر پلان کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ اس کے بعض واضح اور عملی مقاصد حسبِ ذیل تھے:

(الف) ہر پولیس افسر کو (آئی جی سے لے کر اے ایس آئی تک) یہ اجازت دینا کہ وہ کسی بھی دوسرے افسر کے ساتھ کسی بھی وقت اور صوبہ میں کسی بھی جگہ گفتگو کر سکے (بوقتِ ضرورت دوسرے صوبوں میں بھی بشرطیکہ وہاں بھی ویسا نیٹ ورک موجود ہو)۔

(ب) تحریری پیغامات فوری طور پر ہر آپریشنل فیلڈ یونٹ (پٹرول یونٹوں، موبائل یا پیدل، تفتیشی یونٹوں، چیک پوائنٹس، امن و امان سے متعلق ڈیوٹی پر مامور اور سیکورٹی ڈیوٹی پر متعین یونٹوں) تک پہنچانا۔

(ج) خط و کتابت اور معلومات کا فیکس اور کمپیوٹر کے ذریعے برقی انداز میں تبادلہ۔

(د) نچلی سطحوں پر کمپیوٹرز کے بتدریج استعمال میں اضافہ سے دفتر کی کارکردگی اور پیپر ورک کو بہتر بنانا۔

(ہ) ضلعی سطح پر تمام ریکارڈ مائیکرو فلم اور آپٹیکل ڈسک پر محفوظ کرنا اور صوبائی سطح پر اس کا ڈپلیکیٹ محفوظ کرنا۔

(و) اخراجات گھٹانے اور کارکردگی بہتر بنانے کے لیے جدید دفتری ساز و سامان متعارف کرانا۔

ان مقاصد کے بابت کوئی بھی شخص تجویز پیش کر سکتا تھا، تاہم پلان کا سب سے اہم نکتہ یہ تھا کہ

اے حمید سرمایہ کی زیادہ سے زیادہ بچت چاہتے تھے اور مختلف مراحل کی تکمیل کے لیے کروڑوں کی بجائے لاکھوں کی بات کرتے تھے۔ یاد رہے کہ وہ سپیشل برانچ میں رہتے ہوئے ان میں سے بعض کام بہت ہی کم لاگت پر کرا چکے تھے۔

بیوروکریٹوں کی طرف سے ڈالی گئی اور طریقِ کار کی بہت سی رکاوٹوں کے باوجود کچھ پیشرفت ہوئی۔ تمام ضلعی ہیڈکوارٹرز میں الیکٹرانک ایکسچینج لگائی گئی جس میں اس قدر گنجائش تھی کہ دفتر میں ہر شخص کو حسبِ ضرورت انٹرکام کی سہولت فراہم کی جا سکتی تھی۔ ہر ضلعی دفتر کو 3 سے 4 تک دوسرے یونٹوں کو اس سے بھی زیادہ سیٹ فراہم کرنے کے لیے پرسنل کمپیوٹرز خریدے گئے۔ استعمال میں اضافہ ہونے پر ان کی تعداد بڑھائی جا سکتی تھی۔ ہر ضلع اور رینج کے دفتر میں فیکس مشین نصب کر دی گئی۔

ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ ایک تجویز یہ تھی کہ سب ڈویژن کی سطح تک تمام دفاتر کا ''ہاٹ لائنز'' کے ذریعے آپس میں رابطہ قائم کر دیا جائے۔ اے حمید نے پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن کارپوریشن کے سینئر حکام کے ساتھ طویل ملاقات کی۔ جب انہوں نے اپنے منصوبہ کے مقاصد اختصار سے بیان کیے تو پی ٹی سی کے افسروں نے کہا کہ وہ ان مقاصد کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''یہ بہت پیچیدہ ہوگا۔'' اے حمید نے جواب دیا۔ آپ اس کی پیچیدگی کی فکر نہ کریں۔ آپ ہمیں صرف ہاٹ لائنیں فراہم کر دیں، باقی کا انتظام ہم خود کر لیں گے۔'' کیا مناسب لاگت پر وہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہاٹ لائنوں کے ساتھ جو انتہائی مہنگی تھیں، اے حمید نے صوبہ بھر کے لیے ایک متبادل نیٹ ورک کا منصوبہ بنایا جو کہ محکمہ کے اندرونی استعمال کے لیے تھا، جس پر عملاً دوبارہ کوئی لاگت نہیں آنی تھی۔

اے حمید کو نجی شعبہ میں بھی اسی طرح کی ذہنی الجھن کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے ''پاکٹل'' اور ''انسٹافون'' کے سینئر حکام کے ساتھ (ان دنوں ملک میں یہی دو کمپنیاں موبائل نیٹ ورک چلا رہی تھیں) طویل مذاکرات کیے اور ہر کمپنی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اسے اپنے ٹرانسمیٹرز کی فاضل صلاحیت کا کچھ فیصد حصہ مخصوص کر دینا چاہیے اور صوبہ میں پولیس کے اندرونی استعمال کے لیے ایک کلوزڈ نیٹ ورک قائم کرنا چاہیے۔ ایک پولیس افسر اپنے موبائل فون کے ذریعے پولیس نیٹ ورک پر سب کے ساتھ بات کر سکے گا، لیکن کمپنی کے دوسرے گاہکوں کے ساتھ نہیں۔ کمپنی پولیس سے فون کے حوالہ سے ہر مہینے ایک

مقررہ رقم وصول کرے گی۔ اس بات سے قطع نظر کہ جیتنے کالیں ان سے کتنی کالیں کی گئیں، پولیس یا تو فون خرید لے گی یا ان کا کرایہ ادا کرے گی۔

اس سے ہر شخص کو فائدہ پہنچتا۔ پولیس افسر اپنے ساتھیوں کے ساتھ صوبہ میں کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت بات کر سکتے تھے۔ محکمہ پولیس موجودہ لوکل اور ٹرنک کالز کے بلا کنٹرول مصارف کی بچت کر سکتا تھا اور اسے محض مقررہ رقم ادا کرنی تھی جو نسبتاً کم ہوتی۔ موبائل کمپنی اپنے ٹرانسمیٹر کی اضافی صلاحیت سے اچھا خاصا نفع کما لیتی تھی۔ علاوہ ازیں وہ دوسرے محکموں کے لیے اسی طرح کے نیٹ ورک قائم کرنے کے لیے پولیس کے ماڈل کو استعمال کر سکتی تھی۔ کمپنی کے سینئر حکام کے متعلق توقع تھی کہ وہ ایسے تصور پر جھپٹیں گے جو کمپنی کے لیے فائدہ مند ہو۔

وہ اس انوکھے تاہم بنیادی طور پر انتہائی آسان منصوبہ کے مضمرات کو نہیں سمجھ سکے۔ بہترین پیشکش جوان کی طرف سے کی گئی، وہ معیاری اخراجات میں کمی کے حوالہ سے تھی۔ نجی شعبہ کی برتری کا یہ حال تھا جس کی بابت بہت قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ نئے تصورات قبول کرنے کی زبردست لچک اور خواہش رکھتا ہے۔ خصوصاً اس صورت میں جب اسے بیرونی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا تعاون حاصل ہو۔

اے حمید نے مایوس ہونے کی بجائے اپنا دماغ لڑایا ور جلد ہی ایک متبادل پلان سوچ لیا۔ جو پہلے منصوبہ کی نسبت بہت بہتر اور سستا تھا۔ وہ موبائل کی طرح قریباً ویسی ہی سہولت فراہم کر سکتا تھا لیکن بہت تھوڑی لاگت پر۔

ہمسایہ ممالک کے تجربات سے استفادہ

دریں اثناء طے کیا گیا کہ سینئر افسروں کی ایک ٹیم کو ان ہمسایہ ملکوں کا دورہ کرنا چاہیے جو ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں تاکہ پتہ چل سکے کہ ان کا محکمہ پولیس اپنے مسائل سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے اور ہم ان سے کیا سیکھ سکتے ہیں یا ان کے ساتھ کس طرح مطابقت پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ ٹیم فروری اور مارچ 1992ء کے دوران ملائشیا، سنگاپور، سری لنکا اور بنگلہ دیش کے دورہ پر گئی اور ان کے کمپیوٹر، ٹیلی مواصلات اور ریکارڈ کی دیکھ بھال کے طریق کار کا مطالعہ کیا۔ افسوس ہے کہ ویزا کی الجھن کے باعث انڈیا نہیں جا سکی۔

مذکورہ بالا چاروں ملک انگریزوں کی کالونیاں رہ چکے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد مختلف سمتوں

میں چل پڑے۔ سنگاپور نے جو سب سے مالدار ہے انتہائی بیش قیمت اور جدید ترین نظام اپنایا۔ تاہم دولت کے بل بوتے پر بھی ایک ایسی ریاست میں جس کی آبادی صرف 30 لاکھ ہے' اچھی صلاحیت' قومی سطح پر مربوط کوریج اور صارفین تک آسان رسائی کا بندوبست نہیں کیا جاسکا۔ مثال کے طور پر گاڑیوں سے متعلق تمام اعداد و شمار ایک جگہ دستیاب نہیں تھے اور ایک گاڑی کے متعلق' اگر اس کا رجسٹریشن نمبر معلوم نہ ہو تو سینٹرل کمپیوٹر سے تفصیلات حاصل کرنے کا کوئی متبادل طریقہ نہیں تھا۔ اس طرح جعلی پلیٹ نمبر استعمال کیے جانے کا امکان موجود تھا۔ سنٹرل ڈاٹا بیس کا تمام پولیس چوکیوں کے ساتھ رابطہ قائم نہیں کیا گیا حالانکہ سنگاپور کا کل رقبہ پنجاب کی ایک تحصیل سے بھی کم ہے۔ ایک پولیس چوکی کے انچارج نے اے حمید کو بتایا کہ ''اس کام پر بہت زیادہ لاگت آئی تھی' اس لیے اسے ترک کر دیا گیا۔''

ملائیشیا والے بھی اسی راستے پر گامزن تھے۔ وہ توقع کر رہے تھے کہ دولت ان کے تمام مسائل حل کر دے گی۔ مواصلات کے نظام پر بے پناہ خرچ کرنے کے باوجود وہ اپنے صرف 1/5 اضلاع کو آپس میں مربوط کر سکے۔ خدا جانے باقی کے لیے سرمایہ کا بندوبست کب تک ہو گا۔ ڈاٹا کو مرکزی کمپیوٹر سنٹر تک پہنچنے میں 90 دن لگے۔ اہلِ ملایا کا یہ منفی رخ ظاہر کرتا ہے کہ وہ چینیوں کے مقابلہ میں کم محنتی ہیں اور وہاں سرکاری ملازمتوں میں فرزندِ زمین کو دوسروں پر ترجیح دی جاتی ہے۔

سری لنکا نے معمولی وسائل رکھنے کے باوجود اہم کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اے حمید نے ان کے مرکزی مواصلاتی سنٹر کا معائنہ کیا جو ملک کے تمام حصوں کو دارالحکومت سے ملاتا ہے۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ سری لنکا کے نظام سے ان کے بعض تصورات کے قابلِ عمل ہونے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ غیر ملکی مدد سے چلنے والا منصوبہ تھا جس کے لیے ہر چیز (Turnkey) کی بنیاد پر فراہم کی گئی تھی۔ پھر بھی اے حمید نے بعض خامیاں نوٹ کیں۔ مثال کے طور پر ہنگامی صورت حال میں چوٹی کی قیادت بشمول مسلح افواج کے سربراہوں کو پیغام دینے کے لیے محض ایک فون سسٹم تھا۔

دوسری کامیابی سراسران کی اپنی تھی۔ ان کے فنگر پرنٹ بیورو نے سرمایہ کی کمی اس طرح پوری کی کہ فنگر پرنٹس کے میچ کرنے کو کمپیوٹرائز کرنے میں اختراع پسندی سے کام لیا۔ بہت سادہ طریقہ استعمال کرتے ہوئے انہوں نے فنگر پرنٹس کی درجہ بندی کے لیے چار ہندسوں کا کوڈ ڈویلپ کر لیا اور ڈاٹا کو ایک پرسنل کمپیوٹر میں فیڈ کر دیا۔ اصل پرنٹس مائیکرو فارمز میں جمع کیے گئے جو کاغذی ریکارڈ کے مقابلہ میں

قریباً 95 فیصد کم جگہ میں آ گئے۔

اے حمید کی درخواست پر ڈی آئی جی مہی ران سیلوارٹنم (Maheran Selvaratnam) نے جو انتہائی خوش اخلاق اور مدد کرنے والے افسر تھے ان کے لیے فنگر پرنٹ بیورو کے ایک اضافی دورہ کا اہتمام کرا دیا تاکہ وہ ان کے طریقِ کار کو تفصیل سے دیکھ اور سمجھ سکیں۔ جبکہ باقی ٹیم مالدیپ کے تفریحی دورہ پر چلی گئی۔ اے حمید قائل ہو گئے کہ ہمیں صوبائی اور ضلعی سطح پر فنگر پرنٹس ریکارڈ رکھنے کے لیے لنکا والوں کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ جو نہ صرف انتہائی مؤثر ہے بلکہ بہت سستا بھی پڑتا ہے۔ یعنی اس پر محض چند لاکھ روپے خرچ ہوتے ہیں۔

جنوب میں بغاوت کے موضوع پر ایک بریفنگ کے دوران بتایا گیا کہ اس کا ایک اہم سبب سرکاری ملازمتوں پر سیاستدانوں کا کنٹرول ہے۔ حصولِ روزگار کے لیے محض کسی ایم پی کی سفارش کافی ہے۔ اُمیدوار کی صلاحیت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت نوجوانوں میں انتہائی مایوسی پھیل گئی اور جے وی پی نے جو اس بغاوت کی پشت پناہی کرنے والی مارکسٹ تنظیم ہے، صورت حال سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس میں ہمارے ایم پی ایز اور ایم این ایز کے لیے سبق ہے جو سرکاری محکموں میں تمام بھرتی اپنی ذاتی سفارش پر کرانا چاہتے ہیں۔ انہیں معاشرہ کے مفاد کے مقابلہ میں اپنے ووٹ کی زیادہ فکر ہوتی ہے۔

اے حمید کولمبو میں گھومتے پھرتے اور دارالحکومت کے بنیادی ٹریفک مسائل دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ انہوں نے ان میں سے بعض کے انتہائی آسان حل فوراً سوچ لیے۔ ان کا ارادہ تھا کسی دن متعلقہ حکام سے ان کے بارے میں بات کریں گے۔

بنگلہ دیش کی پولیس نے پاکستان سے علیحدگی کے بعد اپنے نظام میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کی۔ واحد تبدیلی جو دیکھنے میں آئی وہ یہ کہ صوبائی ہوم ڈیپارٹمنٹ ختم کر کے پولیس براہ راست وزارت داخلہ کے ماتحت کر دی گئی ہے۔ دوسرے انہوں نے سب سے بڑے چار شہروں میں کمشنریٹ سسٹم رائج کر دیا ہے، جس کی ہمارے بہت سے پولیس افسران اب بھی خواہش رکھتے ہیں۔

جب اے حمید نے اپنی ٹیم کے سینئر پولیس افسران کے ساتھ میٹنگ کے دوران پنجاب کے ٹیلی مواصلاتی نظام کو جدید تقاضوں کے مطابق بنانے کے متعلق اپنے منصوبہ کا خاکہ پیش کیا تو ان کی طرف سے

گہری دلچسپی کا اظہار کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ اس بارے میں مزید تفصیلات فراہم کریں۔ انہوں نے نہ صرف سب کچھ بتانے کی پیشکش کی بلکہ بشرطِ فرصت عملدرآمد میں مدد دینے کا وعدہ بھی کیا۔ وہ اب بھی بنگلہ دیش جانے اور اپنے وعدہ پورا کرنے کو تیار ہیں۔

انصار اکیڈمی ڈھاکہ کا دورہ بڑا مفید ثابت ہو۔ یہ ایسے رضا کاروں کا تربیتی مرکز ہے جو دیہات میں قومی تعمیر کی سرگرمیوں کو فروغ دیتے ہیں۔ اکیڈمی کے وسیع کمپلیکس میں مردوں اور عورتوں کو مختلف پیشوں اور فنون کی تربیت دی جاتی ہے تا کہ وہ اپنی روزی آپ کما سکیں۔ اب تک کئی لاکھ رضا کاروں کو تربیت دی جا چکی ہے۔ اے حمید انصار کے متعلق بہت کچھ جاننے کے خواہشمند ہیں تا کہ وہ اس قسم کی تنظیم کے لیے منصوبہ تیار کر سکیں۔

ڈھاکہ میں 30 ہزار کے قریب رکشے (غیر سرکاری ذرائع کے مطابق یہ تعداد 60 ہزار ہے) ٹریفک کے بہت سے مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ جونہی بتی سبز ہوتی ہے وہ ایک سیلاب کی صورت میں دوڑتے ہیں۔ تاہم کوئی حکومت انہیں ''آف روڈ'' کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی بلکہ شدید ردِعمل کے ڈر سے ان کی تعداد میں کمی بھی نہیں کر سکتی۔ ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ یہ عام آدمی کے لیے سواری کا سب سے سستا اور مناسب ذریعہ سفر ہے۔

وہاں ہماری ٹیم کا اتنی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا جو کسی اور ملک میں دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ جس سے پتہ چلا کہ بنگلہ دیش والے پاکستانیوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ایئرپورٹ پر انتہائی سینئر حکام نے ٹیم کا خیر مقدم کیا۔ ڈھاکہ کا بہترین ریسٹ ہاؤس جس میں دوسرے ملکوں کی وی وی آئی پی شخصیات قیام کرتی ہیں' ہماری ٹیم کے لیے مخصوص کیا گیا۔ ٹیم کے لیے دو کاریں ہمہ وقت تیار کھڑی رہتی تھیں۔ ہر کھانے کے وقت وہ کسی نہ کسی کے مہمان ہوتے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے' ان کے ساتھ وی آئی پی والا سلوک کیا جاتا۔ یہاں تک کہ راج شاہی جیل میں بھی۔ میزبانوں کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی خواہش نہیں تھی۔ پولیس اکیڈمی (راج شاہی) کا دورہ شیڈول میں شامل نہیں تھا۔ تاہم خالد لطیف کی خواہش پر فوراً بندوبست کر دیا گیا۔ بنگلہ دیش کا ایک انتہائی خلیق اور قابل افسر عبدالمنان ہمہ وقت اور ہر جگہ ٹیم کے ساتھ رہا۔

اے حمید کا تاثر یہ تھا کہ بنگلہ دیش والے ہمیں اپنے اس قدر قریب سمجھتے ہیں کہ اُن کا بس چلے تو

اپنے ملک کو وہاں سے اٹھا کر ہماری سرحد کے ساتھ رکھ دیں۔

اے حمید نے مطالعاتی دورہ کے دوران ذاتی مطالعہ و مشاہدہ کی بنیاد پر کمپیوٹرائزیشن اور ٹیلی کمیونیکیشن کے میٹرک سسٹم نیز ریکارڈ نگہداشت کے نظام پر کام شروع کر دیا۔ کئی اور پراجیکٹ بھی تھے جن کی انہوں نے منصوبہ بندی کی تھی۔ مائیکروفلمنگ اور جملہ پولیس افسران کے ریکارڈ بشمول لاکھوں فنگر پرنٹس کے فنگر پرنٹ تیار کرنے کی سہولت بھی فراہم کرنی تھی۔ فیلڈ کے فرائض کے لیے ہاتھ میں پکڑنے والے ٹیپ ریکارڈرز' کمپیکٹ کیمرے اور دوسری کارآمد تاہم سستی چیزیں بھی متعارف کرانی تھیں۔

اجتماعی خطا

اے حمید کے ایک بڑے منصوبہ کو سازگار حالات میسر آ گئے۔ 1993ء کے آخر میں اعجاز اکرم ترقی پا کر ڈی آئی جی ٹیلی مواصلات بن گئے تھے۔ پولیس میں اصلاحات بروئے کار لانے کے جذبہ اور اپنے اہم منصوبوں کو مکمل کرنے کی خواہش کے تحت وہ اے حمید کی برانچ کے لیے کچھ اچھے تصورات دینے کے لیے ان کے پاس آئے۔ اے حمید نے جو اچھے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں' تجویز پیش کی کہ فرسودہ' ناکارہ اور ناقابلِ اعتماد ٹیلی پرنٹر سسٹم کی جگہ کمپیوٹر پر مبنی ٹیلی مواصلات کا نیٹ ورک لگایا جائے۔ وہ اس پر پہلے ہی کام کر چکے تھے۔ لیکن میرے بحیثیت آئی جی تبادلہ کے بعد اس پر عملدرآمد کے لیے انہیں کوئی مدد نہیں مل رہی تھی۔ انہوں نے ضلعی دفاتر میں نچلی سطح پر کمپیوٹر سکھانے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔

اعجاز اکرم ایک یتیم بچی کو گود لے کر اس پر خلوص نیت سے محنت کرنے لگے۔ انہوں نے کمپیوٹر کی وسیع پیمانہ پر تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی۔ اعجاز نے ایک اچھے رہنما کی خوبیوں اور جذبہ ایثار و قربانی کے ساتھ تہیہ کر لیا تھا کہ پولیس کی بعض انتہائی اہم ضروریات پوری کر کے دم لیں گے۔

ٹیلی مواصلات کے نیٹ ورک پر کام کر کے ان کے عملہ نے حساب لگایا کہ منصوبہ پر عملدرآمد کے بعد پولیس کو ہر سال 10 ملین روپے سے زیادہ کی بچت ہوگی۔ یہ اقدام آپریشنز میں شاندار اصلاح' کارکردگی میں اضافہ اور افرادی قوت میں بچت کا سبب بنے گا۔

کسی آدمی نے مذاق میں کہہ دیا کہ اس طرح سرمایہ بچانے والا منصوبہ ہاتھ لگنے پر حکومت پوری

طرح مجاز ہوگی کہ اے حمید کو عمر بھر پوری تنخواہ اور ترقی دی جائے خواہ اس کے بعد وہ کوئی اور کام کریں یا نہ کریں۔ غالباً وہ بات حکومت تک بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ مارچ 1994ء میں انہیں اچانک او ایس ڈی بنا دیا گیا۔ جس کا مطلب ہوتا ہے کہ آدمی کوئی کام کیے بغیر گھر بیٹھے تنخواہ لیتا رہے۔ یاد رہے کہ انہیں بطور خاص سپیشل برانچ کے لیے بھرتی کیا گیا تھا' اور ان کا کسی دوسری جگہ تبادلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسی قانونی باریکیوں کی کون پرواہ کرتا ہے۔

اے حمید کو معمولی سی بات پر اعراف میں پھینک دیا گیا۔ بعض پولیس افسروں نے جوان کی ذہنی صلاحیتوں سے جلتے تھے اور منظور احمد وٹو (وزیر اعلیٰ پنجاب) کے منظورِ نظر بننا چاہتے تھے' ان پر الزام لگایا کہ وہ نواز شریف کے یارِ غار ہیں۔ انہوں نے اے حمید کے فوری تبادلہ پر زور دیا۔ وہ کبھی میاں صاحب کے قریب نہیں رہے تھے' اس وقت بھی نہیں جب وہ وزیر اعلیٰ تھے۔ نہ ہی ان سے خاص قسم کے کچھ فائدے اٹھائے تھے۔ جیسا کہ لنگوٹیے یار اکثر اٹھاتے ہیں۔ جہاں تک خفیہ خبریں میاں صاحب تک پہنچانے کا تعلق تھا۔ خفیہ اطلاعات کا تو کیا' عمومی نوعیت کی کوئی بریف' رپورٹ یا فائل کبھی ان کی معرفت اوپر نہیں جاتی تھی۔ انتہائی خفیہ دستاویزات جوان کے پاس آتی تھیں' وہ اخبارات ورسائل تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ انہیں پڑھ کر ان میں سے اتنی زیادہ خفیہ معلومات حاصل کر لیتے ہوں کہ پوری سپیشل برانچ مل کر بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس کے برعکس انہوں نے پورے سات سال پولیس کو درپیش آپریشنل مسائل کا مطالعہ کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کے لیے اپنا سارا وقت اور توانائیاں وقف کیے رکھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے جو کام کیا' وہی انقلاب کا موجب بن گیا۔ لیکن جب معمولی خود غرضی اور دماغی خلل کے تحت انہیں چلتا کر دیا گیا تو پھر اس کام کی قطعاً کوئی وقعت نہیں رہی۔

اس سے بھی اہم ایک اور وجہ یہ تھی کہ اے حمید پولیس کو ترقی دینے اور جدید حالات کے مطابق بنانے کے علمبردار تھے۔ اس کے لیے ایسی ذہنی کیفیت درکار ہوتی ہے جو نئے خیالات اور کاموں کو نئے طریقہ سے انجام دینے کے عمل کو قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ لیکن بہت سے بیوروکریٹس ایسی تبدیلی کو ایک آفت اور مصیبت سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ پرانی مثالوں کے متلاشی رہتے ہیں اور خود کو جمود کی حالت میں محفوظ سمجھتے ہیں۔ کسی تبدیلی کو قبول کرنا تو دور کی بات ہے۔ وہ تبدیلی کی ضرورت سے بھی اتفاق نہیں کرتے۔ جس وقت میرے دفتر میں کمپیوٹرز خریدنے کا معاملہ زیرِ بحث تھا' ایک ڈی آئی جی نے جسے بہت پڑھا لکھا اور تیز

طرار سمجھا جاتا تھا کہا:

''کمپیوٹر خریدنے کا کیا فائدہ؟ ہم ان کے بغیر ہی ٹھیک ٹھاک کام چلا رہے ہیں۔'' ان کے لیے نئے ذرائع اور طور طریقوں میں ناکامی یا پریشانی کا خطرہ ہی سوہانِ روح تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس بات سے بھی نفرت کرتے ہیں کہ ان کی کوتاہیاں دوسروں کے سامنے بے نقاب ہوں۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ معاملات جوں کے توں رہیں۔ اے حمید کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ عقل کی راہ میں حائل رکاوٹ کو ہٹانے کی ہمت نہیں رکھتے اور جہالت کی دلدل میں چہل قدمی کر کے خوش رہتے ہیں۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ انہوں نے اور میں نے جو کچھ بنایا تھا' ہمارے وہاں سے ہٹتے ہی بگڑنا شروع ہو گیا اور یہ سب کچھ انتقام کے طور پر کیا گیا۔

اب حمید کو جو سزا دی گئی اس کا فوری سبب ''اجتماعی غلطی'' تھی۔ وہ ان بہت سے برے کاموں کی بنیاد ہے جو پولیس والے کرتے ہیں۔ چونکہ وہ میرے بہت قریب تھے اور میں خود زیرِ عتاب تھا' اس لیے بعض لوگوں نے سوچا کہ ''دشمن کے دوست کو دشمن'' قرار دینے سے انہیں فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ خواہ اس سے ایک بے قصور آدمی اور خود پولیس کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچے۔ وزیرِاعلیٰ نے اس الزام کی آزاد ذرائع سے تصدیق کرنے کی بنیادی شرط پوری کیے بغیر ان کی بات ماننے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ ہمارے حکمرانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ کسی شخص کی طرف سے انہیں نقصان پہنچنے کا خفیف سا امکان ہے۔ تو اس پر فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ اُردو میں ایسے لوگوں کو ''کان کے کچے'' کہا جاتا ہے۔ ارسطو کے ایک قول سے بیش قیمت مشورہ ملتا ہے۔ کسی شخص نے اس سے کہا:

''میں نے ایک قابلِ اعتماد شخص سے آپ کے خلاف کچھ سنا ہے۔'' عظیم فلسفی نے جواب دیا:

''جو شخص دوسروں کے خلاف باتیں کرتا ہے' وہ قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا۔''

اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے اے حمید نے حسب ذیل کہانی سنائی۔ ایک لومڑی کو پریشان حالت میں بھاگتے دیکھا گیا۔ کسی شخص نے پوچھا:

''کیا معاملہ ہے' تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟''

لومڑی بولی: ''اونٹوں کو گھیر کر پکڑا جا رہا ہے۔''

''لیکن تم تو یقیناً اونٹ نہیں ہو۔'' سوال کنندہ نے اس سے کہا۔

''بلاشبہ میں اونٹ نہیں ہوں۔ لیکن فرض کریں کسی بااختیار حاکم (بیوروکریٹ) نے مجھے ''بچہ شتر'' (اونٹ کا بچہ) قرار دے کر میری گرفتاری کا حکم جاری کر دیا تو میں خود کو کیسے بچاؤں گی؟'' دور اندیش جانور کا یہ جواب سن کر سوال کنندہ نے خاموشی اختیار کر لی۔



باب 42

مجرموں کے لیے فرقہ وارانہ تحفظ

دہشت گردوں اور تخریب کاروں نے جو 1987ء میں انتہا کو ہاتھ لگانے کے بعد زیرِ زمین چلے گئے تھے، مگر 1990ء اور 1991ء میں پھر سر اٹھایا۔ یہ مرحلہ بھی براہ راست افغان بحران کا نتیجہ تھا' اگرچہ اس وقت روسی فوجیں افغانستان سے نکل گئی تھیں۔ بعض گوریلوں نے جو مذہبی جوش و خروش میں اندھے ہو گئے اور افغانستان کی طویل لڑائی کے دوران تربیت حاصل کر چکے تھے' جرائم کی دنیا میں پناہ لے

لی اور اپنے مخالف فرقہ کو بطورِ خاص نشانہ بنانے لگے۔ مذہبی دہشت گردی نے اپنے نظریہ کی بنا پر دشمنانِ پاکستان کی طرف سے اس کے استحصال اور ہر قسم کے ہتھیاروں کی آسان دستیابی کے باعث منظم قتل کی سنگدلانہ وارداتوں اور ڈکیتیوں کے ذریعے ہولناک منظر پیدا کر دیا۔

مذہبی تنظیموں نے بہت سے مجرموں کو جنہیں سیاستدانوں اور دوسرے لوگوں نے ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا ایک ہی کمبل کے نیچے پناہ دے دی۔ میں نے بہت سے شیعہ اور سنی قائدین سے پیچیدہ صورتحال پر تبادلہ خیال کیا۔ لیکن انہیں ان کے ٹھوس مذہبی تعصبات نے اندھا کر رکھا تھا۔ اس لیے انہوں نے آنکھیں کھول کر حقیقت کا سامنا کرنے سے انکار کر دیا۔

اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز حکام بھی اس مسئلہ کا پوری طرح ادراک نہیں رکھتے تھے۔ وزارتِ داخلہ نے آئی بی اور آئی ایس آئی کے مشورہ سے سپاہ صحابہ اور تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ دونوں پر پابندی لگانے کی تجویز پیش کی۔ جو سراسر اناڑی پن تھا اور مسئلہ کے حل میں قطعاً مدد نہیں دے سکتا تھا۔

امام بارگاہوں اور مساجد کو جو دونوں طرف کے مجرموں کے لیے پناہ گاہوں کا کام دیتے تھے' تالے لگانا اور بند کرنا ہرگز ممکن نہیں۔ مذہبی قائدین اپنی عبادت گاہوں میں بیٹھ کر دہشت گردی اور تخریب کاری کے منصوبے بناتے ہیں۔ پھر انہیں مذہب کے نام پر اور حفاظت خود اختیاری کے تحت جائز ٹھہراتے ہیں۔

اس غرض سے استعمال ہونے والے مجرم اپنے جداگانہ مقاصد رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عبادت گاہ میں بیٹھ کر مذہبی فریضہ کی آڑ میں اپنا کام کر رہے ہیں' اس لیے انہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اس طرح وہ محفوظ طریقے سے منشیات کا لین دین' ہتھیاروں کی تجارت' ڈاکہ زنی' اغوا برائے تاوان اور دیگر جرائم کا ارتکاب جاری رکھ سکتے تھے۔ ان کا نشانہ عموماً مخالف فرقہ کے افراد بنتے تھے۔ اغوا کردہ افراد کو مساجد اور امام بارگاہوں میں رکھا جاتا جہاں انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا اور بعض اوقات قتل کر دیا جاتا تھا۔

اگر دونوں بڑی فرقہ وارانہ تنظیموں پر پابندی لگا دی جاتی تو وہ با آواز بلند احتجاج کرتیں اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو بروئے کار لاتیں۔ حکومت دفاعی پوزیشن پر ہوتی کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔ اعلیٰ عدالتیں بھی حکومت کے اقدام کو خلافِ قانون قرار دے دیتیں جب تک مجرمانہ منصوبہ بندی اور افعال کا ٹھوس ثبوت پیش نہ کیا جاتا۔ انٹیلی جنس ایجنسیاں حسبِ معمول ناکارہ اور خوش فہمی میں

مبتلا تھیں کیونکہ نتائج آخرِ کار حکومت کو بھگتنے پڑتے ہیں ایجنسیوں کو نہیں۔ علاوہ ازیں خفیہ ایجنسیاں غیر ملکی امداد کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کرسکتی تھیں کیونکہ ہمیں علم تھا کہ دونوں تنظیموں کے بااثر اور خوش تدبیر غیر ملکی سرپرست موجود تھے۔

دونوں فرقہ وارانہ تنظیموں پر پابندی لگانے پر غور وخوض کے لیے اسلام آباد میں اعلیٰ سطح کا اجلاس بلایا گیا۔ ہر ایک پابندی لگانے کی آسان ترکیب کے حق میں تھا۔ میں نے ایک بنیادی سوال اٹھایا اور شرکائے اجلاس سے پوچھا: ''آپ حقیقی مسئلہ کا سدِ باب کرنے یا اسے کم کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں یا محض اس اجلاس کو کامیاب بنانے کے خواہاں ہیں؟'' میں نے مزید کہا ''اگر آپ دونوں تنظیموں پر پابندی لگانے کا فیصلہ کریں گے تو اس کا کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا جب تک ہم اپنی پوری طاقت سے اس کی حمایت نہ کریں''۔ اس وقت ہمارے اندر کوئی اہلیت نہیں اور بہت ہی کم معلومات رکھتے ہیں۔ فرقہ وارانہ تنظیموں کے گرد مذہبی جنون نے جو دیوار کھڑی کررکھی ہے، اسے حکمت اور قوت کے ساتھ منہدم کرنا ہوگا۔ میں ان کے اندرونی حلقوں میں گھسنے کی کوشش کررہا ہوں مجھے مجرموں کو الگ تھلگ کرکے کچلنے کا موقع دیں۔ اس کے بعد ہی مسئلہ سے نمٹا جاسکے گا۔ مجرموں کو ہمیشہ خریدا جاتا ہے تاکہ وہ معاشرہ میں انتشار وابتری پھیلائیں۔ میرا پختہ یقین ہے کہ زمین کی کوئی قوت اپنے تمام وسائل کے باوجود ہمارے امن کو تباہ نہیں کرسکتی اگر ہم مجرموں پر کنٹرول حاصل کرکے ان کا قلع قمع کردیں۔''

اجلاس کے شرکا میرے خیالات سے متفق نہیں تھے۔ وہ دشمن کے ایجنٹوں کو مضبوط ہاتھوں سے کچلنے کے شاندار منصوبے اور بلڈوز کرنے کی تدابیر رکھتے تھے لیکن کیسے؟ اس بارے میں ان کے پاس کوئی واضح لائحہ عمل نہیں تھا۔ محض لمبے چوڑے وعدے' الفاظ سے بھرپور اور بے معنی زبانی تنبیہہ جو کہ ہمارے ان ایڈمنسٹریٹروں کے غیر سنجیدہ ذہنوں کا خاصہ ہے جنہیں اختیارات کے زعم نے اندھا کررکھا ہے۔

لیہ میں پہلی کامیابی

آخرِ کار سپیشل برانچ پنجاب کو ایسے خطرناک اور سنگدل مجرموں کا سراغ لگانے میں اولین کامیابی حاصل ہوئی جو ایک عرصہ سے مذہبی تنظیموں کے زیرِ سایہ سرگرمِ عمل تھے۔ میں نے رینج کے ڈی آئی جی صاحبان اور متاثرہ اضلاع کے ایس پی حضرات کو مشورہ دیا کہ حقیقی مجرموں کا تعاقب کریں ایسے افراد کا نہیں جن کے نام کسی بھی فرقہ کی طرف سے دباؤ کے تحت غلط طور پر ابتدائی رپورٹوں یا تفتیشی رپورٹوں میں درج

کر لیے گئے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس نے واقعی سچائی کا دامن تھامنے میں عزم وہمت سے کام لیا۔

پہلی کامیابی ڈیرہ غازی خاں پولیس کے حصّہ میں آئی جو ایک مذہبی راہنما کے قتل کی تفتیش میں مصروف تھی۔ سردست وہ معاملہ عدالت میں زیرِ سماعت ہے' ایسی صورت میں کسی فریق کے کسی شخص کا نام ظاہر کرنے سے پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ اس لیے میں مسئلہ کے مختلف پہلو ظاہر کرنے کے لیے صرف اپنی حکمت عملی اور پولیس کے طریق کار کا خلاصہ بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

حقیقی مجرمان کو گرفتار کر کے پوچھ گچھ کی گئی۔ صبر وتحمل اور جان جوکھوں میں ڈالنے والی مشقت کے بعد پورے پس منظر اور منصوبہ بندی کا سراغ لگا لیا گیا۔ مجرموں کے سرپرستوں نے ہر قسم کا دباؤ ڈالا' جس میں احتجاج اور بڑے بڑے جلوسوں کے ذریعے ہاہا کار شامل تھی' مگر ڈی آئی جی عرفان محمود ثابت قدم رہے۔ میں نے ان سے کہا کہ احتجاج کرنے والوں بلکہ وفد لے کر آنے والوں کو بھی ثبوت کے ساتھ حقیقت سے آگاہ کر دیں۔ میں جانتا تھا کہ صداقت اپنا رنگ ضرور لائے گی اور عوام بشمول وارداتوں میں ملوث تنظیموں کے نچلے طبقات بچشم خود حقائق کا مشاہدہ کر لیں گے۔ سچائی آہستہ آہستہ ان دیواروں کو منہدم کر دے گی جن کی بنیاد جھوٹ پر رکھی گئی ہے۔

لیّہ میں کامیابی سے ہمیں شرکائے جرم اور مجرموں کے طریقوں کی بابت مزید جامع معلومات حاصل ہوئیں اور بہت سے مقدمات کا سراغ لگانے میں مدد ملی۔ اسی طرح کے ایک اور کیس میں ڈیرہ غازی خاں کے ایک گھر سے 6 بدمعاش پکڑے گئے۔ وہ اسکول کے کیشیئر سے اساتذہ کی تنخواہوں کی رقم لوٹنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ لوٹی ہوئی رقم لیّہ کیس کے ملزموں کی ضمانت پر خرچ کرنی تھی۔ یہ بھی طے کر لیا گیا تھا کہ اگر ملزمان کی ضمانت نہ ہوئی تو عدالت سے واپسی پر انہیں راستہ میں پولیس کی تحویل سے آزاد کرا لیا جائے گا۔

تفتیش کے دوران پتہ چلا کہ ان کے تین ساتھی میانوالی کے افغان کیمپ سے مزید ہلاکت خیز اسلحہ لانے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ بروقت اطلاع ملنے پر سرگودھا پولیس نے مداخلت کر کے انہیں بھی گرفتار کر لیا۔ مجرموں میں سے بعض افغان جنگ میں حصہ لے چکے تھے اور سخت جان بن گئے تھے۔ تاہم پولیس اپنی ہنرمندی اور جرأت کی بدولت ان کے نیٹ ورک میں سرنگ لگا کر اسے توڑنے میں کامیاب ہو گئی۔ ان کے سرپرستوں میں سے بعض نے زبردست احتجاج کیا۔ تاہم پولیس نے سچائی کا دامن نہیں

چھوڑا۔ جب تفتیش کی ویڈیو ٹیپ تحفظ دینے والے عملا کو دکھائی گئیں تو ان میں سے بہتوں نے مجرموں کی حمایت سے ہاتھ اٹھا لیا۔

ہمیں زندہ رہنا ہے

تفتیش کے نتیجہ میں پولیس نے فرقہ وارانہ تنظیموں کے بہت سے ارکان پکڑ لیے جو صوبہ کے مختلف علاقوں میں قتل اور ڈاکہ جیسے سنگین جرائم میں ملوث تھے۔ ادھر نارووال سے دو نوجوان پکڑے گئے۔ انہوں نے دورانِ تفتیش انکشاف کیا کہ وہ اور ان کے ساتھی ڈاکے اور قتل کی سینکڑوں وارداتیں کر چکے ہیں۔ یہ کہ انہوں نے شاہ جمال (لاہور) میں ایک ڈاکہ کے دوران دو پولیس کانسٹیبلوں کو قتل کر دیا تھا۔ ایک بارات کو جو نارووال جا رہی تھی' لوٹا' ٹرینوں میں ڈاکے ڈالے' ٹرک لوٹے' حتیٰ کہ سیالکوٹ میں فوجی افسروں اور جوانوں کو بھی نہیں بخشا۔ انہوں نے اپنے 18 ساتھیوں کی نشاندہی کی اور ان کی گرفتاری میں مدد دی۔ ان کا گروہ صوبہ بھر میں پھیلا ہوا تھا۔ پولیس نے ان لٹیروں کو بڑی مشکل اور جرأت سے گرفتار کیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ سب نوعمر' دبلے پتلے اور مذہب سے لگاؤ رکھنے والے تھے اور جہادِ افغانستان میں حصہ لے چکے تھے۔ وہ خود کو سپاہ صحابہ کا رکن بتاتے تھے جبکہ مذکورہ تنظیم ان سے لاتعلقی کا اظہار کرتی تھی۔

احمد پور شرقیہ میں ایک مولوی مارا گیا۔ لوگوں نے دو ملزموں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ پوچھ گچھ پر انہوں نے خود کو تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کا رکن ظاہر کیا۔ وہ بہت سی ڈکیتیوں میں ملوث تھے۔ ان کا تیسرا ساتھی جو بھاگ گیا، خان گڑھ (مظفر گڑھ) سے میڈیکل کا طالب علم تھا۔ انہوں نے ایک اور امام مسجد کے گھر میں بم پھینکا' جس سے اس کا پورا خاندان ہلاک اور زخمی ہو گیا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ ایسے کام کر کے اپنا مذہبی فرض ادا کر رہے ہیں۔

''آپ لوگ ڈاکہ زنی جیسے جرائم کیوں کرتے ہیں؟'' ان سے سوال کیا گیا۔

''کیونکہ ہمیں زندہ رہنا ہے اور خود کو اس قابل رکھنا ہے کہ دشمن کا صفایا کر سکیں۔'' انہوں نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ جلد ہی ان کے دوسرے پانچ ساتھی بھی دھر لیے گئے۔

راولپنڈی پولیس نے سرگرم تعاقب کے بعد پانچ باریش ڈاکوؤں کو اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ صادق آباد میں ڈاکہ ڈالنے کے بعد بھاگ رہے تھے۔ انہوں نے ایک ایسے مدرسہ میں پناہ لینے کی کوشش

کی جو سپاہِ صحابہ کے زیرِ انتظام تھا۔ وہ راولپنڈی میں اور اس کے ارد گرد چوری اور ڈکیتی کی بہت سی وارداتوں کا ارتکاب کر چکے تھے۔ اُنہیں اپنے سینئرز کو ایسی سرگرمیوں میں ملوث دیکھ کر شہ ملی تھی جو ایسے کام مذہبی فریضہ کے طور پر کرتے تھے۔

فیصل آباد میں پولیس نے چند ڈاکوؤں کا سرگرمی سے پیچھا کیا جو ایک بینک میں ڈاکہ ڈال کر اور ڈیوٹی پر متعین کانسٹیبل کو قتل کر کے فرار ہو رہے تھے۔ انہیں سپاہِ صحابہ کی مسجد سے گرفتار کیا گیا۔ انہوں نے اپنے رہنماؤں کی موجودگی میں ہینڈ گرنیڈز کی نشاندہی کی جو مسجد کے صحن میں دفن تھے۔ پولیس نے وہ سارے دستی بم برآمد کر لیے۔ وہ لوگ افغانستان میں بھی کئی سال رہ آئے تھے۔

لاہور میں ڈاکوؤں کے ایسے کئی گروہ پکڑے گئے۔ تین مختلف گروہوں کے 14 ارکان اس بات پر بے حد نازاں تھے کہ انہوں نے لوٹ مار کے لیے ہمیشہ مخالف فرقہ کے مکانوں اور دکانوں کو نشانہ بنایا' کسی اور کا گھر نہیں لوٹا۔

دونوں فریق قتل کی سفاکانہ وارداتوں میں ملوث تھے اور منصوبہ کے تحت ناقابلِ تصور جرائم کا ارتکاب کر رہے تھے۔ یہاں ایسے ہزاروں واقعات میں سے محض چند ایک کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ صورت حال مذہبی جنون کے تحت وقتی طور پر پیدا نہیں ہو گئی تھی۔ مجرموں نے اپنے مفاد کی خاطر فرقہ وارانہ نفرت و عداوت کو خطرناک رخ دے دیا تھا اور بڑی بیدردی سے اس کا استعمال کر رہے تھے۔ ملک بڑی تیزی سے تخریبی صورت حال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کوئی تو ایسا صاحب بصیرت ہوتا جو اس کھیل کو سمجھ سکتا اور جرأت و ہمت سے کام لے کر ملک کو بچا سکتا۔ پنجاب پولیس نے جذبہ حب الوطنی کے تحت اسے اپنا فرض سمجھا اور کسی پر الزام لگانے بغیر فرقہ وارانہ تنظیموں پر پابندی لگانے جیسے سادہ حل کا سہارا لینے سے گریز کیا۔

جھنگ کا معرکہ

پورے صوبہ میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ضلع جھنگ تھا جو ہیر رانجھا کی رومانوی داستان کی بدولت غیر معمولی شہرت کا حامل ہے۔ وہ شہر بڑی حد تک ویران ہو گیا تھا کیونکہ زیادہ تر آبادی ڈاکوؤں اور لٹیروں کے مابین تصادم کے خوف سے نقل مکانی کر گئی تھی۔ پورا شہر خوف و ہراس کی لپیٹ میں تھا اور اس پر کلاشنکوف برداروں کا راج تھا۔ مختلف محلوں میں آباد پولیس والے اپنے سینئروں کے مقابلہ میں مسلح ٹھگوں

کے زیادہ فرمانبردار تھے۔ کسی اطلاع کے "اوپر" پہنچ جانے کی بابت معمولی سا شک بھی پولیس والوں اور ان کے اہلِ خاندان کی موت کا سبب بن سکتا تھا۔" اطلاع حاصل کرنے کے ذرائع ناپید ہو گئے تھے اور انتظامیہ بالکل اندھیرے میں تھی۔ قتل کی وحشیانہ اور پرتشدد وارداتوں پر اس کا ردِعمل مبہم اور ناقابلِ فہم ہوتا تھا۔

پولیس نے دوسرے اضلاع کی کسی حد تک صفائی کرنے کے بعد جھنگ کے مافیا کے خلاف گھیرا تنگ کرنا شروع کیا۔ اس وقت دونوں فرقوں کی قیادت بھی دفاعی پوزیشن پر آ گئی تھی کیونکہ ہم ان کے زیر تحفظ بہت سے مجرموں کو گرفتار کر چکے تھے۔ (یہ گاؤں کے زمینداروں کی اختیار کردہ "بدمعاش پال سکیم" سے مختلف پروگرام تھا) میں نے دونوں فرقوں کے قائدین کو مقدمات اور شہادتوں کی تفصیل سے آگاہ کیا تو وہ انتہائی پریشان اور شرمندہ ہوئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ بدمعاش ان کی طرف سے فراہم کردہ تحفظ کو کس طرح اپنے ناپاک مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور مذہبی سرگرمیوں کی آڑ میں منشیات اور ناجائز اسلحہ کا کاروبار کر رہے ہیں۔ ڈاکے مارتے ہیں' جوا خانے چلا رہے ہیں اور قحبہ خانے کھول رکھے ہیں۔

میں نے رانا عبدالواسع کو جو بہت تیز طرار' تجربہ کار اور بیباک ونڈر آفیسر تھا' جھنگ کا ایس پی بنا دیا۔ اس نے صورتحال کا اس کے تاریخی اور معاشرتی پس منظر میں جائزہ لینے کے بعد قدم اٹھایا۔ جھنگ میں بڑے زمیندار ہمیشہ سے خاندانی سیاست کر رہے ہیں۔ شہری آبادی کی اکثریت سنّی مسلک سے تعلق رکھتی تھی۔ آزادی کے بعد سنّی مہاجرین کی بھاری تعداد نے جھنگ میں سکونت اختیار کر لی۔ اپنے قدم جمانے کے بعد انہوں نے شیعہ خاندانوں کو اہم سیاسی عہدوں سے بیدخل کرنے کی کوشش کی۔ سنّی علما نے اپنی ہم مسلک اکثریت کو شیعہ اُمیدواروں کو ووٹ دینے سے باز رکھنے کے لیے اہلِ تشیع کے خلاف زوردار تقریریں کیں۔ یہ تدبیر کامیاب رہی' چنانچہ قومی اسمبلی کے انتخابات میں کرنل عابد حسین (عابدہ حسین کے والد) جیسا سرکردہ سیاستدان شکست کھا گیا۔ سازشوں کی سیاسی بنیادیں وقت گزرنے کے ساتھ دونوں طرف سے دشمنی میں بدل گئیں۔

رانا واسع نے دونوں طرف کے سرگرم ونمایاں افراد کی ایک فہرست تیار کی۔ پھر بڑی مشکل اور محنت سے بدمعاشوں اور ان کی پناہ گاہوں کا سراغ لگایا۔ سپیشل برانچ نے انہیں مزید معلومات فراہم کیں جو جھنگ سے ملحق دوسرے اضلاع میں گرفتار گئے مجرموں سے پوچھ گچھ کے دوران حاصل کی گئی تھیں۔

جھنگ سے باہر کے علاقوں سے جو معلومات حاصل ہوئیں' ان کی مدد سے رانا واسع کے آدمی

ایک سنّی مذہبی لیڈر کے قتل کے فوراً بعد دو شیعہ مجرموں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان سے پوچھ گچھ کی گئی تو ان کے پورے گروہ کا پتہ چل گیا۔ ان کے سات ساتھیوں کو فوری طور پر حراست میں لے لیا گیا اور بہت سے بعد میں پکڑے گئے۔ خوف و دہشت کا ناقابلِ انہدام قلعہ منہدم ہونے لگا۔ اسی طرح سپاہِ صحابہ سے تعلق رکھنے والے تین دہشت گرد پکڑے گئے تو انہوں نے درجنوں وارداتوں کا اعتراف کر لیا۔ ان کی گرفتاری سے مختلف قبائل اور سیاسی گروپوں کے ساتھ تازہ ترین رابطوں کا انکشاف ہوا۔ وہ مذہبی جذبات سے کھیلتے مجرموں کو پناہ دیتے اور ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ جھنگ پولیس نے ایسے زمینداروں اور تاجروں کے خلاف ٹھوس شہادتوں کی روشنی میں کارروائی کی۔ وہ دفاعی پوزیشن پر آ گئے اور لاقانونیت کی بجائے قانون کا ساتھ دینے کے عہد و پیمان کر کے جان چھڑائی۔ رانا واسع کی محنت، تجزیاتی سوچ، گہری فراست و دور بینی اور مجرموں کے ٹھکانوں پر جو پہلے ناقابلِ رسائی تھے دلیرانہ حملے بارآور ثابت ہوئے۔ دلیر اور نڈر بدمعاش، جو پہلے پولیس کی نااہلیت کا مذاق اڑایا کرتے تھے اب ایک نئے اور خوفناک چیلنج کو سامنے پا کر خوفزدہ ہو گئے۔

بدقسمتی سے رانا واسع اچانک شدید بیمار ہو گیا۔ ہم مجرموں پر دباؤ جاری رکھنا چاہتے تھے، اس لیے چیف سیکرٹری پرویز مسعود اور میں نے جھنگ کے ایس پی کے عہدہ کے لیے رانا محمد نواز کا انتخاب کیا۔ وہ بھی بہت قابل اور ورکنگ افسر تھا۔ اس نے مجرموں کو ان کے مذہبی و سیاسی سرپرستوں سے الگ تھلگ کرنے اور انہیں ایک ایک کر کے گرفتار کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اپنے گرد پولیس کا دائرہ تنگ ہوتے دیکھ کر مجرم اور ان کے سرپرست پریشان ہو گئے۔ ان میں سے بعض نے لاہور ہائیکورٹ میں رٹ درخواستیں دائر کر دیں جس سے ان کی کمزوری مزید آشکار ہو گئی۔ بدمعاش جو پہلے اس یقین کا اظہار کرتے تھے کہ پولیس نہ تو ان کے علاقہ میں داخل ہو سکتی ہے، نہ ہی ان پر ہاتھ ڈال سکتی ہے، اپنے بعض ساتھیوں کی گرفتاری دیکھ کر حوصلہ ہار گئے۔ اب وہ یا تو پسپائی اختیار کر رہے تھے یا پناہ گاہوں کی تلاش میں تھے۔

برائی کا انجام برائی

اس مرحلہ پر دونوں طرف کے مقتدر مذہبی رہنماؤں نے مجھ سے پولیس کے ''ظلم اور سنگدلی'' کی شکایت کی۔ میں نے ان کے سامنے حقائق رکھے اور ان پر زور دیا کہ مجرموں کی پشت پناہی ترک کر دیں،

آپ لوگ آگ سے کھیل رہے ہیں۔ وہی مجرم جن کی آپ سرپرستی کر رہے ہیں' اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لیے آپ کا خون بہانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ مجرموں پر ان کے والدین بھی بھروسہ نہیں کر سکتے' آپ تو بیگانے ہیں۔

اس وقت تک مجھے فرقہ وارانہ رہنماؤں کو درپیش کسی خطرہ کے بارے میں قطعی معلومات میسّر نہیں تھیں۔ تاہم ان کا خیال تھا کہ جو کچھ ان کے ذہنوں میں تھا' مجھے اس کی بھی خبر تھی۔ انہوں نے مجھے علیحدگی میں بتایا کہ ان میں سے ہر ایک کو مجرموں کی طرف سے اسی نوعیّت کا خطرہ درپیش ہے۔ فرقہ واریت کے علمبردار انہی بدمعاشوں کے ہاتھوں یرغمال بن گئے تھے جنہیں پیشتر ازیں وہ اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہے تھے۔ اس طرح ہر شخص مجرمانہ ذہنیت کے شکنجے میں اسیر ہو کے رہ گیا۔

ہر دو فرقوں کے مقتدر رہنماؤں نے مجھ سے علیحدگی میں درخواست کی کہ انہیں اس صورتحال سے بچایا جائے جس میں وہ خود پھنس گئے تھے۔ میری استدعا پر چوہدری واجد علی خاں' ایم پی اے ان کی مدد کے لیے آگے آئے۔ انہوں نے سپاہِ صحابہ اور تحریکِ جعفریہ کے قائدین کے ساتھ کئی ملاقاتیں کیں اور انہیں مفاہمت پر آمادہ کر لیا۔ ہر فریق نے دوسرے فرقہ کے مجرموں کا سراغ لگانے اور گرفتار کرانے میں خفیہ مدد دی۔ اس کے بعد واجد علی نے دونوں فرقوں کے رہنماؤں کی وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم کے ساتھ ملاقات کرائی۔ یہاں تک کہ آخرِ کار وہ فرقہ وارانہ امن و آشتی کے لیے کام کرنے لگے۔

دریں اثنا پولیس نے مجرموں کا تعاقب جاری رکھا جو اب پہلے کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ تنہا رہ گئے اور بے نقاب ہو گئے تھے۔ بدمعاشوں کا جری سرغنہ سلیم فوجی ایک زبردست پولیس مقابلہ میں موت کا نشانہ بن چکا تھا۔ انہی دنوں جھنگ کے جیل سپرنٹنڈنٹ کے قاتل گرفتار کر لیے گئے۔ تین انتہائی خطرناک مجرم بھیس بدل کر جھنگ سے فرار ہو گئے۔ تاہم سرگودھا کی مستعد و چوکس پولیس نے انہیں گرفتار کر کے جھنگ بھیج دیا تاکہ اپنے کیے کی سزا پا سکیں۔ یہ رانا واسع اور رانا محمد نواز جیسے دور اندیش' ہوشیار اور بہادر افسروں کی محنت کا نتیجہ تھا کہ جھنگ بدمعاشوں کا یرغمالی نہیں رہا۔

جھنگ میں ان پولیس والوں کے اعزاز میں ایک بڑی تقریب منعقد ہوئی جنہوں نے شہر کی نارمل زندگی بحال کر دی تھی۔ لوگوں نے پولیس کی ہنرمندی و چابک دستی نیز جرأت و بے باکی کو دل کھول کر سراہا۔ ان افسروں کو نظم و نثر کی صورت میں شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا گیا جنہوں نے اپنی جانیں شہر کے

امن پر نچھاور کر دی تھیں۔ نصرت فتح علی نے سٹیڈیم میں منعقد ہونے والی ایک پُر ہجوم تقریب میں شام سے صبح تک اپنے فن کا مظاہرہ کیا جو ہیر رانجھا کے شہر میں امن بحال ہونے کی خوشی میں منعقد ہوئی تھی۔

قرآنِ حکیم کے نسخے جلانے والے مولوی؟

بعض مذہبی عناصر جنہیں امن کی بحالی راس نہیں آئی' برہم و برگشتہ ہو گئے۔ پولیس نے چنیوٹ اور فیصل آباد سے ان انتہائی کمینے اور ذلیل مجرموں کو گرفتار کر لیا جنہوں نے قرآن حکیم کے نسخے جلائے تھے۔ ایک معروف اور مقدس مذہبی گروپ ان کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ کئی قابلِ صد احترام علما فیصل آباد کے ڈی آئی جی مرزا محمد علی کے پاس پہنچے اور معاملہ کو دبانے کی التجا کی۔ تاہم علاقہ کے اکثر لوگوں کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ نسخے مخالفین کو ملوث کرنے اور ملک بھر میں ہنگامے شروع کرنے کے لیے نذرِ آتش کیے گئے تھے۔ شر پسندوں کا خیال تھا کہ اس طرح ان کی اہمیت پھر بحال ہو جائے گی۔ وہ نہ صرف غیر ملکی طاقتوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے بلکہ انتہائی خباثت اور بدمعاشی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

وہ اپنا آپ منوانے کے خواہاں تھے اور میں انہیں بہت زیادہ اہمیت دینے کو تیار تھا بشرطیکہ وہ معاشرہ کی بھلائی کے لیے مثبت انداز میں کام کریں۔ میں نے جملہ افسران کو ہدایات جاری کر دیں کہ مقتدر علمائے کرام کو بلائیں۔ انہیں مناسب احترام دیں اور ان سے درخواست کریں کہ منفی طریقوں سے اہمیت حاصل کرنے کی بجائے لوگوں کو جرائم اور برائی کے خلاف جہاد میں حصہ لینے کی ترغیب دیں۔ اس طرح ان کی توانائیاں صحیح سمت میں صرف ہوں گی اور انہیں اہمیت حاصل کرنے کے لیے فساد پھیلانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میری کوششیں انہی خطوط پر جاری رہیں اور علما نے بھی مثبت جواب دیا۔ بصورتِ دیگر وہ بے نقاب ہو جاتے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ درست ہو جائیں' خوشامد نہ کریں۔ انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ انسانیت و شرافت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے خود کو ایسے مجرموں سے الگ تھلگ کر لیں جن کے نام تھانوں میں درج تھے۔ پولیس کے فرائض ادا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ مجرم کو تنہا کر دیا جائے اور اسے دل بہلانے کی باتیں کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

رفیع احمد پرویز نے' جو بہت تیز طرار افسر تھا اور معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا تھا' میری درخواست پر پنجاب پولیس کے افسروں کے استفادہ کے لیے ایک سائنٹیفک اور جامع تحقیقی رپورٹ لکھی۔ ا

س رپورٹ کی وسیع پیمانہ پر تقسیم و تشہیر کرنے سے جن میں ان کے سیاہ کارناموں' شناخت، طریقہ ہائے واردات اور ٹھکانوں کی بابت معلومات تھیں اور یہ بتایا گیا تھا کہ اس مقدس فرقہ واریت کے پس پشت کس کا ہاتھ ہے' مجرم پوری طرح بے نقاب ہوگئے۔ پولیس کی سراغ رسانی کی اضافی کوشش سے وہ عذاب کم از کم وقتی طور پر ٹل گیا۔ اس سلسلے میں محض سخت اور آمرانہ ہتھکنڈوں سے کام نہیں لیا گیا۔



باب43

منشیّات کے خلاف جہاد

منشیات کا موجود ہونا اور قبضے میں رکھنا نہ صرف بجائے خود جرم ہے بلکہ بعض سنگین جرائم کا موجب بھی بنتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک جرائم منشیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کا ارتکاب' ان کے عادی اپنی خواہش کی تسکین کے لیے کرتے ہیں۔

سلمان قریشی' ایڈیشنل آئی جی پنجاب اور صلاح الدین نیازی' ڈی آئی جی کرائم برانچ نے اس موضوع پر گہری تحقیق کی تو ہولناک نتائج سامنے آئے۔ 18 سے 28 سال تک کے نوجوان جن میں اکثریت اوسط درجہ کے خاندانوں سے تعلق رکھتی تھی' بیش قیمت ہیروئن حاصل کرنے کے لیے نقب زنی' چوری' ڈاکے اور دیگر جرائم کا ارتکاب کرتے پائے گئے۔ بری صحبت کے باعث جب وہ اس لعنت میں گرفتار ہوجاتے ہیں تو انہیں روزانہ کی خوراک خریدنے کے لیے جیب خرچ سے کہیں زیادہ رقم درکار ہوتی ہے۔ اس غرض کے لیے پہلے وہ اپنے گھر کی چیزوں پر ہاتھ صاف کرتے' اس کے بعد جرائم کی وسیع دنیا میں داخل ہوجاتے ہیں اور جہاں بھی داؤ لگے چوری کرکے اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔ جوں جوں یہ لت بڑھتی جاتی ہے توں توں جرائم کے ارتکاب اور اس کی وسعت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

ہماری تحقیق سے بعض ایسے واقعات سامنے آئے جن میں منشیات کی خرید کے لیے رقم اور وسائل حاصل کرنے کی غرض سے بیٹوں نے اپنے والدین کو قتل کر ڈالا۔ بیرون ملک سے فارغ التحصیل ایک نوجوان نے اپنی ماں اور باپ دونوں کو محض اس لیے قتل کر کے کار میں جلا کر راکھ کر دیا کہ وہ اس کے بڑھتے ہوئے مطالبات پورے کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کا باپ ریٹائرڈ کرنل تھا۔ اس طرح کے بہت سے واقعات ہر طرف رونما ہو رہے تھے جس سے امیر' غریب' تعلیم یافتہ اور ناخواندہ' شہری اور دیہاتی سب یکساں متاثر ہو رہے تھے۔

میں نے ڈی آئی جی صاحبان اور دیگر سینئر افسروں کا اجلاس بلایا جس میں منشیات سے متعلق جرائم پر بحث مباحثہ ہوا۔ سلمان اور نیازی نے حقائق اور اعداد و شمار کی مدد سے مسئلہ کی سنگینی واضح کی۔ خالد لطیف ڈائریکٹر تحقیق و ترقی نے بعض ایسے مقدمات کا ذکر کیا جن میں خاندانی تعلقات کا تقدس منشیات کے لیے غیر ذمہ دارانہ دباؤ کے باعث پامال کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ بھائیوں نے اپنی بہنوں کے ساتھ ''زیادتی'' کرنے کے بعد انہیں ہلاک کر دیا۔ بعض مردوں نے اپنی بیویوں کو نشہ پورا کرنے کے لیے جسم فروشی پر مجبور کیا۔ باپوں نے اپنی بیٹیوں کے ساتھ جبراً بدکاری کرنے کے بعد انہیں مار ڈالا۔ ملازمین نے اپنے مالکان کا گلا گھونٹ دیا اور استادوں نے اپنے شاگردوں کو بیچ دیا۔ ڈی آئی جی تنویر حمید نے تحقیق اور حکمت عملی سے متعلق مقالہ میں مسئلہ کی شدت واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اصلاحی اقدامات بھی تجویز کیے۔ اس کے علاوہ بعض کارآمد تجزیاتی رپورٹیں بھی مرتب کی گئیں۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ پہلے اپنی فورس کے سامنے مکمل تصویر پیش کرنی چاہیے اور انہیں صورتحال کی سنگینی کا احساس دلانا چاہیے۔ اس کے بعد عدالتوں کو حقائق اور اعداد و شمار کے ساتھ بریف کرنا چاہیے۔ پھر عوام کا تعاون حاصل کرنے کے لیے معاشرہ کے مختلف طبقات میں آگاہی پیدا کرنی چاہیے۔ ہم جانتے تھے کہ ضلعی انتظامیہ اور پولیس ہی ایسے موثر شعبے ہیں جو نتائج دکھا سکتے ہیں۔ صحیح معنوں میں پولیس ہی وہ فورس تھی جسے مسئلہ تک حقیقی رسائی حاصل تھی۔

سینئر افسروں نے جونیئر افسروں اور جوانوں سے خطاب کیا اور معاشرہ پر منشیات کے تباہ کن اثرات کی وضاحت کی۔ انہوں نے قومی فریضہ کے طور پر اس برائی کے سدِ باب پر زور دیا۔ پُر جوش سپاہیوں نے ہر قیمت پر اس لعنت کی بیخ کنی کا تہیہ کر لیا۔ عدالتیں پہلے ہی متقی و خدا ترس چیف جسٹس میاں

محبوب احمد کی ہدایت پر منشیات پھیلانے والوں کے ساتھ سختی سے نمٹ رہی تھیں۔ ڈپٹی کمشنروں اور ایس پی صاحبان نے وکلا، علما، صحافیوں، دانشوروں، اساتذہ، طلبا اور معاشرے کے دیگر طبقات سے خطاب کیا اور اس برائی کے استیصال میں مدد کرنے کی اپیل کی۔ انتظامیہ نے اس مقصد کے لیے کئی سیمینارز، جلوس اور ''واک'' کا اہتمام کیا۔ وفاقی اور صوبائی وزرا نے ایسے جلوسوں کی قیادت کی۔ ایم این ایز، ایم پی ایز اور کونسلرز بھی ان میں شریک ہوئے۔ طلبا نے سب سے زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ بعض مقامات پر غصہ سے بپھرے ہوئے جلوس منشیات کے اڈوں پر حملہ آور ہوئے جس سے منشیات کا دھندا کرنے والوں کے دلوں میں دہشت بیٹھ گئی اور ان میں سے بہت سے جان بچانے کے لیے میدان سے بھاگ گئے۔ بعض مقدمات میں وکلا نے ایسے لوگوں کی پیروی کرنے سے انکار کر دیا۔ جب مجھے وکلا کی اخلاقی سوچ کا پتہ چلا تو میں نے اپنے افسروں کا دوسرا اجلاس طلب کیا اور اس حوالہ سے ان کی ذمہ داری اور فرض منصبی کا احساس دلایا کہ منشیات سے متعلق جرائم میں کسی بے گناہ کو ملوث نہ کیا جائے۔ ہمیں لوگوں، وکیلوں اور عدالتوں کی توقعات پر پورا اترنا تھا، جنھوں نے پولیس پر اس قدر اعتماد کیا تھا۔ پولیس نے ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگنے دی اور مہم کے دوران کسی فرضی برآمدگی یا بے گناہ افراد پر منشیات ڈالنے کی کوئی شکایت نہیں ملی۔ افسروں نے سپاہیوں کو زبردست ترغیب دی اور انھوں نے ہر جگہ منشیات فروشوں کا تعاقب کیا۔ انھوں نے مسلسل جہاد کیا یہاں تک کہ ان میں سے بہت سے اس مہم کے دوران مارے گئے۔

قبائلی علاقوں میں ہیروئن نایاب ہو گئی

میانوالی اور اٹک پولیس نے اتنا زبردست اور جامع آپریشن کیا کہ قبائلی علاقہ کے سرداروں نے گرفتاری کے خوف سے ہیروئن کی فراہمی بند کر دی۔ وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے لیکن سپاہیوں نے اپنی مہم جاری رکھنے کا عزم کر لیا تھا۔ میانوالی اور اٹک صوبہ سرحد سے پنجاب میں داخل ہونے کے دو اہم راستے ہیں۔ ان دونوں شہروں کے نزدیک دریائے سندھ پر واقع پل گزرگاہ کا کام دیتے ہیں۔ یہ دونوں راستے بند کر دیئے گئے تو پنجاب میں منشیات کے ذخیرے کم پڑ گئے۔ میانوالی کے ایس پی میاں محمد آصف اور اٹک کے ایس پی ناصر درانی نے اپنے جوانوں کا اس حد تک حوصلہ بڑھایا کہ انھوں نے دریائے سندھ کے کنارے واقع کئی خطرناک مقامات پر بھی سمگلروں کا پیچھا کر کے انھیں قانون

کی گرفت میں لے لیا۔

ایک واقعہ میں میانوالی کی ایک پولیس پارٹی نے جو صرف سپاہیوں پر مشتمل تھی' کرایہ کے مزدوروں کو گرفتار کرلیا۔ ان سے پوچھ گچھ کی اور انہیں اپنے سرپرستوں کے نام بتانے پر مجبور کردیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں 12 مزید باربردار پکڑے گئے جن سے بھاری کھیپ برآمد ہوئی۔ اس کے علاوہ سرگودھا میں ایک خفیہ ٹھکانہ پر چھاپہ مارا گیا۔ وہاں سے ہیروئن و حشیش کی بھاری مقدار کے علاوہ راکٹ لانچروں اور کلاشنکوفوں کا بھاری ذخیرہ برآمد ہوا۔ سرگودھا کے سیشن جج چوہدری افتخار احمد چیمہ نے ہر ملزم کو بیس سال قید بامشقت کی سزا سنائی اور مقدمات کا فیصلہ چند دنوں میں کردیا۔

راولپنڈی پولیس نے دو سمگلروں کو گرفتار کیا۔ دورانِ تفتیش انہوں نے لاہور' بھائی پھیرو' قصور' اوکاڑہ اور بہاولنگر میں اپنے اڈوں کا انکشاف کیا۔ اس کے ساتھ ہی 23 ٹھکانوں پر چھاپے مارے گئے تو ہتھیاروں اور ہیروئن کی بھاری مقدار برآمد ہوئی۔ سیشن ججوں نے مجرموں کو سزا سنانے میں بڑی مستعدی دکھائی اور ان میں سے بعض کو 60 سال سے بھی زیادہ مدت کی سزائے قید دی گئی۔ بدنام منشیات فروشوں کے ناقابلِ رسائی زیرِ زمین ٹھکانوں کا سراغ لگایا گیا۔ بدنام زمانہ ڈیلر مثلاً بھائی پھیرو کا شریفا اور اس کے بیٹے' اوکاڑہ کا سردار اور بہاولنگر کا شریف وٹو، سبھی پکڑ کر قانون کے حوالے کیے گئے۔ ان میں سے اکثر کے خلاف بہت سے مقدمات درج تھے اور وہ ضمانتوں پر تھے' لیکن اس دفعہ ججوں نے انہیں فوری طور پر سخت قسم کی سزائیں دے کر جیل بھجوا دیا۔

سمگلر انتہائی پریشان و حواس باختہ ہو گئے اور اس بات پر حیرت کا اظہار کرنے لگے کہ پولیس ان کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ پولیس کو منشیات کے خوفناک اثرات و نتائج سے آگاہ کر کے اس امر کی ترغیب دی گئی تھی کہ اس لعنت کا قلع قمع کرنے کے لیے اپنا اخلاقی اور قانونی فرض ادا کریں۔ عدالتوں میں بھی اس مسئلہ سے عام مسئلہ کی صورت میں نہیں نمٹا جا رہا تھا۔ موت کے سوداگروں کی سرپرستی کرنے والوں پر بھی کڑا وقت آ گیا تھا۔ اوکاڑہ کے ایس پی مرزا شمس الحسن نے اوکاڑہ کے بدنام ڈھکو خاندان اور شیخ خاندان کو اس کاروبار سے ہاتھ اٹھانے پر مجبور کردیا۔ وفاقی وزیر میاں زمان نے ان کی مدد کرنا چاہی مگر ان کی ایک نہ چلی۔ پھر انہوں نے وزیراعلیٰ سے ملاقات کی۔ انہوں نے مجھ سے اس ڈی ایس پی کا تبادلہ کرنے کو کہا جس نے شیخ فیملی کو گرفتار کیا تھا۔ جب میں نے انہیں معاملہ کے پس منظر اور حقیقی

صورتحال سے آگاہ کیا تو انہوں نے تبادلہ پر زور نہیں دیا۔ اس کے بعد میاں زمان وزیر اعظم کے برادرِ خورد شہباز شریف سے ملے۔ میں نے انہیں مجرم خاندان کے گھناؤنے کرتوتوں کے بارے میں بریف کیا تو وہ بھی میاں زمان کی مدد کرنے سے دستکش ہو گئے۔ آخر میں جب میری ہدایت پر میاں زمان کو منشیات فروشوں کی سرگرمیوں کی بابت تفصیل سے بتایا گیا تو ان کے لیے بھی مجرموں کی پشت پناہی سے علیحدگی اختیار کرنے کے سوا چارہ نہیں رہا۔

پولیس نے ضلع قصور میں ایس پی ظفر قریشی اور اے ایس پی ڈاکٹر شفیق کے زیرِ قیادت حیرت انگیز طریقہ سے مجرموں کا سراغ لگایا' انہیں گرفتار کیا اور چالان کر کے حوالہ زنداں کر دیا۔ سردار غلام فرید سیشن جج قصور نے منشیات کے اکثر سمگلروں کو عمر قید کی سزا سنائی۔

ظفر قریشی نے بعد ازاں ایس پی سیالکوٹ کی حیثیت سے محنتی و مخلص افسروں اور جوانوں کی مدد سے منشیات کی لعنت کا اپنے ضلع سے مکمل طور پر خاتمہ کر دیا۔ انہوں نے کھلا چیلنج دے دیا تھا کہ وہ اس شخص کو 10 ہزار روپے انعام دیں گے جو پورے ضلع میں ایسے مقام کی نشاندہی کرے گا جہاں ہیروئن ملتی ہو۔ قریشی نے زبردست دباؤ اور طرح طرح کی دھمکیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ تاہم مجرموں کے معاملہ میں ذرا بھی لچک پیدا نہیں کی۔ چیف جسٹس آف پاکستان اور لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس سیالکوٹ کے دورہ پر گئے تو انہوں نے ظفر قریشی کی کوششوں کو دل کھول کر سراہا۔

جرائم کی دنیا کے بعض کرتا دھرتا افراد نے جیل میں رہ کر بھی اپنے کارندوں کی مدد سے منشیات کا کاروبار جاری رکھا۔ یہاں تک کہ وہ موبائل ٹیلیفون بھی استعمال کرتے رہے۔ سپیشل برانچ کے ڈی آئی جی تنویر حمید نے ان کی بابت ضروری معلومات حاصل کر کے ہوم سیکرٹری چوہدری نذیر احمد کو پہنچائیں تو انہوں نے ان کی سرگرمیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے سخت اقدامات کیے۔

منشیات فروشوں پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پولیس کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ سپاہیوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنا فرض ادا کرتے ہوئے بلکہ فرض کی پکار سے تجاوز کر کے جرأت مندانہ انداز میں خون کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔ ملتان کے ڈی آئی جی میجر مشتاق اپنے کئی دلیر افسروں سے محروم ہو گئے' جنہوں نے ملتان' خانیوال' کبیر والہ اور ساہیوال میں ڈرگ مافیا کا مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ ڈی آئی جی عرفان محمود کے بھی متعدد بہادر افسر اور سپاہی مظفر گڑھ و ڈیرہ غازیخان میں

اس مہم کے دوران جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بہاولپور کے ڈی آئی جی رفیق حیدر کو بھی رحیم یار خان اور بہاولنگر میں خاصا جانی نقصان برداشت کرنا پڑا۔

بہرحال مسئلہ پر قابو پا لیا گیا۔ ہیروئن نایاب ہوگئی اور اس کے عادی ہر جگہ موت کے گھاٹ اترنے لگے۔ ہیروئن نہ ملنے کی وجہ سے صرف ایک دن میں اوکاڑہ میں 7' راولپنڈی میں 3 اور لاہور میں 27 نشئی مر گئے۔ ابتدا میں، میں کچھ زیادہ توجہ نہیں دے سکا کیونکہ میں نے اسے نیک کام سمجھا لیکن جب تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی تو یہ سنگین نتائج کا حامل انسانی مسئلہ محسوس ہونے لگا۔ بچارا نشئی ولن نہیں حقیقت میں شکار اور مظلوم ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے حکومت اور محکمہ صحت کے اعلیٰ حکام سے بات کی' وہ علاج کی سہولتیں فراہم کرنے میں متامل تھے۔ ڈاکٹروں اور ہسپتالوں نے اندازہ لگایا کہ اس منصوبہ پر کئی کروڑ روپے خرچ کرنے پڑیں گے۔ میں مخمصہ میں پڑ گیا۔ میرے لیے اس مہم کو جو بڑی محنت اور کوششوں سے شروع کی گئی تھی جاری رکھنا محال ہو گیا' ساتھ ہی مجھے مرنے والے بدنصیب نشہ بازوں کا بھی احساس تھا۔ پولیس والوں نے ازخود اس کا ایک حل ڈھونڈا۔ وہ انسانی ہمدردی میں اس حد تک چلے گئے کہ انہوں نے اپنے طور پر پولیس لائنوں اور پولیس ہسپتالوں میں ان نشہ بازوں کے لیے علاج کے مراکز قائم کیے۔ سپاہیوں نے ان کے لیے خون کے عطیات دیئے اور اپنی جیب سے خرید کر ادویات مہیا کیں۔ عوام نے پولیس کے نیک جذبہ کو سراہا اور عادی نشہ بازوں کے علاج و بحالی کے کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ انہوں نے دل کھول کر ادویات' فنڈز اور دیگر عطیات دیئے اور ہم سے بازی لے گئے۔ کچھ عرصہ بعد پولیس کے علاج مراکز لوگوں کی مدد سے خودکفیل ہو گئے۔ علاج مراکز کے قیام میں ڈپٹی کمشنر بڑے سرگرم اور معاون ثابت ہوئے۔ میں نے ایسے کئی ہسپتالوں کا دورہ کیا اور انسانیت کو انتہائی اذیت اور تکلیف کی حالت میں دیکھا۔ تاہم جب مجھے نشئی افراد کے والدین' بھائیوں یا بہنوں کی طرف سے شکریہ کے سینکڑوں خطوط موصول ہوئے تو دلی سکون محسوس ہونے لگا۔

اس مہم کی کامیابی کا وسیع پیمانہ پر چرچا ہوا۔ امریکہ کی ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی اور اقوامِ متحدہ کے افسروں نے جو منشیات کے کنٹرول کی نگرانی پر مامور تھے' مسرت کا اظہار کیا اور اس بے مثال کامرانی پر بڑے حیران ہوئے۔ انہوں نے نتائج کا بچشم خود ملاحظہ کرنے کے لیے کئی اضلاع کا دورہ کیا۔ امریکی سفیر اور قونصل جنرل اٹک سیالکوٹ اور قصور گئے اور پولیس کی کارکردگی کو سراہا۔ نارکوٹکس کنٹرول بورڈ کے

چیئرمین ملک محمد نواز اور سیکرٹری چوہدری نذیر احمد خصوصی طور پر تیر کے پاس آئے۔ نیز پرویز مسعود چیف سیکرٹری نے مہم کی کامیابی پر مبارکباد دی اور پولیس کی کارکردگی کو لائق تحسین قرار دیا۔ وفاقی وزیر برائے نارکوٹکس کنٹرول، رانا چندر سنگھ نے ایک خصوصی اجلاس بلایا۔ وہ ہماری کامیابی کا راز جاننا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہماری کامیابی کا سب سے بڑا سبب اس مسئلہ کی سنگینی سے صحیح آگاہی پیدا کرنا تھا۔ دوسرے اس کے خاتمہ میں پولیس، عدلیہ اور عوام کے مابین ہم آہنگی نے بڑا کام دکھایا۔



باب44

شہدائے امن

اوائل 1992ء میں فرض کے ساتھ سچی لگن اور جرأت کا ایک شاندار کارنامہ ظہور پذیر ہوا۔ 19 فروری کو ڈی ایس پی زمرّد وزیر آباد کے نزدیک جی ٹی روڈ اور چھوٹی کینال روڈ کے مقام اتصال پر نگرانی کر رہا تھا۔ جب اسے وائرلیس پر پیغام ملا کہ گوجرانوالہ میں ایک بینک لوٹ لیا گیا ہے اور ڈاکو فرار ہو گئے ہیں۔ اس نے فوراً ایک پارٹی آگے بھیج دی۔ تھوڑی دیر میں ایک کار چوک سے گزری۔ اس میں سوار افراد نے پولیس پارٹی کو دیکھ کر کلاشنکوفوں سے فائرنگ شروع کر دی۔ ڈی ایس پی کے سر میں گولی لگی جس کے نتیجہ میں وہ اندھا ہو گیا۔ تاہم اس نے بیہوش ہونے سے پہلے واقعہ کی اطلاع وائرلیس پر آگے بھیج دی۔ اس کے دو گن مینوں نے حملہ آوروں سے مقابلہ جاری رکھا اور گاڑی کے ٹائروں میں گولیاں مار کر اسے ناکارہ کر دیا۔ زخمی ڈی ایس پی کو فوراً گوجرانوالہ ڈسٹرکٹ ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔

اوجلہ کلاں کا معرکہ

وہ بدمعاش گاڑی سے اتر کر قریبی گاؤں اوجلہ کلاں (تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ) کے ایک ڈیرہ میں جا گھسے۔ انہوں نے وہاں موجود عورتوں اور بچوں کو یرغمال بنالیا اور مکانات کی دیواروں کے پیچھے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ گوجرانوالہ کی پولیس بھی جو پہلے ہی ان کے تعاقب میں روانہ ہوگئی تھی' اس خفیہ ٹھکانے پر پہنچ گئی۔ گوجرانوالہ کے ایس ایس پی ملک اقبال اور ان کے ایڈیشنل ایس پی خادم حسین بھٹی موقع پر پہنچ گئے۔ قریبی ضلع گجرات کے ایس پی مسعود بنگش نے بھی موقع پر پہنچنے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ ڈی آئی جی سید اظہر حسن ندیم نے آپریشن کی کمان خود سنبھال لی۔

بدمعاشوں کو دیواروں کی آڑ میسر تھی جبکہ پولیس والے کسی اوٹ کے بغیر تھے کیونکہ وہاں چپٹی زمین پر ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کی آڑ میں وہ پوزیشنیں لے سکتے۔ علاوہ ازیں یرغمالیوں کا معاملہ بھی پیش نظر تھا جو پولیس کو اپنے آپریشن میں غیر معمولی احتیاط برتنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ایسی صورت میں پولیس جلد بازی سے کام لیتی تو اسے بہت بڑا خطرہ مول لینا پڑتا۔ اگر حرکت نہ کرتی تو بدمعاشوں کے لیے راستہ کھلا تھا' وہ راہِ فرار اختیار کر سکتے تھے۔ گویا پولیس والے دوہری الجھن سے دوچار تھے۔

پولیس کے جوان راستہ میں حائل کڑی رکاوٹوں کے باوجود خطرہ مول لینے کو تیار ہوگئے خواہ انہیں جان کی بازی کیوں نہ لگانی پڑ جائے۔ ان کی حوصلہ افزائی کے لیے آس پاس کے دیہات سے سینکڑوں افراد اکٹھے ہوگئے۔ ان میں سے بعض کے پاس لائسنس یافتہ ہتھیار تھے۔ اظہر حسن ندیم کے لیے ان کے جوش و جذبہ کو کنٹرول کرنا محال ہوگیا۔

بدمعاشوں کی فائرنگ کے باعث پولیس والے اپنی اپنی پوزیشن پر لیٹ گئے۔ کوئی آڑ میسر نہ ہونے کے باوجود پولیس والے نہ صرف غیر محفوظ پوزیشنوں پر ڈٹے رہے بلکہ پیٹ کے بل پیش قدمی جاری رکھی۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کر سکتے تھے لیکن یرغمالیوں کی سلامتی کے پیشِ نظر محتاط تھے۔

مقابلہ بڑا زبردست خونیں اور ہولناک تھا۔ آٹھ گھنٹے کی لڑائی کے بعد آخرِ کار پولیس نے بدمعاشوں کو گھیرے میں لے لیا اور تمام یرغمالیوں کو بخیر و عافیت چھڑا لیا۔ ڈاکوؤں میں سے دو مارے گئے جبکہ تیسرا تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہوگیا تاہم اگلے 48 گھنٹوں کے دوران وہ بھی ایک اور

پولیس مقابلہ میں مارا گیا۔ پولیس کو بھی بھاری جانی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس کے آٹھ افسروں اور جوانوں نے جامِ شہادت نوش کیا جبکہ 23 شدید زخمی ہوئے۔ پولیس کے ساتھ شانہ بشانہ لڑتے ہوئے دو دیہاتیوں کو بھی گولیاں لگیں۔

مشن پایۂ تکمیل کو پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ میں رانا مقبول احمد' ڈی آئی جی لاہور اور چوہدری واجد علی خاں ایم پی اے کے ہمراہ تیزی سے گوجرانوالہ ڈسٹرکٹ ہسپتال پہنچا جہاں زخمی زیرِ علاج تھے۔ ڈپٹی کمشنر خوشنود لاشاری بذاتِ خود ان کے علاج معالجہ کی نگرانی کر رہے تھے۔ سینئر پولیس افسر بھی موقع پر موجود تھے۔

پولیس کے ساتھ لوگوں کا تعاون اور یک جہتی بڑی متاثر کن تھی۔ ہزاروں افراد ہسپتال میں جمع ہو گئے جو خون کے عطیات دے رہے تھے' دوائیاں فراہم کر رہے تھے اور ضرورت کی ہر چیز مہیا کر رہے تھے۔ بعض شہریوں نے شدید زخمی پولیس والوں کو لاہور کے ہسپتالوں میں پہنچانے کے انتظامات کیے۔ ہسپتال گلدستوں اور تحائف سے بھر گیا۔ وہ پولیس والوں کی جرأت و شجاعت کو سلام کر رہے تھے اور ان کے احساس فرض کو خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے۔ اظہر حسن ندیم اور ملک اقبال ہسپتال پہنچے تو ان کا ہیروز کی طرح استقبال کیا گیا۔ انہوں نے اپنے شاندار کارنامہ کی بدولت جو احترام حاصل کیا' وہ صاف نظر آ رہا تھا۔

شہریوں کے جذبات اور جوش و خروش دیدنی تھا۔ پولیس والوں نے اپنی جانوں اور خون کا نذرانہ دے کر لوگوں کے دل جیت لیے تھے۔ قانون نافذ کرنے والوں کی حیثیت سے ان کا اصل کردار پھر سے بحال ہو گیا۔ وہ معاشرہ کے حقیقی محافظ بن گئے۔ ان کے حوصلے بلند اور عزائم میں پختگی آ گئی۔

ایک عظیم روایت کی پاسداری

پولیس کی صفوں میں ہم آہنگی و یکجہتی نیز ٹیم سپرٹ قابل داد اور شاندار تھی۔ دو حقیقی بھائی انسپکٹر فاروق خاں اور سب انسپکٹر امان اللہ خاں اس لڑائی میں شریک تھے۔ فاروق اچانک گولی لگنے سے زخمی ہو گیا تو امان اللہ نے چاہا کہ اسے فوری طور پر ہسپتال پہنچائے مگر اسے روک دیا گیا۔ امان اللہ کی بجائے اس کے ساتھی زخمی کو لے گئے اور اسے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ ان میں سے 6 اس کوشش کے دوران بری

طرح زخمی ہوگئے۔ فاروق نے زخموں کی تاب نہ لا کر ہسپتال میں دم توڑ دیا جبکہ امان اللہ اس وقت تک محاذ پر ڈٹا رہا جب تک دشمن کو زیر نہیں کرلیا گیا۔ فاروق خاں نے مرتے وقت جو آخری سوال کیا وہ یہ تھا ''آیا یرغمالیوں کو بچالیا گیا ہے؟''

فاروق ایک عظیم روایت کو زندہ کر گیا۔ اس کا دادا اور والد پولیس میں ملازم رہ چکے تھے اور پانچ دوسرے بھائی بھی ملازمت کررہے تھے۔ اس کی والدہ نے جو بڑی نیک اور حوصلہ مند خاتون تھیں' جوان بیٹے کی میت دیکھ کر فخر کا اظہار کیا۔ روزنامہ مشرق کے نمائندہ کے ساتھ' جو فاروق کا گہرا دوست تھا' باتیں کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ''اگر میرے سارے بیٹے ملک کی خدمت کرتے ہوئے قربان ہوجائیں تو میں سمجھوں گی کہ میرا وعدہ پورا ہوگیا۔'' (اس عظیم خاتون کے چھ بیٹے تھے جو سب پولیس میں ملازم تھے) پھر وہ اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگئی اور اظہارِ تشکر کرنے لگی۔ جب رئیس قریشی نے لاہور ایئرپورٹ پر یہ واقعہ سنایا تو وزیراعظم نواز شریف سمیت بہت سوں کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں۔

اگلے دن ان عظیم شہدا کی گوجرانوالہ پولیس لائن میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی تو کئی رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ نمازِ جنازہ میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ ان کے ساتھ ساتھ وزیرِ اعظم' وزیراعلیٰ' چیف سیکرٹری پرویز مسعود' ہوم سیکرٹری چوہدری نذیر احمد' کمشنر کامران رسول اور دیگر بہت سے سینئر حکام موجود تھے۔ نماز کے بعد انہوں نے زخمی افسروں اور جوانوں کی عیادت کی۔ ان سب کے حوصلے بلند پا کر وزیراعلیٰ نے خوشی کا اظہار کیا۔

چیف سیکرٹری نے ڈی ایس پی زمرد خان کو بتایا کہ حکومت نے اس کے لیے بہت بڑا انعام منظور کیا ہے۔ زمرد نے' جواب بھی آنکھیں نہیں کھول سکتا تھا جواب دیا ''سر آپ کا بے حد شکریہ' میں ابھی زندہ ہوں' مجھے کسی انعام کی ضرورت نہیں براہ کرم ان غریب سپاہیوں کے لیے فنڈز کا بندوبست کریں جو اس لڑائی میں شہید ہوگئے ہیں یا زخمی ہوئے ہیں۔ آپ ان کے خاندانوں کی مالی امداد کریں' میں سمجھوں گا مجھے انعام مل گیا۔'' اپنے جوانوں کے لیے ایثار و قربانی کے اس جذبہ نے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا۔

عظیم جرأت کی زندہ مثالیں

جب ان قابلِ فخر اور درخشاں کارناموں کو پولیس کے جرائد اور قومی اخبارات میں نمایاں کر کے شائع کیا گیا تو عام پولیس والوں کا حوصلہ بڑھا اور انہیں ایسے کاموں کی ترغیب ملی۔ سچی بات یہ ہے کہ ان

دنوں پولیس کا مورال اور حوصلہ اس قدر بلند ہو گیا تھا کہ اب انہیں مجرموں کے مدِ مقابل لانے کے لیے کسی تحریک کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ بدمعاشوں پر ایسے جھپٹتے تھے جیسے عقاب چڑیوں پر۔ منظم اور وحشی مجرم جائے پناہ کی تلاش میں ادھر اُدھر بھاگ گئے اور پولیس ہر جگہ ان کا پیچھا کرتی پائی گئی۔

نماز کے بعد شہادت

ڈی ایس پی افتخار کھارا ابھی نمازِ عشاء سے فارغ ہوئے تھے جب انہیں بتایا گیا کہ ضلع شیخوپورہ کے بدمعاش باقر شاہ اور اس کے گروہ نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے اور ایک مسروقہ کار کی ڈگی میں اس کی لاش لے کر جا رہے ہیں۔ افتخار کھارا چند منٹوں میں ان کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔

کھارا نے چشم زدن میں فرار ہوتے ہوئے مجرموں کو جا لیا۔ اگر باقر شاہ کے کھاتہ میں قتل کی درجنوں وارداتیں درج تھیں تو کھارا بھی اس طرح کے 100 سے زیادہ مقابلوں میں حصہ لے چکے تھے۔ دونوں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ باقر اور اس کے ساتھی مارے گئے جس پر عوام نے سکھ کا سانس لیا۔ تاہم اس معرکہ میں افتخار کھارا کو بھی جان کی قربانی دینی پڑی۔ وہ اپنے گن مین شفقت سمیت شہید ہو گئے۔

ایسے دلیر جوان کی شہادت میرے لیے ذاتی صدمہ تھی۔ اس سے پولیس کے وقار میں اضافہ ہوا اور بدمعاشوں کی ہلاکت سے علاقہ کو سکون ملا۔ خیر و شر کے اس معرکہ میں آخرِ کار حق کی فتح ہوئی اور باطل سرنگوں ہو گیا۔

افتخار کھارا اولڈ راوین (گورنمنٹ کالج لاہور کے سابقہ طالب علم) اور مذہبی آدمی تھے۔ وہ معروف سائنسدان اور گورنمنٹ کالج (لاہور) کے شعبہ باٹنی کے سربراہ چوہدری سلطان علی کے لختِ جگر اور چوہدری سردار علی کے بھتیجے تھے جو ایس پی کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے دیانتداری و قابلیت میں بڑا نام پایا۔

”میں نے یہ سب کچھ پاکستان کے لیے کیا“

عید کے دن انسپکٹر نیازی اپنی ٹیم کے ساتھ منڈی بہاؤالدین کے نزدیک کینال روڈ پر گشت کر رہے تھے جب انہیں سامنے سے ایک کار آتی نظر آئی۔ کچھ شک پڑنے پر انہوں نے کار کو رکنے کا اشارہ

کیا۔ ادھر سے آناً فاناً گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ پولیس جیپ میں سوار ہر شخص گھائل ہوگیا۔ پولیس نے جوابی فائرنگ کر کے مجرموں میں سے ایک کو ہلاک کر دیا جبکہ دوسرے کار کو وہیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ایک زخمی ہیڈ کانسٹیبل نے جائے واردات پر ہی شہادت پائی۔ دیگر زخمیوں کو لوگوں نے ہسپتال میں پہنچایا۔ شبیر نیازی کو میو ہسپتال (لاہور) لایا گیا۔

میں ڈی آئی جی سید اظہر حسن ندیم کے ہمراہ شبیر نیازی کی عیادت کو گیا۔ وہ ہوش میں تھا اور اس کے حوصلے بلند تھے۔ وہ اپنے متعلق زیادہ پریشان نہیں تھا' البتہ شہید ہونے والے ہیڈ کانسٹیبل کے بارے میں گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ اس نے ہم سے یہ بھی پوچھا آیا ملزم گرفتار کر لیے گئے ہیں؟

''ہم تمہیں ترقی دیں گے اور بہت بڑا انعام بھی'' میں نے اسے بتایا۔ اس نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ پھر کہنے لگا ''سر یہ میرا فرض تھا۔ میں خوش ہوں کہ میں نے اپنا فرض خوش اسلوبی سے ادا کر دیا ہے۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میرے جوانوں میں سے کسی نے بھی پشت نہیں دکھائی۔ میں نے یہ سب کچھ پیارے وطن پاکستان کے لیے کیا' پروموشن کے لیے نہیں۔ آپ اللہ سے دعا کریں کہ مجھے شہادت کے مرتبہ پر سرفراز فرمائے۔'' میں اس کے جرأت مندانہ الفاظ سن کر بڑا متاثر ہوا۔ بظاہر وہ بالکل ٹھیک تھا۔

شام کے وقت اظہر ندیم نے فون پر اطلاع دی۔

''سر وہ شیر دل افسر اللہ کو پیارا ہوگیا ہے۔''

''لیکن وہ تو بالکل ٹھیک لگ رہا تھا' پھر یہ کیسے ہوگیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ اپنے رشتے داروں سے باتیں کر رہا تھا' جب اس نے آخری سانس لیا۔ موت کے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور شگفتگی تھی۔'' ندیم نے جواب دیا۔ اللہ نے اس کی دعا قبول کرتے ہوئے اسے شہادت کے رتبہ پر سرفراز کر دیا تھا۔

''خدا کا شکر ہے' میں نے اپنا فرض پورا کر دیا''

سپاہِ صحابہ سے وابستہ ایک بدمعاش سلیم فوجی جھنگ میں پولیس سے مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔ اس کے ساتھی غصہ سے پاگل ہوگئے۔ انہوں نے اپنے بہت سے رفقاء کو انتقام پر آمادہ کر لیا جیسے مرنے والا کوئی ولی اللہ یا بزرگ تھا۔ انہوں نے شہر میں زبردست جذباتی فضا پیدا کر دی۔ اہلِ تشیع ڈر کے مارے امام باڑہ میں جمع ہوگئے۔ مشتعل ہجوم نے ان کا گھیراؤ کر لیا اور انہیں زندہ جلانے کی دھمکیاں دینے لگے۔ پولیس گارڈ

اور حفاظتی دستے کی نفری بہت کم تھی۔ انہیں لگانا مصیبت میں پڑنے والی بات تھی۔ ایسی صورت میں امدادی دستوں کا کسی نہ کسی طرح پہنچنا اور محصور لوگوں کو بچانا ناگزیر ہو گیا' ورنہ بہت بڑا سانحہ رونما ہو جاتا۔

انسپکٹر عمر حیات وٹو نے جو کہ شیر دل افسر تھا' اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ بکتر بند گاڑی میں ہجوم کی طرف پیش قدمی کی تا کہ کمک کے طور پر آنے والے دستوں کے لیے راستہ بنایا جا سکے۔ بکتر بند گاڑی بڑے ہجوم میں پھنس گئی۔ لوگوں کے پاس ہر طرح کے ہتھیار تھے۔ وہ خوفزدہ اہلِ تشیع کو ہلاک کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ محصورین میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں اور معصوم بچے بھی تھے۔ ہجوم نے پسپائی اختیار کر کے دوبارہ صف بندی شروع کر دی' تاہم اس کے اشتعال میں خاصی کمی آ گئی تھی۔ اگر وٹو بروقت اور جرأت مندانہ قدم نہ اٹھاتا تو سارے محصورین مارے جاتے۔

مشتعل ہجوم اور اس کے غضبناک سرپرستوں کو اس وقت سخت مایوسی ہوئی جب شکار آخری لمحہ پر ان کے منہ سے چھین لیا گیا۔ انہوں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے پولیس کو نشانہ پر دھر لیا اور بکتر بند گاڑی پر راکٹ لانچر پھینکا' وہ راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ دو سپاہی موقع پر ہی شہید ہو گئے۔ باقی تین کو جو بری طرح جھلس گئے تھے' ہیلی کاپٹر کے ذریعے سی ایم ایچ کھاریاں پہنچایا گیا' ڈاکٹروں نے ان کی جانیں بچانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن وہ تینوں بھی یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

عمر حیات نزع کی حالت میں بھی محصور عورتوں اور بچوں کی بابت تشویش کا اظہار کرتا رہا۔ جب اسے بتایا گیا کہ انہیں بخیر و عافیت بچا لیا گیا ہے تو بے حد خوش ہوا۔ ''خدا کا شکر ہے میں اپنے فرض کی ادائیگی میں سرخرو ہو گیا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے ملک کو بدترین قسم کے شیعہ' سنی فسادات سے بچا لیا۔ انہوں نے پنجاب پولیس کی تاریخ میں اپنے خون سے ایک نیا اور شاندار باب رقم کیا۔

بدمعاشوں کے مقابلہ میں مردانگی

مجرموں کے خلاف لڑائی کے اور بھی بہت سے واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ سب انسپکٹر رانا الطاف کو شیخوپورہ میں حمام سے نکلتے ہوئے اس لیے شہید کر دیا گیا کہ وہ اپنے علاقہ میں منشیات کا دھندا کرنے سے روکتا تھا۔ اس کے جنازہ میں ہزارہا افراد نے شرکت کی جو مرحوم کو خراجِ تحسین پیش کرنے آئے تھے۔ علاقہ کے ہر دلعزیز شاعر امانت علی امانت نے اس کی شان میں ایک طویل نظم لکھی۔ اس کے اہلِ خاندان سے

تعزیت کرنے کے لیے خود نواز شریف ان کے گھر گئے۔ ضلع کے ایم این ایز اور ایم پی ایز بھی عقیدت و احترام کا اظہار کرنے کی غرض سے اس کے والدین کے پاس پہنچے۔

فیصل آباد میں چھ خطرناک مجرموں نے شہریوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ منشیات اور ناجائز اسلحہ کا کاروبار کرتے تھے جبکہ ان کے ساتھی ڈاکے مارتے اور لوگوں سے تاوان وصول کرتے تھے۔ وہ معزز خاندانوں کی خوبرو لڑکیاں اٹھا لیتے اور ان کے ساتھ زیادتی کرتے تھے۔ انہیں دن دہاڑے ایک شاندار مقابلہ میں، جس کی کمان ڈی آئی جی مرزا محمد علی اور ایس ایس پی کر رہے تھے، کیفرِ کردار تک پہنچا دیا گیا۔ شہریوں کی طرف سے ان کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں لوگوں نے ان کی خدمات کو دل کھول کر سراہا۔

جرأت و بہادری کے بہت سے انفرادی واقعات بھی ظہور پذیر ہوئے۔ میانوالی میں اے ایس آئی عبدالستار نے ڈرگ مافیا کے لیے دھندہ کرنا ناممکن بنا دیا۔ منشیات فروشوں نے گھات لگا کر عبدالستار کو شہید کر دیا۔ ڈی ایس پی عبدالحمید نیازی کا جس نے تن تنہا شہر کے بدمعاش زلفی کو جہنم رسید کیا تھا، فیصل آباد میں ایک ہیرو کے طور پر استقبال کیا گیا۔

بدمعاشوں کے ساتھ سینکڑوں قابلِ ذکر مقابلے ہوئے جن کے دوران بہت سے پولیس والوں نے جرأت مندی سے موت کو گلے لگایا اور ان میں سے سینکڑوں زخمی ہوئے تاہم کسی ایک نے بھی پیٹھ پر گولی نہیں کھائی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی بھاگ کر جان بچانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک فوجی سپاہی کے برعکس ایک پولیس والے کو ہمیشہ اس امر کی اجازت ہوتی ہے کہ مقابلہ کرے یا نہ کرے۔ وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے کی بجائے آسانی سے ادھر اُدھر کھسک سکتا ہے اور ایسا کرنے کی صورت میں مجرم ہمیشہ بڑے بڑے انعامات اور لالچ کی پیشکش کرتے ہیں، مگر یہ افسر اور جوان اپنے معاشرہ کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھے۔ وہ عزم و ہمت کا ایک شاندار باب رقم کر گئے۔

ہزاروں ڈاکو اور بدمعاش مارے گئے اور زخمی ہوئے جبکہ بہت سے روپوش ہو گئے۔ تاہم پولیس کو بھی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ معاشرہ کے دشمنوں کے خلاف لڑنے والے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے عزت و احترام حاصل کر رہے تھے۔ ان میں سے چند ایک کے نام جو حافظے کی لوح پر محفوظ رہے، حسب ذیل ہیں۔ سلطان احمد گارڈ، اعجاز حسین شاہ، ظفر اقبال، نصر اللہ، چوہدری عمر حیات، زاہد مراد، افضل، عبدالحمید،

موسیٰ خاں اور غلام حسین۔ انہوں نے امن کے لیے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

تقریری مقابلے

ہمایوں شفیع' اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل ٹریننگ نے تجویز پیش کی کہ زیرِ تربیت نوجوانوں کے مابین ان پولیس والوں کی بہادری اور ہیروازم پر تقریری مقابلے کرائے جائیں جنہوں نے ادائے فرض کے دوران اپنی جانیں جانِ آفرین کے سپرد کر دیں۔ انہوں نے ایک منصوبہ تیار کیا پھر اے حمید کی مدد سے اسے بہتر اور جامع بنایا۔ اس کے بعد تمام یونٹوں' ضلعوں' رینجوں اور صوبہ کی برانچوں میں تقریری مقابلے کرائے گئے۔ آخری مقابلہ گوجرانوالہ میں ہوا جس میں صوبہ بھر کے نچلی سطح پر جیتنے والوں نے حصہ لیا۔

مختلف مقابلوں میں جو پُرجوش اور ایمان افروز تقریریں کی گئیں' جنہیں ہزارہا پولیس والوں نے سنا۔ ان میں شہدائے پولیس کی دلیری و عزم و ہمت کی داستانیں بیان کی گئیں۔ جس سے فورس میں جذباتی فضا اور پاکیزہ جذبات پیدا ہوئے۔ بہت سے لوگوں کے لیے پولیس والوں کی نفسیات پر مرتب ہونے والے شریفانہ اثرات کے بارے میں تصور کرنا بھی محال ہو گیا۔ بہت سے مقامات پر انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ انعامات کی توقع سے بے نیاز ہو کر جرائم اور مجرموں کے خلاف جہاد کریں گے اور اسلامی احکام اور اپنے ضمیر کی پیروی کریں گے۔ اکثر جیتنے والوں نے انعام کی رقم شہید فنڈ میں دے دی جس میں سے شہداء کے پسماندگان کو مالی امداد دی گئی۔

تقریری مقابلہ کو ایک مستقل فیچر کے طور پر متعارف کرایا گیا جس کے لیے اے حمید نے تفصیلی ہدایات مرتب کیں۔ بہترین تقریروں میں سے متعدد پولیس جرائد میں شائع ہوئیں۔ ان کی ویڈیو ٹیپ تیار کی گئیں اور پولیس لائنوں میں ٹیلیویژن سیٹ پر بار بار دکھائی گئیں۔

جن لوگوں نے وہ جرأت مندانہ مقابلے خود دیکھے تھے اور شاعرانہ طبیعت رکھتے تھے' انہوں نے بڑی اثر انگیز نظمیں اور ترانے لکھے۔ ان میں سے ڈی آئی جی سید اظہر حسن ندیم کا کلام بہترین پایا گیا۔ بعض نظمیں ممتاز گلوکاروں نے کسی معاوضہ کے بغیر ریڈیو اور ٹی وی پر سنائیں۔ پولیس لائنوں میں آڈیو ویڈیو کیسٹیں دکھائی گئیں۔ پولیس بینڈ نے بعض سریلی دھنیں تیار کیں جو مختلف مواقع پر اپنے جری ساتھیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے وقت بجائی گئیں۔

خادم حسین بھٹی ایڈیشنل ایس پی گوجرانوالہ نے جرأت مندانہ مقابلوں سے متاثر ہو کر اس موضوع پر خوبصورت نظمیں لکھیں۔ انہوں نے بذاتِ خود ایسے مقابلوں میں کئی بار موت کا سامنا کیا اور جوانوں کو بڑی ثابت قدمی سے جانیں قربان کرتے دیکھا۔ ان کا پنجابی کلام براہ راست دل پر اثر کرتا اور لوگوں کو بہادری کا بلند ترین مقام حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

شہدا کی یاد میں

اوجلہ کلاں کے معرکہ کے شہدا اور زخمی ہونے والوں کی تعداد پولیس کی تاریخ میں سب سے زیادہ تھی۔ میں نے ان کی عظیم قربانی کی یاد منانے اور انہیں دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بنانے کی غرض سے اعلان کر دیا کہ ہر سال 19 فروری کو ''پولیس ڈے'' منایا جائے گا۔ 1993ء میں آغاز کے طور پر اس دن پولیس کے شہیدوں کی بابت تقریری مقابلوں کا آخری راؤنڈ ہوا۔ میں نے ہدایات جاری کر دیں کہ اس روز پولیس کے دستے خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے تقریباتی وردی میں اپنے ضلع کے شہداء کی قبروں پر جائیں اور فاتحہ خوانی کریں۔ عید الفطر کے روز سینئر افسر شہیدوں کے گھر جائیں اور ان کے بچوں کو مناسب تحفے تحائف پیش کریں۔ اس طرح کے دورے بہت مفید ثابت ہوئے۔ پورا محلّہ بلکہ گاؤں اس کو اپنے لیے موجب افتخار سمجھتا اور شہیدوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اکٹھا ہو جاتا تھا۔ جس سے نہ صرف ان کے اہلِ خانہ کو تسکین ملتی بلکہ پولیس فورس کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

''زندہ جاوید'' کے لیے پوری تنخواہ

نواز شریف نے بحیثیت وزیرِ اعلیٰ پولیس کے ہر شہید کے خاندان کے لیے تین لاکھ روپے اور شدید زخمی ہونے کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے کی منظوری دی۔ غلام حیدر وائیں نے اعلان کیا کہ ہر شہید کے خاندان کو اس کی ریٹائرمنٹ کی تاریخ تک پوری تنخواہ دی جائے گی جو وہ زندہ رہنے کی صورت میں وصول کرتا۔ ان کا یہ فیصلہ لائق ستائش تھا۔ انہوں نے ڈسٹرکٹ پولیس لائن لاہور میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''قرآن حکیم کے مطابق شہید کو مردہ نہیں کہنا چاہیے' اگر وہ زندہ ہے تو ہم اس کی تنخواہ کیسے بند کر سکتے ہیں۔''

ڈسٹرکٹ شہید فنڈ

موت خواہ کیسی ہی شاندار اور لائق افتخار ہو' پسماندگان کے لیے مالی مشکلات کا سبب بن جاتی ہے۔ ضلع بھر کے پولیس والے ایک دن کی تنخواہ شہید کے خاندان کے لیے شہید فنڈ میں جمع کراتے تھے۔ میں نے فوری امداد بہم پہنچانے کی خاطر فیصلہ کیا کہ ہر ضلع میں مستقل طور پر شہید فنڈ قائم کیا جائے۔ ڈپٹی کمشنروں نے دیگر محکموں کے تعاون سے شہید فنڈ کے لیے فراخ دلی سے عطیات دیئے۔ ضلع کونسل' میونسپل کارپوریشن' میونسپل کمیٹی' ایوانِ صنعت وتجارت' تجارتی انجمنوں اور دیگر اداروں نے بھی فنڈ میں کثیر رقوم جمع کرائیں۔ پوری قوم ان جانبازوں کو عزت دینے کی خواہاں تھی جنہوں نے لوگوں کی جان' مال اور آبرو کے تحفظ کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دیں۔

شہداء کی یادگاریں

پولیس والوں کے دلیرانہ کارناموں کی یاد منانے کے لیے مختلف شہروں کی پولیس لائنوں میں یادگاریں تعمیر کی گئیں نیز بیرکوں اور عمارتوں کو ان کے نام سے منسوب کیا گیا۔ بلدیاتی اداروں نے سڑکوں اور عمارتوں کے نام ان کے نام پر رکھ دیئے۔ دریائے راوی کے پل کے نزدیک بڑی سڑک کو ڈی ایس پی اکرام اللہ نیازی سے منسوب کیا گیا۔ گوجرانوالہ میں شہدا کی بڑی بڑی پینٹنگز تیار کر کے اہم چوراہوں میں آویزاں کر دی گئیں۔

پنجاب کابینہ نے فیصلہ کیا کہ شہید کے ایک قریبی رشتہ دار کو' جو اس کے ورثاء کی کفالت کر سکے' فوری طور پر پولیس میں بھرتی کیا جائے گا۔ کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں نے شہداء کے خاندانوں کو زرعی زمین اور رہائشی پلاٹ الاٹ کرنے میں گہری دلچسپی لی۔ انہوں نے شہدا کے بچوں کی معقول اور مفت تعلیم کے لیے بھی ٹھوس اقدامات کیے۔ گوجرانوالہ میں ایک شہید کی بیوہ اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتی تھی' کمشنر کامران رسول نے ان بچوں کو ڈویژنل پبلک سکول میں پڑھائی کا مستقل بندوبست کر دیا۔

عوامی نمائندوں کی طرف سے خراجِ عقیدت

پولیس کے جری افسروں اور جوانوں کی فرض سے لگن اور عظیم قربانیوں کو قومی اسمبلی اور پنجاب

اسمبلی کی طرف سے زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ وہ منظر بڑا متاثر کن تھا جب پیپلز پارٹی کے رہنما اور پنجاب اسمبلی میں قائدِ حزبِ اختلاف رانا اکرام ربانی نے پولیس کی جرأت و فرض شناسی کو شاندار خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک قرارداد پیش کی‘ جو اتفاقِ رائے سے منظور کر لی گئی۔ نہ صرف حکمران جماعت بلکہ پورے ایوان نے پولیس کی خدمات کو سراہا جو اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ پولیس قیامِ امن و امان اور لوگوں کی خدمت کرنے میں کسی امتیاز یا سیاسی تعصب کو خاطر میں نہیں لاتی۔ حقیقت میں پولیس کی طرف سے انصاف‘ مساوات اور غیر جانبداری کی شاندار روایت کو قائم رکھنے میں جس انصاف پسندی کا مظاہرہ کیا گیا وہ قابلِ تحسین تھا۔ وہی پولیس جس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ قانون کی حکمرانی قائم رکھنے کے لیے کام کرے گی‘ کسی آمر کی حکومت برقرار رکھنے کے لیے نہیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ اس نازک موقع پر نواز شریف اور غلام حیدر وائیں جیسے لیڈر حکمران تھے‘ جو قانون کی بالادستی قائم رکھنے کا حوصلہ اور اس پر یقین رکھتے تھے۔ وہ آئین کو توڑنے والے آمروں اور خوفناک جاگیرداروں کے برعکس کسی گھمنڈ کو قانون و شرافت سے بالاتر ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔



باب45

بینظیر کا ناکام لانگ مارچ

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن اور قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کی قائد بے نظیر بھٹو دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں لیکن مستقبل قریب میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ نواز شریف حکومت کی مدت پوری ہونے اور نئے انتخابات کے انعقاد تک انتظار کرنے کو تیار نہیں تھیں۔

انہیں اچانک کچھ اُمید دلائی گئی اور 10 نومبر 1992ء کو انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ آٹھ دن بعد اسلام آباد کی طرف لانگ مارچ کی قیادت کریں گی۔ یہ اعلان ہر ایک کے لیے حیران کن تھا کیونکہ ملک میں کوئی سیاسی خلفشار اور بے چینی نہیں تھی جو ایسے اقدام کا جواز بن سکتی۔ اس کے علاوہ اتنا بڑا اقدام اٹھانے کے لیے ایک ہفتہ کی مدت قطعاً کافی نہیں تھی۔ سی او پی اور آئی جے آئی کے اجزائے ترکیبی نواز شریف سے اختلاف کر کے الگ ہو گئے تھے' پھر بھی وزیرِ اعظم کو قومی اسمبلی میں غالب اکثریت حاصل تھی۔ سیلاب کے دوران انہوں نے جس لگن اور محنت سے کام کیا اور بذاتِ خود تمام متاثرہ علاقوں میں گئے اور لوگوں کے مسائل حل کیے' اس نے انہیں اور بھی مقبول بنا دیا تھا۔

ہمیں اس قسم کی اطلاعات ملیں کہ لانگ مارچ کا اشارہ طاقتور حلقوں کی طرف سے دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ملیحہ لودھی معروف صحافی اور انگریزی روز نامہ ''نیوز'' (اسلام آباد) کی ایڈیٹر کے متعلق خبر ملی کہ انہوں نے چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز کے ساتھ بڑا قریبی تعلق پیدا کر لیا ہے۔ وہ بے نظیر بھٹو کے بھی بہت قریب تھیں۔

پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ نے بے نظیر کی کال پر غور و خوض کرنے کے لیے ایک اجلاس بلایا' جس میں

شہباز شریف' چوہدری پرویز الٰہی' ارشد لودھی وغیرہ کے علاوہ چیف سیکرٹری' راقم الحروف اور سپیشل برانچ کے ایڈیشنل آئی جی بھی شریک ہوئے۔

بینظیر کی کال ہر ایک کے لیے ایک معمّہ بنی ہوئی تھی۔ اجلاس میں اس بات پر اتفاقِ رائے تھا کہ لوگ احتجاج کے موڈ میں نہیں ایسی صورت میں اچانک احتجاج کی کال کیوں دی گئی ہے؟ مجھ سے رائے مانگی گئی تو میں نے کہا کہ ''یہ اقدام مایوسی کا نتیجہ لگتا ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق بے نظیر اُمید سے ہیں۔ ان کے شوہر گزشتہ دو سال سے جیل میں ہیں۔ انہیں یہ بات بہت چبھ رہی ہے کہ ان کے ہاں بچہ ہونے والا ہے جبکہ ان کے شوہر پابندِ سلاسل ہیں۔ اگرچہ زرداری کو جب وہ قومی اسمبلی کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے اسلام آباد جاتے تھے' بے نظیر کے ساتھ وقت گزارنے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ پھر بھی بے نظیر کو پختہ یقین تھا کہ ان کے شوہر کو دو سال پورے کرنے کے بعد' جبکہ ضمانت منظور کرنا لازمی ہو جاتا ہے' رہا کر دیا جائے گا۔ لیکن حکومت نے وہ قانون بدل دیا تھا۔ وہ اس وقت بھی جیل میں تھے اور بے نظیر کو ''سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ لوگوں کے سامنے اپنے حاملہ ہونے کی کیا تاویل پیش کریں۔ میرے خیال میں اگر ان کے شوہر کو وقت پر رہا کر دیا جائے تو صورتحال بدل جائے گی۔''

میرا یہ تجزیہ سن کر سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے دوبارہ کہا ''میں مذاق نہیں کر رہا۔'' اس کے بعد وائیں صاحب چیف سیکرٹری کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا: ''ایسی خبریں صرف چوہدری سردار کے پاس ہوتی ہیں۔'' میں نے بے نظیر کے حاملہ ہونے سے متعلق خبر کی صداقت پر اصرار کیا اور زور دے کر کہا ''میں آئی جی ہوں' آپ کو میری خبر پر یقین کرنا پڑے گا۔'' تاہم اجلاس میں میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔

احتجاج کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد وزیرِ اعلیٰ نے فیصلہ کیا کہ اس سے قانون اور زمینی حقائق کے مطابق نمٹا جائے گا۔ صورتِ حال کی بابت ہمارا قیاس تھا کہ لوگوں سے جوش و خروش یا تشدد کا کوئی امکان نہیں۔ اگر پی پی پی نے واقعی تشدد کا راستہ اختیار کیا تو مقامی انتظامیہ ضروری کارروائی سے گریز نہیں کرے گی۔

''یہ محض ایک جلوس ہوگا''

اگلے دن وزیرِ اعظم کے زیرِ صدارت گورنر ہاؤس (لاہور) میں ایک اجلاس ہوا۔ شرکا میں گورنر، وزیرِ اعلیٰ، پنجاب، اسلام آباد انتظامیہ کے متعلقہ افسر، بعض وفاقی وزرا (لالیکا، چوہدری شجاعت، شیخ رشید) آئی بی کے ڈائریکٹر نیز آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل شامل تھے۔

آئی بی کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر امتیاز احمد نے اپنے تجزیہ میں اس طرح کی مایوس کن تصویر پیش کی جیسے کوئی حملہ آور فوج حرکت میں آنے والی ہو۔ انہوں نے شرکائے اجلاس کو بتایا کہ پی پی پی کے ہجوم پوری طرح تیاری کر کے آئیں گے اور مسلح حالت میں ہونگے۔ اگر انہیں اسلام آباد میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی تو وہ ایوانِ صدر، وزیرِ اعظم ہاؤس، پارلیمنٹ ہاؤس، ٹیلیویژن سنٹر اور ریڈیو سٹیشن پر قبضہ کر لیں گے۔ آئی ایس آئی کے ڈی جی لیفٹیننٹ جنرل جاوید ناصر نے محاصرہ کی مذکورہ حالت کو مزید پریشان کن انداز میں بیان کیا اور تجویز پیش کی کہ لیاقت باغ میں ہونے والے جلسۂ عام پر پابندی لگا دی جائے نیز سرحد سے آنے والے جلوس کو اٹک کے پل پر اور شمالی پنجاب کی طرف سے آنے والوں کو جہلم میں روک لیا جائے۔ وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ پی پی پی کے جلوس کو ہر شہر میں روانہ ہونے سے پہلے منتشر کرنے کا مشورہ دے دیا جائے۔ یہ نہیں سوچا کہ ایسا قدم اٹھانے میں ملک میں کتنا تصادم جنم لے گا اور کس قدر خلفشار پھیلے گا۔ دونوں افسر سیاسی حرکیات (Dynamics) سے قطعی بے خبر تھے۔

نواز شریف بحیثیت وزیرِ اعلیٰ اس طرح کے بہت سے واقعات کا حوصلہ کے ساتھ سامنا کر چکے تھے لیکن ڈائریکٹر آئی بی اور ڈی جی، آئی ایس آئی نے معاملہ کی بڑے بھیانک انداز میں منظر کشی کی۔ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں وزیرِ اعظم کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں۔ اسلام آباد کی انتظامیہ بھی بری طرح خوفزدہ لگتی تھی جیسا کہ اسلام آباد کے آئی جی جہانزیب برکی کی باتوں سے اندازہ ہوا۔

ناچار میں نے بولنے کی اجازت حاصل کر کے اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا، میں نے کہا:

''میرے خیال میں ہمارا قیاس اس وقت غلط ہو جاتا ہے جب لانگ مارچ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ جس سے بے پناہ خوف و ہراس وابستہ ہوتا ہے۔ اس کی بجائے اگر ہم اسے جلوس کا نام دے دیں تو سارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ حقیقت میں وہ ایک جلوس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔ میاں صاحب! آپ 1986ء سے حزبِ اختلاف کے جلوسوں کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی اجازت دیتے رہے ہیں۔ براہ کرم اس جلوس کے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ کریں، مزید برآں آپ جمہوری نظام میں اس قسم کی سرگرمی پر

پابندی نہیں لگا سکتے۔ آج کل مارشل لا کا دور نہیں۔ جنرل جاوید ناصر کا پیش کردہ ملٹری پلان قطعاً کام نہیں دے سکتا۔ آپ ایک سیاستدان ہیں' آپ کو سیاسی فیصلہ کرنا چاہیے۔ انہیں پارلیمنٹ ہاؤس تک جانے دیں' اگر انہوں نے توڑ پھوڑ کی تو آپ ان کے خلاف حسبِ ضرورت طاقت استعمال کر سکتے ہیں بلکہ فوج طلب کر سکتے ہیں۔ بہر حال ان کے اس اقدام کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہوگی' وہ زیادہ سے زیادہ پارٹی کارکنوں کا شو بن سکتا ہے۔ اس لیے میں دوبارہ التماس کرتا ہوں' اسے لانگ مارچ نہ کہیں' یہ محض ایک جلوس ہوگا۔ اگر اسے پارلیمنٹ کی عمارت تک جانے کی اجازت دے دی جائے تو کوئی قیامت نہیں آئے گی۔''

تمام وزراء نے مجھ سے اتفاق کیا۔ چوہدری شجاعت نے صحیح معنوں میں سیاسی انداز میں یہ تجویز پیش کی کہ حکومت کو شرکائے جلوس کی مفرحات سے تواضع کرنی چاہیے لیکن جمشید برکی' سیکرٹری داخلہ اور جہانزیب برکی' آئی جی اسلام آباد بہت سہمے ہوئے اور خوفزدہ تھے' وہ معمولی سا خطرہ بھی مول لینے کو تیار نہیں تھے۔ ان کا مشورہ یہ تھا کہ کسی کو بھی اسلام آباد میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے' پنجاب کی ساری پولیس ان کے تصرف میں دے دی جائے۔ میں نے ساری فورس فراہم کرنے کی پیشکش کر دی۔

چیف سیکرٹری مسعود پرویز ان سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے۔ انہوں نے یہ انوکھی تجویز پیش کی کہ پنجاب اور اسلام آباد کی انتظامیہ کو ایک سمجھا جائے اور اُسے جلوس سے نمٹنے کی ذمہ داری سونپ دی جائے۔ وہ محض مدد کرنے کے لیے اصل راہ سے ہٹ رہے تھے اور خوش اسلوبی سے انتظام چلانے کی ذمہ داری اپنے سر لے رہے تھے' تاہم جمشید برکی نے مداخلت کی اور اسے اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز قرار دیا۔ اسلام آباد کے کمشنر سعید مہدی واحد افسر تھے جنہوں نے ہمارے ساتھ اتفاق کیا۔ انہوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر جلوس کی اجازت دینی ہو تو انتظامات کے بارے میں پی پی پی کی مقامی قیادت کے ساتھ تبادلۂ خیال کر لیا جائے۔

وزیراعظم حکومتِ پنجاب کی اس تجویز سے اصولی طور پر متفق تھے کہ لیاقت باغ میں جلسۂ عام اور اس کے بعد 18 نومبر کو جلوس نکالنے کی اجازت دے دی جائے۔ تاہم قطعی فیصلہ وزیرِ داخلہ پر چھوڑ دیا گیا۔ جو صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ اور آزاد کشمیر کے وزیراعظم کو اعتماد میں لیں گے کیونکہ ان دونوں علاقوں سے جلوس آنے والے تھے۔ انہوں نے یہ ہدایت بھی جاری کر دی کہ ریڈیو اور ٹی وی پر لانگ مارچ کی اصطلاح استعمال نہ کی جائے۔

بیوروکریٹ سیاستدانوں پر غالب آ گئے

سیکرٹری داخلہ، ڈائریکٹر آئی بی اور ڈی جی، آئی ایس آئی نے چوہدری نثار علی اور ملک نعیم جیسے سخت مؤقف رکھنے والوں کو اس حد تک پمپ کیا کہ اگلے اجلاس میں ہمیں بولنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ ڈائریکٹر آئی بی مسلسل اور روانی سے بولتے رہے، ناچار وزیرِ داخلہ چوہدری شجاعت حسین کو ہاتھ اٹھا کر یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ''اسلام آباد پر حملہ ہونے والا ہے۔''

اسی طرح فوجی افسر جو انٹیلی جنس چیفس کی حیثیت سے انتہائی اہم عہدوں پر کام کر رہے تھے، بے بنیاد خوف و ہراس پیدا کر کے وزیرِاعظم کو تصادم کی راہ پر ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مارشل لا کا اعصابی خلل عود کر آیا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں اس حد تک کامیاب ہو گئے کہ نواز شریف کی خود اعتمادی کو متزلزل کر دیا۔ یہ ان کی اتنی بڑی کامیابی تھی کہ میرے علم کے مطابق گزشتہ 6 برسوں کے دروان بیوروکریسی کو کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ وہ سب سے بڑا نقصان تھا جو انہوں نے حکومت کو پہنچایا۔ مجھے ان کی حالت پر اس وقت ترس آیا، جب انہوں نے اجلاس کے دوران ہی اس فیصلہ کا اعلان کر دیا کہ جلسہ عام اور جلوس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس قسم کا فیصلہ ان کے اور جمہوریت کے حق میں نیک شگون نہیں تھا۔

غلام حیدر وائیں نے لاہور میں ایک میٹنگ کی اور معاملہ سے حکمت اور نرمی کے ساتھ نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ طے پایا کہ راولپنڈی میں دفعہ 144 نافذ کر دی جائے اور وفاقی حکومت کے فیصلہ کی روشنی میں لیاقت باغ کے مجوزہ جلسۂ عام پر پابندی لگا دی جائے۔ بعض دوسرے اضلاع میں بھی اسی طرح کی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بہر حال ضلعی انتظامیہ اور پولیس کو ہدایت کی گئی کہ جلوسوں سے صرف نظر کیا جائے اور پی پی پی کے کارکنوں کو، اگر قیامِ امن و امان کے لیے انہیں عارضی طور پر حراست میں لینا پڑے، فوراً رہا کر دیا جائے۔

دوسری طرف اسلام آباد کی انتظامیہ نے انتہائی سخت فیصلہ کر لیا جو اناڑی پن کا مظہر تھا۔ غیر ملکی ٹیلیویژن سٹیشنوں نے ایسی تصویریں دکھائیں جن میں پولیس کو بے نظیر بھٹو اور غلام مصطفیٰ جتوئی پر لاٹھی چارج کرتے دکھایا گیا تھا۔ ایسا کرنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ ان کو روکنے کی ساری کوششیں دھری رہ گئیں اور وہ راولپنڈی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں ڈی آئی جی حبیب اللہ نیازی بڑی نرمی اور حکمت

عملی کے ساتھ انہیں انہی کی گاڑی میں بٹھا کر گیسٹ ہاؤس چھوڑ آئے۔ جمہوری حکومت کی محض اس لیے بدنامی ہوئی کہ ناتجربہ کار افسروں نے صورتحال کے بارے میں غلط قیاس آرائی کر کے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ ایسا محسوس ہوا کہ اسلام آباد کی انتظامیہ سول امور سے نمٹنے یا سیاسی معاملات طے کرنے کی اہل نہیں تھی۔

اس کے برعکس پنجاب میں پی پی پی کے لیڈروں سے اس قدر اچھا سلوک کیا گیا کہ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ گوجرانوالہ میں پولیس نے نصرت بھٹو، جہانگیر بدر، غلام مصطفیٰ کھر اور اعتزاز احسن کو گرفتار کر کے ایک ریسٹ ہاؤس میں پہنچا دیا اور ایسے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا کہ اعتزاز احسن، ڈی آئی جی سید اظہر حسن ندیم سے یہ سوال پوچھے بغیر نہیں رہ سکے کہ وہ ان کے ساتھ ایسی خوش اخلاقی سے کیوں پیش آرہے ہیں؟ اظہر نے جواب دیا کہ یہ سب کچھ محض عام اخلاق کے تحت کیا جا رہا ہے۔ لیکن اعتزاز نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ پولیس وہ سب کچھ اپنے طور پر کر رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں جنرل آصف نواز نے تم لوگوں کو ایک طلسم میں گرفتار کر رکھا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ سید اظہر نے انہیں یقین دلانے کی ہر چند کوشش کی کہ انہیں کسی طرف سے آنے والی ہدایات کا کوئی علم نہیں۔ میں یہ سب کچھ محض اپنا فرض ادا کرنے کی غرض سے کر رہا ہوں۔''

''نہیں نہیں، ایسی بات قطعی نہیں ہے۔'' اعتزاز نے اصرار کیا۔

''میں جانتا ہوں یہ ہدایات کہاں سے آرہی ہیں۔ نومنتخب صدر کلنٹن نے بھی تمہیں خبردار کیا ہے کہ ہمیں کچھ نہ کہا جائے اور آصف نواز بھی قطعاً برداشت نہیں کریں گے کہ ہمیں کوئی گزند پہنچے۔''

اس کے بعد پی پی کے قائدین مخصوص انداز میں کہنے لگے:

''ہم برسر اقتدار آنے کے بعد ان افسروں سے پورا پورا حساب لیں گے جنہوں نے ہمارے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔''

سید اظہر نہیں جانتے تھے کہ ان کی غلط فہمی کیسے دور کی جائے۔ تاہم اگر پی پی کے اتنے بڑے لیڈر کو یہ یقین تھا کہ آرمی چیف اور امریکہ کے نومنتخب صدر ان کی حمایت اور ہمدردی کر رہے ہیں تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ''لانگ مارچ'' کا اشارہ کس طرف سے ہوا تھا۔

ہم نے پنجاب میں طے کر لیا تھا کہ قانون اور حکمت و دانش مندی کے تقاضوں پر عمل کریں

گے۔ صرف وہاں کارروائی کی گئی جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا۔ پولیس کو ہدایات دے دی گئی تھیں کہ "ٹرین مارچ" اور "روڈ مارچ" میں کوئی مداخلت نہ کریں۔ چھوٹے چھوٹے ہجوم اپنی راہ پر گامزن تھے بہت سے مقامات پر پولیس کو تعینات ہی نہیں کیا گیا۔ میرے قیاس کے مطابق بی بی کی کال کا لوگوں کی طرف سے بھرپور جواب نہیں ملا' اس لیے ہم نے پولیس کا وقت اور توانائی ضائع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ادھر چوہدری نثار اور جمشید برکی نے زبردست خفت محسوس کی اور اس بات پر وزیراعظم کی "برہمی" سے مطلع کیا کہ ہم نے پی پی پی کے ساتھ نرمی کیوں برتی؟ میں نے جواب دیا کہ ہم وزیراعظم سے خود بات کرلیں گے اور ایئرپورٹ پر ان سے ملاقات کی تو میاں صاحب نے اس بات کی تردید کی کہ وہ نرمی برتنے پر ہم سے ناراض ہیں۔ انہوں نے پرویز مسعود سے کہا کہ "مجھے تمہاری صلاحیت پر مکمل اعتماد ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ حالات کے مطابق صورتحال کا سامنا کریں۔"

نام نہاد لانگ مارچ کا پُرجوش جواب نہیں ملا۔ پنجاب کی انتظامیہ نے وزارتِ داخلہ اور چوہدری نثار علی کے دباؤ کے باوجود معاملہ کو نرمی اور خوش اسلوبی سے ہینڈل کیا۔ لاہور میں بعض شرکائے جلوس نے پنجاب اسمبلی پر ہلہ بول دیا۔ اس کے دو دروازوں کو آگ لگا دی' تب بھی نہ کوئی لاٹھی چارج کیا گیا نہ طاقت استعمال کی گئی۔ سپیکر منظور احمد وٹو بے حد پریشان اور برہم تھے۔ انہوں نے میرے ساتھ گفتگو میں بڑی ترش روئی سے کام لیا' تاہم میں نے غیر ضروری کارروائی کرنے سے انکار کر دیا۔

جلوس کے منتظمین چاہتے تھے کہ ان کا کچھ جانی نقصان ہو یا انہیں مشتعل کیا جائے۔ مگر ہم نے ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دی' پنجاب حکومت نے بڑی دانشمندی سے معاملہ کو نمٹایا' اگرچہ خود صدر غلام اسحاق خاں اس سے خوش نہیں تھے۔ انہوں نے شکوہ بھی کیا کہ "شرپسندوں کو سبق سکھانے کے لیے مناسب کارروائی نہیں کی گئی۔"

اسلام آباد میں مسعود پرویز اور مجھے "بزدل" تک کہا گیا۔ ہم نے اس کی چنداں پرواہ نہیں کی کیونکہ ہمیں اپنے کیریئر کے دوران ایسی باتوں سے بارہا واسطہ پڑ چکا تھا۔ ہمیں اس بات پر فخر تھا کہ ہماری منصوبہ بندی کے طفیل کوئی جانی یا مالی نقصان نہیں ہوا اور ہم نے جائز طریقہ سے منتخب حکومت کو سازشوں کی دلدل میں دھنسنے سے بچا لیا جو بعض طاقتور قوتیں اس کے خلاف بروئے کار لا رہی تھیں۔

بے نظیر کا مایوس اور پریشان ہونا فطری بات تھی کیونکہ ان کی سکیم بری طرح ناکام ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ علالت کا بہانہ کر کے لندن چلی گئیں۔ آصف علی زرداری کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا اور بچی کی

پیدائش سے پہلے وہ بھی بے نظیر کے پاس پہنچ گئے۔ نواز شریف حکومت نے ان کے ساتھ دوستانہ انداز میں معاملہ کیا اور بے نظیر کو حمل کے حوالہ سے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ بلاوجہ مضطرب تھیں۔

لانگ مارچ واقعی ایک جلوس ثابت ہوا جس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس اصطلاح کو جسے چین میں ماؤزے تنگ اور ان کے ساتھیوں نے متعارف کرایا تھا' پی پی پی نے ایک ایسے جلوس کے لیے استعمال کیا جو نہ تو طویل تھا' نہ ہی اسے مارچ کا نام دیا جا سکتا تھا۔



باب46

اہم تبدیلیوں کا سال 1993ء

1993ء کا سال بمشکل شروع ہوا تھا جب عساکر پاکستان کے سپہ سالار اعلیٰ (چیف آف آرمی شاف) جنرل آصف نواز پر دل کا دورہ پڑا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے جانشین کے انتخاب کے مسئلہ پر صدر اور وزیراعظم کے درمیان زبردست اختلافِ رائے پیدا ہو گیا۔ میں دونوں کے مابین اختلافات کی خبر پہلے بھی سن چکا تھا۔ ارشد چوہدری کے بقول اصل اختلاف جنرل آصف نواز کا جانشین تلاش کرنے کے مسئلہ پر پیدا ہوا اور وہ اس وقت شدت اختیار کر گیا جب شہباز شریف کی تجویز پر بے نظیر بھٹو کو متفقہ طور پر قومی اسمبلی کی کمیٹی برائے امورِ خارجہ کی چیئرپرسن منتخب کر لیا گیا۔ صدر نے اسے خود اپنے پروردہ شخص کی طرف سے بیوفائی بلکہ غداری سے تعبیر کیا کیونکہ انہوں نے بے نظیر بھٹو کو برطرف کرنے اور

ان کے خلاف اعلیٰ عدالتوں میں ریفرنس دائر کرنے کے بعد اس شخص کے برسرِ اقتدار آنے میں خاصی مدد کی تھی۔

میں نے شروع میں ارشد چوہدری کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی' تاہم ان باتوں کی اس وقت توثیق ہوگئی جب وزیراعظم نے آٹھویں ترمیم (جس کے تحت صدر کو اسمبلی توڑنے کا اختیار حاصل تھا) کے خلاف سخت بیان دیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ نواز شریف سے علیحدگی اختیار کرنے والے اور مایوس سیاسی مخالفین صدر اور وزیراعظم کے مابین اختلافات سے فائدہ اٹھانے کے لیے سرگرمِ عمل ہوگئے ہیں اور نئی صف بندی میں مصروف ہیں۔ مجھے یہ پریشانی لاحق ہوگئی کہ اگر نواز حکومت غیر مستحکم ہوگئی تو جرائم کے خلاف میری مہم کو زبردست دھچکا لگے گا۔

مجھے جلد ہی (16 مارچ 1993ء کو) وزیراعظم سے ملاقات کا موقع مل گیا۔ دیگر معاملات پر تبادلہ خیال کرنے کے بعد میں نے ان سے دریافت کیا آیا صدر کے ساتھ ان کے واقعی سنگین اختلافات پیدا ہوگئے ہیں؟ وہ طرح دے گئے۔ میں نے سوچا شاید وہ اس حساس معاملہ پر مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ اس کے بعد میں نے کہا: ''میں حیران ہوں کہ صدر میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ میں نے تو ان کے خلاف کبھی کچھ نہیں کہا۔'' میں نے مزید کہا:

''سنا ہے وہ دوبارہ صدر بننے کے خواہاں ہیں' ان کی مدت کار سالِ رواں کے آخر میں پوری ہورہی ہے۔ آپ اور بے نظیر ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔ وہ اس اقدام کو وہ اپنے لیے خطرہ سمجھ رہے ہیں۔'' میاں صاحب نے جواب دیا کہ صدارت کے لیے ان کے سامنے غلام اسحاق خاں کے سوا اور کسی کا نام نہیں۔

''اگر یہ بات ہے تو آپ جا کر ان کی غلط فہمی دور کیوں نہیں کر دیتے؟'' میں نے عرض کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور نکتہ تجویز کیا۔ اب جب آپ اور قائد حزبِ اختلاف کے مابین خوشگوار تعلقات کار قائم ہوگئے ہیں تو آپ صدر سے کہہ سکتے ہیں کہ پہلے کی طرح انہیں اس مرتبہ بھی متفقہ طور پر منتخب ہونے کی توقع رکھنی چاہیے۔ وہ یہ سن کر یقیناً خوش ہونگے۔''

میں نے میاں صاحب کے حسرت بھرے الفاظ سنے وہ اپنے آپ سے کہہ رہے تھے: ''اے کاش انہوں نے یہ گندا کھیل شروع نہ کیا ہوتا' انہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سب کچھ غیر ضروری

تھا۔'' میں نے اس طرح کا تاثر دیا جیسے ان کی کوئی بات نہیں سن رہا ہوں۔ پھر اچانک مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''لیکن آپ کیوں پریشان ہیں؟''

''سر' پولیس کے بہت سے آدمیوں نے جرائم کے خلاف جدّ وجہد میں اپنی جانوں کی قربانی دی ہے۔ ملک میں کسی قسم کی غیر یقینی صورتحال پیدا ہوئی تو اس سے جرائم کے خلاف مہم کو زبردست نقصان پہنچے گا۔ اگر پولیس کو سڑکوں پر ہونے والے احتجاج کو کنٹرول کرنے یا نئے الیکشن سے متعلق ڈیوٹیوں پر لگا دیا گیا تو اس کی توجہ ہٹ جائے گی اور مجرم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ براہ کرم ہمیں ذرا سانس لینے دیں تاکہ ہم اپنی توانائیوں کو ازسرِ نو مجتمع کر لیں۔'' میں نے فکرمند لہجہ میں گفتگو کی۔

''چوہدری صاحب' آپ نے واقعی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے' سنگین جرائم کی تعداد گھٹ گئی ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب مجھے پنجاب میں امن وامان کی خراب صورتحال کے باعث جاپان کا دورہ منسوخ کرنا پڑا تھا۔ تاہم آپ کو اسے مزید بہتر بنانا ہوگا۔ آپ ہمارے اختلافات کے بارے میں فکر نہ کریں۔''

ہوا کا رُخ بدلتا ہے

میں میاں صاحب کے مزاج کو سالہا سال سے جانتا تھا۔ اگر انہیں یہ احساس دلا دیا جائے کہ قومی مفاد کا تقاضا یہ ہے تو وہ اپنی انا اور مفاد کو اس پر قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ اپنی انا کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے 22 مارچ کو صدر سے ملاقات کی لیکن بڑے میاں بہت ضدی' ہٹ دھرم اور برہم تھے' اس لیے کوئی بات نہ بن سکی۔

میں اپریل کے دوسرے ہفتہ میں جنرل آصف نواز کی بیوہ کی طرف سے لگایا گیا یہ الزام اخبار میں پڑھ کر حیران رہ گیا کہ ان کے شوہر کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا۔ انہوں نے بریگیڈیئر امتیاز اور چوہدری نثار علی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ حکومت نے فوری طور پر سپریم کورٹ کے جج جسٹس شفیع الرحمٰن کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کر دیا۔ کمیشن نے اس الزام کو بے بنیاد قرار دیا' تاہم مخصوص مفادات رکھنے والوں نے اپنا کھیل جاری رکھا۔

اس کے بعد وفاقی وزراء یکے بعد دیگرے مستعفی ہونے لگے۔ مسلم لیگ کے بعض ایم این ایز نے وفاداریاں تبدیل کر لیں' اس کے باوجود وزیراعظم کو ایوان میں واضح اکثریت حاصل تھی۔ پھر اچانک

بے نظیر لندن سے لوٹ آئیں اور محاذ آرائی کا واضح اشارہ دیتے ہوئے صدر کی حمایت شروع کر دی۔

وفاقی دارالحکومت میں اس قسم کی افواہیں کثرت سے گردش کرنے لگیں کہ صدرِ مملکت قومی اسمبلی کا تیاپانچا کرنے والے ہیں۔ نواز شریف نے 17 اپریل کو ریڈیو اور ٹیلیویژن پر قوم سے خطاب کیا جس میں صدر پر زبردست نکتہ چینی کی اور انہیں منتخب وزیراعظم کے خلاف سازشیں کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا نیز ایوانِ صدر کو سازشوں کا گڑھ قرار دیا۔ صدر نے اگلے ہی دن' جب انہیں یہ پتہ چلا کہ سپیکر نے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا ہے اپنے مواخذہ (Impeachment) سے خوفزدہ ہو کر قومی اسمبلی توڑ دی۔

اگلے دن سردار بلخ شیر مزاری نے نگران وزیراعظم کے عہدہ کا حلف اٹھایا۔ نگران حکومت نے پرویز مسعود (چیف سیکرٹری) رانا مقبول احمد (ڈی آئی جی لاہور) اور میجر حبیب اللہ (ڈی آئی جی راولپنڈی) کو اور مجھے تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک ہم نواز شریف کے آدمی تھے۔

اس روز میں اپنے دفتر ہی نہیں گیا کیونکہ مجھے تبادلہ کا پورا یقین تھا۔ تاہم میرے تبادلہ کے احکام صادر نہیں کیے گئے۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میرا تبادلہ آخری لمحہ پر روک لیا گیا کیونکہ میری بابت تصور کر لیا گیا کہ میں پنجاب پولیس میں انتہائی مقبول ہوں اور فورس کا اعلیٰ و ادنیٰ ہر کارکن میرا بے حد احترام کرتا ہے۔ انہیں خدشہ محسوس ہوا کہ میرا اچانک تبادلہ بدامنی و بے چینی کا سبب بن جائے گا۔ حکومت کی اس کمزوری کا پتہ چلا تو میرا حوصلہ اور بلند ہو گیا اور اپنے ماتحت افسروں کو صوبہ سے مرکز میں جانے کے لیے فارغ کرنے سے انکار کر دیا۔ ناچار حکومت کو دوسرے افسروں کے تبادلہ کے احکام بھی واپس لینے پڑے۔

غلام حیدر وائیں نے جن کے خلاف پنجاب اسمبلی کے سپیکر اور وائیں کی پارٹی کے رکن منظور وٹو نے عدم اعتماد کی قرارداد پیش کی تھی' میری پوزیشن کو غلط سمجھا۔ انہوں نے طیش میں آ کر ایک اخباری بیان میں مجھ پر الزام لگایا کہ میں اپنا اثر ورسوخ ان کے خلاف استعمال کر رہا ہوں۔ میں وائیں کا ہمیشہ سے انتہائی احترام کرتا تھا' لیکن اگر میری فورس مجھے پسند کرتی تھی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ مجھے اس بات پر فخر تھا کہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی میرا طرزِ عمل بالکل درست رہا۔ ایک ذمہ دار سرکاری ملازم ہوتے ہوئے میں کسی کی طرفداری نہیں کر سکتا تھا' اگرچہ اپنی ذاتی حیثیت میں نواز شریف اور وائیں دونوں کو بہت زیادہ پسند کرتا تھا۔ میں محض سرکاری ملازم تھا' نہ کوئی سیاستدان تھا' نہ ہی عوامی نمائندہ۔ محض یہ امر واقعہ کہ نئی حکومت نے خود اپنے خدشات کے پیشِ نظر میرا تبادلہ نہیں کیا۔ اس بات کا جواز نہیں تھا کہ وائیں صاحب

منظور احمد وٹو کے اقدام کو شکست دینے میں ناکام ہو کر اس کا ذمہ دار مجھے ٹھہراتے۔

جب میں نے وائیں صاحب کا اخباری بیان پڑھا تو فون پر ان سے سخت احتجاج کیا۔ انہوں نے انتہائی معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان سے جلد بازی میں ایسا ہو گیا۔ چوہدری پرویز الٰہی نے بھی' میرے خلاف مذکورہ نوعیت کا بیان دیا تھا اسی طرح معذرت کا اظہار کیا۔ بعد میں دونوں مجھ سے ملے اور اپنے بیانات پر کفِ افسوس ملنے لگے۔ تاہم ان کی طرف سے مجھے سیاسی کھیل میں ملوث کرنے سے جو نقصان ہونا تھا' وہ تو ہو چکا تھا۔ دونوں نے وعدہ کیا کہ وہ مل کر پریس کانفرنس کریں گے جس میں میری پوزیشن کی وضاحت کی جائے گی' لیکن اس کی نوبت کبھی نہیں آئی۔

وٹو اور وائیں کے مابین جھڑپ

ان دنوں بڑی تیزی سے نئے نئے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ سپریم کورٹ نے صدر کے اقدام کو خلافِ قانون قرار دیتے ہوئے قومی اسمبلی اور نواز شریف کی حکومت بحال کر دی تھی۔

منظور وٹو نے جو وائیں کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور ہونے کے نتیجہ میں وزیر اعلیٰ بن گئے تھے' سوچا کہ نواز شریف کے خلاف سیاسی معرکہ آرائی میں وہ مجھ پر بھروسہ نہیں کر سکتے کیونکہ میں بہر صورت میاں صاحب کا ساتھ دوں گا۔ وائیں کی طرح وہ بھی غلط فہمی کا شکار ہو گئے جبکہ میں محض ایک سرکاری ملازم تھا اور میرا کوئی سیاسی کردار نہیں تھا۔ میں اسی طرح راہ راست پر چلتا رہتا جس طرح میں نے وائیں کے خلاف تحریک عدم اعتماد کے دوران غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا تھا۔ میری انتہائی راست روی پر وائیں اور وٹو دونوں نے اپنے سیاسی کیریئر کے نازک لمحہ پر برہمی کا اظہار کیا۔ لڑائی کے دوران آدمی کے طرزِ عمل کو دوسرا فریق آسانی سے غلط قرار دے سکتا ہے کیونکہ ایک سرکاری ملازم خصوصاً پولیس والے کی قسمت ہی ایسی ہوتی ہے۔

جب وٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی گئی تو انہوں نے چاہا کہ پوری انتظامیہ کھل کر ان کی حمایت کرے۔ ان کے خیال میں میں مسائل پیدا کرنے والا آئی جی تھا' کیونکہ میں افسروں کی سیاسی بنیاد پر تعیناتی یا تبادلہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وائیں کے دور میں بھی میرا وطیرہ ایسا ہی رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس وقت آئی جی بننا قبول کیا تھا جب نواز شریف نے مجھے اپنا محکمہ چلانے کے

لیے فری ہینڈ دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

وٹو نے جھنگ کے ایس پی رانا نواز کو جو کہ ایک قابل اور دیانتدار افسر تھا تبدیل کرنا چاہا کیونکہ وٹو کے بعض ایم پی ایز اس سے خوش نہیں تھے۔ رانا نواز کا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے جھنگ میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کے کینسر کا استیصال کیا اور پوری قوم کو انتہائی تباہ کن صورتحال سے بچالیا۔ میں یہ اجازت کیسے دے سکتا تھا کہ ان کی بے عزتی کی جائے؟ میں نے وزیراعلیٰ کے سیکرٹری سکندر سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باس کو بتا دیں، اگر ایسے باصلاحیت ایس پی کا تبادلہ کیا گیا تو انہیں کوئی دوسرا آئی جی تلاش کرنا ہوگا۔

وٹو بعض دیگر معاملات پر بھی مجھ سے ناخوش تھے۔ انہوں نے ایک بار مجھ سے کہا: ''میں بڑا سنگ دل واقع ہوا ہوں اور اپنے کسی حکم کے جواب میں ''نہیں'' سننا گوارا نہیں کرتا چاہے وہ حکم غلط ہی کیوں نہ ہو۔'' میں جانتا تھا کہ ان کی نیت بری نہیں تھی۔ ان کے نزدیک میں ایک غلط قسم کا افسر تھا کیونکہ میں نے ایسے بہت سے کاموں میں رکاوٹ ڈالی جو وہ کرنا چاہتے تھے۔ میں سیاسی معاملات میں بے رحمی و سنگ دلی کے ہمیشہ خلاف رہا، کیونکہ ماضی میں جن حکمرانوں نے ظالمانہ پالیسی اپنائی میں اس کے تباہ کن نتائج دیکھ چکا تھا۔

29 مئی 1993ء کو چوہدری حبیب اللہ، سیکرٹری پنجاب اسمبلی، اچانک غائب ہوگئے۔ وہ چوہدری پرویز الٰہی اور منظور وٹو کے مابین سیاسی دنگل میں جو وٹو کے خلاف تحریک عدم اعتماد کے بعد شروع ہوا، ایک اہم شخص بن گئے تھے۔ سیکرٹری کے بارے میں قیاس کیا گیا کہ انہوں نے عدم اعتماد کا نوٹس وصول کرلیا تھا لیکن اس وقت سے ان کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ پولیس نے ان کے اغوا کا کیس رجسٹر کرلیا۔ وٹو بے تاب ہو رہے تھے اور لاہور پولیس پر برہمی کا اظہار کر رہے تھے۔ انہوں نے نادر شاہی حکم صادر کردیا کہ حبیب اللہ کو 31 مئی تک بہر صورت تلاش کرکے بازیاب کیا جائے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ ایسے معاملات میں وقت لگتا ہے اور انہیں صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے کیونکہ وہ فوری اور بلا امتیاز کارروائی کے خواہاں تھے۔

وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ لاہور پولیس کے پورے سیٹ اپ کو تبدیل کردیا جائے تاکہ حقیقی اثرات مرتب ہوسکیں، میرے نزدیک وہ نااہل حکمرانوں کا دہشت پھیلانے کا مخصوص حربہ تھا۔ میں ان کی رائے

سے متفق نہیں تھا' ڈی آئی جی احمد نسیم کا چند دن پہلے تبادلہ کر دیا گیا تھا۔ طارق کھوسہ ایس ایس پی میرے بہترین افسروں میں سے ایک تھے۔ ایس پی کینٹ بھی ایسے ہی تھے۔ اس کے باوجود وہ ان سب کا ایک ہی جست میں تبادلہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں سمجھانے کوشش کی کہ وہ اقدام انتظامی لحاظ سے غلط ہوگا مگر بے سود۔

اس کے بعد انہوں نے میرے خلاف بھی کارروائی کی ٹھان لی۔ چنانچہ 31 مئی کو شام کے اجلاس میں مجھے آئی جی کے منصب سے ہٹا کر واپس او ایس ڈی بنانے کا فیصلہ سنا دیا' جس کا انہیں کوئی اختیار نہیں تھا' کیونکہ آئی جی کی پوسٹنگ وفاقی حکومت کرتی ہے' صوبائی نہیں' میں نے ایسے مشکل حاکم کے ساتھ کام کرنے کی قانونی حکمت اور ناراضی کی پروانہ کرتے ہوئے معاملہ ختم کرنے کا ارادہ کرلیا۔ جہاں اطاعت وفرمانبرداری کرنے سے عزت حاصل ہونے کا امکان نہیں تھا' میں نے وہاں بے عزتی کرانے کی ٹھان لی۔

میں نے رسمی طور پر ان کا شکریہ ادا کیا کہ مجھے ایک بھاری اور تھکا دینے والی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا ہے اور اجلاس سے چلا آیا۔ آئی جی' ایس ایس پی اور ایس پی کینٹ بھی ان کا شکریہ ادا کر کے میرے پیچھے اُٹھ آئے۔

میں نے وائرلیس پر خطاب کرتے ہوئے پوری پولیس فورس کا اپنی کمان کے دوران تعاون کرنے اور اپنی فرائض کے ساتھ شاندار لگن کا مظاہرہ کرنے پر شکریہ ادا کیا۔ میں ان تمام ذمہ داریوں' بے چینیوں اور پریشانیوں سے فارغ ہو کر اپنے گھر آ گیا جو مجھ پر عوام' پولیس اور حکومت کی طرف سے عائد ہوتی تھیں۔ میں اس بات پر مطمئن تھا کہ میں اپنا فرض اپنے تصورات' صلاحیت اور ضمیر کے مطابق درست ادا کرتا رہا' میں نے مخصوص حالات میں ویسے ہی کیا جیسے میں چاہتا تھا۔ میں کوئی غلط کام کرنے کے لیے دباؤ میں نہیں آیا' مجھے ان جوانوں پر بہت زیادہ فخر تھا جنہوں نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے جان کی بازی لگا دی تھی۔ میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ پولیس کو اپنا حقیقی فرض پہچاننا چاہیے اور اسے ایک اخلاقی فورس' قانون کا مضبوط دست و بازو اور عوام کا محافظ بننا چاہیے۔ میں نے اپنا کردار ادا کر دیا تھا۔ تاہم بہت کچھ کرنا باقی رہ گیا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ میرے ساتھیوں میں سے کم از کم' چند یقیناً اپنے ہاتھوں میں ترکیبوں اور مکاریوں کی زنبیل

نہیں بلکہ صداقت کی شمع اٹھا کر اس راستے پر چلیں گے جو ہیں نے دکھایا تھا۔ ان خیالات کے ساتھ میں ایک طویل عرصہ کے بعد گہری نیند سویا۔

اگلی صبح میں بڑی پریشان کن صورتحال میں بیدار ہوا۔ کوئی بھی پولیس افسران عہدوں کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوا جو گزشتہ شام خالی ہوئے تھے۔ ہر ایک نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر معذرت کر لی تھی۔



باب 47

باہر کی دنیا میں ایک معصوم

1975ء میں جبکہ میں پاکستان نارکوٹکس کنٹرول بورڈ میں تعینات تھا' مجھے ایک اجلاس میں شرکت کے لیے پہلے غیر ملکی دورہ پر بنکاک بھیجا گیا۔ وہ میرا پاکستان سے باہر کا پہلا سفر تھا۔ وہ تجربہ میرے لیے خاصا ہیجان خیز ثابت ہوا۔ میرے ہمراہ دوسرے مندوب سندھ کے سیکرٹری ایکسائز و ٹیکسیشن سلمان فاروقی تھے۔ وہ بڑی مسحور کن شخصیت کے مالک اور اپنے سرکاری کام میں بڑے دور اندیش واقع ہوئے تھے۔ میری طرح وہ بھی انتظامی امور میں لوگوں سے صلاح مشورہ کرنے اور ان کی شراکت پر پورا یقین رکھتے تھے۔ ایسی تدابیر نے سرکاری محاصل کی وصولی میں کئی دفعہ ان کی بے حد مدد کی تھی' بنکاک میں ہمارا زیادہ تر وقت چلنے پھرنے میں گزرا۔ وہ بہت اچھے رفیقِ سفر ثابت ہوئے۔

شراب خوری کے موضوع پر منعقد ہونے والی اس کانگریس کا افتتاح تھائی لینڈ کے وزیر اعظم نے کیا۔ ہر شخص نے شراب نوشی کے خلاف تقریر کی۔ جبکہ تقریب کا اختتام ساقی گلفام کے ہاتھوں سے پیش کیے گئے بادہ و جام سے ہوا۔ مصر اور سعودی عرب کے مندوبین نے ہماری طرح قول و فعل کے اس کھلے تضاد

کو بری طرح محسوس کیا۔

اس کے بعد ہمیں ایک شاندار اور نسبتاً رجعت پسند شہر چیانگ مائی لے جایا گیا جو ملک کا تیسرا بڑا شہر اور انتہائی شمال میں واقع ہے۔ میں نے اسے تھائی لینڈ کا لاہور اور بنکاک کو وہاں کا کراچی قرار دیا جو سلمان کو بڑا ناگوار گزرا۔ پھر ہمیں بذریعہ ہیلی کاپٹر سرحد کے ساتھ واقع قبائلی علاقہ میں لے جایا گیا جہاں چرس کاشت کی جاتی تھی اور اقوامِ متحدہ نے وہاں متبادل فصلیں اگانے کا پروگرام شروع کر رکھا تھا۔ یہ علاقہ جو تین پڑوسی ممالک تھائی لینڈ، برما اور لاؤس کے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ ''گولڈن ٹرائی اینگل'' کہلاتا ہے۔ کیونکہ یہ اب بھی منشیات فراہم کرنے والے دنیا کے سب سے بڑے علاقوں میں سے ایک ہے۔ تجربہ کامیاب تھا۔ اگر چہ بہت سے چرس کاشت کرنے والوں کو برما اور لاؤس کے فوجی حکمرانوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ پروگرام میں کاشتکاروں کو موقع پر قرضے دینا اور ان کی فصلوں کو مارکیٹ تک لے جانے کے انتظامات کرنا شامل تھا۔ قبائلی علاقہ پہاڑی اور سرسبز تھا۔ وہاں کوئی سڑک نہیں تھی۔ باشندے وحشی تھے جو اپنی رسوم اور طور طریقوں کے پابند تھے۔ ان کی عورتیں جسم کا محض نچلا حصہ ڈھانپتی ہیں۔ کنواری لڑکی کسی بھی شخص کے ساتھ جسے وہ پسند کرے ہم بستری کر سکتی ہے۔ مگر شادی کے بعد نہیں۔ مختلف قومیں مختلف رسوم اور کلچر رکھتی ہیں۔

چیانگ مائی سے واپسی پر ہم نے ہوائی اڈہ سے ہوٹل تک بس میں سفر کیا اور تھائی لینڈ کے وزیر اعظم نیز ان کے وزیروں کو اسی بس سے سفر کرتے دیکھ کر بڑے حیران ہوئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ پبلک ٹرانسپورٹ کو سرکاری اخراجات میں بچت کی ضرورت پر زور دینے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ بصورتِ دیگر بھی وزیر اعظم رعونت سے پاک اور سیدھے سادے تھے۔ میں نے خواہش ظاہر کی۔ کاش ہمیں بھی ان جیسا کوئی لیڈر نصیب ہوتا۔ وہ زیڈ اے بھٹو کا دور تھا' اس لیے آپ میری حیرت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

بنکاک کے نزدیک پٹایا کے مشہور ساحل پر برازیل کی ایک زنانہ مندوب مجھے مسلسل گھور رہی تھی جبکہ میں نیدر لینڈ کے ایک مندوب کے ساتھ کھانے کی میز پر مصروف گفتگو تھا۔

''آپ مجھے بہت شائستہ لگتے ہیں۔'' اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ میں یہ سن کر دم بخود رہ گیا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں' کیا آپ اپنے ریمارکس کی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گی۔"

"کیا آپ پاکستان سے آئے ہیں؟" اُدھر سے سوال کیا گیا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"مجھے افسوس ہے' میں سمجھتی تھی کہ پاکستانی غیر مہذب ہوتے ہیں مگر آپ تو بڑی نرمی وشائستگی سے شستہ انگریزی میں بات کرتے ہیں۔" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ مجھے سخت دھچکا لگا اور غصہ بھی آیا۔

"مجھے افسوس ہے میڈم۔" میں نے اس سے دوٹوک الفاظ میں کہا: "آپ میرے ملک کی توہین کررہی ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں انگریزی بولنا مہذب ہونے کی علامت ہے؟ مجھے اپنے بارے میں قطعاً کوئی فکر نہیں۔ لیکن آپ کو میرے ملک کی بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ آپ کو معذرت کرنا ہوگی۔"

"میں واقعتاً بہت نادم ہوں۔" اس نے کہا۔ "لیکن میں نے کہیں پڑھا ہے کہ پاکستان کے فوجیوں نے لاکھوں بنگلہ دیشی عورتوں کے ساتھ جبراً منہ کالا کیا تھا۔ وہ بڑا ہولناک واقعہ تھا۔ بہرحال میں انتہائی شرمندہ ہوں۔ مجھے آپ کو اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔" پھر وہ پھرتی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"وہ تو محض بھارت کا پروپیگنڈہ تھا۔" میں نے اسے بتایا۔

اس شام کو میں انتہائی پریشان رہا اور رات کو سو بھی نہیں سکا۔ یہ بدترین قسم کا معاملہ تھا جو مجھے پیش آیا۔ مجھ پر بعض اوقات جذبات کا ایسا دورہ پڑتا ہے جس پر قابو پانا مشکل ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت اس وقت پیش آتی ہے جب میں بہت زیادہ پریشان وسراسیمہ ہوں۔ ایک پاکستانی کو جنرل یحییٰ خاں اور اس کے ٹولہ کی غلط کاریوں کے باعث باتیں سننا پڑیں۔

تھائی لینڈ کا دورہ قریب الاختتام تھا جب بیگم سلمان فاروقی بھی اپنے شوہر سے آملیں۔ انہوں نے بیگم اور بچیوں کے لیے بعض چیزیں خریدنے میں میری مدد کی۔ بعدازاں ہم نے اکٹھے سنگاپور کا سفر کیا۔

سنگاپور کی صفائی کی تعریف کرتے ہوئے میں نے سگار کی ڈبیا سڑک پر پھینک دی۔ میرے دوست نے جن کا تعلق پی آئی اے سے تھا' اسے فوراً اٹھالیا۔ مجھے بے حد پریشانی ہوئی اور ان سے معذرت چاہی۔ وہ محض شائستگی کا مظاہرہ نہیں کررہے تھے اس لیے کہنے لگے۔

"اگر آپ پکڑے جاتے تو بہت زیادہ جرمانہ ہوتا۔" اب سنگاپور کے اس قدر صاف ہونے کا سبب کوئی راز نہیں رہا تھا۔

ترقی سے پہلے امن ضروری ہے

اکتوبر و نومبر 1975ء میں مجھے ٹوکیو میں نارکوٹکس کے موضوع پر ایک سیمینار میں شرکت کا موقع ملا۔ دوسرے زیرِ تربیت افراد کی طرح میں نے بھی ٹوکیو انٹرنیشنل سنٹر میں قیام کیا۔ یہ بہت سے ملکوں کے لوگوں سے ملنے کا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ ایک پاکستانی کے لیے ان دنوں دلچسپ موضوع کرکٹ اور بدترین موضوع وہ آرمی ایکشن تھا جس کے نتیجہ میں بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا۔

یوکوہاما کی سیر کرتے ہوئے مجھے ایک سکھ سے ملنے کا اتفاق ہوا جو وہاں کپڑے کا کاروبار کرتا تھا اور بنیادی طور پر لاہور کا رہنے والا تھا۔ وہ بڑا مہمان نواز نکلا۔ جب اسے پتہ چلا کہ میرا تعلق بھی لاہور سے ہے' تو اس نے سوٹ کے پیسے لینے سے نکار کر دیا جو میں نے اس سے خریدا تھا۔ میں نے زبردست اصرار کر کے اسے اپنی اصل قیمت خرید وصول کرنے پر آمادہ کر لیا۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے آفتاب صاحب جو قریباً تین ماہ سے وہاں مقیم تھے اور شہر سے خوب واقف ہو چکے تھے' مجھے شنجوکو ریلوے جنکشن پر ایک انڈین ریسٹوران میں لے گئے۔ اگرچہ میں بعد میں، میں ایسے نظاروں کا عادی ہو گیا۔ لیکن پہلی بار زیرِ زمین اور سطحِ زمین پر سٹیشن دیکھ کر بہت حیران ہوا بلکہ حیرت زدہ رہ گیا۔ وہاں انسانوں کا ایک جمِ غفیر نقل و حرکت کر رہا تھا۔ وہ سب بڑے سلیقہ اور خاموشی کے ساتھ آ جا رہے تھے۔ ہر کوئی کسی مقصد سے نپے تلے تاہم تیز تیز قدموں سے چل پھر رہا تھا۔ اس جگہ لوگوں کا اس قدر ہجوم ہونے کے باوجود نہ چیزیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں نہ ہی گندگی تھی۔ کوئی شخص کوڑے دان کے سوا زمین پر کوئی چیز نہیں پھینکتا تھا۔ ایسا لگا کہ لوگوں کو بچپن سے ایسا کرنے کی عادت پڑ گئی تھی اس لیے اتنا بڑا شہر اس قدر صاف ستھرا تھا۔ وہ کسی دباؤ کا نتیجہ نہیں تھا جیسا کہ سنگاپور میں دیکھنے میں آیا۔

پولیس کے پاس اپنے ملک میں تیار شدہ تازہ ترین ساز و سامان تھا۔ پورے شہر کے ٹریفک کی نگرانی پولیس ہیڈکوارٹرز میں واقع چھوٹے سے ہال سے کی جا رہی تھی۔ اس کے لیے سڑکوں پر اور گلیوں میں کلوز سرکٹ ٹیلیویژن نصب تھے جو کنٹرول روم کو فیڈ کرتے تھے۔ وہاں سڑکوں پر ہزاروں پولیس چوکیاں' گشتی کاریں اور موٹر سائیکل سوار دستے موجود تھے۔ ان سب کا وائرلیس ٹیلیفون اور کمپیوٹرز کے ذریعے کنٹرول روم کے ساتھ رابطہ تھا۔

ایسا محسوس ہوا کہ کوئی چیز بھی ان کے نوٹس میں آئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ 1950ء کی دہائی تک پاکستانی ایس ایچ او کے متعلق بھی ایسا ہی گمان کیا جاتا تھا۔ لیکن پھر معاشرہ نے اسے مطلوبہ وسائل دینے سے انکار کر دیا تو وہ بہت پیچھے رہ گیا۔ میں نے جاپانی پولیس افسر سے پوچھا۔ آیا ان کی پولیس کو وسائل کی کمی محسوس ہوتی ہے؟

''نہیں، بالکل نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہمیں حسب ضرورت ہر چیز مل جاتی ہے۔ کیونکہ جان و مال کے تحفظ کو اولین ترجیح حاصل ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد بھی پولیس کے بجٹ کو پہلی ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ اس چیز کا احساس ہو گیا تھا کہ اندرونی امن کے بغیر تعمیرِ نو یا ترقی کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ پولیس کو صنعتی ترقی کا لازمی جزو قرار دیتے ہوئے اس کی ازسرِ نو تنظیم کی گئی اور اسے ترقی دی گئی۔''

معاشرہ میں امن کا قیام اور اقتصادی ترقی لازم و ملزوم ہیں۔ ترقی کرنے سے پہلے امن قائم کرنا ضروری ہے۔ پاک' جاپان فرینڈ شپ سوسائٹی کے صدر میا موٹو نے کہا ''ہم اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ 1945ء کی شکست نے ہماری غلط سوچ ختم کر دی اور اب ہم جنگ کی بجائے امن کے ذریعے دنیا کو مسخر کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ ہمارے نزدیک اندرونی امن سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے ہم اپنے ایجنڈا میں پولیس کی ضروریات کو سرِ فہرست رکھتے ہیں۔''

بھارتیوں کو خفت

نارکوٹکس پر ہونے والے سیمینار میں بعض واقعات کے تذکرے اور ملکی رپورٹوں سے کارآمد معلومات حاصل ہوئیں جن کی مدد سے اس لعنت کی موجودگی' فراہمی اور منشیات کے عادی افراد کے خلاف تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔ مجرموں سے متعلق معلومات کا تبادلہ بڑی فراخ دلی اور دیانت داری سے کیا گیا۔ امریکیوں اور آسٹریلیا والوں نے بطور خاص اس بات پر زور دیا کہ ان کے ملکوں میں منشیات کے باعث تشدد اور جرائم بڑھ رہے ہیں۔ وہ اس کے ثبوت میں حقائق اور اعداد و شمار ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ سمگلر جب تنگ گھیرے میں آ جائیں تو پولیس والوں اور ججوں کو بھی قتل کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ منشیات کے عادی نقب زنی اور چوری کی وارداتیں کرتے ہیں اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنے والدین کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ ہمارا پورا معاشرتی و اخلاقی ڈھانچہ تباہ ہونے والا ہے۔

1975ء میں ایسی صورتِ حال کے بارے میں سوچنا بھی محال تھا۔

میں نے اپنے ملک کے متعلق اپنی رپورٹ میں چارٹس، تصویروں اور نقشوں کی مدد سے ان اقدامات کا ذکر کیا جو منشیات پر قابو پانے کے لیے کیے جا رہے تھے۔ پاکستان میں جو تدابیر بروئے کار لائی جا رہی تھیں، انہیں بھارتیوں کے سوا سب نے سراہا۔ بعد میں ترکی اور سری لنکا کے مندوبین نے مجھ سے باتیں کرتے ہوئے بھارتی طرزِ عمل پر خفگی کا اظہار کیا۔ میں جواب دینے کے لیے موقع کی تاک میں رہا۔

دو بھارتی مندوبین نے اپنی رپورٹ میں دعویٰ کیا کہ بھارت کو اندرون ملک کوئی مسئلہ درپیش نہیں۔ البتہ پاکستان کی طرف سے ہر قسم کی منشیات سمگل کر کے بھیجی جا رہی ہیں۔ انہوں نے ایک جھوٹا نظریہ گھڑ کر پیش کیا کہ چین منشیات کی سمگلنگ کی اپنی پوری قوت اور وسائل کے ساتھ پاکستان کے تعاون سے پشت پناہی کر رہا ہے۔ تاکہ انڈیا کے انسانی وسائل کو تباہ کیا جا سکے۔ یہ چین اور پاکستان دونوں پر گھٹیا الزام تھا اور مجھے دونوں کا دفاع کرنا تھا کیونکہ سیمینار میں چین کا کوئی نمائندہ شریک نہیں تھا۔ میں اس الزام کو بے بنیاد کہہ سکتا تھا۔ تاہم میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مندوب پاکستان کے بارے میں یہ شک لے کر جائے کہ وہ بھارت کے خلاف کسی بین الاقوامی سازش میں ملوث ہے۔ سری لنکا والوں نے بھارتیوں کے خلاف زبردست واویلا کیا۔ میں نے چیئرمین کو بتایا کہ میں بھارتی مندوبین کے الزام کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ چیئرمین کی خواہش تھی کہ سیمینار میں تو تکار اور تلخی کی نوبت نہ آنے پائے۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں اس موضوع پر محض پیشہ ورانہ انداز میں گفتگو کروں گا۔

میں نے اپنے جواب میں اعتدال پسندی اور راست گوئی سے کام لیا۔ میں نے نشاندہی کی کہ اس ناجائز کاروبار میں دنیا کی تمام اقوام کے سمگلر بشمول بھارتی و پاکستانی شامل ہیں۔ تمام ممالک کی قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں ان کے خلاف جدوجہد میں شریک ہیں۔ سمگلر پوری انسانیت کے، خصوصاً ان ملکوں کے جن سے وہ تعلق رکھتے ہیں، دشمن ہیں۔ کوئی ملک یا حکومت ان کی ناپاک سرگرمیوں میں فریق نہیں بن سکتی۔ وہ بدترین درجہ کے مجرم ہیں اور کسی نرمی کے مستحق نہیں۔ پاکستان کسی پاکستانی سمگلر کا ہرگز دفاع نہیں کرے گا۔ اس کے بعد اچانک آواز بلند کرتے ہوئے میں نے کہا: ''بھارتی مندوبین نے پاکستان اور چین پر الزام لگایا ہے کہ وہ منشیات بھارت کو سمگل کرنے کی کوششوں میں ملوث ہیں۔ میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر ان کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہے تو اس وقت یہاں پیش کریں تاکہ مجرموں کے

خلاف ضروری اقدامات کیے جا سکیں۔" اس کے بعد وہ بیٹھ گیا۔ ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ بھارتیوں کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ اس لیے ان کے منہ لٹک گئے اور انہیں زبردست خفت اٹھانا پڑی۔ لگتا ہے کہ انہیں کسی نے اس طرح بریف نہیں کیا تھا کہ وہ ایک بین الاقوامی سیمینار میں دوسرے ملکوں پر بے بنیاد الزام تراشی کرنے سے باز رہیں۔ بہرحال انہوں نے پھر کوئی شرارت نہیں کی۔

سیمینار کے اختتام پر مندوبین نے اپنے ملکوں کے عوامی گیت پیش کیے۔ میں نے اپنے قطعی غیر مترنم لہجہ میں پنجابی میں ایک ماہیا سنایا جسے سب نے پسند کیا اور سراہا۔

واپسی پر ہمارے طیارہ کو فنی خرابی کے باعث پانچ گھنٹے بیجنگ میں رکنا پڑا۔ ہوائی اڈہ پر چینیوں نے پاکستانیوں کی بطورِ خاص تواضع کی۔ میرے برابر میں بیٹھا ہوا جاپانی ایک مشہور چینی کو طویل عرصہ کے بعد چاول کی شراب پیتے دیکھ کر حیران رہ گیا' وہ 21 سال کے بعد اپنے وطن آیا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ بیجنگ سے پرواز کے بعد میں دوبارہ اس کے پاس نہیں بیٹھوں گا۔ میں نے ایئر پورٹ پر دو وال کلاک دیکھے جن کے وقت میں پورے 12 منٹ کا فرق تھا۔ کیا وہ وقت کے دو مختلف زونوں کی نمائندگی کر رہے تھے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا ناچار میں نے ایک آدمی سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ایک کلاک پیچھے رہ گیا ہے جس کے درست ہونے میں ایک دن اور لگے گا جب ضروری اجازت موصول ہوگی۔ 1975ء میں چین ترقی کی دوڑ میں باقی دنیا کے ساتھ ملنے کے لیے سخت محنت کر رہا تھا۔

بیجنگ سے راولپنڈی تک کی پرواز میری زندگی کا انتہائی شاندار اور ناقابلِ فراموش تجربہ تھا۔ ہمارے طیارے کے پر قراقرم اور ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں کو چھو رہے تھے۔ وہ چودھویں کی پوری طرح روشن و درخشاں رات تھی۔ چاند کی روشنی نے برف کی چادر کو ساحری کے انداز میں اور بھی زیادہ مسحور کن بنا دیا تھا۔ اس منظر سے نظریں ہٹانا ممکن نہیں رہا۔ میں نے خود کو ایسی چڑیا کی طرح محسوس کیا جس پر سانپ نے جادو کر دیا ہو۔

1976ء کے آخر میں نشہ بازوں کے علاج اور بحالی صحت کی بابت ایک بین الاقوامی ورکشاپ میں جو راولپنڈی کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں منعقد ہوئی تھی میں بطور میزبان شریک ہوا۔ اس کا اہتمام عالمی ادارہ صحت (WHO) اور پاکستان نارکوٹکس کنٹرول بورڈ نے مشترکہ طور پر کیا تھا۔ ترکی سمیت بہت سے ممالک نے شرکت کی۔ میں ترک مندوبین کو سیاحت کے لیے ٹیکسلا اور سوات لے گیا۔

انہوں نے بہت سی دلچسپ باتوں کے علاوہ یہ بھی بتایا کہ افیون ترکی کے ایک شہر کا نام ہے جس کے اردگرد زیادہ تر چرس کاشت کی جاتی ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ افیون چرس کے لیے ان عام ناموں میں سے ایک ہے جو ہمارے ملک میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اُردو اور ہماری علاقائی زبانوں کے بہت سے الفاظ ترکی زبان میں مشترک ہیں۔

برطانیہ کا پہلا دورہ

مجھے نارکوٹکس سے متعلق ایک سیمینار میں شرکت کے لیے نامزد کیا گیا جو جنوری 1978ء میں واشنگٹن ڈی سی میں ہونے والا تھا۔ میں دسمبر کے آخر میں راولپنڈی سے لندن کے لیے روانہ ہوا۔ میرے دوست اور رشتہ دار میاں محمد سرور بھٹی جو مانچسٹر میں آباد ہیں' میرے شریکِ سفر تھے۔

لندن سے آگے ہم مانچسٹر کے لیے بذریعہ سڑک روانہ ہوئے۔ وہ بالکل موٹروے پر سفر کرنے کی مانند تھا۔ نواز شریف کی مساعی سے ہمارے ملک میں بھی موٹروے بہت جلد تعمیر ہو جاتی لیکن بے نظیر نے 1993ء میں دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد اسے عام سڑک میں بدل دیا۔ ایک سال بعد پھر طے کیا گیا کہ اسے منصوبہ کے مطابق مکمل کیا جائے گا خواہ کتنا ہی خرچہ کیوں نہ برداشت کرنا پڑے۔

ایک دن میاں سرور کے بڑے بھائی میاں عبدالمجید مجھے مانچسٹر کے اردگرد واقع مقامات دکھانے کے لیے لے گئے۔ میاں سرور کا خاندان بہت مہمان نواز تھا۔ میاں صاحب کے بڑے صاحبزادے ہمایوں سرور نے جو بڑے شائستہ اور حسین نوجوان تھے' ایک بیٹے کی طرح میری خدمت کی۔ میں اُسے بہت زیادہ پسند کرنے لگا۔ آگے چل کر میں نے اپنی دوسری صاحبزادی سائرہ اس کے عقد میں دے دی۔

واپسی پر میاں مجید مجھے بذریعہ ٹرین لندن لے گئے۔ میں اس شہر کو دیکھنے کا زبردست اشتیاق رکھتا تھا کیونکہ میں اس کے متعلق بہت زیادہ پڑھ اور سن چکا تھا۔ لیکن اسے دیکھنا عروج کی ضد ثابت ہوا۔ جس سے میرے رومانوی خواب چکنا چور ہو گئے۔ میں نے وہ مشہور مقامات یقیناً دیکھے جو اکثر سیاحوں کے لیے باعثِ کشش ہوتے ہیں۔ ان دنوں وجاہت لطیف لندن میں تعینات تھے۔ اس لیے دوپہر کا کھانا ہم نے ان کے ساتھ کھایا۔

لندن سے امریکہ

برطانیہ میں مختصر اور خوشگوار قیام کے بعد میں واشنگٹن پرواز کر گیا۔ ہوائی اڈہ پر ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی کے ایک افسر نے میرا استقبال کیا۔

ڈاکٹر پی ایم طور جو میرے دوست اور رشتہ دار ہیں' نیز ایروناٹکس کے ماہر ہیں' اٹلانٹا (جارجیا) میں سکونت پذیر ہیں' تین دن کے لیے میرے ساتھ واشنگٹن آئے اور مجھے شہر سے متعارف کرانے کے لیے مختلف حصے دکھائے۔

ڈاکٹر محمد یعقوب جو کالج میں میرے کلاس فیلو تھے' آئی ایم ایف میں کام کرتے تھے۔ 1993ء میں انہیں سٹیٹ بینک آف پاکستان کا گورنر بنا دیا گیا۔ وہ اور ان کی خوبصورت بیگم مجھے خریداری کے لیے شاپنگ مال پر لے گئے۔ میں پہلی بار واشنگٹن گیا تھا اس لیے وہاں گھومنے پھرنے اور ایک ہی چھت کے نیچے اشیا کی بے شمار قسمیں دیکھنے میں خوب دل لگتا تھا۔

ایک دن ہوٹل سے واپس آتے ہوئے میں برفباری اور تیز ہوا کے طوفان میں پھنس گیا۔ میرے ہاتھ میں چند چیزیں تھیں' وہاں اس قدر شدید سردی تھی کہ جیبوں سے ہاتھ باہر نکالنا محال ہو گیا۔ میں اشیاء پر مشتمل تھیلے کو کبھی ایک ہاتھ میں پکڑتا اور کبھی دوسرے میں ایک کلومیٹر کا فاصلہ اس قدر طویل لگنے لگا کہ میری ہمت جواب دے گئی۔ چونکہ میری ساری زندگی گرم علاقوں میں گزری ہے اس لیے میں سردی اور برف باری سے ڈرتا ہوں' وہ تجربہ واقعی بہت خطرناک تھا۔ جب میں ڈاکٹر طور سے ملنے گرم علاقہ اٹلانٹا میں گیا تو وہ تبدیلی بڑی خوشگوار محسوس ہوئی۔ وہ مجھے اپنی ویگنیئر میں علاقہ کی سیر کرانے کے لیے لے گئے۔ سیمینار کے منتظمین نے ہمیں شکاگو' کنساس اور دیگر مقامات کی سیر کرائی۔ امریکہ واقعی مسحور کن ہے بہت زیادہ اور بڑی چیزوں کی سرزمین۔ مشاہدہ یقین کے مترادف ہوتا ہے۔ تاہم اس کا زیادہ تر حصہ مہاجر معاشرہ کی محنت شاقہ اور مربوط توانائیوں کا مرہونِ منت ہے کیونکہ نقل مکانی کر کے آنے والا ہر معاشرہ جوش و خروش سے معمور اور زندگی کی اُمنگ سے مالا مال ہوتا ہے۔

امریکہ آج بھی ایک قبائلی معاشرہ ہے

سیمینار میں انتہائی مفید اور قیمتی معلومات کا تبادلہ ہوا کیونکہ مندوبین اپنے ملک کی بابت جو رپورٹ پیش کرتے تھے' بعد میں اس پر زوردار بحث ہوتی تھی۔ ایک امریکی نے عملدرآمد کی راہ میں حائل مشکلات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ قدیم اور قبائلی معاشرے مثال کے طور پر ترکی' افغانستان' ایران اور پاکستان وغیرہ دنیا کے لیے زبردست خطرہ ہیں وہاں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو زبردست جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ کوئی توہین آمیز بات نہیں تھی' تاہم ترکی وافغانستان کے وفود نے ان کے بیان کا بہت برا منایا۔ کانفرنس میں تعطل کی سی کیفیت پیدا ہوگئی اور گرما گرم بحث ہونے لگی۔ اگرچہ پاکستان کا نام بھی لیا گیا تھا' تاہم ابتدا میں چپ رہا۔ ترک اور افغان مندوبین نے مجھے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی کیونکہ ترجمہ کی سہولت میسر ہونے کے باوجود وہ انگریزی سمجھنے سے قاصر تھے۔ ترکی اور پاکستان کے مابین خصوصی تعلقات کے پیشِ نظر میں پورے عزم کے ساتھ بحث میں شریک ہوگیا۔

میں نے جس نکتہ پر زور دینا چاہا وہ یہ تھا کہ امریکی معاشرہ ابھی تک کسی بھی تعریف کی رو سے قبائلی ہے' وہاں کی برادریوں میں آج بھی جداگانہ نسلی شناختیں اور گروپ بندی ہے۔ نقل مکانی کے علاقہ یا ملک کی نسبت سے علیحدہ گروہ بندی قائم رکھے ہوئے ہیں۔ وہ اب بھی اپنے اصل وطن مثلاً برطانیہ' آئرلینڈ' ڈنمارک اور جرمنی کے بعض رسم ورواج پر عمل پیرا ہیں۔ میں نے چند کتابوں کے حوالے دیئے اور ہفت روزہ ''نیوزویک'' سے اقتباس پیش کیے۔ میں نے سیاہ فام آبادی کا بطورِ خاص ذکر کیا جو عرصہ دراز سے امریکہ میں آباد ہے۔ لیکن امریکی معاشرہ میں جذب نہیں ہوسکی اور ابھی تک غیر مطمئن ہے۔ میں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ امریکی معاشرہ اب بھی قبائلی ہے' طویل تقریر کی۔ ترک' افغان اور بعض دیگر مندوبین اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے مجھے اپنا ترجمان بنالیا۔ امریکی ناراض ہوئے۔ لیکن انہوں نے میرے استدلال سے بڑی حد تک اتفاق کیا۔ بجز اس نکتہ کے کہ آج کل امریکہ میں کہیں بھی قبائلی قوانین نافذ نہیں ہیں۔ میرا جواب یہ تھا کہ ریڈ انڈینز جنہیں اب نیٹو امریکنز کہا جاتا ہے' اب بھی قبائلی رسوم پر عمل کرتے ہیں۔ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لیے کسی بدمزگی یا تلخی کی نوبت نہیں آئی۔

آزادی کی قدر و قیمت

میں نے امریکی پولیس کو ہتھیاروں سے پوری طرح لیس' خوب تربیت یافتہ اور انتہائی مستعدو باصلاحیت پایا۔ اس کے باوجود پولیس والے جرائم خصوصاً منظم اور وحشیانہ جرائم کے بارے میں بڑے

پریشان اور مضطرب تھے۔ اس کا سبب جاننے کے لیے میں نے ان کی کارکردگی کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا۔ عدالتی کارروائی دیکھی اور سنی۔ جیلوں کے دورے کیے اور رات کے گشت میں ان کی پولیس کے ساتھ حصہ لیا۔ ایک دفعہ ایک کار کے بارے میں جو ہمارے آگے جا رہی تھی' پٹرول کو کچھ شک ہوا۔ اس نے چند بٹن دبائے اور کنٹرول روم سے اڑھائی (2 1/2) منٹ میں پوری معلومات حاصل کر لیں۔ وہ ایک مسروقہ کار تھی جو 23 منٹ پہلے چھینی گئی تھی۔ مجھے گلی میں مقابلہ ہوتا صاف نظر آ رہا تھا۔ دو بکتر بند گاڑیاں بھی وہاں پہنچ گئیں۔ چور اور کار کو فوراً قابو کر لیا گیا۔ اسے جوابی کارروائی کا موقع نہیں دیا گیا۔ میں پولیس کی مستعدی سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ فرضی ڈراما مجھے دکھانے کے لیے رچایا گیا تھا۔ میں نے ان کے وسیع اور متاثر کن کنٹرول روم میں موجود دوسرے ریکارڈ سے چیک کیا تو وہ کیس بالکل درست نکلا۔ کسی مصیبت زدہ کی طرف سے مدد کے لیے پکار موصول ہونے پر ان کی کارروائی کا وقت اوسطاً پانچ منٹ سے کم تھا اکثر صورتوں میں ایک منٹ سے بھی کم پایا گیا۔

میں نے بہت سے امریکی افسروں سے پوچھا کہ جرائم سے نمٹنے کے لیے اس قدر اعلیٰ اور وسیع انتظامات کے باوجود ان کی شرح میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟ انہوں نے مختلف وجوہات بتائیں جن میں ہتھیاروں کی بھرمار' معاشرتی عدم مساوات' قانونی دشواریاں' مختلف اوصاف والے نوآبادکار اور سیاہ فام لوگوں کی ضروریاتِ زندگی سے محرومی وغیرہ شامل تھیں۔ اس بات پر سب متفق تھے کہ معاشرہ شہری آزادیوں کے لیے یہ قیمت رضاکارانہ طور پر ادا کر رہا ہے انہوں نے تسلیم کیا کہ یورپ اور ایشیا کے بہت سے ممالک میں جرائم بہتر طور پر کنٹرول میں ہیں۔ تاہم ان ملکوں میں ریاست اور معاشرہ کے نام پر جن جرائم کا ارتکاب کیا جاتا ہے وہ ان سے بھی زیادہ تاریک پہلو رکھتے ہیں۔ وہاں امنِ عامہ' دباؤ اور ظلم وتشدد کے نام پر بہت کچھ ہوتا ہے۔ امریکیوں کے آباؤاجداد نے اس نظام کے خلاف بغاوت کی تھی' ان کی آل اولاد اس تاریک دور میں واپس جانے کو تیار نہیں۔ پولیس والے اس بات پر فخر کا اظہار کر رہے تھے کہ وہ معاملہ کو چھان بین کے لیے عدالت میں پیش کر دیتے ہیں اور کسی شخص پر مقدمہ نہیں چلاتے جب تک ان کے پاس قائل کرنے والی شہادت موجود نہ ہو۔

میں جب بھی امریکہ گیا لوگوں نے بھٹو کی قسمت کے فیصلہ کی بابت لازماً پوچھا اور تشویش ظاہر کی۔ ان دنوں بھٹو کیس زیرِ سماعت تھا۔ اپنے دورہ کے آخری مرحلہ میں ''کنکریٹ کے جنگل'' میں گیا جسے

نیویارک کہا جاتا ہے۔ میرا پرانا دوست ناصر حسین قریشی مجھے لینے آیا تھا۔ ایک طویل عرصہ کے بعد مجھے پا کر وہ باغ باغ ہوگیا۔ ہم نے ان خوشگوار دنوں کی یادیں تازہ کیں جو گورنمنٹ کالج لاہور میں اکٹھے گزارے تھے۔ آخر میں بھٹو کیس پر بھی تبادلہ خیال کیا۔

ناصر کے والد ٹوبہ ٹیک سنگھ ہائی سکول میں ہمارے ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے اور اپنی نیکی وتقویٰ کے لیے مشہور تھے۔ ناصر انکم ٹیکس سروس میں کام کر چکے تھے جو انہوں نے سی ایس ایس پاس کرنے کے بعد اختیار کی تھی۔ بھٹو کے ابتدائی دور میں سرکاری ملازمین کی جو چھانٹی کی گئی وہ بھی اس کی زد میں آ گئے۔ ناچار اپنا دیس چھوڑ کر امریکہ سدھار گئے وہاں ازسرِ نو زندگی شروع کرنے کے لیے زبردست اور طویل جدوجہد کرنی پڑی۔ ان قطعی ذاتی وجوہات کی بنا پر وہ بھٹو سے دلی نفرت کرنے میں حق بجانب تھے۔

ناصر اور ان کی خوبصورت بیگم نے بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ وہ مجھے ورلڈ ٹریڈ سنٹر' وال سٹریٹ' مجسمۂ آزادی' اقوامِ متحدہ کی بلڈنگ' ٹائمز اسکوائر اور دوسرے دلچسپ مقامات دکھانے لے گئے۔

کالج کے دنوں کے ایک اور دوست ڈاکٹر خورشید احمد بھی نیویارک میں تھے۔ انہوں نے اور ان کی اہلیہ نے بھی میرے کئی روزہ قیام کے دوران میری بڑی خدمت کی۔

عمرہ کی ادائیگی

فروری 1978ء میں نیویارک سے لندن آتے ہوئے میں ایک دن کے لیے اپنے دوست چوہدری انور ظہور کے پاس رک گیا جو وہاں محنت کشوں کے مسائل پر ایک کورس کر رہے تھے۔

میں نے واپسی پر عمرہ کا پروگرام بنایا تھا اور بلقیس سے کہہ گیا تھا کہ مجھ سے جدّہ میں آ ملیں۔ ہوائی اڈہ پر پاکستانی سفارت خانہ کے قونصل اقبال معین نے مجھے خوش آمدید کہا۔ وہ کالج میں میرے ہم جماعت رہ چکے تھے اور میرے بہت ہی پیارے دوست تھے۔ میں نے رات ان کے ہاں گزاری' اگلی صبح بلقیس بھی وہاں پہنچ گئیں۔ اقبال اور ان کی بیگم بہت اچھے میزبان تھے۔ ان کے پاس قیام کر کے ہم واقعتاً بے حد لطف اندوز ہوئے۔ انہوں نے ہمارے قیام کو بہت آرام دہ بنایا اور ہمیں خریداری کرانے نیز مختلف مقامات دکھانے کے لیے لے گئے۔ میرے بھتیجے طارق محمود بھی جدہ میں تھے۔ ان سے ایئر پورٹ پر اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ وہ بڑی روانی سے عربی بول رہے تھے حالانکہ انہیں وہاں گئے محض چند مہینے گزرے تھے۔

اقبال معین' ان کی اہلیہ' طارق' بلقیس اور میں نے ربیع الاول کے مبارک مہینہ میں جمعہ کے روز عمرہ ادا کیا۔ ہم صبح سویرے روانہ ہوگئے۔ راستہ میں ہم نے وہ جگہ دیکھی جہاں رسولِ اکرم ﷺ اور قریش مکہ کے مابین صلح حدیبیہ ہوئی تھی جسے انسانی تاریخ میں فراست وتدبر کا بہت بڑا کارنامہ قرار دیا گیا ہے۔ وہاں سے آگے سڑک پہاڑی علاقہ سے گزرتی ہے۔ ہم جوں جوں مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ رہے تھے' میں جذباتی ہورہا تھا۔ مسجدِ حرام کے بلند مینار دور سے نظر آرہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ہم شہر مکہ میں داخل ہوگئے۔ میرے سامنے وہ پہاڑیاں تھیں' وہ گلیاں تھیں اور وہ مقاماتِ مقدسہ تھے جہاں دنیا کے سب سے مقدس اور عظیم انسان نے زندگی کے شب و روز گزارے اور ان میں اپنے پاک وجود کے ساتھ اقامت گزیں رہا تھا۔ جب اس مقدس شہر میں داخل ہوتے ہوئے میری نظر خانہ کعبہ پر پڑی تو میں ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ بیت اللہ پر پہلی نظر نے مجھے مبہوت کردیا۔ میں خود کو انتہائی پست سمجھنے لگا اور مجھ پر زبردست ہیبت طاری ہوگئی۔

ہم نے نماز جمعہ کے بعد گائیڈ کی مدد سے عمرہ کیا۔ بلقیس اور میں خوش قسمت تھے کہ ہمیں طواف کے دوران ہر بار حجرِ اسود کو بوسہ دینے کا موقع مل گیا۔ ہم نے مقامِ ابراہیم پر شکرانہ کے نوافل ادا کیے اور زم زم کے مسلسل بہنے والے کنوئیں سے پانی پیا۔

بہت سے دوستوں اور رشتہ داروں نے مجھ سے مخصوص قسم کی دعائیں کرنے کو کہا تھا' لیکن مکہ میں پہلی بار داخل ہونے پر سب کچھ بھول گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہوگیا تھا۔ مدینہ منورہ سے واپس آتے ہوئے دوسری بار مکہ مکرمہ میں قدم رکھا تو مجھے لوگوں کی درخواستیں یاد آئیں۔ میاں ریاض الحق اولادِ نرینہ سے مرحوم تھے انہوں نے بیٹے کے لیے دعا کرنے کی استدعا کی تھی۔ میں نے ان کے لیے پورے خلوص کے ساتھ دوبار دعا مانگی۔ دونوں بار ایک خوبصورت بچے کا چہرہ میرے سامنے نمودار ہوا۔ میں نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعا سن لی ہے۔ میرے کانوں میں یہ آواز بھی آئی کہ اس بچے کا نام جمالِ مصطفیٰ رکھنا۔ اللہ تعالیٰ نے میاں ریاض کو اسی سال بیٹا عطا فرمایا جس کا نام یوسف جمال مصطفیٰ رکھا گیا۔ میاں ریاض میاں احمد علی کے بیٹے ہیں جنھوں نے بلقیس کے ساتھ میری شادی کرانے میں مدد کی تھی۔ وہ میاں محمد شفیع (میرے سسر) کے بڑے قریبی دوست تھے۔ میاں ریاض میرے داماد ہمایوں سرور کے ماموں بھی ہیں۔

عمرہ کے بعد ہم منیٰ اور عرفات گئے۔ جبلِ رحمت پر پہنچے اور کچھ فاصلے سے غارِ حرا دیکھا کیونکہ اس پر چڑھنا میرے بس سے باہر تھا۔ روحانی لحاظ سے یہ دورہ بڑا نفع بخش رہا۔ ہم نے اللہ سے اپنے گناہوں اور خطاؤں کی معافی مانگی اور بڑی عاجزی سے دعا کی کہ ہمیں صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔

عمرہ کے بعد بلقیس اور میں بذریعہ سڑک مدینہ منورہ گئے۔ راستہ میں بدر کے مقام پر رکے اور شہدائے بدر کی ارواح کے لیے دعا کی۔ ہم بعد دوپہر مدینہ پہنچے۔ مسجدِ نبویؐ کے عالیشان مینار دور سے نظر آ رہے تھے۔ زندگی بھر کے خوابوں کے شہر میں پہنچ کر میں نے خود کو بڑا ہلکا پھلکا اور روحانی طور پر بلند محسوس کیا۔ میں نے سمجھا کہ مجھے اپنی زندگی کی مطلوبہ منزل مل گئی ہے۔

ہم نے پاکستان ہاؤس میں قیام کیا جو مسجدِ نبویؐ کے بابِ جبریل کے سامنے واقع ہے۔ ہم ہر روز حاضری دیتے رہے جس سے بے حد ذہنی سکون و اطمینانِ قلب حاصل ہوا۔ ہم اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ مسجدِ نبویؐ میں اس جگہ دعا کرنے کا موقع ملا گیا۔ جہاں رسولِ اکرم ﷺ خود دعائیں کیا کرتے تھے۔ ہم نے مدینہ کے گردونواح میں تاریخی مقامات کی زیارت بھی کی۔

امریکہ کا دوسرا دورہ

میری آنکھ میں کچھ نقص ہو گیا تھا اس لیے مجھے مشورہ دیا گیا کہ امریکہ جا کر لینز لگوا لوں۔ میں اکتوبر 1987ء میں امریکہ گیا اور پٹس برگ میں جہاں میرے دوست اور رشتے دار ڈاکٹر پی ایم طور رہائش پذیر تھے' آنکھوں کا علاج کرایا۔ مسٹر طور ایرو ناٹکس لیزنگ میں پی ایچ ڈی تھے اور لاک ہیڈ کارپوریشن میں' جس کا شمار دنیا کی بڑی کارپوریشنوں میں ہوتا ہے' اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔

میری آنکھ کا آپریشن آدھ گھنٹے میں مکمل ہو گیا۔ تاہم مجھے مزید دو گھنٹے ہسپتال میں گزارنے پڑے۔ ڈاکٹروں نے بے ہوش کرنے والی مقامی دوا استعمال کی تھی۔ اس لیے میں پوری طرح بے ہوش نہیں ہوا اور وہ میری دائیں آنکھ کے ساتھ جو کچھ کر رہے تھے اسے محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے دو ہفتوں کے دوران ہر چوتھے روز چیک کرانے کو کہا گیا۔ اس دوران ڈاکٹر طور نے دلچسپ مقامات دکھائے۔ نیاگرا آبشار کو دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔ میرے دونوں بیٹے ہارون اور عرفان جو امریکہ میں زیرِ تعلیم تھے' میرے ساتھ تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ لوگ کس طرح بڑی جھیل کی طرف کشتیوں میں جا رہے تھے' میں نے دیکھا

کہ کشتیاں آبشار کی طرف سے چٹان اور آبشار کے مابین تنگ سرنگ میں داخل ہو رہی تھیں۔ اس عظیم آبشار کے پیچھے جانے کے تصور سے ہی مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی۔ وہ واقعی عجیب چیز تھی۔ جس نے گھنٹوں کے لیے مجھے اپنے اندر جذب کرلیا۔



باب48

اسباب کی دنیا

اخبارات میں جرائم کی کہانیوں کی شہ سرخیاں عام لوگوں میں اکثر خوف و ہراس پیدا کردیتی ہیں۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ ان کی جان و مال کو تحفظ میسّر نہیں کیونکہ ایک مہذّب ملک کے شہریوں کی حیثیت سے انہیں ایسی توقع کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہے۔ اس کا سبب جو اکثر سننے میں آیا۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ پولیس نااہل اور رشوت خور ہے۔ بہت کم افراد اس حقیقت کا ادراک رکھتے ہیں کہ اس کی اصل وجہ کچھ اور ہے۔ امن وامان کی خراب صورتِ حال کی بہت سی وجوہ ہیں اور اس کے ساتھ پولیس کے علاوہ دوسرے بہت سے افراد وابستہ ہیں۔

قانون شکن افراد کی عزت افزائی

جب حکومت کا کوئی اخلاقی جواز نہ ہو تو قانون کے نفاذ کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔

عدالتوں کی نظر میں جرائم اور مجرمین کے خلاف درست اقدامات بھی مشکوک ٹھہرتے ہیں جس سے مجرموں کے ساتھ نرم سلوک کرنے کی گنجائش پیدا ہوجاتی ہے۔ جب مجرم اور سیاسی مخالف کے مابین امتیاز ختم ہو جائے تو عدالتی کنٹرول کمزور پڑ جاتا ہے۔

اکتوبر 1958ء میں آئین کو منسوخ کردیا گیا اور ملک کی اعلیٰ ترین عدالت نے اسے جائز

قرار دے دیا تو قانون شکنی کو انتظامیہ اور عدلیہ دونوں طرف سے تقدس حاصل ہوگیا۔ جس کے نتیجہ میں ''سچائی طاقت ہے'' (Right is might) کا اصول جس کی لاٹھی اس کی بھینس (Might is right) میں بدل گیا اور ''قانون کی حکمرانی'' کی جگہ ''حکمرانوں کے قانون'' نے لے لی۔ قانون کے مناسب طریقِ کار کے ذریعے فوجداری نظام عدل گستری میں ہر طرح کے ''شارٹ کٹ'' استعمال کیے جانے لگے اور معاملات کو تیزی سے نمٹانے کی عادت اپنالی گئی۔ مختلف گروپ منظر پر نمودار ہوئے اور اپنے مخصوص مفادات کی بنیاد پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے لگے۔ قانون کی بالادستی پر اقتدار واختیار کی بالادستی نے سبقت حاصل کر لی۔

انصاف سے انکار نے محروم گروپوں کو قانون اپنے ہاتھوں میں لینے اور جتنی بھی ''طاقت'' میسر ہو' اسے استعمال کرنے پر مجبور کر دیا۔ مجرمانہ ذہنیت کو عام طور پر قبول کر لیا گیا' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرم کو نیوز میڈیا' فلموں اور لٹریچر کے ذریعے تقدس حاصل ہوگیا۔ اس قبولِ عام نے مجرمانہ ذہنیت کو مزید تقویت پہنچائی جس نے معاشرہ کو بدمعاشی' قانون شکنی اور طاقت کے وحشیانہ استعمال کی تعریف وتوصیف کرنے کے رجحان کی طرف دھکیل دیا۔

قانون کے نفاذ کا درجہ گھٹا کر اسے حکمران کے اختیار پر عملدرآمد کا نام دے دیا گیا۔ یہ کام سب سے پہلے مارشل لا حکام نے کیا۔ بعد میں سول حکومتوں کی جابرانہ قوت نے جو ہمیشہ نقصان دہ ہوتی ہے' قانون کی حکمرانی کی ظاہری شکل وصورت بھی تباہ کر دی اور اخلاقی ومعاشرتی بگاڑ کو پروان چڑھایا۔ طاقت قانون کی حکمرانی برقرار رکھنے کے لیے صرف قانون کے مضبوط بازو کے طور پر کارآمد ہو سکتی ہے' حکمرانوں کے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے نہیں۔

ہمارے ہاں انٹیلی جنس ایجنسیاں ہمیشہ قانون سے بالاتر رہی ہیں۔ ذرائع کو ترقی دینے کے بہانے وہ سنگین جرائم مثلاً سمگلنگ اور منشیات کے کاروبار کی سرپرستی کرتی ہیں اور قومی مفادات کو قطعاً مدِنظر نہیں رکھا جاتا۔

قانون کی حکمرانی سے صرفِ نظر نے خود فوج کو بھی متاثر کیا ہے جو اس کی سب سے زیادہ پابند ہوتی ہے۔ جنرل آصف نواز چیف آف آرمی سٹاف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے افسروں سے کہہ دیا تھا کہ اپنا کام کرتے وقت انصاف اور نظم وضبط کے مسلمہ اصولوں کی پرواہ نہ کریں۔ اس

کے نتیجہ میں بہت سے سنگین واقعات رونما ہوئے۔ مسلح فوجیوں نے ایک منصوبہ کے تحت گلبرگ (لاہور) کے تھانہ پر دن دہاڑے ہلّہ بول دیا جسے سینکڑوں افراد نے افسوس کے ساتھ دیکھا۔ بہاولپور میں دو میڈیکل ڈاکٹروں کو محض اس بات پر زدوکوب کیا گیا کہ ان کی گاڑی نے فوجی جیپ کو پاس کیوں کیا۔ گوجرانوالہ میں ایک میجسٹریٹ اور پولیس والوں کو اس لیے جان چھڑانی مشکل ہوگئی کہ انہوں نے غلط جگہ پر کھڑی ہوئی کار کا چالان کردیا تھا جو بعد میں کسی جنرل کی نکلی۔

جب میں نے ایسے واقعات کے متعلق جنرل آصف نواز سے بات کی تو انہوں نے اپنے جوانوں کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے سے اتفاق کیا۔ وہ بھی اس وقت جب میں نے ان پر زور دیا کہ بدنظمی کے ایسے معاملات کی روک تھام نہ کی گئی تو وہ خود فوج کی ہائی کمانڈ کے لیے سنگین مسئلہ بن جائیں گے۔ انہوں نے قانون شکنی کرنے والوں کی گردن دبوچنے کا وعدہ کرلیا لیکن ان کی طرف سے کی گئی کسی تادیبی کارروائی کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔

حقیقت میں وہ ڈسپلن توڑنے والوں کو سزا دینے میں ناکام رہے' الٹا مجرموں کو تحفظ دیا گیا۔ انہوں نے 1992ء میں سندھ میں فوجی ایکشن کے دوران صرف ایم کیو ایم کو نشانہ بنایا حالانکہ انہیں صوبہ بھر میں پھیلے ہوئے ڈاکوؤں اور رہزنوں کے خلاف کارروائی کرنی چاہیے تھی۔ ایم کیو ایم کے بعض شرپسند عناصر بھاگ کر لاہور پہنچ گئے تھے' بروقت اطلاع ملنے پر پولیس نے ان سب کو قابو کرلیا۔ جنرل آصف نے مجھ سے ان کی رہائی کے لیے رابطہ کیا۔ میں نے جواب دیا کہ ''وہ تو قاتل اور مجرم ہیں۔ ان کی گرفتاری فوجی ایکشن کے مقاصد حاصل کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔'' وہ کہنے لگے۔ آپ کراچی کی صورتِ حال سے پوری طرح آگاہ نہیں ہیں۔ میں بڑے چوروں کو پکڑنے کے لیے ان چھوٹے چوروں کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔'' لیکن میں نے ان سے اتفاق نہیں کیا۔

پھر وہ وزیراعظم کے پاس پہنچے۔ انہوں نے میاں صاحب سے جو کچھ کہا' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواز شریف فوراً لاہور آئے اور ایئرپورٹ پر ایک اعلیٰ سطح کا اجلاس بلایا۔ وہ میرے دلائل سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اس کے بعد سپیشل برانچ کے ایڈیشنل آئی جی میجر ضیاء الحسن نے زیرِ حراست افراد کے جرائم کی تفصیل بیان کی۔ جب میاں صاحب نے قدرے جذباتی انداز میں اصرار کیا تو گرفتاریوں کا جواز پیش کرنا

پڑا۔ وزیر اعظم نے اپنا ذہن بدلنے کی بجائے خفگی کا اظہار شروع کردیا۔ آرمی چیف کا بہت زیادہ دباؤ کارگر ثابت ہوا۔ ناچار ہم نے درمیانی راستہ نکالا اور انہیں ضمانت پر رہا کردیا۔ بعدازاں وہی مجرم عناصر ایم کیو ایم (حقیقی) کے نام سے کراچی میں سرگرمِ عمل ہوگئے۔ جنرل آصف اُن کی سرپرستی کرنے لگے۔

دوہرا معیار

ہمارے معاشرہ کے مراعات یافتہ طبقے قانونی پابندیوں کا احترام کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ سیاستدان، مذہبی رہنما، سرکاری ملازم، طلبا وغیرہ اعلانیہ قانون شکنی کرتے اور اس کا منہ چڑاتے ہیں۔ صرف عام شہری قانون کا احترام کرتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے ایک بار فرمایا تھا کہ بہت سی قومیں اس لیے تباہ ہوگئیں کہ ان کے اشرافیہ خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے تھے۔

حب الوطنی کو زنگ کیوں لگ گیا؟

فوجی اور سول بیوروکریٹس نے باہم گٹھ جوڑ کرلیا کہ لوگوں کو اپنے معاملات کے انتظام میں شریک نہیں کریں گے۔ اس سے جنم لینے والی مایوسی ومحرومی نے حب الوطنی کے ان جذبات کو زنگ آلود کردیا جو لوگوں کو جرائم کے ارتکاب اور قانون شکنی کے خلاف نبرد آزما ہونے پر ابھارتے ہیں۔ ملک سے محبت اور اس کے قوانین پر عمل میں بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ محبت میں کمی واقع ہوجائے تو وہ لاقانونیت پر اُبھارنے کا سبب بنتی ہے۔

اخلاقی اقدار کا انحطاط

کسی معاشرہ کی اخلاقی اقدار اس کے قوانین کو تقدس عطا کرتی ہیں۔ قانونی ضابطوں سے انحراف نے خصوصاً 54-1953ء سے آخرکار 1958ء میں ہمیں ایسے نظامِ حکومت کی طرف دھکیل دیا جس کا کوئی قانونی جواز نہیں تھا۔ انسان دوستی سکھانے والے اخلاقی اور علمی عوامل مادی ترقی کی راہ پر اُبھارتے رہے جبکہ انسان کی روحانی ضروریات کو نظر انداز کردیا گیا۔ اخلاقی اقدار جو معاشرہ کے اتحاد و ہم آہنگی کے لیے بڑی اہم ہوتی ہیں۔ مادی آسائشوں کی بلا روک ٹوک دوڑ میں بھاری دباؤ تلے آگئیں۔ یہ چوہا دوڑ آخرکار اپنے برگ وبار لا کر رہی۔

انسانیت سے عاری اور وحشت و بربریت پر مبنی ماحول میں جس میں آئین وقانون کی پامالی پر

فخر کیا جانے لگا' نہ صرف جرائم سے صرفِ نظر کیا گیا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ دولتمندی کی علامات مثلاً بینک' مارکیٹیں اور پلازے محروم و نادار لوگوں کو جرائم پر ابھارنے لگے۔ ان کے خیال میں ان جگہوں کے زیادہ تر مالکان بذاتِ خود لٹیرے تھے۔ محتاج و مفلس لوگوں کی مجروح اور راہ سے بھٹکی ہوئی نفسیات غصہ سے پاگل ہوگئی اور طرح طرح کی مجرمانہ سرگرمیوں کے ذریعے اپنا آپ منوانے لگی۔

میڈیا راہ سے بھٹک گیا

دولت کمانے کا خبط تفریحی میڈیا کو گنوار پن اور فحاشی کی طرف لے گیا۔ میڈیا خصوصاً فلموں' درآمد کردہ فلموں اور مغربی سٹائل میں ڈھالے گئے میوزک' مقامی نیز درآمد کردہ اخبارات' رسائل اور کتابوں نے اخلاقی پابندیوں کو کمزور اور معاشرتی اقدار کو انحطاط پذیر کرنے کی راہ ہموار کی۔ میڈیا اپنی اصل سمت بھول گیا اس نے اقدار کو تقویت پہنچانے کی بجائے برائیوں کے خلاف معاشرتی فصیلوں کو تباہ کرنا شروع کردیا۔

متروکہ جائیداد کی حرص

قیامِ پاکستان سے قبل شہروں میں کاروبار اور جائیداد کے مالک زیادہ تر ہندو اور سکھ تھے۔ ان کے بھارت چلے جانے سے لوگوں کو راتوں رات امیر بننے کے مواقع میسّر آئے۔ بہت سے مہاجرین نے جھوٹے کلیموں کے ذریعے انڈیا میں جو کچھ چھوڑ کر آئے تھے' اس سے کہیں زیادہ جائیداد ہتھیالی۔ کلیم داخل کرنے والوں اور بیوروکریٹس دونوں نے فراڈ' دھوکہ دہی اور مکاری سے معاشرہ کے اخلاقی ڈھانچہ کو زبردست نقصان پہنچایا۔ جب لوگوں کو پورا معاوضہ نہیں ملا یا انہوں نے جو کچھ ہتھیا لیا تھا' وہ واپس کرنے کو کہا گیا تو ختم نہ ہونے والی مقدمہ بازی شروع ہوگئی۔ یہ سلسلہ ایک عشرہ سے زیادہ عرصہ تک جاری رہا۔ بعد ازاں ایوب حکومت نے مستقل آبادکاری کے لیے جو اسکیم بنائی اس نے معاملات کو اور بھی خراب کردیا۔

تعلیم کے شعبہ میں انحطاط

انگریز جو تعلیمی نظام چھوڑ کر گئے تھے' وہ ایک آزاد ملک کی ضروریات سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اس کی اصلاح کرنے کی بجائے 1955ء میں کسی امتحان میں حاصل کردہ نمبروں کو میرٹ کا تعین کرنے کے لیے واحد معیار قرار دے کر صورتِ حال کو مزید خراب کردیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جائز و ناجائز طریقہ سے

زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کی پاگلوں والی دوڑ شروع ہوگئی اور طالب علم کی کسی مضمون میں قابلیت اور اس کی لگن کو نظر انداز کر دیا گیا۔

فرقہ واریت کو فروغ

فرقہ وارانہ تعصب کے ساتھ بہت سے خطرات وابستہ ہوتے ہیں۔ خواہ اسے سیاست میں کامیابی کے آسان راستہ کے طور پر اپنایا جائے یا دوسرے ملکوں کے زیرِ اثر اور ان کی مالی مدد سے لڑائی اپنے سر لینے کی صورت میں اختیار کیا جائے۔ زورِ بازو حاصل کرنے کی کوششیں ان مجرموں کو محفوظ ٹھکانہ فراہم کرتی ہیں جو مذہبی فرائض کے نام پر مختلف جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مفرور مجرموں کے لیے فرقہ وارانہ آڑ سب سے زیادہ محفوظ ٹھکانہ ہوتی ہے۔

معاشرتی ناانصافی

اگرچہ یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار آنے والی حکومتیں سب کو روزگار کے مناسب مواقع فراہم کرنے اور اقتصادی فلاح و بہبود کے اسلامی اصولوں پر عملدر آمد کے وعدے کرتی رہیں، لیکن عملی طور پر کچھ نہیں کیا گیا۔ گزشتہ برسوں کے دوران عدم مساوات اس قدر بڑھ گئی کہ کم مراعات یافتہ طبقے مایوسی کا شکار ہوگئے۔ خوشحالی کے جزیرے نفرت کے نشان بن گئے اور ناجائز طریقوں سے حاصل کی گئی دولت نے اکثر صورتوں میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔ حکمرانوں نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ معاشرہ میں امن کا قیام محض انصاف اور مساوات کے ذریعے ممکن ہے۔

اندرونی دہشت گردی

جب حکومتیں اپنے مخالفین سے نمٹنے کے لیے آمرانہ اور غیر جمہوری ہتھکنڈے استعمال کرنے لگیں اور قانون نیز عدالتوں کے ذریعے انصاف ملنا ناممکن ہوجائے تو انصاف سے محرومی قانون کی خلاف ورزی بلکہ اندرونی دہشت گردی کا سبب بن جاتی ہے جو واحد عملی متبادل ہوتا ہے۔ عوامی سطح پر احتجاج اور تحریکیں شروع ہوجاتی ہیں جو تشدد اور دہشت گردی کا موجب بنتی ہیں یہاں تک کہ خود حکومت کا دھڑن تختہ ہوجاتا ہے۔ اس عمل سے اقتدار کے احترام پر زد پڑتی ہے۔ وہ جرائم پیشہ لوگوں کے لیے سنہری موقع ہوتا

ہے۔ جو سیاسی سرگرمیوں کی آڑ میں خوب ہاتھ رنگتے ہیں۔

تونگری کا جرم

خاندانی نظام کا بطور ادارہ خاتمہ اور بیرونی اثرات کے تحت معاشرتی اصولوں کی شکست وریخت دولت مند بننے کے خبط کا سبب بنی۔ خوشحال گھرانوں کے تعلیم یافتہ چشم وچراغ تفریح طبع کے طور پر جرائم کا ارتکاب کرنے لگے۔ وہ ایسی زندگی کی بوریت سے نجات پانے کے لیے جس میں انہیں کسی قسم کے چیلنجوں سے واسطہ نہیں پڑتا، ڈاکے بھی ڈالنے لگے۔ انہیں گرفتاری کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ وہ اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ ان کے والدین کی دولت اور اعلیٰ پوزیشن انہیں کسی بھی مصیبت سے بچا لے گی۔ پولیس اور عوام ان کے سامنے بے بس ہوتے ہیں۔

غربت وافلاس کا جرم

تعلیمی سہولتوں کا پھیلاؤ اور روزگار کے ناکافی مواقع ایسے تعلیم یافتہ (لیکن کسی ہنر کے بغیر) نوجوانوں کی تعداد میں اضافہ کا باعث بنے جو ملازمت کے متلاشی تھے۔ باطنی خامیوں اور روزی کمانے کے لیے خاندانی دباؤ نے بہت سے نوجوانوں کو مجرمانہ زندگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے مصیبت کے مارے دوسرے ہم عمر ساتھیوں کو ساتھ ملا کر مجرموں کے گروہ بنا لیے جو پولیس اور عوام کے لیے دردِ سر بن گئے۔

فوجداری نظامِ عدل کا بگاڑ

فوجداری نظامِ عدل گستری نے ایک مربوط ڈھانچہ کے طور پر طویل مدت میں ترقی پائی تھی۔ ایک طرف پولیس مجرموں کو پکڑتی اور ان کے خلاف بھرپور تفتیش کے ذریعے قوی ترین شہادت پیش کرتی تھی، دوسری طرف عدالتیں اس امر کو یقینی بناتی تھیں کہ مجرم کا قانون کے تحت اطمینان بخش طریقہ سے جرم ثابت ہونے کے بعد اسے عبرتناک سزا دی جائے۔

چونکہ سیاست میں غیر جمہوری حربے استعمال کیے جانے لگے، حکمران بدمعاشوں کو تحفظ دینے

اوران کی حوصلہ افزائی کرنے لگے‘ دوسری طرف سیاسی حریفوں کو کچلنے کے لیے استبدادی اور ظالمانہ طریقے بروئے کار آنے لگے۔ اس لیے عدالتوں کو اس بات پر یقین کرنا محال ہوگیا کہ جو شخص مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہے‘ وہ واقعی قصوروار ہے۔ یہ کہ اس کے خلاف جو شہادت پیش کی گئی وہ حقیقی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے صادر کردہ فیصلہ پر اس کی روح کے مطابق عملدرآمد کیا جائے گا یا نہیں۔

چونکہ عدالتی مشینری کمزور پڑ گئی اور جرم نیز مجرموں کے خلاف رکاوٹیں ختم ہوگئیں‘ اس لیے ظلم و تشدد میں اضافہ ہوگیا اور جرائم میں کمی نہیں آئی۔

بیرونی اثرات

جرائم کی صورتِ حال میں بلاشبہ اندرونی عوامل اور اس پر بیرونی اثرات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ حالیہ برسوں کے نمایاں اثرات اس ’’جہاد‘‘ کا نتیجہ ہیں جو روسی تسلط کے خلاف افغانستان میں کیا گیا۔ قبائلی علاقوں کی خصوصی حیثیت ختم نہ ہونے سے بھی جرائم میں اضافہ ہوا ہے۔

قبائلی علاقوں میں مجرموں کے ٹھکانے

انگریز افغانستان کی سرحد پر ڈیورنڈ لائن کے ساتھ واقع قبائلی علاقہ میں اپنے قوانین نافذ کرنے میں ناکام ہوگئے تو انہوں نے قبائلی لوگوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنے معاملات کا اپنی رسوم وروایات کے مطابق خود بندوبست کر سکتے ہیں‘ سرکاری افسر جنہیں ’’ریذیڈنٹ‘‘ یا ’’پولیٹیکل ایجنٹ‘‘ کہا جاتا تھا‘ محض قبائلی سرداروں کے ساتھ تعلق قائم کرنے اور انہیں محفوظ سرحدوں کے اندر رکھنے کے لیے مقرر کئے جاتے تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ’’دیسی صاحبوں‘‘ نے جو انگریزی راج میں غلاموں کے طور پر کام کرتے رہے تھے۔ اس غیر معمولی اور ماورائے قانون صورتِ حال کو جاری رکھا اور قبائل کو باقی ملک کے ساتھ ملانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس فعل کو باقی ملک میں جرم سمجھا جاتا ہے‘ قبائلی علاقہ میں اس کی حیثیت وہ نہیں۔ اس طرح وہ علاقہ مجرموں کے لیے محفوظ پناہ گاہ بن گیا۔

قبائلی سردار سرمایہ یا دوسری ترغیبات کے عوض بھگوڑے مجرموں کو پناہ دے کر جرائم کی حوصلہ

افزائی کرتے ہیں۔ چونکہ وہاں عام قوانین لاگو نہیں ہوتے اس لیے قبائلی سرداروں کی صوابدید پر ہے کہ مجرم پولیس کے حوالے کریں یا نہ کریں۔ بعض ایسے مجرم بھی جن کا تعلق مجرموں کی تنظیموں سے ہوتا ہے بعض نا عاقبت اندیش سرداروں کے تعاون سے پناہ لینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

آزادی کے بعد کے ابتدائی برسوں میں افغانستان سے پاکستان کو ایسی اشیا کی سمگلنگ شروع ہوگئی جو بظاہر افغانستان میں فروخت کے لیے درآمد کی جاتی تھیں چونکہ قانونی درآمدات کے مقابلہ میں جن پر بہت زیادہ محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ سمگل کردہ اشیا بہت سستی پڑتی تھیں اس لیے غیر قانونی تجارت نے خوب فروغ پایا۔ قبائلی علاقہ میں پشاور کے قریب ''باڑا'' کے مقام پر اس کاروبار نے اس قدر فروغ پایا کہ ملک کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں سمگل شدہ مال کی باڑا مارکیٹیں کھل گئیں۔ ان کی مقبولیت سے درآمدی قوانین کی بڑے پیمانہ پر خلاف ورزی ہونے لگی اور انہیں بند کرنے میں ناکامی قانون نافذ کرنے والوں کی نااہلیت ظاہر کرتی ہے۔

منشیات کی لعنت

سمگلنگ میں عظیم کامیابی حاصل کرنے کے بعد قبائلی دوسرے نفع بخش کاروبار مثلاً منشیات کی طرف متوجہ ہوئے جس میں انہیں دنیا بھر میں خوب شہرت حاصل ہوئی۔ اگرچہ بیرون ملک مارکیٹیں بہت زیادہ نفع بخش تھیں لیکن منشیات نے کرپشن کی لہروں پر سوار ہوکر مقامی مارکیٹ میں بھی اچھی خاصی جگہ بنالی۔ نشہ کی لت جو کہ بہت مہنگی عادت ہے مایوس و محروم نشہ بازوں کو جرائم پر ابھارتی ہے۔

بعض قدرتی نشہ آور پودے مثلاً بھنگ اور افیون صدیوں سے ہمارے ملک میں دستیاب تھے تاہم ان کا استعمال معدودے چند لوگوں تک محدود تھا اور اسے معاشرتی طور پر پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ حالیہ عشروں میں مغرب نے نہ صرف صاف شدہ منشیات مثلاً کوکین، مارفین اور ہیروئن وغیرہ متعارف کرائیں اور نشہ آور ادویات کو بھی مقبول بنایا بلکہ نشہ کرنے والوں کو قابلِ احترام بنادیا۔ بہت سے افغانوں کے لیے جنگ کے بعد ان کی تباہ شدہ معیشت کو سہارا دینے کے لیے مغرب سے امداد نہیں آئی تو ان کے لیے منشیات کی تیاری اور ان کی سمگلنگ ہی واحد ذریعہ معاش بن گئی۔

یہ لعنت اعلیٰ سوسائٹی سے شروع ہوئی جو مغرب کے ہر خیال اور فیشن کو فوراً گلے لگالیتی ہے۔ پھر

اسے نچلے طبقات میں پھیلا دیا گیا کیونکہ جب اندرون ملک فراہمی اور بیرون ملک درآمد کے لیے پیداوار میں اضافہ ہوگیا اور وہ آسانی سے دستیاب ہونے لگیں تو ان کی قیمت گر گئی۔ منشیات جدید زندگی کی محرومیوں سے فرار کی آسان راہ دکھاتی ہیں۔ جو لوگ اس کے عادی ہو جائیں' ان کے خاندان بہت کم عرصہ میں مالی اور معاشرتی طور پر تباہ ہو جاتے ہیں۔ پہلے افراد اور گروہ مل کر جن جرائم کا ارتکاب کرتے تھے' منشیات کے آنے سے وہ پس منظر میں چلے گئے۔ جوں جوں منشیات کی فراہمی اور استعمال میں اضافہ ہوا' ان سے متعلق جرائم بھی بڑھ گئے۔ منشیات کی بے تحاشا دولت نے معاشرتی حالات کو اور بھی خراب کر دیا اور کرپشن انتہا کو پہنچ گئی۔

کلاشنکوف کلچر

1980ء کے عشرہ میں روسی تسلّط کے خلاف ''جہادِ افغانستان'' کے دوران امریکہ کے زیرِ سرپرستی مختلف ملکوں سے ہتھیار اور گولہ بارود کی بھاری مقدار پاکستان پہنچی۔ موت کے سوداگروں نے اسلحہ کی اتنی بھاری مقدار کا رخ لوگوں کی طرف کر دیا حتیٰ کہ کلاشنکوف، ٹیلی ویژن، سیٹ سے بھی سستی ہوگئی۔ بدمعاشوں نے تو اسالٹ رائفلیں محاوراتی ہاٹ کیک کی طرح خرید لیں' لیکن پولیس کو اتنا جدید اسلحہ میسّر نہیں آیا۔ 1950ء کی دہائی میں درّہ آدم خیل (قبائلی علاقہ میں ایک گاؤں) کے بنے ہوئے پستول اور عام گن تھوڑی بہت مقدار میں آتے تھے' لیکن 1980ء کی دہائی میں جدید ہتھیاروں کا سیلاب آ گیا۔ مہلک ہتھیاروں کی اتنی بھاری مقدار میں دستیابی نے جرائم کی صورتِ حال پر جو تباہ کن اثرات مرتب کیے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

کلاشنکوف جیسے مہلک ہتھیار کی آسانی سے اور سستے داموں دستیابی نے مجرموں کی نفسیات اور طریقہ واردات کو بڑی حد تک بدل دیا ہے۔ اپنے سامنے ناقص ساز و سامان سے لیس اور بے حوصلہ پولیس کو دیکھ کر ان کا سارا ڈر اور خوف جاتا رہا۔ ایک مجرم اپنے آٹومیٹک ہتھیار کو لہرا کر اور ہوا میں چند گولیاں فائر کر کے بے دھڑک فرار ہو سکتا ہے نہ اسے سرگرم تعاقب کا فکر ہوتا ہے نہ کسی شخص کی طرف سے مزاحمت کا۔ پولیس والے اپنے فرسودہ ہتھیاروں کے باعث بزدل بن گئے ہیں۔

غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکی

لوگ ہمیشہ نقل مکانی کر کے دوسرے ملکوں کو جاتے رہتے ہیں۔ اس دور کے آسان ذرائع نقل و حرکت نے ان کے لیے گھروں سے زیادہ دور تک جانا ممکن بنا دیا ہے۔ نقل مکانی اکثر حالات کے جبر یا بہتر مواقع کی تلاش کے لیے کی جاتی ہے۔ 1947ء میں اعلانِ آزادی کے فوراً بعد مشرقی پنجاب میں وسیع پیمانہ پر جو قتلِ عام ہوا اس نے لاکھوں انسانوں کو سرحد پار کرنے پر مجبور کر دیا۔ 1980ء کے عشرہ میں افغانستان پر روسی قبضہ کے باعث تیس چالیس لاکھ افغان باشندے پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ کراچی میں روزگار کے بہتر مواقع دستیاب ہونے کی بنا پر بنگلہ دیش، بھارت، برما، سری لنکا اور دیگر پڑوسی ممالک کے لاکھوں افراد وہاں غیر قانونی طور پر مقیم ہیں۔

نقل مکانی کر کے آنے والوں میں بدمعاش و بدقماش افراد بھی شامل تھے، خصوصاً ایسے عناصر جو اچھی طرح جانتے تھے کہ اپنی برادری میں کیسے کام کیا جا سکتا ہے۔ ہماری پولیس غیر ملکی جرائم اور مجرموں سے واقف نہیں تھی۔ لسانی اور ثقافتی رکاوٹوں نے مسئلہ کو اور بھی سنگین بنا دیا۔ چنانچہ فرسودہ ساز و سامان سے لیس اور ناقص تربیت یافتہ پولیس کے لیے ایسی غیر معمولی صورتِ حال سے نمٹنا محال ہو گیا۔

بیرونی دہشت گردی اور تخریب کاری

ہندو کی نفسیات نے بڑے مقدس اعلانات و اعترافات کے باوجود پاکستان کے قیام کو دل سے ہرگز قبول نہیں کیا۔ ہندو معاشرہ نے ہندوستان پر مسلمانوں کے قریباً ایک ہزار سالہ راج کو کبھی فراموش نہیں کیا اور اس میں مسلمانوں کے خلاف صدیوں سے شدید نفرت پائی جاتی ہے۔ انگریزی راج کے اختتام پر پچھلا حساب چکانے اور انتقام لینے کا وقت آیا تو ایک نئے ملک کی تخلیق نے ان کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ اس لیے اگر بھارت ہمارے لیے کبھی ایک اور کبھی دوسرا بہانہ بنا کر مشکلات پیدا کرتا رہا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

ہمارے خلاف بھارت کی طرف سے دہشت گردی اور تخریب کاری ہمیشہ جاری رہی۔ البتہ اس کی شدت میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔ بعض اوقات وہ شمال میں واقع اپنے اتحادیوں کے گٹھ جوڑ سے تخریبی کارروائیاں کرتا ہے۔ 1980ء کے عشرہ میں یعنی ''جہادِ افغانستان'' کے دوران بیرونی دہشت گردی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی، جو بہت سی دیگر مجرمانہ سرگرمیوں خصوصاً ہتھیاروں اور منشیات کی تجارت کا سبب بنی۔ ان

سرگرمیوں نے مجرمانہ پس منظر رکھنے والے بہت سے عناصر کو بے بہا دولت اور دوسرے پُرکشش محرکات نیز تخریب کاروں اور دہشت گردوں کو مقامی طور پر وارداتیں کرنے کی ترغیب دی۔ (مزید تفصیلات کے لیے باب 22 ملاحظہ کیجئے)

رکاوٹیں

اگرچہ جرائم کی صورتِ حال پر اثر انداز ہونے والے بہت سے معاشرتی عوامل تھے' تاہم اس سلسلہ میں پولیس اور عدلیہ کے کردار کے غیر مؤثر ہونے کی متعدد وجوہ تھیں' خواہ عدم توجہ کی بنا پر ایسا ہوا یا ناپاک ارادوں کی تکمیل کے لیے دانستہ ایسے اقدامات کیے گئے۔

لوگوں کی اجنبیت ومخالفت

آمرانہ پس منظر رکھنے والے غیر جمہوری حکمرانوں نے پولیس کو اپنے من مانے احکام نافذ کرنے اور اپنے مخالفین نیز حریفوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے استعمال کیا' جس سے لوگ پولیس کے خلاف ہوگئے۔ اب اسے قانون کی محافظ اور کمزور کی حفاظت کرنے والی فورس نہیں سمجھا جاتا۔ معاشرہ کو جسے امن میسر نہیں تھا۔ پولیس سے رجوع کرنے کی بجائے بدمعاشوں سے معاملہ طے کرنے پر مجبور کردیا گیا۔ اندریں حالات جرائم کو خوب فروغ ملا۔

پولیس کا غلط استعمال

حکمرانوں نے پولیس کو کبھی بھی اپنی نجی ملیشیا سے زیادہ حیثیت نہیں دی۔ پولیس ملازمین کو سیکورٹی کے نام پر گھنٹوں وی وی آئی پی شخصیات کے راستہ پر پہرہ دینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلح پولیس والوں کو ان کی رہائش گاہ پر بطور محافظ ڈیوٹی دینا پڑتی ہے یا باڈی گارڈ یا پائلٹ یا متحرک اسکارٹس (Mobile Scorts) کے طور پر ان کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ ان محافظوں کا واحد مقصد جس کی اکثر صورتوں میں قانون اجازت نہیں دیتا' وی آئی پی حضرات کی انا کو تسکین پہنچانا اور ان کے حریفوں نیز ووٹروں کو مرعوب ومتاثر کرنا ہوتا ہے۔

پولیس کی افرادی قوت کو جو پہلے ہی ضرورت سے کم ہے' جرائم کی روک تھام اور تفتیشی ذمہ

داریوں سے ہٹا کر دوسرے کاموں میں لگا دیا جاتا ہے جس سے ان کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور توانائی بھی۔ اگر پولیس کو اس جبری مشقت یعنی بیگار سے نجات مل جائے تو تھکی ہاری اور یہ پست ہمت پولیس کے لیے بہت بڑی ریلیف ہوگی۔

پولیس کی قوت اور توانائی پٹرول پمپوں، بینکوں، سفارت کاروں، ججوں اور انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں کی حفاظت کرنے بلکہ مذہبی جنونیوں اور شر پسندوں کو ان کے دشمنوں سے محفوظ رکھنے پر بھی خرچ ہوتی ہے۔ سیکورٹی اور گارڈ کی بہت سی ڈیوٹیاں پرائیویٹ سیکورٹی ایجنسیوں کو سونپی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح عدالتوں سے متعلق فرائض مثلاً سمنوں اور وارنٹوں کی تعمیل کا کام کسی علیحدہ فورس کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔

منصوبہ کے بغیر آبادکاری

آبادی میں قدرتی اضافہ اور کئی عشروں کے دوران دیہاتوں سے لوگوں کی بھاری تعداد میں شہروں کی طرف نقل مکانی نے شہروں کا معاشرتی توازن خراب کر دیا ہے۔ لوگوں کو شہری سہولتیں فراہم کرنے اور ان کی نگہداشت کرنے میں حکامِ بالا کی ناکامی سے عوام میں مایوسی اور بے چینی پھیلی۔ مناسب روزگار کے فقدان نے جرم کی ترغیب اور کشش کو ناقابلِ مزاحمت بنادیا۔ جھگیوں اور جھونپڑیوں پر مشتمل کچی آبادیاں کثرت سے وجود میں آگئیں جو مجرموں کے لیے تنگ و تاریک ٹھکانوں کا کام دیتی ہیں۔ شہری زندگی کی گمنامی نے بھی مجرموں کو فائدہ پہنچایا۔

اس کے برعکس روزگار کے مواقع کی تعداد میں اس نسبت سے اضافہ نہیں ہوا جس نسبت سے شہری آبادی بڑھی ہے۔ علاوہ ازیں تاجروں اور صنعت کاروں کو جو مجموعی طور پر حکومت سے بھی زیادہ روزگار کے مواقع پیدا کرتے ہیں، بھٹو کی قومی تحویل میں لینے کی پالیسی سے ایسا دھچکا لگا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے پاؤں پر دوبارہ کھڑے ہوسکے۔ اس کوتاہ اندیش پالیسی کے اخلاق اور قانون پر جو منفی اثرات مرتب ہوئے وہ کسی بیان کے محتاج نہیں۔

عرصۂ دراز کے بعد ناگزیر اقدامات

انسانی معاشرہ کو اپنے حالات میں تبدیلی لانے یا اصلاح کرنے کے لیے توازن درکار ہوتا ہے۔ جب راستے کچے تھے تو ڈاکو اور پولیس والے دونوں گھوڑے پر سفر کرتے تھے۔ ان کے لیے اس وقت

بھی مشکلات موجود تھیں۔ اب کسانوں کے فائدہ کے لیے کھیت سے منڈی تک سڑک بنادی گئی ہے جو مجرم کو اپنی گاڑی میں تیزی سے فرار ہونے میں مدد دیتی ہے۔ جس کا ظاہری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ موبائل پولیس کو اچھے ٹیلی مواصلاتی نظام کی سہولت فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ نئی سڑک کے اہم مقامات پر چیک پوسٹیں بھی ہونی چاہئیں، ورنہ معاشرہ کو عدم توازن کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

شہروں اور قصبوں میں جو تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ نئے تھانے اور پولیس چوکیاں قائم کرنے کا اہتمام شاذ ہی کیا جاتا ہے۔ حالانکہ نئی کالونیوں اور بستیوں میں جرائم سے نمٹنے کے لیے ایسا کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اکثر صورتوں میں پولیس بلڈنگز کے لیے جگہ بھی مخصوص نہیں کی جاتی۔ اس کے برعکس مجرم آئندہ کی منصوبہ بندی کرکے اپنے لیے ٹھکانے بنا لیتے ہیں۔ اس میں حیرت و تعجب کی کوئی بات نہیں نئے اور نسبتاً خوشحال باشندے جرائم کا نشانہ بننے پر پولیس تحفظ کے لیے شور مچاتے ہیں۔ ان کے لیے بہتر ہے کہ شہروں کی منصوبہ بندی کرنے والوں اور ترقیاتی کاموں کے انچارج حکام سے جواب طلبی کریں کہ انہوں نے نئی کالونی میں پولیس سٹیشن یا چوکی کے لیے جگہ کیوں نہیں رکھی۔

ہر ترقیاتی منصوبہ میں سیکورٹی اسکیم اس کے لازمی جز کے طور پر شامل ہونی چاہیے۔ جوں جوں شہروں کی آبادی میں اضافہ ہوتا جائے، ان کی سیکورٹی ضروریات کا تفصیلی سروے ہونا چاہیے۔ دہلی کی آبادی لاہور سے محض ڈیڑھ گنا ہوگی۔ لیکن اس کی پولیس لاہور کی پولیس سے تین گنا زیادہ ہے۔ منصوبہ بندی اور وسائل مخصوص کرنے سے بہت زیادہ فرق پڑتا ہے۔

عوامی حمایت پر مشتمل نظام کا خاتمہ

ماضی میں ہمارے پاس بکھرے ہوئے اور طویل فاصلوں پر واقع دیہات تک میں وہاں کے سرکردہ اور نمایاں افراد کے ذریعے جو لائق احترام خطابات کے حامل ہوتے تھے نگرانی و پاسبانی کا بڑا کارآمد اور مؤثر نظام موجود تھا۔ پنجاب میں ایسے اعزازی حکام کو ذیلدار (12 گاؤں پر مشتمل ذیل کا سربراہ) سفید پوش (معزز آدمی) اور نمبردار (لفظی معنے نامزد کردہ شخص جو گاؤں میں مالیہ کی وصولی کا ذمہ دار ہوتا ہے) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان کے پاس چند ملازم مثلاً چوکیدار، دفعدار وغیرہ ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو جاگیردار اور کسان مشترکہ طور پر معاوضہ دیتے تھے۔

یہ نظام جس کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں ذیلی فورس ہوتی تھی، نچلی سطحوں پر فوجداری نظام

عدل گستری کی بڑی مؤثر مدد کرتا تھا اور حکومت کو قطعاً کوئی خرچ برداشت نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مجرم جانتے تھے کہ سب میں سرایت کر جانے والے اس نظام کی چوکس اور گہرائیوں میں اتر جانے والی نگاہ سے بچنا بڑا مشکل ہے۔

افسوس ہے کہ آزادی کے بعد اس نظام کو ''انگریزی راج کا ورثہ'' قرار دے کر ختم کر دیا گیا۔ اس کی جگہ اس سے بہتر نظام نافذ نہیں کیا گیا۔ کم تنخواہ پانیوالے' ناقص تربیت والے اور حوصلہ ہارے ہوئے جو سپاہی تعینات کیے گئے۔ انہیں نہ مقامی طور پر عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے نہ ہی وہ کوئی اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔

پنچایت کی جگہ بنیادی جمہوریت

صدیوں سے پنچایت کو گاؤں کی اجتماعی عقل و دانش کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ اتفاق رائے سے منتخب شدہ پنچایت اجتماعی قیادت بھی ہوتی تھی اور مقامی عدالت قانون بھی۔ بلاشبہ یہ ادارہ انگریزی دور میں اس وقت روبہ زوال ہوگیا جب حکومت نے اس کے ارکان نامزد کرنے شروع کر دیئے۔ اس نظام کو بحال کرنے یا اسے ازسرِ نو اہمیت دینے کی بجائے ایوب حکومت نے اسے ختم ہی کر دیا۔ اس کی جگہ ''بنیادی جمہوریت'' کا نظام رائج کیا گیا جس میں بی ڈی ممبروں کو انتظامی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے اور عدالتی بھی۔ سب سے نچلی سطح پر براہ راست الیکشن کے ذریعے عوامی نمائندوں کو تحصیل' ضلع اور ڈویژن کی سطح پر چنا جاتا تھا۔ اس نظام میں بنیادی اکائی کو ''یونین کونسل'' کا نام دیا گیا تھا' جو قومی اور صوبائی اسمبلیوں نیز صدر کا انتخابی ادارہ (Electoral College) بھی تھا۔

اس نظام میں بنیادی خرابی یہ تھی کہ انتخابات سب سے نچلی سطح سے متعارف کرائے گئے جس نے ایک خاندان کو دوسرے خاندان کے مقابل لا کھڑا کیا۔ مقامی دشمنیاں اور رقابتیں جو عموماً سوئی ہوئی تھیں پھر سے زندہ ہوگئیں تاکہ الیکشن میں غالب کردار ادا کر سکیں اور اگلے انتخابات تک زیادہ شدت سے جاری رہیں۔ چونکہ الیکشن کے لیے ووٹوں کی اکثریت ہی واحد معیار تھا' اس لیے بدمعاش اور ان کے مربی بھی میدان سیاست میں کود پڑے تاکہ عزت و احترام کا لبادہ اوڑھ کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔ وہ دولت کے ذریعے یا قوتِ بازو کے بل پر اکثریت حاصل کر لیتے تھے۔ انتظامیہ نے بھی جس سے توقع کی

جاتی تھی کہ انتخابی ادارہ کو حکمرانوں کے دائیں ہاتھ ڈکے گی اپنا کیل کودکھایا۔

بعد میں یونین کونسلوں کے عدالتی اختیارات واپس لے لیے گئے۔ اس طرح گاؤں کی سطح پر چھوٹے مجرموں کو سزا دینے کا اختیار باقی نہیں رہا۔ ہر مقدمہ پولیس کے ذریعے عدالتوں میں جانے لگا۔ ضابطہ کی تاخیر اور کرپشن مجرموں کے لیے بڑی مفید ثابت ہوئی۔

اے حمید نے ''پنچایتوں کے ذریعے جرائم پر کنٹرول'' کے عنوان سے ایک جامع مقالہ لکھا جسے حکومت پنجاب کے کسان کمیشن (آج کل کالعدم ہے) کی طرف سے شائع کیا گیا۔ ان کے تجزیہ سے ظاہر ہوا کہ پنجاب میں پولیس کے رجسٹرڈ کردہ 90 فیصد مقدمات کو پنچایتیں نمٹا سکتی ہیں۔ بشرطیکہ انہیں صحیح طریقہ سے بحال کر دیا جائے۔ انہوں نے ایک جامع مسودہ قانون بھی تیار کیا جس میں انگریزی دور کے پنچایت سے متعلق دو قوانین پر گرانقدر اضافہ اور ان میں خاصی اصلاح بھی کی گئی تھی۔ اگر مذکورہ قانون نافذ کر دیا جائے تو جرائم کو کم از کم دیہی علاقوں میں جو ہماری آبادی کا دو تہائی حصہ ہیں۔ مؤثر طور پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔

عدالتوں اور سینئر افسروں کا انصاف سے گریز

عدالتیں اور پولیس اپنا کام انجام دینے کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ دونوں کے مابین ہم آہنگی واشتراک عمل اس وقت ختم ہو گیا جب دونوں پر آمرانہ اور غیر جمہوری حکومتوں کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا۔ اگر انصاف کے ذریعے معاشرتی امن کو یقینی بنانا مقصود ہے تو سچائی کو ہر قسم کی تفتیش اور مقدمات کی بنیاد بنانا ہوگا تاکہ عدالتیں صحیح اور منصفانہ فیصلے کر سکیں۔ پولیس اور نچلی عدالتیں جھوٹ پر مبنی دم گھٹنے والے ماحول کا شکار ہو گئیں۔ جو ان کے گرد اعلیٰ ترین سطح کے بااختیار لوگوں نے پیدا کر دیا تھا۔

انصاف پسند ججوں اور سینئر پولیس افسروں نے اپنا دامن بچانے کے لیے سرگرم ہونے کی بجائے گریز کی راہ اختیار کی۔ جن لوگوں نے اخلاقی جرأت اور قانونی پوزیشن سے کام لیا انہیں چھان بین کے بعد ملازمتوں سے نکال دیا گیا یا دوسرے طریقوں سے سزا دی گئی۔ اپنی بقا کے لیے غیر سرگرمِ عمل ہونے کی کیفیت نے جو انتہائی عدم تحفظ سے پیدا ہوئی تھی۔ عدالتوں اور سینئر پولیس افسروں کی طرف سے قواعد و ضوابط کی غیر ضروری پابندی کی شکل اختیار کر لی۔ انہوں نے امن عامہ برقرار رکھنے کی ساری ذمہ داری

ماتحت اہلکاروں کو سونپ کر انہیں اجازت دے دی کہ اس فرض کو اپنی پسند و ناپسند اپنے طور طریقوں اور اپنے اطوار کے مطابق ادا کریں۔ ماتحتوں کی رہنمائی کرنے اور انہیں راہِ راست پر رکھنے کا کردار ترک کر دیا گیا۔

سینئر افسروں میں تنک چڑھا پن پیدا ہو گیا جس کے باعث انہوں نے تباہ کن منفی کردار کو عادتِ ثانیہ بنا لیا' وہ اپنے ماتحتوں پر بہت زیادہ نکتہ چینی کرنے لگے اور اختلاف رائے کا خواہ وہ کتنا ہی دانشمندانہ اور کارآمد کیوں نہ ہوتا، گلا گھونٹ دیا گیا۔ مشکل مسائل کو بحث مباحثہ اور اصلاح مشورہ کے ذریعے حل کرنے کی صحت مند روایت ترک کر دی گئی۔ ایسے حالات میں جرائم اور مجرموں کے خلاف عزم و ہمت اور لگن کے ساتھ کارروائی کرنا ممکن نہیں رہا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیارات میں کمی

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیارات اور اتھارٹی میں انتظامیہ اور عدلیہ کی علیحدگی کے نام پر کمی کر دی گئی' تاہم کوئی مؤثر متبادل فراہم نہیں کیا گیا۔ پہلے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا جرائم اور مجرموں پر قابو پانے کے لیے انتظامی اور عدالتی کوششوں میں مرکزی کردار ہوتا تھا۔ وہ ضلع کا چیف مجسٹریٹ' سب سے بڑا پراسیکیوٹر اور قیامِ امن کا ذمہ دار ہوا کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں اسے بہت زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ تاہم جرائم پر قابو پانے اور جلد انصاف کے لیے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ علاوہ ازیں عدالتیں اس کے اختیارات پر کڑی نظر رکھتی تھیں جیسا کہ اس وقت کی قانونی اسکیم کا تقاضا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور اس کے ماتحت مجسٹریٹوں کے ہر فعل کو اعلیٰ ترین عدالت قانون میں چیلنج کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جب خود آئین کو بازیچۂ اطفال بنا دیا گیا تو ہر چیز اپنی جگہ سے سرک گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے زیادہ وہ حقیقی بدمعاش تھے جو کسی کو جواب دہ نہیں تھے خواہ وہ کتنا ہی اہم اور کوئی بھی ہوتا۔ لیکن شہریوں نے جنہیں ان کے تمام حقوق سے محروم اور تہی دست کر دیا گیا تھا' اپنی ساری توجہ حقیقی مجرموں کی بجائے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ادارہ کی طرف مبذول کر دی حالانکہ قانون اور قانون کی حکمرانی سے متعلق نگرانی اور توازن کو پامال کرنے والے وہ خود تھے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اتھارٹی کو انصاف کے غلط فہمی پر مبنی تصورات کے تحت بے وقعت کر دیا گیا۔ سب سے پہلے دیہی پولیس کی مدد واپس لے لی گئی۔ پھر بھٹو حکومت نے اسے اس کے بہت سے

اختیارات سے محروم کر دیا حالانکہ نظریاتی طور پر امن و امان کا ذمہ دار اب بھی وہی تھا۔ بعد ازاں کچھ اور اختیارات چھین لیے گئے سیشن جج، جسے ان میں سے بہت سے اختیارات منتقل کر دیئے گئے تھے عدل گستری کا ذمہ دار تو تھا لیکن قیامِ امن و امان کا نہیں۔

ایوب خاں کی حکومت نے ڈپٹی کمشنر کو ترقیاتی کاموں میں الجھا دیا جو جرائم کے خلاف جدوجہد جیسے مشکل اور ناخوشگوار کام کے مقابلہ میں خاصی آرام دہ اور نفع بخش سرگرمی تھی۔ جب ڈپٹی کمشنر نے ترقی دہندہ کا کردار اپنا لیا تو وہ اس قدر مصروف ہو گیا کہ اس کے لیے ڈسٹرکٹ میجسٹریٹ کے فرائض ادا کرنا ممکن نہیں رہا۔ مجرم کو کھلی چھٹی مل گئی کہ جہاں چاہے وارداتیں کرتا پھرے۔ جرائم کی بیخ کنی کرنے کے لیے اکیلی پولیس رہ گئی جو مجرم کو گرفتار کرنے اور تفتیش کرنے کی مجاز تو ہے، سزا دینے کا قانونی اختیار نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ مجرموں کو نظر بند کرنا اور سزائیں دینا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا کام ہے۔

جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے قیامِ امن و امان سے متعلق فرائض پولیس کو سونپ دیئے تو طاقت کا غلط استعمال ناگزیر ہو گیا۔ پولیس نے حکمرانوں کے دباؤ میں آ کر طاقت کے غیر قانونی استعمال پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنی ساری توانائیاں حکومت کے مخالفین کو جھوٹے مقدمات میں پھنسانے پر صرف کرنے لگی۔

اعلیٰ عدالتوں اور ان کے ماتحت سیشن کورٹوں نے مسئول علیہان کے حقوق کا سرگرمی سے تحفظ کرنے کا کردار سنبھال لیا۔ بہت سے مقدمات میں پراسیکیوشن سیاسی وجوہات کی بنا پر اس قدر بدنیت ہو گئی کہ سیشن کورٹس نے اصل مجرموں کے خلاف صحیح مقدمات کی بابت بھی شک کرنا شروع کر دیا۔ عدالتوں کو یہ یقین نہیں رہا کہ کون سا فوجداری کیس سچا ہے اور کون سا جھوٹا۔ اس طرح حقیقی مجرموں کو اس سے کہیں زیادہ شک کا فائدہ ملنے لگا جتنا کہ ملنا چاہیے تھا۔ چونکہ مقدمات سیاسی بنیادوں پر بنائے جاتے تھے اس لیے عدالت کا ذہن جرم کا نشانہ بننے والے ملزموں پر زیادہ توجہ دینے لگا۔

اس عمل میں جرائم کی بیخ کنی کے اختیارات اور انصاف کو یقینی بنانے کے مابین نازک توازن پیدا ہو گیا۔ دوسری طرف مجرموں نے نظام کو ناکام بنانے کے لیے گروہ بنا لیے۔ ان کا نشانہ بننے والے مصیبتوں میں گرفتار اور حصولِ انصاف سے مایوس ہو گئے۔ ان میں بعض نے مجبوراً قانون کو ہاتھ میں لے لیا۔ جس سے صورتِ حال مزید خراب ہو گئی۔ انہیں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا تھا جو معقول قانونی اور اخلاقی

اختیار رکھتا ہو اور ان کی دادرسی کر سکے۔

اس وقت سے ہم نے ایسی ہر قسم کی عدالتیں قائم کرنا بند کر دیں جو انتظامی محکموں کی گود میں بیٹھ کر کام کرتی تھیں۔ جن کا اچھی طرح متعین کردہ کوئی عدالتی سربراہ نہیں ہوتا۔ جو تمام شہروں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جن کا نہ کوئی وقار ہے نہ اخلاقی کردار۔ لوگ پریشان حال ہیں کیونکہ ایسی عدالتیں اس قدر سمجھ دار اور دور اندیش بھی نہیں جتنا کہ بدنام زمانہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوتا تھا۔ انہیں عوام کی زبان میں ''مامے دی عدالت'' (ماموں جان کی عدالت) کہا جاتا ہے۔ ہم نے کیا حاصل کیا؟ ہم انتہائی افسوس ناک صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ ہم اپنی ہی حماقتوں کی دلدل میں دھنس گئے ہیں۔ محض نعرہ بازی کی بجائے ہمیں کچھ بنیادی کام کرنے چاہئیں۔ قانون کی طاقت اور عمل کے ساتھ اُمید بحال کرنے کے لیے اعلیٰ درجہ کے روحانی اقدام کی ضرورت ہے۔



باب 49

امن وامان کے تقاضے

1947ء میں حصولِ آزادی کے بعد سے امن وامان کو وہ اہمیت اور ترجیح نہیں دی گئی جو اسے برطانوی راج میں حاصل تھی۔ انگریزی راج میں صحت، تعلیم، ریلوے، انہار، مواصلات وغیرہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا، لیکن وہ امن وامان کو ہمیشہ اوّلین ترجیح دیتے تھے، جس کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ وہ اس کے لیے کتنے وسائل مخصوص کرتے تھے۔ عوام اس پالیسی کی تعریف کرتے تھے اور بعض آدمی آج بھی اس کا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کرتے ہیں۔

آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ سامراجیوں نے جو اچھے کام کیے، ان سب کو ضائع کر دیا جائے۔ بہر حال یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار آنے والی حکومتوں نے امن وامان کے معاملہ میں ایسا ہی کیا۔ انہوں نے عوام کے حوالہ سے اپنا بنیادی فرض فراموش کر دیا۔ امن وامان اور فوجداری انصاف کے لیے بجٹ میں مسلسل کمی کی جاتی رہی۔ 1947ء میں پولیس کا بجٹ مجموعی بجٹ کا گیارہ فیصد ہوتا تھا۔ جس میں اگلے سال ہی بہت زیادہ کمی کر دی گئی۔ پھر اس میں بہت آہستہ آہستہ اضافہ کیا گیا اور حالیہ برسوں میں وہ پانچ فیصد کے قریب پہنچ گیا ہے۔ (تفصیلات کے لیے باب نمبر 50 ملاحظہ فرمائیے)

شاید حکمرانوں نے سوچا ہو کہ آزادی کے بعد وسائل کی انتہائی کمی اور مسائل کی بھرمار کے پیشِ نظر انہیں زیادہ سے زیادہ بچت کرنی چاہیے۔ انہوں نے امن وامان پر خرچ کو ناگزیر نہیں سمجھا۔ ایسی سوچ شاید وقتی طور پر درست ہو۔ لیکن بدقسمتی سے وہ سوچ آئندہ برسوں میں بھی کام دکھاتی رہی۔ حتیٰ کہ اس دور میں بھی حاوی رہی جب سیاسی صورتِ حال مستحکم ہو گئی تھی اور حکومت نارمل طریقہ سے کام کرنے لگی تھی۔ اگرچہ حکومت پنجاب کے سالانہ خرچ میں اضافہ ہوتا رہا، مگر امن وامان کا بجٹ کم وبیش منجمد ہی رہا۔ اس کے برعکس آبادی میں مسلسل اضافہ ہوا اور سیکورٹی کے لیے اس کی ضروریات بڑھ گئیں۔

عدالتوں میں ججوں، مجسٹریٹوں، عملہ، ساز وسامان یہاں تک کہ سٹیشنری کی ہمیشہ کمی ہوتی ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق پنجاب میں کورٹ فیس اور دیگر عدالتی مصارف کی مد میں سالانہ قریباً ایک ہزار ملین روپے وصول ہوتے ہیں لیکن عدالتوں پر اس رقم کا محض ایک چوتھائی حصہ خرچ کیا جاتا ہے۔ اگر عدالتوں کا

بجٹ عمومی بجٹ سے الگ کر دیا جائے اور سارا آمدنی عدالتوں کے قیام اور پرانی عدالتوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے ہائی کورٹ کے تصرف میں دے دی جائے تو عدالتی نظام میں شاندار بہتری واقع ہو سکتی ہے۔ نہ صرف تمام عدالتوں میں زیرِ التوا سارے مقدمات نمٹائے جا سکتے ہیں بلکہ مستقبل کی متوقع تاخیر سے بھی بچا جا سکتا ہے۔

امن وامان خالی باتوں سے قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ پولیس ہر اس جگہ موجود ہونی چاہیے' جہاں اس کی ضرورت ہو۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اسے افرادی قوت' عمارات' ہتھیاروں اور اسلحہ' ساز وسامان' ذرائع مواصلات اور عوام کے حوالہ سے نیز ان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیشِ نظر بہت کچھ درکار ہے۔ جو لوگ پولیس کی ضروریات سے واقف نہیں۔ خصوصاً بیوروکریٹس جو خزانہ کی کنجیوں کو کنٹرول کرتے ہیں' ان کے لیے اہم ضروریات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالنا مفید ہوگا۔

حکمران طبقے اور دانشوروں کو اندرونی معاشرتی امن کی اہمیت کا احساس کرنا چاہیے جس کے بغیر معاشرے بیرونی جارحیت کے مقابلہ میں بہت جلد فنا ہو جاتے ہیں۔ دراصل بیرونی خطرات کسی معاشرہ کو مضبوط کرتے ہیں جبکہ اندرونی بدنظمی سے اس کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ حکومت اور قوم اس پہلو پر مناسب توجہ دے اور پولیس کے لیے کافی وسائل مخصوص کیے جائیں۔

عمارتیں

بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات میں نمایاں اضافہ کے باوجود عدالتوں اور پولیس کی اضافی ضروریات کے لیے کبھی فنڈز مہیا نہیں کیے گئے۔ صرف چند نئی عمارتیں بنائی گئی ہیں یا پرانی عمارتوں کی مرمت کی گئی ہے۔ پنجاب کے 592 تھانوں میں سے محض 188 مناسب عمارتوں میں واقع ہیں۔ پولیس والوں کو دھوپ' بارش اور سردی کے عالم میں ٹینٹوں میں رہتے اور کام کرتے دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ انہیں حواس باختہ کرنے اور فرار ہوتے ہوئے مجرم سے دور رکھنے کے لیے محض ایک کریکر کافی ہے۔ سپاہیوں کے لیے بیرکیں اور رہائشی مکانات صرف ناکافی نہیں جو کچھ میسر ہے اس کی حالت بھی انتہائی خراب اور ناگفتہ بہ ہے۔ سزائے موت کے مجرموں کو جو کوٹھڑیاں میسر ہوتی ہیں' پولیس کی بیرکیں ان سے بھی بدتر حالت میں ہیں۔ اس کے برعکس سینئر حکام نے سرکاری فنڈز کے بے تحاشا غلط استعمال سے اپنے دفاتر اس طرح آراستہ وپیراستہ کر لیے ہیں جیسے بڑے ہوٹلوں کے اقامتی کمرے ہوتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل نہ صرف افسوس

ناک ہے بلکہ اس سے نچلے اہلکاروں میں مایوسی پھیلی ہے۔

نچلی عدالتیں جن عمارتوں میں کام کررہی ہیں ان کی حالتِ زار بھی تھانوں سے مختلف نہیں۔ اکثر صورتوں میں عدالتوں کے لیے نئی عمارتیں تعمیر نہیں کی گئیں' نہ ہی موجودہ عمارتوں میں توسیع کی گئی ہے جبکہ آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے اور زیرِ التوا مقدمات کی تعداد بھی خاصی بڑھ گئی ہے۔ اکثر عمارتیں خستہ حال ہیں۔ بہت سی حالتوں میں جگہ اس قدر کم ہے کہ وہ عدالت کی کم سے کم ضرورت بھی پوری نہیں کرتی۔

ہتھیار اور گولہ بارود

شاید بین الاقوامی سطح پر ایسا نہ ہو' تاہم یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں گزشتہ چند برسوں میں پولیس کو عملاً غیر مسلح کردیا گیا ہے۔ کیونکہ اب مجرموں کے لیے کلاشنکوف معیاری ہتھیار بن گیا ہے۔ لیکن پولیس والوں کے پاس اب بھی رواں صدی کے ابتدائی حصہ میں استعمال ہونے والی 303 این فیلڈ رائفلیں ہیں۔ ریوالور اور پستول بھی اسی دور کے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہتھیار ناکارہ ہوچکے ہیں۔ علاوہ ازیں پولیس والوں کو پریکٹس کے لیے محض چند گولیاں فائر کرنے کی اجازت ہوتی ہے اور بس۔ یہی تربیت ہے جو انہیں پوری سروس کے دوران دی جاتی ہے۔ پولیس مین جب ناکارہ ہتھیار اور زنگ آلود اسلحہ کے ساتھ فائر کرتا ہے تو بھاگتے ہوئے مجرم کی بجائے خود کو زخمی کرلیتا ہے۔ مٹھی بھر جدید ہتھیار جن کی لاہور اور بعض بڑے شہروں میں نمائش کی جاتی ہے وہ زیادہ تر مقامات کی قابلِ رحم حالت پر پردہ ڈالنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ناقص ہتھیاروں سے لیس پولیس والے عمدہ ہتھیاروں سے مسلح بدمعاشوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے' ان پر غالب نہیں آسکتے اور انہیں گرفتار نہیں کرسکتے۔ ناقص ہتھیاروں سے لیس پولیس والا بس اسی قدر مؤثر ہوتا ہے جتنا کہ باگڑبلا (کپڑے کا بنا ہوا انسانی ڈھانچہ جو کوؤں کو ڈرانے کے لیے کھیت میں کھڑا کردیتے ہیں)۔

ناکافی افرادی قوت

بین الاقوامی معیار کے مطابق بنیادی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہر 400 افراد کی آبادی کے لیے ایک پولیس مین درکار ہوتا ہے جبکہ ہمارے ہاں پولیس کے بجٹ میں مسلسل ''بچت'' کرنے کا نتیجہ

یہ نکلا ہے کہ ایک ہزار افراد کے لیے ایک پولیس والا دستیاب ہے۔ افرادی قوت کی اس کمی کو پورا کرنے کا کوئی طریقہ نہیں کیونکہ پولیس کو عملی طور پر اپنے کام کے لیے موجود رہنا پڑتا ہے خواہ وہ ڈیوٹی نگرانی سے تعلق رکھتی ہو یا تفتیش سے۔ اگر مزید ڈاکٹروں اور استادوں کے بغیر بڑھتی ہوئی آبادی کو بنیادی تعلیم اور علاج کی سہولت فراہم نہیں کی جاسکتی تو اضافی پولیس کے بغیر جرائم پر قابو پانا کیسے ممکن ہے؟ اگر تعلیم اور صحت کے لیے اضافی فنڈز فراہم کیے جاسکتے ہیں تو پولیس کے لیے کیوں نہیں؟

اسی طرح ہر سطح پر ججوں کی تعداد بھی کم ہے اس لیے زیرِ التوا مقدمات کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے جبکہ انصاف میں تاخیر انصاف سے انکار کے مترادف ہے۔

دفتری ضروریات

جو لوگ جدید پولیس اور عدالتی طریق کار کی بات کرتے ہیں' انہیں معلوم نہیں کہ ہمارے تھانوں اور عدالتوں کو انتہائی ناگزیر چیزیں بھی دستیاب نہیں۔ فرنیچر حسبِ ضرورت نہیں ہوتا اور جو تھوڑا بہت دستیاب ہو' وہ انتہائی خراب حالت میں ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کوئی نئی کرسی نظر آئے تو سمجھ لیں کہ وہ اس پر بیٹھنے والے کی ذاتی خوش تدبیری کا نتیجہ ہے۔ سٹیشنری کے لیے سرے سے کوئی بجٹ نہیں ہوتا۔ کیا یہ بات حیران کن نہیں کہ تھانے کا محرّر تھانے میں جو رپورٹیں درج کرتا ہے۔ خود شکایت کنندہ سے کاغذ اور پنسل فراہم کرنے کو کہتا ہے۔ نچلی عدالت کے جج کو وکیل صفائی سے اسی طرح کی درخواست کرنی پڑتی ہے تاکہ عدالتی کارروائی قلمبند کی جاسکے۔ جو لوگ کمپیوٹرز' کیمروں' ٹیپ ریکارڈرز' کاپی کرنے والی مشینوں' تفتیش میں کام آنے والی کٹ اور دوسرے جدید ساز وسامان کی بات کرتے ہیں، انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اگر کسی تھانہ میں ہاتھ سے چلنے والا ٹائپ رائٹر موجود ہو تو وہ عشروں کا استعمال شدہ ہوتا ہے اور شاذ ہی کام کرتا ہے۔

ٹرانسپورٹ

جدید ترین ماڈل کی طاقت ور گاڑیوں میں تیزی سے نقل وحرکت کرنے والے مجرموں کے مقابلہ میں قانون کے رکھوالے پولیس ملازمین خراب وخستہ' کھٹارا' کم رفتار اور عجائب گھر میں رکھنے کے لائق گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ وہ پرچھائیں کا تعاقب کرتے اور حقائق سے منہ چھپاتے ہیں۔ ایسی

حالت میں مجرم کو اپنے پکڑے جانے کی چنداں فکر نہیں ہوتی۔ وہ اپنا کام معقول وقت میں اور اطمینان کے ساتھ کر سکتا ہے۔ نک چڑھے رپورٹر اور خود پسند متکبر حکام اس صورت میں ہمیشہ شاکی نظر آتے ہیں جب پولیس جائے واردات پر بروقت نہ پہنچے۔ لیکن وہ یہ بات سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں کہ پولیس کو ان کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے مناسب ٹرانسپورٹ میسر نہیں۔ اگر کسی تھانہ کے پاس دس برس پرانی جیپ ہو جس کی دیکھ بھال اور مرمت وغیرہ ایس ایچ او اپنی جیب سے کراتا ہو تو آدمی ایسے ماہرانہ تعاقب کی توقع کیسے کر سکتا ہے جو غیر ملکی ٹیلی ویژن پر دکھائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض ہے۔

1970ء میں ایک احتجاجی گروپ مارچ کرتا ہوا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ٹکا خاں کے بنگلہ پر پہنچ گیا۔ وہ اس بات پر غصہ سے آگ بگولا ہو گئے کہ احتجاج کرنے والوں کو روکنے کے لیے پولیس بروقت کیوں نہ پہنچ سکی۔ بطور افسر رابطہ مجھ سے اس ''سنگین غفلت'' پر جواب طلبی کی گئی۔ میرا جواب بہت آسان اور سیدھا سادا تھا۔ وہ یہ کہ پولیس والوں کو تھانہ سول لائنز سے چھاؤنی کے علاقہ میں جانا تھا مگر انہیں فوری طور پر کوئی ٹرانسپورٹ دستیاب نہیں تھی۔ اگر وہ ہنگامی ضرورت کی بنا پر کسی پبلک بس یا ٹرک پر قبضہ کر لیتے تو انہیں مارشل لا حکام پکڑ لیتے کہ وہ اپنے اختیار کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ جنرل صاحب کو یہی غنیمت سمجھنا چاہیے تھا کہ پولیس والے کسی نہ کسی طرح ان کے بنگلے پر پہنچ تو گئے اور اس بات کو یقینی بنانا چاہا کہ ان کے گھریلو سکون میں دوبارہ خلل نہ پڑنے پائے۔

مواصلات

آج کل ٹیلی فون کو پولیس آپریشن کے لیے انتہائی ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ پھر بھی تمام تھانوں اور دوسرے فیلڈ دفتروں کو یہ سہولت میسر نہیں۔ جہاں یہ سہولت میسر ہو وہاں بل ادا کرنے کے لیے بجٹ نہیں ہوتا۔ نتیجتاً یا تو فون کنکشن منقطع کرا دیے جاتے ہیں یا ایس ایچ او کو اپنی جیب سے بل ادا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح تمام تھانوں میں اور فیلڈ افسروں کے پاس وائرلیس سیٹ موجود نہیں۔ نیا سیٹ خریدنا تو دور کی بات پرانے سیٹ کو تبدیل کرنے کے لیے بھی اکثر فنڈز نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں فیکس مشین اور کمپیوٹرز صرف ان لوگوں کی خواہشات کی فہرست پر موجود رہتے ہیں جنہیں ان چیزوں کی ضرورت ہے۔

جرائم کا ریکارڈ

جرائم کی تفتیش اور سدِ باب بڑی ہنر مندی اور حسنِ تدبیر کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ کام جبر اور دباؤ سے نہیں ہوسکتا۔ جرائم پر قابو پانے کے لیے اُن کا ریکارڈ انتہائی موثر ہتھیار ہے۔ اگر ریکارڈ دستیاب نہ ہو یا اٹکل پچو طریقہ سے مرتب کیا گیا ہو، تو اختیارات کا من مانا استعمال عام ہو جاتا ہے جو جبر و تشدد اور ناانصافی کا موجب بنتا ہے۔ اس لیے پولیس کے نظام کو اچھے طریقے سے چلانے کے لیے ریکارڈ کو مربوط اور استعمال کے لحاظ سے کار آمد بنانا ضروری ہے۔ ہمارے تھانوں میں مشکوک افراد اور مجرموں کی انگلیوں کے نشانات تک کا مکمل ریکارڈ موجود نہیں ہوتا نہ ہی ایسے مجرموں کی جو تحویل میں ہوں یا جو پولیس کو مطلوب ہوں، مکمل فہرست اور درجہ بندی کا ریکارڈ دستیاب ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مجرموں کی چال کے انداز اور آواز کے خصوصی وصف شناختی علامت اور تصویریں ریکارڈ کرنے کے لیے ایڈز اور کٹ دستیاب نہیں ہوتی۔ بلاشبہ شخصی کمزوریاں اور نااہلیت ہر جگہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر کسی مقصد کے لیے مطلوبہ ذرائع دستیاب نہ ہوں تو کوئی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ اس طرح کسی کی قسمت نہیں سدھر سکتی۔

تربیت

پولیس کے امور میں مہارت کے لیے تربیتی سہولتوں کا حال افسوس ناک ہے۔ نہ تو حسبِ ضرورت تربیتی ادارے موجود ہیں، نہ ہی ضروری وسائل فراہم کیے جاتے ہیں۔ آتشیں اسلحہ کی تربیت نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ معقول تعداد میں اسلحہ و ہتھیار میسر نہیں۔ تفتیش کا ہنر صحیح طریقہ سے نہیں سکھایا جاسکتا کیونکہ مطلوبہ ساز و سامان اور سہولتیں میسر نہیں۔ محض پریڈ کرنے اور قانون پڑھانے سے بات نہیں بنتی۔ یہی وجہ ہے کہ تربیتی ادارے ہنر مند، ماہر، پیشہ ور اور قانون کو سمجھنے والے ذہین و ہوشیار افسروں کی بجائے محض کاسہ لیس، خوشامدی اور فرمانبردار روبوٹ تیار کر رہے ہیں۔

جرائم کی سراغ رسانی

پولیس اور مجرم ہمیشہ ایک دوسرے کی گھات میں رہتے ہیں۔ ان کی تازہ ترین معلومات کا ٹکراؤ

نتیجہ کا تعین کرتا ہے۔ اگر پولیس زیادہ کامیاب ہو تو مجرم زیرِ زمین چلے جاتے ہیں۔ اگر وہ مستعد نہ ہو تو مجرم منظر پر چھا جاتے ہیں۔

جرائم سے متعلق معلومات کی پولیس کو فراہمی کا سلسلہ 1950ء کے عشرہ میں عوام کی حمایت پر مبنی نظام (مثلاً دیہات میں ذیلدار، نمبردار اور چوکیدار) ختم ہونے سے اور بعد ازاں آمرانہ حکومتوں میں عوام اور پولیس کے درمیان فاصلے بڑھ جانے سے ختم ہو گیا۔ اس طرح پولیس جرائم کے خلاف جدوجہد کے لیے اپنے سب سے اہم ہتھیار سے محروم ہو گئی۔ فنڈز کی کمی کے باعث پولیس اس خلا کو اپنی پیشہ ورانہ سراغ رسانی کے ذریعے پر نہیں کر سکتی کیونکہ اس پر معاشرتی روابط اور اثر و رسوخ کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کی نسبت بہت زیادہ خرچ آتا ہے۔ الغرض حصولِ معلومات کے یہ دونوں ذرائع عملاً ختم ہو گئے ہیں۔ ایک بصیرت و دور اندیشی کے فقدان کی وجہ سے اور دوسرا فنڈز کی کمی کے باعث۔

عملی انٹیلی جنس

عملی انٹیلی جنس کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اس سلسلے میں جو تھوڑی بہت معلومات دستیاب ہوتی ہیں، وہ بھی غیر مربوط اور منتشر حالت میں پائی جاتی ہیں اور موقع پر دستیاب اطلاعات سے اس لیے پوری طرح استفادہ نہیں کیا جا سکتا کہ مؤثر اور بروقت خبر دینے والے ذرائع مواصلات میسر نہیں۔ پولیس کو دور دراز علاقہ سے کسی واقعہ کی خبر بہت دیر سے ملتی ہے۔ اس وقت تک وہ خبر عملی انٹیلی جنس میں تبدیل ہو چکی ہوتی ہے اور مجرم اپنے ٹھکانہ پر پہنچ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بڑے شہروں میں بھی مجرم پولیس سے آگے نکل گئے ہیں۔ پولیس کسی مظلوم کی فریاد کا بروقت جواب دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی کیونکہ اسے بروقت اطلاع نہیں ملتی۔ اسے فوری طور پر ٹرانسپورٹ کی سہولت میسر نہیں ہوتی اور اس کی افرادی قوت کے پاس ضروری ساز و سامان نہیں ہوتا۔ پولیس زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے گروپ کی صورت میں کسی چوک میں کھڑی ہو جائے۔ لیکن پولیس والوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ وہ اپنے طور پر سرے سے کوئی سوچ نہیں رکھتے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ پنجابی کہاوت ہے کہ "انّے کتے ہرناں دا پچھا کرنا" یعنی اندھے کتے دوڑتے ہوئے ہرنوں کا تعاقب کرتے ہیں۔ پولیس کی ناکہ بندی اور چیکنگ کا عام

شہری کو ہراساں کرنے کے سوا کوئی مقصد نہیں۔

پراسیکیوشن

پولیس کی امدادی سروسز اور برانچوں کو معیشت کے بحران سے زبردست دھچکا لگا۔ پراسیکیوشن برانچ قابل وکیلوں کی خدمات حاصل کرنے میں ناکام ہوگئی کیونکہ یہاں ان کی تنخواہیں بہت کم تھیں۔ تنخواہوں میں اضافہ کرنے کی بجائے اس برانچ کو بہتر تنخواہوں کے لیے محکمہ قانون سے منسلک کر دیا گیا۔ پولیس کی تنخواہ میں مطلوبہ اضافہ اس لیے نہیں کیا گیا کہ پولیس کو عام طور پر بہتر تنخواہ دینا گوارا نہیں تھا۔ اس طرح پراسیکیوشن پر امن وامان کے ذمہ داروں کی کمان اور کنٹرول دونوں ختم ہوگئے۔ پولیس اور عدالتوں کے مابین پل کا کام دینے والا ادارہ باقی نہیں رہا اور پراسیکیوشن کے ذریعے جرائم پر کنٹرول کمزور ہوگیا۔

اس کے بعد پراسیکیوشن پر کنٹرول کی جگہ وحشیانہ قوت کے ساتھ تعذیب وایذارسانی نے لے لی۔ پہلے یہ کام پولیس سے لیا گیا' بعد میں فوج سے بھی لیا جانے لگا۔ یہ بات قطعاً مدِنظر نہیں رکھی گئی کہ جرائم پر قابو پانے کے دو ہی موثر طریقے ہیں۔ ایک قانون کے مطابق مقدمہ تیار کرنا' دوسرے عدالتی فیصلے۔ محض گرفتاری جس کی عدالت میں پیروی نہ کی جائے' جبر کا موجب بن سکتی ہے۔ عدالتوں سے خواہ سول ہوں یا فوجی' یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ شہادت کی عدم موجودگی میں مجرموں کو کڑی سزائیں دے سکیں گی۔ مختصر مدت کے مقاصد کے لیے جو مختصر راستہ اختیار کیا جائے خواہ وہ مقاصد کتنے ہی ارفع اور برتر کیوں نہ ہوں' آخرِ کار ظلم اور عدمِ مساوات کا سبب بنتے ہیں اور ان کے نتیجہ میں بدامنی پھیلتی ہے' امن قائم نہیں ہوتا۔ فوجداری انصاف کا ہر لحاظ سے مکمل اور موثر نظام بڑی حد تک معیشت کی وجہ سے اور بعض اوقات جلد انصاف کے غیر حقیقت پسندانہ اور رومانوی مقصد کے تحت تباہ کر دیا گیا۔

ٹریفک برانچ

موٹر گاڑیوں کی تعداد میں معتد بہ اضافہ اور سڑکوں پر خطرات کے باوجود ٹریفک برانچ، غیر تربیت یافتہ' عملہ کی کمی سے دوچار اور غیر ہنر مند رہی۔ من موجی حکمران جو ہمیشہ ناگوار عجلت میں ہوتے تھے' اس کی تنظیم' کمانڈ اور کنٹرول کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکے۔ وہ قومی سطح کی کمانڈ سے جھولتے ہوئے

بلدیاتی اداروں کے آپریشنل کنٹرول تک جاتے اور کوئی فیصلہ کیے بغیر رخصت ہو جاتے تھے کیونکہ فیصلہ کرنے کی صورت میں انہیں کچھ رقم خرچ کرنی پڑتی تھی۔ اس طرح کے غیر ایمان افروز اور غیر رومانوی معاملات پر خرچ کرنے کی بجائے دولت کے طاقتور منیجر اسے سڑکوں اور آرام دہ موٹر گاڑیوں کے لیے بچا رکھتے ہیں۔ جو کسی ضابطہ کے بغیر اِدھر اُدھر دوڑ سکیں اور حادثات کی صورت میں ان کی موت کا باعث بن سکیں۔ مالیات کے ماہرین کے مطابق ڈرائیوروں کی تربیت' سڑکوں پر سلامتی کے نشانات کی تنصیب' اندھے رش کو منضبط کرنے یا تیز رفتاری کو کنٹرول کرنے پر صرف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

دیگر ایجنسیاں

سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسیوں (اضلاع میں) کرائم برانچ' سیکورٹی برانچ' سپیشل برانچ' فنگر پرنٹ بیورو اور دیگر سروسز کا بھی جو موثر نگہبانی کے لیے ضروری ہیں' ایسا ہی حال ہے۔ حقیقت میں وسائل کی کمی اور دباؤ کے باعث ان برانچوں کی حالت عام پولیس سے بھی بدتر ہے۔ ان کے پاس ضروری حقائق کا کوئی ڈاٹا بنک اور ریکارڈ موجود نہیں جس سے وہ اپنی کارکردگی کے لیے رہنمائی حاصل کرسکیں۔ ان کے پاس واحد اثاثہ ان کی اتھارٹی ہے۔ جس کا وہ بڑی فراخدلی سے غلط استعمال کرتے ہیں۔ ذرائع کے بغیر اتھارٹی جس پر کوئی روک ٹوک نہ ہو اور اس سے کوئی ذمہ داری وابستہ نہ ہو' انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔

یہ ایجنسیاں جنہیں فیلڈ میں نگرانی کی ذمہ داریوں میں معاون اور رابطہ پیدا کرنے والی سمجھا جاتا ہے، غیر متحرک اور بیکار ہوگئی ہیں۔ اعداد و شمار اکٹھے کرنا' ان کا تجزیہ کرنا' تھانوں' ضلعوں اور صوبوں میں رابطہ قائم کرنا۔ آپریشنل اطلاعات کی بروقت ترسیل' اقدامات کے لیے استنباط کی جانچ پڑتال کرنا اور ان ایجنسیوں کے دیگر لازمی اقدامات اور طریقے اپنے بنیادی ڈھانچہ اور آپریشنز کے لیے فنڈز کا تقاضا کرتے ہیں۔

امن کے بغیر ترقی نہیں ہوسکتی اور امن صرف انصاف اور ایمانداری کے ذریعے ممکن ہے۔ حکمران طبقہ اور دانشوروں کو اندرونی معاشرتی امن کی اہمیت کا احساس کرنا چاہیے۔ داخلی امن کے بغیر معاشرے خارجی جارحیت کے مقابلہ میں بہت جلد فنا ہو جاتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بیرونی خطرات معاشرہ کو مضبوط بناتے ہیں جبکہ اندرونی بدامنی اسے تباہی سے دوچار کرتی ہے۔ معاشرہ اور حکومت کو اس پہلو پر مناسب ترجیح دینی چاہیے اور اس کے لیے معقول و کافی فنڈز مخصوص کرنے چاہئیں۔



محکمہ پولیس ۔ حقائق اور اعداد و شمار

حقائق الفاظ کی نسبت زیادہ طاقت سے بولتے ہیں۔ اس باب میں دی گئی جدولیں اور گوشوارے پولیس کی موجودہ تعداد اور اسے فراہم کردہ وسائل کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو لوگ ہماری پولیس سے مغربی ممالک کی پولیس جیسی کارکردگی کی توقع رکھتے ہیں' انہیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ پنجاب رقبہ میں یورپ کے جملہ ممالک سے ماسوائے روس' بڑا ہے اور آبادی کے لحاظ سے دنیا کے 25 بڑے ملکوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ انہیں پولیس کی تعداد اور اسے دستیاب وسائل کا یورپی ممالک کی پولیس سے موازنہ کرتے وقت مذکورہ بالا حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

اس باب میں شامل گوشواروں اور گرافس کے موضوعات درج ذیل ہیں:

1- پنجاب پولیس کی عددی قوت
2- پولیس فورس کی مختلف عہدوں میں تقسیم
3- تھانوں کی عمارتیں
4- غیر ترقیاتی بجٹ میں پولیس کے لیے مخصوص کردہ رقم
5- ترقیاتی بجٹ میں پولیس کے لیے مخصوص کردہ رقم
6- 1994-95ء کے پولیس بجٹ کی تقسیم
7- پولیس بجٹ میں دیرپا اشیا کے لیے مخصوص کردہ رقم
8- پولیس ٹرانسپورٹ کی موجودہ پوزیشن
9- وائرلیس سیٹوں کی موجودہ پوزیشن
10- وائرلیس سیٹوں کی ضرورت
11- پولیس مقابلے 1986ء تا جون 1993ء
12- 1947ء سے 1995ء تک رپورٹ شدہ جرائم کا گراف

-13 1947ء سے 1995ء تک رپورٹ شدہ قتل کے مقدمات کا گراف

(جاری ہے)

جدول نمبر 1: 1994ء میں پنجاب پولیس کی عددی قوت

عہدہ	تعداد	کیفیت
انسپکٹر جنرل	1	
ایڈیشنل انسپکٹر جنرل	2	
ڈپٹی انسپکٹر جنرل	19	
اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل اور ایس پی	134	
اے ایس پی اور ڈی ایس پی	431	
انسپکٹرز	1701	
سب انسپکٹرز	3600	
اے ایس آئی	6627	
ہیڈ کانسٹیبل	9893	
کانسٹیبل	65695	
میزان	88103	

نوٹ: صوبہ کو درج ذیل علاقائی دائرہ ہائے اختیار میں تقسیم کیا گیا ہے:

-1 رینج (ڈویژن) 8 اضلاع - 34 سب ڈویژن - 142

-2 رینج کا سربراہ ڈی آئی جی ضلع کا ایس ایس پی/ایس پی اور سب ڈویژن کا اے ایس پی/ڈی ایس پی ہوتا ہے۔

-3 تھانوں کی کل تعداد 592 ہے۔ ان میں سے 390 دیہی اور 232 شہری علاقوں میں ہیں۔

-4 پولیس چوکیوں کی تعداد 190 ہے۔ ان میں سے 115 دیہی اور 75 شہری علاقوں میں قائم ہیں۔

-5 پنجاب کی کل آبادی 66,989,000 ہے (اس میں 44,070,000 دیہی اور 22,914,000 شہری ہے) آبادی کے لئے پولیس کا تناسب قریباً 1020 افراد پر ایک

سپاہی بنتا ہے۔ صوبہ کا کل رقبہ 205,345 مربع کلومیٹر ہے۔ اس حساب سے ہر تین مربع کلومیٹر کے لیے ایک سپاہی میسر ہے۔

جدول نمبر 2: پولیس کی عددی قوت کی تقسیم

برانچ	تعداد	فیصد
تھانے	29203	33% تقریباً
پنجاب کانسٹیبلری	11763	13.35
ڈسٹرکٹ و رینج ریزرو	4246	4.82
پولیس آفیسرز	3985	4.52
ٹریفک برانچ	3471	3.94
پراسیکیوشن برانچ	2050	2.33
کرائم برانچ و ڈسٹرکٹ سی آئی اے	2437	2.77
سپیشل برانچ	1899	2.16
مواصلات و ٹرانسپورٹ	4989	5.66
گارڈز	11447	15.26
قیدیوں کے لیے محافظ دستے	1994	2.26
تربیتی ادارے	1443	1.64
زنانہ پولیس	603	0.69
متفرق	8569	9.72

نوٹ: (i) تھانوں میں متعین تعداد مقدمات کی تفتیش نیز واچ اینڈ وارڈ ڈیوٹی کے لیے ہوتی ہے۔

(ii) متفرق میں اردلی' لائنوں کا عملہ' آنسو گیس سکواڈ' ڈرل سٹاف اور رخصت پر گئے ہوئے ریزرو شامل ہیں۔

جدول نمبر 3: تھانوں کے لیے عمارتیں

عمارات	تعداد
تھانے جو اصل عمارتوں میں قائم ہیں	188
تھانے جو ناقابلِ استعمال عمارتوں میں ہیں	250
کرایہ کی عمارتوں' دکانوں' ٹینٹوں میں قائم تھانے	135
زیرِ تعمیر عمارتیں	19
عمارتوں کی مجموعی تعداد جو تعمیر ہوئی ہیں	385
1947ء سے 1994ء تک تعمیر کی گئی عمارتیں	48

نوٹ: قیامِ پاکستان سے اب تک آبادی میں تین گنا اضافہ ہوگیا ہے۔ لیکن تھانوں کی تعداد دگنی بھی نہیں ہوئی۔ 1947ء میں تھانوں کی تعداد 302 تھی جو اب 592 ہے۔ گویا اب تک محض 290 کا اضافہ ہوا ہے۔

جدول نمبر 4: پنجاب کے غیر ترقیاتی بجٹ میں پولیس کا حصہ

سال	پنجاب کا بجٹ (رقم 10 لاکھ روپوں میں)	پولیس کے لیے مخصوص رقم	فیصد
1947-48ء	200.7	24.7	12.31
1951-52ء	2278.7	30.4	1.34
1961-62ء	4437.2	82.8	1.87
1966-67ء	4077.0	127.7	3.13
1971-72ء	3457.9	71.9	2.08
1972-73ء	4088.5	87.8	2.15
1973-74ء	6077.9	93.8	1.54
1974-75ء	8265.4	131.9	1.60
1976-77ء	13036.0	273.1	2.09
1977-78ء	15383.9	298.6	1.94
1978-79ء	13895.1	312.9	2.39
1979-80ء	13895.1	310.0	2.23

1980-81ء	14766.6	378.8	2.56
1981-82ء	12189.2	431.6	3.05
1982-83ء	21228.7	497.9	2.35
1983-84ء	24012.9	619.0	2.58
1984-85ء	21848.0	842.1	3.85
1985-86ء	25679.1	994.5	3.87
1986-87ء	31601.1	1394.4	4.41
1987-88ء	38806.6	1711.6	4.41
1988-89ء	39870.0	1780.6	4.47
1989.90ء	42591.8	1648.5	3.87
1990-91ء	46719.0	2485.5	5.32
1991-92ء	55828.5	2762.0	4.95
1992-93ء	63207.6	3264.6	5.16
1993.94ء	73686.3	3756.7	5.10
1994.95ء	83020.8	3948.0	4.76

جدول نمبر 5: پنجاب کے ترقیاتی بجٹ میں پولیس کا حصہ

سال	پنجاب کا بجٹ (رقم 10 لاکھ روپوں میں)	پولیس کے لیے مخصوص رقم	فیصد
1981-82ء	335.00	2.64	0.78
1982-83ء	405.00	1.74	0.42
1983-84ء	422.00	3.63	0.86
1984-85ء	430.00	5.51	1.28
1985-86ء	567.00	5.40	0.94
1986-87ء	660.13	6.59	0.99
1987-88ء	892.02	7.52	0.84
1988-89ء	745.00	8.51	1.14
1989-90ء	716.90	5.24	0.74

1990-91ء	766.00	7.00	0.91
1991-92ء	999.22	8.79	0.88
1992-93ء	1200.20	9.34	0.78
1993-94ء	1151.89	5.85	0.51
1994-95ء	1028.34	8.70	0.84

جدول نمبر 6: 1994-95ء کے لیے پولیس بجٹ کی تقسیم

خرچ کی مد	رقم (10 لاکھ روپوں میں)	فیصد
تنخواہ اور الاؤنسز	3331.8	83.74
کار آمد اشیا اور سروسز	568.5	14.29
دیرپا اشیا کی خرید	00.0	0.00
دیرپا اشیا کی مرمت	60.5	1.52
تبادلوں پر ادائیگی	17.2	0.45
میزان	3978.0	100.00

نوٹ: اشیائے ضرورت اور سروسز میں پٹرول، تیل، لبریکنٹس، سفری بھتہ، ٹیلیفون، بجلی اور گیس کے بل، نیز پرنٹنگ اور سٹیشنری وغیرہ کے اخراجات شامل ہیں۔

-2 دیرپا اشیا میں ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں، وائرلیس سیٹ اور دیگر سامان شامل ہے۔

-3 تبادلوں کے لیے ادائیگیوں میں نمایاں کارکردگی پر انعام، شہید فنڈ کے لیے مخصوص رقم اور خفیہ سروسز کے لیے مختص کردہ فنڈز شامل ہیں۔

جدول نمبر 7: دیرپا اشیاء کی خرید کے لیے پولیس کا مختص کردہ بجٹ

سال	ٹرانسپورٹ	ٹیلیفون	اسلحہ	دیگر	میزان
1984-85ء	11.7	0.7	0.0	1.8	14.2
1985-86ء	38.8	11.3	2.0	1.6	53.7
1986-87ء	120.6	49.4	23.1	4.9	198.0
1987.88ء	60.0	15.8	15.1	3.8	94.7
1988-89ء	73.5	---	---	---	73.5

1989-90ء	12.3	---	---	---	12.3
1990-91ء	178.3	25.0	40.0	11.0	254.3
1991-92ء	34.7	5.8	46.7	9.6	96.8
1992-93ء	141.2	12.7	19.2	18.3	191.4
1993-94ء	65.0	3.1	---	8.5	76.6
1994-95ء	---	---	---	---	---

نوٹ: ٹرانسپورٹ میں ہر قسم کی موٹر گاڑیاں شامل ہیں۔

-2 ٹیلی فون میں ٹیلی کمیونیکیشنز کا سامان شامل ہے۔

-3 اسلحہ میں مظاہروں کو منتشر کرنے کے لیے استعمال ہونے والا سامان شامل ہے۔

1994ء میں سارا فنڈ لاہور اور نو تخلیق کردہ اضلاع منڈی بہاؤالدین و حافظ آباد کے لیے مخصوص کر دیا گیا

جدول نمبر 8: ٹرانسپورٹ کی موجودہ پوزیشن

ٹائپ	تعداد	قابلِ استعمال	ناکارہ	کیفیت
پک اپ	1069	785	284	
جیپ	519	409	110	
کیریئرز	467	402	65	
کاریں	278	196	82	
ایمبولینس	16	16	---	
ریکوری وہیکل	9	7	2	
اے پی سی	9	4	5	
اسکارٹ کاریں	4	4	---	
فورک لفٹر	2	2	---	
موٹر سائیکل	1546	1296	250	
میزان	3919	3117	802	

نوٹ: کیریئرز میں ٹروپ کیریئر، قیدیوں کی گاڑیاں اور گشتی کینٹین شامل ہیں۔

-2 ایسے تھانے جن کے پاس کوئی پک اپ نہیں = 128

-3 اے ایس پی/ڈی ایس پی جن کے پاس کوئی جیپ نہیں = 85

-4 ایک گاڑی دو لاکھ 50 ہزار کلومیٹر یا پانچ چھ سال استعمال کے بعد ناکارہ سمجھی جاتی ہے۔ اس فارمولا کے تحت ہر سال 387 گاڑیوں کی جگہ نئی گاڑیاں آنی چاہئیں جن کی مالیت 320 ملین روپے کے قریب بنتی ہے۔

جدول 9: وائرلیس سیٹوں کی موجودہ پوزیشن

ٹائپ	تعداد	قابلِ استعمال	ناکارہ
موبائل	2782	1510	1272
پاکٹ (جیبی)	2091	1165	926
بیس	1109	889	220
پورٹیبل	547	127	420
ایچ ایف	115	53	62
میزان	6644	3744	2900

جدول 10: وائرلیس سیٹوں کی ضرورت

لوکیشن	تعداد
ایسے تھانے جن کے پاس کوئی وائرلیس سیٹ نہیں	130
پولیس چوکیاں جن کے پاس وائرلیس سیٹ نہیں	145
ہنگامی پولیس چوکیاں جو وائرلیس سیٹ کے بغیر ہیں	86

جدول 11: پولیس مقابلے 1986ء تا 1990ء

تعداد	1986ء	1987ء	1988ء	1989ء	1990ء
مقابلے	16	28	68	60	167
پولیس والے شہید ہوئے	14	18	18	7	19

زخمی ہوئے	45	48	34	35	43
مجرم مارے گئے	10	16	36	16	69
زخمی ہوئے	15	9	8	17	32
گرفتار کئے گئے	---	---	---	136	315

جدول 12: پولیس مقابلے - جنوری 1991ء تا جون 1993ء

تعداد	1-5/1991	6-12/1991	1992	1-6/1993
پولیس مقابلے	94	120	197	86
پولیس والے شہید ہوئے	7	10	41	7
زخمی ہوئے	18	43	108	52
مجرم مارے گئے	38	56	88	37
زخمی ہوئے	17	28	38	24
پکڑے گئے	118	1216	327	98

نوٹ: مصنف 20.06.1991 سے 31.05.93 تک پنجاب کا انسپکٹر جنرل آف پولیس رہا۔ اس جدول میں درج زیادہ تر مقابلے اسی دور میں ہوئے۔

پہلا گراف: 1947ء سے 1995ء تک رپورٹ شدہ جرائم

نوٹ: جرائم میں، 1960ء میں مارشل لا کا ابتدائی رعب داب ختم ہونے کے بعد اچانک بے پناہ اضافہ ہوگیا کیونکہ مارشل لا حکام نے آئین اور قانون کی اعلانیہ خلاف ورزی اور انحراف شروع کردی تھی۔ جرائم پیشہ عناصر نے بطور خاص اپنے قول و فعل سے ان کی پیروی کی۔ اس کے بعد جرائم میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔

دوسرا گراف - قتل کی وارداتیں 1947ء تا 1995ء

نوٹ: 1947ء میں قتل کی وارداتوں کی بھاری شرح فرقہ وارانہ فسادات/قتل عام کو ظاہر کرتی ہے۔ مارشل لا حکام کی طرف سے آئین اور قانون کا قتلِ عام کرنے پر مارشل لا کا رعب داب ختم ہوگیا اور جرائم میں تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

باب 51

بعض متفرق واقعات

لاڑکانہ میں پولیس ہڑتال

یہ فروری 1972ء کا ذکر ہے۔ صدر ذوالفقار علی بھٹو کے آبائی شہر لاڑکانہ میں پولیس نے ہڑتال کر دی۔ یہ ہڑتال پیپلز پارٹی کی مقامی قیادت اور کارکنوں کے رویّہ کے خلاف تھی۔ پولیس والوں نے بھٹو کے سامنے اسی موقع پر احتجاج کیا جب وہ شکار کھیلنے لاڑکانہ گئے ہوئے تھے۔ میاں انور علی ڈائریکٹر آئی بی نے مجھے بتایا کہ صدر راولپنڈی سے کسی ایسے آدمی کی تلاش میں ہیں جو موقع پر جائے اور معاملہ کی بابت گہرائی سے چھان بین کرے۔ میاں صاحب کو یقین تھا کہ میں یہ کام صدر کے اطمینان کے مطابق کر سکتا ہوں۔ چنانچہ قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند۔

میں اگلے دن لاڑکانہ پہنچا۔ سندھ کے انسپکٹر جنرل یوسف اورکزئی بھی اس دن وہاں آئے ہوئے تھے۔ لاڑکانہ کے نئے ایس پی نور الٰہی لغاری نے اسی روز چارج سنبھالا تھا۔

میں نے متعلقہ پولیس والوں میں سے اکثر کے خیالات معلوم کیے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے پی پی کو ووٹ دیے تھے اور وہ بھٹو کے اتنے ہی وفادار ہیں جتنا کوئی دوسرا ہو سکتا ہے۔ لیکن ان پر یحییٰ خاں کے وفادار ہونے کا بے بنیاد الزام لگا کر برطرفی کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ عام طور سے پولیس والے ایسی دھمکیوں کو خاطر میں نہیں لاتے لیکن ان دنوں پی پی اقتدار کے گھوڑے پر سوار تھی۔ اس لیے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانا چنداں دشوار نہیں تھا۔

”بنیادی طور پر اعتماد کا فقدان تھا کیونکہ غریب سپاہی یا سب انسپکٹر سابقہ حکومت کے ساتھ کیسے گٹھ جوڑ کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی کہ فوری طور پر فورس کا اعتماد بحال کیا جائے۔

ہڑتال کے پس پشت کئی اور چھوٹی موٹی وجوہات بھی کارفرما تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ پولیس خصوصاً پولیس لائنز ریزرو اپنے حالات کار سے بے حد نالاں ہے۔ کم تنخواہ‘ طویل اوقاتِ کار اور ان کے ساتھ عموماً برا سلوک کیا جاتا ہے۔ میں نے خبردار کیا کہ اگر ان مسائل کا حل نہ ڈھونڈا گیا تو اس طرح کے واقعات دوسرے مقامات پر بھی رونما ہو سکتے ہیں۔ دوسروں کو لاڑکانہ کے ہڑتالی پولیس والے دور سے ہیرو نظر آئیں گے۔ پس پولیس کی سینئر کمانڈ اور حکومت کو بنیادی اقدامات فوراً اور بلاتاخیر کرنے چاہئیں۔

دادو اور حیدر آباد میں ہڑتال

لاڑکانہ کی ہڑتال تو ختم ہوگئی لیکن اس کے فوراً بعد دادو میں اور پھر حیدر آباد میں پولیس نے ہڑتال کردی۔ میں وہاں بھی گیا اور میاں انور علی کو جامع رپورٹ پیش کی۔ انہوں نے اس رپورٹ پر صدر زیڈ اے بھٹو سے تبادلہ ٔخیال کیا تاہم پولیس والوں کی بہتری کے لیے کوئی مثبت قدم نہیں اُٹھایا گیا۔ اس کے برعکس جو اندازِ فکر اپنایا گیا وہ سراسر مطلق العنانیت پر مبنی‘ غیر دانشمندانہ اور حقیقت پسندی کے خلاف تھا۔ بعدازاں میاں صاحب مجھ سے ازراہِ مذاق روزانہ پوچھتے تھے: ’’دور کے ہیروز کا کیا حال ہے؟‘‘

سرحد اور پنجاب میں ہڑتال

چونکہ سندھ میں ضروری تدابیر اختیار نہیں کی گئیں۔ اس لیے ہڑتالوں کا سلسلہ جلد ہی صوبہ سرحد اور پنجاب تک پھیل گیا۔ اس طرح مسئلہ نے انتہائی گھمبیر اور سنگین صورت اختیار کرلی۔ اُدھر بھٹو نے حقائق کا سامنا کرنے کی بجائے اس اقدام کے پسِ پردہ خفیہ ہاتھوں کا سراغ لگانا شروع کردیا۔ انہیں اس کے پیچھے روس‘ بھارت‘ نیپ اور بعض دوسرے شرپسند عناصر کا ہاتھ نظر آیا۔ وہ گربہ کشتن روزِ اوّل کے مصداق اس مسئلہ سے پوری قوت اور سختی کے ساتھ نمٹنا چاہتے تھے۔ انٹیلی جنس بیورو‘ سول حکام‘ سینئر پولیس افسران حتیٰ کہ جرنیلوں نے بھی طاقت استعمال نہ کرنے کا مشورہ دیا مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔ وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ ہڑتالیوں کو سبق سکھانے اور دوسروں کے لیے نمونہ عبرت بنانے کی خاطر انہوں نے آرمی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن اور پاک فضائیہ کے چیف ایئر مارشل رحیم یار خاں کو پشاور پولیس لائنز پر شروع میں توپ خانہ سے اور آخر میں ہوائی جہازوں سے بمباری کرنے کا حکم دے دیا۔ ان دونوں نے اس حکم کے سنگین مضمرات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس پر نظرثانی کا مشورہ دیا مگر بھٹو ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ناچار

انہوں نے منصوبہ بنانے اور جاسوسی کرنے کے بہانے کارروائی موثر کردی۔ بھٹو نے اسے حکم عدولی اور نافرمانی سے تعبیر کیا۔

دریں اثنا سینئر پولیس کمان کی طرف سے ترغیب اور دھمکیوں نے ہڑتالی پولیس والوں کو ہڑتال ختم کرنے پر مجبور کر دیا۔ پنجاب میں راولپنڈی کے ڈی آئی جی صاحبزادہ رؤف علی اور دیگر سینئر افسروں نے پس پردہ زبردست محنت کی۔ انہوں نے پولیس والوں کو یقین دلایا کہ ہڑتال ختم کرنے کی صورت میں انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ جب فضا سازگار ہوگئی تو گورنر مصطفیٰ کھر نے ہڑتال ختم کرنے کے لیے ڈیڈ لائن دے دی۔ یہ تدبیر کامیاب رہی۔ کھر نے لاہور میں ایک بڑے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے پولیس والوں کو دھمکی دی کہ ہڑتال فوراً ختم کردیں ورنہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ پولیس کی ہڑتال معمولی شور شرابے کے ساتھ ختم ہوگئی جس سے پی پی' کھر اور بھٹو کی ساکھ اور قوت کو تقویت پہنچی لیکن کسی نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اس لیے وہ سلسلہ جاری رہا۔ حکومت نے سخت رویہ اپنا لیا اور پولیس پہلے سے زیادہ سنگدل اور کرپٹ ہوگئی۔

بھارت میں پولیس کی بغاوت

یہ گڑبڑ محض پاکستان تک محدود نہیں تھی۔ مئی 1973ء میں بھارت کے صوبہ یوپی (اترپردیش) میں پولیس نے بغاوت کردی اور فوج سے ٹکر لینے پر آمادہ ہوگئی۔ وہ واقعہ پورے جنوبی ایشیا کے پولیس حکام کے لیے زبردست تشویش کا باعث بن گیا۔ چونکہ اکثر ممالک کی تنظیم اور سروس کے حالات ایک جیسے ہیں' اس لیے بغاوت کی وبا کسی بھی علاقہ میں پھیل سکتی ہے۔ صاحبزادہ رؤف علی کو جو ان دنوں آئی جی پولیس تھے' اس معاملہ سے بڑی دلچسپی تھی کہ بھارت میں ہونے والی شورش کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس کے پس پردہ عوامل کا تجزیہ ہونا چاہیے۔ رپورٹ میں اس سے حاصل ہونے والے اسباق کی نشاندہی بھی کرنی چاہیے۔

اے حمید اس کام کے لیے موزوں ترین شخص تھے۔ وہ لاڑکانہ میں ہونے والی پولیس ہڑتال کی انکوائری کے لیے بھی میرے ہمراہ گئے تھے۔ چنانچہ میں نے انہی سے استدعا کی کہ اس کام کو انجام دیں۔ وہ لاہور سے راولپنڈی پہنچے اور کئی مہینے میرے پاس قیام کیا۔

انہیں سب سے پہلے جس مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا وہ مطلوبہ خام مواد کی عدم دستیابی تھی۔ مذکورہ شورش سے متعلق اخبارات میں جو خبریں اور رپورٹیں شائع ہوئیں وہ نامکمل اور سطحی نوعیت کی تھیں۔ حتیٰ کہ

برطانوی اخبارات نے بھی جو برطانوی راج کے حوالے سے جنوبی ایشیا کے امور کی خاصی کوریج کرتے ہیں' اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس موضوع پر دوسری رپورٹیں بھی دستیاب نہیں تھیں۔ کیونکہ کسی پولیس افسر یا انتظامیہ افسر نے اس شعبہ میں تحقیق و مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اے حمید کو یقین تھا کہ شورش کے واقعات اور مختلف پہلوؤں پر مطلوبہ مواد صرف بھارتی اخبارات میں مل سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس دور کے بلکہ کئی ہفتے بعد تک کے تمام انگریزی اخبارات منگوا لیے تاکہ متعلقہ خبروں بلکہ تبصروں اور تجزیاتی رپورٹوں سے بھی استفادہ کیا جا سکے۔

ان کی مجموعی تعداد 500 کاپیوں تک پہنچ گئی۔ جو کسی عام آدمی کو خوفزدہ کرنے کے لیے بھاری بھرکم مواد تھا۔ لیکن اے حمید قطعاً نہیں گھبرائے بلکہ خوش ہوئے کہ اب وہ اپنے مطالعہ و تحقیق کو جامع شکل دے سکیں گے۔ وہ ہر روز صبح سے رات گئے تک اخبارات میں کھوئے رہتے۔ سوائے کھانے پینے کے وقفہ کے وہ اپنی نشست سے بھی نہ اٹھا کرتے۔ ان کے یوں مسلسل بیٹھ کر کام کرنے کا ایک نقصان یہ ہوا کہ ان کے وزن سے ایس ایس پی ہاؤس کے صوفہ میں گڑھا پڑ گیا۔

انہوں نے قریباً دو مہینے کی محنتِ شاقہ کے بعد ضروری خام مواد اکٹھا کر کے اس میں سے انتخاب' درجہ بندی اور تلخیص کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کے بعد اسے قلمبند کرنے کا مرحلہ شروع ہوا۔ اخبارات میں سے تراشے کاٹنے' انہیں کاغذوں پر چسپاں کرنے' ٹائپ کرانے' مکرر ٹائپ کرانے اور پروف ریڈنگ کرنے میں اس قدر محنت کرنی پڑی کہ اے حمید آج تک کفِ افسوس ملتے ہیں کہ کاش ان دنوں کمپیوٹر دستیاب ہوتا تو اتنی مشقت نہ کرنی پڑتی۔ یاد رہے کہ دنیا میں پہلا شخصی کمپیوٹر ان کا منصوبہ مکمل ہونے کے پورے دو سال بعد مارکیٹ میں آیا تھا۔ گویا وہ ہمیشہ وقت سے آگے چلتے ہیں۔

تحقیق بذاتِ خود آسان کام نہیں تھا۔ مثال کے طور پر کسی بھی اخبار نے بغاوت کے سرغنہ کی بابت چند الفاظ یا ایک آدھ فقرے سے زیادہ کچھ نہیں لکھا تھا۔ اے حمید نے ان تمام اجزاء اور ٹکڑوں کو یکجا کر کے رام بدوریا کا جو ایم اے پاس ہیڈ کانسٹیبل تھا' خاکہ تیار کیا۔ وہ غیر معمولی آدمی اپنے ساتھیوں سے اس قدر مخلص تھا کہ اس نے اے ایس آئی بننے سے محض اس لیے انکار کر دیا کہ ترقی پانے کے بعد وہ نچلے اہلکاروں کی انجمن کا رکن نہیں رہ سکتا تھا۔

اے حمید کی انتھک محنت کے نتیجہ میں 87 صفحات پر مشتمل رپورٹ تیار ہوگئی جو معاملہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی تھی۔ چونکہ ہندوستان اور پاکستان کے حالات ایک جیسے ہیں' اس لیے وہ رپورٹ ہمارے لیے انتہائی کارآمد ثابت ہوئی۔ صاحبزادہ رؤف علی نے بڑے انہماک واشتیاق کے ساتھ رپورٹ کا مطالعہ کیا اور اپنے سٹاف افسروں کی میٹنگ میں اس کی دل کھول کر تعریف کی۔ انہوں نے رپورٹ کی نقلیں تیار کروا کے دوسرے پولیس افسروں میں تقسیم کرائیں۔ اے حمید از راہ مذاق کہا کرتے تھے کہ اگر اس کی ایک بھی کاپی سرحد کے پار چلی گئی تو بھارتی بے حد متاثر ہوں گے اور اس شاندار انٹیلی جنس کام کا سہرا انٹیلی ایجنسیوں کے سر باندھیں گے۔

اس رپورٹ نے بہت زیادہ مواد اور شہادتوں کے ان نتائج کی توثیق کر دی جو میں نے لاڑکانہ رپورٹ میں اخذ کیے تھے۔ دیگر بہت سے عوامل کے علاوہ ناگفتہ بہ حالات کار' ڈیوٹی کا طویل دورانیہ' جائے سکونت کا فقدان' ناکافی ٹرانسپورٹ' کم تنخواہ' مقررہ معیار سے زیادہ تعلیم اور سب سے اہم ان کی عزتِ نفس اور خودداری کو ملحوظ نہ رکھنا' اس کی بڑی بڑی وجوہات تھیں۔

لوگوں کے ساتھ پولیس کا رویّہ

میں نے پولیس ہڑتال کی تحقیقات سے حاصل ہونے والا سبق ہرگز فراموش نہیں کیا۔ ان میں سے ایک سبق عوام کے ساتھ پولیس کے رویہ کی بابت تھا۔ میں نے لاہور کا ایس ایس پی بننے کے بعد محسوس کیا کہ پولیس کا بے ہودہ و گستاخانہ رویہ ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ محنت کش' طلبا' صحافی اور عام شہری، سبھی پولیس کے درشت بلکہ توہین آمیز رویہ اور گندی زبان سے نالاں تھے۔ دوسری طرف پولیس والے یہ سمجھتے تھے کہ وہ راہِ راست پر ہیں اور اپنا کام ٹھیک طریقہ سے انجام دے رہے ہیں۔

میں نے ان کے ساتھ صاف گوئی اور بے تکلفی سے بات کی۔ ان میں سے اکثر نے نرمی برتنے اور قانون وانصاف پر مبنی ثابت قدمی اختیار کرنے کے بارے میں میرے وعظ و نصیحت سے کچھ اثر نہیں لیا۔ انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ صاحبانِ اختیار میں سے اکثر لوگ نظام حکومت مؤثر انداز میں چلانے کے لیے گالم گلوچ اور آہنی پنجہ کی تدابیر استعمال کرتے تھے۔ مثال کے طور پر غلام محمد بطور گورنر جنرل یحییٰ خاں بحیثیت صدر اور امیر محمد خاں آف کالا باغ گورنر کے طور پر اپنے ماتحتوں کو فحش گالیاں بکتے اور بعض اوقات ان پر ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

ہمارے معاشرہ میں پولیس والوں کے لیے اعلیٰ تعلیم پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ تاہم کوئی اس کا صحیح تجزیہ نہیں کرتا۔ یہ فرضی کہاوت عام طور سے مشہور ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ سپاہی اپنا رویہ خود بخود درست کر لیں گے۔ مگر یہ بات ہمیشہ درست نہیں ہوتی۔ تعلم کا روزگار کی نوعیت کے ساتھ تعلق ہونا لازمی ہے اور معاوضہ کا معقول ہونا بھی ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر اس سے ادارہ میں غلط بیانی پھیلے گی اور سپاہیوں کے لیے انفرادی طور پر مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔ اگر کسی گریجوایٹ کو گارڈ ڈیوٹی پر لگا دیا جائے تو وہ اپنی تعلیمی صلاحیت کو بے فائدہ بلکہ رائیگاں سمجھے گا۔ مایوس و پریشان حال شخص زیادہ زود رنج اور چڑچڑا ہو جاتا ہے اور بدتمیزی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ پولیس اصلاحات کا ایک جامع پیکیج ہونا چاہیے جو تمام پہلوؤں پر محیط ہو۔ یہ ان اسباق میں سے ایک ہے جو میں نے اے حمید کی رپورٹ سے سیکھے۔

پینے کا پانی بھی دستیاب نہیں

میں نے اے حمید سے گزارش کی کہ وہ باہر کے آدمی کی حیثیت سے پولیس والوں کے غیر مہذب رویّہ کے اسباب کی ایک فہرست مرتب کریں۔ میں نے ان کی مرتب کردہ وجوہات کا مطالعہ کیا اور ان پر تجزیاتی نظر ڈالی۔ میرے ذاتی تجربہ اور اندرونی معلومات کی روشنی میں جو تصویر ابھری، وہ انتہائی مایوس کن تھی۔

رہائش کے انتہائی خراب حالات غیر مہذب رویّہ کی سب سے بڑی وجہ ہیں۔ لاہور پولیس کے پاس کوئی رہائشی کوارٹرز نہیں۔ شہر کی آبادی 15 گنا سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور اسی حساب سے پولیس کی افرادی قوت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ لیکن ان کے کوارٹرز (شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں کے لیے) کی پرانی تعداد جوں کی توں ہے، اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ شادی شدہ سپاہیوں کی محض 2 فیصد نفری کے لیے کوارٹر ہیں۔ ان کی حالات بھی انتہائی ناگفتہ ہیں کیونکہ وہ 19 ویں صدی میں تعمیر کیے گئے تھے۔ دفتروں، تھانوں اور پولیس چوکیوں کے لیے اکثر عمارتیں یا تو بوسیدہ حالت میں ہیں یا سرے سے موجود نہیں۔ بے شمار رہائشی اور تجارتی کالونیاں وجود میں آ گئیں مگر پولیس کے لیے عمارات کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔

لاہور پولیس لائنز میں جہاں ہزاروں پولیس والے اقامت گزین ہیں، پینے کا پانی تک میسر نہیں کیونکہ وہاں کا ٹیوب ویل گزشتہ دس سال سے بند پڑا ہے۔ سپاہیوں کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے کارپوریشن کی ٹینکی یا قریبی مسجد سے پانی چرانا پڑتا ہے۔ گلبرگ، اچھرہ، سمن آباد، ماڈل ٹاؤن اور دوسرے

پوش علاقوں میں تھانوں اور پولیس چوکیوں کے لیے سر چھپانے کے لیے کوئی عمارت نہیں۔ ٹرانسپورٹ اور ٹیلی کمیونیکیشنز خستہ حالت میں ہیں۔ ٹیلی فون اور گیس کے بل ادا کرنے کے لیے فنڈز نہیں۔ سرکاری گاڑیوں یہاں تک کہ ہتھیاروں کی مرمت کے لیے کوئی پیسہ نہیں۔ پولیس والوں کو کوئی تربیت نہیں دی جاسکتی کیونکہ تربیتی سہولتیں دستیاب نہیں یا تربیت کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ میں نے اس خستہ صورتِ حال پر جس قدر زیادہ غور کیا اسی قدر زیادہ مایوس ہوا اور میری حوصلہ شکنی ہوئی۔ اے حمید کا تجزیہ واقعی حوصلہ شکن تھا۔

یہ خراب حالت عرصۂ دراز کی غفلت و لاپروائی کا نتیجہ تھی۔ یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں نے کبھی مطلوبہ فنڈز فراہم نہیں کیے۔ خلافِ قانون حکومتوں کو قائم رکھنے کے لیے پولیس کو ہر وقت سولی پر ٹانگ کر رکھا گیا۔ لیکن پولیس کی ہائی کمان یا حکمرانوں نے پولیس والوں کو درپیش مسائل پر کبھی توجہ نہیں دی۔ حکمران اور اعلیٰ حکام ہمیشہ اس بات کے خواہاں رہے کہ احتجاج کرنے والوں کو ان سے دور رکھا جائے تاکہ وہ کسی بدمزگی کے بغیر اپنے اختیارات سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ انہوں نے جرائم کو بھی لائق توجہ نہیں سمجھا تاکہ مجرم ان کے ذاتی عیش و آرام میں خلل نہ ڈالیں۔ مجرم عام لوگوں کے لیے مسئلہ بنے رہے' اشرافیہ کے لیے نہیں کیونکہ ان کے بنگلوں پر تحفظ کے لیے گارڈ موجود ہوتی ہے۔

فطری اتحادی

جب پولیس مین کو تحفظ کے معاملہ میں اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تو قانون شکن عناصر اور مجرم رضاکارانہ طور پر پولیس کے اتحادی بن گئے۔ یعنی نظرانداز کردہ پولیس مین کا جھکاؤ مجرموں کی طرف ہو گیا اور اس نے ذاتی فائدہ کے لیے اپنے اختیار کو غلط استعمال کر کے جینے کی روش اپنالی۔ اختیار اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ایک مقدس امانت ہوتی ہے لیکن پولیس والوں نے حکمرانوں کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دیا جو ملک کے بنیادی قوانین کی خلاف ورزی کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ تھکے ہارے اور فاقہ زدہ پولیس والے جن کا نہ کوئی گھر ہوتا ہے نہ ٹھکانہ' اپنے خاندانوں کے شائستہ ماحول سے دور رہتے ہیں' جنہیں غیر قانونی اور مجرم حکمرانوں کے لیے طاقت کے اندھا دھند استعمال نے شرف انسانیت سے محروم کر کے وحشی درندہ بنا دیا ہے۔ وہ مجرموں خصوصاً منظم گروہوں کے ساتھ ساز باز کرنے پر مجبور ہو گئے اور غریب شہریوں کو مشقِ ستم بنانے لگے۔ اگر اس طرح کے حالات نے انہیں اکھڑ' بدتمیز' بدزبان اور سنگدل بنا دیا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

یہ بڑا تکلیف دہ تجزیہ تھا جو اسے فیلڈ اور ریسرچ سے موقع پر مشاہدات اور بھارت میں پولیس کی بغاوت پر تحقیق سے حاصل کیا۔ اس قدر مشکلات کی موجودگی میں میں اکیلا پولیس کو عوام کے قریب کس طرح لاسکتا تھا؟ بہر حال میں انسانی فطرت کے درست ہونے پر یقین رکھتا ہوں۔ اس لیے میں نے پولیس والوں کو قانون کے پابند شہریوں کے قریب لانے کی ذمہ داری کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کرلیا۔

افسروں کو پرانی ڈگر سے ہٹانا

میں انسانیت کی خدمت کے موضوع پر اجلاس منعقد کرنے اور تقاریر کرنے کے علاوہ اپنے افسروں کو پولیس کے عام ماحول سے دور لے جاتا اور مختلف موضوعات مثلاً شاعری' موسیقی اور آرٹ پر بحث مباحثہ کی دعوت دیتا۔ ایک بار میں انہیں شاہی قلعہ (لاہور) کے ''روشنی اور آواز'' شو میں لے گیا جس میں قلعہ کا تاریخی پس منظر پیش کیا گیا تھا۔ شاہانہ مکالمے' کلاسیکل میوزک' تیز روشنی اور آواز کے مختلف النوع اثرات کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ اس کے بعد میں نے پولیس افسروں کے ایک مشاعرہ کا اہتمام کرایا۔ اس سے بڑی صحت مند فضا پیدا ہوئی اور بہت سے افسروں کے شاعرانہ ذوق کا انکشاف ہوا' جسے تسلیم کیا گیا اور دل کھول کر داد دی گئی۔ اس کے علاوہ میں انہیں پکنک کے لیے کامران کی بارہ دری (جو کہ دریائے راوی کے عین وسط میں واقع ہے) شالامار باغ' چھانگا مانگا کے فاریسٹ پارک' ہیڈ بلوکی اور لاہور کے گردونواح میں واقع دیگر تفریحی مقامات پر لے گیا۔ میں نے رجمنٹ کی سطح پر کبڈی' والی بال اور باسکٹ بال جیسے کھیل منظم کیے اور ان کے میچ کرائے۔ علاوہ ازیں ورائٹی شوز اور عوامی میوزک کے مقابلوں کا اہتمام کرایا۔ ان میں رسہ کشی اور گلی ڈنڈا کے مقابلے سب سے زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز ثابت ہوئے۔

میں نے افسروں کو بتدریج ان کے خول سے باہر آتے دیکھا۔ میں انہیں روزمرّہ کی سرگرمیوں سے ہٹا کر تھوڑی دیر کے لیے کہیں دور لے جاتا اور ان کے ذہنوں کو سکون و آسودگی فراہم کرتا تاکہ وہ انسانی اقدار سے متاثر ہوں۔ دن بھر کی مشقت کے دوران ذہن کو سکون اور تروتازگی بخشنے والے چند لمحات سے سالہا سال کی تھکاوٹ اور بوریت کے اثرات دور ہونے لگے۔

میں ہوا کا رخ بدلنے کی جو کوشش کر رہا تھا' یہ اس کی حوصلہ افزا ابتدا تھی۔ میں نے پولیس والوں کو مختلف ذرائع سے قانون کی حکمرانی اور اخلاقیات دوبارہ پڑھانے کی کوشش کی۔ انتظامیہ اور عدلیہ نے بھی قابلِ ستائش ٹیم سپرٹ کا مظاہرہ کرکے میری مدد کی۔ زندگی کے جملہ شعبوں کے لوگوں کی طرف سے جو

حوصلہ افزا جواب ملا اس سے جرائم کے خلاف جدوجہد میں بڑی مدد ملی۔ عوام نے اس لڑائی میں ہر ممکن طریقہ سے حصہ لیا بلکہ بدمعاشوں کے خلاف پولیس والوں کے شانہ بشانہ لڑتے ہوئے اپنی جانوں کے نذرانے بھی پیش کیے۔ عوام کے تعاون اور حوصلہ افزائی کے طفیل بہت سے معاملات میں پولیس والوں نے بدمعاشوں کے ساتھ مقابلہ میں موت سے ڈرنا چھوڑ دیا اور بڑے حیرت انگیز واقعات رونما ہوئے۔ جس طرح فوجی جوان کا لڑائی میں ٹیسٹ لیا جاتا ہے اسی طرح مجرم کے ساتھ مقابلہ پولیس والوں کی بہادری کا ٹیسٹ ہوتا ہے۔ پست ہمت فورس ممکنہ حد تک سامنے آ کر لڑنے سے گریز کرتی ہے۔ کیونکہ لڑائی میں بہرحال مجروح یا ہلاک ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ یہ امر قطعی حیرت انگیز نہیں کہ پنجاب میں پولیس مقابلوں کی سالانہ تعداد اکثر دو ہندسوں میں ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر 1986ء میں 16' 1987 میں 28' 1988ء میں 68' 1989ء میں 60 اور 1990ء میں 167۔ لیکن 1991ء میں یہ تعداد ابتدائی شرح سے چھ مہینوں میں بڑھ کر 119 تک پہنچ گئی۔ 1992 اور 1993ء کے اعداد و شمار اس سے کہیں زیادہ تھے۔ (مزید تفصیلات کے لیے باب 50 سے رجوع فرمائیں)۔

اس جذبہ نے اکثریت کو کسی حد تک متاثر تو کیا لیکن وہ اس کمی کو پورا نہیں کر سکا جو سرمایہ اور وقت جیسی اہم ضروریات دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے واقع ہو چکی تھی' اس لیے کوئی نمایاں تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی۔ جرائم کی صورتِ حال بدستور سنگین رہی بلکہ جو کچھ میں بیان کر رہا ہوں' اس سے بھی بدتر ہو گئی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ہمیں جو کچھ نظر آ رہا ہے' وہ آئس برگ کی چوٹی بھی نہیں۔ یہ اخلاقی و معاشرتی انحطاط کی وہ سطح ہے جسے قریب سے دیکھا جائے تو ہولناک منظر دکھائی دیتا ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہم نے صدیوں کی مسلمہ حکمت و دانائی کو نظر انداز کر کے طاقت ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ اخلاقی اور قانونی قدروں کا مذاق اڑایا گیا اور ان کی خلاف ورزی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا گیا، درست سمجھا گیا، بلکہ مسرت کا اظہار کر کے حوصلہ افزائی کی گئی۔ جس کے نتیجہ میں پورا معاشرتی ڈھانچہ روبہ زوال ہو گیا۔ جس سے مجرم گروہوں اور مافیا کے حوصلے بلند ہوئے۔

مجھے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان سے جو بلند عہدوں پر فائز ہیں' یہ سن کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ جرائم پر قابو پانے کی ذمہ دار اکیلی پولیس ہے۔ اس میں شک نہیں پولیس کو مجرموں کی گرفتاری اور ان کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے میں اہم کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کردار بڑا محدود ہے۔ مجرموں کو سزا دینے کا اصل اختیار اور ذمہ داری عدالتوں کی ہے۔ بدقسمتی سے عدالتوں کے کردار کو بھی

ان ظالم اور غیر قانونی حکمرانوں نیز افسروں نے پولیس افسران کو [illegible] دیا ہے۔ جو معمولی سا بہانہ ہاتھ آنے پر آئین شکنی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس طرح وقت کی آزمائش پر پورا اترنے والے فوجداری نظامِ عدل کو روبہ انحطاط کر دیا گیا۔ حقیقت میں غیر اخلاقی طور پر مسلط ہونے والے طالع آزماؤں نے اس نظام کو اپنی حماقتوں سے بڑی بے غیرتی کے ساتھ تباہ و برباد کر دیا ہے۔

پولیس کی حالت بڑی قابلِ رحم ہے۔ پنجاب میں نصف سے زیادہ تھانوں کو عمارتیں میسر نہیں۔ بعض شامیانوں کام کر رہے ہیں۔ پولیس لائنوں میں جو بیرکیں موجود ہیں' ان میں بمشکل 15 فیصد نفری کے قیام کی گنجائش ہے۔ کوئی یہ جاننے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ باقی 85 فیصد نفری رات کہاں گزارتی ہے۔ رہائشی کوارٹرز شادی شدہ ملازمین کی تین فیصد تعداد سے بھی کم کے لیے میسر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ باقی 97 فیصد اپنے بیوی بچوں کو کہاں رکھیں؟ مجرموں سے نمٹنے کے لیے پولیس کے پاس زیادہ تر 303 رائفلیں ہیں اور ان میں سے بھی اکثر ناکارہ ہیں۔ ٹرانسپورٹ اوّل تو میسر نہیں اگر کچھ گاڑیاں دستیاب ہیں تو وہ چلنے کے قابل نہیں۔ مواصلات کے نیٹ ورک میں جابجا پیوند لگے ہیں۔ بعض مقامات پر ٹیلی گراف کے ساتھ فورس کو ڈاب بھی زیرِ استعمال ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے مسائل درپیش ہیں' جنہیں حل کرنے کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے۔

اس صورتِ حال کو ایس ایچ اوز کے بار بار تبادلوں نے مزید خراب اور سنگین بنا دیا ہے۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق جولائی 1991ء میں 556 میں سے محض 37 تھانے ایسے تھے جہاں کے ایس ایچ اوز کی مدتِ تعیناتی ایک سال سے زیادہ تھی۔ 29 فیصد تھانوں میں یہ مدت ایک سال سے بھی کم پائی گئی جبکہ 44 فیصد تھانیداروں کی مدت ملازمت تین مہینے سے بھی کم نکلی۔ جب انہیں اپنے ماتحت علاقہ کو سمجھنا تو درکنار عملہ کی تعداد جاننے کے لیے بھی وقت نہ ملے تو ان سے اچھی کارکردگی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

امن کے لیے ایک پائی میسر نہیں

جو لوگ ہر وقت ''سخت کارروائی'' اور ''آہنی ہاتھوں سے نمٹنے'' کی باتیں کرتے ہیں وہ اس وقت کہاں چلے جاتے ہیں جب بجٹ تیار ہوتا ہے اور پولیس کو انتہائی ناگزیر ضروریات کے لیے بھی فنڈز نہیں ملتے؟ اس آہنی ہاتھ کو زنگ لگ گیا ہے اور وہ عرصۂ دراز کی غفلت اور عدم منصوبہ بندی کے باعث ناقابلِ

استعمال ہوگیا ہے۔ اب اس سے نرم کارروائی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ بلند بانگ اعلانات اور پرزور وعدوں پر کبھی عمل نہیں کیا گیا' اس لیے پولیس کو بنیادی اشیائے ضرورت بھی میسر نہیں۔

حصولِ آزادی کے بعد سے اب تک کسی حکومت نے فوجداری انصاف کی فراہمی کو اپنی اولین ترجیح قرار نہیں دیا۔ جب اسے "غیر ترقیاتی مد" کے کھاتہ میں ڈال دیا گیا تو اس کی حالت مزید خراب ہوگئی۔ بیوروکریسی کے "بابوؤں" نے کبھی نہیں سوچا کہ معاشرہ میں امن قائم کیے بغیر کوئی ترقی نہیں ہوسکتی۔ گمراہ حکومتوں نے عوام کو بھاری بھرکم منصوبوں سے متاثر کرنے کی کوشش کے دوران یہ بات بھلادی کہ ان کا اولین فرض اپنے شہریوں کی جان' مال اور آبرو کی حفاظت کرنا اور انہیں انصاف فراہم کرنا ہے۔ اچھی حکمرانی کا مطلب ہے امن اور انصاف۔ ترقی اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب لوگ اپنی حالت بہتر بنانے کے خواہاں ہوں۔

گمراہ حکمرانوں نے معاشرتی نظام کی قیمت پر مادی ترقی کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ انہوں نے پولیس کے فنڈز میں کمی کردی۔ 1947ء میں پنجاب پولیس کا بجٹ کل صوبائی بجٹ کا 11 فیصد تھا۔ وہ بھی اس وجہ سے کم تھا کہ دوسری جنگ کے باعث معاشی حالات دگرگوں تھے۔ 1990ء کے عشرہ میں پولیس کا بجٹ کم ہوتے ہوتے پانچ فیصد سے بھی کم رہ گیا۔ 1970ء کی دہائی میں یہ شرح تین فیصد تک پہنچ گئی تھی۔

کسی کو اس پر تعجب نہ ہوتا' اگر پولیس کی کارکردگی بدستور بدتر رہتی۔ لڑنے کا جذبہ اور اپنے فرض سے لگاؤ آدمی کی مدد تو کرتے ہیں' لیکن محض ان سے کام نہیں چلتا۔ کسی فورس کو نظرانداز کرنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ پولیس کے معاملہ میں اس کی کوئی حد نہیں رہی۔ مجرمانہ غفلت برتی گئی۔ میں نے منتشر پولیس کی تعمیرِ نو اور پولیس کے حوالہ سے معاشرہ کی روزافزوں ضروریات پوری کرنے کے لیے ایک پانچ سالہ جامع منصوبہ تیار کیا۔ اس پورے پیکیج پر سالانہ دو بلین روپے سے زیادہ خرچ نہیں ہونا تھا۔ پانچ سالہ منصوبہ کی تکمیل سے نہ صرف ماضی کی لاپروائی کا ازالہ ہوجاتا بلکہ پولیس کو کسی حد تک جدید خطوط پر استوار کرنا بھی ممکن ہوجاتا۔ حکومت کے دیگر اخراجات کے مقابلہ میں امن کی قیمت نہ ہونے کے برابر تھی۔

فنڈز کے مطالبہ پر غور کرنے کے لیے صوبائی اور وفاقی سطح پر کئی اجلاس ہوئے۔ وزیراعظم اور وزیراعلیٰ دونوں اس کے حق میں تھے کہ پولیس کی کارکردگی بہتر ہونی چاہیے۔ لیکن خزانہ کو کنٹرول کرنے

والے ماتحت حکام' جنہیں فنڈز کے لیے بالکل جائز درخواستیں بھی مسترد کرنے سے روحانی خوشی ہوتی ہے۔ ''سنگدل اور بے رحم پولیس پر رقم ضائع کرنے'' کو تیار نہیں ہوئے۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ ان کی سرد مہری و شوخ چشمی کو پردہ اخفا میں نہیں رہنے دوں گا۔ اسلام آباد کی ایک میٹنگ میں میں نے کہا: ''ٹھیک ہے' آپ کی دلیل بڑا وزن رکھتی ہے۔ پھر آپ پورے محکمہ پولیس کا بستر گول کیوں نہیں کر دیتے؟ آپ اکیلی پولیس کو موردالزام کیوں ٹھہراتے ہیں؟ ہم میں سے سب سنگدل و بے رحم ہیں۔ آپ بھی خیر مجسم نہیں ہیں۔ آپ اپنے ایئر کنڈیشنڈ دفاتر میں بیٹھ کر جو کچھ کر رہے ہیں' وہ بنیادی طور پر ایک اکاؤنٹنٹ کا کام ہے۔ پھر بھی آپ پولیس والے کو مطعون کرتے ہیں جو اپنی جان پر کھیل کر بدمعاشوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ شدید مشکلات و مصائب سے دوچار ہونے کے باوجود آپ سے زیادہ فرض شناسی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ موجودہ حالات میں بھی ان طرز عمل آپ میں سے بعض بہترین افراد سے اچھا رہا ہے۔ پولیس کا نڈر سپاہی روزانہ گولیوں کا سامنا کرتا ہے۔ تاکہ آپ جیسے ضعفِ بصارت کے شکار ''بابو'' سکون کی نیند سو سکیں، میں سچ مچ طیش میں آ گیا تھا۔ بہرحال میرے وہ سخت الفاظ کارگر ثابت ہوئے۔ صاف جواب کی بجائے مجھے 92-1991ء کے لیے 250 ملین روپے کی جزوی گرانٹ مل گئی اور وہ بھی ایک وقت کی گرانٹ کے طور پر۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بیوروکریسی معاشرہ کی بنیادی ضروریات سے آنکھیں بند کر کے کس طرح کام کرتی ہے۔ مجھے اس تکلیف دہ حقیقت کا احساس تھا کہ پولیس والوں نے اپنی قربانیوں سے معاشرہ کے بگاڑ کے آگے بند باندھ دیا ہے۔ لیکن حکومت احساسِ ذمہ داری سے غافل ہو گئی۔ اسی طرح اگر پولیس والے بھی اپنا فرض ادا نہ کرتے تو ہولناک اور سنسنی خیز جرائم میں اضافہ ہو جاتا۔ ڈاکو اور لٹیرے بیوروکریٹس میں سے بھی بعض کے گھروں کو لوٹ لیتے۔ اس صورت میں ہر طرف زبردست خوف و ہراس پھیل جاتا اور پولیس کو اپنے انتہائی ناگزیر مطالبات کے لیے شور و غل مچانے یا پریشان ہونے کی بجائے محض ایک دفعہ تقاضا کرنے پر رقم مل جاتی۔

اس اجلاس کے بعد مجھے زبردست روحانی اذیت سے گزرنا پڑا جسے مرتے دم تک فراموش نہیں کر سکوں گا۔ جونہی مجھے ریسٹ ہاؤس کے کمرہ میں تنہائی میسر آئی۔ میں ان شیر دل افسروں اور جوانوں کے لیے پھوٹ پھوٹ کر رویا جنہوں نے معاشرہ میں قیامِ امن کے لیے اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے ان کی قربانیوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ وہ قوم کے عظیم سپوت تھے اور اب بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی انہیں اجر دے سکتا ہے۔ وہ اپنے کمانڈرز کے حکم پر موت کے منہ میں چلے گئے۔ عام لوگوں

نے شہدا کے لیے زبردست عزت و احترام کا مظاہرہ کیا۔ ان کے اعزاز میں یادگاریں تعمیر کیں اور ان کی بیوی بچوں کی دیکھ بھال کی۔ لیکن بیوروکریٹک مشین کے ناعاقبت اندیش کل پرزے ان کی بنیادی ضروریات کا ادراک کرنے سے معذور رہے۔

ایک چیز جو دولت سے نہیں خریدی جاسکتی

حکومتوں کو اپنی ترجیحات پر نظرثانی کرنی چاہیے۔ اگر وہ خارجی دفاع کو وفاقی بجٹ میں دوسرے نمبر کی ترجیح قرار دے سکتی ہے، جو آڈٹ سے مستثنیٰ ہوتا ہے، تو ملک کے داخلی دفاع کے لیے ایک یا دو فیصد اضافی رقم کیوں خرچ نہیں کرسکتیں؟ اندرونی دفاع کی لڑائی تو دن یا رات کے وقت ہر روز لڑنی پڑتی ہے۔ جس میں پولیس والے مارے جاتے ہیں یا زخمی ہوتے ہیں۔ کوئی بھی دفاع خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی، مفت نہیں ہوسکتا۔ اگر قوم کے نمائندے رات کو سکون کی نیند سوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ انہوں نے داخلی سلامتی کے لیے اسی طرح معقول رقم فراہم کردی ہے جیسا کہ سرحدوں کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔ خارجی دفاع کے مصارف پر کسی کو اعتراض نہیں خصوصاً اس صورت میں جبکہ ہمارا واسطہ بھارت جیسے خطرناک دشمن سے ہے۔ لیکن اندرونی دفاع کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس دفاع کو اس خطیر رقم کے عشر عشیر سے مضبوط بنایا جاسکتا اور مطلوبہ معیار پر لایا جاسکتا ہے جو "ترقی" کے نام پر لٹائی جاتی ہے۔

اگر موجودہ روش جاری رہی تو معاشرہ کو اس وقت سے ڈرنا چاہیے جب اسے ناگزیر نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پولیس کا سپاہی ناخواندہ یا نیم خواندہ دیہاتی کی طرح نہیں ہوتا جو اس لیے تکالیف برداشت کرتا اور مشکلات سے گزرتا ہے کہ اس کے گھر متبادل صورت نہیں ہوتی۔ اب تو نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ کانسٹیبلوں کے لیے بھی میٹرک پاس ہونا لازمی قرار دے دیا گیا ہے اور ان میں بہت سے اس سے بھی زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ وہ اس حقیقت بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ان کے برابر تعلیمی صلاحیت رکھنے والے سرکاری اور نجی شعبہ میں دوسرے ملازمین کتنی تنخواہ لے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر بینک کا گارڈ ایک سپاہی کے مقابلہ میں اس کی روزمرہ ڈیوٹیوں کے حوالہ سے کہیں بہتر حالت میں ہے پھر وہ غیرانسانی حالت میں کام کرنے کا سلسلہ کیوں جاری رکھیں؟

معاشرہ کو اس وقت سے ڈرنا چاہیے جب پولیس والے اپنی حالت بہتر بنانے کی ٹھان لیں گے۔ یہ واحد منظم فورس ہے جسے مجرموں کو پکڑنے اور ان پر مقدمہ چلانے کا اختیار حاصل ہے۔ اگر پولیس والے بغاوت کردیں اور اپنے اختیارات ذاتی فائدہ کے لیے استعمال کرنے کا تہیہ کرلیں تو پولیس میں

موجودہ کرپشن اور تعذیب کی سطح اپنی اہمیت کھو بیٹھے گی۔

یوم حساب یقیناً آئے گا۔ لیکن اس وقت تک ہم جان و مال کے نقصان کی صورت میں بھاری قیمت ادا کر چکے ہوں گے۔ کیا معاشرہ اس وقت تک اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتتا رہے گا؟ جو لوگ پولیس سے توقع کرتے ہیں کہ وہ یورپی اور امریکی معیار پر پوری اترے' انہیں دونوں کے حالاتِ کار اور بجٹ کا موازنہ بھی کرنا چاہیے۔ کیا وہ اس بات پر مطمئن اور ممنون نہیں کہ ہمارے ہاں جرائم کی شرح بہت ہی کم ہے۔ اگر سرمایہ اس قدر قیمتی ہے کہ پولیس پر ضائع نہیں کیا جا سکتا تو اس دن کا انتظار کریں جب آپ کے پاس نوٹوں سے بھرے ہوئے بیگ تو ہوں گے لیکن امن و سکون فراہم کرنے والا میسر نہیں ہوگا۔ آپ بنیادی مسائل کا اپنی مرضی کے مطابق حل نہیں ڈھونڈ سکتے۔ داخلی سیکورٹی اس گولی کی مانند ارزاں نہیں جو سر درد کی صورت میں استعمال کی جاتی ہے۔



باب52

کچھ اپنے خاندان کے بارے میں

میاں محمد شفیع

میرے خسر میاں محمد شفیع ان انسانوں میں سب سے نفیس اور شائستہ تھے جن سے زندگی میں مجھے واسطہ پڑا۔ وہ صوبائی سول سروس (P.C.S) کے رکن تھے۔ وہ سرگودھا اور لاہور میں بحیثیت ڈپٹی کمشنر کام کر چکے تھے۔ 1965ء میں وہ حکومت مغربی پاکستان کے سیکرٹری تھے' جب وہ میری زندگی کا مرکزِ نگاہ بنے۔

میاں شفیع ایک ممتاز اسکالر' دانشور' کھلاڑی اور کلاسیکل موسیقی کے رمز آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ ادب اور فن کے سچے شیدائی تھے۔ انہوں نے 1957ء میں ''1857'' کے عنوان سے جنگِ آزادی کے موضوع پر جسے انگریزوں نے ''غدر'' کا نام دیا' اُردو میں ایک عظیم کتاب لکھی۔ وہ ایک بلند پایہ قلم کار تھے اور انہوں نے متعدد شہ پارے تخلیق کیے۔ بلا شبہ میاں صاحب اپنے طرزِ عمل اور کامیابیوں میں نقطۂ

کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔

میاں صاحب بڑی متاثر کن اور پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی شرافت اور مزاج میں عاجزی وانکسار تھا۔ وہ سب کے لیے رحمدل' شفیق اور جسٹس سجاد احمد خان جج لاہور ہائی کورٹ کے بقول ''انسانی ہمدردی کے دودھ سے لبریز'' تھے۔

میاں صاحب بیوروکریٹس میں پائے جانے والے عام عزور ونخوت سے پاک اور جیسا کہ مولانا مودودیؒ ان کے متعلق کہا کرتے تھے' کہ وہ اسلام کے بیان کردہ معیار کے مطابق ''مجسمۂ انکسار و شرافت تھے'' اس کے ساتھ ساتھ وہ کردار کی زبردست قوت کے مالک تھے اور ضرورت کے وقت بڑی ثابت قدمی اور جرأت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ کسی ناپسندیدہ دباؤ میں نہیں آتے تھے' حتیٰ کہ انہوں نے اپنے وقت کے مشہور دیوقامت اور مغربی پاکستان کے افسانوی گورنر نواب امیر محمد خاں آف کالا باغ' بلکہ خود صدر ایوب خاں کا بھی ناجائز دباؤ قبول نہیں کیا۔ آغا شورش کاشمیری نے اپنے ہفت روزہ ''چٹان'' میں انہیں علامہ اقبالؒ کے مردِ مومن سے متعلق تصور کی ہو بہو تصویر قرار دیا تھا۔

بلقیس کے ساتھ شادی

رحمت علی جو میاں صاحب کا ایک پرانا خادم تھا' ان کے خاندان کا ایک فرد بن گیا تھا۔ میاں صاحب نے بچپن میں اس کے والدین کا سایہ اٹھ جانے کے بعد سے اس کی پرورش کی تھی۔ وہ میرا بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے ساتھ مئی 1965ء میں اتفاقیہ ملاقات ہوئی۔ اس نے تجویز پیش کی کہ میں میاں صاحب کی نوجوان صاحبزادی بلقیس کے ساتھ جو بیوہ تھی' شادی کرلوں۔

میں میاں صاحب اور ان کے خاندان کو 1950ء سے جانتا تھا جب ان کا بحیثیت سب ڈویژنل مجسٹریٹ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تقرر ہوا۔ میرا زیادہ تر وقت ان کی صحبت میں گزرتا تھا تاکہ ان کی اچھی باتیں سن سکوں اور ان سے استفادہ کرسکوں۔ میں ان کے اور ان کی اہلِ خانہ کی بے حد تعریف کرتا تھا' لیکن یہ بات میرے حاشیہ خیال میں بھی کبھی نہیں آئی تھی کہ اس عظیم خاندان میں میری شادی ہوسکتی ہے۔ میرے خاندان کی درویشانہ حالت کے پیشِ نظر بھی یہ بات ناقابلِ تصور تھی۔

میں بلقیس کو جانتا تھا۔ میں نے اسے بچپن سے لائق ستائش حسن میں ڈھلتے دیکھا۔ وہ شرم وحیا

کا پیکر تھی۔ یہ خوبی اسے والدین سے ورثہ میں ملی تھی۔ وہ 1963ء میں محض 23 برس کی تھی جب اس کا شوہر دو بچیاں انجم (دو سال) اور سائرہ (محض چند مہینے کی) چھوڑ کر راہیِ ملکِ عدم ہو گیا۔

جس وقت رحمت نے مذکورہ تجویز پیش کی تو بلقیس کی عمر 25 برس ہو چکی تھی۔ مجھ پر وارفتگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ لیکن میں انتہائی پریشان بھی تھا۔ میں نے رحمت سے کہا۔ ''یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہو گی لیکن کیا میاں صاحب یہ تجویز مان جائیں گے؟''

''میاں صاحب سرکاری دورے پر جرمنی گئے ہوئے ہیں۔ واپس آنے کے بعد ہی اس معاملہ پر غور کریں گے۔'' اس نے جواب دیا۔ رحمت نے وہ تجویز اپنے طور پر پیش کی تھی اس لیے وہ خود بھی قدرے پریشان ہو گیا۔

''تم پہلے بیگم صاحب سے اس کا ذکر کرنا' میاں صاحب سے نہیں۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔ ''ممکن ہے میاں صاحب کو یہ بات ناگوار گزرے اور ان کی بلاوجہ خفگی کا سبب بنے۔

مجھے رحمت کی تجویز سے ناقابلِ بیان مسرّت ہوئی۔ محض اس لیے نہیں کہ میں بلقیس اور اس کے خاندان کو پسند کرتا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ مجھے رسول اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کا موقع مل رہا تھا۔

رحمت نے مجھے بعد میں بتایا کہ بیگم صاحبہ راضی ہیں۔ اسی طرح بلقیس کے نانا خان بہادر عبدالعزیز بھی متفق تھے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد میں نے ایک دوست کے ذریعے میاں احمد علی سے ذکر کیا' جو میاں صاحب کے بہت قرابت دار تھے۔

میاں محمد شفیع چند دن بعد جرمنی سے واپس آ گئے تو احمد علی نے مجھے بتایا کہ میاں صاحب بھی مان گئے ہیں' اگرچہ شروع میں انہیں کچھ تامل تھا۔ جس کا سبب قطعاً خلافِ توقع تھا۔ ''میرے نزدیک یہ مناسب نہیں کہ سردار کسی بیوہ لڑکی کے ساتھ شادی کرے خواہ وہ ہماری بیٹی ہی کیوں نہ ہو۔'' انہوں نے رحمت کی تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ پھر بولے: ''پولیس سروس آف پاکستان جیسی دقیع ملازمت اختیار کرنے کے بعد وہ بہتر رشتہ کا مستحق ہے۔''

میں اپنے متعلق ان کی اتنی اچھی رائے سن کر بڑا متاثر ہوا۔ میں نے رحمت علی اور احمد علی دونوں سے کہا: ''اگر یہ تجویز قبول کر لی گئی تو میں اسے بہت بڑی نوازش اور اپنے لیے باعثِ فخر سمجھوں گا۔'' احمد علی نے میرے جذبات میاں صاحب تک پہنچائے تو وہ احمد علی کی تجویز کو رد نہ کر سکے چنانچہ جب احمد علی نے

اپنی تجویز کی اصولی طور پر منظوری کی خوشخبری سنائی تو میرا دل باغ باغ ہوگیا۔

میں نے اپنی بڑی بہن اور بہنوئی نور محمد کو جو کرشن نگر میں رہتے تھے' یہ خبر سنا کر حیران کر دیا میری ہمشیرہ اور بلقیس گہری سہیلیاں بھی تھیں۔

نور محمد نے ایک دلچسپ راز پر سے پردہ اٹھایا۔ ان کا پڑوسی عبدالعلی خاں جو پیشہ کے لحاظ سے موچی تھا اور نجوم میں کچھ درک رکھتا تھا۔ اس نے بلقیس کے شوہر کی المناک موت کے بعد میرے بہنوئی کو بتایا تھا کہ میری اور بلقیس کی دو سال کے اندر اندر شادی ہو جائے گی۔ اس وقت نور محمد نے اس بات کی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ تاہم بعد میں میری زبانی نامہ و پیام کی روداد سن کر قائل ہوگیا۔ مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی۔ اگلے دن میں عبدالعلی خاں سے ملنے گیا۔ اس دن سے آج تک وہ میرے دوست ہیں۔

میری ہمشیرہ نے پہلے والدین کو ہموار کیا' اس کے بعد رسمی طور پر بیگم شفیع کے پاس پہنچیں۔ جب معاملہ حتمی طور پر طے پا گیا تو میں نے اپنے دو انتہائی قریبی دوستوں سردار ظفر علی اور شیر محمد خاں لونڈ خور کو یہ خوشخبری سنائی۔ دونوں نے بے پناہ مسرّت کا اظہار کیا کیونکہ وہ میاں صاحب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ باقی انتظامات ہمشیرہ کے حوالے کر کے میں اپنی نوکری پر ایبٹ آباد چلا گیا۔

میری نسبت کی خبر بہت جلد تمام رشتہ داروں اور دوستوں تک پہنچ گئی۔ بعض نے اسے پسند نہیں کیا اور مجھے پیچھے ہٹ جانے کی ترغیب دی۔ حمید پٹواری نے جو میرے دوست بھی تھے اور رشتہ دار بھی، برادری کی بنیاد پر اس کی مخالفت کی۔ کیونکہ ہم گوجر برادری سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ میاں صاحب ارائیں تھے۔ انہوں نے ایک گوجر دوشیزہ کے جو بہت ہی متموّل خاندان کی لڑکی تھی متبادل رشتہ کی پیشکش کی۔ اس کے علاوہ مجھ پر کئی طرف سے دباؤ ڈالا گیا اور طرح طرح کی ترغیبات دی گئیں۔ بعض افراد جو اس سے پہلے ہمارے ساتھ بول چال کے روادار بھی نہیں تھے' اب بڑے پُر کشش رشتے بتانے لگے۔ لیکن میں اپنے فیصلہ پر قائم رہا۔ دولت یا مادی آسائشیں میرے لیے کوئی خاص کشش نہیں رکھتی تھیں۔ بہت زیادہ جہیز حاصل کرنے کی حرص بھی میرے نزدیک بے معنی تھی کیونکہ میں شروع سے اس سنگین معاشرتی برائی کے خلاف تھا جو ہندوؤں کے اثر سے بعض مسلم علاقوں میں جڑ پکڑ چکی ہے۔ اس کے برعکس بلوچستان اور سرحد میں دولہا کی طرف سے دلہن والوں کو "والور" (جہیز) ادا کیا جاتا ہے۔

نکاح اور رخصتی

میں نے مزید دباؤ سے بچنے کے لیے میاں احمد علی سے کہا کہ جس قدر جلدی ہو سکے میرا نکاح کرادیں۔ انہوں نے بتایا کہ بلقیس کے گھر والوں کو بہت سے انتظامات کرنے ہیں۔ بہت جلد بازی سے کام لیا جائے تب بھی سال رواں (65ء) کے اختتام سے پہلے بات بنتی نظر نہیں آتی۔ میں نے عبدالعلی خان نجومی سے مشورہ کرنے کی بابت سوچا اور اس سے ملنے لاہور چلا گیا۔ اس نے حساب لگا کر بتایا کہ شادی کی رسم جون کے دوسرے ہفتہ میں یعنی بہت جلد انجام پانے والی ہے۔ وہ تاریخ میرے تصور سے بھی پہلے آرہی تھی۔

خان صاحب کی پیش گوئی سے حوصلہ پا کر میں نے بذاتِ خود میاں عبدالعزیز صاحب سے بات کی جو بلقیس کے نانا اور قابلِ احترام بزرگ تھے۔ میں نے مذہب کے ساتھ ان کے لگاؤ کا ایسی خوبصورتی اور چابک دستی سے استعمال کیا کہ وہ فوراً میرے ہمنوا بن گئے اور دوسروں کو بھی فوری نکاح کی افادیت کا قائل کر لیا۔ چنانچہ 10 جون 1965ء کو رات کے 8 بجے 8 اے کلب روڈ جی او آر-I (لاہور) میں میرا نکاح ہو گیا۔ خوشی کی اس تقریب میں صرف خاندان کے افراد اور بہت ہی قریبی دوستوں نے شرکت کی۔

نکاح کے بعد میرے دل میں یہ خواہش مچلنے لگی کہ رخصتی بھی جلد ہی ہو جائے اور میاں صاحب کو جہیز اور دیگر فضول اخراجات کے جھنجھٹ میں نہ پڑنے دیا جائے۔ میں نے اس سلسلے میں سردار ظفر سے مشورہ کیا۔ ہم نے ایک انوکھی تجویز سوچی جسے سن کر سب حیران رہ گئے۔

اگلے دن میں نے منصوبہ کے مطابق انارکلی بازار سے بچوں کے لیے بہت سارے کھلونے خریدے اور سسرال والوں سے ملنے چلا گیا۔ میرے یوں اچانک وارد ہونے پر وہاں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں چھوٹی بچیوں کے ساتھ کھیلنے بیٹھ گیا۔ میری سالیاں آمنہ اور نجمہ بھی موجود تھیں۔ وہ گاہ بگاہ مذاق کرتیں تو فضا قہقہوں سے گونج اٹھتی۔

میں بلقیس کو دیکھنے اور اس سے بات چیت کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا، مگر وہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اس موقع پر کچھ قسمت نے ساتھ دیا اور کچھ مولوی عبدالعزیز نے میری مدد کی۔ اچانک سائرہ نے رونا شروع کر دیا۔ وہ میری اور مولوی صاحب کی سرتوڑ کوشش کے باوجود چپ نہیں ہوئی۔ ماں کی

مامتا نے جوش مارا تو بلقیس فوراً ڈرائنگ روم میں آ گئی جہاں ہم براجمان تھے۔ جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، اس کے گالوں پر حیا کی سرخی دوڑ گئی اور وہ واپس جانے لگی۔ اس مرحلہ پر اس کے نانا نے رکنے کو کہا۔ ''اپنے شوہر کے پاس بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ شرع کے عین مطابق ہے۔'' انہوں نے بلقیس کو سمجھایا۔ بلقیس نے پہلے بچی کو چپ کرایا پھر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے خود کو ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا پایا۔ مولوی صاحب نماز کی ادائیگی کے واسطے ہمارے درمیان سے اُٹھ گئے۔

اس طرح ہمیں دل سے دل ملا کر باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ بلقیس کی باتوں سے زبردست خوشی ٹپکنے لگی۔ ہم ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے۔ لیکن یہ ایک نیا بندھن تھا۔ میں اس کے شائستہ طور اطوار اور خوبصورتی سے بے حد متاثر تھا' تاہم اس کی صاف گوئی سب خوبیوں پر حاوی تھی۔ اس کے ساتھ شادی کرنے کی بابت میرے فیصلے پر وہ بے حد خوش تھی اور تشکر بھرے جذبات میں میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔ ''تمہیں اس طرح نہیں کہنا چاہیے۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''یہ میری خوش بختی ہے کہ تم جیسی حسین دوشیزہ میری دلہن بن گئی۔'' ''یہی بات دوسری طرح بھی درست ہے۔'' اس نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرے لیے کئی رشتے آئے' گھر والے میرے مستقبل کی بابت پریشان تھے۔ آپ میرے لیے فرشتہ بن کر آئے ہیں۔''

مجھے اس سے ایسی کھری اور اخلاص بھری گفتگو کی توقع نہیں تھی۔ اس سے میری انا کو تسکین ملی۔ میرے دل میں اس کا احترام اور بڑھ گیا۔ صرف آنسو میرے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے۔ اس کی بھی ایسی ہی کیفیت تھی۔ ہم نے اسی لمحہ ایک دوسرے کو مکمل طور پر سمجھ لیا۔ جو ہماری ازدواجی زندگی کے دوران ایک عظیم اثاثہ ثابت ہوا۔ آئندہ زندگی میں ہمارا کئی مسائل پر زبردست اختلاف ہوا' لیکن باہمی احترام اور دلی تعلق اپنی جگہ قائم رہا۔

مجھے اسی دن بلقیس کو بعد دوپہر ساتھ لے جانے کی اجازت مل گئی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ ایبٹ آباد لے جانے پر آمادہ کرنا چاہا تو اس نے کہا کہ یہ بڑا عجیب اور خلافِ معمول لگے گا۔ لیکن میں بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ خاصی گفت وشنید کے بعد اسے راضی کر لیا۔ اگلے دن یعنی 12 جون کو میں نے راولپنڈی کے لیے ہوائی جہاز کے دو ٹکٹ خریدے اور بلقیس کے حوالے کرتے ہوئے اسے بتا دیا کہ کل کی پرواز سے راولپنڈی جانا ہے اور میں تمہیں لینے کے لیے دو گھنٹے پہلے پہنچ جاؤں گا۔ وہ تذبذب اور

اضطراب کی حالت میں تھی۔ میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور فوراً اپنی جائے رہائش (سمن آباد) کی طرف روانہ ہو گیا۔

میری توقع کے مطابق رحمت مجھ سے ملنے آیا۔ اس کے بعد میاں احمد علی آئے۔ دونوں نے بتایا کہ میاں صاحب کو پارجات فرنیچر اور دیگر گھریلو اشیاء کی خریداری کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ میری سالیاں بے حد پریشان ہیں۔ وہ بھی بعض انتظامات کرنے کے لیے وقت مانگ رہی ہیں۔

میں ان کے ساتھ چلا گیا۔ میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوئے خوف سا محسوس ہوا کیونکہ ان کا سامنا کرنا آسان بات نہیں تھی۔ میں جہیز اور دیگر رسوم و رواج کے خلاف تھا۔ مگر میاں صاحب کے ادب و احترام کے باعث بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے جی کڑا کر کے مؤدبانہ الفاظ میں گزارش کی کہ "سر دست کسی سامان کی ضرورت نہیں، آپ جو کچھ بنانا اور خریدنا چاہیں اطمینان سے خرید لیں۔ ہم بعد میں لے جائیں گے۔" مولوی صاحب نے ایک بار پھر میری مدد کی اور اپنی ویٹو پاور میرے حق میں استعمال کر کے معرکہ سر کر لیا۔ یوں خدا خدا کر کے وہ مرحلہ طے ہوا اور میاں صاحب نے بادلِ نخواستہ رخصتی کی اجازت دے دی۔ شادی پر میرے کل -/364 روپے خرچ ہوئے۔ ان میں انگوٹھی کی قیمت بھی شامل تھی جو میں نے بلقیس کو پیش کی۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ ایک باوقار سروس کے افسر کی حیثیت سے مجھے شاندار تقریب کا اہتمام کرنا چاہیے تھا، لیکن میں نے سادگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

نکاح ہو جانے کے بعد بلقیس نے انکشاف کیا کہ میں نے ایک دفعہ گورنمنٹ کالج میں ڈرامیٹک کلب کے سیکرٹری کی حیثیت سے اسے اور اس کے سب سے بڑے بھائی احمد کو "جولیس سیزر" نامی ڈرامہ دیکھنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس موقع پر جلدی میں میرا پاؤں اس کے پاؤں پر پڑ گیا تھا جس سے اسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ لیکن وہ شرم و حیا کے باعث اف بھی نہیں کر سکی۔ میں نے اتنے سالوں کے بعد معذرت کا اظہار کیا تو وہ ہنسنے لگی۔

پہلے بیٹے کی پیدائش

26 فروری 1966ء کو اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہلا بیٹا عطا فرمایا۔ خبر ملنے پر میں لاہور آیا۔ بلقیس اپنے میکے میں قیام پذیر تھی ہم نے وہیں بچے کی ولادت کی خوشی منائی۔ میری چھوٹی سالی نجمہ نے بچے کا نام ہارون تجویز کیا۔ میں نے اپنے نام کی بجائے مولوی عبدالعزیز کے نام کو اس کا آخری جزبنا دیا جو میری

طرف سے مولوی صاحب کا انتہائی ممنون اور شکر گزار ہونے کا اظہار تھا۔ ان کی اولادِ نرینہ نہیں تھی اس لیے میرے فیصلہ کی بابت سن کر بے حد خوش ہوئے۔

میں بلقیس اور نومولود کو دادو لے آیا۔ انجم اور سائرہ اپنے نانا' نانی کے پاس رہیں کیونکہ ان کی اچھی تعلیم کا بندوبست لاہور میں ہی ہوسکتا تھا۔

دادو میں موسم گرم تھا۔ میاں صاحب نے بچے کے لیے لاہور سے ایئر کنڈیشنر تو بھیج دیا مگر وولٹیج کی کمی کے باعث وہ کام نہیں کرتا تھا۔ میں نے بلقیس سے مشورہ کیا کہ بچے کی دیکھ بھال کے لیے کوئی عورت ملازم رکھ لیں۔ مگر اس نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ نوکرانی برتنوں کو ٹھیک طور سے صاف نہیں کرے گی جس سے بچے کے بیمار ہونے کا احتمال ہے۔ علاوہ ازیں اس کی خواہش تھی کہ بچہ زیادہ تر وقت ماں کے ساتھ گزارے تاکہ نوکرانی کی بری عادات کا اثر نہ ہو۔ مجھے اس کی سوچ اور رویہ سے بے حد خوشی ہوئی۔ وہ زندگی بھر اپنی اسی سوچ پر قائم رہی۔

دوسرے بیٹے کی ولادت

15 ستمبر 1967ء کو خداوند کریم نے ہمیں دوسرے بیٹے سے نوازا۔ وہ جمعہ کا دن تھا اور میری والدہ بلقیس کی دیکھ بھال کے لیے گھر پر موجود تھیں۔ جلد ہی لیڈی ڈاکٹر بھی پہنچ گئی۔ بچے کی پیدائش نمازِ جمعہ کی اذان کے وقت ہوئی۔ میں نے بڑے بھائی کی طرح اس کے نام کا آخری جز بھی نانا کے نام کی مناسبت سے عرفان عبدالعزیز تجویز کیا۔

صائمہ بیٹی کی پیدائش

ہمارے آخری بچے نے جو اللہ تعالیٰ نے بیٹی کی شکل میں عطا فرمایا 22 جون 1972ء کو راولپنڈی میں آنکھ کھولی۔ بلقیس ایک اور بیٹے کی آرزومند تھی جبکہ میری خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ بیٹی سے نوازے۔ اس کا نام صائمہ رکھا گیا۔ یہ بیٹی میرے لیے بڑی خوش قسمت واقع ہوئی۔ اس کے چہرہ پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ کئی لحاظ سے میری والدہ سے بڑی مماثلت رکھتی ہے۔ اس کی موجودگی میرے لیے ہمیشہ موجبِ سکون واطمینان رہی' مجھے اس سے روحانی طور پر تسکین ملتی ہے۔ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ وہ کبھی بیمار نہیں ہوئی۔ بلقیس اور میں اس بات پر اکثر حیران ہوتے تھے۔

لاہور میں قیام کے دوران ہارون کو قبل از وقت سکول میں داخل کرادیا گیا جس سے اس کے دل میں سکول کا خوف بیٹھ گیا۔ میں نے بلقیس سے کہا کہ کچھ عرصہ انتظار کرلیں ورنہ وہ سکول کے نام سے ہمیشہ خوفزدہ رہے گا۔ وہ کسی قدر جلد باز تھی‘ بہرحال اس نے میری بات مان لی۔

سیٹلائٹ ٹاؤن (راولپنڈی) کی اسی گلی میں جہاں ہماری رہائش تھی‘ ایک نرسری سکول تھا۔ میں ہارون اور عرفان کو سکول کے سامنے سیر کے بہانے ساتھ لے جاتا۔ شروع میں‘ ہم صرف شام کے وقت نکلتے تھے کیونکہ ہارون سکول کے بچوں کو دیکھتے ہی ڈر سے بھاگنے لگتا تھا۔ بعدازاں میں انہیں صبح کے وقت بھی ساتھ لیجانے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ سکول سے مانوس ہوگئے۔ ہارون کو اپنے دل میں بیٹھے ہوئے فرضی خوف پر قابو پانے میں کئی مہینے لگے جبکہ عرفان کو ایسی مشکل پیش نہیں آئی اور اسے پہلے داخل کرادیا گیا۔ ہارون نے بعد میں داخلہ لیا۔ آہستہ آہستہ دونوں اچھے طالب علم بن گئے۔ بعدازاں میں نے ان کی تعلیم سے زیادہ واسطہ نہیں رکھا‘ یہ ذمہ داری بلقیس نے سنبھال لی۔ جس سے میرا بہت بڑا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ اس طرح میں اپنے دفتری امور پر زیادہ توجہ دے سکا کیونکہ بلقیس نے مجھے گھریلو معاملات سے بالکل بے نیاز کردیا تھا۔

میاں شفیع کی بے وقت موت (جس کا چوتھے باب میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے) کے بعد میری سسرال والوں کو یکے بعد دیگرے متعدد اموات کا صدمہ سہنا پڑا۔ میری خوش دامن جمیلہ بیگم نے بڑے حوصلہ اور کامل ایمان کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے انجم اور سائرہ کے علاوہ اپنے تین کم عمر بیٹوں اور دو بیٹیوں کی تعلیم و تربیت کی بھاری ذمّہ داریاں اپنے سر لے لیں۔ شوہر کی زندگی میں انہوں نے باہر کے معاملات سے کبھی واسطہ نہیں رکھا تھا۔ ان کا اس جائیداد کے بندوبست سے بھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا جو کئی جگہ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے میاں صاحب کی پنشن کا مسئلہ اور بعض دیگر معاملات طے کرائے۔ پھر بھی انہیں بہت سے مسائل درپیش تھے۔ ان کے دوسرے بیٹے عباس شفیع نے جو ان دنوں سیکنڈ ایئر کے طالب علم تھے‘ گھریلو امور میں ماں کا خوب ہاتھ بٹایا اور خاندان کو پریشانیوں سے نکالا۔ اس خاندان کو مصائب کے بھنور سے نکلنے اور نارمل حالت تک پہنچنے میں کئی سال لگ گئے۔

"پختہ عہد کرو"

ہماری سب سے بڑی بیٹی انجم کی منگنی جولائی 1984ء میں ہوئی۔ یہ ہمارے خاندان میں ہونے والی پہلی خوشی تھی۔ میرے قریبی دوستوں منظور بھٹی اور عبدالخالق اعوان نے شادی کے لیے خریداری

میں میری خاصی مدد کی۔ حسب ضرورت بلقیس اور میری بیٹیاں بھی ماہرانہ مشورے دیتی رہیں۔

مارچ 1985ء میں ہم شاپنگ کے لیے ایبٹ آباد گئے۔ میرے ہمراہ بلقیس، میری خوش دامن، سائرہ اور بھتیجے بھتیجیاں تھیں۔ میری ساس کو رات کے دس بجے دل کا شدید دورہ پڑا۔ میں نے ہزارہ کے ڈی آئی جی کمال شاہ سے فون پر کہا کہ فوری طور پر ڈاکٹر کا بندوبست کریں۔ میں نے ڈاکٹر کے لیے خود جانا چاہا مگر میری ساس نے سختی سے منع کر دیا۔ کہنے لگیں: ''میں جانتی ہوں، یہ ہارٹ اٹیک ہے۔ میں بچوں گی نہیں۔ میں انجم اور سائرہ کی طرف سے پریشان ہوں، میرے سامنے پختہ وعدہ کرو کہ تم ان کی شادی کی ذمہ داری نبھاؤ گے تاکہ میں اطمینان کے ساتھ اس دنیا کو خیر باد کہہ سکوں۔'' ''میں پوری ذمہ داری نبھاؤں گا۔'' میں نے انہیں یقین دلایا۔ ''آپ ہمت نہ ہاریں، حوصلہ سے کام لیں، آپ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' مجھے زبردست دکھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس قدر قریبی اور شفیق ہستی کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہنا آسان بات نہیں تھی۔

بلقیس، سائرہ، بھتیجیوں اور بھانجیوں نے رونا شروع کر دیا۔ ہماری دوسری بیٹی سائرہ نے جس کی چند دن پہلے نسبت طے پائی تھی، صدمہ کو سب سے زیادہ محسوس کیا۔ میری ساس بڑی متقی اور مذہب سے گہرا لگاؤ رکھنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے اردگرد کھڑے سب کو ہدایت کی کہ رونے دھونے سے پرہیز کریں کیونکہ وہ جلد ہی اپنے خالقِ حقیقی کے پاس جا رہی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میری یہ نصیحت ان کے بیٹے بیٹیوں تک بھی پہنچا دوں۔ اس کے بعد انہوں نے صاف آواز میں کلمہ پڑھا اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد کمال شاہ ڈاکٹر کو لے کر پہنچے لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

ہم نے انجم کے نکاح کی تاریخ مارچ کی بجائے مئی تک مؤخر کر دی۔ شادی کے وقت سب نے انجم کی نانی کی کمی بری طرح محسوس کی۔

پہلی نواسی کی پیدائش

انجم نے ایم بی بی ایس کیا۔ اس کا شوہر محمد امجد بھی ایم بی بی ایس ہے، لیکن دونوں میں سے کوئی بھی میڈیکل پریکٹس نہیں کرتا۔ وہ پراپرٹی مینجمنٹ کا کاروبار کر رہے ہیں۔ امجد کے والد چوہدری غلام حسین، جو اب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں، صوبائی سول سروس میں ایک ممتاز اور معزز افسر تھے۔ چار سال تک بحیثیت ڈپٹی کمشنر لاہور تعینات رہے۔ انجم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے نانا اور سسر دونوں لاہور کے ڈی سی رہ چکے ہیں۔

جس دن میں نے سپیشل برانچ کے ایڈیشنل آئی جی کا چارج سنبھالا یعنی 14 جون 1986ء کو

اسی روز انجم کی پہلی بیٹی پیدا ہوئی۔ بلقیس کہنے لگی کہ نانی بننے کے بعد وہ خود کو بوڑھا محسوس کرنے لگی ہے۔ میں نے اسے چھیڑنے کے لیے فوراً جواب دیا: ''لیکن میرے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہے۔''

چوہدری غلام حسین نے بچی کا نام ''ثمر'' رکھا۔ اس کی پیدائش بڑی مبارک ثابت ہوئی۔ ایک تو میرے عہدہ میں ترقی ہوگئی۔ دوسرے لاہور میں پوسٹنگ ہونے سے پورا خاندان ایک بار پھر اکٹھا ہوگیا۔ انجم اور امجد کو اللہ تعالٰی نے 7 مئی 1987ء کو بیٹے سے نوازا جس کا نام مرتضٰی رکھا گیا۔

13 نومبر 1968ء کو بلقیس اور میں ''صبوحی'' (صبح کی چائے) پی رہے تھے۔ جب میں نے ایک کوّے کو بڑے آرام سے اپنے مکان کی منڈیر پر بیٹھتے دیکھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''کوئی خوشخبری آنے والی ہے۔'' ہمارے دیہات میں لوگ اس بات پر عموماً یقین رکھتے ہیں کہ کوّے کو ایسی حالت میں دیکھنا خوشخبری موصول ہونے کا اشارہ ہوتا ہے۔ میں یہ بات پوری نہیں کر پایا تھا اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ چوہدری غلام حسین لائن پر تھے۔ انہوں نے خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالٰی نے انجم کو دوسرا بیٹا دیا ہے۔ دوسرے ہی لمحے کوّا اڑ گیا۔ میرا یقین پختہ ہوگیا کہ لوگوں میں پائے جانے والے اس گمان میں واقعی کچھ صداقت ہے۔ اس نواسے کا نام مصطفٰی رکھا گیا۔ ثمر، مرتضٰی اور مصطفٰی آج کل اچھے طالب علموں کے طور پر تحصیل علم میں مصروف ہیں۔

ہماری دوسری بیٹی سائرہ کی شادی 27 جنوری 1986ء کو ہمایوں سرور کے ساتھ ہوئی جو میاں محمد سرور کے بیٹے اور میاں احمد علی کے پوتے ہیں۔ انہوں نے میری شادی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

سائرہ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا جبکہ اس کے شوہر نے لندن کے سکول آف اکنامکس سے گریجوایشن کی۔ دونوں مانچسٹر میں سکونت رکھتے ہیں اور کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔

میں 1987ء میں آنکھوں کے آپریشن کے سلسلہ میں پٹس برگ (امریکہ) گیا تو مجھے خبر ملی کہ سائرہ کے ہاں خدا کے فضل سے 24 اکتوبر کو بیٹے نے جنم لیا ہے۔ بلقیس خوشی کے مارے پھولی نہ سمائی اور لاہور سے مانچسٹر پہنچ کر دم لیا۔ میں بھی امریکہ سے وہاں پہنچ گیا۔ بچے کا نام حسن مصطفٰی سرور رکھا گیا۔ سائرہ کا دوسرا بیٹا قیس 5 جنوری 1989ء کو مانچسٹر میں پیدا ہوا۔ آج کل حسن اور قیس دونوں سکول جانے لگے ہیں اور چھوٹے اسکالرز کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ وہ ہر سال ہم سے ملنے آتے ہیں، کیونکہ میاں سرور اپنی مادرِ وطن کے ساتھ جڑیں پیوستہ رکھنے کے معاملہ میں بڑے مخلص ہیں۔ وہ چوہدری شاہ دین

کے فرزند ہیں جو 1937ء میں موضع لڑی ضلع جالندھر سے نقل مکانی کر کے مانچسٹر میں جا بسے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے میاں مجید بھی وہیں آباد ہیں۔

صائمہ کی شادی

میرے دوست نذیر احمد غازی اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل ایک عرصہ سے چوہدری عبدالکریم کے بیٹے نوید کے لیے ہماری سب سے چھوٹی بیٹی صائمہ کا رشتہ مانگ رہے تھے لیکن میں بعض گھریلو معاملات میں الجھا ہوا تھا جبکہ ایسے امور میں میرا ہاتھ بٹانے والی بلقیس داغ مفارقت دے گئی تھی۔ ایک بار انہوں نے چوہدری عبدالکریم کے پیغام کی بابت یاددہانی کرائی تو میں نے جواب دیا: ''میں اس بارے میں اس وقت فیصلہ کروں گا جب انسپکٹر جنرل کے عہدہ سے میرا کہیں اور تبادلہ ہو جائے گا۔''

میں نے تو یونہی ٹالنے کے لیے ایک بات کہہ دی تھی لیکن غازی صاحب نے اسے پکا وعدہ سمجھ لیا اور بڑی احتیاط سے یاد رکھا۔ چنانچہ ادھر مذکورہ پوسٹ سے میرا تبادلہ ہوا' اُدھر اگلی صبح غازی صاحب میرے گھر آدھمکے۔ مجھے ان کی ناقابلِ شکست منطق کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مجھے بھی دونوں کی جوڑی پسند تھی' اس لیے بات پکی کر دی' میں جانتا تھا کہ چوہدری عبدالکریم کا کاروباری حلقوں میں ان کی امانت و دیانت کی وجہ سے بڑا احترام ہے۔ اور ان کا خاندان ان اعلیٰ گھرانوں میں سے ایک ہے جو شرافت و شائستگی کی شاندار روایات کے امین ہیں۔ نوید جو اپنے باپ کے ساتھ کاروبار کی نگرانی کرتا ہے، بہت ہی شائستہ اور بانکا سجیلا نوجوان ہے۔

یوں اوائل جون 1993ء میں صائمہ کی نسبت طے پائی اور 2 دسمبر کو شادی ہوگئی۔ میاں بیوی دونوں پنجاب یونیورسٹی کے گریجوایٹ ہیں۔ 19 اکتوبر 1994ء کو ان کے ہاں پہلی بیٹی نے جنم لیا جس کا نام ایمان رکھا گیا۔ اس کی دوسری بیٹی کا نام امن نوید ہے اور دونوں بیٹیوں سے چھوٹے بیٹے کا نام عبداللہ نوید ہے۔ مسز کریم صائمہ کو ماں کی طرح چاہتی اور پیار کرتی ہیں۔ انہوں نے بلقیس کی عدم موجودگی میں میری ساری پریشانیاں اور بے چینیاں اپنے سر لے لی ہیں۔

ہارون کی شادی

میرے بیٹے ہارون نے میرے نقش قدم پر چلتے ہوئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ وہاں

سے یونیورسٹی آف انجینئرنگ وٹیکنالوجی (لاہور) چلا گیا۔ آخرش امریکہ کی کول گیٹ یونیورسٹی سے فارغ ہوا۔ ہارون نے اپنی والدہ کی زندگی میں ہی سٹی بینک میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ بلقیس اسی وقت سے اس کے لیے دلہن کی تلاش میں تھی اور آخرِ کار خواجہ شریف غفور کی جو کہ ایک اعلیٰ کشمیری خاندان سے ہیں صاحبزادی شارمین(Charmain) کو پسند کر لیا۔ اپنی ناگہانی وفات سے تین دن پہلے اس نے بڑا اصرار کیا کہ میں رشتہ مانگنے کے لیے اس کے ساتھ خواجہ صاحب کے گھر چلوں، مگر بعض ضروری بلکہ ناگزیر سرکاری مصروفیات کے باعث میں اس کی خواہش پوری نہیں کر سکا۔ جب مجھے فرصت ملی تو بلقیس ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ میں انتہائی دل گرفتہ اور غمزدہ اس بات کے لیے بے چین تھا کہ بلقیس کی آخری خواہش کو عملی جامہ پہناؤں۔ لیکن غفور صاحب نے معاملہ کو حتمی شکل دینے میں بہت دیر کر دی۔

حسن اتفاق سے کچھ دن بعد مانچسٹر سے میاں محمد سرور آ گئے۔ میری درخواست پر وہ میرے کزن چوہدری غلام سرور کو ساتھ لے کر خواجہ غفور سے ملے مگر انہوں نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ میاں سرور پورے چھ مہینے ٹھہرے رہے جس سے ان کے کاروبار کو زبردست نقصان پہنچا۔ لیکن میدان مارنے میں کامیاب ہو گئے۔ مجھے اس بات پر دلی خوشی ہوئی کہ بلقیس کی آخری خواہش پوری ہو گئی۔ شادی کے تمام انتظامات چوہدری سرور نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ ان کے چھوٹے بھائیوں، میری بہنوں اور بھانجوں نے بھی ہاتھ بٹایا۔ یوں ہم 24 دسمبر 1993ء کو ہارون کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہوئے۔ 25 دسمبر کو ولیمہ کے بعد موسیقی کا شاندار پروگرام ہوا جس میں ملک کے نامور گلوکار نصرت فتح علی خان نے رات گئے تک اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہارون کو دو بچوں سے نوازا ہے۔ بیٹے کا نام اسفندیار اور بیٹی کا نام علیزے ہے۔

بلقیس کو زیورات پسند تھے لیکن میں نے اسے کوئی زیور لے کر نہیں دیا تھا۔ وہ جسمانی اور روحانی طور پر اس قدر خوبصورت و حسین تھی کہ اسے زیور پہننے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ ع ''نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی'' والا معاملہ تھا۔ اس کے آپریشن کے وقت میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اسے کوئی اچھا سا تحفہ دوں گا۔ اس کے تندرست ہونے پر میں نے اسے سونے کی 12 چوڑیاں پیش کیں۔ اس نے خوشی کا اظہار کیا اور پھر اپنی عادت کے مطابق کہنے لگی: ''آپ کو یہ رقم بچوں کے لیے بچا کر رکھنی چاہیے تھی۔'' آخر کار اس نے وہ چوڑیاں یہ کہتے ہوئے پہن لیں کہ ''میں انہیں صائمہ کے لیے رکھ دوں گی۔'' اس کے بعد انہیں ہر

وقت پہنے رہتی تھیں اور کبھی نہیں اتاریں۔ میرے لیے وہ منظر بڑا ہی المناک اور تکلیف دہ تھا جب اس کی موت کے بعد نرسوں کو اس کے ہاتھوں سے مذکورہ چوڑیاں اتارتے دیکھا۔ اس وقت انجم اور سائرہ نیویارک میں تھیں۔ آج وہ تحفہ صائمہ کے پاس ہے جو اس کی پیاری اور شفیق ماں نے اس کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔

عرفان کی شادی

عرفان نے 1999ء میں کولمبیا یونیورسٹی میں اپنی کلاس فیلو راضی کے ساتھ شادی کی۔ ان کے دو بچے ہیں جن کے نام بالترتیب کمال عرفان عزیز اور مریم عرفان عزیز ہیں۔

مخلص ملازمین

رحیم گل، ہنگو (کوہاٹ) سے تعلق رکھنے والا پٹھان 1967ء میں میرے پاس اردلی کے طور پر آیا۔ اس وقت میں قربان لائنز (لاہور) میں بحیثیت اے ایس پی تعینات تھا۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا حتیٰ کہ 1986ء میں بطور ہیڈ کانسٹیبل ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ گزشتہ تمام برسوں میں اس نے بڑی وفاداری، خلوص اور دیانتداری سے گھر کے مخلص فرد کے طور پر میری خدمت کی ہے۔ میرے بچے اس کی آنکھوں کے سامنے پلے بڑھے۔ اس نے ڈرائیوری سیکھنے کے بعد بچوں کو ان کے تعلیمی اداروں تک لے جانے اور لانے کی ذمہ داری بھی خوب نبھائی۔ بہرحال اس کی محبت و شفقت وقت بے وقت اسے سختی کرنے سے نہیں روکتی تھی اور بچے بلا چون و چرا اس کی بات مانتے تھے۔ جب وہ حق بجانب ہوتا تو بڑوں کے سامنے بھی کھری بات کہنے سے نہیں چوکتا تھا۔ ہارون نے جو اس وقت اس سے ذرا بڑا تھا جتنا اس وقت اس کا بیٹا اسفندیار ہے۔ اسے ''گلا'' کہنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے بچے اسے ''خان'' اور ''خان بابا'' کہا کرتے تھے۔ جب انہیں اس کی خاندان کے رکن کی حیثیت کا پتہ چلا تو احترام سے ''بابا رحیم گل'' کہنے لگے۔

دو سال بعد عرفان کو شدید بخار چڑھا اور درجہ حرارت 106 ڈگری فارن ہیٹ تک پہنچ گیا۔ ٹمپریچر کو نیچے لانے کے لیے اسے برف پر لٹانا پڑتا تھا۔ اس طرح کے بہت سے پاپڑ بیلنا پڑے۔ رحیم گل نے کئی راتیں مسلسل جاگ کر گزاریں۔ ایک لمحہ کے لیے نہیں سویا جب تک عرفان کا بخار نہیں اتر گیا۔ وہ

بہت رحم دل اور درد مند انسان ہے۔ اس کے خلوص اور پیار میں کبھی کمی نہیں آئی۔

محمد شریف ساکن چیلیانوالہ ضلع گجرات 1980ء سے میرے ساتھ ہے۔ وہ ایک اچھا باورچی ہے اور بہت سے مہمان آ جائیں تو بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کے خلوص اور کام سے لگاؤ کے بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس نے میرے والدین کی جس فرض شناسی کے ساتھ خدمت کی' اس نے مجھے ہمیشہ کے لیے اس کا شکر گزار بنا دیا۔ میں نے آج کل لکھنے لکھانے کا جو کام شروع کر رکھا ہے' وہ کرتے کرتے تھک جاتا ہوں تو وہ مساج کر کے میرے پٹھوں کو آرام پہنچاتا ہے۔ جس سے میری تھکاوٹ اور بوریت دور ہو جاتی ہے اور میں تازہ دم ہو کر پھر اپنے کام میں لگ جاتا ہوں۔

دو المناک موتیں

1991ء اور 1992ء کے سال میرے لیے سب سے زیادہ المناک ثابت ہوئے۔ مجھے اپنی شفیق اور خدا ترس و پرہیز گار ماں کے ساتھ سب سے زیادہ محبت تھی۔ میاں محمد بخش جو میرے روحانی مرشد تھے' اللہ کی انتہائی رحمت و شفقت کو ماں کی گہری محبت سے تشبیہ دیتے تھے۔ وہ میرے لیے ہمیشہ روحانی قوت کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔ وہ بدترین حالات میں بھی اللہ پر غیر متزلزل یقین رکھتی تھیں۔

میری ماں نے خوشحالی آنے کے بعد بھی بڑی سادہ زندگی گزاری۔ انہوں نے کبھی زیور نہیں پہنا۔ اس وقت بھی نہیں جب پاکستان کو ہجرت سے پہلے گھر میں خاصی آسودگی تھی۔ میں ان کی گود میں پل کر بچّے سے جوان ہوا اور پولیس میں اعلیٰ ترین عہدہ پر پہنچا۔ تاہم مجھے حقیقی سکون اس وقت ملتا جب وہ مجھے اپنی پیاری بانہوں میں لے کر پیار کرتیں۔ میں اپنی تمام پریشانیاں بھول جاتا۔ بڑھاپے میں انہیں گنٹھیا ہو گیا تھا۔ تاہم اس تکلیف کو حوصلہ سے برداشت کیا۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ انہیں شدید درد ہے مگر انہوں نے اسے بڑے صبر اور ضبط سے برداشت کیا۔ ہم جب بھی درد کے متعلق پوچھتے وہ ہمیں مطمئن کرنے کے لیے بڑے سکون سے جواب دیتیں۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں''۔ وہ مجھے یا اپنی بیٹیوں کو اپنی بابت قطعاً تکلیف نہیں دینا چاہتیں تھیں۔ وہ انتہائی رحم دل اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔

آخرِ کار میں نے انہیں سروسز ہسپتال (لاہور) میں داخل کرا دیا۔ میں روزانہ صبح کو اور مغرب کے بعد ان سے ملنے جاتا۔ میری اہلیہ' بہنیں' بھانجیاں اور خاندان کا ہر فرد ان کے پاس رہتا۔ بے حد کمزور اور سوکھ کر کانٹا

ہوگئی تھیں۔ درد کی شدت سے اکثر نیم بے ہوش رہتی تھیں۔

مجھے 27 اکتوبر 1991ء کو ایک اہم سرکاری کام کے سلسلے میں اسلام آباد جانا پڑ گیا۔ میں ان کی زیارت کے لیے حاضر ہوا اور انہیں بتایا کہ ضروری کام سے اسلام آباد جارہا ہوں۔ انہوں نے حسب معمول مجھے پیار کیا اور میری بخیر وخوبی واپسی کے لیے دعا کی۔ پھر کہنے لگیں: ''میرے بارے میں قطعاً فکر نہ کرنا' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ جاؤ اور خوش اسلوبی سے اپنا کام کرو۔'' میں اسی دن آخری پرواز سے واپس آ گیا اور ایئرپورٹ سے سیدھا ہسپتال پہنچا۔ انہوں نے معمول کے مطابق مجھے اپنی بانہوں میں لے کر پیار کیا اور ماتھا چوما۔ اس کے بعد بولیں: ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اتنا لمبا سفر کر کے تھک گئے ہوگے' جاؤ آرام کرو۔'' انہیں نیم بیہوشی کی حالت میں اور شدید درد کی کیفیت میں بھی میرے آرام وآسائش کا اس قدر خیال تھا۔ انہوں نے یہ پوچھا آیا میں نے دن میں وقت پر کھانا کھالیا تھا۔ وہ بے پناہ محبت کرنے والی ہستی تھیں اور اپنے بیٹے کے بارے میں بہت فکرمند رہتی تھیں۔

اگلے دن یعنی 28 اکتوبر کو انہوں نے دن کے 11 بجے کلمہ پڑھتے ہوئے اپنی جان، جانِ آفرین کے سپرد کردی۔ دم نکلنے کے بعد ان کے چہرہ پر عجیب طرح کا نور برسنے لگا۔ وہ بڑے سکون سے سوئی ہوئی لگتی تھیں۔ میرے لیے وہ زندگی میں بہت کچھ بلکہ سبھی کچھ تھیں۔ فیصل ٹاؤن کے قبرستان میں دفن کر کے آتے وقت مجھے اس قدر کمزوری محسوس ہوئی جیسے بدن میں قطعی جان نہ رہی ہو۔ ان کے اٹھ جانے سے جو جذباتی خلا پیدا ہوا' اس نے مجھے نڈھال کردیا تھا۔ مجھے اپنے والد کے بارے میں اور بھی زیادہ تشویش تھی جو اکیلے رہ گئے تھے۔ لیکن وہ اپنے سے زیادہ میرے متعلق فکرمند رہتے۔

بلقیس جو 27 سال تک میری شریکِ حیات رہی۔ 20 جولائی 1992ء کو دن کے 11:30 بجے مختصر سی علالت کے بعد داغِ مفارقت دے گئی۔ اس کی صحت بہت اچھی تھی' اسے 8 جولائی کو پیچش کی شکایت ہوئی اور ایک نیم لیڈی ڈاکٹر کے مشورہ سے ایموڈیم (ایک ممنوعہ دوائی) کی مقررہ مقدار سے زیادہ خوراک کھالی۔ اس دوا نے اس کے نظامِ ہاضمہ اور آنتوں کی نقل وحرکت کو بلاک کردیا۔ اس نے اپنی تکلیف کو معمولی سمجھا۔ 19 جولائی کو جب پیٹ کا درد کم نہیں ہوا تو میرے ڈرائیور نے اسے سروسز ہسپتال میں داخل کرادیا۔ مجھے اس کی بابت کچھ خبر نہیں تھی۔

تھوڑی دیر بعد میری سالی نجمہ نے ہسپتال سے فون کر کے مجھے اس کے متعلق بتایا تو زبردست

دھچکا لگا۔ میں فوراً ہسپتال پہنچا۔ بظاہر وہ بالکل ٹھیک تھی۔ البتہ درد نے نڈھال کر رکھا تھا۔ میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ وہ بار بار صائمہ کو یاد کرتی تھی جو اس وقت نیویارک میں تھی۔ آخر میں کہنے لگی: ''آپ صائمہ کو واپس بلا لیں۔ اسے میرے پاس لائیں۔'' میں نے وعدہ کیا کہ صائمہ کو فوراً بلا لوں گا۔ صائمہ، مصطفیٰ کی آنکھوں کے علاج کے سلسلہ میں اپنی بڑی بہن کے ساتھ گئی ہوئی تھی۔

ڈاکٹروں نے بلقیس کی جان بچانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ پنجاب کے وزیرِ صحت جعفر اقبال اور ان کی اہلیہ عشرت پورے وقت تک ہسپتال میں رہے۔ ہارون، نجمہ اور ہمایوں نے اس کے لیے خون کا عطیہ دیا۔ اگلے دن اس کی حالت قدرے سنبھل گئی۔ ڈاکٹروں نے سمجھا وہ خطرے سے باہر آ گئی ہے۔ نجمہ جو رات بھر جاگتی رہی تھی، غسل کرنے گھر چلی گئی میرے دوست نذیر بخاری نے مجھ سے چائے پینے کو کہا۔ میں بہت خوش تھا کہ وہ ٹھیک ہوگئی ہے لیکن معاملہ یکسر الٹ نکلا۔

ہم پر اچانک مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بلقیس کومہ میں چلی گئی اور آخری دم تک ہوش میں نہیں آئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم کا کوئی ٹکڑا الگ ہو گیا ہے۔ وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی تھی۔ آخرکار ڈاکٹر نے تصدیق کر دی کہ وہ اللہ کو پیاری ہو گئی ہے۔ مجھے یوں لگا کہ بدن میں جان نہیں رہی۔

ناگہاں میری نظر ہارون اور عرفان پر پڑی۔ انہیں روتے دیکھ کر میں نے خود کو سنبھالا اور انہیں دلاسہ دیا کیونکہ بڑے کی حیثیت سے انہیں حوصلہ دینا میرا فرض تھا۔ ایک نرس نے اس کے سنہری ہاتھوں سے سونے کی وہ چوڑیاں اتاریں جو میں نے 1979ء میں آپریشن کے وقت اسے دی تھیں اور اس نے زندگی بھر کبھی نہیں اتاری تھیں۔

بلقیس بڑی سادہ مزاج اور مخلص تھی۔ وہ مجھ سے قطعاً کسی چیز کی فرمائش نہیں کرتی تھی۔ میری خدمت اور بچوں کی دیکھ بھال میں بے پناہ خوشی محسوس کرتی تھی۔ میرے والدین اس سے بے حد خوش تھے۔ اس نے دونوں کی بڑے خلوص اور پیار سے خدمت کی۔ وہ میرے لیے بہت کچھ بلکہ سب کچھ تھی۔ مجھے اچانک یوں محسوس ہونے لگا کہ زندگی کی تمام خوشیاں ہوا ہو گئی ہیں۔

میرے والد جو بظاہر خوش و خرم تھے، بلقیس کی ناگہانی موت سے اس قدر افسردہ ہوئے کہ جینے کا حوصلہ ہار بیٹھے۔ انور ظہور نے ایک دن اس کا سبب پوچھا تو بولے: ''بلقیس کی موت نے میرے بیٹے کی

زندگی تباہ کر دی ہے۔ مجھے ہر وقت انہی کی فکر رہتی ہے۔ والدین کی پریشانی کبھی کم نہیں ہوتی۔

میرے لیے مشکل ترین لمحہ وہ تھا جب میں نے انجم اور صائمہ کو نیویارک میں اور سائرہ کو مانچسٹر میں اس سانحہ کی اطلاع دی۔ ہارون' عرفان اور امجد میں سے کسی کو بھی وہ المناک خبر سنانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بچیوں کو قطعاً یقین نہیں آیا کہ ان کی پیاری ماں ان سے منہ موڑ گئی ہے۔ وہ دنیا کے دوسرے سرے پر بیٹھ کر روئیں پیٹیں اور خدا جانے کیسے اکیلی سفر کر کے لاہور پہنچ گئیں۔ ماں کی قبر ان کی آہوں اور سسکیوں کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بڑا دلگداز اور روح فرسا منظر تھا۔ بلقیس کو 20 جولائی کی شام کو میری ماں کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ فیصل ٹاؤن کے قبرستان میں یہ دونوں پاکیزہ روحیں ایک دوسرے کے پہلو میں ابدی نیند سو رہی ہیں۔ میری والدہ اور اہلیہ نے مجھے وہ کچھ بنانے میں' جو کچھ میں ہوں' بہت اہم کردار ادا کیا۔

میرے والد نے 27 مئی 1997ء کو صبح کے وقت بڑے آرام سے یعنی حالتِ خواب میں فرشتۂ اجل کو لبیک کہا۔ ان کا نواسا عبدالواحد ان کے پاس سویا ہوا تھا۔ اس نے انہیں کسی درد' تکلیف یا بے چینی کی حالت میں نہیں دیکھا۔ وہ بڑی قد آور شخصیت کے مالک' بڑے ذہین اور صحت مند تھے۔ آخری دم تک کسی کی مدد کے طلبگار نہیں ہوئے۔ شام کو معمول کے مطابق کھانا کھایا اور کسی سہارے کے بغیر باتھ روم گئے۔ اس وقت ان کی عمر 90 برس سے زیادہ تھی۔ ان کی وفات پر چند لمحے کے لیے میں نے خود کو چھوٹا بچہ محسوس کیا جیسے میرے سر پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ اس وقت میری عمر 60 برس ہو چکی تھی لیکن باپ کی موت نے مجھے بری طرح ہلا کر رکھ دیا۔ میرے سر سے ٹھنڈی چھاؤں والا سائبان اٹھ گیا تھا۔

انہیں میری والدہ کے پاس دفن کیا گیا۔ میرے وجود کے تینوں پہلو ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے اور اپنے قرب میں جگہ بخشے۔ آمین۔

انسان کی زندگی اور حیات اللہ کی عطا کردہ ہوتی ہے اور سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ موت کے بعد کی زندگی تا قیامت باقی رہے گی۔ سائرہ اور صائمہ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایک بچہ عطا فرمایا۔ زندگی مختلف رنگوں میں جاری رہتی ہے۔ پرانے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ ان کی جگہ نئے پتے اُگ آتے ہیں۔ مجھے بچپن کی یادداشتوں میں سے وہ وقت یاد آ رہا ہے جب میری دادی اماں اکثر پنجابی زبان کا یہ شعر گنگنایا کرتی تھیں:

پپل دیا پتیا کیوں کھڑ کھڑ لائی او

پچھلیاں ٹر جانا رت نویاں دی آئی او

یہ شعر ایک مسلمہ صداقت پر مبنی ہے۔ زندگی کا تسلسل ان شاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ بہرحال میں اپنی کہانی یہیں ختم کرتا ہوں۔



باب نمبر 53

دل کی آواز

1- رب کا روپ ...... ماں

ہیلری کلنٹن اپنے معمول کے کالم میں لکھتی ہیں کہ مجھے بھی اپنی بیٹی کی فکر ہے جو اپنی تعلیم کے لئے ہم سے دور رہتی ہے۔ عام مادرانہ فکر کے علاوہ اسے یہ تشویش بھی لاحق رہتی ہے کہ اسے صدر امریکہ کی دختر ہونے کی وجہ سے ایک عام نوعمر دوشیزہ کی زندگی نہ مل سکے۔ صدر امریکہ کی بیٹی کے حوالے سے اسے سلامتی کا خدشہ بھی لاحق رہتا ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ دوسروں کی توجہ کا مرکز بن کر اپنی نجی زندگی کی رازداری نہ کھو بیٹھے اور عام آدمی کی زندگی کے زیر و بم اور چیلنجوں سے محروم رہ کر کوئی مختلف النواع شخصیت نہ بن جائے۔

بچوں کے لئے فکری مندی سے سوچنا ان کی دیکھ بھال کرنا اور احتیاط کرنا ماں کی فطرت ہے۔ یہاں تک کہ یہ جذبات اور عمل جانوروں کی دنیا میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح انسانی دنیا میں ہے

بلکہ انسانوں سے بھی بڑھ کر۔ ہر ماں یہ جبلت اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتی ہے اور ایک نسل سے دوسری نسل میں اپنے تخلیقی عمل سے آگے تبدیل کرتی جاتی ہے۔ یہ عمل تخلیق اور بقائے کائنات کا ایک لازمی جزو اور تسلسل ہے۔ رحمت کا یہ حسین عطیہ اصل میں خالق کل ہی کی طرف سے مخلوق کو ملا ہے اور یہ اس کی شفقت بے پایاں کا معمولی سا عکس ہے جو اس نے ماں کی شکل میں ظاہر کر رکھا ہے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک صحابی رفع حاجت کے لئے باہر گئے، جھاڑیوں کے پیچھے چڑیا کے بچے دیکھے۔ ننھے ننھے بچے انہیں بہت بھلے لگے اور انہیں اپنی چادر میں لپیٹ کر چل پڑے، بچوں کی ماں چڑیا اپنی ممتا کی وجہ سے تڑپ اٹھی اور اپنے بچوں کو محبوس کرنے والے صحابی پر ایک نحیف و نزار بال و پر سے حملہ آور ہو گئی کہ اپنی بچوں کو آزاد کرا سکے۔ وہ مسجدِ نبوی تک حملہ کرتی ہی رہی اور اپنے بچوں کی خاطر اپنی جان تک کی پروانہ کی...... ماں کے جذبہ ترحم کا یہی تقاضا تھا اور وہ اس نے پورا کر دیا۔

قدرت یہ نظارہ دیکھ رہی تھی، رحمتہ للعالمین کی نگاہ جب اس منظر کی طرف اٹھی تو آپ نے مدینہ میں موجود تمام مومنین کو بلا لیا اور اپنے مختصر و موثر خطاب میں اس نحیف و نزار ماں کی محبت اور ایثار کا نقشہ پیش فرما کر صحابہ سے پوچھا کہ ماں کی محبت کا آپ کو اندازہ ہوا، سب نے عرض کیا کہ ہاں، بالکل۔ واقعی ماں کی محبت سمندروں سے بھی بڑھ کر بیکراں ہوتی ہے، اس کا کوئی حساب نہیں لگا سکتا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اب آپ اندازہ لگائیں کہ خالق کل کی محبت اپنی مخلوق کے لئے کتنی زیادہ ہے، ایک عام ماں سے بھی 70 گنا زیادہ اور پھر قرآن مجید میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک ہی تو چیز ہے جس کا قادرِ مطلق نے خود ہی اپنے آپ کو پابند کر رکھا ہے اور وہ ہے رحمت...... اس کی بے پایاں رحمت کہ کوئی اسے نہ مانے تو بھی اسے رزق دیتا ہے بلکہ فرواں دیتا ہے کہ آزمائش ہی سہی...... بسم اللہ نہ پڑھنے پر حضرت ابراہیم اپنے مہمان سے خفا ہو جاتے ہیں مہمان دستر خوان سے اٹھ جاتا ہے تو پیغمبروں کے جد امجد ابراہیم سے خود خدا خفا ہو جاتا ہے اور اس وقت تک خفا رہتا ہے کہ جب تک اس خدا کا نام نہ لینے والے کو وہ ڈھونڈ نہیں پاتے...... خدا کی رحمت بے حد ہے بلا شرط ہے۔ ہاں رہنمائی کا ذریعہ عرفانِ حق واقرار حق بذاتِ خود اک رحمت عظیم ہے۔ یہی ربانی خاصیت جو ماں کی سرشت میں ہے، بگڑے اور ناخلف بیٹے کو بھی بھوکا نہیں دیکھ سکتی، سمجھاتی بھی ہے اور تڑپتی بھی ہے، سزا بھی دیتی ہے اور آنسو بھی بہاتی ہے...... انسان کامل فخرِ موجودات رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کے ریاستی ادائے فرض میں بھی آپ کو رحمت ہی رحمت نظر آتی ہے...... ضمیر کی ستائی

مومنہ حاضر ہو کر اقرارِ جرم کرتی ہے۔ آپ اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیتے ہیں وہ دوسری طرف جا کر اقرار کرتی ہے۔ آپ پھر منہ موڑ لیتے ہیں اور وہ تیسری دفعہ بحرِ صداقت میں ڈوبنے کے لئے اقرار کرتی ہے تو پھر جا کر تعزیر واجب ہوتی ہے۔ رحمت و ربوبیت کا پلا کتنا بھاری ہے...... یونہی ایک ماں اپنے بیٹے کی سزائے موت معاف کرانے کیلئے حاکمِ دو جہاں کے پاس حاضر ہوتی ہے' ماں کا دکھڑا سن کر آپ آبدیدہ ہو جاتے ہیں' وہ روتی جاتی ہے تو آپ بھی رونے سے رک نہیں سکتے' آنسو جاری رہتے ہیں۔ ماں ماں ہے' قاتل کی ماں بھی ماں ہے۔ قاتل کی ماں کا دکھ بھی اتنا ہی دلدوز ہے جتنا کسی بھی ماں کا اور شاید عام ماں سے بھی بڑھ کر کہ دکھ سزا کا ہی نہیں تربیت میں کوتاہی کا بھی ہے۔ غفلت و گمراہی کا بھی ہے مگر اللہ کی طرف سے ریاستی ادائے فرض بھی اہم ہے بلکہ لازم ہے' معافی کا اختیار بھی سربراہ مملکت کو نہیں' اس سربراہ کو بھی نہیں جس کا حکم اس کے ماننے والوں کا حصہ ایمان ہے۔ اختیار صرف وارث کو ہے' وہاں سے معافی نہیں ملی تو سزا دینا ہی پڑی مگر ماں کا دکھ کہ اس میں برابر کی شمولیت ہے' شعوری ہی نہیں جذباتی و فطری بھی کہ وہ دکھ ہی ایسا ہے۔

آپ کا اپنا داماد جنگِ بدر میں کفار کی طرف سے لڑتا ہوا جنگی قیدی بن جاتا ہے۔ حضرت خدیجہ کا بیٹی کو پیار سے دیا ہوا ہار فدیہ کے طور پر آپ کے سامنے آ جاتا ہے تو آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہو جاتی ہے کہ ایک ماں نے وہ ہار پیار سے اپنی بیٹی کو دیا تھا...... یہی نہیں اس کتیا کی قسمت دیکھیے جو فتح مکہ کے وقت فاتح لشکر سے اپنے بچوں کو بچانے کے لئے کوشاں ہے' گلیاں سنسان ہیں' سب دروازے بند ہیں کہ یہی اعلانِ عافیت ہے۔ کتیا ایک بند دروازہ سے دوسرے بند دروازے کی طرف جاتی ہے کہ مبادا اس کے بچے لشکرِ عظیم کے پاؤں نیچے روندے جائیں۔ آپ کی نگاہ کرم اس ہراساں کتیا ماں پر پڑتی ہے۔ آپ اس کا درد محسوس کرتے ہیں اور دس ہزار کا جری لشکر آپ کے حکم سے وہیں کھڑا ہو جاتا ہے جب تک اس ماں کو اپنے بچے سنبھالنے کی مہلت نہیں مل جاتی۔ واہ واقعی ماں اس کی رحمت کا سایہ ہے' اسی لئے تو ہم پنجابی میں کہتے ہیں ماواں ٹھنڈیاں چھاواں۔

خود خدا نے صفا اور مروہ کو ماں کی محبت و ایثار کی علامت کے طور پر قابلِ پرستش بنا دیا ورنہ کیا ہے دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں مگر وہاں تو متفکر ماں اپنے بیٹے اسماعیل کی پیاس سے پریشان سات چکر کاٹتی ہے۔ جلدی جلدی فکرمندی سے اور وہ ادائے ممتا ہی طریقِ عبادت ٹھہرا کہ ماں کی محبت رب کا ہی ایک روپ ہے۔

جب نپولین پورے یورپ کا شہنشاہ تھا تو اس نے اپنے باقی چھ بھائیوں کو بھی مختلف ملکوں کا بادشاہ بنادیا تھا مگر ان سات بادشاہوں کی ماں ہمیشہ ان کے لئے متفکر رہتی تھی اور اس وقت بھی وہ اپنے پرانے گھر میں رہتی تھی اور اپنے بادشاہ بچوں کے لئے ہر روز کھانے کا بندوبست کرتی رہتی تھی۔ چیزیں اکٹھی کرتی' لباس بناتی اور بہت متفکر رہتی۔ ان سات بادشاہوں کی ماں کی ایک پرانی سہیلی سے رہا نہ گیا اور کہنے لگی کہ تمہارے ساتوں کے سات بیٹے بادشاہ ہیں تم ان کا اتنا زیادہ فکر کیوں کرتی ہو؟ بادشاہوں کی ماں کہتی ہے بہن کچھ پتہ نہیں کہ کب ان بادشاہوں کی بادشاہت ختم ہو جائے اور وہ بیچارے بھوکے پیاسے ماں سے روٹی مانگنے آجائیں۔ ماں واقعی ماں ہے ہر رنگ میں اور ہر موقع پر ماں ہے۔ پیدا کرنے والے کی اس دنیا میں شناخت ہے۔

میری والدہ مرحومہ کی یہی حالت تھی اللہ انہیں اپنے غلافِ رحمت میں رکھے۔ 27 اکتوبر 1991ء کی صبح مجھے کسی اہم اجلاس کے لئے راولپنڈی جانا تھا۔ میری ماں بہت بیمار تھیں' سروسز ہسپتال میں داخل تھیں' آنکھوں کی بینائی جواب دے چکی تھی مگر ہوش وحواس اچھی طرح قائم تھے۔ میں لاہور سے باہر نہیں جانا چاہتا تھا مگر ادائے فرض بھی ایک عجیب جذبہ ہے۔ میں اس وقت پنجاب کا آئی جی پولیس تھا۔ میں نے بادل نخواستہ ماں سے راولپنڈی جانے کی اجازت مانگی' اجازت فوری مل گئی مگر ساتھ لمبی نصیحتیں کہ آرام سے جانا...... میری بیماری کی وجہ سے واپسی میں جلدی نہ کرنا تھک جاؤ گے۔ میں نے کہا جہاز سے جاؤں گا اور جہاز سے آؤں گا۔ ہوائی جہاز سے انسان نہیں تھکتا۔ فرمایا نہیں بیٹا سفر سفر ہی ہوتا ہے۔ پتہ نہیں چلتا آدمی تھک جاتا ہے۔ شام کو واپس مت آنا' تھک جاؤ گے...... خبردار اس خیال سے جلدی نہ کرنا کہ ماں بیمار ہے۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں' سب ہی تو میرے پاس ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ کھانا کہاں سے کھاؤ گے' بہتر ہے کہ تم گھر کا پکا کھانا ساتھ لے جاؤ' تمہارا پیٹ بہت جلد خراب ہو جاتا ہے' ہاں دوپہر کو سو لینا۔ میں نے کہا کہ میں پولیس کا بہت بڑا افسر ہوں۔ سب لوگ میرے آرام کا خیال رکھتے ہیں' صاف ستھرا کھانا تیار کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ مگر میری بیمار بہت ہی بیمار ماں کو میری باتوں پر قطعاً یقین نہیں تھا۔ وہ سراپا محبت وتفکر بنی کھڑی تھیں۔ انہیں اپنی شدید بیماری بلکہ اپنی زندگی کی آخری اور جان لیوا بیماری کا ذرہ بھر فکر نہ تھا...... فکر تھا تو اپنے صاحب اختیار بیٹے کے آرام کا' شام کو میں واپس آگیا۔ حاضری دی تو پہلی بات یہی کہی کہ بیٹا بہت تھک گئے ہو گے' کیوں واپس بھاگ آئے' جاؤ گھر جا کر ذرا آرام کرلو۔ ذرا تامل کیا تو سختی سے کہا کہ جاؤ آرام کرو یہ میرا حکم ہے۔ اور اگلے دن 28 اکتوبر کی صبح وہ متفکر ماں اپنی زندگی

کے آخری سانس لے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ماں مرتے دم تک پیار ہی پیار ہے، رب ذوالجلال کا احسان ہے۔ اس دنیا میں اس کی رحمت کا روپ ہے...... بے لوث الفت۔

ہائے او موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

مانا کہ موت کا ایک وقت معین ہے مگر بعض موتیں بہت ہی بے موقع، غیر متوقع اور دلخراش ہوتی ہیں۔ 18 جولائی 1992ء کی صبح بلقیس نے اپنے پیٹ میں معمولی سی خرابی کی شکایت کی اور پھر Entox کی ایک دو گولیاں کھالیں۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

چند لمحوں بعد اس نے کہا کہ شام کو ہم لوگ خواجہ شریف غفور صاحب کے گھر ان کی بیٹی شارمین سے ہارون کی شادی کی بات کے لئے چلیں گے۔ مگر میں نے اپنی مصروفیت کے مدِ نظر کہا کہ کسی اور دن سہی۔ بلقیس کو کوئی تکلیف نہ تھی اور نہ ہی وہ کوئی زیادہ بیمار نظر آ رہی تھی، میں دفتر چلا گیا۔

اگلے دن یعنی 19 جولائی کی صبح صبح میاں منظور احمد وٹو صاحب جو اس وقت پنجاب اسمبلی کے سپیکر تھے کسی کام سے میرے گھر آئے اور کافی دیر ان کے ساتھ محو گفتگو رہا۔ وہ گئے تو میں نے دیکھا کہ بلقیس ٹی-وی روم میں بیٹھی ہے۔ مجھے دفتر کی جلدی تھی۔ میں نے بلقیس میں کوئی خاص بیماری کے آثار نہ دیکھے۔ ویسی ہی لگ رہی تھی جیسے کہ پہلے تھی۔ البتہ اس کا رنگ کچھ زرد زرد سا محسوس ہوا مگر میں سمجھا کہ پیٹ کی خرابی سے کچھ کمزوری ہوگئی ہوگی۔ بلقیس نے کوئی شکایت بھی نہ کی اور میں دفتر چلا گیا۔

میں دفتر سے کوئی تین بجے سہ پہر واپس آیا تو بابا جی (والد صاحب) کو بہت غصے میں پایا۔ بولے سردار! تم بہت فضول آدمی ہو۔ تمہیں پتہ ہی نہیں کہ بیگم بے چاری ہسپتال میں پڑی ہے اور تمہیں دفتر کی پڑی ہے۔

ہیں! ہسپتال میں پڑی ہے اور مجھے خبر تک نہ ہے۔ مجھے اطلاع کر دی ہوتی۔ بھئی اطلاع تو تبھی کرتے اگر تم فون پر ملتے۔ تمہاری میٹنگیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔ جاؤ بیگم کا پتہ کرو۔ چھوڑو سب کام۔ فضول آدمی کہیں کے۔

بابا جی کی یہی عادت تھی اور ایسے ہی جھڑکتے رہتے تھے۔ کوئی بھی ان کی بات کا برا نہیں مناتا تھا۔ سب کو پتہ تھا کہ ان کے سخت الفاظ کے پیچھے کتنی محبت چھپی ہوتی تھی اور میرے ساتھ تو وہ سب سے

بڑھ کر الفت کرتے تھے۔

میں ابھی ہسپتال چلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ نجمہ میری سالی کا ہسپتال سے فون آ گیا کہ آپ ذرا ہسپتال آ جائیں۔ میں نے بلقیس کا حال پوچھا تو کہتی ہے کہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ بس ایسے ہی دل چھوڑے بیٹھی ہے۔ بار بار کہتی ہے کہ میں نے اب نہیں بچنا۔ جلدی سے سردار کو بلاؤ۔

نجمہ کا یہ کہنا تھا کہ میری تو جان نکل گئی۔ شاید میری چیخ ہی نکل گئی ہو۔ نجمہ نے مجھے تسلی دی کہ بھئی آپا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ آپ ویسے ہی آ جائیں۔

میں نے بھاگ کر گاڑی میں چھلانگ لگائی اور ہسپتال پہنچ گیا۔ دیکھنے میں بلقیس بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی تھی مگر اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے سخت درد ہے۔ میں نے پوچھا تو بتایا کہ اس کے پیٹ میں شدید درد اور جلن ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ سارا جسم آگ میں جل رہا ہے۔ اور مجھے بہت گرمی لگ رہی ہے۔ میں نے دیکھا تو کمرے کا ایئر کنڈیشنر پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ کمرہ کافی حد تک ٹھنڈا بھی تھا مگر اسے گرمی کی بہت زیادہ شکایت تھی۔ میں نے پرویز مسعود چیف سیکرٹری پنجاب اور وزیرِ صحت چوہدری جعفر اقبال کو فون کیا تو انہوں نے پورے ہسپتال کے عملہ کو ہلا کر رکھ دیا کہ اس سے زیادہ ٹھنڈا کمرہ دو اور چند لمحوں میں وہ خود بھی ہسپتال پہنچ گئے۔

اس دوران ایک ڈاکٹر نے مجھے چل کر ایک کمرہ دیکھنے کو کہا۔ وہ اوپر والی منزل پر تھا اور میں نے بھاگ کر سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں بلکہ پھلانگنا شروع کر دیں۔ اتنے میں میں دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت ہی سیاہ کالی موٹی تازی بلی تیزی سے میرا راستہ کاٹتے ہوئے ہمارے سامنے سے گزرتی ہے۔ کالی بلی کو دیکھنا تھا کہ میرا ماتھا ٹھنکا کہ اللہ خیر کرے حالانکہ میں ان چیزوں اور روایات پر ذرا بھر اعتقاد نہیں رکھتا مگر اس وقت میری ذہنی حالت کچھ ایسی تھی کہ اس وقت اس بلی کا گزرنا' مجھے بہت شاق گزرا اور یہ بات میرے دل سے نہ نکلی۔ درحقیقت اب تک نہیں نکل سکی اور میری روح کا کوئی حصہ پکار اٹھا کہ ہو نہ ہو کوئی المیہ ہونے کو ہے۔ خیر میں دعا کرتا رہا۔ وہ کمرہ تو مجھے پسند نہ آیا۔ اسی منزل پر ایک اور زیادہ ٹھنڈا کمرہ میسر ہو گیا مگر بلقیس کا تو شاید کلیجہ پھٹ چکا تھا اسے ٹھنڈک کہاں محسوس ہو سکتی تھی۔

ہارون اور عرفان ان دنوں لاہور ہی میں تھے وہ بھی پہنچ گئے مگر ہماری تینوں بیٹیاں ملک سے باہر تھیں۔ سائرہ تو ویسے ہی مانچسٹر میں رہتی تھی مگر انجم اپنے چھوٹے بیٹے مصطفیٰ کے کسی اپریشن کے سلسلہ میں نیویارک گئی تھی اور ساتھ صائمہ کو بھی لے گئی تھی۔

......ادھر بلقیس نے صائمہ! صائمہ کی رٹ لگا رکھی تھی۔ صائمہ کو فوراً بلاؤ۔ اسے کیوں نیویارک جانے دیا اور میں اسے جھوٹی تسلیاں دیتا رہا کہ ابھی پہنچتی ہے۔ ابھی پہنچ جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بلقیس کو اس وقت صائمہ کی بہت فکر کھائے جا رہی تھی۔ ماں کا دل سب کی طرف سے مطمئن تھا مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ صائمہ ابھی بہت چھوٹی ہے اور اس کی فکر اسے ستا رہی تھی۔

ڈاکٹروں نے تمام ٹیسٹ کر لیے۔ تمام پاپڑ بیل لئے مگر درد اور گرمی کا احساس بلقیس کو تڑپاتا ہی رہا۔ آدھی رات گزرے اس کے پیٹ کے اندر Bleeding شروع ہوگئی اور خون کی ضرورت پڑی۔ سب سے پہلے خون ہارون نے دیا کہ اس کا گروپ ماں سے ملتا تھا۔ پھر ضرورت پڑی تو بلقیس کے بھائی ہمایوں رضا شفیع نے دیا اور پھر ضرورت پڑی تو اس کی بہن نجمہ نے دیا۔

......اور پھر ضرورت ہی نہ رہی۔

صبح ہو چکی ہے۔ دن کے گیارہ بجے کا عمل ہے۔ 20 جولائی کا منحوس دن ہے۔ سب ڈاکٹر کھڑے ہیں۔ بہن بھائی کھڑے ہیں۔ ہارون' عرفان کھڑے ہیں اور بلقیس کبھی نہ واپس آنے کے لئے کومے میں چلی گئی۔ ڈاکٹروں نے ہزار کوشش کی مگر ہونی کو ہو کر رہنا تھا اور بلقیس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہمارا ساتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ "انا اللہ وانا الیہ راجعون"

تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

اس لمحہ مری زندگی کی روشنی ختم ہو چکی تھی۔

مری زندگی کا نور ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا اور میں کچھ نہ کر سکا۔ بس دیکھتا رہ گیا۔ وہ کتنا تکلیف دہ منظر تھا جب نرس اس کی سونے کی چوڑیاں اس کے بے جان بازوؤں سے اتار رہی تھی۔ یہ چوڑیاں بلقیس نے کبھی بھولے سے بھی نہیں اتاری تھیں کہ یہ چوڑیاں اسے اس کے سردار نے دی تھیں وہ جو اسے بگاڑ کر سرتاج کہتی تھی اور آج سب حسرتیں سدھریں تھیں جوان چوڑیوں کے ساتھ اتر رہی تھیں۔ میں چکرا کر ایک کرسی پر گر گیا۔

ہارون' عرفان کو دیکھا تو سنبھلنا پڑا۔

اس کے بعد جو ہوا وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر اکثر ہوتا ہے۔ مگر سب سے مشکل وہ لمحہ تھا جب مجھے مانچسٹر اور نیویارک دیارِ غیر میں ان معصوم بچیوں کو یہ بتانا پڑا کہ اب ان کی ماں اس دنیا میں نہیں رہی۔ وہ بہت ہی تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ دنیا کے دوسرے حصہ میں وہ بیچاریاں بے یار و مددگار تڑپ کر رہ گئیں اور

لاہور چل دیں۔

گرمی کا موسم تھا۔ ہم بچیوں کا انتظار نہیں کر سکتے تھے اور اسی شام بلقیس میری والدہ کے پہلو میں فیصل ٹاؤن قبرستان میں اپنی آخری آرام گاہ میں پہنچ گئی۔

اور مرے منہ سے نکلا

یہاں ہیں وہ دو عظیم ہستیاں جنہوں نے میری زندگی بنائی

میری ہوک نکل گئی

آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔

مجھے میرے والد صاحب نے سنبھالا۔

صائمہ، سائرہ اگلے دن پہنچیں تو ماں کی قبر سے لپٹ لپٹ کر روتی رہیں اور بے ہوش ہو گئیں۔

تب سے میرے منہ سے اکثر نکل جاتا ہے کہ

ہائے او موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

اور کبھی کہتا ہوں

تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

کہ میں اس وقت سے بے موت مر رہا ہوں۔

کیونکہ میری زندگی ہی بلقیس تھی

اور شاید میں بلقیس کے لئے؟

صرف بلقیس کے لئے ملازمت میں آیا تھا۔

کہ اللہ کی یہی منشا تھی، اُسے یونہی منظور تھا

بلقیس کے چلے جانے کے بعد چند منٹوں میں ہی سب کچھ بدل گیا۔ حکومت بدل گئی اور میں افسر بکار خاص یا افسر بیکار بن گیا اور اسی حالت میں ریٹائر ہو گیا۔ کہ اللہ کو ایسے ہی منظور تھا۔ یہ نوکری یہ ٹھاٹھ باٹھ مجھے صرف امانتاً ملے تھے کہ میں بلقیس کی دلجوئی کر سکوں یا کم از کم اس کے اہل بن سکوں۔ جب اس کی ضرورت نہ رہی تو میری چھٹی ہو گئی۔

اس کے راز وہی جانے اور کوئی نہ جانے

یہ دل کے مرض اور گردوں کی خرابی سب اسی وجہ سے ہے کہ بلقیس کے بعد میری کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ دل گردہ کس کام کا کہ دیکھنے والے ہی نہ رہے۔

تقریباً 62 سال کی عمر کو پہنچ کر جب میں اپنی زندگی پر پیچھے مڑ کر نظر ڈالتا ہوں تو جو کچھ ہوا وہ کسی عجوبہ سے کم نہیں ہے۔ وہ وہ ہوا جو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیا ہونا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ بندے کی کوئی حیثیت نہیں۔ فطرت کی قوتیں بہت زیادہ طاقتور ہوتی ہیں۔

تتمہ

کتاب میں استعمال شدہ مخفّفات

مخفف	پورے الفاظ	معانی
اے سی آر	اینول کانفیڈنشل رپورٹ	سالانہ خفیہ رپورٹ
اے ڈی سی	ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر	(مفہوم واضح ہے)
اے آئی جی	اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل	(مفہوم واضح ہے)
اے این پی	عوامی نیشنل پارٹی	ایک سیاسی جماعت کا نام

اے ایس آئی	اسسٹنٹ سب انسپکٹر	(مفہوم واضح ہے)
اے آر ایم	انٹی رائٹ ایکیمنٹ	مظاہروں کی روک تھام کا سامان
اے ایس پی	اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس	(مفہوم واضح ہے)
اے ٹی سی	انٹی ٹیررسٹ سیل انسدادِ دہشت گردی سیل	
اے زیڈ او	الذوالفقار آرگنائزیشن	ایک تنظیم کا نام
بی ڈی	بیسک ڈیماکریسی	بنیادی جمہوریت
بی اے	بیچلر آف آرٹس	
بی بی	بے نظیر بھٹو	
بی بی سی	برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن	
سی ڈی	کمپیکٹ ڈسک	
سی ڈی اے	کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی	
سی آئی ڈی	کریمنل انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ	
سی ایم ایل اے	چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر	
سی او پی	کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز	
سی پی او	سنٹرل پولیس آفس	
سی آر پی سی	کریمنل پروسیجر کوڈ ضابطۂ فوجداری	
سی ایس پی	سول سروس آف پاکستان	
سی ایس ایس	سنٹرل سپیریئر سروسز	
ڈی اے سی	ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی	
ڈی سی	ڈپٹی کمشنر	
ڈی سی سی	ڈیجیٹل کمپیکٹ کیسٹ	
ڈی جی	ڈائریکٹر جنرل	
ڈی آئی بی	ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو	

ڈی آئی جی	ڈپٹی انسپکٹر جنرل
ڈی ایم	ڈسٹرکٹ میجسٹریٹ
ڈی ایم ایل اے	ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر
ڈی ایم ایس	ڈپٹی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ
ڈی او	ڈیمی آفیشل
ڈی ایس آر	ڈیلی سچوایشن رپورٹ
فاٹا	فیڈرلی ایڈمنسٹرڈ ٹرائبل ایریاز
ایف آئی آر	فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی
ایف آئی سی	فیڈرل انسپکشن کمیشن
ایف آئی آر	فرسٹ انفارمیشن رپورٹ ابتدائی رپورٹ
ایف ایس ایف	فیڈرل سیکورٹی فورس
جی ایچ کیو	جنرل ہیڈکوارٹرز
جی او آر	گورنمنٹ آفیسرز ریذیڈنسز
جی پی او	جنرل پوسٹ آفس
جی ٹی روڈ	گرانڈ ٹرنک روڈ
ایچ سی	ہیڈ کانسٹیبل
آئی بی	انٹیلی جنس بیورو
آئی جی پی	انسپکٹر جنرل آف پولیس
آئی جے ٹی	اسلامی جمعیت طلبہ
آئی ایم ایف	انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ
آئی ایس آئی	انٹر سروسز انٹیلی جنس
جے آئی	جماعت اسلامی
جے یو آئی	جمعیت العلمائے اسلام

کے جی بی	روس کی انٹیلی جنس ایجنسی	
خاد	افغانستان کی انٹیلی جنس ایجنسی	
ایل ایل بی	بیچلر آف لاز	
ایل یو ایم ایس	لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز	
ایم اے	ماسٹر آف آرٹس	
ایم بی اے	ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن	
ایم بی بی ایس	بیچلر آف میڈیسن اینڈ بیچلر آف سرجری	
ایم ایل اے	مارشل لا ایڈمنسٹریٹر	
ایم ایم پی آئی	موبائل موٹر پٹرول انسپکٹر	
ایم این اے	ممبر آف نیشنل اسمبلی	
ایم پی اے	ممبر آف پراونشل اسمبلی	
ایم کیو ایم	مہاجر قومی موومنٹ	
ایم آر ڈی	موومنٹ فار ریسٹوریشن آف ڈیماکریسی	تحریک بحالیٔ جمہوریت
ایم ایس	ملٹری سیکرٹری	
نیپ	نیشنل عوامی پارٹی	
این آئی پی اے	نیشنل انسٹیٹیوٹ فار پبلک ایڈمنسٹریشن	نیپا
این پی پی	نیشنل پیپلز پارٹی	
این ڈبلیو ایف پی	نارتھ ویسٹ فرنٹیئر پراونس	صوبہ سرحد
او ایس ڈی	آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی افسر بکار خاص	
پی اے بی ایکس	پرائیویٹ اینڈ برانچ ایکسچینج	
پی سی او	پروویژنل کانسٹیٹیوشنل آرڈر	
پی سی ایس	پراونشل سول سروس	
پی ایچ ڈی	ڈاکٹر آف فلاسفی	

پی آئی اے	پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز	
پی ایل او	پیلسٹائین لبریشن آرگنائزیشن	تحریکِ آزادیٔ فلسطین
پی این اے	پاکستان نیشنل الائنس	
پی این سی بی	پاکستان نارکوٹکس کنٹرول بورڈ	
پی او ایل	پٹرول' آئل' لبریکنٹس	
پی او ڈبلیو	پرزنر آف وار	جنگی قیدی
پی پی پی	پاکستان پیپلز پارٹی	
پی ایس ایف	پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن	
پی ٹی	فیزیکل ٹریننگ	
پی ٹی اے	پراونشل ٹرانسپورٹ اتھارٹی	
را	ریسرچ اینڈ انیلسز ونگ آف	بھارت کی خفیہ ایجنسی
	انڈین انٹیلی جنس بیورو	
سارک	ساؤتھ ایشین ایسوسی ایشن فار ریجنل کوآپریشن	
ایس بی	سپیشل برانچ	
ایس ڈی ایم	سب ڈویژنل مجسٹریٹ	
ایس ڈی پی او	سب ڈویژنل پولی آفیسر	
ایس ایچ او	سٹیشن ہاؤس آفیسر	
ایس آئی	سب انسپکٹر	
ایس پی	سپرنٹنڈنٹ آف پولیس	
ایس پی اے ایف	سندھ پیپلز ایسوسی ایشن فار فریڈم	
ایس ایس پی	سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس	
ٹیلی کام	ٹیلی کمیونیکیشنز	
ٹرانسپ	ٹرانسپورٹ	

یوڈی ایف — یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ

یوکے — یونائیٹڈ کنگڈم — برطانیہ

یواین — یونائیٹڈ نیشنز: اقوامِ متحدہ

یوایس اے — یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ — امریکہ

یوایس ایس آر — یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلکس — روس

وی سی آر — ویڈیو کیسٹ پلیئر

وی او اے — وائس آف امریکہ

وی آئی پی — ویری امپارٹنٹ پرسن اہم شخصیت

وی وی آئی پی — ویری ویری امپارٹنٹ پرسن انتہائی اہم شخصیت

واپڈا — واٹر اینڈ پاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی

ڈبلیو ایچ او — ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن

وائی ایم سی اے — ینگ مین کرسچین ایسوسی ایشن